(PHD) مقالہ

# اُردو سوانح نگاری آزادی کے بعد

# URDU BIOGRAPHY AFTER FREEDOM

ڈاکٹر حسن وقار گُل

شُعبۂ اُردو، جامعہ کراچی، کراچی (پاکستان)

450/-

(۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء)

ڈاکٹر حسن وقار گل

شعبۂ اردو، جامعہ کراچی، کراچی (پاکستان)

| | |
|---|---|
| نام کتاب | اردو سوانح نگاری' آزادی کے بعد (۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء) |
| مصنف | ڈاکٹر حسن وقار گل |
| اشاعت | ۲۴ شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ / ۲۵ دسمبر ۱۹۹۷ء / (سال جشن طلائی پاکستان) |
| ناشر | شعبہ اردو' جامعہ کراچی' کراچی۔ پاکستان |
| زیر اہتمام | صدر شعبہ اردو جامعہ کراچی |
| تعاون | گلرنگ پبلی کیشنز' 10 سی' جامی کمرشل اسٹریٹ ون فیز سیون پاکستان ڈیفنس آفیسرز ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی' کراچی پاکستان |
| کمپوزنگ | محمد خالد / میڈیا سروسز پریس چیمبر آئی آئی چندریگر روڈ کراچی |
| پروف ریڈنگ | شاہ محمد تبریزی |
| تزئین | محمد جاوید اقبال |
| مطبع | ذکی سنز پرنٹرز آئی آئی چندریگر روڈ کراچی |
| قیمت | |
| یورپ و امریکہ | تیس (۳۰) امریکی ڈالر |
| مشرق بعید | پچھتر (۷۵) سعودی ریال |

تقسیم کار

ویلکم بک پورٹ (پرائیوٹ) لمیٹڈ مین اردو بازار کراچی' پاکستان

فون: 2639581-2633151 فیکس: 2638086




# انتساب

والد محترم حضرت انورؔ دہلوی (مرحوم)

والدہ محترمہ انیسؔ جہاں بیگم (مرحومہ)

مادر علمی جامعہ کراچی

کے تمام اساتذہ و سابق طالب علم ساتھیوں

اور ان تمام صحافی دوستوں کے نام

جن کی آغوش تربیت اور صحبت نے آج اس قابل بنایا۔

ہم کو وقار ادب نے شعور ادب دیا

ہم سے ملے ادب کو خزانے نئے نئے

# ترتیب و تہذیب

## باب سوم



## باب چہارم



## باب پنجم







## باب ششم



## باب ہفتم

پروفیسر ڈاکٹر سید شاہ علی
سابق صدر شعبہ اردو جامعہ کراچی

## اردو سوانح نگاری کی نئی جہتیں

"اردو سوانح نگاری" آزادی کے بعد' اردو سوانح نگاری کے موضوع پر ایک اہم تحقیقی و تنقیدی کام ہے جس پر ڈاکٹر محمد وقار الحسن وقار گل نے جامعہ کراچی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ پاکستان میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے جو اعلیٰ سطح اور مستقل بنیادوں پر کیا گیا اس سے قبل پاکستان مین جو کام ہوا اس کی افادیت اپنی جگہ مگر "اعلیٰ سطح پر نقش اول" ڈاکٹر حسن وقار گل کے کام کو ہی کہا جائے گا۔ یہ بات میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ میں اس کام کا نگراں رہا ہوں بلکہ بنیادی بات یہ ہے کہ یہ کام ایک ایسے وقت میں ہوا جب اس نوعیت اور اس سطح کے کام کی اشد ضرورت تھی اور اس مشکل موضوع پر کوئی شخص سنجیدگی سے کام کرنے کو تیار نہ تھا۔ چند سوانح عمریوں پر سطحی تبصرہ کر کے کتاب شائع کر دینا یا کوئی مضمون لکھ دینا اور بات ہے اور اعلیٰ سطح پر تحقیقی و تنقیدی جائزہ لے کر کسی صنف کے مقام کا تعین کرنا' مستقبل کے سوانح نگاروں کے لئے تحقیقی بنیادوں پر مواد فراہم کرنا اور ایک ایسی راہ تلاش کرنا جو بیسویں صدی کے ادب کو اکیسویں صدی کی شاہراہ سے ملا سکے اور بات ہے اور ڈاکٹر حسن وقار گل کے مقالے کی ایک اہم جدت یہی ہے کہ انہوں نے اپنے مقالے میں آنے والی صدی کے چیلنجوں پر بھی نظر رکھی ہے اور آخری باب میں ادب کی ترقی میں الیکٹرونکس میڈیا کے کردار کا جس طرح جائزہ لیا یہ اردو ادب میں ایک نئی فکر کی بنیاد ہے۔

ڈاکٹر حسن وقار گل کا مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے جس میں علمی' ادبی' سیاسی' سماجی اور مذہبی شخصیات کی اردو میں لکھی گئی ان سوانح عمریوں اور آپ بیتیوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے جو اردو زبان و ادب میں اضافہ قرار دی جاتی ہیں ان میں بعض اختلافی نوعیت کی بھی ہیں مگر مقالہ نگار نے دلائل کے ساتھ اردو ادب میں ان کی حیثیت کا تعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور وہ اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں اس کا فیصلہ تو ناقدین ادب ہی کر سکیں گے مگر مجھے یہ کہنے میں کوئی تامّل نہیں کہ اردو ادب میں کسی موضوع پر تنقید کرنا آج کے دور میں مشکل مسئلہ نہیں مگر موضوع کے اعتبار سے تنقید کا حق بھی صرف اسے ہی حاصل ہونا چاہیے جو خود اس موضوع پر اتھارٹی ہو اور

پاکستان میں سوانح نگاری کے موضوع پر اعلیٰ سطح پر ڈاکٹر حسن وقار گل کے علاوہ کوئی دوسرا مقالہ نگار نظر نہیں آتا۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ میں ڈاکٹر وقار حسن گل کو "عقل کُل" کی سند دینے جا رہا ہوں بلکہ ان کی جستجو اور محنت کی داد نہ دینا بھی ایک زیادتی ہو گی۔

مذکورہ مقالے کی اہم بات یہ بھی ہے کہ اس مقالے میں آپ بیتیوں کے حوالے سے جدت اختیار کی گئی ہے یعنی "آپ بیتی۔ خودنوشت" اور "آپ بیتی۔ بیانیہ" جبکہ اس سے قبل اردو ادب میں جو بھی اور جس قسم کی بھی آپ بیتیاں سامنے آئیں ہم اسے خودنوشت کا درجہ دیتے رہے مگر ڈاکٹر حسن وقار گل نے اس مسئلے پر اختلافی رجحان کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسی آپ بیتیوں کو "بیانیہ" قرار دے کر ایک الگ صنف کی حیثیت دے دی ہے جو آپ بیتی کسی کی ہے اور تحریر کسی اور نے کیا ہے مثلاً "شیخ عبداللہ کی آپ بیتی آتش چنار جسے محمد یوسف ٹینگ نے تحریر کیا یا "آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی" جسے عبدالرزاق ملیح آبادی نے تحریر کیا' اس کے علاوہ "آپ بیتی رشید احمد صدیقی" مرتبہ سید معین الرحمٰن، (India wins Freedom) انڈیا ونز فریڈم انگریزی تحریر ہمایوں کبیر' اردو ترجمہ پروفیسر مجیب کو بھی خودنوشت آپ بیتیوں میں شمار کیا جاتا ہے اس کی نوعیت بھی بیانیہ ہے اس کے علاوہ بھی اس نوعیت کی آپ بیتیاں ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر حسن وقار گل نے دوٹوک فیصلہ دے کر ایک معیار قائم کر دیا ہے۔

مقالے میں ایک بات جو مقالہ نگار کی ذہنی اپج اور جدید رجحانات کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ ہے خاکہ نگاری کے ضمن میں جس میں "انفرادی" اور "اجتماعی" کے ذیلی عنوانات قائم کر کے قابل تعریف جدت اختیار کی گئی ہے اور مقالہ کا آخری باب جس میں آزادی کے بعد تحریر کی جانے والی سوانح عمریوں' آپ بیتیوں اور خاکوں (۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء) کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور یہ اس مقالے کا سب سے اہم حصہ ہے جسے مقالہ نگار نے نہایت عرق ریزی سے مدلل انداز میں پیش کیا ہے ممکن ہے اس میں پیش کردہ تجزیوں پر اختلافی ردعمل بھی سامنے آئے مگر یہ کسی بھی محقق اور مقالہ نگار کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی تنقیدی و تجزیاتی رائے کا کھل کر اظہار کرے اور ڈاکٹر حسن وقار گل نے یہاں بھی اپنا حق استعمال کرنے کے ساتھ فرائض کی ادائیگی کا بھی خیال رکھا ہے یعنی آزادی کے بعد ادبی تحریکات کے حوالے سے قومی تحریکات کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے اور علمی و ادبی شخصیات کی سوانح عمریوں کے علاوہ تحریک آزادی کے زعماء کی سوانح عمریوں کو بھی موضوع بحث بنایا ہے جس سے ان کے قومی رجحانات کا



بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور پاک و ہند کی ان تمام شخصیات پر بحث کی ہے جنھوں نے پاک و ہند کی آزادی کی جنگ لڑی اس سے بہت سے قومی مسائل سامنے آئے جس کے حل کے لئے مقالہ نگار نے اپنی رائے کا اظہار بھی کیا اور اس مقالہ میں یہ خاص بات سامنے آئی ہے کہ پاکستان و بھارت دونوں ملکوں میں تحریک آزادی کے صرف چند زعماء پر تو بہت کچھ لکھا گیا اور انہی پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے مگر جدوجہد آزادی کی بہت سی شخصیات کو ہم آج بھی نظرانداز کر رہے ہیں اور یہی بات دونوں ملکوں کی قومی بدقسمتی ہے۔ مثال کے طور علامہ اقبال اور قائداعظم پر تو بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے مگر علامہ اقبال اور قائداعظم کے دیگر رفقاء پر بھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش موجود ہے مگر ہم اس سے غافل نظر آتے ہیں۔

یہ مقالہ ایسے موقع پر شائع کیا جا رہا ہے جب ہم اپنے ملک کا جشن طلائی منا رہے ہیں اور ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ مقالہ چونکہ آزادی کے حوالے سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اس لئے اس کی اشاعت کا اہتمام سرکاری جانب سے کیا جاتا اس میں پیش کی گئی سفارشات پر عمل کرنے کے ساتھ ہی ان تمام اہم شخصیات کے سوانح لکھوائے جاتے۔ جنھوں نے تحریک آزادی کو کامیابی سے ہم کنار کرانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا جس سے نئی نسل کو بھی آگاہی ہوتی مگر ایسا نہ ہوا۔ مگر موضوع کی مناسبت سے اب یہی موقع مناسب ہے کہ جشن طلائی کے سال ۱۹۹۷ء میں اسے شائع کیا جائے۔ شعبۂ اردو جامعہ کراچی کے زیر اہتمام اس کی اشاعت ایک نیک شگون ہے جو مقالہ نگار ڈاکٹر حسن وقار گل اور شعبۂ اردو جامعہ کراچی کی جانب سے پاکستانی قوم کے لئے جشن طلائی کا خصوصی تحفہ سمجھا جائے گا اور یہ کتاب نہ صرف مستقبل کے سوانح نگاروں کی رہنمائی کا باعث بنے گی بلکہ اردو سوانح نگاری کے موضوع پر تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والوں کے لئے بھی مشعل راہ ثابت ہو گی۔

سینیٹر جمیل الدین عالی
معتمد انجمن ترقی اردو، پاکستان

# حرف چند ( بیانیہ )

("اردو سوانح نگاری، آزادی کے بعد۔ ترقی و امکانات ایک جائزہ" کے موضوع پر ۸ اگست ۱۹۹۶ء کو منعقد ہونے والے "اردو سیمینار" میں کی جانے والی صدارتی تقریر سے تلخیص و اقتباس)

اردو سوانح نگاری ایک دلچسپ مگر مشکل فن ہے اور اس پر تحقیق و تنقید اس سے زیادہ مشکل عمل ہے جس کی ابتدا ایک لحاظ سے باقاعدہ طور پر تو ہندوستان میں ڈاکٹر شاہ علی نے کی اور پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ میں یہ مشکل کام ڈاکٹر وقار گل نے سرانجام دے کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے اس سے قبل اس موضوع پر پاکستان میں کافی کام ہوا لیکن اس کا بیشتر حصہ ڈاکٹر حسن وقار گل کے کام کے آگے ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات میں یہاں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں ڈاکٹر حسن وقار گل کا یہ مقالہ تین بار پڑھ چکا ہوں اور ہر بار ایک نیا لطف آیا، یہاں ڈاکٹر حسن وقار گل کے استاد و نگراں مقالہ سید شاہ علی صاحب بھی موجود ہیں جن سے بیس برس بعد ملاقات ہوئی۔ ہم نے ڈاکٹر سید شاہ علی صاحب کا مقالہ "اردو میں سوانح نگاری" ۱۹۶۱ء میں رائٹرز گلڈ کی جانب سے شائع کیا تھا اور اسے داؤد ادبی انعام بھی ملا۔ جو آدم جی ایوارڈ کے بعد پہلا ایوارڈ تھا۔ ڈاکٹر شاہ علی نے اپنا مقالہ لکھنؤ یونیورسٹی میں لکھا جس میں قیام پاکستان سے قبل کی سوانح کا جائزہ لیا گیا تھا اور پاکستان میں ڈاکٹر صاحب کے ہی شاگرد نے آزادی کے بعد لکھی جانے والی سوانح عمریوں کو موضوع بحث بنایا اور یہ بات ڈاکٹر شاہ صاحب کے لئے بھی باعث مسرت ہونا چاہیے کہ جس کام کی ابتدا انہوں نے ہندوستان میں کی پاکستان میں انہی کے شاگرد نے ان کی نگرانی میں اپنا یہ مقالہ مکمل کیا۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وقار صاحب کی یہ کتاب بہت اچھی ہے اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ یہ ممتاز محقق ڈاکٹر شاہ علی صاحب کی نگرانی میں لکھی گئی۔

سوانح عمری کی بارے میں یہ کہنا کہ یہ کیوں لکھی جاتی ہے؟ کیا اس لئے کہ لوگ اپنے کارنامے بیان کریں یا اپنے گناہوں کے اعترافات لکھیں یا اس لئے کہ ہم لوگوں کو اچھی باتوں کی ترغیب ہو۔



اس کا بھی نفسیاتی تجزیہ ہونا چاہیے کہ یہ کیوں لکھی جاتی ہیں یا کیوں لکھوائی جاتی ہیں پلوٹارک سوانح کا شہزادہ کہلاتا ہے اس کا بنیادی مقصد اپنے ممدوح کا موازنہ کرنا نہیں نہ صرف کارنامے بیان کرنا ہے۔ اس نے یونانی ہونے کے ناتے یونانی پن دکھایا۔ اس طرح کہ گو وہ اپنے دور میں روم مقبوضہ یونان کا شہری تھا۔ اس نے قدیم عظیم رومن مشاہیر اور قدیم یونانی مشاہیر کو منتخب کر کے ان کے سیرتی موازنے کئے اور اس طرح بیشتر حکمران رومیوں کو بالواسطہ طور پر یاد دلایا کہ یونان نے بھی عظیم فلاسفہ کے علاوہ عظیم سپاہی، فاتح اور مدبر پیدا کئے تھے۔

تاریخ بھی بادشاہوں کی سوانح ہی ہے اس میں جا بجا خلافت راشدہ کے بعد سے جو باتیں لکھی جاری ہیں وہ نہ صرف مسلمانوں کی تاریخ بلکہ بادشاہوں کے حالات اور شاہی سوانح عمریوں ہی کی ایک شکل ہے۔ تحریک اسلام کی تاریخ نہیں ہے۔

سوانح عمری کی تاریخ اب تک کوئی قابل تعریف نہیں رہی ہمارے پاس سوانح عمری پر اعتبار کرنے کا جواز کیا ہے؟ کوئی نہیں! منطقی تجزیے ضرور کہیں نہ کہیں لے جاتے ہیں یا وقت کچھ انکشافات کر دیتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ سوانح عمری میں اصلی سیاست، اصلی شاعری، اپنے اپنے عہد کی تاریخ بن جاتی ہے۔ جوش صاحب کی آپ بیتی اور اس قسم کی آپ بیتیاں معاشرے پر منفی اثرات بھی مرتب کرتی ہیں۔ کہا جاتا ہے جوش صاحب نے اپنی آپ بیتی میں اتنے جھوٹ لکھے ہیں جس کے سبب ان کی شاعرانہ شہرت کا بھی دس فیصد حصہ متاثر ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حالی نے یادگار غالب میں ان کی شراب نوشی کا کم سے کم تذکرہ کیا ہے بلکہ چھپانے کی کوشش کی ہے وہ "اس معاملے میں" غالب کا ہمدردانہ ذکر کرتے ہیں۔ تو حالی اسی طرح حقیقت بیانی اور انصاف سے کام نہیں لیتے استاد کے "عیوب" دباتے ہیں مگر اس کا معاشرتی پہلو اچھا ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری جیسا پروگریسو آدمی جو ترقی پسند تحریک کے (بانیوں میں) بانی ہیں جب ذکر کرتے ہیں تو اپنی سنسکرت دانی کا ذکر فخریہ کرتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ میرے نانا بھی ہندو تھے جبکہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

قدرت اللہ شہاب کا "شہاب نامہ" چھپتے ہی اتنا پاپولر ہوا کہ میں جہاز میں سفر کر رہا تھا کہ لوگوں نے میرے ہاتھ چومنا شروع کر دیے کہ عالی صاحب آپ کا ذکر شہاب نامے میں ہے۔ میں نے کہا کہ ان کی مہربانی کہ انہوں نے میرا ذکر کیا۔ اس کتاب میں بہت سے لوگوں کا تذکرہ ہے۔ وہ میرے ممدوح، محسن، نیک پرہیزگار اور متقی آدمی تھے۔ ایک سو اسی صفحے کا (ان کے بارے میں) مضمون

لکھا پڑا ہے مگر حقیقت میں پیش نہیں کر سکتا۔ انہوں نے میری بڑی تعریف کی ہے مگر میں ان کی ان متضاد باتوں کو کیسے بھول جاؤں جو ایوان صدر میں گزریں، منسٹری میں گزریں جو اکثر غلط ہیں۔ (سوانح میں ذکر کر کے ان باتوں کا اثر کم کرنے کی کوشش کی ہے۔)

"زندہ رود" پچھلے پچاس برس کی عمدہ سوانح عمریوں میں سے ہے میں نے تیسری جلد کے مطالعے کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال سے کہا کہ میں نے محسوس کیا کہ اس کتاب میں شروع سے آخر تک کوئی انسانی عیب نہیں نظر آتا۔ جاوید اقبال نے علامہ اقبال کو بے عیب انسان ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے مگر بے عیب تو خدا کی ذات ہے اس کی ضد میں انکے بھائی آفتاب اقبال نے جو کچھ لکھا کہ جاوید نے یہ کیوں نہیں لکھا وہ کیوں نہیں لکھا وہ بھی سب غصے اور ضد میں لکھا۔ لیکن بہر حال وہ چند صنفی سوانحی پہلو تھے جنہیں میں دراصل انسانی پہلو کہوں گا ان کے ظاہر ہونے میں اگر واقعاتی طور پر غلط نہ ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ان سے علامہ کی توقیر کم نہیں ہوتی۔

سب سے اچھی کتاب (اس موضوع پر) ادا جعفری کی ہے۔ جس میں انہوں نے بدایوں کی پوری ثقافت بیان کر دی ہے۔

ڈاکٹر وقار گل نے تنقید کا میدان جیت لیا ہے کہ لوگ اپنے سوانح لکھ رہے ہیں یا افسانے لکھ رہے ہیں؟ ان کے والد (انور دہلوی) کے شعر کا ایک مصرعہ ہے

"عیبی عیب ہنر مند ہنر دیکھتے ہیں۔" میں وقار گل کے والد انور بھائی یعنی (انور دہلوی مرحوم) کا معتقد ایک جونیئر دوست ہوں۔

ابن انشاء پر پروفیسر ریاض احمد (جن کا تعلق فیصل آباد سے ہے) نے تحقیقی مقالہ لکھا۔ اس میں میرا ذکر اس طرح سے کیا بس جی ان کے بارے میں کیا لکھوں یہ انشاء جی کے بڑے دوست تھے۔ یہ بات اس شخص کے بارے میں لکھی جو انشاء کا پرستار رہا ہو، وہ میرا رہا ہو یا نہ ہو میں تو اس کا عاشق اور دوست تھا۔ جو اکی ہر بات سنتا ہو۔ جو اس کے سیکڑوں مادی معاملات میں معاون رہا ہو۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس حرف چند کو ایک برس تک نہ لکھ سکا اور مقالہ کو اپنے پاس لیے بیٹھا رہا۔ ایک دن فرہاد زیدی میرے پاس آئے تو میں رو پڑا اور ایک گھنٹے تک روتا رہا۔ فرہاد زیدی نے مشورہ دیا کہ آپ انشاء کے بارے میں حرف چند لکھ کر اس میں شامل ہو جایئے آپ ان کی زندگی سے یا وہ آپ کی زندگی سے نکلے نہیں ہیں۔ اور اگر نہ لکھا تو آپ اسی دائرہ جذبات میں کٹتے رہیں گے۔ میں نے کہا فرہاد صاحب میں نے پروفیسر ریاض احمد کو خود فیصل آباد سے بلایا۔



انہیں تمام سہولتیں فراہم کی تھیں پی ایچ ڈی کے لیے۔ انشاء کے دوستوں اور گھر والوں سے ملوایا اور کیا کچھ نہیں کیا اور انہوں نے اس مقالہ میں میرا یہ دو سطری تذکرہ کیا۔ یہ ان کا حق تھا اس کا برا ماننا جائز نہیں اور میری انسانی کمزوری ہے۔ لیکن دیکھیے کہ یہ بھی سوانح عمری کا ایک پہلو ہے۔ پاکستان میں سوانح نویسی بطور خاص خود بیتی یعنی جو خود لکھی جائے بڑی منافقت، جھوٹ، خود ستائی اور الزام تراشی کا پلندہ ہے۔ اب آیئے ترقی کے امکانات کی طرف کہ اس صنف کی ترقی کے کیا امکانات ہیں پاکستان میں جیسے جیسے جھوٹ کے، خود تشہیری اور الزام تراشی کے امکانات بڑھتے جائیں گے سوانح نویسی کے امکانات بھی بڑھتے جائیں گے اس کا غم نہ کیجئے۔ بے نظیر نے

"DAUGHTER OF THE EAST"

(دختر مشرق) اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ بھٹو صاحب نے ۱۹۷۱ء میں جب ڈھاکہ فال ہونے والا تھا یو این او میں کیا کارنامے انجام دیئے (آف دی ریکارڈ) کی تصدیق کہیں سے نہیں ہوتی اپنی خود ستائی یا تعریف قابل معافی تو ہے قابل تعریف نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ سنجیدہ محقق ادیب یا صحافی اس سلسلے میں کام کریں اور سوانح کو سچ کے قابل بنائیں۔ تمام سوانح لکھنے والے ممدوح کی ایسی باتوں کو ڈھکے چھپے انداز میں لکھیں کہ آنے والی نسل پر برا اثر نہ پڑے کیونکہ خاندان میں چھوٹے بڑے سب ہوتے ہیں سب سے فیس کرنا پڑتا ہے۔ یہ کام صحافیوں کا ہے کہ وہ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنے پر زور دیں حسن وقار گل نے یہ بڑا کام کر دکھایا ہے اور اب یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ میں ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن کی بات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں کہ انہوں نے کہا کہ یہ کام بار بار نہیں ہونا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ سبجیکٹ کو آبجیکٹ ہوتے رہنا چاہیے۔ شاہ صاحب پہلے آدمی ہیں جنہوں نے سوانح پر تنقید کی بنیاد ڈالی۔ ان کی کتاب بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اور سوانح کی مکمل تعریف اس میں موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر پندرہ برس بعد اس موضوع پر تجزیہ اور تحقیق کا کام ہوتے رہنا چاہیے ورنہ ہم روایتی کے روایتی ہی رہ جائیں گے۔ آج کل حالات یہ ہیں کہ آدمی پچاس برس کا نہیں ہو پاتا اور اس پر مقالہ لکھا جا رہا ہوتا ہے۔ سوانح لکھنا بہت مشکل کام ہے اور جو سوانح لکھے گئے ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے ڈاکٹر حسن وقار گل نے تجزیہ نگاری اور تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔

کیونکہ جتنا مشکل سوانح لکھنا ہوتا ہے اس سے کہیں مشکل کام اس پر تحقیق و تنقید ہے۔ جس میں موصوف آج سرخرو ہوئے اور پوری قوم بجا طور پر ان پر فخر کر سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے مقالہ

میں شعوری طور پر ہماری تہذیبی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے تحریک آزادی کی جدوجہد کرنے والے قومی ہیروز اور رہنماؤں کی تاریخ کو یکجا کرنے کا کا فریضہ انجام دیا ہے ساتھ ہی زبان و ادب کی بہت سی نئی جہتوں کی طرف اشارہ کر کے تحقیق و تنقید کا فرض بھی ادا کر دیا ہے۔

○



آفتاب احمد خان
(سابق سیکریٹری خزانہ حکومت پاکستان)
صدر انجمن ترقی اردو پاکستان

## تحفۂ دانشور

بائیوگرافی اور آٹو بائیوگرافی انگریزی ادب کی ایک ممتاز صنف ہے جسے اردو میں حالی جیسا ہمہ جہت ادیب میسر آیا جس نے اردو ادب میں اردو سوانح نگاری کو ایک صنف کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ اور حیات سعدی' یادگار غالب اور حیات جاوید جیسی معرکۃ الاراء سوانح عمریاں تحریر کر کے اردو کے سوانحی ادب میں گرانقدر اضافہ کیا۔ حالی کے بعد یہ سلسلہ قائم رہا مگر ضرورت اس بات کی تھی کہ سوانح نگاری جیسی دلچسپ صنف کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ بھی لیا جائے اور اس کی کو ڈاکٹر سید شاہ علی نے اپنے مقالہ "اردو میں سوانح نگاری" کے ذریعے پورا کیا۔ موصوف نے یہ مقالہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ۱۹۵۵ء میں مکمل کیا اور اس کی اشاعت ۱۹۶۱ء میں پاکستان میں ہوئی گو کہ اسی سال الطاف فاطمہ کا ایک مختصر مقالہ سوانح نگاری کے موضوع پر سامنے آیا جو چند سوانح عمریوں پر تبصرہ کی حد تک محدود رہا اور مذکورہ کتب کے علاوہ آزادی کے بعد سے اب تک مزید کسی نے اس طرف توجہ نہ دی حالانکہ اس دوران بے شمار سوانح عمریاں اور خودنوشت منظر عام پر آئیں' خاکہ نگاری کو بھی رواج ملا مگر سوانح نگاری کے زمرے میں تحقیق و تنقید کا میدان خالی رہا۔ اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد "ڈاکٹر شاہ علی کے ایک ہمہ صفت شاگرد ڈاکٹر حسن وقار گل کا ایک اہم کارنامہ ہے کہ جس موضوع کو مشکل سمجھ کر اہل قلم پہلو تہی کر رہے تھے اسے چیلنج سمجھ کر ڈاکٹر حسن وقار گل نے اپنی کاوشوں سے آسان بنا دیا۔"

ڈاکٹر حسن وقار گل صاحب ایک اہم علمی و ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے والد حضرت انور دہلوی مرحوم اور تایا نازش حیدری مرحوم کا شمار اردو کے صاحب طرز شعراء میں ہوتا ہے اور ڈاکٹر گل نے جس ماحول میں پرورش پائی اس کا تقاضا تھا کہ وہ بھی کوئی ایسا اہم کارنامہ انجام دیں جس سے ان کے بزرگوں کا نام مزید روشن ہو جائے اور انہوں نے پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ پی ایچ ڈی کی سطح پر اردو سوانح نگاری کے موضوع پر یہ مقالہ لکھ کر اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر وقار گل کے اس مقالہ کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا

ہوں کہ اردو ادب میں کیسی کیسی ہستیاں کیا کیا کارنامے انجام دے گئیں ان میں سے ہر شخصیت اپنا جواب آپ ہے خصوصاً "تحریک آزادی کے حوالے سے جن لوگوں نے اہم کارنامے انجام دیئے اور جو آج بھی ہماری تاریخ کا اہم باب ہیں ان کے کارنامے آج بھی منظر عام پر لانے اور نئی نسل کو ان سے روشناس کرانے کی ذمہ داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے مگر شاید ہم اپنی یہ ذمے داری پوری نہ کرسکے مگر کوئی تو ہے جس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور سیکڑوں شخصیات کے سوانح یکجا کر کے قوم کو نہ صرف ایک بصیرت افروز تحفہ پیش کیا بلکہ اردو کے سوانحی ادب میں ایک گرانقدر اضافہ بھی کیا اور پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر ایک دانشور اس سے بڑھ کر اور کیا تحفہ پیش کرسکتا ہے جو ڈاکٹر حسن وقار گل نے پیش کیا۔

مذکورہ مقالہ کے سبب کیسے کیسے تاریخی واقعات سامنے آتے ہیں اس کا اندازہ تو مقالہ پڑھ کر ہی کیا جاسکتا ہے اور ہم آج جن ہستیوں کو نظرانداز کررہے ہیں ان کے کارنامے دنیا بھر کے مسلمانوں خصوصاً "پاکستانی قوم کے لئے مشعل راہ ہیں۔ قائداعظم ہوں یا علامہ اقبال سردار عبدالرب نشتر ہوں یا چوہدری خلیق الزماں، مولانا مودودی ہوں یا مولانا عبدالحامد بدایونی، حضرت علیؒ ہوں۔ یا حضرت عثمانؓ جواہر لعل نہرو ہوں یا راجندر پرشاد، قدرت اللہ شہاب ہوں یا ابن انشاء، مولانا ظفر علی خاں ہوں یا شورش کاشمیری، شیخ عبداللہ ہوں یا میر قاسم، ابوالکلام آزاد ہوں یا راجہ صاحب محمود آباد پاکستان بنانے والی شخصیات ہوں یا پاکستان بنانے کی مخالفت کرنے والی، محقق نے ہر ہر شخصیت کے ہر ہر پہلو کا گہرا تنقیدی و تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے اور ان کی سوانح عمریوں کو یکجا کر کے ان کا تقابلی جائزہ بھی پیش کیا ہے اور بہت سی ایسی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ جس سے تحریک آزادی کے نئے پہلو اور ادب کی نئی جہتیں ہمارے سامنے آگئی ہیں۔ ڈاکٹر حسن وقار گل کا یہ کام نہ صرف اہل علم و ادب میں توقیر پائے گا بلکہ اردو کے سوانحی ادب میں ایک کارنامہ گنا جائے گا اور یہ کتاب حوالے کے لئے ایک معتبر اور منفرد کتاب قرار پائے گی۔

میں ڈاکٹر حسن وقار گل کو اس کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آفتاب احمد خاں



پروفیسر ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی
سابق پرنسپل وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج، کراچی
ریسرچ اسکالر، ہمدرد یونیورسٹی، پاکستان

## اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد

ڈاکٹر حسن وقار گل کے پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد (۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء) دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا۔ اس کے ساتوں ابواب پر میں نے نظر ڈالی اور جستہ جستہ پڑھے۔ مجھے اس میں جو نمایاں خوبیاں نظر آئیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ مصنف نے دستیاب سوانح عمریوں کو تلاش کرنے میں حتی المقدور کوئی کسر نہیں چھوڑی ان کی تلاش میں وہ ملک کے طول و عرض میں تقریباً" ہر جگہ گئے، جہاں جہاں سوانح عمریاں دستیاب ہوسکتی تھیں۔

۲۔ دستیاب ہونے والی سوانح عمریوں کا انہوں نے مطالعہ بھی کیا اور ہر سوانح عمری کو، سوانح عمری کے تسلیم شدہ معیار پر پرکھا بھی کہ وہ معیاری ہیں یا معیار سے فروتر ہیں، نامکمل ہیں یا کسی پہلو سے ناقص ہیں۔

۳۔ مقالہ انہوں نے رواں شستہ اور شگفتہ زبان میں تحریر کیا ہے۔ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لئے حتی الامکان موزوں اور محتاط الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔

ڈاکٹر وقار گل کا مقالہ اپنے موضوع پر ایک مبسوط تحقیقی جائزہ تو ہے ہی یہ سوانح عمریاں لکھنے والوں کے لئے رہنما کا مرتبہ بھی رکھتا ہے۔

پروفیسر جمیل اختر خان،
سابق صدر شعبہ و سینیر پروفیسر اردو
جامعہ کراچی

## ایک اور کامیابی

(۸ ر اگست ۱۹۹۶ء کو منعقدہ اردو سیمینار میں کی گئی تقریر سے اقتباس)

ڈاکٹر سید شاہ علی صاحب نے لکھنؤ یونیورسٹی میں اپنا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ "اردو میں سوانح نگاری" تحریر کر کے اردو سوانحی ادب میں تحقیق و تنقید کی بنیاد ڈالی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ پاکستان میں بھی پی ایچ ڈی کی سطح پر اس کام کو آگے بڑھایا جائے اور یہ ضرورت ڈاکٹر شاہ علی صاحب کی نگرانی میں ڈاکٹر حسن وقار گل نے پوری کی۔ آزادی کے بعد کا تمام سوانحی ادب جو کتابی شکل میں موجود تھا اسے تلاش و جستجو کے بعد یکجا کیا اور اس پر تحقیق و تنقید سے ایک وقیع مقالہ "اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد" تحریر کر کے جامعہ کراچی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ پچھلے پچاس برس میں پاکستان کی کسی جامعہ میں پی ایچ ڈی کی سطح پر یہ کام نہیں ہوا۔

ڈاکٹر حسن وقار گل دہلی کے ایک معزز علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے والد حضرت انور دہلوی اور تایا نازش حیدری مرحوم صاحب اسلوب شاعر تھے ڈاکٹر گل نے جس علمی و ادبی ماحول میں پرورش پائی اس کا تقاضہ تھا کہ وہ خود کوئی اہم کارنامہ انجام دیں۔

"اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد" ڈاکٹر حسن وقار گل کا ایک اہم علمی و ادبی کارنامہ ہے جو ان کی وسیع النظری ان تھک محنت، جستجو گہرا مطالعہ، طویل مشاہدہ اور تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ یہ مقالہ اردو سوانح نگاری کے زمرے میں ایک اہم مرتبہ کا حامل ہے جو مستقبل میں تحقیق و تنقید کرنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ یہ اردو کے سوانحی ادب میں ایک مستقل اضافہ ہے۔

○



پروفیسر سحر انصاری
صدر شعبۂ اردو، جامعہ کراچی

## ایک مختصر جائزہ

انسانی معاشروں میں تجربات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ تجربات خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے زندگی بسر کرنے کے معیارات فراہم کرتے ہیں۔ اسی لئے کسی فرد کی داستان حیات خواہ اس نے خود بیان کی ہو یا کسی اور نے اسے دہرایا ہو، ہمیشہ سے قابل توجہ اور دلچسپی کا باعث رہی ہے۔ رفتہ رفتہ آپ بیتی اور سوانح نگاری نے ایک فن کا درجہ حاصل کر لیا دنیا کی ہر مہذب اور ترقی یافتہ زبان میں سوانح کو ادب کا اہم حصہ سمجھا جاتا ہے۔

مسلمانوں میں تاریخ و سیر کی ایک قدیم روایت ملتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی یہ روایت قائم رہی تذکرہ نویسی، تاریخ نویسی اور یادداشتوں کے ساتھ ساتھ توزک لکھنے کا رجحان ملتا ہے۔ مغل بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے کوائف انہی ذرائع سے ہم تک پہنچے ہیں اور انہی کے توسط سے ہر عہد کی عام معاشرتی و تہذیبی خصوصیات کا بھی اندازہ ہوتا گیا۔

فارسی کی جگہ جب اردو ایک علمی ادبی زبان کے طور پر استعمال ہونے لگی تو نہ صرف فارسی کی اصناف ادب نے اس زبان میں جگہ پائی بلکہ نئے نئے اسالیب اور ایجادات و اختراعات کا دروازہ بھی کھل گیا جس کی بدولت اردو کا سرمایہ فارسی پر سبقت لے گیا۔

جہاں تک سوانح اور خود نوشت کا تعلق ہے اس امر کی روایت بھی رہی ہے کہ کوئی قصہ داستان یا کتاب شروع کرتے ہوئے حمد و نعت کے بعد مصنف اپنے کوائف بھی مختصراً بیان کرتا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی نثر سے گزر کر جب ہم خطوط غالب تک پہنچتے ہیں تو ان خطوط میں سوانحی مواد کو ایک نئے انداز سے محسوس کرنے لگتے ہیں۔

سرسید احمد خان کو بجا طور پر جدید اردو نثر کا بانی کہا جاتا ہے کیوں کہ انہوں نے تقریباً ہر شعبے میں ابتدا کر کے اپنے رفقائے کار کے لئے آئندہ کی راہ ہموار کی چنانچہ سوانح نگاری میں بھی ایک چراغ انہوں نے روشن کیا اور اپنے نانا کے بارے میں سیرت فریدیہ کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی۔

بعد میں مولانا حالی، مولانا شبلی، اور ان کے معاصرین نے اس باب میں خصوصی مقام حاصل

کیا انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے سوانحی ادب پر نظر ڈالئے تو کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے یہ بہت وقیع نظر آئے گا۔

اس زمانے میں ساری دنیا میں سوانحی ادب کو سب سے زیادہ پسند کیا جا رہا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں پہلا سبب تو یہ ہے کہ سوانح حیات اپنی ساخت میں افسانے اور ناول سے قریب ہوتی ہے اس لئے اس میں زبان و بیان کی وہ ساری خوبیاں یک جا ہو جاتی ہیں جو افسانے یا ناول کے لئے ضروری ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ واقعات خیالی یا فرضی نہیں بلکہ حقیقی اور اصلی ہوتے ہیں اس طرح پڑھنے والے کو لکھنے والے کے تجربات میں شریک ہونے ان کو ایک معیار بنانے اور ان سے کچھ سیکھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے بھی ان سوانحات کے پیچھے یہ تلقین پوشیدہ ہوتی ہے کہ اس راہ پر چلو تو کامیاب و کامران رہو گے اور کبھی خبردار کر دیا جاتا ہے کہ من نکردم شما حذر بکنید

اردو میں سوانح نگاری کے ارتقا کا جائزہ لیا جائے تو اس کے سرے مشرق اور مغرب دونوں سے جا ملتے ہیں یونان نے جس انداز سے اس فن کی بنیاد رکھی تھی اس کا ایک تسلسل مغرب کے ادب میں آج بھی پایا جاتا ہے۔ پلوٹارک نے مشاہیر یونان و روما لکھ کر نہ صرف ان مشاہیر کو زندگی عطا کر دی ہے بلکہ اپنے اسلوب کی بناء پر تاریخ ادب و سیر میں ایک خاص شرف حاصل کر لیا ہے۔ دور جدید میں اس کی اہمیت کوئی ایس ایلیٹ کے ایک مختصر تبصرے نے جس طرح اجاگر کیا ہے شاید کسی اور نے نہ کیا ہو۔ ایلیٹ کہتے ہیں کہ شیکسپیئر نے پلوٹارک کی "سوانحات" سے جو کام لیا ہے وہ کام بہت سے لوگ پورے برٹش میوزیم سے نہیں لے سکتے۔

مغربی ادب میں ڈاکٹر جانسن کی سوانح عمری جو باسویل نے لکھی تھی ایک معیار تصور کی جاتی ہے خود ہمارے یہاں جب کبھی کسی بڑے سوانح نگار کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جاتی ہے تو اس کا موازنہ باسویل سے ضرور کیا جاتا ہے۔

سوانح نگاری کے اس پس منظر میں یہ بات یقینی تھی کہ اسے پی ایچ ڈی کے تحقیقی کام کا موضوع بنایا جائے اس ضمن میں اولیت کا سہرا ڈاکٹر سید شاہ علی کے سر ہے جن کا مقالہ کتابی صورت میں شائع ہوا اور اس پر رائٹرز گلڈ کی طرف سے داؤد ادبی انعام بھی دیا گیا۔ ڈاکٹر شاہ کی "اردو میں سوانح نگاری" قیام پاکستان سے قبل تک کے سوانحی ادب کا احاطہ کرتی ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کام کو آگے بڑھایا جاتا۔

مقام مسرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ایک شاگرد وقار حسن گل نے اس ضمن میں تگ و دو



کی اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۰ء تک کے سوانحی ادب کا احاطہ کیا اور "اردو میں سوانح نگاری آزادی کے بعد" لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

ڈاکٹر حسن وقار گل دہلی کے ایک ادبی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے والد مرحوم انور دہلوی اور تایا مرحوم نازش حیدری سے کون واقف نہیں۔ یہ دونوں صاحب اسلوب شاعر خیام الہند حیدر دہلوی کے شاگرد تھے۔ حسن وقار گل میں ادبی سطح پر کام کرنے کا ایک جذبہ ہمیشہ سے رہا ہے جس کا میں خود بھی گواہ ہوں۔

ڈاکٹر حسن وقار گل کا یہ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے جس میں انہوں نے موضوعات کے اعتبار سے سوانح عمریوں کو تقسیم کر کے ان کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ ایک حصہ اردو میں علمی، ادبی اور فنی شخصیات کی سوانح عمریوں کے لئے وقف ہے۔

جب کہ دوسرے حصوں میں سیاسی سماجی تاریخی شخصیات نیز اہل فلسفہ اور مذہبی شخصیات کو شامل کیا گیا ہے۔ شخصی مرقعوں اور خاکوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

اس مقالے کا سب سے اہم باب میری نظر میں باب ہفتم ہے جس میں حسن وقار گل نے اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور اس موضوع کا فنی و تنقیدی جائزہ لکھا ہے۔ اس میں نہ صرف سوانح نگاری کے موضوع، مواد اور اسلوب سے یہ حاصل بحث کی گئی ہے بلکہ حال اور مستقبل کے امکانات کا تجزیہ کر کے اردو ادب پر اس کے مجموعی اثرات کا تعین بھی کیا گیا ہے۔

موجودہ دور میں کتاب اور تصنیف کی کسی تحقیق میں جدید ذرائع ابلاغ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر حسن وقار گل نے اس ضمن میں غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کر کے اپنے نظریات پیش کئے ہیں۔

یہ مقالہ محنت، لگن، اور تن دہی سے لکھا گیا ہے۔ اردو میں سوانح نگاری پر تحقیقی کام کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہے۔

ڈاکٹر حسن وقار گل اب وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کے شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں لیکن ان کا اصل تعلق بحیثیت طالب علم اور ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو جامعہ کراچی سے رہا ہے۔ اس لحاظ سے یہ امر میرے لئے مزید مسرت کا باعث ہے کہ وطن عزیز پاکستان کے جشن طلائی کے موقع پر ان کی یہ کتاب شعبۂ اردو جامعہ کراچی گل رنگ پبلی کیشنز کراچی کے تعاون سے شائع کر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اہل علم و ادب اس کتاب کی نہ صرف خاطر خواہ پذیرائی کریں گے بلکہ مستقبل کے سوانح نگار اور محقق اس سے رہنمائی بھی حاصل کر سکیں گے۔

## گویا دبستاں کھل گیا

ماضی گزرے ہوئے زمانہ کا نام نہیں۔ دراصل گذشتہ یادگار کامیابیوں اور ناکامیوں کی روداد ہے اور ہر دو نوع کے تجربات اہم اور قابل غور ہیں۔ اور اس لیے محفوظ کیے جاتے ہیں کہ آنے والی نسلیں ان سے اس حد تک استفادہ کریں کہ انھیں زندگی کیلئے بصیرت اور مستقبل کے لئے روشنی ملے۔ عام رویہ یہ ہے کہ کامیابیوں اور کامرانیوں کی یاد میں جشن منائے جاتے ہیں اور ناکامیوں کو فراموش کر دیا جاتا ہے حالانکہ کامیابیوں اور ناکامیوں کی مجرد طور پر کوئی اہمیت نہیں ہوتی قابل غور وہ اسباب و علل ہوتے ہیں جن کے انجام میں یہ نتائج حاصل ہوتے ہیں یہ تمام اسباب کسی فرد کی فکر، جہد اور کردار کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ ان کی نوعیت کبھی انفرادی اور وقتی ہوتی ہے اور کبھی یہ اجتماعی ہوتے ہیں اور ان کے اثرات دائمی قرار پاتے ہیں

ماضی مجموعہ ہے افراد اور ان کے کردار کا۔ ان دو عناصر میں کسی کو غیر اہم قرار دے کر بھلایا نہیں جا سکتا۔ یہ لازم و ملزوم ہیں۔ عام طور پر تاریخ کو واقعات کا مجموعہ بنا دیا جاتا ہے اس کے زیر اثر سوانح عمری کو بھی واقعات پر مشتمل قرار دیا جانے لگا ہے۔ یہ المیہ ہمارے بے مقصد نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کا ہے حقیقت میں تاریخ اور سوانح عمری کا مقصدی ہونا ضروری ہے تاکہ پڑھنے والوں میں بصیرت پیدا ہو اور دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ کونسے حالات تھے جنھوں نے واقعہ کو جنم دیا اور فرد کی فکر اور اس کا کردار کیا تھا جو اس نے ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے اختیار کیا اور اس کے عمل سے کیا نتیجہ برآمد ہوا یہی فن سوانح نگاری کا تقاضا ہے جو جزو ہے کل نہیں۔

اردو میں سوانح نگاری کی روایت بہت پرانی نہیں ہے اس کی تاریخ ایک صدی سے کچھ زیادہ عرصہ پر محیط ہے اس دوران جو سوانحی ادب منظر عام پر آیا وہ کمیت کے اعتبار سے قابل تعریف ہے لیکن کیفیت کے لحاظ سے لائق ستائش نہیں ہے اس نوع کے ادب میں وہ بھی ہیں جو واقعات کا مجموعہ ہیں اور وہ بھی ہیں جو بصیرت افروز ہیں موجودہ دور کے حالات میں کتب بینی کا رجحان برائے نام رہ گیا ہے



شعری اور افسانوی مجموعے ضرور پڑھے جاتے ہیں اگرچہ ان کا مطالعہ بھی حوصلہ افزاء نہیں اس کی وجہ ان کے متعارف ہونے کے ذرائع ہیں سوانحی ادب کو متعارف کرنے اور اس کے مطالعہ کا شوق بیدار کرنے کی سعی نہ ہونے کے برابر ہے یہ ایک اہم ضرورت تھی جس کی طرف استاد محترم ڈاکٹر سید شاہ علی نے توجہ کی اور ۱۹۵۵ء میں "اردو میں سوانح نگاری" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی کوشش اس حد تک کامیاب ہوئی کہ اس صنف ادب کے تعارف کا سلسلہ جاری ہوا۔ الطاف فاطمہ نے ایم اے کا مقالہ "اردو ادب میں فن سوانح نگاری" کا ارتقاء ۱۹۶۱ء لاہور میں اور اردو میں لکھی جانے والی آپ بیتیوں کا حاصل مطالعہ "اردو میں خودنوشت سوانح عمری" ڈاکٹر صبیحہ انور نے لکھنؤ یونیورسٹی میں پیش کیا اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ڈاکٹر ممتاز فاخرہ کا مقالہ "اردو سوانح نگاری کا ارتقاء" دہلی (انڈیا) سامنے آیا۔ تجزیے اور تنقید کے اس سلسلے سے قارئین کی خاطر خواہ رہنمائی ہوئی۔

استاد محترم ڈاکٹر سید شاہ علی کا مقالہ سوانح نگاری کے فن کے رموز سے بھی واقف کرواتا ہے اور زیر بحث ادب کے حسن و قبح کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ انھوں نے ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک کے سوانحی ادب کا عالمانہ جائزہ لیا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ چنانچہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہم نے اسی موضوع کا انتخاب کیا اور انھوں نے مقالہ جس مرحلے تک پہنچایا اس کے بعد کے مرحلوں کو طے کرنے کا ارادہ کیا۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے ہمارے مقالہ کا موضوع ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۰ء تک کا مطبوعہ سوانحی ادب قرار پایا جو سوانح عمریوں اور آپ بیتیوں کے تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ پر منحصر ہے جسے اب کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ یہ مقالہ باوجود ممکنہ کوشش کے شاید اس معیار تک نہ پہنچ سکا ہو جو محترم استاد ڈاکٹر سید شاہ علی نے قائم کیا تھا

سابق سوانحی ادب پر جو تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا اس میں شائع شدہ سوانحی ادب کا سن وار جائزہ لیا گیا لیکن موضوع کی وسعت اور اس کی ضمنی اقسام پر توجہ نہیں دی گئی تھی موضوع کی وسعت اور انواع کے لحاظ سے ہم نے حسب ذیل ابواب قائم کیے ہیں۔

باب اول میں ادوار ماقبل اور دور زیر بحث کے علمی و ادبی، تاریخی، سیاسی، مذہبی پس منظر اور رجحانات کا ذکر کیا ہے تاکہ موضوع اور مباحث کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

باب دوم میں علم و ادب اور فن سے متعلق شخصیات کی سوانح عمریوں کا جائزہ لیتے ہوئے فنی رجحانات

کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ہمارا حقیقی موضوع مستقل اور جامع سوانح عمریاں ہیں جو کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہیں۔ اس نوع کی تصانیف میں صاحب سوانح کی خدمات اور کارناموں کا جائزہ سوانحی حالات سے ہٹ کر بھی لیا جاتا ہے۔ ہم نے حالات زندگی کی جامعیت کو معیار بنا کر ایسی سوانح عمریوں کو اس باب میں شامل کیا ہے۔ ضمناً مختصر اور جزوی سوانح عمریوں پر نظر ڈالی ہے۔ ان کو بھی کئی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

ایک حصہ ان تصانیف پر مشتمل ہے جن میں مصنف کا مقصد خدمات اور کارناموں کا تنقیدی جائزہ لینا ہے اور ساتھ ہی حالات زندگی سرسری طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ انھیں ہم نے مختصر سوانح عمریاں قرار دیا ہے۔
دوسرے حصہ میں ان تصانیف کو شامل کیا ہے جن میں صاحب سوانح کے کسی محدود یا مخصوص پہلو پر داد تحقیق دی گئی ہے انہیں جزوی سوانح عمری کا نام دیا ہے۔
تیسرے حصے میں ایسی تصانیف پر نظر ڈالی ہے جن میں ایک سے زائد شخصیات کے سوانحی حالات درج ہیں ظاہر ہے کہ یہ مختصر اور سرسری نوعیت کی ہیں اس کی مثال روایتی "تذکروں" کی ہے انہیں اجتماعی سوانح عمریوں کا نام دیا ہے۔
باب سوم میں تاریخ سیاست اور معاشرے سے متعلق شخصیات کی سوانح عمریوں کا ترجیحاً جائزہ لیا ہے اور ضمناً باب دوم کی مختصر جزوی اور اجتماعی سوانح عمریوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔
باب چہارم میں سیرت النبی، بزرگان دین اور صوفیائے کرام، علماء اور اہل فلسفہ کی مستقل و جامع سوانح عمریوں کا جائزہ لے کر سوانح نگاری کے رجحانات کا پتہ چلانے کی کوشش کی ہے اس باب میں بھی ضمناً مختصر جزوی اور اجتماعی سوانح عمریاں شامل ہیں۔
باب پنجم آپ بیتیوں سے متعلق ہے اس صنف کے بارے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اکثر "آپ بیتیاں" جو "خود نوشت سوانح عمری" کہلانے کی مستحق ہیں وہی ہماری موضوع بحث بنی ہیں۔ محض "یادداشتوں" پر مشتمل "خود نوشت" جن سے سوانحی حالات کا علم نہیں ہو سکتا شامل نہیں کی گئی ہیں۔ "آپ بیتیوں" کی ایک قسم ایسی بھی منظر عام پر آئی ہے کہ "آپ بیتی" کسی اور کی ہے اور اسے تحریر کسی اور نے کیا ہے۔ یہ تعداد میں بہت کم ہیں۔ انھیں "بیانیہ آپ بیتی" قرار دے کر اس باب میں شامل کر لیا گیا ہے۔
باب ششم میں شخصی خاکے شامل ہیں۔ اردو میں بے شمار شخصی خاکے لکھے گئے ہیں ان کی بڑی تعداد



رسائل و جرائد میں محفوظ ہے۔ ہم نے انہیں کو موضوع بحث بنایا ہے جو کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ خاکہ نگاری کے مجموعے بھی کئی طریقے کے رائج ہیں۔ ایک نوعیت یہ ہے کہ ایک شخصیت کا خاکہ ایک مصنف نے لکھا ہے دوسری نوعیت یہ ہے کہ ایک شخصیت کے خاکے متعدد اہل قلم نے لکھے ہیں۔ تیسری نوعیت متعدد شخصیات پر ایک مصنف نے لکھا ہے اور چند نمونے ایسے بھی ہیں کہ متعدد شخصیات پر متعدد حضرات نے طبع آزمائی کی ہے۔ پہلی کو ہم نے انفرادی نوعیت کی خاکہ نگاری قرار دیا ہے اور باقی تینوں کی نوعیت اجتماعی ہے۔
باب ہفتم میں آزادی کے بعد سوانح نگاری کا عمومی جائزہ لیتے اور عمومی رجحانات کی نشاندہی کرتے ہوئے اردو ادب میں ان کی حیثیت اور اہمیت کا تعین کیا ہے اور مستقبل میں سوانح نگاری کی ترقی کے امکانات پر جدید ذرائع ابلاغ کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔
ان ابواب سے مقالہ کی وسعت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسمیں پاک و ہند کی تمام تصانیف آجاتی ہیں۔ ہمیں مطالعہ اور مقالہ کی ترتیب کے دوران گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مسئلہ سوانح عمریوں کی دستیابی کا تھا یہ تو ممکن نہ ہوا کہ آزادی کے بعد کا تمام سوانحی ادب فراہم ہو جاتا لیکن ہم نے زیادہ سے زیادہ تصانیف سے استفادہ کی سعی کی ہے اور خاص طور پر ان کی جانب توجہ کی ہے جو سوانح نگاری کے فن اور اس کے رموز و نکات کی واضح نمائندگی کرتی ہیں اور جو مستقبل میں لکھی جانے والی سوانح عمریوں کے لئے رہنماء ثابت ہو سکتی ہیں ایسی سوانح عمریاں بھی ہماری توجہ کی مرکز رہیں جن کے ذریعہ اس فن میں نئے رویوں کے تجربات کئے گئے۔
مقالہ کے ابواب کا تعین کرنے کے بعد سخت دشواری ان شخصیات کی سوانح عمریوں کے بارے میں پیش آئی جن کا تعلق ایک سے زائد شعبۂ زندگی سے یکساں طور پر اہم اور نمایاں رہا مثال کے طور پر علامہ اقبال کا نام لیا جا سکتا ہے۔ وہ فلسفی تھے، سیاسی رہنما تھے، احیائے اسلام کی تحریک کے لئے بھی کوشاں تھے۔ ان کی شخصیت اور کارنامے ہر اعتبار سے اہم ہیں۔ مصنفین نے سوانح عمریوں میں ایک سے زائد شعبہ ہائے زندگی سے ان کے تعلق کو نمایاں کیا۔ ہمارے لئے یہ مسئلہ بنا رہا کہ ایسی تصانیف کو کس نوعیت کی سوانح عمریوں میں جگہ دیں۔ ہم نے کتاب کے غالب موضوع کو ترجیح کی بنیاد بنایا۔ ان مشکلات پر ہم کس حد تک قابو پا سکے ہیں اس کا فیصلہ اہل نظر بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔
مترجمہ سوانح عمریاں ہمارے موضوع سے خارج ہیں اس کے باوجود چند تراجم کو شامل کر لیا گیا ہے یہ ایسی سوانح عمریاں ہیں جو سند کا درجہ رکھتی ہیں یا اس شخصیت پر اردو میں لکھا ہی نہیں گیا ہے اس کی

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سوانحی عمری کے زمرے میں دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کے رجحان کی روایت اور اس کے معیار کا بھی اندازہ ہو سکے۔

موجودہ دور میں جو سوانحی ادب منظر عام پر آیا اس کا تعلق ان تمام شخصیات سے ہے جو مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں علمی ادبی' سماجی' تاریخی' مذہبی' فنی اور سیاسی شخصیات کے حالات نہایت ذوق سے لکھے گئے ہیں ان کے لکھنے والوں کا مختلف دبستانوں سے تعلق ہے کسی نے مولانا الطاف حسین حالی کی پیروی کی۔ کسی نے مولانا شبلی نعمانی کو رہنما بنایا۔ ایسے بھی ہیں جن میں جوش عقیدت وارادت حد سے متجاوز نظر آتا ہے زیادہ تر کتابیں حصول داد تحقیق کے لئے لکھی گئیں۔ ان میں وہی کامیاب تصور ہو گی جن میں سلامت روی' انصاف پسندی' تحقیق کے ذریعہ بصیرت افروزی سے کام لیا گیا ہے۔ ہم نے اپنے مقالہ میں لکھنے والوں کے بنیادی نقطۂ نظر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کو مقصدی ادب کے پیمانے سے ناپا اور سراہا ہے۔

اس طویل اور تھکا دینے والے مرحلہ سے گزرنے کے دوران چند باتیں خصوصیت سے سامنے آئی ہیں جن کی جانب توجہ دلانا ضروری ہے۔ اکابرین کے حوالہ سے عمومی رویہ زیادہ امید افزا نہیں ہے یہ عام وتیرہ بن گیا ہے کہ اسلاف کی یاد میں دن منائے جاتے ہیں سطحی نوعیت کی تکرار ہوتی رہتی ہے جن کے یوم ہر سال منائے جاتے ہیں ان کی روداد دیکھی جائے تو ان میں یکسانیت ہی ملے گی حقیقی کام جن صفات' خصوصیات اور کارناموں کو مناسب پس منظر کے ساتھ مؤثر طریقہ سے ادا کیا جانا چاہیے نہیں ہو رہا ہے رسمی اندازی باتوں کے سوا اصلاحی اور تعمیری نقطۂ نظر کا فقدان ہے یہی کیفیت تحریری کام کی ہے وقتی جوش وجذبے سے کسی شخصیت کے بارے میں دو چار مقالے اور کتابیں منظر عام پر آتی ہیں اور چند دنوں بعد اس شخصیت کی علمی اور تحقیقی حیثیت کو بھلا دیا جاتا ہے۔

ہمارے اہل علم نے چند شخصیات کو منتخب کر لیا ہے ان کے بارے میں واقعی وقیع کام سرانجام پایا ہے ان میں قائداعظم' علامہ اقبال' اور غالب قابل ذکر ہیں ان کی حیات کا ہر گوشہ منظر عام پر لانے کی کوشش کامیاب ہوئی ہے یہ کام اعلیٰ علمی سطح پر ہوا ہے ان کی تلخیص یا اقتباسات سے ہائی اسکول اور کالج کی سطح پر پیش کرنے کی مہم کبھی نہیں چلائی گئی اس لئے ان کے ناموں سے تو سب واقف ہیں لیکن ان کی زندگیوں کے گوشوں سے مخصوص علمی حلقوں کے سوا عام سطح یا طالب علموں کی سطح پر کوئی کام نہیں ہوا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ کس عمر کے طبقہ کو سوانحی حالات کی ضرورت ہے تاکہ وہ ان سے رہنمائی حاصل کر سکیں جو ادب شائع ہوتا ہے وہ اعلیٰ معیار کا ہوتا ہے اور زیادہ پڑھے لوگ تو پہلے سے



ہی بہت کچھ جانتے ہیں۔ نوجوان طبقہ اس روشنی سے محروم رہتا ہے سرکاری سطح پر یا بڑے علمی اداروں کی سرپرستی میں یہ انتظام ضروری ہے کہ سوانح وسیرت کے بارے میں نسبتاً آسان پیرائے میں سستی کتابیں شائع ہی نہ کی جائیں بلکہ ان کو نوجوان طبقے تک پہنچانے کے مؤثر ذرائع بھی روبہ عمل لائے جائیں جشن' مذاکرے' تقاریر' اعلیٰ پیمانے کی تصانیف وہ اثر نہیں کرتیں جو اس عمل سے حاصل ہو سکتا ہے۔

سوانحی ادب کا ایک شعبہ آپ بیتی ہے۔ اردو میں نہایت کامیاب آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں اس شعبہ کا المیہ یہ ہے کہ اکابرین کی گوناگوں مصروفیات انھیں اجازت نہیں دیتیں کہ وہ اپنی یادداشتوں کو قلم بند کریں۔ اس میں ایک احتیاط یہ بھی کرنا پڑتی ہے کہ خودنمائی اور خودستائی کا عنصر شامل نہ ہونے پائے اکثر سنجیدہ مزاج حضرات اسی لئے خودنوشت لکھنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ کہیں ان پر خودستائی کا الزام نہ لگ جائے۔ اس کے باوجود اس وقت جو تصانیف مطالعہ میں آئیں ان سے نہ صرف لکھنے والوں کو سمجھنے کا موقع ملا بلکہ ان کے عہد کے بعض اہم رجحانات اور ان کے وسیلہ سے دیگر اہم شخصیات سے واقف ہونے کا موقع ملا

اس کے علاوہ خاکہ نگاری کو بھی آزادی کے بعد ہی تقویت ملی اور شخصیات کے بڑے عمدہ خاکے لکھے گے۔ جس نے ادب میں ایک نیا رجحان پیدا کیا۔

مطالعہ کے دوران وہ مقالے بھی نظر سے گزرے جو ایک خاص سانچے کو ملحوظ رکھ کر لکھے جاتے ہیں اس میں لازماً ایک باب' سیاسی' تاریخی اور ادبی پس منظر کا ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک ضروری عناصر ہے لیکن اس باب کا اصل مقالہ یا شخصیت کے حالات سے کوئی ربط نہیں ہوتا اس لئے اس کی افادیت باقی نہیں رہتی۔

اب جبکہ قیام پاکستان کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی ہے حکومت اور بڑے اداروں کا فرض تھا کہ جدوجہد آزادی کے قافلہ کے زیادہ سے زیادہ حضرات کو متعارف کروانے کی مہم شروع کی جاتی اس تاریخی موقع پر بڑی حد تک فراموش کردہ اکابرین نوابزادہ لیاقت علی خان' سردار عبدالرب نشتر' راجہ صاحب محمود آباد' مولانا حسرت موہانی' خواجہ ناظم الدین' نورالامین اور ان جیسے مخلص اور فعال رہنماؤں کی یادوں کے چراغ روشن کرکے ان کے کارناموں سے بھی نوجوان نسل کو واقف کروایا جاتا۔ کیا یہ قومی المیہ نہیں ہے کہ ان بزرگوں کی سوانح عمریاں تاحال اطمینان بخش طور پر نہیں لکھی گئی ہیں اب

اپنوں کے بارے میں ہمارا یہ رویہ ہے تو غیروں کا کیا ذکر کیا جائے۔ یہی حال علمی، ادبی اور سماجی شخصیات کے سوانحی حالات کا ہے کہ ان کے نام کبھی کبھار زبان پر آجاتے ہیں لیکن تفصیلات کو نئی نسل تک منتقل کرنے کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے۔

ہم وقت کی اس دہلیز پر کھڑے ہیں کہ اب بھی اس جانب توجہ نہ کی تو چند دنوں بعد ان اکابرین کی داستان حیات قصہ پارینہ بن جائے گی اور ان کی سیرت و کردار سے بصیرت کی جو روشنی مل سکتی ہے اس کے امکانات معدوم ہو جائیں گے۔

۱۹۹۷ء میں پاکستان کے جشن طلائی کے موقع پر۔ ریڈیو، ٹی وی، اخبارات و رسائل اس سلسلے میں خصوصی نشریات اور اشاعتی مرحلوں سے گزر رہے ہیں، اخبارات و رسائل تو روایتی انداز میں علم و ادب اور آزادی کے زعماء کے بارے میں تعارفی مواد چھاپ کر خود کو بری الذمہ سمجھ لیتے ہیں مگر ریڈیو اور ٹی وی جو عوام خصوصاً نوجوان نسل کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ان معاملات سے غافل ہیں اور سوائے ناچ گانوں اور چند مخصوص ڈراموں کے کوئی ایسا قابل ذکر پروگرام پیش نہیں کیا جا رہا۔ اس سلسلے میں حکومت نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ مقام افسوس ہے کہ اس مبارک سال میں بھی قومی سیاست داں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں اور مذہب و ملت کے مفادات کو بھول کر ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال رہے ہیں قرضہ پر قرضہ لے کر ملک کو مزید مقروض کر رہے ہیں قومی مفادات کے ادارے فروخت کر کے حکومتی اخراجات پورے کئے جا رہے ہیں۔ عوام مہنگائی کے بوجھ تلے کچلے جا رہے ہیں مگر عوام کے مسائل پر کوئی توجہ نہیں دے رہا۔ آئین (پارلیمنٹ) و عدلیہ کی جنگ نے جگ ہنسائی کا سامان فراہم کر دیا مگر کسی نے بھی آئین کی شق الف ۲۵۱ ب پر کوئی توجہ نہ دی جس کے تحت ۱۹۸۸ء میں پورے ملک میں عملاً "اردو کا نفاذ ہونا لازمی تھا۔ از خود نوٹس لینے والی عدالت عظمیٰ نے بھی آئین کی اس شق پر اب تک کوئی توجہ نہ دی اور نہ ہی حکومت نے اس جانب توجہ دی۔ کاش پاکستان کے عوام سے محبت کے دعویدار وہ سیاست داں جو آئین کی آٹھویں، نویں، دسویں، گیارہویں اور بارھویں تیرھویں ترمیمات کے قائم رہنے اور نہ رہنے کی جنگ لڑ رہے ہیں قومی مفاد کی آئینی شق A۔ ۲۵۱ پر بھی توجہ کر سکیں۔

ان گزارشات کے ساتھ قارئین کی خدمت میں اپنے مقالہ "اردو سوانح نگاری" آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء ہم پیش کر رہے ہیں اسے پاکستان کی گولڈن جوبلی کے تحفہ کے طور پر قبول کیا جائے اس کے ذریعہ بالواسطہ طور پر آپ بہت سی شخصیات سے واقف ہو جائیں گے ساتھ ہی سطور بالا میں جن



امور کا اظہار کیا گیا ہے ان پر سنجیدگی سے غور فرما کر تعمیری لائحہ عمل مرتب کریں۔

آخر میں اپنے مقالے کی تیاری اور کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں بھی چند معروضات کے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اس مقالے کی تیاری میں استاد محترم ڈاکٹر سید شاہ علی صاحب کی خصوصی رہنمائی اور شفقت و محبت نے میری بہت سی مشکلات کو آسان بنا دیا ان کا حقیقی تعاون ہمیشہ مجھے یاد رہے گا۔ اس سلسلے میں کتابوں کی فراہمی نہایت مشکل عمل تھا خصوصاً "بھارت میں شائع ہونے والی کتب جن کی فراہمی میں استاد محترم پروفیسر شفقت رضوی صاحب اور محترم ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری صاحب کے ذاتی کتب خانے میرے بہت کام آئے اور شفقت صاحب کے توسط سے ایوان اردو اور بہادر یار جنگ اکیڈمی کی کتابیں بھی میرے بہت کام آئیں اس سلسلے میں شفقت رضوی صاحب، ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری صاحب اور خواجہ حمید الدین شاہد صاحب کا خصوصی طور پر شکر گزار ہوں اس سلسلے میں مزید جن کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا ان میں غالب لائبریری ناظم آباد کراچی، لیاقت میموریل لائبریری کراچی، انجمن ترقی اردو کراچی، بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی، ایوان اردو کراچی، ڈاکٹر محمود حسین یادگاری کتب خانہ (مرکزی کتب خانہ) جامعہ کراچی، پنجاب پبلک لائبریری لاہور، اورینٹل کالج (جامعہ پنجاب) لائبریری لاہور، گورنمنٹ کالج لاہور، کتب خانہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، بلوچستان یونیورسٹی لائبریری کوئٹہ، آرمی اسٹیشن ہیڈ کوارٹرز لائبریری کوئٹہ کینٹ اور نیشنل لائبریری اسلام آباد کا بھرپور تعاون مجھے حاصل رہا جس کے لئے میں مذکورہ تمام کتب خانوں سے متعلق تمام شخصیات کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کے علمی و عملی تعاون سے میرے مقالے کی تکمیل ہو سکی۔

میرا یہ مقالہ ممتحن حضرات کے پاس، لاہور اور لندن بھیجا گیا پی ایچ ڈی کی ڈگری ملنے کے بعد میری لاہور میں اپنے دوسرے ممتحن محترم ڈاکٹر وحید قریشی سے ملاقات ہوئی انہوں نے مقالے کی اشاعت کے سلسلے میں خصوصی مشورے دیئے جس پر میں عمل بھی کر رہا ہوں، ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی علیگ نے بھی میرا زبانی امتحان لیا۔ ان کا مشورہ بھی شامل اشاعت ہے۔ اس کی اشاعت کے سلسلے میں ممتاز محقق مشفق خواجہ صاحب سے بھی مشورہ کیا اور ان کی محبت و شفقت اور ان کے رہنما اصولوں نے کتاب کی اشاعت میرے لئے آسان بنا دی موصوف نے مقالہ کا مطالعہ کرنے کے بعد مقالہ کی اشاعت کے سلسلے میں میری بڑی ہمت بندھائی جس کے لئے میں خصوصی طور پر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس مقالے کی تکمیل میں میری مشکلات کو کم کرنے میں حد سے زیادہ تعاون

(انتظامی) سابق صدر شعبہ اردو جامعہ کراچی استاد محترم ڈاکٹر یونس حسنی نے کیا اور یہ تعاون میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ اس سلسلے میں سابق ڈین کلیہ فنون ڈاکٹر کلیم الرحمٰن کا انتظامی تعاون مجھے حاصل رہا جس کے لئے میں ان کا بھی شکر گزار ہوں۔ اس مقالے کی اشاعت کے سلسلے میں سابق صدر شعبۂ اردو اور سینئر پروفیسر شعبۂ اردو (موجودہ) استاد محترم پروفیسر جمیل اختر خاں صاحب کی شفقت و محبت اور مشورے میرے بہت کام آئے اور ان کی محبت و شفقت کا نتیجہ یہ ہے انہوں نے اردو سیمینار میں کی گئی اپنی تقریر کے اقتباسات کو شامل کتاب کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں یونی کیرینز انٹرنیشنل پاکستان (جامعہ کراچی سے فارغ التحصیل ممتاز طلبہ کی تنظیم) کے صدر محترم مسعود نقوی بھائی اور بھائی اظہر عباس ہاشمی' ڈاکٹر نیر عزیز مسعودی صاحب کے مشورے اور خصوصی تعاون بھی مجھے حاصل ہے۔ صدر انجمن ترقی اردو و سابق وفاقی سکریٹری جناب آفتاب احمد خاں نے مقالہ کا مطالعہ فرمایا اور مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنی رائے بھی عطا کی جسے مقالے میں مضمون کی صورت میں شامل کیا جا رہا ہے اس مقالے کی اشاعت تو انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے ہونا تھی جس کا اظہار دوران تحقیق مقالہ ممتاز شاعر و معتمد انجمن ترقی اردو سینیٹر جمیل الدین عالی صاحب نے کئی بار کیا اور ۸ اگست ۱۹۹۶ء کو ہونے والے اردو سیمینار میں بھی یہ تذکرہ کیا مگر اس پر عمل در آمد کے لئے کئی سال لگ سکتے تھے کیونکہ انجمن کے پاس سلسلے وار پہلے ہی سے کئی کتابوں کی اشاعت کا کام موجود ہے۔

جبکہ اس مقالہ کی اشاعت موضوع کے اعتبار سے پاکستان کے جشن طلائی کے موقع پر ہونا چاہئے تھی اور اس سلسلے میں صدر شعبۂ اردو جامعہ کراچی اور معروف نقاد پروفیسر سحر انصاری صاحب سے رابطہ کیا تو انہوں نے شعبۂ اردو کی جانب سے جشن طلائی کے موقع پر اس مقالہ کی اشاعت کو نیک شگون قرار دیتے ہوئے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا جس کے لئے انہیں گل رنگ ہیلی کیشنز کراچی اور یونی کیرینز انٹرنیشنل پاکستان کا خصوصی تعاون بھی حاصل ہے اس سلسلے میں برادر محترم پروفیسر سحر انصاری صاحب کا میں بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ ان کا یہ عملی تعاون بھی مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ میرے پیش رو بزرگ وائس پرنسپل و سابق صدر شعبہ اردو وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج پروفیسر آفتاب زبیری صاحب علیگ کے پر خلوص مشورے دوران تحقیق بھی میرے کام آئے اور آج بھی ان کا خلوص و محبت میری رہنمائی کا باعث ہے۔

مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں چند اور محبت کرنے والی ہستیوں کا ذکر ضروری ہے جن میں ادارہ



یادگار غالب کے مرزا ظفر الحسن مرحوم جو ہر ملاقات میں مجھ سے پوچھتے ضرور تھے میاں کیا اور کتنا کام کر لیا' یا میرے سینئر اور محترم دوست برادر محترم ڈاکٹر معین الدین عقیل جو آجکل جاپان میں ہیں انہوں نے بھی مجھے اس سلسلے میں بہت ٹوکا۔ استاد محترم ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر کشفی بھی میرے محبت بھرے ان ٹوکنے والوں میں سے ہیں جن کی محبت آج یہ رنگ لائی کہ میں سب کے سامنے سرخرو ہوا۔

اس سلسلے میں آج مجھے اپنے مرحوم والدین حضرت انور دہلوی اور بیگم انیس انور دہلوی اور مرحوم بھائی محمد اسرار الحسن (اچھے میاں) بہت یاد آئے کاش آج یہ بھی میری خوشیوں میں شریک ہوتے مگر مجھے یقین ہے کہ ان کی ارواح میری خوشیوں میں ضرور شامل حال ہے میرے بڑے بھائی پروفیسر اظہار الحسن حیدری صاحب محمد انصار الحسن صاحب اور بڑی بہن ثریا محمود خانم کی دعائیں بھی میرے شامل رہیں۔ لیکن ایک ہستی ایسی بھی ہے جس کی وابستگی تو فوج سے ہے مگر تعلق خانوادہ شبلی نعمانی یعنی اعظم گڈھ سے ہے وہ ہیں میری شریک حیات کرنل شاہ جہاں وقار گل' قدم قدم پہ مجھے ان کا تعاون بھی حاصل رہا اور باوجود بے حد مصروفیات کے انہوں نے ایسا ماحول فراہم کیا کہ میں نہ صرف اپنے مقالہ کی تکمیل کر سکا بلکہ اسے کتابی صورت دینے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

آخر میں خدائے رب العزت کے حضور عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے شکر گزار ہوں کہ جس نے مجھ حقیر پر تقصیر کو یہ حوصلہ بخشا کہ میں اپنے اس مقالے کی نہ صرف تکمیل کر سکا بلکہ اہل علم و دانش اور پوری قوم کے لئے کتابی شکل میں تحفہ جشن طلائی پاکستان پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر حسن وقار گل
ایم اے (جرنلزم) ایم اے (اردو ادبیات)
ایل ایل بی ' ڈی ایل ایس' پی ایچ ڈی
صدر شعبۂ اردو
وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج
گلشن اقبال۔ شاہراہ جامعہ کراچی' پاکستان

# باب اول

## علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، مذہبی و لسانی

## پس منظر اور رجحانات

(۱)

ملکوں کی تقسیم قوموں کے حوالے سے اور قوموں کی شناخت ان کی تہذیب' ثقافت' مذہب' زبان وادب اور ان سیاسی محرکات واعمال سے ہوتی ہے جو انہیں ایک معاشرتی زندگی عطا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ برصغیر پاک وہند کی تقسیم میں بھی یہی محرکات کار فرما تھے اور اس میں شک نہیں کہ برصغیر پاک وہند کی تقسیم کی یہ تحریک' مذہبی وثقافتی اقدار و دو قومی نظریات اور سیاسی اختلافات کی بنیاد پر پروان چڑھی لیکن جس امر نے اسے سب سے زیادہ تقویت بخشی اور کامیابی کی منزل سے ہمکنار کیا وہ اردو زبان کے تحفظ وبقا کا مسئلہ اور اس کو نامانوس وملت کش اثرات کے بحران سے مصئون و مامون کے درجے تک پہنچانے کی خواہش کا ردعمل اور اردو زبان وادب کے تحفظ کا بے پناہ جذبہ تھا۔ جو برصغیر کے ہر حصے میں پایا جاتا تھا باوجود اس کے کہ یہ زبان عوام وخواص کی ہر دلعزیز زبان تھی' حکومت وقت کی بے اعتنائی اور ایک بڑے طبقے کی کھلم کھلا سیاسی مخالفت کے باعث مظلوم اور یتیم سمجھی جانے لگی تھی۔ تقسیم کے بعد اسے پنپنے اور ترقی کرنے کے بھرپور مواقع میسر آئے۔ مملکت خداداد پاکستان میں تو اسے قومی زبان کی حیثیت حاصل ہوئی جبکہ بھارت میں بھی اب اسے ہندی کے مقابلے میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جانے لگا ہے۔

ہم آزاد قوم ہونے کے باوجود ذہنی طور پر خود کو ابھی تک غلامی کی زنجیر سے جکڑے ہوئے ہیں جس کے خطرناک نتائج ہماری تعلیم' تہذیب وثقافت اور زبان وادب پر پڑ رہے ہیں۔ بالخصوص زبان کے معاملے میں ابھی تک ہم احساس کمتری کا شکار ہیں چنانچہ اردو کو اپنانے اور اس کی مقبولیت وافادیت کو تسلیم کرنے میں بھی یہی چیز ہماری راہ میں حائل ہے۔

اردو کی ساخت اور تدوین کا جہاں تک تعلق ہے اس کی نوعیت اور اس کے ارتقا پر نظر ڈالنے سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زبان کی تشکیل بعض ناگزیر حالات اور سماجی معاشرتی وعمرانی عوامل اور ردعمل کے تحت ہوئی اور ان اثرات کے نتیجے میں قدیم وعصری زبانوں کے بے شمار الفاظ ومحاورات اس زبان میں شامل ہوئے جن کو نہ تو نقد واحتساب کی کسوٹی پر جانچا گیا اور نہ ہی ان کے اصل متن' مطالب ومعانی کا تعین کیا جاسکا۔ دراصل اس کی توقع ہی نہ تھی کہ زبان اور اسالیب زبان اور صرف ونحو کے متعلق صحیح قواعد وضوابط مرتب کئے جائیں گے۔ سیاسی حالات نے مسلمان بادشاہوں' نوابوں اور امراء کو اردو کی سرپرستی پر مجبور کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فارسی کے زیر اثر اردو کا شعری سرمایہ' غزل' قصیدہ' رباعی' مثنوی اور نظم کی شکل میں

تیزی سے آگے بڑھتا رہا لیکن زبان کی ساخت اور تعمیر و تیکنیک کی طرف بہت کم لوگ متوجہ ہوئے۔ یہاں تک کہ اردو نثر بھی اس شاعری کا ساتھ نہ دے سکی اور مدتوں بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے برصغیر میں اپنے قدم جمائے اور وہاں کی زبانوں اور تہذیب و ثقافت سے واقفیت اپنے لئے ضروری سمجھی تو انگریزوں کی سرپرستی اور کوششوں سے اردو زبان کو ایک علمی زبان بنانے کی داغ بیل پڑی۔

حقیقت یہ ہے کہ میر امن سے سرسید تک پہنچتے پہنچتے اردو زبان کی ساخت اور اس کے اسالیب میں ایک پختگی آچکی تھی اور سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کار نے اردو زبان و ادب کو مزید اس قابل بنا دیا کہ اس میں ہر موضوع پر طبع آزمائی کی جاسکے چنانچہ حالی' شبلی' نذیر احمد' محمد حسین آزاد' اور ان کے بعد عبدالحلیم شرر' نواب محسن الملک' نواب وقار الملک' مولوی ذکاء اللہ' مہدی افادی' وحید الدین سلیم' سید سلیمان ندوی' عبدالماجد دریا بادی' مرزا فرحت اللہ بیگ' سجاد حیدر یلدرم اور ایسے ہی نامور لکھنے والے سامنے آئے تو ان موضوعات پر بھی قلم اٹھایا جانے لگا جن پر اب تک دوسری زبانوں کی اجارہ داری تھی' خصوصاً "مغربی ادب سے بہت سی چیزیں اردو ادب میں در آئیں۔ مثلاً" (Biography) اور (Autobiography) جو انگریزی ادب کی ایک مستقل صنف سمجھی جاتی تھی۔ حالی کی کاوشوں سے اردو ادب کی ایک اہم صنف بن گئی۔

(۲)

۱۹۴۷ء برصغیر جنوبی ایشیا کی تاریخ میں ایک حد فاصل ہے جس کے ایک طرف بہیمیت اور غلامی' جبر اور لاچاری' حقوق طلبی اور قتل عام' حق اور باطل' زندہ رہنے کی خواہش اور موت سے ہمکنار کرنے کی سامراجی چال رہی گویا اجالے اور اندھیرے کے درمیان وہ جنگ جاری تھی جس کی ابتدا الوہیت اور اہلبیت سے ہوئی تھی۔ دوسری طرف آزادی کے بعد کی صورت حال ہے جس میں آزادی اور آسودگی کے باوجود تہذیبی اور ثقافتی صورتحال کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں رہی۔

تاریخ شاہد ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کو بیک وقت دوستوں اور دشمنوں سے لڑنا پڑا۔ دشمن سے لڑنا آسان ہوتا ہے کہ اس کے حملے کے رخ اور طاقت کا اندازہ کرکے دفاعی یا جارحانہ منصوبہ بندی کی جاسکتی ہے لیکن دوستوں سے لڑنا مشکل ہوتا ہے وہ دوست جن کی آستینوں میں خنجر چھپے ہوں اور جن کے ہاتھ میں نشتر کھلا ہو ان دوستوں میں ایسے بھی تھے جن کے ساتھ خون' نسل اور ایمان کے رشتے تھے اور وہ بھی جو اکثریت کے باوجود اقلیتی قوم سے خائف تھے' کیونکہ اکثریت نے صدیاں غلامی میں گزاری تھیں۔ ان میں جنگجویانہ صلاحیتیں تھیں نہ جارحیت کا حوصلہ تھا اسی لئے سازش ان کا شیوہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد



مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہوگیا۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت تمام اقوام نے کی' مورد الزام مسلمان ٹھہرے ان کے خلاف انگریزوں کے جذبۂ انتقام نے ہندوستان کی سرزمین کو خون سے رنگ دیا۔ دہلی کے گلی کوچے قتل گاہ بنے۔ ہر درخت کی شاخ پر لٹکتی لاشیں تمدن اقوام مغرب کی ننگی جارحیت اور ظلم کی داستانیں سناتی تھیں۔ انگریزوں کو اکثریتی قوم کی حمایت اور تائید حاصل تھی۔ انگریز اور اکثریتی قوم ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے۔ اکثریتی قوم کی وفاداری اور یاری نے انگریزوں سے ہر قسم کی مراعات حاصل کیں۔ سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے۔ ان کی مالی حالت ہمیشہ سے اچھی تھی۔ پہلی جنگ آزادی کے دوران انہیں کوئی نقصان نہیں اٹھانا پڑا۔ مالی وسائل کی وجہ سے ان میں حصول تعلیم کا رجحان رہا وہ تجارت پر حاوی' تعلیم میں ماہر' سرکاری ملازمتوں کے لئے نوازشات کے سزاوار رہے ایسی صورتحال سامنے آئی کہ مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ سرکاری سطح پر جو حال تھا کہ اس کی گواہی انگریز مورخ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر (W.W.Hunter) اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" (Our Indian Muslims) میں ان الفاظ میں دیتا ہے۔

"ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا۔ اب مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب ایک اور سات ہے۔ ہندوؤں اور یورپین کا تناسب ایک اور دو کا ہے۔ مسلمانوں اور یورپین کا تناسب ایک اور چودہ کا۔ تمام نظام حکومت میں اس قوم کا یہ تناسب ہے جبکہ ایک صدی پہلے ساری حکومت پر اجارہ داری تھی۔ پریذیڈنسی شہر کے دفتر میں معمولی ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً" معدوم ہے۔ سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید نہیں رکھتے کہ قلی' چپراسی' دواتوں میں سیاہی ڈالنے والے یا قلموں کو ٹھیک کرنے والے کے سوا کوئی اور ملازمت حاصل کرسکیں۔"(۱)

اس صورتحال میں سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی کوششیں قابل ستائش ہیں جنہوں نے حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے مسلمانوں میں بیداری کی لہر دوڑا دی۔ اسلام کے احیاء کے ساتھ کوششیں شروع کی گئیں کہ مسلمان تعلیم اور ہنر سے آراستہ ہوں۔ میدان سیاست میں کارہائے نمایاں انجام دینے سے قبل اپنی معاشی اور معاشرتی حالت کو درست کریں' مصلحتاً" انگریز دشمنی کے اظہار سے گریز کریں۔ اسی باعث اپنے سر "انگریز پرستی" کا الزام لینا بھی قبول کیا۔ اگرچہ اکثریتی قوم کہیں زیادہ انگریز پرست تھی۔ اس نے ایک انگریز "ہیوم" کی سرکردگی میں انڈین نیشنل کانگریس ۱۸۸۴ء میں قائم کی جس کے اغراض و مقاصد (Creed) میں

پہلی شق "تاج برطانیہ سے وفاداری" تھی۔ کانگریس کے دوسرے سالانہ اجلاس، منعقدہ کلکتہ ۱۸۸۶ء کے صدر دادا بھائی نوروجی نے اس شق کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

"ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ وفاداری ہماری ریڑھ کی ہڈی تک سرایت کی ہوئی ہے" (۲)

ان ہی "وفاداروں" کی تاریخ آج "حریت پسندوں" کی تاریخ بتائی جاتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہر دور میں "ہندوستان ہندوؤں کے لئے" (۳) کے نعرے لگائے جاتے رہے۔ "دیو سماج" (۴) (۱۸۸۲ء) نامی تنظیم لاہور میں قائم ہوئی۔ دیانند سرسوتی نے ۱۸۷۵ء میں "آریہ سماج" (۵) کی تحریک شروع کی کلکتہ کے پروہت رام کرشن نے "رام کرشن" (۶) مشن شروع کیا ان سب کا مقصد ہندوؤں میں احساس برتری پیدا کر کے مسلمانوں کے خلاف انہیں صف آرا کرنا تھا۔ یہ سلسلہ ایک صدی جاری رہا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر حفیظ الرحمان صدیقی لکھتے ہیں کہ

"ہندوؤں نے انگریزی حکومت کے سائے میں مسلمانوں کے خلاف کیے بعد دیگرے متعدد اقدامات کئے مسلمانوں کے خلاف اپنے آپ کو منظم کیا۔ گاؤ کشی کے تحفظ کے لئے انجمن بنائی۔ عین نماز کے اوقات میں مسجد کے آگے کھڑے ہو کر باجے بجانے کی پالیسی پر کاربند رہے۔ مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لئے شدھی کی مہم شروع کی۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف ہندو جارحیت کے لئے تیار کرنے کی غرض سے سنگھٹن نام کی مسلح تنظیم بنائی۔ آنحضرتؐ اور دیگر دینی شخصیات کے خلاف دل آزار کتابیں شائع کی گئیں اور کالی دیوی کے نام پر ہر سال مسلح جلوس نکالنے کی طرح ڈالی، مسلم کش فسادات، کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ سب کچھ صرف ہندو مذہب کے نام پر نہیں بلکہ ہندو قوم پرستی کے نام پر کیا جانے لگا۔" (۷)

انگریزوں نے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے ریاستی جبر کے ساتھ ساتھ عیسائی مشنری کو فعال بنایا جس نے غربت سے فائدہ اٹھا کر عورتوں اور کم سن بچوں کو مشنری میں پناہ دے کر عیسائی مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا۔

مسلمانوں کے خلاف معاشرتی، سیاسی، سماجی، لسانی غرض تمام شعبہ ہائے زندگی میں محاذ کھولے گئے۔ اردو کے خلاف ہندی کو روشناس کروایا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک قوم ہونے کے لئے جن اقدار کی ضرورت ہوتی ہے، مفقود تھے ان کے مذہب جداگانہ، رسم و رواج جداگانہ، رہن سہن کا طریقہ جداگانہ، لباس چال ڈھال، انداز گفتگو، آداب محفل، طرز فکر اور طرز عمل سب جدا تھے، قدر مشترک اگر تھی تو صرف یہ کہ وہ ایک سرزمین پر رہتے تھے اور ایک زبان (اردو) بولتے تھے۔



صدیوں کی یکجائی سے اردو زبان نے دو اقوام میں رواج پایا تھا۔ انگریزوں نے اپنی روایتی چالبازی سے اردو کے مقابلہ میں ایک مصنوعی زبان "ہندی" کو لا کھڑا کیا تاکہ یہ قدر مشترک بھی باقی نہ رہے۔ ہندی زبان کی اصلیت کے بارے میں انگریز اور ہندو مورخین متفق ہیں کہ یہ کبھی عام طور پر بولی جانے والی زبان نہیں رہی تھی۔ آر ڈبلیو فریزر "اے لٹریری ہسٹری آف انڈیا" (A literary History Of India) میں لکھتا ہے۔

"ہندی صرف ایک کتابی زبان ہے جو انگریزوں کے زیر اثر وجود میں آئی انہوں نے مقامی مصنفین کو ورغلایا کہ وہ "ہندوستانی" انداز کی ایسی کتابیں تحریر کریں جن میں عربی یا فارسی کی جگہ سنسکرت استعمال ہو۔" (۸)

اس امر کی شہادت ڈاکٹر تارا چند نے دی ہے۔

"جدید ہندی ایک نامعلوم زبان تھی۔ اس کا ادب موجود نہ تھا۔ ادبی مقاصد کے لئے پہلے پہل فورٹ ولیم کالج میں اس زبان کا استعمال شروع ہوا۔ کالج کے اساتذہ نے للو لال جی اور دوسرے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی کہ وہ بھی اردو مصنفین کی طرح تصنیف اور تالیف کا کام اسی زبان میں کریں جس میں عربی اور فارسی الفاظ کی جگہ سنسکرت کے الفاظ استعمال ہوں۔ (۹)

اس بیان کے مطابق ڈاکٹر تارا چند کے وقت ہندی کی عمر صرف ۱۳۵ سال تھی۔ (۱۰)

پنڈت کشن پرشاد کول نے ڈاکٹر تارا چند کے بیان کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اٹھارویں صدی کے آخر میں انگریزی حکومت کی مصلحتوں نے فورٹ ولیم کالج میں پہلے پہل ہندی کی بنیاد اس طرح ڈلوائی کہ للو لال جی سے ایک کتاب "پریم ساگر" کے نام سے ایسی ہندی زبان میں لکھوائی جس کا تعلق اردو سے تھا نہ برج بھاشا سے۔ (۱۱)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدائی زمانہ میں بہی خواہان اردو کو قواعد زبان اور صرف و نحوی اصول کے مبادیات متعین کرنے، املا اور تلفظ کی بحث اٹھانے، علم اللسان کے اصولوں کے مطابق زبان کو ڈھالنے اور دوسری زبانوں سے اس کے رشتے واضح کرنے کی جانب توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا ہمیشہ زبان کے بجائے اصناف شاعری پر توجہ دی گئی۔ اس مخصوص اور سائنٹیفک انداز میں فورٹ ولیم کالج نے اہم اقدامات کئے۔ جدید نثر کی ترویج، لغات کی تدوین اور قواعد کے منضبط کرنے میں کارپردازان کالج نے اہم حصہ لیا۔ جدید نثر کی ترویج سے اسالیب کے نئے امکانات پیدا ہوئے۔ زبان اور ادب میں وسعت آئی۔ فورٹ ولیم کالج کے علاوہ دہلی کالج، انجمن پنجاب، انجینئرنگ کالج رڑکی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں ان کے ذریعہ مغربی علوم کی اردو میں

منتقلی سے اہل دانش وبینش کے ذہن کے نئے نئے دریچے وا ہوئے بالواسطہ طور پر ہی سہی مغربی علوم اور ادبیات سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم ہوئے۔ برصغیر میں انگریزوں کی حکمرانی کی تاریخ "دو عملی" اور "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ انہوں نے جہاں اردو زبان وادب کی سرپرستی کی وہیں اس کے مقابل ہندی کو لے آئے اور ہندوؤں کے ذریعہ اسے بھی ادبی مقام حاصل کرنے میں مدد دی۔ ہندی کو آگے بڑھانے کی کوشش تھی کہ ۱۸۷۱ء میں بہار کے گورنر سرجی کیمبل نے اس صوبہ میں اردو کی جگہ ہندی کو نافذ کیا۔ شہ پا کر ہندوؤں نے تعلیمی کمیشن پر زور دیا کہ اردو کو تعلیمی معاملات سے بالکل بے دخل کر دیا جائے۔ پنجاب اور سرحد سے بھی ایسی درخواستیں بھجوائی گئیں۔

"سر انتھونی میکڈانل ہندو اور ہندی کا بڑا خیر خواہ تھا۔ اس نے بنگال کی گورنری کے دوران وہاں اردو کی جگہ بنگالی رائج کی۔ یوپی کا گورنر بنا تو تعصب اور اردو دشمنی کو ہوا دینے لگا۔ ہندو اس کے اشاروں پر ہندی کے نفاذ کے لئے آواز اٹھاتے رہے۔ انہیں ۱۹۰۰ء میں اس وقت کامیابی ہوئی جب سر انتھونی میکڈانل نے ایک حکم کے ذریعے ہندی کو اردو کے مساوی درجہ دے کر دفاتر اور عدالتوں میں اسے رائج کر دیا۔" (۱۲)

سرسید نے اردو دشمنی کے رجحان کا مقابلہ کرنے کے لئے ۱۸۷۳ء میں "مجلس تحفظ اردو" قائم کی تھی۔ دن بدن سیاسی، مذہبی، سماجی اور لسانی بعد میں اضافہ ہوتا گیا حال کے بطن سے جنم لینے والے مستقبل پر صاحبان بصیرت کی نگاہیں رہتی ہیں۔ سرسید اور ان کے رفقاء میں ایسی ہی بصیرت تھی چنانچہ سرسید کی بصیرت نے بنارس کے کمشنر شیکسپیئر کے سامنے یہ کہلوا دیا کہ

"اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل لگا کر شریک نہ ہو سکیں گی، ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے، جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔" (۱۳)

مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے رسالہ "مہذب" کی ۲۳ر اگست ۱۸۹۰ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ "وقت ایسا آگیا ہے کہ ایک قوم دوسرے کے جذبات کو مجروح کئے بغیر مذہبی فرائض بھی انجام نہیں دے سکتی۔ جب حالات اس درجے کو پہنچ گئے ہیں تو بہتر ہے کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمان علاقوں میں تقسیم کر کے آبادی کا تبادلہ کر دیا جائے۔" (۱۴)

انہی حالات کے تسلسل میں لارڈ کرزن کے زمانہ میں بنگال کی تقسیم ہوئی یہ اس وقت رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ تھا اس کا رقبہ ۲ لاکھ مربع میل اور آبادی تقریباً ۸ کروڑ



تھی۔ تقسیم کی وجوہ انتظامی اور معاشی تھیں۔ اس کی وسعت اور آبادی انتظامی معاملات میں دشواری کے سبب تھے۔ معاشی طور پر مشرقی علاقہ مفلوک الحال اور پس ماندہ تھا۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس کے برخلاف مغربی علاقہ میں خوشحال ہندو رہتے تھے جن کے ماتحت پورے صوبے کی زراعت، تجارت اور صنعت تھی۔ دوسرے الفاظ میں مغربی حصہ استحصالی سرمایہ داروں کا تھا جبکہ مشرقی حصے کے رہنے والے ان کے آہنی شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ ۲۰ جولائی ۱۹۰۵ء کو تقسیم بنگال کا اعلان ہوتے ہی ہندو سیاست نے احتجاج شروع کر دیا اور تقسیم کو بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے کے مترادف قرار دیا۔ حالانکہ حقیقت میں وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ان کے چنگل سے نکل جائیں اور انگریز حکمران اس ترقی یافتہ علاقہ کو ان کی سطح پر لے آئیں۔ احتجاج کے نتیجہ میں تقسیم کا حکم منسوخ ہو گیا۔ اس وقت مسلمانوں کو سوچنا پڑا کہ جب سیاسی احتجاج کے ذریعے ہی بات منوائی جا سکتی ہے تو سیاست سے بے تعلقی مناسب نہیں چنانچہ نواب محسن الملک نے مسٹر بولڈ کو اپنے خط مورخہ ۱۸ اگست ۱۹۰۶ء میں تحریر کیا کہ

"میں دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کے جذبات میں اب تبدیلی آچکی ہے۔ مجھے خطوط مل رہے ہیں جن میں سخت لب ولہجہ استعمال کیا گیا ہے ان حضرات کے خیال کے بموجب ہندوؤں کی کامیابی ان کی منظم شورش کی مرہون منت ہے اور مسلمانوں کی خاموشی انہیں نقصان پہنچا رہی ہے۔" (۱۵)

یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مسلم رہنماؤں کے ایک وفد نے سر آغا خان کی قیادت میں لارڈ منٹو سے شملہ میں ملاقات کر کے اپنے مطالبات پیش کئے منشور کے ذریعے سیاسی مقاصد ومفادات کے حصول کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں میں یہ رجحان بڑھتا گیا کہ وہ بھی اپنی سیاسی تنظیم قائم کریں جس کے ذریعے اپنے حقوق کی حفاظت کر سکیں۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم زعماء کے ایک اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں نواب وقار الملک اور نواب محسن الملک نے اس رجحان کی تائید کی اور سیاسی تنظیم کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ اس کا نتیجہ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو اس وقت برآمد ہوا جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ ڈھاکہ میں صدر جلسہ نے قرارداد پیش کی اور منظور کروائی جس میں کہا گیا تھا کہ

"ہندوستان کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے نمائندگان پر مشتمل یہ اجلاس فیصلہ کرتا ہے کہ ایک سیاسی انجمن قیام عمل میں لائی جائے جس کا نام "کل ہند مسلم لیگ" ہو۔"

قرارداد کی تائید مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان اور حکیم اجمل خان نے کی تھی۔

مسلم لیگ کا قیام انگریزوں اور ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں کے خلاف برسرپیکار ہونے کے رجحان کا پہلا منظم مظاہرہ تھا۔ اس نے احتجاجی سیاست کے حربے استعمال کرنے پر قانونی جنگ کو ترجیح دی۔ یوں تو تحفظ حقوق اور حصول آزادی کے لئے مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے کارروان میں درجنوں زعماء کے نام آتے ہیں جنہوں نے تاریخ کے ہر دور میں قیادت کا حق بے لوثی اور دلیری سے ادا کیا لیکن لیگ کو وسیع پیمانے پر منظم کرنے اور متحرک کرنے کا سہرا قائداعظم محمد علی جناح کے سر ہے۔ قائد کے پیش نظر سرسید کے عہد سے اپنے دور تک کے سیاسی، مذہبی، معاشی اور معاشرتی حالات اور رجحانات تھے اور انہوں نے ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۰ء تک سیاست میں رہ کر کانگریس کی قیادت اور اس کی سازشوں کا قریب سے مطالعہ اور مشاہدہ بھی کیا تھا۔ وہ "اتحاد کے سفیر" بن کر ابھرے اور اپنے تجربات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ کانگریس کی ہندو نوازی مسلمانوں کے حقوق اور مفادات کے خلاف ہے۔ اس لئے انہوں نے کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور قیام پاکستان کی جدوجہد کو مقصد حیات قرار دے دیا۔ مطالبۂ پاکستان تاریخی جدلیت کا نتیجہ ہے اسی لئے قائداعظم نے فرمایا تھا کہ

"ان دونوں قوموں کے مابین شادی بیاہ نہیں۔ ان کے عوام آپس میں بلا تکلّف کھانا نہیں کھا سکتے۔ ہندو اپنے سوا سب کو ملیچھ سمجھتے ہیں ان کا عقیدہ، خدا، رسول ہی جدا نہیں بلکہ شخصی قانون بھی جدا ہے۔ رسم و رواج جدا ہیں اور سب سے بڑھ کر تاریخی پس منظر جدا، فلسفہ جدا، مقاصد اور نصب العین جدا ذوق اور مشرب بھی جدا ہیں۔" (۱۶)

یہ سچائی کل کی بھی ہے اور آج کی بھی، ڈاکٹر سید عبداللہ کے بیان کے مطابق :

"بلاشبہ انگریزوں کے آنے کے بعد انگریزی داں طبقے میں دونوں قوموں کے بعض ظاہری طور طریق مثلاً "لباس اور فیشن ایبل زندگی میں دونوں کے اسالیب یکساں طور پر فرنگی ہوتے چلے گئے اور ابھی ان میں یکسانی ہے لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کی وسیع اکثریت معاشرت میں کل بھی جدا تھی اور آج بھی جزوی اشتراک کے باوصف جدا ہے۔ ان دونوں قوموں کی معاشرت کے پیچھے ان کے مذاہب تھے اور ہیں۔" (۱۷)

ہندو مسلمانوں کو ملیچھ سمجھیں مسلمان ہندوؤں کو کافر قرار دیں تو اس بنیادی اختلافی رجحان اور عدم آہنگی کے بعد باقی دیگر نوعیت کی جزوی اور ثانوی یکسانیت نہ تو اتحاد قائم کرسکتی تھی اور نہ انہیں ایک قومیت کے بندھن میں باندھ سکتی تھی۔ اس تناظر میں دو قوموں کے درمیان تضادات اور ان کے نتیجہ میں کبھی نہ ختم ہونے والے تصادم سے بچنے کی یہی راہ تھی کہ ان



قوموں کے درمیان ملک تقسیم کردیا جائے۔ چنانچہ یہ تاریخی عمل اگست ۱۹۴۷ء میں پورا ہوا۔

## (۳)

پچھلی صدی کے نصف آخر میں مسلمانوں میں دو اہم رجحانات پیدا ہوئے ایک سیاسی تھا، دوسرا لسانی وادبی! سیاسی رجحان کے تحت قائدین اور زعماء نے قوم کی بقا کی جنگ شروع کی۔ مسلمانوں میں احساس قومیت پیدا کیا۔ تعلیم کے ذریعہ ترقی اور خوشحالی کا راستہ استوار کیا تو ادبی رجحان کے تحت اردو کو تصورات اور خیالات کی حسین و رنگین وادی میں بھٹکتے رکھنے کے بجائے نیچرل شاعری اور مقصدیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اسی زمانہ میں نئے سیاسی اور لسانی وادبی رجحانات کی وجہ سے اردو نے ہمہ جہتی ترقی کی۔ اسالیب، معانی وبیان میں تغیرات پیدا ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو زبان اس قابل ہوگئی کہ اس میں ہر موضوع پر خیال آرائی کی جانے لگی نئی اصناف ادب کا اضافہ ہوا جن میں ایک اہم اور مشکل صنف "سوانح نگاری" ہے۔ اگرچہ سرسید نے سیرت فریدیہ، آثار الصنادید (مع تذکرہ اہل دہلی) کے ذریعہ سوانح نگاری کے نقش چھوڑے تھے لیکن الطاف حسین حالی نے براہ راست مغربی ادبیات سے مستفیض نہ ہونے کے باوجود جدید شاعری، اصول تنقید اور اصول سوانح پر کامل عبور کے ثبوت پیش کئے۔

حالی سے قبل اردو میں سوانح نگاری کو ایک علیحدہ صنف کا درجہ حاصل نہ تھا۔ زیادہ تر سیرۃ الانبیاء، بزرگان دین کے حالات اور روحانی کارنامے قلم بند کئے جاتے تھے۔ ان میں بھی تحقیق اور حقیقت نگاری کے بجائے عقیدت اور ارادت کی بناء پر مبالغہ آمیز روایات کو جگہ دی جاتی تھی۔ اردو ادب پر حالی کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے "کریٹکل بایوگرافی" کو نظریاتی اور اصولی طور پر متعارف کرواکر سوانح نگاری میں نیا رجحان پیدا کیا۔ ان کی سوانحی کاوشوں میں حیات سعدی (۱۸۸۶ء) یادگار غالب (۱۸۹۶ء) اور حیات جاوید (۱۹۰۱ء) سوانح و شخصیت نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حیات سعدی تحقیق کی بنیاد پر لکھی گئی۔ یادگار غالب کو اس اعتبار سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ حالی نے اپنے ذاتی مشاہدہ اور معلومات کی بنیاد پر غالب کی شخصیت کے تمام اچھے اور برے پہلوؤں کا حقیقت پسندانہ اور غیر جانب دارانہ احاطہ کیا ہے اس میں انہوں نے نہ تو غالب کی خوبیوں پر داد وستائش کا انداز اپنایا اور نہ خامیوں پر نکتہ چینی کی یا تاسف کا اظہار کیا بلکہ ان سب پہلوؤں کی عکاسی کرکے فیصلہ کا حق قاری کو دیا ہے۔ اس سوانح عمری کے ذریعہ غالب ایک عام انسان کی حیثیت میں سامنے آتے ہیں۔ قاری خود ان کی

اچھائیوں سے متاثر ہو کر ان کا مداح بن جاتا ہے تو ان خامیوں کو عین بشریت قرار دے کر نظر انداز کر دیتا ہے۔ حیات جاوید سرسید کی مخالفت کے ردعمل میں تصنیف ہوئی۔ باوجود اس کے کہ حالی نے ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے لیکن کارناموں پر اتنا زور دیا ہے کہ یہ سوانح عمری "مدلل مداحی" کہلائی۔

دبستان سرسید کے سب سے کم عمر رکن شبلی نعمانی نے بھی سوانح نگاری کی طرف توجہ کی۔ مذہب اور تاریخ اسلام ان کے مطالعہ اور تحقیق کے خاص موضوعات تھے اسی لئے انہوں نے سیرۃ النبی کے لئے بیش بہا معلومات جمع کیں۔ وہ اپنی زندگی میں اس منصوبے کی تکمیل نہیں کر سکے لیکن جس نقطۂ نظر سے انہوں نے ماخذات سے استفادہ کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حقائق کی بازیافت کے ساتھ سیرت کی تکمیل چاہتے تھے۔ انہوں نے الفاروق' المامون' سیرۃ النعمان لکھ کر سوانحی ادب میں قابل قدر اضافہ کیا۔ سرسید اور شبلی کو عام طور پر ایک دوسرے کا مخالف سمجھا جاتا ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ دونوں ایک ہی مقصد کے لئے کام کر رہے تھے وہ آگے بڑھنے کے لئے ماضی سے روشنی حاصل کرنے کے حق میں تھے۔ ان میں اگر فرق نظر آتا ہے تو صرف اس امر میں کہ سرسید ماضی کے ساتھ مغرب کے علوم جدیدہ کو اپنانے کے بھی حامی تھے۔ شبلی کا رجحان یہ تھا کہ اسلاف کی عظمتوں کے نشان بطور نمونہ قوم کے سامنے رکھیں اس لئے سوانح عمریوں میں انہوں نے بعض جگہ صرف نظر سے کام بھی لیا خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعہ پر محتاط رویّہ اختیار کیا ہے۔

اسی دور کے سوانح نگاروں میں ڈپٹی نذیر احمد اور عبدالحلیم شرر کے نام بھی شامل کئے جا سکتے ہیں جن کے قلم سے مختصر سوانح عمریاں وجود میں آئیں۔ نذیر احمد سوانح نگاری کے مسلمہ اصولوں پر پورے نہیں اترے ہیں۔ وہ محقق نہیں تھے اس لئے کھرے کھوٹے میں امتیاز نہ کر سکے جس کی مثال "امہات الامۃ" ہے۔

حالی اور شبلی کے زیر اثر اردو میں سوانح کی صنف کو فروغ ملا اگرچہ جس معیار پر ان دونوں نے تحقیقی کام انجام دیا دیگر سوانح عمریاں اس تک نہ پہنچ سکیں۔ اس دور کی بعض سوانح عمریوں میں مقصد افادی سے زیادہ اخلاقی تھا۔ سوانح نگاروں نے اپنے موضوع سے متعلق نہ تو تحقیق سے کام لیا اور نہ فنی کمزوریوں کا ادراک کیا۔ اگر ان میں کوئی اسلوب ہوتا تو اپنی تحریر کی دلکشی اور خوبصورتی سے کام لے کر سوانح عمری کو پڑھنے کے لئے گوارا بنا دیتا تھا۔ اس دور کی جن سوانح عمریوں کے حوالے دیئے جا سکتے ہیں ان میں گل زار محمدی از محمد مسلم (۱۸۸۱ء)' اوصاف محمدی از



سید محمد اوصاف علی (۱۸۸۲ء)' تواریخ محمدی از سراج الیقین (۱۸۸۷ء)' سوانح عمری محمد از محمد شاہ خان (۱۸۹۸ء)' الصدیق از حافظ عبدالرحمان (۱۸۹۷ء)' سیرت عثمان از عبدالحیٔ (۱۹۰۰ء)' سیرت الصدیق از عبدالحیٔ (۱۹۰۳ء)' صدیق اکبر از مرزا محبوب بیگ' المرتضیٰ از حافظ عبدالرحمان' سوانح عمری حضرت علیؓ از مولوی عبیداللہ بسمل وغیرہ شامل ہیں۔ یہ معلومات کے لحاظ سے غیر مکمل اور زیادہ تر مناظرہ کے انداز کی حامل ہیں۔

عبدالحلیم شرر بھی سوانح نگاری کے رجحانات سے متاثر ہوئے ان کی چھوٹی چھوٹی تصانیف مثلاً" جنید بغدادی' ابوبکر شبلی' سکینہ بنت حسین' خواجہ معین الدین چشتی' قرۃ العین اس کی مثالیں ہیں ان کے علاوہ انہوں نے تاریخی کرداروں کو ناول کے پیرائے میں بھی پیش کیا ہے۔

ایک عرصہ تک مذہبی اور تاریخی سوانح عمریاں لکھنے کا رجحان رہا۔ تاریخی سوانح عمریوں میں تاریخ اور سوانحی فن آپس میں اس طرح خلط ملط ہو گئے کہ انہیں فنی لحاظ سے نہ تو تاریخ کہا جا سکتا ہے اور نہ سوانح عمری! اس کی مثالیں حکیم احمد حسینی کی "حیات صلاح الدین" اور عبدالرزاق کانپوری کی البرامکہ اور نظام الملک طوسی ہیں۔

حالی کی پیروی میں ادبی اور فنی سوانح نگاری کے رجحان نے بھی ترقی کی۔ زندگانی بے نظیر از مولوی سید محمد عبدالغفور شہباز' حیات خسرو از سعید احمد مارہروی' حیات انیس از امجد علی' حیات النذیر از افتخار عالم' حیات دبیر از ثابت لکھنوی جیسی تصانیف منظر عام پر آئیں جو مواد کی کمی اور فن کی خامیوں کے باوجود سوانح نگاری کے رجحان کو آگے بڑھانے کا سبب بنیں۔

علی گڑھ اور ندوۃ العلماء نے سوانح نگاری کو تحریک کی صورت دی تھی ان میں ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے متعلق اہل علم نے شبلی کے نقش قدم پر چل کر ہر لحاظ سے جامع و مفصل سوانح عمریاں لکھیں ان کی تصانیف کے مقاصد وہی رہے جو شبلی نے متعین کئے تھے۔ اکابرین اسلام کے مذہبی' علمی' ادبی' سیاسی کارناموں کو بطور نمونہ پیش کرنا جن سے نئے دور کے مسلمان متاثر ہو کر دین اور دنیا کو سنوار سکیں' جن فرماں رواؤں اور فوجی سالاروں کے حالات تحریر کئے گئے ان میں کارناموں پر زیادہ توجہ دی گئی۔ شخصیت اور نجی زندگی کے آثار برائے نام ہیں۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کہ شبلی کے زیر اثر سوانح نگاری عام ہوئی۔

اردو سوانح نگاری کا اجمالی جائزہ بھی لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گزشتہ صدی اور اس سے بھی کچھ زیادہ رواں صدی میں حالات اور ذہنی رویوں میں نمایاں اور قابل ذکر اور اہم سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ ان میں بعض سوانح عمریاں معروف و محترم اشخاص کی ہیں۔ گزشتہ ایک صدی

سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی، تعلیمی لحاظ سے جمود مسلسل کا زمانہ رہا۔ بعض قوموں کی سرشت میں یہ بات ہوتی ہے کہ وہ انحطاط پذیر ہو کر فنا نہیں ہو جاتیں۔ ان کے انحطاط کے دور میں ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا ہوتی ہیں جو تاریخی جدلیت کے اصولوں پر انحطاط کی وجوہات کا پتا چلا کر ان کے ازالہ یا تلافی کی کوششیں کرتی ہیں اور جب وہ قوم کے لئے نئی سمت کا تعین کر کے اپنی رہنمائی کی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے قومی بیداری اور جمود تازہ کا باعث بنتی ہیں تو انحطاط کے آثار مٹتے جاتے ہیں اور قوم نئی توانائیوں کے ساتھ بیداری کی نئی تاریخ مرتب کرتی ہے۔

مسلمانانِ برصغیر کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ۱۸۵۷ء کے فوری بعد زمانہ زوال پذیری کا نقطۂ عروج معلوم ہوتا ہے۔ اسی زمانہ میں سرسید اور دیگر زعماء نے اسلام کے احیاء اور قوم کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کام شروع کیا۔ قومی بیداری کے آثار ہر نوع کی تصانیف میں ظاہر ہونے لگے۔ یہ لہر علامہ اقبال کے یہاں قومی شعور کی طوفان خیزی بن گئی۔ اس دور میں زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرنے والے صاحب بصیرت لوگوں کی کثرت رہی۔ سیاسی معرکہ آرائی کے لحاظ سے اس کو تاریخ کا ہنگامہ پرور دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ تحریک آزادی میں جنھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ان میں مختلف شعبہ ہائے زندگی، مختلف سیاسی نظریات کے حامل اور مختلف مذاہب و نسلوں سے تعلق رکھنے والے شریک ہوئے۔ ان کی جماعتی وابستگیاں جدا جدا رہیں۔ آپس میں نظریات اور طریق کار کا اختلاف بھی رہا۔ اس کے باوجود ان میں کسی کے خلوص نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سب سوانح نگاری اور شخصیت نگاری کے موضوع بنے۔ چنانچہ سرسید، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، بی اماں، شیخ الہند محمود حسن، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا برکت اللہ بھوپالی، علامہ اقبال، قائداعظم، قائد ملت، مولانا حسرت موہانی، راجہ صاحب محمود آباد، سردار عبدالرب نشتر، عبداللہ ہارون، چودھری خلیق الزماں، مولانا احمد رضا بریلوی جیسے تاریخ ساز مشاہیر ایک طرف ملتے ہیں تو دوسری طرف لوکمانیہ تلک، گوکھلے، موتی لال نہرو، مدن موہن مالویہ، (۱۸) گاندھی جی، جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد، راجندر پرشاد، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر ذاکر حسین، اچاریہ کرپلانی، سبھاش چندر بوس، ونوبا بھاوے کے نام ملتے ہیں۔ ان سے چاہے اتفاق رائے ہو یا اختلاف رائے ان کی شخصیت کے قد آور ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے سیاسی افکار، سیاسی کارناموں اور شخصی اوصاف سے قوم کو واقف کرنے کے رجحان کے تحت اکثر کی جامع سوانح عمریاں فنی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی گئیں۔ مذہبی اور علمی خدمات کے حوالے سے شبلی نعمانی، سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، مولانا اشرف علی



تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹) کی شناخت ہوتی ہے۔ ان کے کارنامے اور اوصاف سوانح عمری کے بہترین موضوعات ہیں۔

ادب اور صحافت میں بھی نامور شخصیات کی کمی نہیں۔ جدید دور کے ادب میں منشی پریم چند، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، قاضی عبدالغفار، عبدالماجد دریا بادی، رشید احمد صدیقی، سجاد ظہیر، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، مہندر سنگھ بیدی سحر، مہندر ناتھ، جوش ملیح آبادی، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، جاں نثار اختر، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، صالحہ عابد حسین، احسان دانش، مرزا ادیب کے نام نمایاں رہے۔

صحافت میں منشی سجاد حسین (اودھ پنچ)، مولانا ظفر علی خان (زمیندار)، شیخ عبدالقادر (مخزن)، حسرت موہانی (اردوئے معلیٰ)، محبوب عالم (پیسہ اخبار)، مولوی ممتاز علی (تہذیب نسواں)، راشد الخیری (عصمت) کے گوناگوں رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ ان تمام بزرگوں اور ان کے جلو میں ہزاروں ایسے ناقابل فراموش نام ملتے ہیں جن کے انمٹ نقوش ان کی عظمتوں اور رفعتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کے سوانحی حالات اور شخصی فضائل بصیرت کے باعث ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے اکثر شخصیات پر کافی کچھ لکھا گیا ہے پھر بھی بعض پہلو تشنہ اور تفصیل طلب ہیں جن پر مزید تحقیق کی گنجائش سوانح نگاروں کے لئے دعوت فکر و عمل ہے۔

سوانح نگاری کے فن کی ترقی میں علی گڑھ تحریک اور ندوۃ العلماء تحریک کے حامیوں نے فعال کردار ادا کیا۔ ان ہی کی تصانیف نے دیگر سوانح نگاروں کی رہنمائی کی۔ یہ کام بھی منصوبہ بندی کے ساتھ نہیں ہوا۔ شبلی کی تقلید کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین کی کاوشوں سے قطع نظر عمومی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب کی جو تحریکیں منظر عام پر آئیں وہ ایک یا چند حضرات کے رجحانات کے تابع رہیں۔ مختصر مدت تک جاری رہیں اور دیرپا اثرات مرتب کئے بغیر ختم ہو گئیں۔ صرف ترقی پسند ادب کی تحریک منظم طور پر اجتماعی انداز میں جاری رہی۔ بقول ڈاکٹر انور سدید

"ترقی پسند تحریک ایک ہمہ جہت اور جامع تحریک تھی۔ اس کے پس پشت ایک واضح نصب العین اور منصوبہ بندی موجود تھی۔ چنانچہ اس نے نہ صرف ادب کے مباحث پیدا کئے بلکہ زندگی پر اثر انداز ہونے کی کوشش بھی کی۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک ترقی پسند تحریک بکھری ہوئی حالت میں نظر آتی ہے۔ انگارے کی اشاعت نے عوام کو جدیدیت کی ایک نئی رو سے متعارف کروایا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک اس تحریک نے اپنے نظریات کا بیج بکھیرا اور رفیقوں اور ہم نواؤں کی

خاصی بڑی جماعت کو دائرہ اثر میں لے لیا۔ اس عرصہ میں تحریک کے وہ معاونین جو اس کے مقاصد کے ساتھ زیادہ دور تک نہ چل سکے تحریک سے الگ ہوگئے اور تحریک کی قیادت انقلابی نوجوانوں نے سنبھال لی۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک کا دور تحریک کا عروجی دور ہے۔ اس زمانہ میں نہ صرف تحریک کا حلقۂ اثر وسیع ہوا بلکہ اس نے فتوحات بھی حاصل کیں اور تحریک کے نصب العین کو روایت کا درجہ دے کر بہت سے ادباء کو اپنے ساتھ ملالیا۔" (۲۰)

ترقی پسند ملک کی آزادی کے علاوہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ استحصالی نظام ختم کر کے انسانی مساوات کی بنیاد پر نیا نظام قائم کرنا چاہتے تھے ان میں جرأت اظہار تھی۔ انقلاب اور بغاوت کا حوصلہ تھا۔ ادب میں تجربات بھی کئے۔ تخلیق کے لئے نئے موضوعات تلاش کئے اور تحریر کے لئے نئے سانچے ڈھالے۔ اس بات کا اعتراف لازم ہے کہ تخلیق اور تنقید کے تمام شعبے انہیں کے رجحانات' افکار اور اظہار کے زیر اثر آگے بڑھتے رہے لیکن انہوں نے تحقیق اور سوانح نگاری کی جانکاہی سے خود کو بچائے رکھا۔

(۴)

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اس کا سب سے بڑا مسئلہ بقا (Servival) کا تھا۔ بھارت کو جمی جمائی حکومت ملی تھی۔ پاکستان کو ہر کام کا آغاز کرنا پڑا۔ یہ انتہائی کشمکش اور پریشانی کا دور تھا۔ اسے انتظامی ڈھانچہ کھڑا کرنا تھا۔ معاشی' سیاسی اور فوجی اعتبار سے از سرنو تنظیم کرنا تھی۔ سرمایہ کا فقدان تھا۔ حکومت ہند نے اس کے حصے کی رقومات دبا رکھی تھیں جو اس وقت تک نہیں دی گئیں جب تک گاندھی جی نے اپنے ہی پیروؤں پر دباؤ ڈالنے کے لئے مرن بھرت نہیں رکھا۔ فوج' اسلحہ اور سازوسامان بھی بروقت پاکستان کے حوالے نہیں کئے گئے۔

اس دور ابتلا میں لاکھوں مسلمانوں کا سیلاب بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آنے پر مجبور ہوا۔ ان مسلمانوں کے گھر لوٹے گئے تھے۔ صدیوں کی میراث نذر آتش کی گئی۔ گلی گلی کوچہ کوچہ مسلمانوں کے خون سے سرخ ہوگئے تھے۔ ہزاروں عورتیں اغوا ہوئیں۔ بے شمار عورتوں کی آبرو ریزی ہوئی۔ یہ دعویٰ کرنے والے کہ پاکستان چھ ماہ بھی قائم نہ رہ سکے گا اس ملک کی مشکلات میں اضافہ کرتے رہے۔ کشمیر میں سازش کے ذریعہ ایک قضیہ کھڑا کیا جس نے فوجی محاذ آرائی کی صورت اختیار کی۔ رن کچھ پر قبضہ کی غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکت اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر کی۔ وسائل سے عاری نومولود اور غیر استوار (Unestablished) حکومت نے قائداعظم



کے عزم وہمت اور رہنمائی میں ان سب کا مقابلہ کر کے اپنی بقا کو یقینی بنالیا۔

تحریک پاکستان کے مخلص کارکنوں کا دور قلیل عرصہ میں ختم ہوگیا۔ ملک اپنے لئے مستقبل کی راہیں متعین کرنے بھی نہ پایا تھا کہ ان کی سرپرستی اور رہنمائی سے محروم ہوگیا۔ ملک کی سیاست طالع آزما جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں چلی گئی جنہیں قیام پاکستان کے مقاصد کے حصول سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ گویا "منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے" اس لئے زندگی کے کسی شعبہ میں دوررس نتائج حاصل کرنے کی منصوبہ بندی نہیں ہوئی۔ ہر آنے والی نئی حکومت نے بغیر کسی جواز کے سابقہ حکومت کے منصوبوں کو کالعدم قرار دے کر سرمایہ کا زیاں کیا۔ پاکستان کی جڑیں مضبوط ہونے کے بجائے کھوکھلی ہوتی گئیں۔ سیاست' معیشت' تعلیم' اخلاق' معاشرت غرض زندگی کے کسی شعبہ میں مستقل منصوبہ بندی کے ساتھ کام جاری نہیں رکھا جاسکا۔

واقعہ یہ ہے کہ پاک وہند کی تقسیم صرف زمین یا علاقوں کی تقسیم نہ تھی۔ ان کی بنیاد جداگانہ نظریات' افکار اور رجحانات تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ نظریات اور رجحانات غیر مستحکم ہوتے گئے اور پاکستانی معاشرہ میں مستحکم قومیت کے استحکام کے بجائے علاقائی رجحانات پروان چڑھنے لگے۔ مغربی تہذیب اور افکار کے ریلے نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ معاشرہ میں اسلامی اقدار اور مغربی مادہ پرستی کے تصادم سے ایک نیا بحران پیدا ہوا۔

ان تمام کمزوریوں کے باوجود پاکستان سے محبت کے جذبے میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ عام حالات میں اختلافات کی شکار قوم آزمائش کی گھڑیوں میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتی ہے جس کا مظاہرہ اس نے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں کیا اور اب بھی کشمیر اور ایٹمی صلاحیت کے مسائل پر کررہی ہے۔

چونکہ کوئی متعینہ قومی مقاصد پیش نظر نہیں رہے اس لئے نوجوان مستقبل کے خواب بننے کے اہل نہیں ہیں۔ مغربی تہذیب کی جانب بڑھتے ہوئے رجحان نے دولت پرستی اور نمود ونمائش کا خوگر بنادیا ہے۔ مذہبی اور اخلاقی اقدار کی پاسداری ختم ہوتی جارہی ہے۔ ضبط اور رواداری کہیں نظر نہیں آتی جس سے فائدہ اٹھا کر مفاد پرست نسلی' لسانی' صوبائی' علاقائی تعصبات کو ہوا دے رہے ہیں۔ نتیجہ میں عوام دست وگریباں ہیں اور مفاد پرستوں کی چاندی ہے۔

بھارت میں اردو زبان کسمپرسی کا شکار ہے۔ ذریعۂ تعلیم ہندی قرار دیا جاچکا ہے جن صوبوں میں اردو دوسرے درجہ پر ذریعہ تعلیم ہے وہاں اس سے کوئی مادی پہلو وابستہ نہیں کیونکہ اس

ذریعہ تعلیم سے حاصل کی ہوئی ڈگریاں ملازمت کے حصول میں سدراہ ہوتی ہیں۔ گاندھی کا نعرہ "اردو اتھوا ہندوستانی اتھوا ہندی" اب اپنا رنگ جما رہا ہے اور اردو کو بھی ہندی کہا جانے لگا ہے۔ فرق اگر ہے تو رسم الخط کا۔ اردو رسم الخط برائے نام رہ گیا ہے۔ دیوناگری رسم الخط کا رواج عام ہے اگرچہ عوام میں بروائج اردو اور ہندی کے درمیان بولنے کی حد تک کوئی فرق نہیں ہے۔ وہاں کے ارباب دانش اس بات پر خوش ہیں کہ اردو زندہ تو رہ گئی چاہے رسم الخط کی تبدیلی کے ساتھ ہو۔ وہ فراموش کر جاتے ہیں کہ زبان ثقافت کا لازمی حصہ ہے تو اس کا رسم الخط زبان کا لازمی حصہ ہے۔ اس کی تبدیلی کے بعد زبان کی شناخت باقی نہیں رہتی۔ اس طریق عمل کے نتائج سامنے آنے شروع ہو گئے ہیں۔ ان کے اشاعتی ادارے کو سرکار کی طرف سے لاکھوں روپیہ سالانہ کی گرانٹ ملتی ہے۔ کوئی کتاب شائع کرتے ہیں تو اس کی تعداد ۳۰۰ سے ۵۰۰ تک ہوتی ہے کیونکہ اس رسم الخط میں پڑھنے والوں کا فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ اب جو مجموعۂ کلام شائع ہو رہے ہیں ان میں تجارتی نقطۂ نظر سے اشعار کو دونوں رسم الخط میں پیش کیا جا رہا ہے۔ (۲۱)

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بھارت میں آئندہ ایک یا دو دہائیوں کے بعد اردو رسم الخط میں کتب کی اشاعت کا ملا "مسدود ہو جائے گی اور وہاں یہی اردو کے زوال کی تکمیل کی علامت ہوگی۔

اس انتشار کے دور میں فکر صالح کے شواہد کہیں نہیں نظر آتے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل سیاسی' مذہبی' سماجی اور ثقافتی رجحانات واضح طور پر موجود تھے۔ ان کی بقا اور تحفظ کے لئے رہنما قوتیں ہر سطح پر اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ کام کر رہی تھیں۔ آج کے خود غرضی اور مفاد پرستی کے دور میں جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ انفرادی کوشش کا مرہون منت ہے اور غیر مؤثر ہے۔ اس صورتحال میں رائے عامہ کے رہنماؤں اور دانشوروں کا فرض بنتا تھا کہ وہ قوم کی رہنمائی کریں۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اپنے افکار اور اعمال سے انتشار اور بحران میں اضافہ ہی کیا ہے۔

اردو زبان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کے بعد برصغیر پاک و ہند میں خوشگوار اور معاون فضا پیدا نہیں ہوئی۔ پاکستان میں قومی زبان قرار دیئے جانے کے باوجود نامساعد حالات سے گزر رہی ہے۔ اسے عملاً "نافذ نہیں کیا گیا مدارس اور جامعات میں انگریزی اور اردو دونوں ذریعۂ تعلیم ہیں حالانکہ قومی شعور کا تقاضا ہے کہ پورے ملک میں کم از کم اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قومی زبان کو بنایا جائے کیونکہ قومی زبان ہی قوم کی شناخت ہوتی ہے۔ جہاں پالیسی ساز ذہنی تحفظات کے شکار ہیں وہاں عوام بھی ذہنی غلامی کے دور سے باہر نہیں نکل سکے ہیں۔ پالیسی سازوں کے لئے انگریزی (Status Symbol) طبقاتی معیار ہے۔ وہ انگریز حکمرانوں کے



جانشین ہیں انگریزوں کے طور طریق سے سرمو گریز ان کے مرتبے کے خلاف ہے۔ عوام کی مجبوری یہ ہے کہ عملی زندگی میں انگریزی کی جس طرح حوصلہ افزائی ہے اس کے نتیجے کے طور پر انگریزی ذریعۂ تعلیم سے ڈگری حاصل کئے بغیر بہتر معاشی مواقع میسر آنے کا امکان نہیں رہا اس لئے انگریزی پر اردو کو ترجیح نہیں دی جاتی حالانکہ دستور پاکستان کی رو سے ۱۹۸۸ء میں پورے ملک میں عملاً" (سرکاری و غیر سرکاری سطح پر) انگریزی کی جگہ اردو کو نافذ ہونا تھا۔ (۲۲) مگر افسوس کہ کئی حکومتیں تبدیل ہونے کے باوجود اس اہم قومی مسئلے پر تاحال کسی نے بھی توجہ نہیں دی جو اردو زبان اور قوم کے لئے بہت بڑا المیہ ہے۔

۱۹۴۷ء تک ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کے بڑے چرچے تھے۔ لاہور ان کا اہم مرکز تھا۔ وہ جماعت جو انقلاب' بغاوت کے ذریعہ آزادی کی خواہاں تھی آزادی کے بعد اس کی حیثیت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ ان کے خیال میں یہ آزادی خاک و خون میں غلطاں تھی۔ انسانوں کو مذہبوں کی بنیاد پر تقسیم کرنے والی تھی ایک زمین کے دو ٹکڑے کرنے والی تھی۔ اس لئے آزادی کا اجالا داغ داغ تھا۔ بہار آئی بھی تھی تو خزاں گزیدہ تھی۔ اس سلسلہ میں جو بیانات دیئے گئے مضامین و مقالات لکھے گئے۔ نظمیں کہی گئیں ان میں سیاسی رجحانات اور سیاسی بے اطمینانی ملتی ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے ترقی پسندوں کی جو کانفرنس ہوئی اس میں جو تجاویز منظور ہوئیں وہ سب کی سب سیاسی تھیں ان کے عمل سے کبھی بھی ریاست سے وفاداری کے رجحان کا اظہار نہیں ہوا۔ ان کا موقف تھا کہ

ادیب عوام کا وفادار ہے اور حکومت یا سرزمین وطن سے وفاداری زمانۂ جہالت کی یادگار ہے۔" (۲۳)

یہ موقف خود ذہنی انتشار کا مظہر ہے اس نے مزید انتشار پیدا کیا ردعمل کے طور پر حسن عسکری نے وطن سے وفاداری کی اہمیت کو جتایا۔ ڈاکٹر صمد شاہین نے پاکستان کی مخصوص تہذیب و ثقافت کے تناظر میں پاکستانی ادب کی تخلیق پر زور دیا۔ ترقی پسندوں کے غیر وفادارانہ رجحانات کی وجہ سے ان کی تنظیم کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ پاکستان میں ترقی پسندوں کی انتہاپسندی کے برخلاف بھارت میں صورتحال مختلف رہی۔ آزادی سے بے اطمینانی کے اظہار کے باوجود ترقی پسندوں نے انقلاب کے لئے شدت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے وہاں کی صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس دور سے پہلے ترقی پسندی نے انقلابی رخ اپنایا تھا اور بعد میں مفاہمت کا ترقی پسندوں

کا انقلابی آہنگ مدہم پڑ گیا۔ عوامی تحریکیں بھی بہت کچھ ٹھنڈی پڑ گئیں۔ آخر کار ترقی پسندوں میں سماجی تبدیلی کی خواہش کے بجائے (Establishment) کا حصہ بننے کا ارمان زیادہ بیدار ہوتا نظر آنے لگا۔ وہ تمام "جمہوری" ادارے، مجالس آئین و اصلاح و مراعات و حقوق وجود میں آئے جن کا اقبال نے بھی آزادی کی نیلم پری کے ساتھ تذکرہ کیا تھا۔ پھر سب سے کاری حملہ جھوٹی توہم پرستی کا ہوا جس کے اثر سے بڑے بڑے دیانت داروں کی دیانت گہنا گئی۔ وطن پرستی کے نام پر قومی عصبیت جارحیت امن دشمنی اور قومی یکجہتی کے نام پر اقلیتوں کی زبان، تہذیب اور وجود کو خطرے لاحق ہونے لگے۔ غرض ادیبوں کے مورچے پر اب سماجی تبدیلی کے مجاہدوں کے قافلے کا گمان نہ ہوتا تھا۔ ارباب اقتدار کے معذرت خواہوں کا شبہ کبھی کبھی البتہ ہونے لگتا تھا۔ (۲۴)

ان دونوں ملکوں میں ترقی پسند تحریک کا تضاد انتہا پر نظر آتا ہے اس کی زوال پذیری کی وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی ہے۔ بھارت میں یہ فعال کردار سے محروم ہے۔ پاکستان میں ۱۹۷۳ء میں اس کی احیاء کی کوشش کی گئی تھی۔ بڑے شہروں میں انجمنیں قائم ہوئیں۔ پرانے لکھنے والوں کا تعاون بھی حاصل کیا گیا لیکن وہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل نہ کر سکی اس کی وجوہ ڈاکٹر انور سدید بیان کرتے ہیں کہ

"تحریک اپنا فعال دور ختم کر چکی تھی مزید یہ کہ ترقی پسند مصنفین کی نئی انجمن کو سجاد ظہیر جیسا مخلص، انقلابی اور ایثار پسند رہنما نصیب نہیں ہو سکا۔ جن ادباء نے اپنے عہد شباب میں اس تحریک کے لئے تازہ خون دیا تھا ان میں سے بیشتر بڑھاپے کی برگد تلے آسودگی سے ستا رہے تھے یا کاروبار حیات میں بری طرح مصروف تھے ان میں تحریک کے قدیم رہنما اپنی اپنی سابقہ خدمات کا اعتراف کرانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادب میں شخصیت سازی کا رجحان پیدا ہوا۔ ادیب نے انقلابی ہیرو کا درجہ اختیار کر لیا۔ کتابوں کی رونمائی، ترقی پسند شخصیتوں پر رسائل کے خاص نمبروں کی اشاعت، ادباء کے ساتھ شامیں منانے اور سالگرہ کے جشن منعقد کرنے کے رجحان اس ہیرو پرستی کے ہی شاخسانے ہیں۔" (۲۵)

اس مجموعی صورتحال میں برصغیر پاک و ہند میں ادبی روایات جس قوت اور شان سے جاری ہیں وہ یقیناً "قابل ستائش ہیں۔ ادب میں کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور اگر سوانح نگاری کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس دور کو انتہائی خوش آئند کہہ سکتے ہیں۔ سوانح نگاری ایک طرح ہیرو پرستی کا شاخسانہ ہے۔ ہماری ایک صدی کی تاریخ ایسی ہستیوں



سے بھری پڑی ہے جن کو ہیرو کا درجہ دیا جا سکتا ہے ان کا تعلق مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تھا لیکن قومی ہیرو کا درجہ وہی حاصل کر سکتا ہے جس کے کارناموں پر قوم کو مباہات و افتخار حاصل ہوا ہو اور آزادی کے بعد بھی بہت سے قومی ہیرو ہمارے سامنے آئے بالخصوص ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کے دوران اپنے ملک اور نظریات اور بقا کے لئے جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے اس فہرست میں نمایاں ہیں اردو کے سوانح نگاروں نے ان تمام ہستیوں کو یاد ہی نہیں رکھا بلکہ ان کے حالات زندگی، ان کے کارنامے اور جس ماحول میں اور جن مقاصد کے لئے کارنامے انجام دیئے ان کے جامع احوال کو مرتب کیا مگر اب بھی بہت سے نام ایسے ہیں جن پر تحقیق کے ساتھ مزید لکھنے کی ضرورت ہے اس عمل میں نکات نظر اور پسند اور ناپسند کا فرق ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک سوانح نگاری کا تعلق ہے اس کا رجحان اور اس کی روایت آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔ اس فن میں چند صحت مند اضافے بھی ہوئے ہیں۔ جب دیدہ ریزی اور جانکاہی سے سوانح نگار اس دور سے گزرا ہے اس کی مثالیں پچھلے ادوار میں کم ملتی ہیں۔

یوں تو سیاسی، ثقافتی اور ادبی تاریخ کے تمام اکابرین کی سوانح عمریاں لکھی جاتی رہیں لیکن ہیرو پرستی کے اظہار کے جو نئے طریقے ایجاد ہوئے ہیں اس کی وجہ سے بھی اس کام میں وسعت پیدا ہوئی۔ جیسے اکابرین کی سو سالہ برسی یا ان کے سو سالہ یوم پیدائش منانے کا طریقہ، حضرت امیر خسرو کا سات سو سالہ جشن منایا گیا۔ غالب کی سو سالہ برسی منائی گئی۔ قائداعظم اور علامہ اقبال، مولانا سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد وغیرہ کے سو سالہ یوم پیدائش منائے گئے۔ یہ دن آفتاب و مہتاب سے کسب نور کا ذریعہ بھی بنے اور ان تقاریب کے دوران ان کی مبسوط سوانح عمریاں بھی لکھی گئیں۔ اب تو زندہ شخصیات کے لئے جشن کے انعقاد اور رسالوں کے خاص شماروں کی اشاعت کا اہتمام ہونے لگا ہے۔ ان سب کے ذریعہ اردو کے سوانحی ادب میں اضافہ ہوا اور خاکہ نگاری کا ایک نیا رجحان پیدا ہوا جس نے پورے ادب پر اثرات مرتب کئے ہیں۔

خاکہ نگاری نے مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کی یاد تازہ کر دی۔ اسی دور میں اجتماعی طور پر سوانح نگاری اور خاکہ نگاری کا رواج ہوا۔ بعض نہایت عمدہ خود نوشت سوانح عمریاں بھی منظر عام پر آئیں۔

ظاہر ہے کہ سوانح نگاری کا فرض انہوں نے ہی انجام دیا جن کے پیش نظر کوئی خاص شخصیت تھی اور جس نے انہیں متاثر بھی کیا۔ پچھلی چھ سات دہائیوں کے دوران جو نابغۂ روزگار

ہستیاں نقش دوام چھوڑ گئی ہیں ان سے آج تک کی نسلیں کسی نہ کسی طور پر متاثر ہیں ان کی شخصیت کی سحر انگیزی اور ان کے کارناموں کی خوشبو ذہن اور روح کا حصہ ہے۔ ان کے حوالہ سے لکھنے کا اس قدر رجحان رہا کہ زندگی کا کوئی واقعہ اور شخصیت کا کوئی پہلو باقی نہ رہا جس پر تحقیق کے ذریعہ استناد کے ساتھ روشنی نہ ڈالی گئی ہو' لاتعداد کتب کی اشاعت کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ جو قوم کی احسان مندی کے جذبے کا ثبوت ہے۔

اس کے برخلاف اس دور کی سب سے بڑی ادبی تحریک (ترقی پسند مصنفین) سے شکایت بھی ہے کہ اس حلقۂ ذوق و فکر نے سوانح عمری کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی اور صرف خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری پر ہی اکتفا کیا چنانچہ تحریک کے اہم ترین ادیبوں اور شاعروں کی جامع سوانح عمریاں ابھی تک منظر عام پر نہیں آئیں۔

جامع سوانح نگاری کی روایت کے استحکام کے ساتھ خود نوشت کی روایت بھی جاری رہی۔ آزادی سے قبل جدوجہد اور کثرت کار کی وجہ سے خود نوشت کے لئے لوگوں کے پاس وقت نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ راہ عمل میں تھے اور منزل دور تھی۔ منزل پر پہنچ کر جب فرصت ملی تو خود نوشت سوانح عمریاں کثیر تعداد میں منظر عام پر آنے لگیں۔ ان کا مقصد نہ خود نمائی تھا نہ خود ستائش بلکہ یہ یادداشتوں کی بازیافت تھی جو یاد جس انداز میں تازہ ہوئی قرطاس ابیض پر منتقل ہوتی رہی۔ خود نوشت سوانح عمریوں کے لحاظ سے بھی آزادی کے بعد کا دور درخشاں رہا۔ سوانح نگاری' خود نوشت سوانح نگاری' خاکہ نگاری (یا شخصیت نگاری) روبہ ترقی ہیں لیکن ایک حیثیت سے تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ تنقید کے بے شمار دبستان ادب میں متعارف ہوئے۔ ہر صنف ادب کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیا گیا لیکن سوانح نگاری جیسے اہم موضوع پر رجحان کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید شاہ علی کی کتاب "اردو میں سوانح نگاری" (۱۹۶۱ء) قابل ذکر ہے۔ جس پر انہیں لکھنؤ یونیورسٹی نے ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی' ڈاکٹر سید عبداللہ کی زیر نگرانی الطاف فاطمہ کا ایم۔ اے کا مقالہ "اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقا" (۱۹۶۱ء) ہے۔ ممتاز فاخرہ کی کتاب "اردو سوانح نگاری کا ارتقا ۱۹۱۴ء تا ۱۹۷۵ء (۱۹۸۴ء دہلی) ہے۔ ان کے علاوہ اس صنف کی فنی ضروریات' اس کی تاریخ اور تنقیدی جائزے پر منحصر کوئی کتاب نہیں ملتی۔ ضرورت ہے کہ اس جانب توجہ کی جائے اور عہد بہ عہد تجزیہ کیا جاتا رہے تاکہ آئندہ کے سوانح نگار ان سے استفادہ کرکے اپنے فن کو نکھار سکیں۔ تنقیدی جائزے کے بغیر فنی اعتبار سے اس صنف کی مزید ترقی کے امکانات مشکوک رہیں گے۔



## مصادر و ماخذات


۱۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان: ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر' صفحہ ۲۵۰ تا ۲۵۲ (انگریزی سے ترجمہ و تلخیص)

۲۔ سکسٹی ایئرز آف کانگریس: ستھپال: لاہور: ۱۹۳۶ء: صفحہ ۱۲۷ (انگریزی سے ترجمہ)

۳۔ عظیم قائد عظیم تحریک (جلد اول): ولی مظہر: مجلس کارکنان پاکستان: ملتان: ۱۹۸۳ء: صفحہ ۷۳

۴۔ عظیم قائد عظیم تحریک: حوالہ مذکورہ

۵۔ عظیم قائد عظیم تحریک: حوالہ مذکورہ

۶۔ عظیم قائد عظیم تحریک: حوالہ مذکورہ

۷۔ تحریک پاکستان اور تاریخ پاکستان: ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی: مطبوعات تکبیر: کراچی: ۱۹۹۲ء: صفحہ ۴۸' ۴۹

۸۔ اے لٹریری ہسٹری آف انڈیا: آر ڈبلیو فریزر: لندن: ۱۸۹۳ء: صفحہ ۳۶۰ (انگریزی سے ترجمہ)

۹۔ دی پرابلم آف ہندوستانی: ڈاکٹر تارا چند: الہ آباد: ۱۹۴۴ء: صفحہ ۳۲' ۳۳ (انگریزی سے ترجمہ)

۱۰۔ دی پرابلم آف ہندوستانی: حوالہ مذکورہ: صفحہ ۸۸ (۔۔۔ ایضاً ۔۔۔)

۱۱۔ ادبی و قومی تذکرے: کشن پرشاد کول: انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ: ۱۹۱۵ء: صفحہ ۴

۱۲۔ عظمتوں کے چراغ (جلد دوم): ولی مظہر: مجلس کارکنان پاکستان: ملتان: ۱۹۸۸ء: صفحہ ۶۴' ۶۵

۱۳۔ حیات جاوید: الطاف حسین حالی: نامی پریس کانپور: ۱۹۰۱ء: صفحہ ۱۰۷

۱۴۔ مولانا شرر کی صحافت: شفقت رضوی: مشمولہ "سہ ماہی اردو": کراچی: ۱۹۸۱ء: شمارہ ۲: صفحہ ۱۳۰

۱۵۔ عظیم قائد عظیم تحریک: ولی مظہر: مجلس کارکنان پاکستان: ملتان: ۱۹۸۳ء: صفحہ ۵۸

۱۶۔ کلچر کا مسئلہ: ڈاکٹر سید عبداللہ: لاہور: ۱۹۷۷ء: صفحہ

۱۷۔ کلچر کا مسئلہ: حوالہ مذکورہ: صفحہ ۹۰

۱۸۔ "حالت زندگی آنرایبل مدن موہن مالویہ آف الہ آباد جسے دفتر تاج جبل پور نے شائع کیا مطبوعہ اشتراکی پریس دہلی: ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۹ء" یہ سوانح عمری مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی پہلی تصنیف ہے جو منظر عام پر آئی۔

۱۹۔ مولانا مودودی نے اپنی سوانح عمری میں تحریر کیا ہے کہ ۱۹۱۹ء میں جب خلافت اور ستیہ گرہ تحریک کا آغاز ہوا تو اس میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ اس زمانے میں، میں نے گاندھی جی کی سیرت پر بھی ایک کتاب لکھی مگر وہ ابھی زیر طبع تھی کہ ایک عزیز نے پولیس سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کی اور اسے ضبط کرلیا گیا۔ بحوالہ "جنرل" خدابخش لائبریری پٹنہ: شمارہ ۵۰: ۱۹۸۹ء: صفحہ ۸

۲۰۔ اردو ادب کی تحریکیں: ڈاکٹر انور سدید: انجمن ترقی اردو: پاکستان کراچی: صفحہ ۵۲۰، ۵۲۱

۲۱۔ غزل پارے (شجاع خاور کے ۱۰۰ شعر): مرتبہ نور جہاں سرور، سراج درپن: شمع بک ڈپو دہلی: ۱۹۹۳ء

۲۲۔ غزلیں گوئل کی: انجنی کمار گوئل: حیدر آباد دکن: ۱۹۹۳ء

۲۳۔ دستور پاکستان: ۱۹۷۳ء: آرٹیکل ۲۵۱ (ا) "پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اسے سرکاری اور دیگر مقاصد کے استعمال کرنے کے لئے آئین کے نفاذ سے پندرہ سال کے اندر انتظامات کیے جائیں گے۔" (اردو ترجمہ)

۲۴۔ بات چیت: ظہیر کاشمیری: ماہنامہ "سویرا": لاہور: شمارہ ۲۵: صفحہ ۶

۲۵۔ جدید اردو ادب: ڈاکٹر محمد حسین: غضنفر اکیڈمی: کراچی: ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۸۵، ۱۸۶

۲۶۔ اردو ادب کی تحریکیں: ڈاکٹر انور سدید: انجمن ترقی اردو: پاکستان کراچی: صفحہ ۵۵۲



# باب دوم

## علمی، ادبی اور فنّی شخصیات کی سوانح عمریاں

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

# تمہید

اردو میں سوانحی ادب کسی نہ کسی روپ میں زمانۂ قدیم سے موجود ہے بازیافت شدہ شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نثر کا آغاز آٹھویں صدی ہجری میں ہو چکا تھا۔ اسی زمانہ میں چھوٹے چھوٹے رسائل دکن اور گجرات کے فقراء' صوفیاء اور اہل دل کے اقوال' اوصاف اور واقعات کے بارے میں قلمبند ہونے لگے تھے انہیں سوانح عمریاں تو نہیں کہا جاسکتا لیکن اس صنف کے ابتدائی نقوش ضرور مانے جاسکتے ہیں۔ اردو شاعری کی ترویج' توسیع اور ترقی کے ساتھ "تذکرہ نگاری" ہونے لگی تھی۔ اس کے تراجم اختصار اور غیر علمی معلومات کی وجہ سے سوانحی خاکے کہے جاسکتے ہیں۔ سوانح نگاری کے فن کو الطاف حسین حالی نے پہلی بار اس وقت آزمایا جب وہ مغربی اصول فن سے بالواسطہ طور پر واقف ہوئے اور اپنی تصانیف میں ان کا عملی اطلاق کیا اس طرح اردو ادب میں بھی "مستقل سوانح عمری" تحریر کرنے کے فن کو رواج ملا۔

مغرب میں بالخصوص انگریزی میں یہ صنف تجربات کے ادوار سے گزر کر تکمیل کے اس مرحلہ پر پہنچی کہ سترہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اسے ادب کی مستقل صنف کا درجہ دیا گیا۔ ڈرائیڈن پہلا ادیب تھا جس نے ۱۶۸۳ء میں "کسی فرد کی تاریخ" (۱) کو سوانح عمری قرار دیا تھا۔ یہی بات قدرے مختلف الفاظ میں "حقیقی زندگی کی روداد" کے طور پر کہی گئی ہے۔ جانسن نے اسے ایسی بیانیہ تحریر قرار دیا ہے جو دلچسپی سے پڑھی جائے اور جس کا اطلاق بخوبی مقصد زندگی پر کیا جائے (۲) موجودہ دور میں سوانح عمری اس جامع روداد کو کہا جاتا ہے جو کسی شخص کی خارجی اور داخلی زندگی کی آئینہ دار ہو اور حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ تمام مثبت اور منفی پہلوؤں کا احاطہ کرے۔

سوانح نگاری کے تین اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں۔ موضوع' مواد اور رویہ

موضوع سے مراد وہ شخصیت ہے جس کی سوانح عمری لکھی جائے اس کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبہ سے ہو سکتا ہے۔ سماجی مرتبہ بلند یا کم تر ہو سکتا ہے۔ وہ اچھائیوں یا برائیوں کا نمونہ ہو سکتا ہے۔ سوانح نگار پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کسی شخص کو اور کیوں منتخب کرتا ہے ظاہر ہے کہ وہ اسی وقت قلم اٹھائے گا جب اس نے شخصیت سے کوئی اثر قبول کیا ہو کبھی اثرات اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ اسے مرعوبیت کا نام دیا جاسکتا ہے اور کبھی بات صرف لگاؤ کی ہوتی ہے۔ بغیر اثر پذیری کے شخصیت کا انتخاب ممکن نہیں یہ زندہ شخصیت بھی ہو سکتی ہے۔ ماضی قریب کی یا ماضی

بعید کی۔ سوانح نگار اپنی افتاد یا رجحان کی بناء پر ان کے انتخاب کا حق رکھتا ہے۔

دوسرا عنصر مواد یعنی مکمل حالات زندگی کی فراہمی کا ہے شخصیت جس قدر قدیم ہوگی اس کے حالات معلوم کرنے میں اتنی ہی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا اور جو معلومات حاصل ہوں انہیں پرکھنا بھی ہوگا کہ وہ واقعی درست ہیں یا نہیں۔ شخصیت کے ظاہری اعمال سے واقفیت نسبتاً کم مشکل ہے لیکن شخصیت کا دوسرا پہلو بھی ہوتا ہے باطنی' ظاہری یا خارجی زندگی کے ساتھ ساتھ باطنی یا داخلی کیفیت کا جاننا بھی ضروری ہے۔ یہ سوانح نگاری کا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ خارجی زندگی دراصل تاریخ کا حصہ ہوتا ہے داخلی کیفیت فرد کی ذات کی عکاس' دونوں کے مجموعہ سے شخصیت مکمل ہوتی ہے سوانح نگار کو واقعات' افعال اور اعمال پر ہی انحصار نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان کے نفسیاتی محرکات ان سے پیدا ہونے والے جذبات' احساسات رجحانات' معتقدات کا بھی پتا لگانا ہوگا۔ مختلف اوقات پر داخلی ردعمل معلوم کرنے کی سعی کرنا ہوگی۔ موضوع کے حصہ میں جو خوشیاں' غم' کامرانیاں اور ناکامیاں آئی ہوں۔ جنہوں نے اس کے کردار اور شخصیت کی صورت گری پر اثرات مرتب کئے ہوں ان کا کھوج لگانا ہوگا۔ ماہر علوم سماجیات کی طرح سوانح نگار اس ماحول اور معاشرت کا بھی پتا چلاتا ہے جس میں موضوع نے پرورش پائی۔ وہ اس کی شخصیت پر اس ماحول کے اثرات کی نشاندہی بھی کرتا ہے اس ضمن میں ان ہستیوں کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جن سے موضوع متاثر ہوا اور جس کے کارناموں نے اس کے دل میں امنگ اور ولولے پیدا کئے۔ جن حقائق اور نظریات نے زمانہ کے تقاضوں کو سمجھنے کا شعور پیدا کیا جن اصولوں نے زندگی بسر کرجانے کا قرینہ سکھایا اور کچھ کر گزرنے کا عزم عطا کیا۔ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر شخصیت کی عظمت استوار ہوتی ہے۔ سوانح نگار موضوع کی تعمیر نو ان کے بغیر نہیں کرسکتا تلاش اور تحقیق کا یہ کام کان کنی کے مترادف ہوتا ہے۔

عام طور پر سوانح عمری کا تیسرا شعبہ اسلوب سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے اس کی معنویت میں اضافہ کی خاطر اسے رویہ یا (Treatement) قرار دیا ہے اور اس میں اسلوب پیشکش دونوں کو شامل کیا ہے۔ سوانح نگار کو موضوع سے قلبی' روحانی یا ذہنی لگاؤ ہونے کے باوجود اسے غیر جانبداری سے پیش کرنا ہوتا ہے۔ وہ شخصیت کی تعمیر نو کرتا ہے اور یہ تعمیر اسی رنگ میں مناسب ہوگی جو رنگ شخصیت کا ہو۔ انسان خوبیوں اور برائیوں' اچھائیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہے۔ خیر مجسم یا شر محض کوئی نہیں ہوتا ہر اچھے انسان میں کسی نہ کسی نوع کی کمزوریاں ضرور ہوتی ہیں اور ہر برے آدمی میں ظاہر یا پوشیدہ نیکی کا ہونا لازم ہے کامیاب سوانح نگار وہی ہے جو موضوع کے



حسن و قبیح اور نیک و بد کو پوری ایمانداری اور غیر جانبداری سے پیش کرے یہی اس فن کا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے کیوں کہ سوانح نگار تو اسی وقت قلم اٹھاتا ہے جب وہ کسی سے لگاؤ رکھتا ہے ایسے میں خامیوں کے ذکر سے اجتناب نفسیاتی ضرورت بن جاتی ہے اور اس کی تصنیف "کتاب المناقب" بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کیفیت میں مکمل غیر جانبداری کی توقع نہیں کی جاسکتی اس کے باوجود فن کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ جہاں خوبیوں کا بہ بانگ دہل اعلان کیا جائے وہاں خامیوں کی نشاندہی بھی ہوتی رہے ضروری نہیں کہ رویۂ محتسبانہ ہو' لعن طعن سے کام لیا جائے بلکہ کمزوروں کو ہمدردانہ طریقے پر عین بشریت کے تقاضے کے طور پر پیش کیا جائے۔ موضوع کی زندگی اعمال اور کردار کے مثبت پہلوؤں کے بیان میں تحریر کی سنجیدگی' وقار' اعتدال اور توازن کا قائم رہنا ضروری ہے کسی جملے پر قصیدہ خوانی یا جانبداری کا اعتراض وارد نہ ہو۔ یہ بات فن سوانح نگاری کے منافی ہوگی کہ اظہار اثر پذیری اور لگاؤ کو عقیدت اور ارادت کی صورت دے دی جائے اور ہر بار شخصیت کے ذکر کے ساتھ "حضرت' قبلہ' محترم یا رحمتہ اللہ علیہ" جیسے سابقوں کا اعادہ ہو' ارادت کی فراوانی اور الفاظ کی گرانباری لکھنے والے کی آسودگی قلب کا باعث ہوسکتی ہے پڑھنے والے کو متوجہ نہیں کرسکتی۔ اس سے واضح طور پر جانبدارانہ رویہ کا اظہار ہوتا ہے جو فن کے لحاظ سے بہت بڑی کمزوری ہے مثلاً" آزادی کے بعد لکھی جانے والی سوانح عمریوں میں سے ایک سید سلیمان ندوی کی سوانح "حیات سلیمان" ہے جسے ان کے شاگرد شاہ معین الدین ندوی نے تحریر کیا۔ شاہ معین الدین مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگرد تھے۔ وہ اپنے استاد کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ ان کا دل بھی جذبات عقیدت سے معمور تھا لیکن ان کی سوانح عمری لکھی تو ایک شاگرد کی حیثیت سے نہیں ایک سوانح نگار کی حیثیت سے ! اس میں اپنے استاد کے تمام مثبت اور منفی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور انہیں من و عن تحریر کردیا ہے۔ یہ طریقہ انہوں نے علامہ شبلی اور مولانا سلیمان ندوی سے ہی سیکھا تھا۔ علامہ شبلی بھی اسی نظریئے کے حامی تھے۔

سوانح عمری کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ مصنف نے مجموعی طور پر کیا رویۂ اختیار کیا ہے اور اس میں کس حد تک حقیقت پسندی اعتدال اور توازن سے کام لیا ہے۔

مصنف کا طرز تحریر موضوع کی خصوصیات کے مطابق ہونا چاہئے کسی صوفی یا مذہبی بزرگ کی سوانح عمری اس شگفتگی کی متحمل نہیں ہوسکتی جو مزاح سے قریب تر ہو اور نہ کسی زندہ دل مجلسی کو سنجیدہ اور پروقار انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے گویا سنجیدہ مزاج شخصیت کے لئے سنجیدہ اور شوخ

مزاج کے لئے شگفتہ تحریر ہی مناسب ہو سکتی ہے۔

اگر موضوع کے بارے میں معلومات یا مواد کی تلاش کان کنی ہے تو اس کے پیشکش کا انداز حاصل شدہ پتھر کو تراش کر خوبصورت اور قیمتی ہیرہ قرار دینے کے مترادف ہے۔ اردو ادب میں کان کنی کے نمونوں کی کمی نہیں تراش خراش کا فرض ادا کرنے والوں کی البتہ کمی رہی ہے۔

ہم نے اپنے مقالہ کے اس باب میں انہیں فنی تقاضوں اور ضرورتوں کو مدِ نظر رکھ کر ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء کے عرصہ میں سوانح نگاری کے رجحان کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور آزادی کے بعد لکھی جانے والی علمی، ادبی اور فنی شخصیات کی سوانح عمریوں کو مذکورہ باب میں جگہ دی ہے جبکہ دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے مشاہیر کی اردو میں لکھی جانے والی سوانح عمریوں کے لئے علیحدہ ابواب قائم کئے ہیں۔ ہم نے اس بات کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ سوانح نگار اور صاحب سوانح کی اہمیت اور افادیت کے تحت تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیں جو موضوع کے لحاظ سے کہیں مختصر اور کہیں طویل ہے۔ علاوہ ازیں غیر ضروری تفصیلات میں جانے سے گریز کیا ہے۔ جہاں ضرورت ہوئی اپنی تحقیق اور تنقید کی حمایت میں مستند حوالوں سے کام لیا ہے۔

○



# باب دوم (الف)

## علمی، ادبی اور فنی شخصیات کی

## مستقل سوانح عمریاں

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

## یادگار حالی: صالحہ عابد حسین: دہلی: ستمبر ۱۹۴۹ء

یادگار غالب' حیات سعدی اور حیات جاوید جیسی سوانح عمریاں لکھنے والے کی سوانح عمری جس جامعیت اور مرتبہ کی ہونی چاہئے تھی صالحہ عابد حسین نے "یادگار حالی" لکھ کر اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ وہ خود اسی خاندان کی فرد تھیں لیکن وہ حالی کا احترام صرف اس لئے نہیں کرتی تھیں کہ وہ نامور اسلاف میں تھے انہوں نے حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے اظہار کیا ہے کہ

"میری عقیدت ان کے خاندانی رشتے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس عظیم الشان خدمت کی وجہ سے ہے جو انہوں نے اردو ادب' اردو شاعری اور اردو زبان کی انجام دی۔"

"دوسرا سبب میری عقیدت کا حالی کی لاثانی سیرت ہے۔ حالی انسان کی حیثیت سے ولی صفت شخص تھے۔" (۳)

کتاب ۳ حصوں پر مشتمل ہے "نشوونما (۲۵ تا ۴۶) آب ورنگ (ص ۴۳ تا ۱۴۲) اور برگ وبار (ص ۱۴۳ تا ۲۴۱) نشوونما میں حالات زندگی بیان ہوئے ہیں۔ مصنفہ نے حالی کی خود نوشت حالات' حیات جاوید' مقدمہ مسدس حالی' خطوط اور دیگر تحریروں سے استفادہ کیا ہے وہ حالی کے سوانحی حالات میں خاطر خواہ اضافہ نہیں کر سکیں ان کی خارجی زندگی بیان کرتے ہوئے سیاسی اور معاشرتی حالات کے پس منظر میں ان کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ اس نوع کی کاوش بھی نہیں کی گئی۔ گھریلو زندگی اور شب و روز کی مصروفیات کا احوال بھی بیان کرنے سے قاصر رہی ہیں۔ سوانح نگار کا رجحان مطبوعہ منتشر مواد کو یکجا کرنے کا ہے۔

دوسرا باب "آب ورنگ" حالی کی سیرت کے بارے میں ہے اس پر زیادہ توجہ کی گئی ہے اس میں حصول تعلیم کی لگن' استفادہ اور قناعت' شہرت پسندی اور اجتناب' کسر نفسی' حیاءً اپنا کلام سنانے سے گریز' غیبت اور بدگوئی سے نفرت کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ خواجہ غلام الثقلین کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ

"مولانا حالی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیانہ خیالات کی رو سے ایک صاحب دل ولی تھے۔ کبھی کسی کی برائی ان کے منہ سے نہیں سنی گئی۔ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے۔"

حالی کے مزاج کے حوالہ سے مصنفہ نے لکھا ہے کہ

"ہمارے دیس میں عام طور پر اہل علم اور اہل فن لاپروا' بے سلیقہ اور دنیا کے واقعات اور

حالات سے بیگانہ محض ہوتے ہیں اور یہ ان کی خاص صفات سمجھی جاتی ہیں لیکن حالی باوجود عالم، شاعر اور ادیب ہونے کے ان صفات سے آراستہ نہ تھے وہ منتظم، سلیقہ شعار، صفائی پسند اور خوش ذوق انسان تھے۔ ان کے لباس، مکان میں طرز رہائش اور معاشرت ہر چیز میں سادگی اور نفاست، سلیقہ اور صفائی کا خوبصورت امتزاج نظر آتا تھا۔" (۴)

"آب ورنگ" اس کتاب کا دلکش ترین حصہ ہے اس کو پڑھنے کے بعد حالی کی سیرت و کردار سے مکمل آگہی حاصل ہو جاتی ہے خصوصیت سے گھریلو زندگی میں ان کے رویہ کا پتا چلتا ہے وہ اپنے گھر میں افراد خاندان کے ساتھ ہنستے بولتے، چلتے پھرتے نظر آتے ہیں کبھی اپنے ننھے نواسے سیدین کی آواز پر اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور اس کے معصوم سوالوں کا دلجوئی سے جواب دیتے ہیں، کبھی عیدین یا تقاریب میں لڑکیوں کی دلچسپیوں میں شریک نظر آتے ہیں۔ مہمانوں کی سادگی کے ساتھ تواضع کرتے ہیں، مہمان بنتے ہیں تو میزبان کے لئے تکلیف کا باعث بننے سے گریز کرتے ہیں۔

حالی گزرے دور کے نمائندہ فرد تھے ان کے حالات کے پس منظر میں ہمیں ایک دور کی معاشرت، اس کا رکھ رکھا، باہم میل ملاپ، اپنوں اور غیروں کے ساتھ ہمدردی کی روایات ملتی ہیں جو انسانی زندگی کا سرمایہ ہیں اور اب مفقود ہوتی جاتی ہیں۔

حالی منکسر المزاج تھے۔ ان کے ہر کام میں ایک دلنواز دھیما پن تھا ان کی شخصیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلوب میں بھی وہی دھیما پن اختیار کیا ہے۔ جو مصنف کے صاحب طرز ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ "برگ وبار" حالی کے ادبی کارناموں کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے سوانح نگاری کی ضرورتوں کو پورا نہیں کیا بطور سوانح عمری "یادگار حالی" جامع نہیں ہے۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد

"بلاشبہ یہ خواجہ صاحب کی مطلوبہ سوانح عمری نہیں ہے لیکن مطلوبہ سوانح عمری کا ایک ایسا قیمتی مواد ہے، جس سے زیادہ مستند مواد ہمیں نہیں مل سکتا" (۵)

سوانحی حالات کی نسبت اوصاف اور کردار کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ سیرت نگاری کے لحاظ سے یہ یقیناً "ایک اہم کارنامہ ہے۔

## امیر خسرو: محمد وحید مرزا: الہ آباد، یوپی: ۱۹۴۹ء

یوں تو حضرت امیر خسرو کی زندگی اور ان کی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر متعدد مضامین لکھے



گئے لیکن باضابطہ سوانح نگاری اور کارناموں پر جامع کتاب کی کمی ہمیشہ محسوس کی گئی۔ اس سلسلہ میں وحید مرزا کی کتاب "امیر خسرو" ایک اہم اضافہ ہے۔ انہوں نے سوانح نگاری کے فن کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر یہ کتاب تحریر کی ہے۔ حالات زندگی کو ابواب میں تقسیم کرکے اسے تاریخی ترتیب سے تحریر کیا ہے کہ مکمل زندگی کا خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ ابتدا میں صاحب سوانح کے حسب ونسب کا حال ہے جس کے ضمن میں ان کے اجداد سے برصغیر آنے کے عہد کا تعین کیا ہے۔ عام طور پر لکھا گیا ہے کہ ان کے والد سیف الدین محمد تغلق کے عہد میں آئے تھے لیکن وحید مرزا نے مستند حوالوں کے ذریعہ ان کی آمد کا زمانہ سلطان شمس الدین التمش کا دور حکومت قرار دیا ہے۔ سیف الدین محمود نے یہاں آنے کے بعد نواب عماد الملک کی بیٹی سے شادی کی تھی انہیں کے بطن سے امیر خسرو ۶۵۳ھ میں پیدا ہوئے۔ نواب عماد الملک کی سرپرستی میں پروان چڑھے اور تعلیم وتربیت حاصل کی۔ تعلیم کے مراحل کا تفصیلی احوال معلوم نہیں ہو سکا ہے اور نہ ان اساتذہ کے نام موجود ہیں جن کے فیض سے وہ صاحب علم ہوئے۔ البتہ امراء، شہزادوں اور دربار سے تعلق کی روداد مفصل ہے۔ ان کے حوالے سے اس دور کے اہم تاریخی واقعات کا اعادہ بھی کیا ہے لیکن اسے سوانحی ضرورت سے آگے نہیں بڑھنے دیا گیا اور نہ ان ابواب کو محض تاریخ بنا دیا ہے۔ ایک باب حضرت نظام الدین اولیاء سے توسل خاص کے لئے وقف ہے اسی میں ان کے صوفیانہ خیالات کا جائزہ لیا گیا ہے آخری حصے میں امیر خسرو کی تصانیف کو موضوع بحث بنایا ہے اگرچہ یہ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے اور اس میں اہم اور ضروری معلومات موجود ہیں لیکن مواد کی عدم دستیابی کی وجہ سے جامع نہیں ہے۔ قاری کو اس کے مطالعہ کے بعد بھی تشنگی کا احساس رہتا ہے۔

## آثار ابوالکلام آزاد: قاضی عبدالغفار: دہلی: ۱۹۴۹ء

قاضی عبدالغفار ادب میں اعلیٰ پائے کی تخلیقی صلاحیتیں رکھتے ہیں ان کی ہر تصنیف روایت سے ہٹ کر ایک نئے انداز کی ہے ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا مشرقی اور مغربی، قدیم اور جدید علوم وادبیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ اپنے حاصل کردہ علم اور اس کی برکات سے انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ "آثار ابوالکلام آزاد" کے ذریعہ انہوں نے سوانح اور شخصیت نگاری کی نئی طرح ڈالی ہے اس بارے میں ڈاکٹر شاہ علی کا بیان ہے کہ

"ہیرو کی زندگی کا تنوع سوانح نگاری کے بیان میں بھی تنوع کا طالب ہوتا ہے۔ ایک کامل اور متنوع حیات کی تالیف میں صرف سنہ وار بیان حقائق کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔"

"سوانح نگار کو پلوٹارک کے مانند سوانح نگاری کے اصل اصول یعنی اندرونی فطرت کی مرقع کشی پر عمل پیرا ہونا چاہئے نہ کہ صرف بیرونی افعال کی وقائع نگاری پر" (۶)

قاضی عبدالغفار بھی اسی اصول کے قائل ہیں۔ انہوں نے "آثار ابوالکلام آزاد" کو اسی نہج پر تصنیف کیا ہے۔ فن سوانح نگاری کے بارے میں اپنے رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ

"میں خود تو ایسی سوانح نگاری کا قائل نہیں جس کی اساس زندگی کے صرف ایسے واقعات ہوں کہ کب پیدا ہوا' کس کے بیٹے تھے' کہاں تعلیم حاصل کی' کیا کیا کام کئے' قومی لیڈر تھے تو قوم کی کیا خدمت کی' عالم فاضل تھے تو علم و فضل کا کیا مقام تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک مقررہ سانچہ ہے۔" (۷)

اپنے طرز تصنیف کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ یہ جدید اور نادر ہے لیکن اس کی کامیابی یا ناکامی کا وہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھے چنانچہ لکھتے ہیں کہ

"ہندوستانی زبان میں سوانح نگاری میں ایک نئے اسلوب کا آغاز ضرور ہوتا ہے گو کہ وہ کتنا ہی ناقص اور نامکمل سمجھا جائے۔" (۸)

کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے نقش اول اور نقش ثانی۔ نقش اول مولانا کی علمی اور سیاسی مشغولیتوں اور رجحانات کو ان کی تحریروں اور تقریروں کی روشنی میں مرتب کیا ہے ویسے بھی مصنف صحافت اور کانگریس کی سیاست سے وابستگی کی بناء پر صاحب سوانح کے حالات و کوائف' نظریات اور رجحانات سے خوب واقف تھے۔ صاحب سوانح کی تحریروں اور تقریروں سے جو کوائف مرتب کئے ہیں اس کی مزید وضاحت اور ضرورت کی خاطر سیاسی پس منظر کو بھی ساتھ ساتھ بیان کرتے گئے ہیں اس نوع کی تحریروں میں مباحث صاحب سوانح کی جانب سے پیش کئے جانے چاہئیں۔ مصنف نے اکثر مقامات پر اپنے خیالات کو ترجیح دے کر ایسے نتائج اخذ کئے ہیں جن کی تائید شاید صاحب سوانح بھی نہ کرتے۔ غبار خاطر میں مولانا نے چڑیا کی کہانی لکھی ہے۔ ان کا جو بھی مقصد تھا وہ کہانی سے واضح ہے۔ مصنف نے اس کا موازنہ اقبال کے فلسفہ خودی سے کیا ہے اس میں صاحب سوانح کا نقطہ نظر نہیں بیان کیا بلکہ "ایجاد بندہ" سے کام لیا ہے۔ لکھتے ہیں



"اقبال نے بھی فلسفہ خودی ایک رمز ہستی کی حیثیت سے پیش کیا ہے مگر مولانا اور اقبال کے درمیان فکر و نظر کا ایک فرق بین ہے۔ اقبال رمز خودی کا فلسفہ صرف مسلمانوں کے لئے پیش کرتے ہیں اسی کو مخاطب بناتے ہیں اور اسی کی زندگی کا پیغام دیتے ہیں مگر مولانا کا فلسفہ حیات اقبال سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔" (۹)

جس شاخ پر مصنف نے آشیانہ بنایا ہے وہ اتنا نازک ہے کہ ان کے تاویل کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتا سطحی نقطۂ نظر سے کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فلسفہ خودی بیان کیا ہے تو یہ صرف مسلمانوں کے لئے ہے اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ صاحب سوانح نے چڑے چڑیا کی کہانی بیان کی ہے تو ان کا فلسفہ خودی چڑے یا چڑیا کے لئے ہے۔ امر واقعی یہ ہے کہ مخاطب چاہے کوئی ہو مطالب سب کے لئے ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ ذہنی تعصب کا شکار نہ ہو۔ اقبال نے تو اپنے بیٹے "جاوید" کو مخاطب کر کے بھی پیغام دیا ہے کیا وہ صرف "جاوید" کے لئے سمجھا جائے۔ وسیع النظری لوگ اقبال کے فلسفہ کو وسیع النظر سے دیکھتے ہیں اسی لئے آج وہ امت مسلمہ کے شاعر ہی نہیں مانے جاتے بلکہ آفاقی شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔

## پریم چند: ہنس راج: رہبر: دہلی: اکتوبر ۱۹۵۰ء

پریم چند اردو افسانوی ادب کا ایک عہد اور ایک روایت تھے۔ افسانے میں حقیقت پسندی کا آغاز انہیں کی تحریروں سے ہوا جب بھی اردو افسانے کی تاریخ بیان کی جائے گی ان کا نام سرفہرست ہی رکھا جائے گا۔ ہنس راج رہبر نے تحقیق اور تلاش کے ذریعہ صاحب سوانح کے حالات زندگی یکجا کئے ہیں اور یہ کوشش بھی کی ہے کہ زندگی کی کہانی ان کی لکھی ہوئی کہانیوں میں تلاش کریں جہاں تک حقیقی واقعات کا تعلق ہے اس کے لئے چھان بین بھی کی ہے اور حتیٰ الوسع غلطی کے امکان سے بچنے کے لئے ان کی زندگی کے انہیں واقعات کو کہانیوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے جو خود انہوں نے یا محترمہ شیورانی دیوی نے یا کسی اور واقف کار نے لکھے ہیں یا عام طور پر معلوم ہیں اس احتیاط پسندی کی وجہ سے پریم چند کی زندگی اور افسانوی حقائق کی یکسانیت منظر عام پر آئی ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے پریم چند کے افسانوں کے بارے میں لکھا ہے

"خارجی ماحول کی محرومیاں آدمی کو تخیل پرست بنا دیتی ہیں زندگی میں جن مسرتوں کا فقدان ہوتا ہے آدمی انہیں تخیل میں ڈھونڈتا ہے۔ ہوائی قلعہ بناتا ہے' ننھا دھنپت رائے جن عالی

شان محلوں کے خواب دیکھا کرتا تھا وہ اسے ساری عمر میسر نہیں آئے لیکن اس تخیل پرستی نے پریم چند کو نئی اور بہتر زندگی کا معمار بنا دیا۔ بڑے ہو کر انہوں نے اپنی کہانیوں میں یہ ہوائی قلعہ جا بجا بنائے ہیں اور انہیں زمین پر اتارنے کی کوشش کی ہے۔" (۱۰)

ہنس راج رہبر نے تحقیق کے علاوہ افسانوں سے مدد لے کر پریم چند' ان کی شخصیت اور ان کی خواہشات اور آرزوؤں کو یکجا کر دیا ہے اس طرح یہ خارجی اعمال کے ساتھ داخلی کشمکش اور واقعات پر ردعمل کی کہانی بھی بن گئی ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا جدت آمیز تجربہ ہے اور کامیاب بھی ہے۔

پریم چند کی ولادت' اور خاندان کے حالات کا تفصیلی ذکر نہیں ان کے حالات زندگی کی ابتدا تعلیم کے زمانہ سے ہوئی ہے ان کی زندگی کے ہر دور پر مفصل لکھا گیا ہے اور عام زندگی اور گھریلو زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

## ذکر غالب: مالک رام: دہلی: اکتوبر ۱۹۵۰ء

ذکر غالب مطبوعہ ۱۹۵۰ء اگرچہ دوسرا ایڈیشن ہے لیکن پہلے ایڈیشن کی نسبت اس میں اس قدر اضافہ ہے کہ اسے جدید تصنیف ہی کہا جا سکتا ہے اس امر کا اظہار سید عابد حسین نے کتاب کے دیباچے میں بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"یہ اس تمام تحقیق کا نچوڑ ہے جو اب تک غالب کی سیرت کے متعلق ہو چکی ہے اس کے علاوہ اس میں مالک رام نے نئے ماخذوں کو کھنگال کر نئی معلومات فراہم کی ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں۔ پہلا ایڈیشن بھی اس لحاظ سے کچھ کم امتیاز نہیں رکھتا تھا اور موجودہ ایڈیشن میں تو ایسے مفید اضافے ہوئے ہیں کہ اہل ذوق کی نظر میں کتاب کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی ہے۔" (۱۱)

ابتدائی باب جس میں مصنف نے غالب کے اجداد کا سراغ لگانے کی کوشش میں ایران کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے بہت طویل ہو گیا ہے۔ اس میں گلشائی نسل کے چار گروہوں کی تفصیل بھی ہے اسی کے ضمن میں خاندان سلجوق کا احوال درج ہے آل سلجوق تقریباً" تین سو سال (۴۰۳ھ لغایت ۷۰۰ھ) ایران پر شان و شوکت کے ساتھ حکمران رہے۔ خوارزمیوں کے ہاتھوں ان کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ ماوراالنہر میں منتشر ہو گئے۔ انہیں میں ایک ترسم خان بھی تھے جنہوں نے سمرقند میں سکونت اختیار کی تھی وہی مرزا غالب کے پردادا تھے اسی طرح غالب کے دادا قوقان بیگ' ان کے والد' چچا اور ننھیال کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات



درج ہیں تعلیم کے سلسلے میں محمد معظم' اور نظیر اکبر آبادی سے استفادہ پر بھی بحث کی ہے اور جہاں تک ممکن ہوا زندگی کے ہر دور کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں چنانچہ جوانی کی بے راہ روی اور رنگینیوں' نجی حالات' متاہل زندگی' پنشن کا مسئلہ' مغلوں اور انگریزوں کے درباروں سے تعلق' ذریعہ معاش' طرز بود و باش کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ سو صفحات سے زائد پر مشتمل جامع سوانح عمری صداقت کی تلاش میں جستجو کی نشاندہی کرتی ہے۔ موقع موقع سے پُرلطف واقعات اور لطائف بھی بیان کیے ہیں ان سے غالب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ معلومات کی فراہمی میں مصنف کو زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ غالب کے خطوط' ان کی مثنویاں' حالی کی یادگار غالب اور دیگر معاصرین کی تحریریں ممد ثابت ہوئی ہیں۔ مصنف نے ان سے استفادہ بھی کیا ہے اور انہیں حسن ترتیب سے آراستہ بھی کیا ہے۔

حالات زندگی کے بیان سے ہی صاحب سوانح کے مزاج اور ان کی سیرت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مصنف نے انہیں موضوع بنا کر جداگانہ باب مختص نہیں کیا ہے اگرچہ کتاب پڑھنے سے غالب کی زندگی اور شخصیت کے نقوش واضح ہوتے جاتے ہیں لیکن سیرت کے حوالہ سے الگ باب لکھا جاتا تو بہتر تھا اس معاملہ میں مصنف نے قاری کے فہم و ادراک پر زیادہ ہی بھروسہ کر لیا ہے یہ کوئی خامی بھی نہیں ہے۔ واقعات اور سیرت کا اظہار ساتھ ساتھ بھی ہو سکتا ہے مصنف نے اسی رجحان کو باقی رکھا ہے۔

مرزا غالب مصنف کے ممدوح ہیں انہوں نے غالب کی بے راہ رویوں کا ذکر کیا ہے لیکن محتاط انداز میں بعض مقامات پر ان کے حاصل کردہ نتائج مبالغہ آمیز معلوم ہوتے ہیں غالب کی اخلاقی اصلاح میں مولوی فضل الحق خیر آبادی کا بڑا ہاتھ رہا لیکن مصنف کا یہ رائے قائم کرنا کہ ان کا مزاج اور ان کے معمولات بھی بدل گئے تھے درست نہیں معلوم ہوتا غالب کے خطوط سے ان کی تردید ہوتی ہے بلکہ مصنف غالب کی طرفداری میں خود بھی تضاد کا شکار ہو گئے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ

"مولوی فضل الحق خیر آبادی کے زیر اثر "غالب نے اپنی آزادانہ زندگی ترک کر دی اگرچہ اب بھی کبھی روز ابر اور شب ماہتاب میں شراب نوشی تو کر لیتے تھے اور آخر تک کرتے رہے مگر اب زندگی کا وہ پہلا خود کشا ہنجار موقوف ہو گیا ان میں مذہبیت کا عنصر پیدا ہو گیا۔" (۱۲)

درپردہ غالب کی طرفداری کے رجحان سے قطع نظر "ذکر غالب" صاحب سوانح کی بازیافت کی کامیاب کوشش ہے۔

## حیات سرسید: نور الرحمٰن: علی گڑھ: ۱۹۵۰ء

نور الرحمٰن کی کتاب "حیات سرسید" نو ابواب پر مشتمل ہے۔ جس کے پہلے باب میں خاندانی پس منظر، ولادت اور تعلیم و تربیت کا احوال اجمالاً" درج ہے۔ موضوع کے بارے میں جس دقتِ نظر سے کام لینا چاہئے تھا نہیں لیا گیا البتہ حالات غدر (باب دوم) سفر انگلستان (باب سوم) اصلاح و ترقی معاشرہ، تعلیم، قیام ایم اے او کالج (باب چہارم) خدمات کونسل، ملکی خدمات اور وفات (باب پنجم) میں بیشتر معلومات "حیات جاوید" سے بلا حوالہ استفادہ ہیں اور ان میں اضافہ بھی نہیں کیا گیا ہے۔ مذہبی خدمات (باب ششم) سیاسی عقائد (باب ہفتم) اردو سے دلچسپی اور بقائے اردو کی کوشش (باب ہشتم) سے متعلق ہیں ان سب کا تعلق سرسید کی خارجی زندگی اور کارناموں سے ہے ان کے افکار پر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے بالخصوص اس لحاظ سے کہ ایک مکتب فکر نے ان سے اختلاف کیا ہے ان کا محاسبہ کرکے کسی ایسے نتیجے پر پہنچنا ضروری ہے کہ سرسید کی شخصیت و کارناموں کی خوبیاں یا خامیاں عیاں ہوں اس جانب مصنف نے توجہ نہیں دی ہے۔ نجی زندگی اور گھریلو حالات کے بارے میں اس کتاب سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتیں آخری باب سرسید کی شخصیت کے بارے میں ہے اس میں ان کے اوصاف کو توصیفی انداز میں پیش کیا ہے جیسے

"ایک شخص واحد جو موجوں کے تھپیڑے اور تلاطم کے ہچکولے بھی سہتا رہا اور باوجود بے سروسامانی و کثرت حوادث اپنے قوائے عقلی و ذہنی سے سکون و استقلال اور ہمت و پامردی کے ساتھ کام بھی لیتا رہا وہ سرسید احمد خان تھے۔" (۱۳)

"اگرچہ سرسید کی تعلیم کی تکمیل نہ ہوئی۔ دولت و ثروت سے بھی محروم تھے، حکومت میں کوئی غیر معمولی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ جدید ترقیات اور علوم سے مطلق بے بہرہ تھے سیاسیات و تعلیم جدید کے اصول سے ناآشنائے محض تھے بااین ہمہ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے مصنف سب سے زیادہ صاحب جاہ و ثروت، حکومت کے بڑے سے بڑے معتمد، جدید علوم کے سب سے بڑے قدر شناس اور ماہر سیاسیات و ماہر تعلیم قرار پائے۔" (۱۳)

بحوالہ بالا بیان میں خیالات کا تضاد بھی ہے اور وہ کیفیت بھی جسے "غیر مدلّل مدح" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ شخصیت نگاری میں یہ وصف ہونا چاہئے کہ حالات و واقعات کے ذریعہ کسی پہلو کو اجاگر کیا جائے نہ یہ کہ بغیر دلیل کے دعوے کئے جائیں۔



حیات جاوید جیسی جامع تصنیف کی موجودگی میں سرسید احمد خان کی سوانح عمری پر قلم اٹھانے کے لئے حالی سے زیادہ معلومات، فنی قدروں کا شعور، بیان میں تحمل اور شخصیت نگاری کے فن پر عبور ضروری ہے حیات سرسید کے مصنف نے ان کا ثبوت نہیں دیا ہے۔

## حکیم الامت، نقوش و تاثرات: عبدالماجد دریا بادی: اعظم گڑھ: ۱۹۵۳ء

یہ مولانا اشرف علی تھانوی کی سوانح عمری ہے جسے مصنف نے خطوط اور ذاتی تاثرات کے سہارے ترتیب دیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی جو اپنے معاصرین میں ممتاز و منفرد حیثیت کے حامل تھے اور حکیم الامت کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ مصنف نے کتاب کے دیباچے میں جس طرح ہیرو کا تعارف کروایا ہے اس کے سبب ہیرو سے ان کی عقیدت و محبت اور بے باکانہ انداز تحریر کا پتا چلتا ہے اور ہیرو کی شخصیت بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔

"حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی بزرگ کس مرتبہ کے، اور ولی اللہ کس پائے کے تھے اس کا حال تو وہی بتا سکتا ہے جو خود بھی بزرگ، عارف اور ولی اللہ ہو اپنے کو تو اس کوچے کی ہوا تک نہیں لگی لہٰذا اگر کسی صاحب نے کتاب کو اس ارادے سے کھولا ہے کہ اس میں حضرت کے مرتبہ معرفت و ولایت کی تفصیل درج ہے یا ان صفحات میں حضرت کے مناقب عرفان و مدارج روحانی کا بیان ہوگا تو خیر اسی میں ہے کہ آگے وہ ورق گردانی کی زحمت ہی گوارہ نہ فرمائیں اور کتاب کو بغیر پڑھے بند کی بند رہنے دیں۔"

"اور چونکہ ان کی انسانیت ان کے مفسر و فقیہ و درویش ہونے سے الگ بھی نہیں کی جا سکی اس لئے ضمناً" ان کے علم و فضل تفقہ و سلوک کا لانا بھی ناگزیر ہو گیا۔

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر

ورنہ حقیقتاً" مصوری ان کی انسانیت کی کرنی تھی وہ بھی اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کے حدود کے اندر۔" (۱۵)

اس سوانح عمری لکھنے کا محرک مصنف کا عقیدت مندانہ جذبہ اور ہیرو سے محبت کا اظہار ہے لیکن مصنف کو ہیرو کے عرفانی مدارج نے اتنا متاثر نہیں کیا جتنا کہ اس کے انسانی اور قابل تقلید کردار نے کیا ہے۔

سوانح نگاری کی خوبی یہ ہونا چاہئے کہ وہ قاری کی دلچسپی کو بھی مد نظر رکھے اور حقائق سے بھی صرف نظر نہ کرے اور اس اعتبار سے عبدالماجد دریا بادی جدید سوانح نگاروں کی صف میں نمایاں نظر آتے ہیں لیکن "حکیم الامت نقوش و تاثرات" لکھتے وقت انہوں نے شاید کسی خاص مقصد کے تحت سوانح عمری کو ابواب میں تقسیم کرنے کی زحمت نہ کی بلکہ تسلسل کے ساتھ لکھتے چلے گئے۔ یہ بھی ان کا ایک منفرد انداز ہے لیکن اس کے سبب قاری کو مشکلات اور جھنجلاہٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا ہے اس کی دلچسپی میں خود بخود اضافہ ہوتا جاتا ہے مولانا عبدالماجد دریا بادی ہیرو کے مشاغل کا مختصراً ذکر کرتے ہیں اور معلومات کا انبار لگا دیتے ہیں۔ ہیرو سے ان کی عقیدت و محبت انہیں غیر جانبداری سے جانبداری کی طرف لے جاتی ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں

"واہ رے حکیم الامت! یہ جواب جس میں اتنی مصلحتوں کی رعایت ہو ان کے سوا کوئی دے نہیں سکتا تھا۔ ان ہی تجربوں سے تو بار بار کہنا پڑتا ہے عالم و فاضل، ذاکر و مشاغل عابد و زاہد، بزرگ و درویش ہونا اور چیز ہے، اور حکیم و مصلح ہونا کچھ اور" (۱۶)

عبدالماجد دریا بادی ایک صاحب طرز ادیب تھے شبلی سے خاصے متاثر تھے اور اردو کے ساتھ انگریزی ادب پر گہری نظر رکھتے تھے اسی لئے انہوں نے سوانح نگاری کے لئے اپنی نئی راہ بنائی مگر کہیں کہیں وہ سوانح نگاری کے اصولوں سے انحراف بھی کر گئے مثلاً "حکیم الامت" لکھتے وقت انہوں نے اس تاریخی پس منظر کو پیش نہیں کیا جس کی روشنی میں مولانا اشرف علی تھانوی کی شخصیت کے دیگر پہلو نہ صرف مزید نمایاں ہو سکتے تھے بلکہ ان کا تقابلی جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ پھر بھی انہوں نے مولانا تھانوی کے بارے میں بہت سی اہم معلومات فراہم کر کے ایک اچھے سوانح نگار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ مزید یہ کہ ذاتی تاثرات اور خطوط کی روشنی میں کسی کے سوانح مرتب کرنا ایک وقت طلب مسئلہ ہو سکتا ہے جسے انہوں نے بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے نبھایا ہے یہی مولانا عبدالماجد کی انفرادیت ہے۔

**وجیہہ الدین وجیہہ: محمد بن عمر: حیدر آباد دکن: اگست ۱۹۵۴ء**

بارہویں صدی ہجری کے ارتقا کے آخری دور کے شاعر وجیہہ الدین وجیہہ کے سوانحی حالات کی تحقیق اور اس کی تصانیف "پنچھی باچھا" (ترجمہ منطق الطیر) تحفۂ عاشقان (تصنیف



۱۱۵۳ھ) مخزن عشق (تصنیف ۱۱۴۴ھ) کے تعارف و تبصرہ پر مشتمل مقالہ محمد بن عمر نے جامعہ عثمانیہ کے ایم۔اے کے امتحان کے لئے لکھا تھا۔ دیگر دکنی شعرا کی نسبت وجیہہ کے حالات زندگی بہت ہی کم دریافت ہوئے ہیں۔ مقالہ نگار نے اس کے کلام سے جو کچھ اخذ کیا جا سکا اور ہمعصروں کے کلام یا ان کی زندگی کے حالات سے وجیہہ کے متعلق جتنی معلومات فراہم ہو سکیں ان کو بڑی خوبی سے ترتیب وار پیش کیا ہے۔ جن ماخذات سے انہوں نے استفادہ کیا ان کا دیانت داری سے حوالہ دیا ہے جہاں ان میں کوئی اختلاف پایا اس کی نشاندہی ہی نہیں کی بلکہ سچائی تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ معلومات کی عدم دستیابی کی وجہ سے مکمل سوانح تو مرتب نہیں ہو سکی صرف خاکہ تیار ہوا ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ سراج اورنگ آبادی اور داؤد اورنگ آبادی کے ہم عصر تھے، حنفی المذہب تھے، چاروں خلفاء اور حضرت غوث پاک کی خدمت میں درجہ بدرجہ ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے عربی اور خاص طور پر فارسی میں بہت اچھی استعداد تھی ان کے ترجمے اس کے غماز ہیں انہوں نے خوش حال اور فارغ البال زندگی گزاری فن موسیقی سے بھی لگاؤ تھا وہ صوفی منش ضرور تھے لیکن دنیا کی رنگینیوں اور زندگی کی دلچسپی کو ترک بھی نہیں کیا تھا۔ مقالہ نگار کا مطمح نظر حیات سے زیادہ کارناموں پر روشنی ڈالنا تھا اس لئے مقالہ کا بڑا حصہ اسی کے بارے میں ہے۔

**میر تقی میر، حیات و شاعری: خواجہ احمد فاروقی: دہلی: جولائی ۱۹۵۴ء**

"میر کا درجہ ہمارے کلاسیکی ادب میں بہت ممتاز ہے ان کی حیثیت ایک منجمد اکائی کی نہیں ہے وہ ادبی ارتقا کی ایک مضبوط کڑی ہیں انہوں نے اپنے زمانہ ہی کے ادب پر نقش نہیں چھوڑا بلکہ مستقبل کی گزرگاہوں کو بھی روشن کیا ہے۔" (۱۷)

اس حقیقت کو ہر زمانہ میں تسلیم کیا گیا لیکن اس تصنیف سے قبل ان کے سوانحی حالات پر کوئی مبسوط اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی تھی ضرورت تھی کہ دید و دریافت اور تنقید و تحقیق سے کام لے کر مواد جمع کیا جائے اور ایک کڑی میں پرو دیا جائے۔ یہ کام اردو کے معروف ادیب، نقاد اور محقق، خواجہ احمد فاروقی نے احسن طریقہ سے انجام دیا ہے۔

باب اول حیات و سیرت پر مشتمل ہے باب دوم میں میر کی نثری تصانیف میں ان کی فارسی خود نوشت "ذکر میر" کا تفصیلی جائزہ (ص ۵۳۲ تا ۵۷۶) لیا گیا ہے یہ بھی سوانح عمری کا حصہ ہے

کتاب کے یہ حصے اپنی جگہ ایک جامع سوانح عمری ہیں۔ اس سوانح عمری کو مرتب کرنے کے لئے "ذکر میر" ان کے اور معاصرین کے اشعار اور اردو شاعروں کے تمام تذکروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اختلاف کی صورت میں شواہد یا استدلال کے ذریعہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس کی اہم خصوصیت تاریخی واقعات، سیاسی ماحول اور سماجی حالات کے پس منظر میں میر کی زندگی کا احوال بیان کرنے کی کوشش ہے عام طور پر قدماء کے حالات زندگی تحریر کرتے ہوئے تاریخی پس منظر بیان ضرور کیا جاتا ہے لیکن صاحب سوانح کی زندگی سے اس کو مربوط نہیں کیا جاتا اس لئے "پس منظر" ایک "زائد اکائی" نظر آتا ہے۔ مصنف نے انہیں ایک دوسرے میں مدغم کر دیا ہے۔

سوانحی حالات تاریخی تسلسل میں لکھے گئے ہیں۔ ہر واقعہ اور حالات پر تحقیق سے کام لیا گیا ہے اور ماخذات کا حوالہ دے کر انہیں مستند بنایا گیا ہے اس تفصیل سے صاحب سوانح کی زندگی کے نشیب و فراز کا کوئی حصہ تشنہ نہیں رہا ہے میر کی افسردہ مزاجی اور تنگ مزاجی مشہور تو ہے لیکن اس کے وجود کا ذکر اس قدر موثر انداز میں کبھی پیش نہیں کیا گیا مصنف نے میر کو ایک فرد کی حیثیت سے نہیں دیکھا بلکہ معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے دیکھا ہے اور معاشرتی حالات نے ان پر اور ان کی شاعری پر جو اثرات مرتب کئے ہیں ان کی نشاندہی سے گریز نہیں کیا ہے خاندانی حالات، والد اور "عم بزرگوار" کا ذکر بھی موجود ہے لیکن گھریلو اور عائلی زندگی پر خاطر خواہ پردہ نہیں اٹھا ہے۔

مصنف نے سوانحی حالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ شواہد اور اسناد کے ذریعہ ان کی سیرت اور بنیادی تصورات کا بھی خاکہ پیش کیا ہے۔ صاحب سوانح کی سیرت کے ضمن میں ان کے قلندرانہ مزاج، خودداری، عالی ہمتی، وسیع المشربی، خدمت خلق، کریم النفسی بیان کئے ہیں اور بعض نفسیاتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح ایک کامیاب سوانح نگاری کے تمام لوازمات کا خیال رکھتے ہوئے اسے مکمل کیا ہے۔

## ذکر اقبال: عبد المجید سالک: لاہور: ۱۹۵۵ء

ذکر اقبال کا شمار بھی اردو میں آزادی کے بعد لکھی جانے والی عمدہ سوانح عمریوں میں ہوتا ہے۔ عبد المجید سالک جو اقبال کے معاصر شاگرد اور دوست بھی تھے انہوں نے اقبال سے



عقیدت مندی کا اظہار ان کی سوانح لکھ کر کیا کیونکہ انہیں یہ احساس تھا کہ اقبال کو بحیثیت شاعر اور فلسفی دیکھا جاتا رہا ہے ان کی تصانیف بھی نقد و نظر کی کسوٹی سے گزر چکی ہیں مگر ان کے سوانح پر کسی نے توجہ نہیں دی جبکہ اقبال پر بحیثیت قد آور شخصیت کے مکمل سوانح لکھنا ایک ضروری امر ہے چنانچہ سالک نے اقبال سے محبت اور عقیدت کے اس رنگ کو "ذکر اقبال" کے روپ میں پیش کیا جس کے بارے میں خود لکھتے ہیں

"مجھے خود بھی چوتھائی صدی تک براہ راست علامہ کی خدمت میں نیاز حاصل رہا اور علامہ کے احباب، اعزہ، مداحین اور ملاقاتیوں سے بھی شناسائی رہی ہے اس لئے مجھے رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ علامہ کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جن پر اب تک کماحقہ، روشنی نہیں ڈالی گئی لیکن وہ پہلو ایسے ہیں جو اہل علم کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہنے چاہئیں۔" (۱۸)

وہ اقبال کی جیتی جاگتی شخصیت کو قاری کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے چنانچہ رقمطراز ہیں

"صاحب شخصیت کے متعلق زیادہ سے زیادہ تفصیل درج ہے اور ان تمام جزویات کا تجزیہ کیا جائے جن کو پڑھ کر اس کی شخصیت کا بولتا چالتا تصور پڑھنے والے کے ذہن میں آجائے۔" (۱۹)

علامہ اقبال کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں شاعر اقبال، فلسفی اقبال، قوم کا مدبر اقبال اور مصنف اقبال وغیرہ۔ اس لئے ضروری تھا اقبال کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو ترتیب سے اس طرح سامنے لایا جائے کہ قاری کو اقبالیات کے ہر گوشے سے کماحقہ، واقفیت ہو جائے چنانچہ اس سلسلے میں مواد کا انتخاب اور اسے اکٹھا کرنا ہی ایک مشکل طلب مسئلہ تھا جسے سالک نے بڑی عرق ریزی سے جمع کر کے ان کی ظاہر و باطنی کیفیات، خیالات اور رجحانات اور کارناموں کی مکمل تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ مصنف نے اقبال کی فکر کو ایک مخصوص انداز میں پیش کیا ہے جس سے بچپن ہی میں ان کی ذہانت، رجحانات و خیالات کا پتا چلتا ہے۔ مصنف نے اقبال کی زندگی پر روحانی اثرات کا بھی سراغ لگانے کی کوشش کی ہے جس کے سبب اقبال نے مابعد الطبیعات کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور ان پر روحانی اثرات کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ انگلستان جانے سے قبل اقبال نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر بھی حاضری دی۔ اس سلسلے میں اقبال کی بزرگوں سے محبت اور عقیدت و احترام کے جذبہ کا بھی پتا چلتا ہے جس کی ایک مثال اقبال کے "سر" کے خطاب کی ہے کہ انہوں نے حق استادی کی پاسداری کرتے ہوئے اس وقت تک سر کا خطاب قبول نہ کیا جب تک کہ ان کے استاد میر حسن کو شمس

العلماء کے خطاب سے نہ نوازا گیا۔ مولانا سالک نے ایسے ہی اہم واقعات کی کڑیاں ملاتے ہوئے مفید نتائج اخذ کئے ہیں وہ معمولی جذبات کو بھی نظرانداز نہیں کرتے بلکہ ان کے حوالے سے نہ صرف اہم واقعات کو سامنے لاتے ہیں بلکہ ہیرو کی شخصیت کی جامعیت کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔

اقبال نہ صرف عوامی اور معاشرتی زندگی میں بلکہ نجی زندگی میں بھی سادگی کے قائل تھے لیکن اچھے کھانوں کے شوقین بھی تھے اس لئے پرہیز وغیرہ سے ذرا گھبرایا کرتے تھے اور ایلوپیتھک علاج کے مقابلہ میں یونانی طریقہ علاج کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

"علامہ اقبال ڈاکٹری دواؤں کی تلخی وناگواری سے بے حد گھبراتے تھے اور علاج جاری نہ رہ سکتا تھا۔" (۲۰)

"مصنف نے اقبال کی زندگی کے تقریباً" تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور ان سے عقیدت مندی اور محبت کے جذبے کے باوجود ان کی بشری کمزوریوں کو نظرانداز نہیں کیا اقبال کے عہد شباب کے واقعات بیان کرتے وقت اقبال کی خوبیوں کے ساتھ ہی بڑی فراخدلی سے ان کی کمزوریوں کو بھی بیان کردیا ہے کہ

اقبال فرشتہ صفت نہیں تھے "جوانی میں ان کی وہی عادتیں تھیں جو عام نوجوانوں میں ہوا کرتی ہیں۔" (۲۱)

اس طرح مصنف نے ہیرو کی عادت واطوار اور خوبیوں کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ان کے لب ولہجہ خصوصاً" پنجابی لہجے میں اردو بولنے کے انداز کو بڑی خوبصورتی سے رقم کیا ہے آگے چل کر مصنف نے اقبال کے دور کے سیاسی' سماجی' اقتصادی علمی وادبی حالات ومعاملات کا تجزیہ کرکے ان کے علمی وادبی کارناموں' شاعری' تصانیف' سیاسی نظریات' تحریک خلافت اور پاکستان کی آزادی کے بارے میں اقبال کے ذہنی رجحانات کو پیش کیا ہے جس سے اقبال کے ذہنی ارتقا اور نشیب وفراز کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ بلاشبہ اقبال ایک بہت بڑے شاعر' مفکر اور فلسفی تھے اور ان سے سالک کی محبت وعقیدت نے انہیں ذکر اقبال لکھنے پر مجبور کیا لیکن مصنف نے ان تمام حقائق کو من وعن پیش کرنے کی خوبصورت سعی کی ہے جو فن سوانح نگاری کے لئے ضروری ہے اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ذکر اقبال ایک عمدہ سوانح عمری ہے جس میں اقبال کی شخصیت کی کامیاب مرقع کشی کی گئی ہے۔



## حضرت امیر خسرو: نقی محمد خان خورجوی: کراچی: ۱۹۵۶ء

نقی احمد خان نے حضرت امیر خسرو کے سوانحی حالات معلوم کرنے اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالنے کے لئے تحقیق اور جستجو سے کام لیا ہے انہوں نے صاحب سوانح سے متعلق روایات اور معروف ماخذات سے ہٹ کر کتب تواریخ وتذکرہ سے استفادہ کیا ہے اس طرح سو سے زائد مستند ماخذات کی مدد سے صاحب سوانح کے واقعات زندگی تاریخی منظر میں پیش کئے ہیں اپنے مطالعہ کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ

"میری نظر میں جس قدر کتابیں امیر خسرو کی سوانح حیات کے سلسلہ میں گزری ہیں ان میں مشہور واقعات کم وبیش یکساں درج ہیں البتہ کسی تذکرہ نویس نے طوالت سے کام لیا ہے اور کسی نے اختصار سے۔ بعض واقعات میں اختلاف بھی ہے جن کو میں نے غیر ضروری سمجھ کر نظرانداز کردیا ہے۔" (۲۲)

اختلافی واقعات کو غیر ضروری قرار دے کر نظرانداز کرنا منصب تحقیق کے خلاف ہے۔ انہیں چاہئے تھا کہ شواہد کی روشنی میں دلائل کے ذریعہ کسی نتیجہ کی کوشش کرتے۔ اس نوع کا رجحان تحقیق اور تصنیف کی اہمیت کم کردیتا ہے۔

مصنف نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ

"میں نے صرف ان تاریخی واقعات اور عام حالات کو مدنظر رکھ کر جو حضرت امیر سے متعلق اور عوام کی دلچسپی کا باعث ہوسکتے تھے کتابوں سے اخذ کرکے پیش کیا ہے۔" (۲۳)

جس کتاب کے مطالب عوام کی دلچسپی تک محدود ہوں اسے وقیع اور جامع قرار نہیں دیا جاسکتا اسے مختلف ماخذات سے حاصل شدہ معلومات کو مرتب کرنا ہی کہا جاسکتا ہے۔ مؤلف نے حضرت امیر خسرو کے حالات زندگی سنہ وار بیان کئے ہیں حکمرانوں سے ان کے تعلقات کی بھی تفصیل ہے۔ ان کی تصانیف کا تعارف بھی کروایا ہے اور موسیقی سے ان کی دلچسپی کا احوال بھی قلمبند کیا ہے لیکن اس حقیقت کی دریافت میں ناکام رہے ہے کہ موسیقی کے فن میں ان کے استاد کون تھے۔ البتہ حضرت امیر خسرو کی موسیقی کے فنی امور سے آشنائی حاصل کرنے کے لئے آغا محمد شمس الدین حیدر لکھنوی اور شاہد احمد دہلوی سے رہنمائی حاصل کی ہے اور انہیں کی بتلائی ہوئی باتوں کو درج کردیا ہے۔ کتاب اعتراضات کی روشنی میں جامعیت سے عاری ہے۔

## جلال لکھنوی: ڈاکٹر محمد حسن: کراچی: ۱۹۵۶ء

برصغیر پر انگریزوں کے جابرانہ اقتدار کے ساتھ ہی دہلی اور اودھ کی سیاسی، معاشرتی، ادبی زندگی کا شیرازہ بکھر گیا۔ پرانے اقدار نے دم توڑ دیا جدید اقدار کی صورت گری نہیں ہوئی۔ اسی دور انتشار اور امید و بیم میں جس شاعر نے دبستان لکھنؤ کی روایات کو زندہ رکھا، زبان کی خدمت کی اور غزل کے رکھ رکھاؤ کو برقرار رکھا وہ جلال لکھنوی تھے یوں تو اردو کے شاعر عمومیت سے ابتلا و آلام کے شکار رہے لیکن زمانے کے نامساعد حالات میں جلال نے نہایت افراتفری میں زندگی گزاری۔ جدید نظریات کے ساتھ اردو شاعری کے پرانے دبستانوں سے چشم پوشی کی جو ریت چلی ہے اس میں جلال کا نام بھی پس پشت چلا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن جو قدیم اور جدید ادب و شاعری پر گہری نظر رکھتے ہیں دبستان لکھنؤ کے اس آخری چراغ کی روشنی کو تازہ کرنے کے لئے ان کے سوانح حیات اور کلام پر تنقید کا فرض ادا کر کے کسی حد تک وہ قرض ادا کر دیا جو اردو والوں پر جلال کا تھا ان کی کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں اس دور کے سیاسی حالات کا جامع جائزہ لیتے ہوئے جلال کے حالات زندگی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ان کے ماخذات نئے نہیں ہیں تمام تذکروں، تواریخ اور ادبی مضامین سے استفادہ کرتے ہوئے واقعات زندگی کو تاریخی ترتیب میں بیان کیا ہے اور جہاں اختلاف پیدا ہوا ہے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے دلائل کے ذریعہ صحیح صورتحال پیش کی ہے مثلاً "ان کی تاریخ ولادت کے سلسلہ میں امیر مینائی کے تذکرہ انتخاب یادگار سے ۱۲۵۶ھ کا تعین ہوتا ہے جبکہ آرزو لکھنوی نے ۱۲۴۴ھ بتائی ہے ڈاکٹر محمد حسن نے ۱۲۵۰ھ قرار دی ہے۔ اصلاح سخن کے ضمن میں ان کا امیر علی خان ہلال، علی اوسط رشک اور فتح الدولہ برق سے رجوع کرنا ثابت کیا ہے۔ رامپور اور منگرول سے ان کی وابستگی کے دوران پیش کردہ حالات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ان واقعات کے ساتھ جلال کے کردار اور اوصاف پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ وہ عروض پر کامل عبور رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا زبان کے حوالے سے بھی انہیں سند کا درجہ حاصل تھا چنانچہ نہ صرف یہ کہ لغت مرتب کی بلکہ جب بھی کسی لفظ کے معاملہ میں اختلاف ہوتا سند کے لئے انہی سے رجوع کیا جاتا۔ کمال فن کے باوجود ناقدری نے انہیں خود پسند اور زود رنج بنا دیا تھا۔ اس بارے میں بھی ایسے واقعات لکھے گئے ہیں کہ نواب رامپور سے بھی ان کی نہیں بنتی تھی۔ باب اول میں حالات زندگی کردار اور اوصاف لکھنے کے علاوہ ان کی تصانیف کا تعارف



اور معاصرین کا تذکرہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ باب دوم شاعرانہ کمالات خصوصاً "غزل گوئی، قصیدہ نگاری کے بارے میں ہے اور باب سوم میں زبان دانی کے حوالے سے ان کی تصانیف و ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جلال پر یہ ایک جامع اور مستند تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے جو جلال کے سوانح کے سلسلے میں بھی نہایت اہم ہے۔

## سعادت یار خان رنگین: ڈاکٹر صابر علی خان: کراچی: ۱۹۵۶ء

رنگین جیسے کثیر اللسان صاحب کمال اور تقریباً "تین درجن تصانیف، نظم کا ورثہ چھوڑنے والے شاعر کی جانب اردو کے اہل علم کی بے توجہی حد درجہ افسوسناک ہے انہیں ریختی کی وجہ سے بدنام شعرا کی فہرست میں جگہ دی گئی اور ان کی غزلوں مثنویوں کو ناقابل اعتنا سمجھا گیا۔ صابر علی خان نے پی ایچ ڈی کے لئے رنگین کے حالات زندگی اور ادبی ماخذات کو موضوع بنا کر ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اس سلسلے میں انہوں نے انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ان مخطوطات سے بھی استفادہ کیا ہے، جو رنگین کی مکتوبہ ہیں ان تمام کی فہرست ضروری تفصیلات کے ساتھ پیش لفظ میں شامل کی ہیں۔ باب اول میں رنگین کے عہد کی سیاسی و سماجی حالات پر روشنی ڈالی ہے جس کے ذریعہ ان کے ماحول کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور جو رنگین کے فکر و سیرت پر اثر انداز ہوئے۔ رنگین کے حالات زندگی کے بارے میں مصنف نے تذکروں پر انحصار نہیں کیا ہے بلکہ رنگین کے اردو اور فارسی دیباچوں، دیوان، مثنویوں، نظموں، قطعات، تاریخ، منظوم مکتوبات اور دیگر تصانیف سے استفادہ کیا ہے۔ انہی کی مدد سے خاندانی حالات، بہن بھائیوں کے نام، بچپن کی تعلیم و تربیت، مشاغل، سیر و سفر، شادی بیاہ، آل اولاد، احباب اور متعلقین کے بارے میں نئی معلومات فراہم کی ہیں انہی ماخذات کے حوالے سے ان کے مذہبی معتقدات، سپاہیانہ جنگجوئی، عشرت پسندی اور طوائفوں سے دلچسپی کا حال معلوم ہوتا ہے۔

مصنف کی تحقیق اور رنگین کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت مجموعۂ اضداد تھی ان کے کلام میں ریختی اور ہزل کے نمونے ملتے ہیں ان کی تحریروں سے ان طوائفوں کا حال معلوم ہوتا ہے جن کی صحبت میں وہ اوقات گزارتے تھے تو ساتھ ہی ان میں سپاہیانہ شان بھی تھی اور حکیمانہ و صوفیانہ نظر بھی۔ ان امور کا اظہار ان کی زندگی سے بھی ہوتا ہے اور کلام سے بھی۔ ابتدائی دو ابواب سوانح عمری سے متعلق ہیں۔ رنگین کے والد طہماس بیگ خان توران کے رہنے والے تھے نادر شاہ کی فوج کے ساتھ ہند آئے تھے۔ رنگین ۱۱۷۰ھ میں سرہند میں پیدا

ہوئے ان کے بڑے بھائی اللہ یار بیگ خان تھے دوسرے بھائی خدا یار خان جو رنگین سے چھوٹے تھے' والد کا انتقال ۱۲۱۷ھ میں ہوا جبکہ ان کی عمر ۴ سال تھی چھوٹے بھائی کی ۱۲۱۳ھ میں رحلت ہوئی تیسرے بھائی کا نام محمد یار خان تھا۔ رنگین کی تحریروں سے مصنف نے اخذ کیا ہے کہ انہوں نے دو شادیاں کی تھیں ان کے لڑکوں میں مرزا علی یار خان اور اختیار خاں کے نام ملتے ہیں ان کی ایک بیٹی محمدی خانم کا پتا چلتا ہے۔ ترکی ان کی آبائی اور خاندانی زبان تھی۔ اس زبان میں انہوں نے شاعری بھی کی اور اس زبان کی ایک لغت بھی لکھی فارسی اس عہد کی عام ادبی' علمی اور سرکاری زبان تھی۔ اس پر بھی انہیں کامل دسترس حاصل تھی عربی میں بھی وہ استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ سرہند میں پیدا ہونے' وہاں پلنے اور بڑھنے کی بناء پر پنجابی بھی جانتے تھے برج اور براہوی سے بھی واقف تھے ان کے کلام میں ان تمام زبانوں کے آثار ملتے ہیں۔ ۱۵ سال کی عمر میں شادی کی۔ اکیاسی سال عمر پائی' گویا ۶۵ سال سے زیادہ عرصہ شعر کہے' انہوں نے اپنی تصانیف کی تعداد ۳۳ لکھی ہے جن میں سے ۳۲ کے مخطوطات مصنف کو فراہم ہوئے۔

حیات' کردار اور تصانیف کی تفصیلات کی دریافت میں مصنف نے ہر ممکنہ ذریعہ کو استعمال کیا ہے اور اپنے مقالہ کو وقیع بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے لکھا جانے والا یہ پہلا مقالہ ہے۔ پاکستان میں یہ پہلا مقالہ ہے جسے ڈاکٹریٹ کی سند کا مستحق قرار دیا گیا۔

## سوانح عمری' حضرت خواجہ نظامی: ملا واحدی: نئی دہلی: دسمبر ۱۹۵۷ء

خواجہ حسن نظامی صوفی منش' صاحب پرداز' صحافی اور متعدد خصوصیات کے حامل تھے۔ ملا واحدی نے ان کی رفاقت میں نصف صدی گزاری اور وہ بھی اس طرح کہ ان کے تمام کاموں میں شریک اور ان کے مزاج میں دخیل رہے یوں تو خواجہ حسن نظامی سے ملنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ملا واحدی کو ان سے خاص قربت حاصل رہی اسی لئے انہوں نے خواجہ صاحب پر استناد کے ساتھ قلم اٹھایا ہے ان کے حالات زندگی بے کم و کاست بیان کرتے ہوئے ان کی زندگی کے نشیب و فراز کا جائزہ لیا اور ان کی ذات کی تمام صفات کو بیان کیا ہے۔ ابتدائی دور حیات' آلام' مصائب اور تنگ دستی کا رہا۔ اس میں بھی وہ حصول علم کے شغل میں مصروف رہے



بازار کی لالٹین میں مطالعہ کرتے تھے کسب معاش حلال کے لئے انہوں نے کسی کام کو عار نہیں سمجھا۔ کبھی درگاہ سلطان المشائخ کے دروازہ پر زائرین کی جوتیوں کی حفاظت کر کے پیسے کمائے تو کبھی پھیری کر کے اپنی ہی کتابیں فروخت کیں یہاں تک کہ اپنی محنت اور کاوش سے نہ صرف صاحب ثروت ہو گئے بلکہ ادیب اور صوفی کی حیثیت سے اپنا مقام منوالیا۔ وہ صوفی ہونے کے باوجود زاہد خشک نہ تھے ان کی خوشدلی' خوش مذاقی' حاضر جوابی کی متعدد مثالیں درج کی ہیں۔ مصنف نے ان کے ان اوصاف کو بھی واضح کیا ہے یہی شوخی طبع ان کی تحریروں میں بھی نظر آتی ہے۔ جھینگر کا جنازہ' داڑھی کی سالگرہ اور چوروں سے خطاب' وہی لکھ سکتا ہے جس کے مزاج میں ظرافت موجود ہو۔

کتاب ۱۹۲۲ء تک کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے اس میں خواجہ صاحب کی آپ بیتی (مطبوعہ ۱۹۱۹ء) سے بھی استفادہ کیا گیا ہے باوجود اس کے کہ حقائق اور معلومات کے لئے زیادہ چھان بین سے کام نہیں لیا گیا سوانح کو عام اور مخصی معلومات یا "آپ بیتی" تک محدود رکھا گیا ہے ملا واحدی کے طرز بیان نے اسے دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ کتاب جزئیات کی حامل نہ ہونے کے باوجود خواجہ صاحب کے تعارف اور ان کے زندگی سے سبق حاصل کرنے کے مقصد کو پورا کرتی ہے۔

## شبلی ایک دبستان: ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی: ڈھاکہ: ۱۹۵۷ء

شبلی ایک دبستان از ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی مکتبۂ عارفین ڈھاکہ کے زیر اہتمام ۱۹۵۷ء میں شائع کی گئی ہے جس کا مقدمہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا تحریر کردہ ہے۔ درمیانے سائز کی ۲۶۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مقدمہ' دیباچہ اور تعارف کے علاوہ شبلی کے سلسلے میں سات ابواب قائم کئے گئے ہیں شبلی کے حالات زندگی جن میں پیدائش سے لے کر لڑکپن' جوانی' حصول علم اور دیگر واقعات کو یکجا کر کے بیان کیا گیا ہے ابتدا میں شبلی کا خاندانی شجرہ پیش کیا گیا ہے اور ان کی وفات تک کا حال بیان کیا گیا ہے اس کے بعد شبلی کی عالمانہ شخصیت کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے بیان کیا گیا ہے جن میں مؤرخ شبلی' متکلم شبلی' ناقد شبلی' شاعر شبلی' انشا پرداز شبلی کے اہم کارناموں کو دہرایا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے جن کاموں کی ابتدا سرسید نے کی تھی شبلی نے کس طرح اپنی ذہانت سے ان کاموں کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سوانح نگار شبلی کے جن عالمانہ پہلوؤں سے زیادہ متاثر ہوا ہے ان کے بارے میں خود رقمطراز ہے۔

"کس نے اردو زبان کی خدمت کی' کس کا اسلوب بیان منطقیانہ استدلال فلسفیانہ نکتہ سنجیوں شاعرانہ شوخیوں اور مؤرخانہ حقیقت نگاری کے جلوے دکھاتا ہزاروں صفحوں پر بغیر دم لئے چلا جاتا ہے؟"

پھر اگر یہ کہا جائے کہ: "وہ ایک فرد نہیں بلکہ ایک دبستان ہیں" (۲۴)

تو شاید کیا 'یقیناً' غلط نہیں اس دعوے کے ثبوت میں فی الحال پانچ شہادتیں پیش کی جاتی ہیں جو صفحہ ۶۵ سے صفحہ ۲۵۲ تک پھیلی ہوئی ہے۔ تعارف داستان حیات' شبلی سے پہلے اردو نثر کا سرمایہ 'انیسویں صدی کی دو زبردست شخصیتیں' یہ سرخیاں اس لئے قائم کی گئی ہیں کہ ان کے بغیر شبلی کی قدر و قیمت' ان کی ادبی فضیلت اور ان کی عظمت کا صحیح طور پر اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ شبلی کے سوانح حیات کے بارے میں یہ ایک اہم کتاب ہے۔

## ابو الطیب متنبیؒ: سید جمیل الرحمٰن اعظمی: کراچی: ۱۹۵۸ء

عربی کے مشہور شاعر متنبیؒ کا دیوان عربی ادب کے نصاب میں ہر جامعہ میں پڑھا جاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ شاعر کے کلام کو سمجھنے کے لئے شاعر کے حالات سے بھی آگاہی ہو۔ اس مقصد کے تحت جامعہ کراچی کے نصابی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے پروفیسر سید جمیل الرحمٰن اعظمی نے کتاب "ابو الطیب متنبیؒ" مرتب کی ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں ولادت سے وفات تک کے حالات و واقعات اس کی شاعری کے مختلف ادوار اور سیف الدولہ اور دیگر سلاطین و امراء سے تعلقات' ان کی شان میں کہے ہوئے قصائد کا ذکر ہے دوسرے حصے میں متنبیؒ کے شاعرانہ مرتبہ کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کا حصہ اول سوانح نگاری کے ضمن میں آتا ہے جس قدر کتب سے حاصل ہو سکیں مؤلف نے انہیں کمال سلیقہ سے ترتیب دے دیا ہے اور کوشش اس امر کی' کی ہے کہ سوانح نگاری کے فن سے اغماض نہ کیا جائے لیکن معلومات کی کمی نے اسے جامعیت کی شکل نہیں دی ہے بحالت موجودہ متنبیؒ کی اس سے بہتر سوانح لکھنا بھی ممکن نہ تھا۔

## داغ: تمکین کاظمی: لاہور: ۱۹۶۰ء

تمکین کاظمی نے ہوش سنبھالنے سے قبل داغ دہلوی کو دیکھا تھا۔ ان کے والد حضرت تجلی'



داغ کے شاگرد بھی تھے اور ان کے حلقۂ احباب میں شامل بھی تھے۔ مصنف نے اپنے والد سے داغ کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں ان کے علاوہ اکثر تلامذہ داغ اور عزیز و اقارب سے بھی قربت خاص کی وجہ سے "داغ آشنائی" کا موقع ملا تھا اس بناء پر مصنف کی معلومات کے مصدقہ ہونے میں کلام نہیں باوجود اس کے کہ اس کتاب سے قبل داغ کی پانچ سوانح عمریاں شائع ہو چکی تھیں۔ مصنف نے اپنی ان معلومات کو جو ان کتابوں میں موجود نہیں' پیش کرنے کے خیال سے اسے مرتب کیا ہے۔ داغ کے حسب و نسب کے بارے میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان پر بحث کرنے سے گریز کرتے ہوئے اس امر پر اکتفا کیا ہے کہ

"ولادت کے اعتبار سے چاہے داغ کے متعلق ان کی معترضین کچھ بھی کہیں لیکن ان کے کردار اخلاق اور اعمال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا" (۲۵)

چونکہ سوانح عمری داغ کی ہے اس لئے بحث کو ان کے کردار کی اچھائیوں اور برائیوں تک محدود رکھا ہے اور ہر دو کے معاملے میں مبالغہ سے گریز کیا ہے اس بارے میں مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ

"مجھے داغ کی بے شمار خوبیاں گنانے کی دھن رہی ہے اور نہ چھوٹی موٹی کمزوریاں ظاہر کر کے ان میں اعلیٰ درجہ کی اخلاقی فضیلت یا کاملیت ظاہر کرنے کا شوق رہا ہے میں نے کوشش کی ہے کہ باسول کی طرح داغ کا مطالعہ کروں" (۲۶)

"میں نے باسول کی تتبع کی ہے اور کتاب کو فصلوں اور حصوں میں تقسیم کئے بغیر بہ لحاظ سنین ترتیب دیا ہے اور ان موتیوں کی لڑی مرتب کر دی ہے۔" (۲۷)

مصنف نے پوری دیانت داری سے معلوم حقائق کا اظہار کر دیا۔ باوجود اس کے کہ صاحب سوانح ان کے والد کے استاد تھے اور وہ خود بھی ایک طرح سے عقیدت مند تھے ان کی عیاشانہ زندگی' طوائف نوازی بالخصوص کلکتہ کی حجاب سے ان کے مراسم کو حقیقت کی روشنی میں پیش کیا ہے زندگی کے حالات و واقعات' نشیب و فراز' دہلی' رامپور' کلکتہ' پٹنہ اور حیدر آباد کی خاک چھاننے کے واقعات سے لے کر ان کے کردار اور سیرت کے واضح نقوش بے لاگ طریقے سے پیش کر دیئے ہیں ان کے معمولات زندگی شعر کہنے کا طریقہ' شعر پڑھنے کا طریقہ' لباس' عطر اور پھول کا شوق' کتب خانے کا حال' نفاست پسندی' سواری کا کروفر گھر کا ٹھاٹ باٹ' غذا' آم کا شوق اور ان کے لطائف کچھ اس طرح قلمبند کئے گئے ہیں کہ قاری اپنے آپ کو صحبت داغ کا ایک فرد سمجھنے لگتا ہے مصنف کے حسن بیان کے ساتھ واقعات کی صداقت اور تفصیل نے اس

سوانح کو انتہائی دلچسپ بنا دیا ہے مصنف نے کتاب کے صفحات بڑھانے کی خاطر داغ کی شاعری پر تبصرے سے گریز کیا ہے اور کتاب کو سوانح تک ہی محدود رکھا ہے۔

## مومن: حالات زندگی اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر: کلب علی خان فائق رامپوری: لاہور: ۱۹۶۱ء

اجڑی ہوئی دلی کی بزم سخن کے تین صدر نشینوں میں ذوق اور غالب کے ساتھ مومن کا نام بھی آتا ہے جو شاعر ہونے کے علاوہ بھی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ حکیم حاذق بھی تھے اور نجوم و رمل میں ید طولیٰ رکھتے تھے "گلشن بے خار" (فارسی) پہلا تذکرہ ہے جس میں شیفتہ نے اپنے شاگردی کی شخصیت کو اجاگر کیا اگرچہ ان کی تحریر میں طرفداری کا عنصر بھی شامل ہے سرسید احمد خان نے آثار الصنادید میں ان کی تعریف و ستائش کی اس کے باوجود محمد حسین آزاد نے "آب حیات" کو ان کے ذکر سے خالی رکھا لوگوں کے اصرار پر کسی کا لکھا ہوا ایک نوٹ دوسرے ایڈیشن میں شامل کر دیا فائق رامپوری کا کہنا ہے کہ

"آزاد مرحوم نے عبدالکریم کے مرسلہ حالات مومن بجنسہ شامل کرائے۔" (۲۸)

لیکن ڈاکٹر عبادت بریلوی نے "مومن اور مطالعہ مومن" میں لکھا ہے کہ

"مولانا حالی کے توجہ دلانے پر دوسرے ایڈیشن میں ان کے حالات بڑھائے گئے لیکن جس طرح حالی نے لکھ کر بھیجے تھے اسی طرح چھاپ دیئے گئے۔" (۲۹)

ان ہر دو حضرات نے اپنے بیانات کی سند نہیں دی ہے موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں ضمیر الدین عرش گیاوی شاگرد تسلیم لکھنوی نے "حیات مومن" لکھی ان کے اکثر بیانات سے بشمول فائق رامپوری دیگر محققین متفق نہیں ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں نیاز فتح پوری نے اپنے رسالہ نگار لکھنؤ کا خاص کا نمبر شائع کر کے انہیں حیات نو دی۔ یہ تحقیقی کارنامہ نہیں تھا البتہ ان کے کلام پر ایسے جاندار تبصرے تھے جن سے سخن فہموں کو مومن شناسی کی راہ سجھائی دی۔ فائق رامپوری نے اپنے وسیع مطالعہ اور جانکاہ تلاش و جستجو سے مومن کے حالات زندگی، ان کے خاندان کے بزرگوں حکیم غلام حسن، حکیم غلام حیدر خان اور حکیم غلام نبی خان کے کوائف، مومن کی ولادت، سکونت، سلسلہ تعلیم، تعلیم عربی و فارسی، حفظ قرآن قوت حافظ کی تیزی دیگر علوم مثلاً "طب، نجوم و رمل، مشاغل شطرنج، موسیقی، تعویز نویسی، شراب نوشی، عشق بازی، شادی اور



اولاد، غرض کہ زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ حقائق کی بازیافت کے لئے سوا سو ماخذات سے کام لیا ہے جن کے بعض بیانات کی تائید کی ہے اور بعض کی تردید، کلیات مومن کے مرتب ڈاکٹر عبادت یار خان نے بغیر کسی ماخذ کے حوالے کے لکھا ہے کہ مومن اور ان کے بزرگ انگریزوں سے تنخواہ پاتے تھے مصنف نے مختصر تاریخ اسلام (مطبوعہ ۱۹۰۴ء) کے حوالے سے ان کے بیان کو مسترد کر دیا ہے وہ عبادت یار خان کی اس روایت کو بھی تسلیم نہیں کرتے کہ مومن خان کے گھرانے میں فارغ البالی تھی اسی طرح حصول تعلیم کے لئے شاہ عبدالعزیز کی شاگردی اختیار کرنا عرش گیاوی سے روایت ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ یہ روایت غلط ہے مومن شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے۔ وہ اس روایت کو بھی تسلیم نہیں کرتے جو تواتر سے جاری رہی کہ مومن، سید احمد بریلوی کے مرید تھے کیونکہ ان کے خیال میں کلام مومن سے اس امر کی تصدیق نہیں ہوتی مومن کا ان سے لگاؤ بربنائے خاندانی روابط تھا نہ کہ بوجہ بیعت۔ واقعہ یہ ہے کہ مومن وسیع المشرب تھے۔ مصنف نے مومن کی حیات معاشقہ کا کھوج ان کی مثنویوں سے لگایا ہے گویا چھ مثنویاں چھ معاشقوں کی یادگار ہیں ان کے تاہل کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں کہ پہلی شادی سردھنا میں (۱۲۴۲ھ) بیگم شمرو کی بیٹی سے اور دوسری خواجہ محمد نصیر رنج کی دختر سے (۱۲۴۵ھ) میں ہوئی اگرچہ اولاد کی تفصیل معلوم کرنے کی پوری پوری سعی کی گئی لیکن پھر بھی کہیں کہیں خلا رہ گیا ہے مومن کی شخصیت، کردار، مشاغل، صورت و شکل، غرض کہ ہر بات کی تحقیق ماہرانہ طور پر کی ہے مستند ماخذات میں کلام مومن، مومن کے فارسی خطوط، اور ان کے عہد میں لکھی گئی کتب تواریخ و سیر کو ترجیح دی ہے۔ تحقیقی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مصنف ایک مشکل مرحلہ سے گزر کر کامیابی کی منزل تک پہنچتے نظر آتے ہیں۔

## مومن اور مطالعہ مومن: ڈاکٹر عبادت بریلوی: کراچی: نومبر ۱۹۶۱ء

فائق رامپوری کی مومن کے بارے میں تحقیقی سوانح جس سال شائع ہوئی اس سال کے اواخر میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب بھی اس موضوع پر شائع ہوئی۔ ڈاکٹر عبادت نے ابتدائی ۱۴۱ صفحات سوانحی کوائف اور سیرت و کردار کے لئے وقف کئے ہیں اس کے باوجود انہیں گلہ ہے کہ "اردو شعراء کے حالات کا سراغ لگانا جوئے شیر کو لانا ہے" انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"مومن نے اپنے بارے میں خود کچھ نہیں کہا ہے۔" (۳۰)

جبکہ فائق رامپوری نے بڑی حد تک ان کی مثنویوں اور فارسی خطوط پر انحصار کر کے سوانح مرتب کی ہے ان میں وافر معلومات موجود ہیں اور چونکہ مومن کے ہی تحریر کردہ ہیں اس لئے ان کے مستند ہونے میں کلام نہیں ڈاکٹر عبادت کے پیش نظر شعرا کے تذکرے اور مومن کے بارے میں عرش گیاوی کی لکھی ہوئی "حیات مومن" کے علاوہ دیگر کم اہم مضامین تھے۔ انہوں نے عرش کے اکثر بیانات کی تردید کی ہے عرش کا کہنا ہے کہ

"مومن علوی سادات ونجیب ہائے کشمیر سے ہیں۔" (۳۱)

ڈاکٹر عبادت نے مومن کے نواسے عبدالحئ انصاری کی ایک خط کے حوالے سے اس کی تردید کی ہے اور ان کو اصل کشمیری ماننے کے باوجود ان کے پٹھان ہونے پر اصرار کیا ہے عرش نے مومن کو اس خاندان سے تعلق بتایا ہے جس سے حکیم اجمل خان کا تعلق تھا عبادت نے اس کو بھی مسترد کر دیا ہے فائق رامپوری نے اپنی کتاب میں جو شجرہ شامل کیا ہے اس سے بھی عرش کے بیان کی تصدیق نہیں ہوتی۔

عبادت بریلوی نے مومن کے بزرگوں کے حالات میں تفصیل سے کام نہیں لیا ہے لیکن مومن کے کوائف کے بارے میں جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے ابتدائی تعلیم سے لے کر علوم و فنون پر کامل دسترس حاصل کرنے کی تفصیل دی ہے ان کی طب، علم نجوم، علم رمل، شطرنج اور موسیقی سے دلچسپی کا حال وضاحت کے ساتھ لکھا ہے اور تائید میں واقعات بھی درج کئے ہیں ان کی حیات معاشقہ کے نقوش ان کی مثنویوں میں موجود ہیں۔ فائق رامپوری نے انہی کو بنیاد بنا کر نتیجہ اخذ کیا ہے کہ چھ مثنویاں ان کے چھ معاشقوں کی یادگار ہیں جبکہ عبادت انہیں "تمام کمال صحیح نہیں" مانتے (۳۲) مگر مومن کے عاشق مزاج ہونے سے بھی انہیں انکار نہیں۔

ازدواجی زندگی کے بارے میں عبادت بریلوی نے زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا ہے مومن کے نواسے عبدالحئ انصاری کے بیان کہ "ان کی پہلی شادی معلوم نہیں کہاں ہوئی تھی" (۳۳) میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے فائق رامپوری نے یہ شادی سردھنہ میں ہونے کی قدرے تفصیل دی ہے عبادت اس شادی کے بارے میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ "اس سلسلہ میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔" (۳۴) اور آگے چل کر مومن کے فارسی خطوط کے اقتباسات بھی درج کرتے ہیں جس سے اس شادی کا حال معلوم ہوتا ہے محقق کے لئے مناسب نہیں کہ وہ تذبذب کا شکار ہو اور موافق و مخالف صورت حال پیش کر کے گزر جائے اس کے تحقیق کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب وہ فیصلہ بھی کرے۔



ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مومن کے اشعار کی تائید حاصل کر کے انہیں مولانا سید احمد بریلوی کا مرید بھی ثابت کیا ہے ان کے سفر کے حالات بھی رقم کئے ہیں فائق رامپوری اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تحقیق مومن شناسی کے ضمن میں کار آمد کاوشیں ہیں۔

## میراں جی خدا نما: ڈاکٹر عبدالحفیظ قتیل: حیدر آباد (انڈیا): ۱۹۶۱ء

میرا جی خدا نما (متوفی ۱۰۷۴ھ) کی اہمیت ان کے صوفیانہ خیالات اور ادبی خدمات کی بناء پر مسلمہ ہے ان کا تعلق دسویں صدی ہجری سے تھا جبکہ دکن میں اردو نثر کا آغاز ہوا۔ صوفیائے کرام نے اسلام کی تبلیغ کے مراکز قائم کئے تھے وہ مقیمی، صنعتی، ملک خوشنود، رستمی اور نصرتی جیسے شعرائے بیجاپور اور محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، وجہی، غواصی اور ابن نشاطی جیسے شعرائے گولکنڈہ کے معاصر تھے ان کے حالات بڑی حد تک پردۂ اخفا میں رہے ہیں ڈاکٹر عبدالحفیظ قتیل جن کا نام ادبیات دکن پر تحقیقات کے حوالے سے مسلمہ ہے، میراں جی خدا نما کے حالات زندگی، ادبی اور مذہبی خدمات کے سلسلہ میں اہم تحقیقی کام کیا ہے۔ ڈاکٹر قتیل نے تمہید میں لکھا ہے کہ "میراں جی کی ادبی خدمات کے پیش نظر میں نے ان کے حالات اور تصنیفات پر مستقل کام کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے" گویا ان کی نظر میں میراں جی کی ادبی خدمات کی زیادہ اہمیت تھی اس سلسلہ میں انہوں نے متعدد مخطوطات و مطبوعات سے استفادہ کیا۔ مخطوطات میں کتب خانہ آصفیہ میں مخزونہ روضۃ الاولیاء، مشکوٰۃ النبوۃ، رسالہ تلاوۃ الوجود، رسالہ نوریہ، ادارۂ ادبیات اردو میں مخزونہ معرفت السلوک، چکی نامہ عرفان، کتب خانہ سالار جنگ میں مخزونہ، شمائل الاتقیاء، کے علاوہ مطبوعات میں گلزار آصفیہ، تذکرۂ اولیائے دکن، تذکرۂ اولیائے بیجاپور، تذکرہ اردو مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو، روضۃ اولیائے بیجاپور قدیم اردو اور ذبح اللہ شاہ، سید شاہ محمد باقر حسینی کے پاس محفوظ قلمی شجرے سے بھرپور استفادہ کر کے اہم معلومات فراہم کی ہیں اس کام کے سلسلہ میں انہوں نے غیر معمولی دقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔

ڈاکٹر قتیل کی فراہم کردہ معلومات سے پتا چلتا ہے کہ سید میراں کے والد کا نام شاہ محمود تھا شجرہ میں شاہ محمد کے اوپر سید بدرالدین حبیب اللہ سے حضرت غوث اعظم تک ان کا سلسلۂ نسب درج ہے ان کا سنہ ولادت ۱۰۰۳ء قرار دیا ہے وہ عبداللہ قطب شاہ کی ملازمت میں رہے ہیں انہیں کسی کام سے بادشاہ بیجاپور کے پاس بھیجا گیا تھا وہاں ان کی ملاقات شاہ امین الدین اعلیٰ سے ہوئی وہ ان کے معتقد ہوگئے اور شاہی ملازمت ترک کر دی۔ وہ حضرت امین الدین اعلیٰ کے

مرید ہوگئے۔ روایت کے مطابق امین الدین' سید میران ہوگئے اور سید میراں امین الدین ہوگئے امین الدین نے بعد بیعت اپنی صحبت محرمانہ سے مستفیض فرمایا پھر خرقۂ خلافت سے سرفراز فرما کر حیدر آباد روانہ کیا خلافت کا یہ سلسلہ مابعد جاری رہا۔ انھیں کسی قسم کا انعام یا جاگیر ملنے کی کوئی سند نہیں ہے ان کے ایک فرزند شاہ امین الدین ثانی کا ذکر بھی ملتا ہے جو ان کے جانشین ہوئے ان کی ایک صاحبزادی کا ذکر بھی ملتا ہے ڈاکٹر قتیل نے نہایت محنت اور تحقیق سے ان کے اخلاف کا شجرہ بھی مرتب کیا ہے۔ مخطوطات جن کے بارے میں ڈاکٹر قتیل تعین کرسکے ہیں کہ وہ سید میراں کی تصانیف ہیں ان میں نثر میں رسالہ وجودیہ' رسالہ مرغوب القلوب اور نظم میں بشارت الانوار' دو غزلیات اور دو مثنویاں ہیں ان سب کا تفصیلی تعارف بھی کروایا گیا ہے اور ان کے متون کو بھی شامل کیا گیا ہے یہ سب نگارشات دکنی زبان میں ہیں' زیر نظر کتاب تحقیق سوانح میں اہم درجہ رکھتی ہے۔

## حیات امجد: محمد جمال شریف: حیدر آباد دکن: اپریل ۱۹۶۱ء

۲۹ مارچ ۱۹۶۱ء کو حضرت امجد حیدر آبادی کا چراغ زندگی گل ہوا۔ ان سے محبت کرنے والوں اور عقیدت مندوں نے ان کی یاد تازہ رکھنے اور انھیں خراج تحسین پیش کرنے کے لئے قلیل مدت میں دو کتابیں شائع کیں ایک تو محمد جمال شریف کی "حیات امجد" ہے جو اپریل ۱۹۶۱ء میں چھپی دوسری ان کے چہلم کے موقع پر محمد اکبرالدین صدیقی نے مرتب کرکے شائع کی جمال شریف نے اپنے اس منصوبہ پر پانچ سال قبل ہی کام شروع کردیا تھا اس سلسلہ میں وہ اکثر حضرت امجد سے ملا کرتے اور معلومات حاصل کیا کرتے تھے۔ مصنف کو ان کے بارے میں قلم اٹھانے کی تحریک اس لئے ہوئی کہ انھوں نے حضرت امجد کو بہت قریب سے دیکھا تھا اس بات نے انھیں گرویدہ کردیا تھا اور ان کی بڑائی اور عظمت کے احساس کو دوبالا کردیا تھا کہ ان میں فکر و عمل کا مکمل آہنگ و اتحاد تھا ان کی شاعری ان کی حقیقی زندگی اور فکر کی ترجمان تھی جس بات کی وہ دوسروں کو تعلیم دیتے تھے پہلے اسی پر کاربند تھے۔

حضرت امجد ۶ رجب ۱۳۰۳ھ کو پیدا ہوئے ان کے والد صوفی سید رحیم علی ابن سید کریم حسین اپنے وقت کے نیک اور خدا رسیدہ بزرگ تھے جن کے یہاں یکے بعد دیگر چار بیویوں سے اکیس بچے پیدا ہوئے تھے ان میں حضرت امجد سب سے چھوٹے تھے ان کی پیدائش کے چالیسویں روز



رسم چلّہ کے دن ان کے والد کا انتقال ہوا اور خاندان پر ادبار چھا گئے ان کی ماں نے پرورش' تعلیم اور تربیت کا بار اٹھایا۔ باوجود اس کے کہ ابتدا میں وہ تعلیم کی طرف رغبت نہیں رکھتے تھے جب انھیں مولوی عبدالوہاب بخاری' علامہ سنادالملک شوستری اور علامہ سید نادرالدین سے استفادہ کا موقع ملا تو ان کا ذہن ہی بدل گیا ان علماء نے انھیں زیور تعلیم سے آراستہ کیا' علمی ادبی ذوق پیدا کیا' فلسفہ اور تصوف سے دلچسپی بڑھائی' شاعرانہ ذوق کو پروان چڑھایا اور انھیں ایک مکمل انسان بنادیا۔ شادی (۱۳۲۱ھ) کے دو سال بعد انھوں نے بنگلور کے سٹی ہائی اسکول میں تعلیم مکمل کی اور پھر مدرسہ دارالعلوم حیدر آباد میں ۲۰ روپے ماہوار پر ملازم ہوگئے بعد میں وہ صدر محاسبی (اکاؤنٹس آفس) میں کلرک بھرتی ہوگئے اور اعلیٰ عہدہ پر پہنچ کر ۱۳۵۱ھ میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے حضرت امجد نے تین شادیاں کیں پہلی والدہ کی مرضی سے کی' حیدر آباد کی طغیانی (۱۹۰۸ء) میں ماں بیوی اور بیٹی بہہ گئیں اور یہ حادثہ حضرت امجد کی آنکھوں کے سامنے ہوا اس جانکاہ واقعہ کا ان کے ذہن پر زندگی بھر اثر رہا دوسری شادی ان کے استاد مولانا نادرالدین کی صاحبزادی سے ہوئی جن کا نام جمال النساء تھا لیکن حضرت امجد انھیں سلمٰی کہا کرتے تھے ایک عالم اور صوفی باپ کی یہ بیٹی خود بھی عالم اور صوفی تھی ان کے اوصاف حمیدہ' مذہب سے رغبت' شعائر کی پابندی کے بارے میں اپنی خودنوشت "جمال امجد" میں بیاں کی ہیں سوانح کی ترتیب میں مصنف نے اس کتاب سے بھی مدد لی ہے اور شخصیت و کردار کے بارے میں اپنی ذاتی معلومات کے حوالے سے لکھا ہے حضرت امجد کے مزاج کی سادگی' خودداری' مہمان نوازی' خیروخیرات کا جذبہ' دوستوں سے محبت' نام و نمود سے پرہیز' بچوں سے انس' ملازمین کے ساتھ برتاؤ' بیویوں سے تعلقات' شعائر اسلام کی پابندی ان سب خصوصیات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے پہلا باب حالات زندگی' دوسرا باب حضرت امجد کی نثرنگاری اور تیسرا شاعری کے بارے میں ہے۔ معلومات براہ راست حاصل ہونے کی وجہ سے ان کے مستند ہونے میں کلام نہیں۔ مصنف نے ان کی پیش کش میں حسن ترتیب کا لحاظ رکھا اور اسے ایک کامیاب سوانح عمری بنادیا ہے۔

## تذکرۂ جگر: محمود علی خاں جامعی: کراچی: اپریل ۱۹۶۱ء

جگر مراد آبادی اپنے دور کے مقبول شاعر تھے۔ دور جدید میں جن شعراء کی وجہ سے غزل کی

آبرو بحال ہوئی ان میں ان کا نام بھی شامل ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں تنقیدیں اور تبصرے بے شمار چھپ چکے ہیں۔ اتنی مقبول شخصیت کی سوانح و سیرت کے بارے میں چند تحریریں ہی منظر عام پر آئی ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی نے ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو کامیابی سے پیش کیا اور بعد میں مالک رام اور محمد طفیل مدیر نقوش نے بھی توجہ کی لیکن سوانحی حالات، فطرت و مزاج مشاغل زندگی، جیسے پہلو تشنہ ہی تھے اس کا احساس خود جگر کو بھی تھا۔ بقول مصنف ان کی خواہش تھی کہ وہی اس فرض کو کمال خوبی سے سرانجام دے سکتے تھے۔ باوجود جگر کے توجہ دلانے کے مصنف اسے ٹالتے رہے اور ایسے وقت تصنیف مکمل کی کہ اس کی اشاعت جگر کی زندگی میں نہ ہو سکی۔

محمود علی خاں جامعی کے صاحب سوانح سے ۱۹۲۵ء میں تعلقات استوار ہوئے تھے جو ان کی وفات (۱۹۶۰ء) تک قائم رہے اس طرح مصنف کو کافی مواقع حاصل رہے کہ وہ جگر کی جلوت سے واقف ہونے کے ساتھ ان کی خلوت میں بھی جھانک سکے چنانچہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے مشاہدہ اور مطالعہ کا حاصل ہے اس میں نہ تو اپنی طرف سے حاشیہ آرائی کی کوشش کی ہے اور نہ جگر کے مرتبہ کو بڑھانے کے لئے لایعنی حکایات اور لفظی گورکھ دھندے سے کام لیا ہے۔ یہاں تک کہ بجنور والی طوائف وحیدن کے علاوہ ایک اور طوائف سے معاشقہ کا احوال بھی بے کم و کاست تحریر کر دیا ہے۔

جگر کی تعلیم، مولانا عبدالغنی سے بیعت، شادیوں کا حال تفصیل سے موجود ہے ان کے مشاغل میں موسیقی، خوشنویسی، شراب نوشی اور شاعری بھی شامل تھے۔ ان کی تفصیلات بھی کتاب میں مل جاتی ہیں۔ عادات و اطوار کے سلسلہ میں ان کی بدحواسیوں کے واقعات، ایفائے وعدہ کا پاس کرنا، وضعداری، خلوص، خوش خلقی، مذہبی خیالات اور تفریحات غرض کہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر سے دیانت داری کے ساتھ پردہ نہ اٹھایا گیا ہو۔ اگرچہ کتاب مختصر سی ہے اس میں ایسے حالات و واقعات مندرج ہیں جو آئندہ لکھنے والوں کے لئے سند کے طور پر کام آئیں گے۔ جگر سے مصنف کے جو بے تکلفانہ تعلقات تھے اسی کی رعایت سے طرز بیان میں بے تکلفی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ جگر کی شخصیت یوں بھی دلفریب تھی مصنف کے اسلوب نے اسے اور بھی دلکش بنا دیا ہے۔

تذکرۂ جگر کو ایک باضابطہ اور مکمل سوانح عمری نہیں کہا جا سکتا چنانچہ دیباچے میں مصنف نے خود بیان کیا ہے۔



"اس کتاب کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جگر صاحب کی نجی زندگی اور کردار کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے جن سے ان کے کلام کی نوعیت یا خصوصیت پر روشنی پڑتی ہے یا اسے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔" (۳۵)

جگر صاحب اپنے شاعرانہ مرتبے کے باعث اپنے معاصرین میں منفرد و ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ خوش گلو اتنے تھے کہ مشاعرے لوٹ لیا کرتے تھے اپنے دور میں اپنی بے پناہ مقبولیت اور شہرت کے باوجود خود جگر صاحب کی یہ خواہش تھی کہ ان کے سوانح ان کے دوست محمود علی خان جامعی تحریر کریں کیونکہ جس قدر جگر صاحب کی نجی زندگی، ابتدائی حالات، شخصیت، کردار اور شاعری کے معاملات سے محمود علی خاں آگاہ تھے اتنا کوئی دوسرا نہ تھا شاید اسی لئے اپنی عمر کے آخری حصے میں جامعی صاحب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا جب کہ یادداشت جواب دے رہی تھی اور تحقیق کی روایت کو وہ نبھا نہیں سکتے تھے۔ پھر بھی یہ تصنیف ہیرو کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کرتی ہے لیکن اگر تشنگی محسوس ہوتی ہے تو اس ادبی ماحول اور عہد کی کہ جس میں جگر نے اپنی شاعرہ کا سکہ جمایا اگر معاصرین کا تذکرہ بھی شامل ہو جاتا یا کلام پر تبصرہ کیا جاتا تو اس کتاب میں چار چاند لگ جاتے پھر بھی "تذکرۂ جگر" ایک ایسی عمدہ کتاب ہے جس میں ہیرو کے بچپن، لڑکپن و جوانی کے حالات، خاندان، تربیت، شخصیت، کردار اور شاعری کے پہلوؤں کو خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے ان کی خوبیوں کے ساتھ ان کی خامیاں، شراب و شباب کی باتیں اور پھر ترک شراب اور ان کے کردار کی پاکیزگی کا لطف سب ہی کچھ اس میں موجود ہے۔

"جگر صاحب بہت ہی خوش چلن اور خوش نظر بھی ہیں اور یہ میں اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ جگر پر اعتماد کر کے اکیلے گھر میں اپنی بیوی، بہن اور بیٹی کو بے فکری سے چھوڑا جا سکتا ہے۔" (۳۶)

مندرجہ بالا حوالے سے جگر کی شراب نوشی جیسی بری عادت کے باوجود ان کے کردار پر جس اعتماد کا اظہار کیا گیا ہے اس سے جگر کے بارے میں مصنف کی عقیدت کا پتا چلتا ہے کہ جگر نے شراب ترک کر کے خود کو باکردار انسان کا روپ دے دیا تھا۔ مصنف نے اپنی یادداشتوں اور تاثرات کے سہارے جگر کی شخصیت کے تقریباً تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ طرز تحریر کی سادگی قاری کو لطف دیتی ہے بلاشبہ جگر کی خوبصورت مرقع کشی ہے۔

## مرزا ابو طالب کلیم ہمدانی، حیات و تصانیف: ڈاکٹر شریف النساء بیگم: حیدر آباد دکن: ۱۹۶۱ء

ڈاکٹر شریف النساء فارسی کی عالم ہیں اور جامعہ عثمانیہ کے کلیہ (گرلز کالج) میں فارسی کی پروفیسر رہی ہیں۔ فارسی زبان اور ادبیات پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ اسی لئے اس زبان کے مشہور شاعر کلیم ہمدانی کو اردو دان طبقہ سے متعارف کروانے کے لئے اپنی تحقیقی کاوش کو "مرزا ابو طالب کلیم ہمدانی، حیات اور تصانیف" میں پیش کیا ہے۔ اس میں دقت نظر، تلاش و جستجو اور جان کاہی سے حقائق کی دریافت کی ہے۔ کلیم کے بارے میں اکثر روایات جو عام ہو گئی ہیں ان کی تردید کی ہے اور اپنے نقطۂ نظر کو شہادتوں اور مستند حوالوں سے درست ثابت کیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ کلیم ترک وطن کر کے پہلے عہد جہانگیر میں ہند آئے اور شاہنواز خان صفوی کے مکان پر فروکش ہوئے جو دربار جہانگیر سے متعلق تھے۔ تحقیق سے یہ ثابت کیا گیا کہ کلیم وطن سے نکلے تو بحری راستہ سے جنوبی ہند پہنچے اور بیجاپور کا قصد کیا جس کی شہرت چار دانگ عالم میں تھی وہاں نواب شاہنواز خان شیرازی کے ہاں قیام کیا جو ابراہیم عادل شاہ والیٔ بیجاپور کا وزیر تھا۔ اس کے ثبوت میں متعدد کتب کے حوالے درج ہیں۔ شاہنواز خان شیرازی نے "نورس بہشت" کے نام سے ایک محل تعمیر کیا اس کا ذکر "تاریخ فرشتہ" میں بھی ملتا ہے۔ کلیم نے اس محل کی تعریف میں ایک طویل مثنوی لکھی اس سے بھی کلیم کے بیجاپور میں مقیم رہنے کی شہادت ملتی ہے۔ شاہنواز خاں شیرازی کے انتقال (۱۰۲۰ھ) کے بعد وہ بے سہارا ہو گیا اور وطن لوٹ گیا لیکن سرزمین کو چھوڑ جانے کا اسے سخت قلق تھا اس کا اظہار جن اشعار میں کیا گیا وہ بھی شامل کتاب ہیں۔ محقق کے مطابق وہ (۱۰۳۰ھ) میں دوبارہ ہند آیا اور جہانگیر تک رسائی کی غرض سے وہ وارد آگرہ ہوا اس نے میر جملہ شہرستانی کا سہارا حاصل کیا اور شاہجہاں کی تخت نشینی تک اس کی سرپرستی میں رہا۔ کلیم کی شاہجہاں کے دربار میں رسائی کے بعد کا عہد اس کے عروج کی داستان ہے۔ کلیم نے بہت سے تاریخی واقعات پر قطعات تحریر کئے ہیں جن کی بڑی اہمیت ہے۔ فاضل محقق نے کلیم کے معاصرین کے قطعات تاریخ وفات درج کر کے قطعیت کے ساتھ اس کا سال وفات متعین کیا ہے۔ کتاب کا ایک حصہ کلیم کے عادات و اخلاق کے بارے میں ہے۔ غرض سوانح و سیرت کے ہر گوشے کو مدلل طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کتاب میں کلیم کے ان



معاصر شعراء، جن کا تعلق دکن سے تھا یعنی سنجر کاشی، ملک قمی، ظہوری اور جن کا تعلق شمالی ہند سے تھا یعنی میر معصوم، قدسی، سلیم، ظفر خان احسن، غنی کشمیری، صائب، شیدا، سعیدائے گیلانی کا ذکر کرتے ہوئے ان سے کلیم کے تعلقات کی نوعیت بھی بتلائی ہے۔ کلیم کی تصانیف کا تعارف اور اس کے کلام کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ بھی شامل کتاب ہے۔ ڈاکٹر شریف النساء کا انداز بیان سنجیدہ، باوقار اور محققانہ ہے وہ اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتیں بلکہ دلائل پیش کر کے اپنی رائے کا اظہار کر دیتی ہیں۔ جن اہل علم کی تحریروں سے اختلاف کیا ہے وہاں بھی متانت کا پہلو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ کسی پر اعتراض یا طعن نہیں کیا ہے۔ کتاب میں شامل طویل "کتابیات" سے محقق کی وسعت مطالعہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

## محمد حسین آزاد (جلد اول و دوم): ڈاکٹر اسلم فرخی: کراچی: ۱۹۶۵ء

محمد حسین آزاد اردو کے عناصر خمسہ میں شمار ہوتے ہیں اُن کی ادبی خدمات متنوع ہیں۔ ان کی سوانح شخصیت اور تصانیف کے بارے میں اسلم فرخی نے پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی کام انجام دیا۔ ان کا یہ طویل مقالہ دو جلدوں میں شائع ہوا ہے پہلی جلد سوانح سے متعلق ہے اور دوسری افکار و تصانیف سے۔

تحقیقی مقالوں کی عام روش کے مطابق ابتدا سیاسی اور سماجی حالات کی پیشکش سے کی گئی ہے اور اسے موضوع متعلقہ سے ربط دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ کتاب میں آزاد کے خاندانی حالات، اسلاف، پیدائش، ابتدائی زندگی، تعلیم، ان کے سیاسی سفر، پنجاب میں قیام، سیر ایران، ملازمت، عالم جنون اور وفات کے حالات تفصیل اور تحقیق سے بیان ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آزاد کی ظاہری زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو منظر عام پر نہ آیا ہو لیکن ان کی نجی زندگی اور گھریلو حالات کے ضمن میں تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔ اس میں مقالہ نگار کو ضروری معلومات کی عدم دستیابی اور مستند ماخذ کی غیر موجودگی کے تلخ تجربے سے گزرنا پڑا۔ جن حالات اور واقعات اور مباحث کو زیر بحث لایا گیا ہے وہ مفصل ہی نہیں جامع بھی ہیں۔ تفصیلات کی فراہمی سے بے حد محنت و کاوش سے کام لیا گیا ہے اور ان کی پیشکش میں سلیقہ اور ہنرمندی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ کتاب کو علمی و ادبی تحقیق کی اہم کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مصنف نے ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے ہر امر کو پیش کر دیا ہے اور جہاں کسی قسم کے ابہام کا خیال ہوا ہے

وہاں اپنی جانب سے صحیح صورتحال کی وضاحت بھی کردی ہے۔

کتاب میں سوانحی حالات کی تفصیل درج کرنے کے بعد ان کی ظاہری شخصیت اور اوصاف وکردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ آزاد کا سراپا اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ

"پستہ قد اور دہرے بدن کے قوی ہیکل انسان تھے' بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی ناک، گھنی اور گول داڑھی' بڑی بڑی مونچھیں' چوڑا اور بھرا سینہ۔" (۳۷)

ہر موسم کے لحاظ سے ان کے لباس کا ذکر بھی ہے اور یہ بھی لکھا گیا ہے کہ وہ لباس کی صفائی اور پاکیزگی کے ساتھ ساتھ طہارت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ روزے نماز کے پابند تھے۔ وارفتگی کے زمانہ میں بھی نماز ضرور پڑھتے تھے۔ وہ شگفتہ طبیعت اور سادہ مزاج تھے۔ زمانہ کے ہاتھوں دکھ اٹھانے کے باوجود ان کی خوش مزاجی اور خوش دلی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

ان میں حد درجہ انکساری اور فروتنی تھی ان میں انتقام کا مادہ بالکل نہ تھا کتابوں سے عشق تھا۔ ان تمام اوصاف کا صرف حوالہ نہیں دیا گیا بلکہ واقعات کے ذریعے ان کی صداقت بھی ثابت کی ہے۔

سوانح کے متعلق معلومات کی حسن ترتیب، شخصیت کے اوصاف کی تکمیل، سنجیدہ، متین اور محققانہ انداز بیان نے اس کاوش کو وقیع اور کار آمد بنا دیا ہے۔ یہ ان چند تحقیقی کارناموں میں سے ایک ہے جو ادب کے طالب علم کے لئے رہنما رہے گی۔

### حیات ذاکر حسین: خورشید مصطفیٰ رضوی: دہلی: ۱۹۶۹ء

ڈاکٹر ذاکر حسین ہندوستان کے قابل احترام ماہر تعلیم' قوم پرست رہنما ہونے کے علاوہ مرنجان مرنج' پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے سوانحی حالات اور کارناموں کو تاریخ وار بیان کرنے کے بجائے نوعیت کے اعتبار سے تقسیم کرکے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کا پہلا باب ابتدائی حالات پر مشتمل ہے جس میں قائم گنج اور ذاکر حسین کے خاندان کے تعارف کے بعد ان کی ولادت، بچپن' تربیت' ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے ساتھ دیگر ایسے واقعات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کی مدد سے ان کی سیرت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً "بچپن میں ان کی اپنے چھوٹے بھائی زاہد حسین خان سے اَن بَن رہتی تھی۔ زاہد حسین خان مزاج کے تیز اور جسمانی طور پر زیادہ مضبوط تھے۔ جبکہ ذاکر حسین جسمانی طور پر ان سے کمزور تھے اور وہ اس وقت بھی ذہن و عقل سے زیادہ کام لیتے تھے۔ ان کے مزاج میں نرمی تھی۔ اس لئے وہ بھائی کی زیادتی کو بھی تحمل سے برداشت کرلیتے تھے۔ یہی تحمل' بردباری' جذبے پر عقل کو حاوی رکھنے کی صفات ہی ان کے اوصاف کے جوہر شمار کئے گئے جو انہیں دوسروں سے ممتاز رکھتے تھے۔



رواداری' خیرسگالی اور ہر چھوٹے بڑے کو عزت دینا ان کا شعار تھا۔ انہیں کی وجہ سے ان کی شخصیت میں ایک طرح کی محبوبیت پیدا ہوگئی تھی۔ مصنف نے واقعات کے بیان کے ساتھ کردار کے ایک ایک پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ دیگر ابواب بھی سوانح کا حصہ ہیں لیکن ان کا نمایاں تعلق کارناموں سے ہے جیسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس و تعمیر اور اس میں ذاکر حسین کا فعال کردار' واردھا تعلیمی اسکیم اور اس سے ان کی وابستگی' جامعہ ملیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے ان کی خدمات اور سیاسی فکر و عمل اگرچہ ان ابواب میں صاحب سوانح کے اوصاف واضح ہوچکے ہیں لیکن مصنف نے آخری باب میں انہیں خصوصیت سے بیان کیا ہے۔ ان میں سادگی' منکسرالمزاجی' اپنا ہر کام خود کرنا' محنت و مشقت سے جی نہ چرانا' ہر کام میں ترتیب اور تنظیم کا خیال رکھنے کی صفات کے حوالے سے واقعات بھی بیان کئے ہیں۔

ذاکر حسین کی پہلودار شخصیت کے نقش کو ابھارنے کے لئے کتاب کی جو ترتیب قائم کی گئی ہے نہایت مناسب ہے۔ اگرچہ اس سے واقعات کا تسلسل قائم نہیں رہا ہے لیکن ہر پہلو پر مکمل معلومات فراہم ہوجاتی ہے۔ مصنف کی نظر میں صاحب سوانح کی نجی اور عام زندگی دونوں رہے ہیں اس لئے وہ انہیں پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

### حکیم سید شمس اللہ قادری: میر احمد علی: حیدر آباد دکن: ۶؍ جنوری ۱۹۷۰ء

حکیم شمس اللہ قادری ۵؍ نومبر ۱۸۸۵ء تا ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۳ء اردو زبان' قدیم ادب اور تاریخ کے مسلم الثبوت عالم تھے۔ ان کی تحقیقات علمی کا اعتراف اہل علم و نظر نے کیا ہے لیکن ان کی شخصیت' سوانح اور کارناموں پر جس قدر توجہ دی جانی چاہئے تھی نہیں دی گئی۔ میر احمد علی نے جامعہ عثمانیہ سے اردو میں ایم اے کیا اور سیدہ جعفر کی نگرانی میں ان کی حیات اور کارناموں پر مقالہ لکھ کر ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ان کا کام اس اعتبار سے بھی مستند ہے کہ انہیں شمس اللہ قادری کی غیر مکمل اور غیر مطبوعہ خودنوشت کے علاوہ ان کے فرزندوں' احباب اور قدردانوں سے براہ راست معلومات حاصل کرنے کی سہولت حاصل رہی۔ شمس اللہ قادری نے باقاعدی تعلیم کہیں حاصل نہیں کی لیکن نامور علماء سے استفادہ کیا۔ فاضل محقق نے ان کی خودنوشت کے حوالے سے انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے فارسی کے شاعر علامہ اقبال کے استاد

مولانا غلام قادر گرامی کی صحبت سے فائدہ اٹھایا تھا۔ سرسید کے آخری ایام میں کئی ماہ ان کے ساتھ گزارے تھے۔ مولانا نذیر حسین محدث اور ماسٹر رام چندر کا ذکر بھی انہوں نے اپنے استاد کی حیثیت سے کیا ہے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بھائی عبدالوہاب انصاری سے علم طب پڑھی تھی ڈاکٹر نستی کانت چٹوپادھیا کے فیض صحبت سے علمی تحقیقات و تطبیقات سیکھے تھے۔ وہ تاریخ عمومی' تاریخ ادبی' فارسی و اردو سے خاص دلچسپی رکھتے تھے اردوئے قدیم کی تاریخ مرتب کی تھی وہ ماہر آثار قدیمہ اور سکہ جات تھے۔ وہ کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے جس کی تصدیق ان فہارس سے ہوتی ہے جو ان کی کتابوں میں بطور حوالہ درج ہیں۔ یہ ساری قابلیت اور علمی مرتبہ انہوں نے اپنی کوششوں سے حاصل کیا۔ ایسے کم لوگ ہی نظر آتے ہیں جو اپنی محنت سے اس بلند درجہ تک پہنچے ہوں۔ محقق نے ان کے حالات زندگی' بزرگوں کے کوائف' فرزندوں کے احوال کا با تفصیل ذکر کیا ہے اور حکیم صاحب کی شخصیت و سیرت کے تمام خدوخال نمایاں کئے ہیں۔ ان کی وضع قطع' ان کے لباس' اخلاق و عادات' مشاغل' ذوق سیروسیاحت' حافظہ کی کیفیت' خودداری' جاہ طلبی سے گریز' تاریخ سے غیر معمولی شغف پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ ان کا مکمل تعارف ہو گیا ہے۔ ان کی تصانیف و تالیفات آثار الکرام' مؤرخین ہند' مؤرخین دکن' تجارت العرب قبل الاسلام' ملیبار' امرائے پائیگاہ' امرائے آصفیہ' شجرۂ آصفیہ' نقود اسلامیہ' سکہ جات شاہان اودھ' مسکوکات قدیمہ' بشارات احمدیہ' جواہر العجائب' عمادیہ' محبوب الآثار' دیباچہ شاہنامہ قدیم' پرتگیزان مالا بار' کتاب الملوک و اخبار الماضین' اردوئے قدیم پر تبصرے بھی کئے ہیں اور ان کے بارے میں معاصرین کی آراء بھی درج کی ہیں۔ مواد کے اعتبار سے کتاب قابل تعریف ہونے کے ساتھ انداز بیان میں توصیف کو پیش نظر رکھا ہے حالانکہ محقق کی مدد کے بغیر بھی ان کے کارنامے داد و ستائش حاصل کر سکتے تھے۔

**خسرو شیریں زبان: اقبال صلاح الدین: لاہور: ۱۹۷۰ء**

امیر خسرو کی سوانح اور ان کے کارناموں پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اقبال صلاح الدین نے اہم اضافہ کیا ہے۔ شاعر ہفت زبان' عارف باللہ' ماہر موسیقی' ترجمان تہذیب و ثقافت امیر خسرو ہر دور میں اہل علم کی توجہ کے مرکز رہے تاریخ نگار اور تذکرہ نویس اس طوطی شیریں مقال کے لئے رطب اللسان رہے لیکن ان پر جس قدر تحقیقی کام ہونا چاہئے تھا اس کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا گیا۔ موجودہ صدی کے اوائل میں ان کی تصانیف کو متن کی تنقیح کے



ساتھ شائع کرنے کا بیڑا علی گڑھ والوں نے اٹھایا تھا وہ بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا حیات خسرو کی تفصیلات بیان کرنے کا فرض کسی حد تک شبلی نعمانی نے ادا کیا ان کے بعد سعید احمد مارہروی' وحید مرزا اور تقی محمد خورجوی نے کتابیں تالیف کیں جن سے حیات خسرو کے حوالے سے تحقیق کے ضمن میں اضافہ ہوا۔ "خسرو شیریں زبان" کے مؤلف کے پیش نظر مذکورہ اہل علم کی کتابوں کے علاوہ امیر خسرو کی تمام تصانیف' تحریریں اور ان کے دور کی تواریخ رہی ہیں۔ ان سب سے استفادہ نے ان کی تحقیق کو وقیع بنا دیا ہے۔ ماقبل لکھنے والوں کے بیان کردہ واقعات سے جہاں بھی اختلاف کیا ہے ان کا ذکر کرتے ہوئے تاریخی حوالوں سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ کتاب سات ابواب اور کئی اہم حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ میں امیر خسرو کے خاندانی حالات اور ان کی زندگی کے کوائف ہیں۔ دوسرے حصے میں ان کی فنون شاعری و موسیقی سے دلچسپی اور خدمات کا ذکر ہے اسی کے ضمن میں ان کی جملہ تصانیف کا مفصل حال بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی فارسی قصائد' غزلیات' مثنویوں اور رباعیوں کا انتخاب بھی شامل ہے۔ تیسرے حصے میں امیر خسرو کے ایسے نثری اقتباسات اور اشعار ہیں جو ان کی ذات اور ان کے فنون پر روشنی ڈالتے ہیں اور اساتذہ کے بارے میں ان کی آراء ہیں چوتھے حصے میں تذکروں' تاریخوں میں ان کا جو ذکر آیا ہے اور شعراء نے انہیں جو نذرانہ پیش کیا ہے درج ہیں۔ سوانحی حالات کو تاریخ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے کیونکہ ان کے والد اور خود ان کا تعلق ہمیشہ کسی نہ کسی حکمران وقت یا شہزادوں سے رہا اس طرح بیک وقت حالات خسرو کے ساتھ تاریخ سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے۔ امیر خسرو کی سیاسی زندگی کے حالات کے علاوہ ان کی گھریلو زندگی کی تفصیلات بھی بیان ہوئی ہیں اور ان کے تصوف سے لگاؤ' سلاطین المشائخ سے بیعت' تجدید بیعت' مرید و مرشد کے درمیان محبت اور اخلاص کے تعلقات' حسن سنجری سے خصوصی لگاؤ کی مکمل وضاحت موجود ہے تاریخ' افتادِ طبع' سیرت و کردار' فکر و فن غرض کہ کوئی پہلو ایسا نہیں ہے کہ جو تشنہ رہ گیا ہو۔

**یادگار شبلی: شیخ محمد اکرام: لاہور: ۱۹۷۱ء**

یادگار شبلی لکھنے سے قبل شیخ محمد اکرام حالات شبلی کے بارے میں "شبلی نامہ" لکھ چکے تھے ان کی نظر میں وہ ایک نامکمل کوشش تھی اسے وہ سوانحی خاکہ سے زیادہ اہم قرار نہیں دیتے ان کے خیال میں سیرت لکھتے وقت صاحب سیرت کے اپنے نقطۂ نظر کو ہمدردانہ طریقہ سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ لٹن اسٹریچی کے نظریہ کے تحت صرف اہم واقعات کو پیش کر کے سیرت

نگاری کا حق ادا کیا تھا اور واقعات کا انبار نہیں لگایا تھا۔ شیخ محمد اکرام علامہ شبلی کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو اجاگر نہیں کر پائے تھے۔ دوسرے اہل علم مثلاً "سید سلیمان ندوی نے سرسید اور شبلی کے درمیان اختلافات کا جو طومار باندھا تھا اس کی حقیقت کا انکشاف بھی ضروری تھا۔ نہ صرف کتاب میں بلکہ یادگار شبلی کے پیش لفظ میں بھی انہوں نے اختلافات کی اس کہانی کو مسترد کردیا ہے اور علامہ شبلی کی تحریروں اور تقریروں سے ثابت کردیا ہے کہ وہ نہ صرف سرسید کی زندگی میں بلکہ ان کی وفات کے عرصہ بعد تک سرسید کے مؤید اور علی گڑھ تحریک کے بہی خواہ رہے۔

یوں تو علامہ کے سوانحی حالات دیگر کتابوں میں مل جاتے ہیں۔ یادگار شبلی کو ان کتب پر یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں تمام مطبوعہ اور قابل حصول غیر مطبوعہ ذرائع معلومات سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ سوانح و سیرت نگاروں کے من مانے بیانات اور من گھڑت نظریات کی مستند حوالوں سے تردید کے علاوہ علامہ کی سیرت کا مطالعہ ان کے داخلی احساسات و جذبات کی روشنی میں کیا گیا ہے اور ان کے محرکات کی نشاندہی کی کوشش کی گئی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان کی شخصیت دوجہتی تھی اور ہر جہت ایک دوسرے سے متصادم تھی وہ ایک طرف تو اپنے استاد مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی سے متاثر تھے۔ جو ایک بڑے عالم تھے ان کی دلچسپی کے مرکز ادب اور معقولات تھے وہ قدیم مشرقی علوم پر کامل دسترس رکھتے تھے جدید علوم کی تحقیر کرتے اور اس کی مخالفت پر کمربستہ رہتے۔ وہ قانون دان بھی تھے اور موسیقی سے شغف بھی رکھتے تھے۔ یہ خصوصیات علامہ شبلی نے اپنی ذات میں سمونے کی کوشش کی تو دوسری طرف وہ سرسید کے نظریات سے بھی متفق تھے اور ان کے زیر تربیت تقریباً "۱۷ سال کا عرصہ گزارا۔ اپنے مربی کی شان میں ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ سرسید نے زندگی کے آخری ایام میں خود محسوس کرلیا تھا وہ اپنی تحریک سے جو نتائج حاصل کرنا چاہتے تھے وہ حاصل نہ ہوسکے اس کا علم شبلی کو بھی تھا اگر سرسید کے محسوسات کو انہوں نے اپنے نظریات بنا کر پیش کیا تو یہ ان کی فکر کی کامیابی نہ تھی اور اس اختلاف کو ہوا دینے سے ان کی شخصیت کی بزرگی میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ شیخ اکرام کا تجزیہ شواہد کی موجودگی میں حقائق پر مبنی ہے۔

علامہ شبلی کی نجی زندگی لائق توصیف نہیں رہی۔ دو شادیوں کے بعد ڈھلتی عمر میں جوان اولاد کی مخالفت کے باوجود تیسری شادی کا ارادہ اور اس سے پیدا شدہ صورتحال کوئی خوشگوار تاثر نہیں چھوڑتی۔ اس پر عطیہ کا قصہ ان کے نام لکھے گئے خطوط کی شوخی اور حد سے بڑھی ہوئی بے



تکلفی' اس دور کی عشقیہ شاعری کسی بھی "علامہ" کو زیب نہیں دیتی۔ اس کتاب میں واقعات کے بیان کے ساتھ سیرت کے تمام پہلوؤں کو بھی واضح کرنے کی سعی موجود ہے۔ بہ حیثیت مجموعی جن حالات سے انہیں از ابتدا تا انتہا گزرنا پڑا ایک حساس انسان ہونے کی وجہ سے انہوں نے شدت سے ان کے اثرات قبول کئے۔ ان کے ردعمل سے ہی ان کی شخصیت کی صورت گری ہوئی۔ سوتیلی ماں کی وجہ سے گھریلو سکون فراہم نہ ہونا' تعلیم سے فراغت کے بعد حصول روزگار کے لئے طویل عرصہ کشمکش' بلند ارادوں کے مقابل معمولی حیثیت کی نوکریوں سے ابتدا کرنا' پہلی بیوی سے مزاج کی عدم مطابقت' دوسری بیوی سے خواہش کے ایک رخ کا حصول اور دوسرے رخ سے محرومی واضح ہے' علی گڑھ کے مقابل میں ندوہ کا اس سطح تک بلند نہ ہونا جس کے وہ متمنی تھے اور پھر جس درسگاہ کو وہ ایم اے او کالج سے اونچا کرنا چاہتے تھے اس سے وابستگی کے امکانات کا ختم ہونا' جس حسن صورت و حسن سیرت کے ایک ذات میں اجتماع کے وہ خواہش مند تھے وہ ایک ہستی میں موجود پانا جوان کی طاقت حصول سے باہر تھی۔

قابلیت کی بلندیوں کو چھونے اور احساس محرومی کا شکار ہونے والی شخصیت جن مثبت اور منفی رجحانات کی حامل ہوسکتی ہے اس کا عکس کتاب میں بیان کردہ ایک ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ شیخ محمد اکرام نے صرف وقائع نگاری کا حق ہی ادا نہیں کیا ہے بلکہ صاحب سیرت کی داخلی کیفیات تک پہنچنے اور ان کی ترجمانی کی کوشش بھی کی ہے۔ وہ شبلی کے مخالف نہیں تھے لیکن سچائیوں سے چشم پوشی کرکے سیرت نگاری کا حق ادا نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے شبلی کے تمام کارناموں اور ان کے کردار کی تمام عظمتوں کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی کمزوریوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ اعظم گڑھ کے اہل علم و دانش حسن عقیدت میں ایسی تصویر پیش کررہے تھے جو ان کے آئیڈیل کی تھی لیکن علامہ کی نہیں تھی۔

جہاں تک فن سوانح میں مدح و توصیف کے شامل ہونے کا سوال ہے شیخ محمد اکرام کا ذہن صاف ہے۔ کسی بھی شخصیت پر قلم اسی وقت اٹھایا جاتا ہے جب یا تو اس کے کارناموں کے لئے تحسین کے جذبات موجود ہوں یا اختلاف کے غیر معمولی وجوہ موجود ہوں۔ اس دور کا سوانح و سیرت نگار صد فی صد غیرجانبدار رہتا ہے یا اسے رہنا چاہئے محض اصول پسندی اور عینیت پسندی ہے۔ مصنف نے یادگار شبلی صاحب سوانح کے علمی تبحر اور ادیبانہ و محققانہ کارناموں سے متاثر ہوکر لکھی ہے اور اسے "حیات شبلی" (مصنفہ سید سلیمان ندوی) (۳۵) کی طرح من مانی تاویلات کے ذریعہ مدح بنایا ہے اور نہ مخالفت برائے مخالفت کے جوش میں حد سے تجاوز کیا

ہے۔ اس میں صداقتوں کی شان موجود ہے اور تجزیاتی مطالعہ کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

## حیات سلیمان: شاہ معین الدین ندوی: اعظم گڑھ: ۱۹۷۳ء

سید سلیمان ندوی بھی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے علم و ادب کے اس دبستان سے ان کا گہرا اور زندگی بھر کا تعلق رہا جو علامہ شبلی نعمانی نے قائم کیا۔ احیائے علوم اسلامی' مشاہیر اسلام کے کارناموں اور تاریخ اسلام کے صحیح خدوخال کو پیش کرنا اس دبستان کے نمایاں کارنامے ہیں علامہ شبلی کے کارناموں کی مدت ۳۲ سال ہے ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی تقریباً "نصف صدی مذہبی' علمی' تعلیمی' قومی' ملّی اور سیاسی کام انجام دیتے رہے۔ ان کی سوانح حیات لکھنے کا حق ایسے ہی شخص کو حاصل تھا جو ان سے برسوں قریب رہا ہو۔ ان کی شخصیت اور کردار کا مطالعہ روز مرہ زندگی کے حوالے سے کیا ہو جس کو یہ مواقع حاصل رہے ہوں کہ صاحب سوانح کے حالات و کوائف براہ راست معلوم کرنے کے علاوہ ان کے عزیز و اقارب' دوست و احباب سے معلومات اخذ کرنے کی سہولت حاصل رہی اور ان کی تصانیف' خطبات' تقاریر اور خطوط سے استفادہ کا موقع ملا ہو۔ شاہ معین الدین احمد ندوی کو یہ تمام سہولتیں حاصل رہیں۔ انہوں نے اپنی کاوش سے زیادہ سے زیادہ مواد جمع کیا ہے تاکہ موضوع سے انصاف کر سکیں۔ انہوں نے خاندان کا تعارف کرواتے ہوئے صاحب سوانح کے بچپن کے حالات بھی بیان کئے ہیں اور ان کی اس وقت کی دلچسپیوں اور مصروفیتوں کا ذکر بھی کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ سید صاحب اس زمانے میں بھی سنجیدہ مزاج اور کم آمیز تھے کھیلوں سے انہیں خاص دلچسپی نہ تھی البتہ بیت بازی اور کبڈی سے کبھی کبھی شوق کر لیا کرتے تھے۔ ان کی تعلیمی مصروفیات اساتذہ بالخصوص شبلی سے قربت و استفادہ کا حال تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ "الہلال" سے وابستگی' پونا کی ملازمت' دارالمصنفین سے وابستگی' تصنیف و تالیف کے مشاغل' درس و تدریس کے طریقے غرض کہ ان کی زندگی بھر کی مصروفیات اور ان کے طور طریقوں کی کیفیتیں اس میں موجود ہیں ان میں سے زیادہ تر باتیں عام نگاہوں میں پوشیدہ نہیں رہیں اس تصنیف کی خصوصیات سید صاحب کی نجی زندگی' واقعات اور افراد کے حوالے سے ان کے تاثرات و جذبات کی ترجمان ہیں جسے شخصی رابطے کی بناء پر مصنف مؤثر طریقے سے پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ سید صاحب کی نجی زندگی کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ

"گھریلو زندگی مہر و محبت کا نمونہ تھی دارالمصنفین میں کام کے اوقات کے علاوہ ان کا سارا



وقت بال بچوں کی دلچسپیوں میں گزرتا تھا سب سے چھوٹی اولاد پر نگاہ زیادہ تھی اس کو گود میں لے کر اور جب چلنے کے قابل ہوا تو انگلی پکڑ کر دارالمصنفین کی سڑک پر ٹہلایا کرتے تھے۔" (۳۸)

ان میں غصہ کرنے' غیظ و غضب کی حالت میں بے قابو ہو جانے کی کیفیت کبھی نہیں دیکھی گئی۔ ناپسندیدگی کا اظہار نرمی اور اشاروں سے کر دیتے تھے یہ بڑی اعلیٰ ظرفی کی بات تھی۔

ان کے تصنیفی شوق اور تحقیق کی دقت نظری کا حال بھی بیان ہوا ہے جس کے بھروسے پر علامہ شبلی نے سیرت النبی کا جو کام غیر مکمل چھوڑا تھا اسے انہوں نے علامہ کے تصور کے معیار کے مطابق مکمل کیا۔

وہ بیک وقت مصنف بھی تھے' محقق بھی تھے دارالمصنفین کے منتظم بھی تھے' احیائے اسلام کے داعی بھی تھے جس کی وجہ سے انہیں شہر شہر کے دورے کرنا اور اسلام کی حقانیت پر تقاریر کرنا پڑتی تھیں۔ وہ میدان سیاست کے شہسوار بھی تھے۔ خلافت تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ صاحب طرز انشا پرداز تھے اپنا اسلوب رکھتے تھے لیکن جب الہلال سے وابستہ رہے تو مولانا ابوالکلام آزاد کے رنگ میں بہت سے مضامین لکھے جنہیں لوگوں نے آزاد کے زور قلم کا نتیجہ سمجھ کر انہیں کے نام سے شائع کیا۔

آخری عمر میں دارالمصنفین کے سلسلہ میں مسعود علی ندوی سے اختلافات ہو گئے تھے جس کا انہیں ہمیشہ رنج رہا۔ اس اختلافی مسئلہ پر مصنف نے روشنی نہیں ڈالی غالباً" اس کی وجہ فریقین کی کمزوریوں کو ظاہر نہ کرنے کا خیال ہو۔

مصنف خود ایک مرنجان مرنج' متین اور سنجیدہ مزاج شخص ہیں۔ انہوں نے چاہا کہ اختلافی اور نزاعی امور کا ذکر کر کے ایسا باب نہ کھولا جائے جس سے بحث و مباحثہ اور رد و قدح کا نیا سلسلہ شروع ہو جائے۔ اکثر اشخاص کے درمیان نزاعات اداروں کی تخریب کے باعث ہوتے ہیں اسی بناء پر مصنف نے مصلحت سے کام لیا ہے اگرچہ یہ فن سوانح نگاری سے انحراف ہے مصنف صاحب سوانح اور مولانا مسعود علی ندوی کے درمیان نزاع کے بارے میں یہ کہہ کر گزر گئے ہیں کہ

"وہ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں اس لئے اس کا قلم انداز کرنا ہی بہتر ہے۔" (۳۹)

موجودہ دور میں سوانح نگاری کا معیار یہی سمجھا جاتا ہے کہ کسی خوبی یا خامی سے صرف نظر نہ کیا جائے۔ اس نقطہ نظر سے مصنف کے رجحان پر حرف گیری کی جا سکتی ہے۔ مصنف کو صاحب

سوانح سے قرب خاص حاصل تھا اس کے باوجود ان سے کہیں کہیں واقعات کے بیان میں سہو ہوا ہے۔ اس حوالہ سے صاحب سوانح کے فرزند ڈاکٹر سید سلیمان ندوی نے ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی کو خط میں لکھا تھا کہ

"حیات سلیمان میں کئی باتیں غلط لکھ دی گئی ہیں مثلاً" والدہ محترمہ کے بارے میں لکھ دیا ہے کہ وہ کم سن بیوہ تھیں۔ جب والد مرحوم نے ان سے شادی کی مگر یہ غلط ہے اور صحیح نہیں ہے اسی طرح کئی اور بے سروپا باتیں ہیں۔" (۴۰)

حیات سلیمان ماخذ کے لحاظ سے خصوصاً "پاکستان کے دوران قیام کے سلسلہ میں معتبر نہیں ہے۔

"...... حیات سلیمان میں میرے بارے میں لکھا ہے کہ میں نے اپنی ہم درس خاتون سے شادی کی' یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ میری اہلیہ میری ہم درس کبھی بھی نہیں تھی شادی سے پہلے تو میں ان کو جانتا بھی نہ تھا۔" (۴۱)

اس کے علاوہ مصنف نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ

"یہ ملحوظ رہے کہ یہ ایک جلیل القدر شخصیت اور ایک شفیق استاد کی سوانح عمری' ایک ادنیٰ شاگرد کے قلم سے ہے اس لئے کہیں جذباتی عقیدت کا پرتو نظر آئے تو اس کو معذور سمجھا جائے۔" (۴۲)

مصنف کے اعتراف کے باوجود ان کی عقیدت مندی بیان میں گراں باری کا باعث نہیں بن سکی۔

مذکورہ خامیوں کے باوجود "حیات سلیمان" شبلی اسکول کی کامیاب تصنیف ہے جس طرح مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد علامہ شبلی کی سوانح عمری لکھنے کا حق انصاف اور حقیقت پسندی سے ادا کیا تھا اسی طرح ان کے شاگرد شاہ معین الدین ندوی نے اپنے استاد کی سوانح عمری کا قرض ادا کیا ہے۔ ان کی تحریر میں وہی شان اور وقار ہے جو علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم میں تھی۔ انہوں نے بھی سوانح عمری میں تخلیقی شان پیدا کردی ہے۔

**حسرت موہانی' حیات اور کارنامے: احمر لاری: گورکھ پور: ۱۹۷۳ء**

احمر لاری نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے "حسرت موہانی حیات و کارنامے" کو موضوع بنایا ان کا مقالہ ۱۹۷۳ء میں کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔ احمر لاری نے مقالہ کی تکمیل کے لئے



مطبوعہ مواد کا سہارا ہی نہیں لیا بلکہ مولانا سے واقف حضرات سے شخصی رابطہ قائم کرکے بعض ایسے امور پر قطعی رائے قائم کی جن میں اختلاف چلا آرہا تھا مثلاً" مولانا کا سال پیدائش متنازع تھا' ۱۸۷۵ء' ۱۸۷۶ء' ۱۹۷۸ء' ۱۸۸۰ء' ۱۸۸۱ء میں پیدا ہونے کی روایتیں عام تھیں مولانا کے خاندان کے ایک بزرگ اکرام الحسن موہانی کے حوالے سے اسے قطعی طور پر ۱۸۸۱ء متعین کیا ہے مولانا کے خاندانی حالات' سلسلۂ طریقت' تعلیم' سیاسی زندگی اور ادبی خدمات کا نہایت تفصیل سے جائزہ لیا ہے اگرچہ بعض امور میں انہوں نے تحقیق کا حق ادا نہیں کیا مثلاً" مولانا سید سلیمان ندوی کے بیان کو کہ مولانا حسرت موہانی مسلم لیگ کے آگرہ اجلاس میں شریک تھے بلا تحقیق درست مانا ہے اور بطور مستند حوالہ درج کیا ہے حالانکہ مذکورہ اجلاس ۱۹۱۳ء میں ہوا تھا جبکہ مولانا اس کے رکن بھی نہیں بنے تھے ان کی رکنیت کی درخواست مسلم لیگ کے ریکارڈ میں موجود ہے جو نومبر ۱۹۱۵ء میں دی گئی تھی اسی طرح مولانا کی چوتھی گرفتاری کے بارے میں فرقت کاکوروی کی من گھڑت کہانی کو بلا تبصرہ و تردید شامل مقالہ کرلیا ہے۔ مولانا کی سیرت اور ادبی خدمات کے بارے میں احمر لاری کی تحقیق یقیناً" معلومات افزا ہے۔ انہوں نے مولانا کی شاعری کا ہی تجزیہ نہیں کیا ہے بلکہ ابتدائی دور کی شائع شدہ نظمیں بھی تلاش کی ہیں جو اضافہ ضرور ہیں مقالہ نگار نے ان غزلوں کی جستجو نہیں کی جو کلیات میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں اور نہ ایسا تقابلی جائزہ لیا کہ غزل کے اشعار رسائل میں کس صورت میں شائع ہوئے تھے اور کلیات میں کس ردوبدل' ترمیم و اضافہ کے بعد جگہ پا سکے۔ مولانا کی اکثر غزلوں کا واقعاتی پس منظر بھی ہے اس کی جانب توجہ نہیں دی البتہ شاعری سے قطع نظر ان کی صحافت اور تذکرہ نگاری اور تنقید نگاری پر سیر حاصل بحث کی ہے جہاں تک مولانا کی سیاست کا تعلق ہے یا تو مقالہ نگار نے تحقیق کی کوشش نہیں کی یا مصلحتوں کی بناء پر حقائق سے چشم پوشی کی ہے۔ ان کے اخذ کردہ نتائج کہ مولانا نیشنلسٹ مسلمان تھے مذہب کی بنیاد پر قومیت کے قائل نہیں تھے حقائق پر مبنی تجزیے نہیں ہیں اس ایک باب سے قطع نظر احمر لاری نے حقائق جمع کرنے اور موثر طور پر پیش کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے اگرچہ بعض کوششوں میں تحقیق کی گنجائش باقی ہے۔

**ابوالکلام آزاد: عرش ملسیانی: دہلی: اگست ۱۹۷۴ء**

پبلیکیشنز ڈویژن حکومت ہند کی خواہش پر عرش ملسیانی نے مولانا ابوالکلام آزاد کے سوانحی حالات مرتب کئے ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ "مولانا کے باب

میں بہت کچھ لکھا گیا ہے ان کے مکمل سوانح اِدھر اُدھر کتابوں میں بکھرے پڑے ہوئے ہیں۔ میرا کام انہیں یکجا کرنا اور حتی الامکان دیانتداری سے جمع کرنا تھا وہ میں نے کردیا۔" (۴۳) جن اہم ماخذات سے انہوں نے استفادہ کیا ہے ان میں (India Wins Freedom)' انوار ابوالکلام آزاد مرتب علی جواد زیدی' ذکر آزاد از مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی' آثار ابوالکلام آزاد از قاضی عبدالغفار' ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں از ڈاکٹر ذاکر حسین' نقش آزاد از غلام رسول مہر' قول فیصل از مولانا آزاد' آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی از مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور چند جرائد کے خاص نمبرز شامل ہیں۔ کتاب کی نوعیت ترتیب و تالیف کی ہے جس میں مرتب نے متنازع امور سے قطع نظر اپنی رائے دینے یا تجزیے اور تبصرے سے بھی گریز کیا ہے۔ مولانا آزاد کے حالات زندگی' ان کے مذہبی خیالات' سیاسی رجحان' علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ اس انداز سے لیا گیا ہے کہ موضوع سے ناواقف قاری کو مستند مواد مل جاتا ہے اور صاحب سوانح کے حالات شخصیت اور کارناموں سے ابتدائی نوعیت کی معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔

## ناسخ تجزیہ وتقدیر: سید شبیہہ الحسن نونہروی: لکھنؤ: ۱۹۷۵ء

ناسخ اردو کے ان شاعروں کی فہرست میں شامل ہیں جن کے کلام پر داد و تحسین کم تنقید و تنقیص زیادہ ہوئی ہے اس کے باوجود تاریخ اردو ادب میں ان کی جو اہمیت ہے اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سید شبیہہ الحسن نونہروی نے انہیں ایک مقنن' ایک دور' ایک تحریک' ایک طرز فکر اور ایک ایسی "رگ گل" قرار دیا ہے۔

"جواب بھی ادبی شیرازہ بندی کررہی ہے اردو کی تاریخ میں ایسی ہمہ گیر شخصیت کو ناپسندیدگی کے باوجود نظرانداز کرنا تاریخی حقیقت سے منہ موڑنے کے مترادف ہے۔" (۴۴)

اردو شعراء کے اکثر تذکروں میں ناسخ کے تراجم شامل ہیں جو اپنے انحصار کی وجہ سے کوئی افادیت نہیں رکھتے سید شبیہہ الحسن نونہروی کی تصنیف "ناسخ تجزیہ و تقدیر" ان کے سوانحی حالات کو مربوط اور مبسوط انداز میں پیش کرنے کی پہلی کوشش ہے۔

کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ ذاتیات اور دوسرا حصہ شعریات ناسخ سے متعلق ہے پہلا حصہ دو سو صفحات سے زائد پر پھیلا ہوا ہے جس میں سوانح عمری پیش کی گئی ہے۔ یہ حصہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔



پہلے باب میں ابتدائی حالات' شخصیت کا تکوینی عہد' تعلیم و تربیت' شعروادب کے لئے دور آمادگی اور ابتدائی ادبی معرکوں پر مشتمل ہے۔

دوسرے باب میں سیاسی بحران کی آزمائش' جلاوطنی' بیرون لکھنؤ زندگی' لکھنؤ سے جذباتی ربط' اس عہد کی دیگر تفصیلات کے علاوہ لکھنؤ کی طرف مراجعت سے وفات تک کے حالات ہیں تیسرے باب میں عادات و فضائل' معمولات و لطائف' سماجی اور ادبی زندگی دائرہ تعارف و تاثر کا بیان ہے۔

مصنف کا رجحان تحقیقی سوانحی عمری مرتب کرنے کا ہے انہوں نے تمام ماخذات پیش نظر رکھ کر ان کا جائزہ لیا ہے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے غیر مصدقہ روایات کو مسترد کرتے ہوئے قرین قیاس نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ از ابتدا تا انتہا رد و قدح' جذب و قبول کا ہی انداز کارفرما ہے۔

اپنی تمام تر تحقیقی کاوش کے باوجود مصنف متعدد اہم امور کے بارے میں قطعی نتیجہ اخذ نہیں کرسکے۔ انہیں ایسے ماخذ ہی نہیں ملے کہ وہ صاحب سوانح کی تاریخ یا کم از کم سال پیدائش متعین کرسکتے۔ انہوں نے تصریحات اور شہادتوں کو پیش کرتے ہوئے صرف یہ نتیجہ نکالا ہے کہ

"ناسخ کی ولادت قطعی طور پر عہد شجاع الدولہ میں ہوئی۔" (۴۵)

تذکرہ میں ناسخ کی جائے پیدائش کے بارے میں بھی اختلاف ہے بعض نے لکھا ہے کہ ولادت لاہور میں ہوئی بعض لکھنؤ کو جائے ولادت بتاتے ہیں مصنف نے تذکروں کے حوالہ سے جائے پیدائش فیض آباد قبول کرلی ہے لیکن وہ ناسخ کے والد شیخ خدا بخش کے جائے قیام کے بارے میں تذبذب کا شکار ہیں اور برنبائے قیاس لکھا ہے کہ

"ان کے باپ خدا بخش تاجر تھے۔ ان کا وطن لاہور تھا۔ وہ تجارت کے سلسلہ میں اودھ میں وارد ہوئے ہوں گے۔ کاروبار کے نقطہ نظر سے ان کے قیام کی مناسب جگہ دارالریاست ہونے کی وجہ سے فیض آباد تھا۔" (۴۶)

"انہوں نے اغلب یہ ہے کہ فیض آباد میں اس وقت تک قیام کیا ہوگا جب تک وہ دارالحکومت تھا اور جب مرکزیت لکھنؤ میں منتقل ہوئی تو وہ بھی لکھنؤ چلے آئے ہوں گے۔" (۴۷)

اس نوع کی قیاس آرائیوں پر سوانح عمری مرتب نہیں کی جاسکتی لیکن مصنف کی مجبوری یہ ہے کہ اب قطعی شہادت دستیاب نہیں۔ ناسخ کے "سید" ہونے کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوسکا اس

طرح خاندان کا حال معلوم نہ ہوسکا۔ مصنف نے یہ بحث بھی اٹھائی ہے کہ

"ناسخ کی ولدیت کا مسئلہ مابہ النزاع رہا ہے بعض لوگ انہیں خدا بخش لاہوری کا متبنّٰی یا غلام بھی سمجھتے رہے ہیں۔ خدا بخش کے انتقال کے بعد جب میراث کا جھگڑا کھڑا ہوا تو اس طرح کے شبہات شدت کے ساتھ پھیلنے لگے بلکہ غلامی کا عیب غالباً" زندگی بھر ان کے سر تھوپا جاتا رہا۔" (۴۸)

ناسخ کے خاندان کے دیگر افراد کا بھی کچھ پتا نہیں چلایا جاسکا میراث کے جھگڑے کی بناء پر معلوم ہوا کہ ان کے متعدد چچا تھے' ان چچاؤں کے نام و نشان کا بھی پتا نہیں ہوسکا' مصنف نے قیاس کیا ہے کہ ان کے کوئی بھائی بہن نہیں تھا ورنہ جھگڑے میں ان کا ذکر آتا۔

بالصراحت ناسخ کے حصول تعلیم کا حال معلوم نہیں کیا جاسکا البتہ ادبی معرکوں سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کی تعلیم کی بنیادیں مضبوط تھیں۔

شاعری ادبی معرکوں اور اس وقت کی سیاست میں ناسخ کے فعال کردار کو تذکروں اور تواریخ کی مدد سے مرتب کیا جاسکا ہے۔ ان میں کوئی ابہام نہیں ہے لکھنؤ سے ناسخ کا نکالا جانا اور جلاوطنی کے دور میں ان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کا خوبی سے ذکر کیا گیا ہے اور واپسی کے بعد لکھنؤ کے قیام سے وفات تک حالات بھی مفصل ہیں۔

مصنف نے اپنے طور پر کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے لیکن جہاں ماخذات سے رہنمائی نہ مل سکی وہاں قیاس سے کام لیا ہے۔ مواد کی عدم دستیابی سوانح عمری کو جامعیت عطا کرنے میں مانع رہی ہے جہاں جہاں قیاس سے کام لیا ہے وہاں استدلال بھی کیا ہے اگر وہ جامع اور مبسوط سوانح عمری مرتب نہیں کرسکے تو خلا کو کسی نہ کسی طور پورا کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔

## مولانا حیدر حسن خان: عبدالسلام ندوی: اعظم گڑھ: ۱۹۷۵ء

مولانا حیدر حسن خان ایک عالم تھے ان کے شاگردوں کا حلقہ بے حد وسیع تھا عبدالسلام ندوی نے اپنی شاگردی کا حق ادا کرنے کے ساتھ احباب کے تقاضوں کے مدِّنظر ان کی سوانح عمری مرتب کی ہے جو زیادہ تر تاثرات اور مصنف کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ تحقیق کے ذریعہ واقعات کی دریافت یا ان کی جزئیات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی سوانحی واقعات کی ترتیب تاریخی اعتبار سے ہے جس میں پیدائش' تعلیم و تربیت' مشاغل' مسلک' درس' خانگی حالات' ازدواج' اولاد سے محبت کے علاوہ ان کے علمی رجحانات' اعزاء احباب سے تعلقات کی



نوعیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اوصاف اور سیرت کے بیان پر خاص توجہ دی ہے اور ان کی خودداری' ثابت قدمی اور وضع داری کے بارے میں متعدد واقعات بھی بیان کیے ہیں۔ وضع داری کے بارے میں لکھا ہے کہ عہد شباب میں جاڑوں کے موسم میں ایک چادر پر اکتفا کرتے تھے۔ یہ ادا بڑھاپے میں بھی قائم رہی کمبل یا رضائی اوڑھنے کو خلاف وضع داری سمجھتے تھے چنانچہ مصنف لکھتے ہیں

"پنجاب کی سردی مشہور ہے جاڑوں میں اچھے اچھوں کے دانت بجنے لگتے ہیں لیکن مولانا دسمبر جنوری کی شدید سردی میں بھی ایک سوتی چادر پر اکتفا کرتے تھے کہتے تھے کہ مجھے شرم آتی ہے جوان ہوکر بھی سردی مناؤں اگر روئی کی رضائی یا اون کا کمبل اوڑھوں تو لوگ کیا کہیں گے کہ جوانی میں بھی اون اور روئی کا محتاج ہے یہ شان ان کی بڑھاپے تک قائم رہی شدید سردی میں بھی ایک شلوکے سے زیادہ نہیں پہنتے تھے اور اس کے بھی بٹن کھلے رہتے تھے۔" (۴۹)

عبدالسلام ندوی سوانح نگاری کے فن سے واقف ہیں ان سے سیرت عمر بن عبدالعزیز (۱۹۲۳ء) اقبال کامل (۱۹۴۸ء) امام رازی (۱۹۵۰ء) جیسی یادگار تصانیف وابستہ ہیں ان سابقہ کارناموں کی مناسبت سے "مولانا حیدر حسن" جامع اور مکمل سوانح عمری نہیں ہے۔

## رازدان حیات: اسلم ہندی: لکھنؤ: ۱۹۷۵ء

مولانا حسرت موہانی کے انتقال کے بعد ان کی جامع سوانح عمری اسلم ہندی نے "رازدان حیات" کے نام سے تحریر کی ہے جو فن اور اصول سوانح نگاری پر پوری اترتی ہے۔ اس میں حالات اور واقعات زندگی کو تاریخی ترتیب میں پیش کرنے کے بجائے موضوعات متعین کرکے ان کے تحت معلومات درج کی گئی ہیں ابتدا میں موہانی کی تاریخی حیثیت اور اہمیت بیان ہوئی ہے۔ مولانا کے بچپن کے حالات' تعلیمی مدارج اور ان کے اساتذہ کا ذکر ہے۔ آخری باب میں خاندان کے حالات' شجرۂ نسب' کردار اور شخصیت کی جھلکیاں' دوسری شادی کا تفصیلی ذکر ہے پہلا اور آخری باب ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں انہیں باہم پیوست ہونا چاہئے تھا لیکن مصنف نے نامعلوم وجوہ کی بناء پر ان کے درمیان فصل پیدا کردیا ہے۔ یہ دونوں ابواب مولانا کے اور ان کے خاندان کے احوال پر روشنی ڈالتے ہیں۔ نشاۃ النساء بیگم اور صاحبزادی نعیمہ بیگم کے حالات بھی انہیں میں درج ہیں مولانا کی دوسری شادی کے ذکر سے اکثر کتب اور مضامین خالی ہیں اس سلسلہ میں مصنف نے براہ راست معلومات حاصل کی ہیں اور مولانا کی دوسری اہلیہ

حبیبہ بیگم کا انٹرویو بھی درج کیا ہے ان کے بطن سے مولانا کی ایک صاجزادی خالدہ بیگم ہیں جو شاعری سے زیادہ افسانہ نگاری میں دلچسپی رکھتی ہیں ان کے بارے میں بھی معاملات اس قدر تفصیل سے پہلی بار منظر عام پر آئے ہیں۔ یہ متعلقین حسرت کے بارے میں اہم اضافے ہیں۔

دیگر ابواب میں شاعری' ادبی خدمات اور تصوف کے بارے میں مولانا کے معتقدات اور رجحانات کا ذکر ہے۔ ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے اسلم ہندی نے سوانح عمری سیرت اور کارناموں کا خوبی سے جائزہ لیا ہے لیکن سیاسی زندگی پر کم توجہ دی ہے۔

## خسرو اور عہد خسرو: عبدالرؤف عروج: کراچی: اکتوبر ۱۹۷۵ء

عبدالرؤف عروج نے برسا برس امیر خسرو کے حالات اور ان کے کمالات کے بارے میں چھان بین کے بعد یہ کتاب تحریر کی ہے جو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہرباب اور اس کے ضمنی موضوعات کو نہایت سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ معلومات جن ماخذات سے حاصل کی گئی ہیں ان کے حوالے بھی موجود ہیں پہلا باب عہد خسرو سے قبل کے سیاسی حالات اور ان کے بزرگوں کے احوال پر مشتمل ہے۔ مصنف نے امیر خسرو کے والد کا نام سیف الدین یا امیر محمود تحریر کیا ہے وہ ان کا نام "لاچین" ماننے سے انکار کرتے ہیں جبکہ ممتاز حسین صاحب نے بہ اصرار تحریر کیا ہے کہ امیر خسرو کے والد کا نام لاچین تھا۔ مصنف نے لاچین کو ترکوں کا قبیلہ قرار دیا ہے جس سے ان کے بزرگ تعلق رکھتے تھے۔ اس باب میں امیر خسرو کے ہند میں آنے اور التمش کے ساتھ جنگوں میں شریک ہونے کا بھی ذکر ہے۔

دوسرا باب امیر خسرو کی ولادت اور تعلیم و تربیت کے بارے میں ہے اپنے استدلال کے ذریعہ مصنف نے ۳۰ ذی الحجہ ۶۵۱ھ کو تاریخ ولادت قرار دیا ہے وہ پٹیالی کو جائے ولادت قرار دیتے ہیں جسے ممتاز حسین نے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ **تحفتہ الصغر** کے حوالہ سے بتایا ہے کہ امیر خسرو نے آٹھ سال کی عمر میں شاعری شروع کردی تھی پہلے ان کا تخلص سلطانی تھا سلطان المشائخ سے ملاقات ان سے بیعت اور ان کے دیئے ہوئے مشوروں کو تفصیل سے لکھا ہے۔ امیر خسرو کے یتیم ہونے کے بعد عماد الملک نے جس طرح انھیں سایۂ عافیت میں لیا اس سے احساس یتیمی باقی نہیں رہا انہی کی رہنمائی میں امیر خسرو کو امور دنیاوی سمجھنے میں مدد ملی باقی ابواب میں تاریخی واقعات کے پس منظر میں امیر خسرو کے حالات قلمبند کیے ہیں آخری باب میں موسیقی کے حوالے سے بھی اہم معلومات ہیں۔



کتاب تحقیقی نوعیت کی ہے مختلف اور متضاد مواد کی موجودگی میں مصنف نے اپنی جو رائے قائم کی ہے اسے دیانتداری' خلوص' سنجیدگی اور بردباری سے بیان کردیا ہے۔ جزوی اختلافات کے باوجود مصنف امیر خسرو کے حالات زندگی کو جامع انداز میں پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے اور فن سوانح نگاری کے روایتی انداز کی پیروی کی ہے جس میں واقعات تاریخ وار بیان کیے جاتے ہیں۔

## امیر خسرو دہلوی: ممتاز حسین: کراچی: ۱۹۷۵ء

ممتاز حسین اردو ادب میں تنقید نگاری کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ تنقید کے لئے جس قدر وسیع مطالعہ اور وسیع نظر کی ضرورت ہے ان میں موجود ہے اس کے سہارے انہوں نے امیر خسرو کی سوانح عمری لکھ کر اپنے تحقیقی اور تنقیدی شعور کا لوہا منوایا ہے۔ امیر خسرو پر جو کتابیں یا مقالے لکھے گئے ان میں مضامین اور واقعات کی تکرار ملتی ہے ایک بات جو بیان ہوگئی بعد کے لکھنے والوں نے اسے مستند و معتبر جان کر اس کا اعادہ کیا ہے۔ مصنف نے ان تمام کا مطالعہ کیا اور صداقت کی تلاش میں تمام ماخذات سے استفادہ کیا وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ امیر خسرو کے بارے میں بیشتر معلومات ناقص ہیں اور جو کچھ پہلے لکھا گیا وہ صداقت پر مبنی نہیں چنانچہ انہوں نے ایک ایک بات پر مباحثہ و محاکمہ کیا استدلال اور سند سے اپنے حاصل کردہ نتائج کی پیشکش کی ہے۔ امیر خسرو کے والد کے بارے میں مختلف روایات عام رہی ہیں سوانح نگاروں نے ان کے نام سیف الدین یا سیف الدین محمود لکھے ہیں مصنف نے ان کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کا نام "لاچین" قرار دیا ہے۔ یہ ترکی لفظ ہے وہ "بندگان شمسی" یعنی زر خرید تھے۔

"خسرو کے تذکرہ نگاروں کو اس کا علم نہ تھا کہ وہ بندگان شمسی میں سے تھے اس لئے ان کا احوال معرض اخفا میں رہا اور برنائے قیاس بہت سے افسانے گھڑ لئے گئے۔" (۵۰)

"سلطان التمش نے لاچین کو اتنی درہم سلطانی میں کسی تاجر سے خریدا تھا۔" (۵۱)

عام طور پر امیر خسرو کی جائے پیدائش پٹیالی بتائی جاتی ہے مصنف نے اس کی بھی تردید کی ہے اور دہلی کو جائے پیدائش قرار دیا ہے۔ امیر خسرو کے خاندان کے افراد میں جد مادری عماد الملک اور ان کے بھائیوں کے حالات بھی تحقیق کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

امیر خسرو کی زندگی کا تاریخی خاکہ نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے ان کی تائید میں امیر خسرو کی اپنی تحریروں سے استفادہ کیا ہے۔ ہندی اور فارسی شاعری پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔

تحقیقی نوعیت کی سوانح عمری میں ممتاز حسین کی کتاب "امیر خسرو" بلاشبہ ایک ممتاز مقام رکھتی ہے اور بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے کا وسیلہ بنتی ہے۔

## مصحفی حیات و کلام: افسر صدیقی امروہوی: کراچی: ۱۹۷۵ء

مصحفی ایک باکمال شاعر ہونے کے باوجود اس لئے بدنصیب تھے کہ ان کی قدر نہ ان کے زمانے میں ہوئی اور نہ بعد میں۔ وہ شاعر جس نے غزلیات کے آٹھ دیوان کے علاوہ بے شمار قصائد اپنی یادگار چھوڑے ہیں اور جس کے شاگردوں کی تعداد سوائے داغ کے باقی تمام اساتذہ کے شاگردوں کی تعداد سے زائد ہے زندگی میں صرف تنگ دستی اور حسرت و ناکامی کے سوا کچھ نہ پایا۔ مرنے کے بعد قبر کا نشان بھی صفحۂ روزگار پر موجود نہیں۔ موجودہ صدی کے آغاز تک ان کے حالات و کمالات پر بہت کم توجہ کی گئی۔ تذکروں میں برائے نام ان کے تراجم شامل ہیں۔ ۱۳۹۰ھ میں منشی مظفر علی اسیر اور امیر مینائی نے ان کے کلام کا انتخاب مرتب کیا تھا لیکن حقیقی معنوں میں حسرت موہانی نے مورخین اور محققین کی توجہ مصحفی کی جانب مبذول کروائی تھی اس کے باوجود کوئی وقیع کام منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ افسر امروہوی نے جو وسیع مطالعہ کی بناء پر حالات، واقعات اور ان کی جزئیات پر گہری نظر رکھتے ہیں، اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مصحفی کی ایک تصنیف "مجمع الفوائد" بازیافت کی ہے جس سے ان کے اجداد کے حالات معلوم ہوئے ہیں اس سے پتا چلتا ہے کہ مصحفی کے مورث اعلیٰ شیخ نظام الدین تھے جن کا تعلق موضع اکبر پور درمیاں منجھاولی و شیخ پور تھا۔ مصحفی کے سال ولادت کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ افسر امروہوی نے ان تمام تحریروں سے بحث کی ہے جن میں تعین سال کیا گیا ہے۔ ان کے واقعاتی اور تاریخی تجزیے کے بعد نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ ۱۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے تھے جائے ولادت کے اختلاف پر بھی طویل بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں مذکورہ اکبر پور کا اب وجود باقی نہیں رہا یہ موضع کبھی وہاں تھا جہاں اب ہلبیہ گڑھ ہے یہ امروہہ کے مضافات میں ہے اس طرح قیام امروہہ، ترک قیام امروہہ، لکھنؤ کا پہلا سفر، تعلیم و تربیت، اخلاق و عادات، مذہب، مشرب، لکھنؤ میں بیالیس سال اور وفات کے بارے میں تمام معلومات کو اکٹھا کر کے ان میں درست اور غلط کی نشاندہی کی ہے۔ تحقیقی کام کے لئے جس دقیق نظر اور قوت فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے اس سے محقق بہرہ اندوز تھے اور حالات مصحفی کے مطالعہ اور بیان میں ان سے کام لے کر ایک بڑے خلا کو پُر کیا ہے۔



## امیر خسرو: شیخ سلیم احمد: دلّی: جنوری ۱۹۷۶ء

شیخ سلیم احمد نے حضرت امیر خسرو کے بارے میں کئی تحریروں کو یکجا کر دیا ہے اس میں صرف مقالات شامل نہیں ہیں بلکہ سعید احمد کی پوری کتاب بھی شامل کر لی گئی ہے جو ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ ایک مقالہ علامہ شبلی نعمانی کا ہے مرتب نے اس مقالہ کے مندرجات سے کہیں کہیں اختلاف کرتے ہوئے اپنی آراء تاریخی شواہد کے ساتھ درج کی ہیں۔ مثلاً "علامہ شبلی نے فرشتہ اور دولت شاہ کی تاریخوں کے حوالے سے سیف الدین محمود کی برِصغیر میں آمد عہد محمد تغلق میں ظاہر کی ہے مرتب نے اس پر بھی کارآمد اختلافی نوٹ لکھا ہے۔

مرتّب کا اپنے مضمون "امیر خسرو کی کہانی خود ان کی زبانی" میں غزوت الکمال کے علاوہ محمد حسین آزاد، علامہ شبلی نعمانی، سعید احمد مارہروی، محمود شیرانی، تارا چند، حسن الدین احمد کی تحریروں کے حوالے سے سوانح عمری حضرت امیر خسرو مرتب کی ہے جو سوانح نگاری کے بنیادی مقصد کو پورا کرتی ہے لیکن چونکہ علامہ شبلی کا مقالہ اور سعید احمد کی کتاب بھی اس میں شامل ہیں اس لئے مضامین کی تکرار ہے جو قاری کے لئے بارِ گراں ثابت ہوتی ہے۔

حسن الدین احمد نے سن وار سوانحی جدول مرتب کی ہے جس سے حالات زندگی، بیک نظر سامنے آجاتے ہیں اس کے کارآمد ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

فی زمانہ اس قسم کی کتابیں مرتب کرنے کا رواج عام ہو گیا ہے اس لئے کسی بنیادی مقصد کو پیش نظر رکھے بغیر معروف اہل علم کے مضامین کو یکجا کر دیا جاتا ہے اس میں محنت بھی زیادہ نہیں کرنی پڑتی اور "صاحب کتاب" ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اس نوعیت کا کام کرنے والے اگر خود بھی صاحب نظر ہوں تو مقالات میں قطع و برید کر کے اس طرح مرتب کر سکتے ہیں کہ تکرار اور اختلاف باقی نہ رہیں، مرتب نے یہ زحمت بھی گوارا نہیں کی ہے۔

## اختر شیرانی اور جدید اردو ادب: ڈاکٹر یونس حسنی: کراچی: ۱۹۷۶ء

اردو شاعری میں ایک دور اور خاص رومانی طرز اختر شیرانی کے نام سے منسوب ہے۔ ان کی شاعری کے عروج کے زمانہ میں برِصغیر کے گوشے گوشے میں ان کی نظموں کی گونج سنائی دیتی تھی نوجوان طبقہ ان کا شیدا تھا لیکن زمانہ کی ستم ظریفی کہ ترقی پسند ادب کا اس طرح زور بندھا کہ تحریک سے وابستہ شاعروں کے سوا باقی سب باکمال اور صاحب طرز شاعر پس منظر میں چلے گئے

حالانکہ ترقی پسندوں میں بھی ایسے شاعر ہیں جو ان سے متاثر رہے ہیں چنانچہ فیض نے تو اس کا اعتراف بھی کیا ہے موجودہ دور میں اس گم شدہ شاعر خوش نوا کی بازیافت کا خیال یونس حسنی کو آیا اور انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے ان کے حالات زندگی، شعری و نثری خدمات پر تحقیقی مقالہ تیار کیا جس پر وکرم یونیورسٹی (بھارت) نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے مستند معلومات جمع کرنے کے سلسلہ میں صاحب مقالہ نے محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے اس کا ایک باب حیات و تصانیف سے متعلق ہے اس میں اس چھوٹے سے علاقہ کا ادبی پس منظر بھی بیان کیا ہے جسے ٹونک کہتے ہیں اور جہاں اختر شیرانی پیدا ہوئے تھے۔ ٹونک کے والی امیر خان کے زمانہ سے ہی وہ ایک اہم ادبی مرکز رہا ہے۔ جوش کے دادا فقیر محمد خان گویا وہیں پر لشکر کے رسالدار تھے لالہ بساون لال شادان والیٔ ٹونک کے میر منشی تھے ان کے علاوہ بھی بڑے عالم اس دربار سے متعلق رہے۔ غدر کے بعد جب دلی کا ادبی دربار ویران ہوا لکھنؤ کی رونقیں اور رنگینیاں خواب ہوئیں تو حیدر آباد اور رامپور کے ساتھ ٹونک نے بھی ادبی مرکز کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ اختر کے پردادا حاجی چاند بعہد وزیر الدولہ ٹونک آکر آباد ہوئے۔ ان کے صاحبزادے محمد اسماعیل خان وہاں نائب میر منشی تھے ان کی اولاد میں حافظ محمود خان شیرانی مشہور عالم محقق اور ماہر لسانیات تھے جو اختر کے والد تھے۔ حافظ محمود شیرانی کی ولادت بھی ٹونک میں ۱۸۸۰ء میں ہوئی تھی اس گھرانے میں ہمیشہ علم و ادب کے چرچے رہے اسی ماحول میں اختر شیرانی نے آنکھ کھولی۔ ادب، شاعری، لسانیات اور تحقیق کا ذوق ورثہ میں پایا تھا۔ ڈاکٹر یونس حسنی نے تاریخی واقعات، خاندان کے حالات، علم و ادب کے ذوق و شوق کے پس منظر میں اختر کی پیدائش، ان کی تعلیم و تربیت اور افتاد طبع کا مکمل جائزہ لیا ہے ان کا کہنا ہے کہ باوجود مذہبی اور علمی ماحول میں پرورش پانے کے اختر کو عشق پرست اور عشق پسند دل ملا تھا وہ چاہنے اور چاہے جانے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ گھر کی تمام پابندیوں کے باوجود انہوں نے عشق کی بازیاں کھیلیں۔ ان کی شاعری دراصل ان کی واردات قلبی ہے۔ بے لگام شباب نے منشی اور منشی فاضل سے آگے نہیں بڑھنے دیا باوجود اس کے انہوں نے جدید طرز کی اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی انگریزی پر اچھی دسترس تھی۔ عربی خوب جانتے تھے ان کا طرز شاعری اسی زبان کی دین ہے جس طرح امراؤالقیس کے ساتھ لیلیٰ کے نعجد کا نام وابستہ ہے اختر کے ساتھ سلمٰی کا نام بھی لازمی جز بن گیا ہے۔ انہوں نے اپنی اکثر نظمیں یا تو سلمٰی کو مخاطب کر کے لکھی ہیں یا ان میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ڈاکٹر یونس حسنی کے بیان کے مطابق یہ کوئی خیالی ہستی نہیں تھی بلکہ گجرات کے متمول اور ذی علم گھرانے سے



تعلق رکھتی تھی اختر کی نظمیں جب رسالہ عالمگیر لاہور میں چھپتی تھیں سلمٰی نے تعریفی خطوط لکھ کر انہیں اپنی جانب متوجہ کیا یہ تعلق محبت کا ایسا رشتہ ثابت ہوا کہ دونوں نے خلوت و جلوت میں نشاط آگین لمحات بسر کئے۔ یونس حسنی نے حکیم نیر واسطی کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"اختر سلمٰی کے عشق و محبت کا افسانہ حسن و عشق کی ایک سرتاپا پاکیزہ اور مقدس داستان ہے اور سلمٰی کے آستانۂ جمال پر اختر کی حضوری عبارت ہے اس نماز شوق سے جو عشق، حسن کے حضور میں کمال خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرتا تھا۔" (۵۴)

جذبات کی پاکیزگی کی غماز ان کی نظمیں بھی ہیں عشق و محبت کا یہ دور سلمٰی کی شادی تک قائم رہا اور اس کے بعد وہ خاموشی سے مفارقت کا زہر پیتے رہے۔ سلمٰی کی جدائی کے غم کو بھلانے کے لئے وہ عذرا اور زلیخا اور جانے کس کس کا سہارا لیتے رہے خمار عشق میں غرق ان جیسی شخصیت بار بار پیدا نہیں ہوتی اسی عشق کے سوز و ساز نے ان کے وجود میں محبوبیت اور ان کی شاعری میں نکھار پیدا کیا۔ شاعری اور شخصیت کے اس ارتباط اور توازن کو فاضل محقق نے دلنشین انداز میں سپرد قلم کیا ہے۔ انہوں نے ظاہری حالات کا جائزہ بھی لیا ہے اور ان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ کر اس کی کیفیات، احساسات اور جذبات کی ترجمانی کی بھی کوشش کی ہے۔ اختر کے شاگردوں میں سلمٰی کے علاوہ احمد ندیم قاسمی، ن م راشد، ادا بدایونی، میرزا ادیب اور کنیز فاطمہ کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔

مقالہ میں اختر کے سوانحی واقعات، زندگی کے نشیب و فراز، عشق و حسن پرستی کی وارداتوں، بہت سی کامیابیوں اور ناکامیوں کے علاوہ ان کی شخصیت کے نمایاں اور چھپے ہوئے گوشوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اختر کی شاعرانہ خصوصیات پر جامع تبصرے کے ساتھ ان کی نثر نگاری کو بھی موضوع بحث بنایا ہے جس سے عام طور پر لوگ واقف نہیں ہیں وہ صحافی بھی تھے۔ بہارستان، خیالستان اور رومان انہیں کی ادارت میں کامیابی کی منزلیں طے کرتے ہیں ان کا تعلق نوبہار لاہور، مخزن لاہور، شاہکار لاہور سے بھی رہا ہے اور مولانا محمد علی کے پرچے ہمدرد کے لئے "نکات و معارف" کے مستقل کالم بھی لکھتے تھے۔ اختر کی ذاتی زندگی شاعرانہ اور ادبی زندگی صحافتی مصروفیات کے ہر پہلو پر مکمل روشنی ڈالی گئی ہے۔ "اختر شیرانی اور جدید اردو ادب" اختر شیرانی پر لکھی گئی پہلی ہی نہیں آخری کتاب بھی ہے اور شاید اس لئے کہ اس میں اضافہ کی گنجائش چھوڑی نہیں گئی۔

## مولوی نذیر احمد دہلوی' احوال و آثار: افتخار احمد صدیقی: لاہور: نومبر ۱۹۷۶ء

مولوی نذیر احمد دہلوی اردو نثر کے عناصر خمسہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات متنوع ہیں اگرچہ ان کے کارناموں کے بعض پہلوؤں خصوصاً "ناول نگاری کے حوالے سے تائیدی اور مخالفانہ مضامین بکثرت لکھے گئے لیکن ان کے سوانحی حالات' سیرت' ان کے دور کے کوائف اور اس پس منظر میں ان کے ذہنی رجحان کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی ادبی خدمات پر مجموعی حیثیت سے تحقیق اور تنقید کی گنجائش موجود تھی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے افتخار احمد صدیقی نے پی ایچ ڈی کے لئے "مولوی نذیر احمد دہلوی' احوال و آثار" کے موضوع کو منتخب کیا اس موضوع پر ان کے تحقیقی مقالہ کو پہلی جامع تحقیقی تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے محقق نے معاصر و معتبر ماخذات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور ان کے حوالے سے سوانح' سیرت اور ذہنی نشوونما کے تمام پہلوؤں کو فن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مرتب کیا ہے ان معلومات اور مباحث کے ضمن میں جو اختلافی امور آئے ہیں ان کا محض ذکر کر کے نہیں گزر گئے بلکہ ان کے جواز و عدم جواز سے مدلل بحث کی ہے۔

یوں تو پی ایچ ڈی کے ان مقالوں میں جو شخصیات سے متعلق ہوتے ہیں سیاسی' معاشرتی اور ادبی پس منظر کو ایک روایت کے طور پر شامل کیا جاتا ہے اور ان کا نہ تو شخصیت سے تعلق ظاہر کیا جاتا ہے اور نہ ان کے پس منظر میں ذہنی ارتقا یا رجحان کا حوالہ دیا جاتا ہے افتخار احمد صدیقی نے پس منظر ایک روایت کے طور پر بیان نہیں کیا ہے بلکہ انہی کو بنیاد بنا کر صاحب سوانح کے رجحانات اور خدشات کا جائزہ لیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کا یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اپنے زمانہ کے لحاظ سے سرسید کی طرح نذیر احمد بھی ترقی پسند تھے غلط نہیں۔ موجودہ دور کی ترقی پسندی اس دور کے تقاضوں کے مطابق ہے تو انہیں بھی نذیر احمد کا مطالعہ ان کے عہد کے تقاضوں کو مد نظر رکھ کر کرنا چاہئے۔

محقق نے مقدمہ میں فن سوانح نگاری سے طویل بحث کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسے خوب سمجھتے ہیں اور مقالہ میں انہوں نے اس کا پورا لحاظ رکھا ہے انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ صاحب سوانح کے بارے میں مواد کا فقدان ہے اور جو موجود ہے اس میں سے زیادہ تر اعتبار کے درجے سے گرا ہوا ہے اس خصوص میں انہوں نے "حیات النذیر" مصنفہ افتخار عالم مارہروی کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور ماخذات میں درج روایات ۔ بے درایت اور من گھڑت و غلط



سنین کی بھی نشاندہی کی ہے۔

افتخار احمد صدیقی نے خاندانی حالات' اجداد کے اذکار' شجرے کی ترتیب اور گھریلو ماحول پر بھی خصوصی توجہ دی ہے تعلیم و تربیت کے چار ادوار متعین کئے ہیں اور ہر دور کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ان سے مرتب ہونے والے اثرات کی نشاندہی کی ہے ان کی ملازمت کے سلسلوں کو بھی تین ادوار میں تقسیم کر کے ہر ایک کے مکمل کوائف جمع کئے ہیں ان کے اوصاف رجحانات اور نفسیاتی کیفیات کے بیان میں بھی ہر ہر پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے خوددار و خودبیں ہونے' مادی ترقی کے عزائم کا حامل ہونے اور شہرت کی تمنا رکھنے والے ہونے کا ذکر کیا ہے ساتھ ہی ان کی جسمانی صحت' مطالعہ کے شوق' درس و تدریس میں دلچسپی' حلقۂ درس میں خوش مزاجی' حلقۂ احباب میں گل افشانی کے بیان سے شخصیت کو متعارف کروایا ہے۔ نذیر احمد کے علمی و ادبی کارناموں پر تصانیف کے سلسلے کے آغاز' محرکات سے شروع کر کے تمام انواع کی کتابوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے مجموعی طور پر یہ تصنیف سوانحی تحقیق اس کی شیرازہ بندی' خدمات پر تنقیح و محاکمہ کا ایک کامیاب نمونہ ہے۔

## یادِ اقبال: صابر کلوروی: لاہور: ۱۹۷۶ء

صابر کلوروی نے علامہ اقبال کی جامع سوانح عمری مرتب کی ہے اور زندگی کے ہر دور کے حالات اور واقعات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ مصنف نے معلومات کے لئے تحقیق اور جستجو سے بھی کام لیا ہے اور سن وار ترتیب میں اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری کے ذہن میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اپنی تحقیق کے ذریعے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ کسی معاملہ کو اختلافات کے بیان کے ساتھ تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔

## نساخ: ڈاکٹر محمد صدر الحق: کراچی: ۱۹۷۷ء

اردو شاعری و ادب کا ایک مرکز بنگال میں بھی قائم تھا اس دور افتادہ سرزمین نے بھی ایسے اہل ہنر پیدا کئے جنہوں نے گیسوئے اردو کو سنوارنے میں اپنی مقدور بھر مخلصانہ کوششیں جاری رکھیں۔ اگرچہ ان کے نام تاریخ ادب اردو میں اس احترام اور اعتراف کے ساتھ نہیں آتے جن کے وہ مستحق تھے ایسے ہی باکمالوں میں عبدالغفور نساخ بھی ہیں جنہوں نے اپنی کوششوں سے السنۂ شرقی کے علاوہ انگریزی پر بھی قدرت حاصل کی اور محنت و لگن سے معاشرے و سرکاری

مثنوی میں اعلیٰ مقامات حاصل کئے ان کے دیوان' دفتر بے مثال' اشعار نساخ' ارمغان نساخ' ارمغانی کے علاوہ دیگر تصانیف چشمۂ فیض' شاہد عشرت' مرغوب دل' گنج تواریخ' کنز التواریخ' مظہر معما' ترانہ خامہ' نصرۃ المسلمین' باغ فکر اور منتخبات دواوین شعرائے ہند اور تذکرے' سخن شعراء اور ایک خودنوشت ان سے یادگار ہیں۔ ڈاکٹر محمد صدرالحق نے یہ مقالہ اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے لکھا جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں سقوط مشرقی پاکستان سے قبل پیش کیا گیا تھا اس وقت تک نساخ پر کوئی قابل ذکر تحقیقی کام ہوا تھا نہ ان کے علمی و ادبی مرتبہ سے روشناسی کی کوئی صورت نکلی تھی۔ ان کا نام تذکرۂ سخن شعراء اور ان خطوط کی وجہ سے لیا جاتا تھا جو غالب نے انہیں لکھے تھے سخن شعراء کی اہمیت کو تسلیم نہ بھی کیا جائے تو ان کی بلند حیثیت کے لئے یہ وصف کیا کم تھا کہ ان کی اور غالب کی مراسلت ہوتی رہی تھی۔ اردو ادب کے اس مایہ ناز شاعر' تذکرہ نویس اور مصنف کو گوشۂ گمنامی سے نکالنے کا فرض صدرالحق نے انجام دے کر تاریخ اردو ادب پر احسان کیا ہے اور یہ اس وقت ہوا جب نساخ کی خودنوشت سوانح عمری منظر عام پر نہیں آئی تھی اور بہت کم اہل علم اس کے نام سے واقف تھے۔ ایک طرح یہ کہنا مناسب ہوگا کہ صدرالحق نے نساخ کو بازیافت کیا ہے اور اس کے لئے انہوں نے کسی ذریعہ یا وسیلہ کو نہیں چھوڑا۔

مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ حیات اور دوسرا تصانیف کے بارے میں ہے۔ تقریباً "سوا سو صفحات میں نساخ کی سوانح عمری بیان کی گئی ہے اور اس کے لئے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ماخذات سے خصوصاً" (غیر مطبوعہ خودنوشت) سے پہلی بار استفادہ کیا ہے۔ نساخ کی نجی زندگی کے احوال سے ان کی خودنوشت بھی خالی ہے۔ صدرالحق بھی معلومات کے اس خلا کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے البتہ ان کی زندگی کے دیگر پہلوؤں' ملازمت کی مصروفیات اور عام مشاغل کے علاوہ ان کے اوصاف بالتفصیل بیان کئے ہیں ایک محیرالعقول دلچسپ پہلو ان کے خودنوشت میں بھی مذکور ہے اور صدرالحق نے بھی اعادہ کیا ہے وہ یہ کہ نساخ عدالتی فیصلے بھی علم نجوم و رمل کے ذریعہ حقیقت معلوم کر کے کیا کرتے تھے ایک ایسے شخص کی کہانی جو نشیب و فراز کا شکار رہا اور اپنی حیثیت خودبنائی دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

خودنوشت کا مخطوطہ جو ایشیاٹک سوسائٹی میں محفوظ ہے۔ ناقص ہیں ویسے بھی اس میں دسمبر ۱۸۸۵ء تک کے اندراجات ہیں۔ نساخ کا سنہ وفات ۱۸۸۹ء ہے ان آخری چار سالوں کے حالات تحقیق سے معلوم کر کے صدرالحق نے سوانح مکمل کر دی ہے۔

خاندانی حالات' نساخ کے ذاتی حالات' تلاش معاش' شادی' دہلی کا پہلا سفر' دوسرا سفر' تیسرا سفر' چوتھا سفر' نجوم و رمل سے دلچسپی' عادات و اطوار' مذہب' رشوت سے نفرت' فیاضی و کنبہ پروری' شخصیت اور اولاد کے ذیلی عنوانات کے تحت مکمل اور جامع معلومات فراہم کردی گئی ہیں جو سوانح نگاری کے زمرے میں کامیاب کوشش ہے۔



## مفتی صدرالدین آزردہ: عبدالرحمان پرواز اصلاحی: دہلی: ۱۹۷۷ء

مغلیہ سلطنت کے دور زوال نے جہاں ابتلا اور پریشان خاطری کو عام کردیا تھا وہاں اس ادبار میں بھی صاحبان علم و فضل' صوفیائے کرام' مشائخ عظام اور شعرائے باکمال کی جلوہ فرمائی دکھائی دی۔ مومن' غالب و ذوق کے معاصرین میں ہر شعبۂ حیات کے نمائندہ افراد موجود تھے انہی میں مفتی صدرالدین آزردہ بھی تھے جن کی شخصیت مجموعۂ اوصاف تھی۔ وہ عالم باعمل تھے' فقیہہ بے مثل تھے' صرف و نحو' منطق و فلسفہ' ریاضی و اقلیدس' معانی و انشا' فقہ و حدیث' تفسیر و اصول میں فرد فرید تھے۔ اس دور کے اکثر باکمال بزرگوں کو زمانہ نے فراموش کردیا ہے۔ مفتی آزردہ کے نام سے بھی واقف ہیں۔ غالب سے ربط خاص کی وجہ سے اکثر ان کا ذکر آتا ہے لیکن ان کے حالات زندگی' تبحر علمی' عادات و اطوار' اپنے زمانہ کے حوالے سے ان کی اہمیت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ عبدالرحمان پرواز اصلاحی نے کمال تحقیق و تلاش بسیار سے ان کے حالات و کوائف اپنی کتاب "مفتی صدرالدین آزردہ" میں یکجا کئے ہیں اور انہیں اس طرح ابواب میں تقسیم کیا ہے کہ زندگی کا ہر دور اور شخصیت کا ہر پہلو اجاگر ہوگیا ہے۔ پہلا باب حالات زندگی کو پیش کرتا ہے جو تاریخی ترتیب میں پیش کئے گئے ہیں دیگر ابواب تاریخی تسلسل کے بجائے موضوعات کے اعتبار سے ہیں۔ دوسرے باب میں ان کی تعلیمی خدمات کے ضمن میں حلقۂ درس' مدرسہ دارالبقا کا قیام اور مرحوم کی دہلی کالج سے وابستگی بیان ہوئے ہیں۔ تیسرا باب ان کے فضل و کمال کے ذکر پر منحصر ہے چوتھے باب میں ان کی علمی و ادبی مجلسوں کا حال ہے اسی کے تحت ان کے دیوان خانے میں ہونے والے اجتماعات' ان کا حلیہ' لباس' شعر پڑھنے کا انداز' ادبی چھیڑ چھاڑ کو پیش کیا گیا ہے۔ اگلے باب میں غالب' شیفتہ اور سرسید سے ان کے تعلقات کی نوعیت کو واضح کرتے ہوئے ان کی رواداری اور عالی ظرفی کے نمونے دکھائے گئے ہیں۔ چھٹے باب میں پہلی جنگ آزادی میں ان کے کردار کی تاریخی شہادتیں فراہم کی گئی ہیں۔ فتویٰ جہاد اور جنگ آزادی میں ناکامی کی وجہ سے جو دور ابتلا آیا اس وقت کے حالات کو مؤثر اور دل گداز انداز میں پیش کیا ہے کتاب میں زندگی کے واقعات تاریخی ترتیب میں نہ ہونے کی وجہ سے زندگی کی صرف

جھلکیاں نظر آتی ہیں لیکن جہاں تک تبحر علمی ٗ کردار و سیرت ٗ سماجی زندگی ٗ معاصرین سے تعلقات ٗ ان کی علمی و تاریخی حیثیت کا تعلق ہے پوری طرح واضح ہوگئے ہیں اور وہ ایک زندہ اور جاندار کردار کے طور پر سامنے آتے ہیں اور تعمیر شخصیت ٗ سیرت نگاری کا کماحقہ فرض ادا ہوگیا ہے۔

آخری باب میں آزردہ کی تصانیف کا تعارف اور ان کی شاعرانہ خصوصیات کو بھی بیان کردیا ہے ایک شاعر اور مصنف کی حیثیت سے بھی آزردہ کی شخصیت متعارف ہوگئی ہے۔

**مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد ٗ حیات اور ادبی خدمات: ڈاکٹر حبیب ضیا**
**حیدر آباد دکن: ۱۹۷۸ء**

مہاراجہ سرکشن پرشاد ریاست حیدر آباد میں صدر اعظم کے عہدہ پر سرفراز رہنے کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ کئی اعتبار سے اہم شخصیت تھے۔ ان کی زندگی اور شخصیت کے انھیں پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے حبیب ضیاء نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے تحقیقی کام انجام دیا ہے جہاں تک سوانحی حالات کا تعلق ہے ان کا کہنا ہے کہ

"مہاراجہ کی زندگی اور ان کی مختلف النوع خدمات پر ایک مبسوط اور مستند کتاب نواب مہدی نواز جنگ مرحوم کی نگرانی میں ایک کمیٹی کی جانب سے مرتب کرکے ۱۹۵۰ء میں شائع کی گئی چونکہ اس کتاب میں مہاراجہ کی نجی اور سرکاری زندگی کا بہت تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اس لئے میں نے اپنے مقالے میں مہاراجہ کی زندگی کے اس حصے کو بہت مختصر کردیا ہے تاہم اس حصہ میں بھی راست ذرائع سے استفادہ کرکے ایسا مواد بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو کمیٹی مذکور کی گرفت میں نہیں آسکا تھا۔" (۵۳)

مصنف نے مہاراجہ کے خاندانی حالات میں ان کے اسلاف کا بھی ذکر کیا ہے جن میں خصوصیت سے راجہ ٹوڈر مل ٗ ان کی پانچویں پشت میں رائے مولچند ٗ ان کے فرزند رائے بھی رام ٗ ان کی اولاد میں رائے نرائن داس ٗ رائے رگھوناتھ رائے ٗ موہن لال اور رائے نانک کا ذکر کرنے کے بعد نارائن داس کے بیٹے مہاراجہ چندو لعل شاداں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے انھیں کے پوتے مہاراجہ نارائن پرشاد نریندر بہادر (۱۲۴۴-۱۳۰۶ھ) تھے انھیں کی صاحبزادی جوالا بی بی کے بطن سے کشن پرشاد پیدا ہوئے تھے ان کا خاندان ذات کا کھتری ٗ تلوار کا دھنی تھا ان کی تاریخ پیدائش میں بھی اختلاف رہا ہے۔ خود مہاراجہ اس کا تعین نہ کرسکے تھے۔ "جذبات شاد" میں انھوں نے ۱۸ شعبان المعظم ۱۲۸۰ھ م ۲۸ جنوری ۱۸۶۴ء درج کی ہے جبکہ مصنف کو ان کی



خودنوشت کا جو مسودہ ملا اس میں ۱۸ شعبان ۱۲۸۱ھ لکھا ہے ان تواریخ سے بحث کرتے ہوئے مصنف نے ان کے تاریخی نام "فرزند فرخندہ" کو مستند جان کر ۱۲۸۰ھ کو درست قرار دیا ہے ان کی تعلیم روایتی مشرقی انداز میں اسی طرح ہوئی جس طرح مسلمان بچوں کی ہوتی ہے فارسی ٗ عربی ٗ انگریزی ٗ گرمکھی ٗ سنسکرت اردو زبانوں کی تعلیم کے علاوہ خطاطی ٗ تیراندازی ٗ بنوٹ بازی ٗ شہسواری کی تربیت بھی حاصل کی۔ انھیں کم عمری سے ہی شاعری سے لگاؤ تھا۔ انھوں نے بچولال تمکین ٗ عبدالعلی ولہ ٗ مظفرالدین معلی ٗ داغ دہلوی اور والئ ریاست میر محبوب علی خان آصف سے اصلاح لی تھی۔

مصنف نے مہاراجہ کی زندگی ٗ تصانیف اور ادبی مصروفیات و خدمات کے متعلق مستند مواد کی فراہمی میں ان کی مطبوعہ تصانیف ان سے متعلق شائع شدہ کتب اور مضامین کے علاوہ ان کی غیر مطبوعہ تحریروں ٗ مکتوبات اور زبانی روایات سے استفادہ کیا ہے اور اپنی تحریر کو سند کا درجہ عطا کیا ہے۔

مہاراجہ مذہب کے معاملہ میں وسیع المشرب تھے۔ ہندو کھتری ہونے کے باوجود تمام مذاہب کے بنیادی عقائد کو درست مانتے تھے چنانچہ وہ وحدانیت کے بھی قائل تھے۔ مصنف نے ان کے وصیت نامہ سے حوالہ دیا ہے کہ

"اپنی وصیت کو خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جو ایک ہے اور ایک ہی ہے جس کا کوئی شریک نہیں میرا اعتقاد ہے کہ کوئی خدا سوائے ایک خدا کے سزاوار حمد نہیں۔" (۵۴)

وہ ذہنی طور پر اسلام اور اسلامی تصوف سے قریب تر تھے اس کے ثبوت میں ان کے وہ خطوط پیش کئے جاسکتے ہیں جو انھوں نے علامہ اقبال کو لکھے تھے۔ اسی مناسبت سے انھوں نے اپنے فرزندوں کے نام رکھے جن کا حوالہ مصنف نے صفحہ ۲۸ پر دیا ہے (بیٹے آصف پرشاد ٗ عثمان پرشاد ٗ خواجہ پرشاد) مہاراجہ کی سرکاری خدمات ٗ ان کے مشاغل ٗ سیرت کا احوال نسبتاً اختصار سے لکھا گیا ہے۔ جس کے مقابلہ میں ان کی ادبی تصانیف و خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ مصنف کی تحقیق کے مطابق جن ارباب علم فضل اور شعراء و ادباء سے ان کے روابط رہے ان میں امیر مینائی ٗ رتن ناتھ سرشار ٗ نواب مرزا داغ دہلوی ٗ سید علی بلگرامی ٗ الطاف حسین حالی ٗ علامہ شبلی نعمانی ٗ اکبر الہ آبادی ٗ مولانا عبدالحلیم شرر ٗ نظم طباطبائی ٗ ریاض خیر آبادی ٗ نصیرالدین خیال ٗ علامہ اقبال ٗ فانی بدایونی ٗ ونا تریہ کیفی ٗ مولانا ظفر علی خان ٗ بابائے اردو عبدالحق ٗ ترہنگ راج ٗ ہوش بلگرامی ٗ تاجور نجیب آبادی ٗ آغا شاعر قزلباش ٗ اختر مینائی ٗ ترک علی شاہ ترکی ٗ عبدالجبار

خان آصفی ملکاپوری، مولانا عبدالماجد دریابادی، ماہر القادری، نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی شامل تھے جن میں سے اکثر پر وہ فیاضانہ کرم بھی کیا کرتے تھے۔

ان کے ذوق شعری کو پیش کرنے کے لئے ان کی منظوم تصانیف کا تفصیلی تعارف بھی موجود ہے ان میں رین بسیرا، مجموعۂ مناجات (اردو فارسی) نظم دو پیسہ، نعرۂ مستانہ، درس محبت، جذبۂ قومی خم کدہ رحمت (مجموعۂ نعت) باغ شاد (مجموعۂ غزلیات) نغمۂ شاد (ہندی کلام) بیاض شاد (فارسی کلام) قصائد، مثنویوں اور نثری تصانیف پر جامع تبصرہ کیا گیا ہے۔

یہ مہاراجہ کے سوانح، سیرت، ادبی خدمات کے حوالے سے ایک وقیع کوشش ہے۔

**زندہ رود: جلد اول، دوئم سوم: جاوید اقبال: لاہور (جلد اول ۱۹۷۹، ۸۲، ۸۵ جلد دوم لاہور ۱۹۸۱ء، ۸۳ جلد سوم: لاہور: ۱۹۸۴ء**

حیات اقبال کے ہر پہلو اور ہر گوشے پر انہماک، تن دہی اور جانفشانی سے تحقیق کی گئی ہے اس کے باوجود متعدد نکات ایسے ہیں جن پر محقق اتفاق رائے نہیں کر سکے۔ محقق نے جتنی وسعت اختیار کی رائے میں اختلاف بڑھتا گیا ضرورت تھی ان آراء کو یکجا کر کے ان کا تجزیہ کیا جائے اور شواہد و دلائل کی روشنی میں حقیقت کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام علامہ کے صاحبزادے جاوید اقبال نے انجام دیا ان کی سوانحی تالیف "زندہ رود" میں حیات اقبال کو تین حصوں میں تقسیم کر کے تمام پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے پہلے حصے میں تشکیلی دور پیدائش سے ۱۹۰۹ء تک کی ایام حیات کی صداقتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اس میں جاوید اقبال کی اپنی کوئی تحقیقی کاوش ایسی نہیں جسے اضافہ کہا جائے نہ انہوں نے اس کا دعوٰی کیا ہے ان کے سامنے اس دور کے بارے میں ایسے تمام ماخذ تھے جن کو کسی نہ کسی اعتبار سے درجۂ استناد حاصل تھا انہوں نے ان ماخذات کو یکجا کر کے ان کا محاسبہ اور تجزیہ کیا۔ کمزور روایات کو مدلل طریقہ سے مسترد کیا اور وہ تمام واقعات جن کے لئے مضبوط شہادتیں موجود ہیں قبولیت کا درجہ دیا ہے۔

حیات اقبال کے ضمن میں جو موضوعات متنازع تھے ان پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور ہر نوع کے بیانات و قیاسات کو یکجا کر دیا ہے۔

پہلے دو ابواب اجداد کے سلسلہ سے متعلق ہیں اس بنیادی نکتہ کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ ان کے اجداد کشمیری تھے اور ان کی گوت سپرو تھی اس امر پر تحقیق کی گئی کہ سپرو کی اصل کیا ہے ان کے اجداد نے کب اور کن حالات میں اسلام قبول کیا ان کی اسلامی اور سماجی خدمات کے علاوہ



ان کی نجی زندگی کس نوعیت کی تھی اگرچہ ان معلومات کا علامہ کی شخصیت، ان کے فکر و فن سے براہ راست کوئی تعلق نہیں لیکن مشرق میں حسب و نسب کو جو اہمیت دی جاتی ہے اس کی بنا پر اور اہل علم کے ذوق جستجو کی تسکین کے لئے ان موضوعات پر بھی متعدد کتب لکھی گئیں اور مقالے سپرد قلم کئے گئے جاوید اقبال نے ان سب کا جائزہ لیا ہے اور ان کی ایسی گمشدہ کڑیاں ملائی ہیں جن کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی یہی مسئلہ مؤلف کو پیش آیا اس لئے انہیں لکھنا پڑا کہ

"ایسی توجیہات پر تبصرہ کرنا بیکار ہے انسان کا ذہن اگر زرخیز ہو تو شواہد کی عدم موجودگی میں بھی کسی نہ کسی مصلحت کے تحت جو چاہے اختراع کر کے احاطۂ تحریر میں لا سکتا ہے۔" (۵۵)

"اس تفصیل سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ شیخ اکبر کے مرشد کا نام کیا تھا یا وہ صوفیہ کے کس سلسلہ یا طریقے سے وابستگی رکھتے تھے۔" (۵۶)

"سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے بزرگوں نے کشمیر سے ہجرت کیوں کی؟ اس کا کوئی واضح جواب ہمارے پاس نہیں۔" (۵۷)

بیشتر معاملات پر سے اشتباہ کے پردے نہیں اٹھ سکے لیکن ایک ہی امر کے بارے میں مختلف تحقیق اور قیاس کو یکجا کر کے پیش کر دینا اس لئے بھی ضروری تھا کہ آئندہ کام آگے بڑھانے کے لئے تمام زاویے پیش نظر رہیں۔

۲۷ صفحات کے ان دو ابواب میں سکھوں کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے جو تقریباً ۶ صفحات پر مشتمل ہے نہ تو اس کا براہ راست تعلق علامہ کے اجداد سے ہے اور نہ اس تاریخ کو ان کے حالات سے ربط دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

تیسرا باب نہایت اہم ہے جو علامہ کی تاریخ ولادت کے تعین کے بارے میں ہے مؤلف نے ۷۵ سے زائد کتب اور رسائل کا حوالہ دیا ہے جن میں علامہ کی تاریخ ولادت ایک دوسرے سے مختلف بتائی گئی ہے ان میں ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء، ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء / ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۳ھ، ۹ فروری ۱۸۷۳ء، ۲۰ جولائی ۱۸۷۴ء کے بارے میں متعدد شہادت پیش کر کے انہیں درست تسلیم کروانے کی کوشش کی گئی۔ مؤلف نے ان سب کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور ہر تاریخ کی حمایت میں جو شواہد پیش کئے گئے ان کو استدلال سے مسترد کیا ہے۔ ان کا انکشاف یہ بھی ہے کہ علامہ کی پیدائش کا اندراج میونسپل کمیٹی کے رجسٹر میں کروایا ہی نہیں گیا جو اندراج ان سے متعلق سمجھا جاتا ہے اس کے اطلاع کنندہ علی محمد اور غلام محی الدین کا اس خاندان سے کوئی تعلق تھا اور نہ اس نام

کے کسی فرد کا ان کے بزرگوں سے ربط ضبط ہونا ثابت ہے۔ بیں صفحات پر تجزیہ مکمل کرنے کے بعد مؤلف اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

"ان شواہد کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی تاریخ ولادت ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ ہے جو ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کے برابر ہوتی ہے۔" (۵۷)

باب ۴ میں علامہ کے بچپن اور لڑکپن کو زیر بحث لایا گیا ہے اس میں اختلافی نکات نہیں ہیں اس لئے مباحث اور رد و قدح کی گنجائش پیدا نہ ہو سکی البتہ حالات، کوائف اور واقعات کو قابل قبول اسناد کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ کوئی گوشہ پردۂ اخفاء میں نہیں رہا اس باب میں بھی شمس العلماء سید میر حسن کے حوالہ سے ان کا تعلق سرسید اور ان کی تحریک سے ظاہر کیا گیا ہے سرسید کے بارے میں صفحات ۵۳ تا ۶۰ پر جو تفصیل درج ہے ان کا بھی براہ راست موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

باب پنجم علامہ کے اس طالب علمی کے دور سے متعلق ہے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں گزرا اس میں بھی مستند معتبر ذرائع اور شواہد سے ممکنہ تفصیل یکجا کر دی گئی ہے اس باب میں آغاز شاعری پر بھی روشنی ڈالی ہے ابتدا میں جو غزلیں گلدستوں اور رسائل میں شائع ہوئیں اور جن مشاعروں میں سنائی گئیں ان کا تاریخی ریکارڈ یکجا کر دیا گیا ہے داغ سے شرف قلمبندی کی تائید کی ہے اور ارشد گورگانی سے اصلاح سخن کی تردید کی ہے۔

باب ۶ میں علامہ کے اس دور کے بارے میں مکمل کوائف جمع کئے گئے ہیں جو ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو اورینٹل کالج لاہور میں ۷۲ روپیہ چودہ آنے ماہوار تنخواہ پر میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے تقرر سے لے کر ستمبر ۱۹۰۵ء میں لندن جانے کے بعد کے وقت تک کا احاطہ کرتے ہیں اس میں ان کی علمی قابلیت کے جلا پانے کے اسباب، ذوق تحقیق پر مائل ہونے کی کیفیت، علم الاقتصاد کی تصنیف اور انجمن حمایت اسلام سے وابستگی کی مکمل روداد موجود ہے طالب علم سے استاد اور استاد سے محقق اور ہمدرد قوم بننے کے جن مدارج سے علامہ گزرے ان کی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

باب ۷ علامہ اقبال کے یورپ کے قیام سے متعلق ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج میں تعلیمی سرگرمیوں، لندن میں عام مشاغل، تصوف سے دلچسپی اور اس پر تحقیق کرنے کے ولولہ، جرمنی کا قیام، غرض ایم اے، بیرسٹری اور پی ایچ ڈی کے تمام مراحل کے طے کرنے کی روداد تاریخ وار پیش کرنے کے علاوہ ان حلقوں، احباب اور اہل علم کا ذکر بھی ہے جن کی صحبتوں میں



انھوں نے وقت گزارا، استفادہ کیا اور اپنی اور دوسروں کی دلبستگی کے سامان کئے۔ سات ابواب پر مشتمل جلد اول میں "حیات اقبال کے تشکیلی دور" کی گویا تشکیل تو اس طرح کی گئی ہے کہ اس سوانح کے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور حیات پر بیسیوں کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

زندہ رود جلد دوم ابواب ۸ تا ۱۴ پر مشتمل ہے ابواب کی ترتیب اور نشان سلسلہ غماز ہیں کہ جلد اول کے تسلسل میں ہے اس میں علامہ اقبال کی زندگی کے وسطی دور پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کا آغاز یورپ سے واپسی کے بعد آغاز ستمبر ۱۹۰۸ء سے علامہ اقبال کی عملی زندگی میں داخل ہونے سے ہوا۔ یہی دوران کے افکار کے بتدریج ارتقا کا تھا جو ۱۹۲۵ء پر اختتام پذیر ہوا اس ضمن میں مؤلف نے ان کی معاشی جدوجہد، ازدواجی زندگی، ذہنی ارتقا، تخلیقی کاوشوں، قلمی معرکوں کا ہر زاویئے سے بھرپور جائزہ لیا ہے جہاں تک معلومات اور مواد کا تعلق ہے۔ یہ ایک نہایت غیر جانبدارانہ کامیاب کوشش ہے۔ ماخذات کی طویل فہرستوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جاوید اقبال نے حقائق کی چھان بین میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے اور بہت سے ایسے ماخذات تک رسائی حاصل کی ہے جو دیگر مؤلفین کی نظر سے پوشیدہ تھے علامہ کی نجی زندگی اکثر موضوع بحث رہی ہے اور اس کے بعض گوشوں میں اعتراضات ہی نہیں کئے گئے بلکہ الزام تراشی سے بھی کام لیا گیا۔ جاوید اقبال نے ان پہلوؤں سے بھی چشم پوشی نہیں کی اور اعتراف کیا ہے کہ علامہ کو عرصہ تک موسیقی سے خاص شغف رہا اور وہ اکثر محفلوں میں شرکت کیا کرتے تھے لیکن ان کی مے نوشی اور طوائف کے قتل کے واقعہ کو محض داستان قرار دیا ہے اور ان معتبر لوگوں کی آراء پیش کی ہیں جو اس دور حیات میں علامہ اقبال کے شب و روز کے ساتھی تھے اس سے شبہات کی گرد آلود فضا صاف نہیں ہوئی تو بہرحال اس کی شدت میں کمی واقع ہوئی ہے اس حقیقت سے کم لوگ واقف ہیں کہ گزر بسر کرنے اور تین بیویوں کا بار برداشت کرنے کے لئے علامہ کو کس قدر کاوش کرنی پڑتی تھی موصوف نے مرحلہ وار کسب معاش کی کوششوں کا حال تفصیل سے پیش کیا ہے یہاں تک کہ ان کی زندگی بھر کی آمدنی کا گوشوارہ بھی تیار کر دیا ہے۔ ابتدائی باب میں ذکر کیا گیا ہے کہ علامہ اوائل ۱۹۰۸ء میں حیدر آباد دکن گئے تھے ان کے خطوط بنام عطیہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس دورہ کی نوعیت نہ تو ریاست سے وابستگی کی خواہش تھی اور نہ نظام کی سرپرستی حاصل کرنے کی آرزو اس کے باوجود صفحہ ۱۴۳ پر شبہ ظاہر کیا ہے کہ غالب امکان ہے کہ اگر انہیں دربار دکن میں باریابی حاصل ہو جاتی تو وہ نظام کو

تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں اپنے مستقبل کے عزائم کی اہمیت سے روشناس کرانا چاہتے تھے اور اگر ان عزائم کی اہمیت سمجھتے ہوتے تو نظام انہیں کسی مناسب منصب کی پیش کش کرتے اور وہ غالباً" اسے قبول کرلیتے مؤلف کا قیاس حق بجانب ہے اور اقبال کے خطوط میں اظہار خیال محض خواہشات کی پردہ پوشی ہے۔ ملت اسلامیہ کی خدمت کا حاصل وضاحت سے بیان کرتے ہوئے ان کے اس کارنامے پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح گاندھی اور مولانا محمد علی کی اس یلغار کو انہوں نے ناکام بنایا کہ اسلامیہ گورنمنٹ سے امداد لیتا ہے اس لئے امداد سے دستکش ہوجائے وقتی طور پر کچھ رقم متبادل انتظام کے طور پر بھی پیش کی گئی لیکن علامہ نے اسلامیہ کالج پر ویسی ضرب نہ پڑنے دی جیسی ضرب ایم اے او کالج پر لگانے پر کامیابی ہوئی تھی۔ علامہ غیر مسلم سیاستدانوں کی چالوں کو بخوبی سمجھتے تھے اگرچہ ۱۹۲۶ء تک وہ عملی سیاست میں داخل نہیں ہوئے لیکن جب بھی ممکن ہوا وہ مسلمانوں کو اغیار کے حربوں سے بچاتے رہے وہ خلافت کی تحریک کے حامی بھی نہیں تھے اور تحریک جس انداز میں جن ہاتھوں میں تھی اس کی تائید بھی نہیں کرتے تھے یہ انکشافات تاریخ کے طالب علموں کے لئے مطالعہ اور تجزیے کے نئے زاویئے فراہم کرتے ہیں ان حقائق کے برخلاف علامہ کا تحریک ہجرت کی تعریف کرنا (۵۹) تعجب انگیز ہے جب کہ مؤلف خود اس کا نتیجہ مسلمانوں کی وسیع پیمانے پر تباہی قرار دیتے ہیں (۶۰) ان شواہد سے حقائق اپنے اصلی روپ میں سامنے آگئے ہیں۔ مؤلف نے ہر عیب و حسن کو اس کے حقیقی پس منظر میں پیش کرکے غیر جانبداری کا ثبوت دیا ہے اور کسی لفظ یا بیان سے حسن عقیدت کی شان پیدا نہیں ہونے دی۔

زندہ رود جلد سوم میں ابواب ۱۵ و ۱۶ شامل ہیں ان تمام کا تعلق علامہ کے عملی سیاست کے ادوار سے ہے۔ ۱۹۲۶ء میں علامہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت کے لئے انتخابات میں حصہ لے کر سیاست میں داخل ہوئے ان کی سیاسی فکر، کونسل میں مسلمانوں کے مفادات کے لئے عملی جدوجہد اور جس گروپ "یونینسٹ" سے ان کا تعلق تھا اس کی مخالفت کے باوجود امرحق کا اعلان کرنے اور اس پر اصرار کرنے کے واقعات بیان کرکے مؤلف نے ان کے کردار میں استقلال اور ثابت قدمی کی جو شان دکھائی ہے وہ لائق تحسین اور قابل تقلید ہے علامہ کی عملی سیاست کے ہر واقعہ کا مرحلہ وار تفصیلی ذکر موجود ہے جس سے ان کی تاریخ ساز شخصیت کے بعض اہم پہلو اجاگر ہوگئے ہیں۔ مؤلف نے اس ضمن میں علامہ کے ساتوں مقالات و خطبات کا جائزہ بھی لیا ہے اور ہر خطبے کے مضمرات کی وضاحت کی ہے۔ مسلم لیگ اجلاس الہ آباد میں



علامہ نے جو تاریخی خطبہ صدارت پیش کیا تھا اس کی حمایت اور مخالفت میں ملک گیر پیمانے پر جو بیانات، اداریے شائع ہوئے ان سب کو یکجا کردیا ہے اس طرح مؤلف اس تاثر کو ابھارنے میں کامیاب ہوا کہ مسلم رہنما اور پریس اس خطبے کے حامی اور ہندو رہنما اور پریس اس کے مخالف تھے۔ علامہ کی سیاسی فکر، ملک کی حالت اور بین الاقوامی کوائف کے تناظر میں اس طرح پیش کی گئی ہے کہ کوئی نکتہ وضاحت طلب باقی نہیں رہا۔

زندہ رود کی تینوں جلدوں میں یہ خصوصیات موجود ہے کہ پڑھنے والے کو احساس نہیں ہوتا کہ اک سعادت مند فرزند اپنے والد کے کارناموں کو اجاگر کرنے کی دانستہ کوشش کررہا ہے مؤلف نے اپنے ذکر سے ممکنہ گریز کیا ہے اور تاریخ و سوانح کے ایک طالب علم کی حیثیت سے واقعات، حالات اور افکار کو اسی طرح پیش کیا ہے جس طرح انہیں حاصل ہوسکے۔ شخصیت نگاری کے ضمن میں ایک عیب جو کثرت سے نظر آتا ہے لکھنے والا جا اور بے جا اپنے نام و تعلق کا حوالہ دے کر قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ تالیف اس عیب سے یکسر خالی ہے۔ مؤلف نے حقائق کو کسی ذہنی تحفظ یا جانبداری سے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اور ہر حقیقت کے لئے مستند و معتبر ماخذ سے استفادہ بھی کیا ہے اور اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ جاوید اقبال کا نام بحیثیت انشا پرداز اس طرح ابھرا ہے کہ متانت، شائستگی، بردباری اور سنجیدگی کی تمام تر اوصاف کے ساتھ وہ اپنے قلم کو قابو میں رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں جہاں علامہ کی شخصیت کی خوبیوں کا ذکر ہے۔ انہیں متوازن اور محتاط طور سے بیان کیا ہے جہاں علامہ پر لگائے گئے الزامات کا حوالہ ہے وہاں بھی ان کا قلم قابو سے باہر نہیں ہوا ہے۔ اقبالیات کے ضمن میں اس سے بہتر غیر جانبدارانہ شان میں کوئی تالیف نہیں ہوئی۔

## علامہ حیرت بدایونی، حیات اور ادبی خدمات : رشید الدین
## حیدر آباد دکن : ۱۹۷۹ء

علامہ سید حسرت حیرت نے اپنے وطن بدایوں کو خیرباد کہا اور اپنے انتقال تک (۱۹۷۵ء تک) حیدر آباد دکن میں مقیم رہے ان کی ذات بجائے خود شہر حیدر آباد کی ایک انجمن اور تہذیبی مرکز تھی شہر کے ادیب و شاعران کے ہاں اکثر آیا کرتے تھے بیرون ریاست سے آنے والے شاعر اور نثر نگار بھی ان کے ہاں ضرور حاضری دیتے حیدر آباد کی ادبی اور تہذیبی شخصیت کے بارے میں رشید الدین نے ان کے انتقال کے ایک سال کے بعد ہی ایم اے کے لئے مقالہ "علامہ حیرت

بدایونی حیات اور ادبی خدمات" کے زیر عنوان تحریر کیا تھا جو ۱۹۷۹ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ حالات زندگی کی فراہمی میں انہیں خاصی سہولت حاصل رہی کیونکہ صاحب سوانح کی تمام اولادیں تعلیم یافتہ اور علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والی ہیں ان میں مقالہ نگار نے خصوصیت سے ان کے صاحبزادے احمد جلیس اور صاحبزادی جیلانی بانو کے تعاون کا ذکر کیا ہے علامہ کی غیر مکمل خودنوشت سے بھی ضروری معلومات حاصل کی جاسکیں ان ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں علامہ کے سلسلۂ نسب' ان کے خاندان' پیدائش' بچپن' تعلیم' شادی' ملازمت' حیدر آباد منتقلی' مہاراجہ کشن پرشاد کی مصاحبت' سرکاری نوکری' ادبی مصروفیات اور ان کے کردار پر خصوصیت سے روشنی ڈالی گئی ہے مقالہ جس مقصد کے تحت لکھا گیا اسی کی مناسبت سے اختصار سے کام لیا گیا ہے حشو و زوائد سے اجتناب کرتے ہوئے مقصدیت کے نکتہ نظر کے تحت طوالت سے گریز کیا گیا ہے اور سلیقے سے تعارف کا حق ادا کیا ہے نہ تو شخصیت کے تعلق سے اور نہ ادبی خدمات کے حوالے سے غیر مدلل مداحی سے کام لیا اور انصاف پسندی اور سلامت روی کو ملحوظ رکھا ہے۔

### ذکر سالک : میر سراج الدین علی خان : حیدر آباد دکن : ۱۹۷۹ء

اسد اللہ خان غالب پر جتنا تحقیقی کام ہوا ہے برخلاف اس کے ان کے شاگردوں کو نظرانداز کردیا گیا ہے اور سوائے مولانا حالی کے کسی کو موجب التفات نہیں سمجھا گیا مالک رام نے تلامذۂ غالب میں ان کے حالات زندگی محفوظ کئے ہیں لیکن اکثر تلامذۂ غالب اس لائق ہیں کہ ان پر وقیع تحقیقی کام انجام دیا جائے فصاحت جنگ جلیل کے شاگرد میر سراج الدین علی خان نے سالک کے حالات زندگی اور ان کے کلام پر مشتمل جو کتاب مرتب کی ہے وہ اس ضمن میں ایک اہم کوشش ہے انہوں نے خطوط غالب کے علاوہ متعدد تواریخ اور مضامین سے استفادہ کیا ہے ان کی تحقیق کے مطابق غالب کے والد عبداللہ بیگ خان اور سالک کے والد عالم بیگ خان اس زمانے میں حیدر آباد آئے جب میر نظام علی خان سریر آرائے سلطنت تھے۔ سالک کی پیدائش بھی وہیں ہوئی لیکن وہ تاریخ پیدائش کا تعین نہیں کرسکے اور اسے ۱۸۱۹ء اور ۱۸۲۳ء کے درمیان قرار دیتے ہیں پندرہ سال کی عمر میں شعرگوئی کا آغاز کیا نام کی رعایت سے تخلص بھی قربان رکھا اور مومن کی شاگردی اختیار کی جو ۱۸۴۰ء تک جاری رہی بعد میں غالب کے شاگرد ہوئے اور



سالک تخلص قرار پایا سالک کو غالب سے بے حد قربت حاصل رہی غالب بھی انہیں بے حد چاہتے تھے اسی تعلق خاطر نے سالک کے جوہر کو چمکایا اور اس مرتبہ کے شاعر ہوئے کہ غالب جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اپنے ایک خط میں ان کا شعر نقل کرتے ہیں۔

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک<br>
تندرستی ہزار نعمت ہے

غالب کے انتقال کے بعد سالک حیدر آباد چلے گئے عمادالملک نے ان کی قدر کی اور محکمہ تعلیمات میں سررشتہ دار مقرر کروایا سالک کے جس قدر حالات زندگی فراہم ہوسکے یکجا کردیئے گئے اس میں تحقیق مزید کی گنجائش باقی ہے کلام پر تبصرہ کتاب کی افادیت میں اضافے کا باعث ہے۔

### مرزا علی لطف' حیات اور کارنامے : مرزا اکبر بیگ : حیدر آباد دکن : ۱۹۷۹ء

جامعات کے شعبۂ اردو میں مشاہیر ادب پر تحقیق کی جو خوشگوار روایت قائم ہوئی ہے اس کی ایک خوشگوار کڑی مرزا اکبر بیگ کا مقالہ "مرزا علی لطف' حیات اور کارنامے" ہے جو جامعہ عثمانیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے لکھا گیا لطف ایک تذکرہ نگار تھے انہیں اس شعبۂ تاریخ میں امتیاز حاصل ہے ان سے قبل اردو شاعروں کے جو تذکرے لکھے گئے وہ سب فارسی میں ہیں لطف نے اردو میں اپنا تذکرہ "گلشن ہند" لکھ کر ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی ہے یوں تو "گلشن ہند" فارسی میں لکھے گئے تذکرے "گلزار ابراہیم" کا ترجمہ ہے لیکن اس میں اتنے اضافے ہیں کہ جداگانہ تصنیف کی شان پیدا ہوگئی ہے۔

شاعروں اور ادیبوں کی نسبت تذکرہ نگاروں کے سوانح حالات مرتب کرنے پر کم توجہ دی گئی ہے مقالہ نگار نے تحقیق کے نظرانداز کردہ شعبہ میں کام کرکے اپنی دقت نظری کا ثبوت دیا ہے اس بارے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی رائے ہے کہ

"اگر ہمارے محققین نسبتاً" کم معروف ادبی شخصیات پر اس طرح توجہ صرف کریں تو ادبی تاریخ کی بہت سی گم شدہ کڑیاں ملائی جاسکتی ہیں۔" (۲۱)

مقالہ نگار نے حیات لطف کے بارے میں چند اہم معلومات فراہم کرنے کے سلسلہ میں تحقیق اور تدوین سے کام لیا ہے دیگر تذکروں کے علاوہ تصانیف لطف کی داخلی شہادت سے بھی استفادہ کیا ہے اس طرح لطف کے نام' وطن' تلمذ سے لے کر تاریخ وفات تک کے بہت سے متنازع فیہ

امور کی یکسوئی کردی ہے مقالہ نگاری کی اس کاوش کے بارے میں گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ

"مقالے کے آغاز میں لطف کی سوانحی کڑیاں ملائی گئی ہیں اور ان کی شخصیت کو مربوط طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے ہر جگہ تلاش و جستجو سے کام لیا ہے اور اپنی معلومات کو سلیقہ سے پیش کیا ہے۔" (۴۳)

مقالہ نگار کا رجحان تحقیق کے ذریعہ حقائق کا انکشاف ہے تاکہ تاریخ ادب کا ایک اہم باب مکمل ہو سکے۔

## مولانا رومی : بشیر محمود اختر : لاہور : ۱۹۷۹ء

مولانا رومی اپنے فلسفۂ حیات اور تصوف کے اعتبار سے لائق مطالعہ ہیں ان کے افکار اور شاعری کا پرتو اردو شاعروں کے کلام میں عموماً" اور اقبال کے کلام پر خصوصاً" ملتا ہے بشیر محمود اختر نے اپنی کتاب "مولانا رومی" میں ان کے مختصر سوانح حالات اور افکار و شاعری کو موضوع بنایا ہے اسے خالص سوانح کے نقطۂ نظر سے نہیں لکھا گیا ہے بلکہ ابتدائی چند ابواب ہی زندگی کے واقعات کے متعلق ہیں پہلے باب میں "رومی عہد اور تاریخی پس منظر" کو واضح کیا ہے دوسرا اور تیسرا باب البتہ سوانحی حالات و کوائف کا اجمالی خاکہ ہے جس میں رومی کے دور' ان کے آباؤ اجداد' تعلیم' ذہنی تربیت کو بیان کرتے ہوئے کلاسیکی اسلامی فلسفہ کا تاریخی و تنقیدی مطالعہ شامل ہے اس باب کے ذریعہ رومی کی شخصیت کی تعمیر میں کسی حد تک مدد ملتی ہے تیسرے باب میں شمس تبریز سے ملاقات' ان کے ساتھ خط و کتابت' ان کے افکار سے استفادہ کا حال ہے بظاہر مصنف کا یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ رومی کی شخصیت اور فکر پر شمس تبریز کے خیالات سے استفادہ کا جائزہ لیا جائے۔ باوجود اس کوشش کے رومی کی انفرادی سوچ متاثر نہیں ہوتی باقی تین ابواب بالتفصیل رومی کی شاعری کے آغاز اور ان کے انداز تغزل کے علاوہ مثنوی کے مقام کے تعین اور ان کے فلسفیانہ خیالات کے تجزیے اور تفہیم کے لئے وقف رکھے گئے ہیں جس تفصیل سے رومی کے خیالات' حیات و کائنات کی ماہیت' علم و عقل کی ماہیت' مسئلہ جبر و قدر' عشق کی ماہیت اور حقیقت کی ماہیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اس سے صاحب سوانح کی بلندی فکر' نکات فلسفہ کی رموز شناسی اور مشکل مسائل پر غور و فکر اور اخذ نتائج کی صلاحیت واضح ہوتی ہے اور ان کی فکری خصوصیات سامنے آتی ہیں بلاشبہ ان امور کا شخصیت شناسی کے لئے جاننا



ضروری ہے آخری باب شاعری میں فکری عناصر کی تلاش کے بارے میں ہے۔ سوانح نگاری میں صاحب سوانح کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے فکری' فلسفیانہ اور شاعرانہ خصوصیات کو شامل کرلینا ضروری ہے لیکن ان میں ترتیب کے ساتھ توازن بھی ہونا چاہئے جو اس کتاب میں نہیں ہے اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ابتدائی ابواب "فکر رومی" کو اجاگر کرنے کے لئے بطور تمہید لکھے گئے ہیں اور غالباً" یہی مصنف کا بنیادی مقصد بھی ہے اس کتاب کے ذریعے ہم "رومی" ایک شخص سے واقف نہیں ہوتے بلکہ رومی "ایک مفکر اور شاعر" سے ضرور روشناس ہو جاتے ہیں۔

## ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور اسلامی بم : زاہد ملک : لاہور : ۱۹۷۹ء

پاکستان کے متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے سائنس دان جنہوں نے ایٹمی ٹیکنالوجی میں عالمی شہرت حاصل کی ہے اس کتاب میں اس طرح متعارف کروائے گئے ہیں کہ ان کے گھریلو' نجی زندگی' روزمرہ مصروفیات کے ساتھ پیدائش سے لے کر کہوٹہ کے مرکز کی تکمیل تک کے تمام حالات جزئیات کے ساتھ موجود ہیں۔ ڈاکٹر قدیر بھوپال میں پیدا ہوئے تقسیم ملک کے وقت کم عمر تھے۔ جان کی امان کی خاطر ان کے خاندان کے بیشتر افراد انتہائی کسمپرسی میں ہجرت کرکے مونا باؤ کے راستے ریگستان کی خاک چھانتے پاکستان آئے تھے۔ ان کی زندگی کی روئیداد سبق آموز ہے۔ بے سروسامانی کے عالم میں عام مدارس میں تعلیم حاصل کرکے بی ایس سی کرنے کے بعد بھی ان کی مسلسل کدو کاوش اور سعی و جہد قائم رہی یہاں تک کہ انہوں نے بیلجیئم کی لیوون یونیورسٹی سے طبعی فلزیات کے موضوع پر اعلیٰ درجے کی تحقیق کرکے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ سائنس کے اس جدید شعبہ میں ماہرین برائے نام تھے۔ ان کی مانگ کا یہ عالم تھا بیک وقت کئی یورپی جامعات اور سائنسی تحقیقی ادارے ان کی خدمات حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے ہالینڈ کے ادارے ایف ڈی او میں ملازمت بھی حاصل کرلی تھی لیکن ان کی خواہشات کا مرکز ان کا وطن رہا۔ ایسے محب وطن کم ہوں گے جو اعلیٰ عہدوں اور بڑے معاوضوں کو چھوڑ کر ملک کی ہر قیمت پر خدمت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ انہوں نے پاکستان اسٹیل مل اور دیگر اداروں میں معمولی نوعیت کی خدمات کی درخواستیں دیں جو قابل اعتناد نہیں سمجھی گئیں۔ مصنف جو خود بھی قومی درد رکھتا ہے ڈاکٹر قدیر کی عظمتوں کے ذکر کے ساتھ ان زیادتیوں کا ذکر کرتا ہے تو ایسا موثر انداز اختیار کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قلم سے

آنسو ٹپکنے کے ساتھ حق ناشناسوں کے لئے غصہ کی چنگاریاں بھی نکل رہی ہیں اس میں افسانہ طرازی کا کوئی عنصر نہیں کیونکہ مصنف نے انصاف اور ہمدردی کے بجائے مخاصمت کرنے والوں کے نام بھی گنوائے ہیں اور اس کے تحریر کردہ حقائق کی تردید کی جرأت کسی نے نہیں کی۔

مصنف ڈاکٹر خان سے ذاتی طور پر واقف اور ان کا روز مرہ ملنے والا ہے انہیں حالات کوائف اور معلومات کے حصول میں کوئی دقت نہیں ہوئی ڈاکٹر خان' ان کے والد' بہن بیوی سے ملاقاتیں کرکے ایک ایک بات کی کھوج لگائی ہے اور ایمانداری سے انہیں ضروری حوالوں اور ماخذات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کتاب کا وہ حصہ جو کہوٹہ کے قیام کے بارے میں ہے نہایت دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ ڈاکٹر خان جو آج ایک داستانی کردار Legendry Figure بنے ہوئے ہیں جس جانفشانی' انتھک محنت اور پُراسرار طریقہ سے اس پروجیکٹ کو مکمل کیا وہ سب فوق البشر کارنامے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ایسی ٹیکنالوجی کو کام میں لانا جس کی طرف تو دنیا کی توجہ بھی نہیں ہوئی اور اپنے وسائل سے تمام کل پُرزے عالمی کھلی مارکیٹ سے خرید کردو سال کے عرصہ میں لیبارٹری تجربے میں بھی کامیابی حاصل کرلی اور پورے پلانٹ کو بغیر بیرونی امداد' رہنمائی یا نگرانی کے کھڑا کرکے محب وطن سائنس دانوں کی ایک فوج بھرتی کرکے پلانٹ پر لگا دینا اور سب کا ایک گھر کے افراد کی طرح ۱۸'۲۶ گھنٹے محنت سے کام کرنا پاکستان کے عام حالات میں ناقابل یقین ہے مصنف نے ڈاکٹر خان اور ان کے بعض ساتھیوں کے بیانات قلمبند کرکے ان ناقابل یقین باتوں کو حقائق کا رنگ دیا ہے۔ کہوٹہ میں ایٹم بم بنا ہو یا نہیں اس کے پلانٹ کا وجود ہی پاکستان کے دشمنوں کے لئے ایٹم بم ثابت ہوا ہے۔ پاکستان کو ایٹمی امداد سے دور رکھنے کی جو بین الاقوامی کوشش کھلے عام اور پس پردہ ہوئیں ان کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا جسے پڑھنے کے بعد یقین ہوچکا ہے کہ واقعی کہوٹہ دشمنوں کے دلوں میں پیوست تیر ہے۔ یہاں یورنیم کی افزودگی کا کام جس عمل کا مرہون منت ہے اس کی تفصیل بھی موجود ہے۔ اگرچہ مصنف ایک صحافی ہے اور طبیعیات سے ان کا کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا لیکن ڈاکٹر خان کے کارناموں کو پیش کرنے کے لئے انہیں کتابوں اور سائنسی رسالوں سے مدد لینی پڑی اور درجنوں تحریریں پڑھ کروہ اس حصہ کو پیش کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ڈاکٹر خان کے سائنسی کارناموں سے قطع نظر ان کے ذاتی اوصاف کو بھی حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے ان کی شخصیت کے جوہر کھل کر اس وقت سامنے آتے ہیں جب ان کے خلاف ہالینڈ میں ہونے والے مقدمہ کی تفصیل نظر سے گزرتی ہے ان کے جذباتی اتار چڑھاؤ ان کے ساتھ ہونے



والی ناانصافی پر غصہ' اپنوں کے انسانیت سوز سلوک پر زندگی میں پہلی بار قابو سے باہر ہوجانا' رات اور دن مطالعہ اور محنت کرکے مقدمہ میں اپنی Defence تیار کرنا' وکیلوں سے بحث و مباحثہ کرکے انہیں قائل کرنا' ان باتوں میں ان کے ایک ایک جوہر ذاتی کی رونمائی ہوئی ہے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے سے زیادہ پاکستان کی بدنامی کا غم کھا رہا تھا اور اس داغ کو مٹانے کے لئے ایک سائنس دان نے کامیاب قانون دان اور جرح اور بحث کرنے والے وکیل کا روپ دھار لیا تھا۔ غرض کہ قدم قدم پر ان کا کردار وطن دوستی کے شواہد پیش کرتا ہے باوجود اپنے ایثار اور انتھک محنت کے انہوں نے ذاتی فائدہ حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی انہیں بالواسطہ طور پر رغبت دلائی گئی لیکن انہوں نے بعد از مرگ کراچی میں قبر کے لئے زمین سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کیا۔

اس کتاب کے ذریعہ ایک داستانی کردار کے تمام خدوخال' ان کے کارناموں کی مکمل تفصیل' شہادتوں اور دستاویز کے ذریعہ سامنے آجاتی ہے تو ان کے حوالے سے بعض لائق ستائش اور بعض قابل نفریں ہستیوں کا بھی ذکر ملتا ہے مصنف نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کا مکمل اعتماد اور غلام اسحاق خان کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو نہ کہوٹہ بنتا نہ ڈاکٹر خان کو اپنی عظمت اور ہنرمندی کا لوہا منوانے کا موقع میسر آتا ان کی راہوں میں جن بڑے بڑے ناموں نے کانٹے بچھائے انہیں بے نقاب کیا گیا ہے یہاں ان کے ناموں کے حوالے سے اپنے قلم کو آلودہ کرنے سے گریز کرنا ہی مناسب ہے۔

آخر میں بیگم خان کا انٹرویو بھی ہے خاتون کے اجداد کا تعلق ہالینڈ سے رہا ہے انہوں نے اپنے شوہر کو ہر رنگ میں دیکھا ہے اور انہیں رنگوں میں پیش کیا ہے اس انٹرویو سے مصنف کے بیان کردہ واقعات کی مزید توثیق ہوتی ہے اور جب وہ ڈاکٹر صاحب کی راہ میں روڑے اٹکانے والوں کا ذکر کرتی ہیں تو قاری کا سر شرم سے جھک جاتا ہے وہ ہم سے زیادہ پاکستان سے محبت کرتی ہیں۔

مصنف کا مقصد اس کتاب کے ذریعہ صرف ڈاکٹر خان کی سوانح عمری ہی مرتب کرنا نہیں تھا بلکہ ان کے اور ایٹمی صلاحیت کے حوالے سے بین الاقوامی سازشوں کو بھی بے نقاب کرنا تھا چنانچہ ابتدائی صفحات میں "مشن زیڈ" کی تفصیل بھی دی گئی ہیں یہ وہی مشن ہے جو بہاول پور کے قریب حادثہ کا سبب بنا اور جنرل ضیاء الحق کے ساتھ کئی جنرلوں کی موت کا باعث بنا۔

اردو میں لکھنے والوں کے ذوق تحقیق میں جس طرح اضافہ ہو رہا ہے اور اس کے لئے تمام تر

وسائل کو استعمال کر کے صداقت تک پہنچنے کی کاوش بڑھ رہی ہے اس کے ثبوت میں یہ کتاب پیش کی جاسکتی ہے جو ایک صحافی نے پوری دیانت داری، غیر جانبداری اور تحقیق کے بعد تحریر کی ہے۔

**مولانا رومی، حیات وافکار : ڈاکٹر افضل اقبال : مترجم بشیر محمود اختر**
**لاہور : ۱۹۷۹ء**

فارسی داں طبقہ مولانا رومی سے بلاواسطہ اور اردو داں طبقہ خصوصیت سے علامہ اقبال کے وسیلہ سے واقف ہے۔ فارسی شاعری کی تاریخوں میں ان کا ذکر ملتا ہے لیکن جو ڈاکٹر افضل اقبال نے ان کے سوانح اور کارناموں پر انگریزی میں اپنی کتاب شائع کی تھی اردو جاننے والوں کے لئے بشیر محمود اختر نے اس کا ترجمہ کیا ہے اور بعض مقامات پر اضافی حوالے بھی درج کئے ہیں کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے دوسرے، تیسرے اور چوتھے ابواب میں مولانا رومی کے آباؤ اجداد، پیدائش، تعلیم و تربیت، ذہنی ارتقا، شمس تبریز سے ملاقاتیں اور ان کے اثرات، شاعری کے ادوار پر فاضلانہ بحث موجود ہے اردو میں یہ اس موضوع پر پہلی بھرپور کاوش ہے۔ مولانا رومی کے بارے میں سوانح حالات اردو میں ناپید ہیں مضامین اور کتب میں حوالے تو ملتے ہیں لیکن ان کی مستقل سوانح عمری نہیں ہے اس لئے فارسی شاعری اور فلسفہ کے رجحان کی نشاندہی کے لئے اس ترجمہ پر نظر ڈالی گئی ہے۔

**فکر تونسوی، شخصیت اور طنز نگاری : بوگس حیدر آبادی : حیدر آباد دکن**
**مئی ۱۹۸۰ء**

فکر تونسوی اردو میں طنز و مزاح کے حوالے سے اہم مقام رکھتے ہیں اور ان کی سوانح اور شخصیت پر قلم اٹھانے والے بوگس حیدر آبادی بھی اسی میدان کے شہسوار ہیں انہوں نے جامعہ عثمانیہ میں ایم اے کی ڈگری کے لئے یہ مقالہ لکھا تھا فکر تونسوی عرصہ دراز سے نظم و نثر لکھتے رہے ہیں اس کے باوجود ان کے سوانح و شخصیت عدم توجہی کے شکار رہے اس صورت حال کی وجہ سے یقیناً "مقالہ نگار کو معلومات حاصل کرنے میں دشواریوں کا سامنا رہا فکر تونسوی سے شخصی رابطہ کی وجہ سے ان کی مشکل آسان ہوئی اور مستند مواد حاصل ہوا مقالہ پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محض ایک نامور ادیب و شاعر کی داستان حیات ہی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں مقصدیت کی حامل ہے فکر نے جن مشکلات، نامساعد حالات، حوصلہ شکن تجربات میں اپنی



کامیابی کی راہ نکالی وہ ان کے عزائم و حوصلہ پر بھی دلالت کرتی ہے اور قاری کے لئے سبق آموز بھی ہے۔ جہد مسلسل سے ہر انسان حالات پر فتح پا کر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا سکتا ہے یہ اس مقالہ کا بنیادی نکتہ ہے اور مقالہ نگار اسے واضح کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

وہ شجاع آباد میں دھن پت رائے کے گھر پیدا ہوئے رام نارائن کو فکر تونسوی بننے کی لئے بڑی جانفشانی کرنی پڑی تھی۔ وہ دیہات کے ماحول میں پلے بڑھے، معمولی قصباتی اسکولوں میں تعلیم حاصل کی ایمرسن کالج میں تھے کہ انہیں گھر کی اقتصادی بدحالی کا اندازہ ہوا بقول ان کے

"ماں باپ کی موجودگی کے باوجود اپنے آپ کو بے سہارا یتیم سمجھ کر کچھ دکھانے کے جذبے نے مجھ سے ہر کام کروایا مگر ماتھے پر بل نہیں آیا" (۶۳)

پہلے انہوں نے ایک خوش نویس سے چند روز فن سیکھا اور کام چلاؤ حد تک خوش نویسی سیکھ کر ڈسٹرکٹ بورڈ شیخوپورہ کے اخبار "کسان" کی کتابت کرنے لگے جس سے ان کو ماہانہ پانچ روپیہ ملتے تھے بعد میں ایک رنگریز کے ہاں پگڑیاں اور دوپٹے رنگنے کی نوکری کی، پینٹر بن کر اشتہارات لکھے، آریہ پرائمری اسکول میں ٹیچر رہے، خوشبودار تیل کی ایجنسی لے کر تجارت کی، لاہور میں کسی بک سیلر کے ہاں کتابوں کے پیکٹ بناتے رہے۔

"وہ خود بھی ادیب بننا چاہتے تھے اسی جذبہ کی بدولت انہوں نے شیخوپورہ سے ایک نیم ادبی اور نیم فلمی نکلنے والے ہفتہ وار کی ادارت قبول کرلی" (۶۴)

۱۹۴۰ء کے لگ بھگ رام نارائن، فکر تونسوی بن گئے وہ فکر معاش کے ساتھ فکر سخن بھی کرنے لگے ایسے میں انہیں رسالہ "ادب لطیف" میں کلرکی مل گئی وہاں کے ماحول نے نکھار کر انہیں پورا شاعر بنادیا اور وہ جلد ہی رسالہ کے ایڈیٹر بھی بن گئے۔ ممتاز مفتی کے اشتراک سے "سویرا" نکالا جسے اردو رسائل میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوئی ۴۷ء میں فسادات کے دوران آگ اور خون کے دریا سے گزر کر "چھٹا دریا" لکھا ترک وطن کرتے وقت ان کی شہرت برصغیر کے گوشہ گوشہ تک پھیل چکی تھی صحافی اور ادیب و شاعر کے طور پر انہوں نے اپنا مقام تسلیم کروالیا تھا۔

اس مقالہ کے لئے فکر نے اپنے حالات کی فراہمی میں جرأت سے کام لیا اور کوئی بات چھپائی نہیں مقالہ نگار نے اسی دیانت داری سے ان کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے فکر کے حوالے سے یہ ابتدائی نوعیت کی کوشش ہے لیکن ایسی پائیدار بنیاد ہے جس پر مستقبل کی اہم سوانح و شخصیت مرتب ہو سکتی ہیں۔

## میر شمس الدین فیض، حیات اور ادبی کارنامے : لئیق صلاح : حیدر آباد دکن جنوری ۱۹۸۰ء

دکن کے قدیم شعراء پر تحقیق کا کام مسلسل ہوتا رہا ہے لئیق صلاح نے ایم فل کی ڈگری کے لئے تیرھویں صدی ہجری کے شاعر میر شمس الدین فیض کا انتخاب کیا انہوں نے یہ مقالہ اپریل ۷۷ء۱۹ میں مکمل کیا اور جامعہ عثمانیہ نے اس پر ۱۹۷۸ء میں ایم فل کی ڈگری دی۔ ان سے قبل بھی فیض پر کام ہوا تھا ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی کتاب "فیض سخن" میں ان کے مختصر حالات اور تصانیف کا ذکر موجود ہے مرزا سرفراز علی کا لکھا ہوا مضمون "مرقع سخن" جلد اول میں شامل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر رشید مولوی نے بھی "فیض، حیات اور شاعری" کے موضوع پر لکھا ہے۔ لئیق صلاح نے موضوع کے ہر پہلو پر جانکاہی سے تحقیق کی ہے ایک باب میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ماخذات سے حالات اکٹھا کر کے سوانح مرتب کی ہے فیض کے سال پیدائش کے بارے میں جو اختلاف تھا اسے دور کیا اور ان کے تاریخی      نام "مظہر کل" ۱۱۹۵ھ کو سند قرار دیا ہے ان کا شجرۂ نسب حضرت علیؓ تک بلافصل محقق کیا ہے۔ وہ حیدر آباد ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں ساری عمر گزار دی وہ حافظ قرآن تھے۔ مشتاق سے شرف تلمذ حاصل تھا فیض شاعری کے علاوہ علم ہندسہ، ہیئت، موسیقی، ریاضی سے بھی واقف تھے۔ امیر خسرو نے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا فیض نے چار سربراہان مملکت نواب نظام علی خان، نواب سکندر جاہ، نواب ناصر الدولہ نے اور نواب افضل الدولہ کے عہد دیکھے تھے ان کی رسائی مخزن علم امیر کبیر شمس الامراء کے دربار تک بھی تھی۔ نواب ناصر الدولہ نے انہیں ضیاء الدولہ کے اتالیق مقرر کیا تھا۔ ضیاء الدولہ کی اتالیق کا جو معاوضہ ملتا تھا اس کے سوا پانچ سو روپیہ ماہوار نواب ناصر الدولہ انہیں دیتے تھے۔ شمس الامراء تین سو روپیہ اور نواب سالار جنگ دو سو روپیہ دیا کرتے تھے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کی علمیت اور قابلیت کے سب ہی معترف اور مداح تھے۔

فیض کے مرشد ابراہیم علی شاہ تھے اپنے مرشد سے انہیں جو عقیدت تھی اس کے جتنے بھی تحریری ثبوت فراہم ہو سکتے تھے محقق نے جمع کر دیئے ہیں۔

فیض کا انتقال ۱۲۸۳ھ میں ہوا صاحب تصنیف نے مختلف حوالوں سے فیض کا سراپا، ان کا لباس اور ان کی شخصیت کے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے ان کی تحقیق کے مطابق فیض بڑے ذکی



اور ذہین تھے صرف ۱۲ سال کی عمر میں گیارہ ماہ کی قلیل مدت میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ فیض کی ماہانہ آمدنی ایک ہزار روپیہ سے زائد تھی جو اس زمانہ کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی باوجود اس کے وہ جاہ پسند نہیں تھے ظاہری تکلفات کو خاطر میں نہ لاتے۔ دیوان خانے میں بوریا بچھا ہوتا اسی پر بیٹھتے اور مہمانوں کو بٹھاتے تھے۔ ساری آمدنی ضرورت مندوں کی نذر ہو جاتی انسان دوستی، حلم و عفو، اعلیٰ ظرفی، وطن پرستی، ان کی شخصیت کے حصے تھے۔ محقق نے فیض کے بیشتر معاصرین کے تفصیلی حالات لکھ کر کتاب کے ایک حصے کو "تذکرۃ الشعراء" کی اہمیت دے دی ہے یہی حال استادوں کے بیان کا ہے فیض کی قریب ایک درجن تصانیف نظم و نثر و لغات کا تفصیلی جائزہ بھی لیا ہے۔ لئیق صلاح کی محنت سے ایک اچھا اہم شاعر گوشۂ گمنامی سے نکل کر تاریخ کے صفحات کی زینت بننے کے لائق ہو گیا ہے۔ فن کے تمام بنیادی اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے اکثر جگہ ماقبل تحقیق کر کے رد کیا ہے۔ جس کے لئے مستند حوالے پیش کئے ہیں اور طرز تحریر کو باوقار رکھنے کی کوشش کی ہے نہ تنقیص میں تلخی ہے اور نہ اپنی دریافت پر تفخر :

## حیات بیدل : ڈاکٹر امانت : الہ آباد : ۱۹۸۰ء

ڈاکٹر امانت نے مرزا عبدالقادر بیدل کے سوانحی حالات ۸۵ صفحات طویل مضمون میں رقم کئے ہیں اگرچہ ان کی کتاب میں چھ مضامین شامل ہیں جو نسبتاً "مختصر" ہیں انہوں نے کتاب کا نام اسی مضمون کی رعایت سے "حیات بیدل" رکھا ہے اس میں حالات زندگی سے ہٹ کر شاعرانہ خدمات پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ مضمون نگار کا انداز نظر محققانہ ہے اور بیدل پر جو کچھ لکھا گیا وہ ان کے پیش نظر رہا ہے انہوں نے ہر تحریر کے حوالے حسب موقع استعمال کئے ہیں اور اگر ان سے اختلاف ہے تو دلائل کے ذریعہ ان کی نفی کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابتدا میں ان کے مواد سے بحث کی ہے اس ضمن میں میر قدرت اللہ قاسم، سید سلیمان ندوی، طاہر نصر آبادی، علی قلی ہدایت، خوشگو، محمد حسین آزاد، علی شیر قانع ٹھٹھوی، امیر شیر علی خان ندوی، غلام ہمدانی مصحفی وغیرہ کی قیاس آرائیوں کو مسترد کرتے ہوئے بیدل کی تصنیف "چہار عنصر" کے حوالے سے ان کے سرزمین بہار سے موروثی تعلق کو درست قرار دیا ہے اگرچہ انہوں نے بھی کسی خاص مقام کا تعین نہیں کیا ہے۔ بیدل نے اپنی تاریخ ولادت خود کہی ہے اس لئے اس میں اختلاف یا قیاس آرائی کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت، شاعری میں مولانا کمال کی شاگردی، مرزا قلندر شاہ کمال، شاہ ملوک، شاہ یکتہ، آزاد، شاہ فاضل، شاہ قاسم ہواللّٰہی، والہ ہروی، شاہ کابلی، سے

ارادت' ان سے رموز تصوف کا اکتساب' تاہل اور ان کے انتقال کے واقعات کو متعدد اہم اور مستند ماخذات کے ذریعہ زیر بحث لا کر ان کی صداقت اور عدم صداقت معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضمون زیادہ طویل نہ ہونے کے باوجود معلومات افزا ہے ڈاکٹر امانت نے کسی موقع پر بھی غیر ضروری مباحث درمیان میں لا کر اسے طوالت دینے کی کوشش نہیں کی ہے۔ تلاش اور وقوف حقائق ان کا مطمعِ نظر رہا ہے۔ اس اعتبار سے جو معلومات حاصل ہو سکیں اور انہیں جس طرح مرتب کیا ہے وہ فن سوانح کی ضروریات اور تقاضے کے عین مطابق ہے۔

## صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی : شمس تبریز خان : کراچی ۱۹۸۱ء

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی کی شخصیت ہمہ گیر اور مسلمہ ہے۔ ان کی حیات اور ان کے کارناموں پر جو توجہ دی جانی چاہئے تھی نہیں دی گئی۔ شمس تبریز خان نے ان کے خاندان کے تعارف' ان کے حالات زندگی خصوصیات و کمالات' علمی و ادبی خدمات' تصانیف' علمی و دینی تحریکات میں ان کے حصے کا احوال اسی طرح رقم کیا ہے کہ ایک دور کی تاریخ منضبط ہو گئی ہے۔

افاغنہ کے خانوادہ شروانی کے اس بطل جلیل کے اجداد میں داؤد خان' خان زمان خان' محمد تقی کے مستند واقعات بیان کرنے کے بعد ان کی ولادت گھر کے ماحول' تعلیم' طرز تعلیم پر روشنی ڈالی گئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ السنہ و علوم شرقیہ پر جو عبور رکھتے تھے اس کی بنیادیں ابتدا ہی میں استوار کر دی گئی تھیں۔ مسلمانوں کی جو علمی و تعلیمی تحریکات برصغیر میں جاری رہیں ان سب میں ان کا فعال کردار رہا اسی حوالے سے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' ندوۃ العلماء' مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مساعی میں ان کے مشورے اور عملی تعاون کی جو صورت رہی بالتفصیل موجود ہے اگرچہ مولانا شروانی' مولانا ابوالکلام آزاد کے مخلص خاص شمار ہوتے ہیں جس کی بناء پر غبار خاطر کے خطوط انہیں کے نام لکھے گئے لیکن تحریک عدم تعاون میں علی گڑھ کالج کو گاندھی' مولانا محمد علی جوہر اور مولانا آزاد کی تاخت سے بچانے میں سینہ سپر ہونے والوں میں وہی سب سے پیش پیش تھے۔ اس سے ان کے صائب الرائے ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ امور مذہبی پر ان کی گہری نگاہ کی وجہ سے انہیں حیدر آباد دکن میں صدر الصدور کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا گیا تھا۔ ان کا رتبہ وزیر کے برابر تھا لیکن وہ وزیر اعظم کے ماتحت نہیں بلکہ براہ راست نظام کے ماتحت کام کرتے تھے



اس سے نظام کے وصف مرتبہ شناسی کا بھی پتا چلتا ہے اور ان کی عظمت کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام' اس میں مشرقی اور دینی علوم کی تدریس میں ان کا فعال کردار' ان کے کارناموں میں نہایت نمایاں ہے۔ مؤلف نے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ خوش اسلوبی سے کیا ہے اور اپنے خیالات کی تائید میں ایسے بزرگوں کی تحریروں کی حوالے دیئے ہیں جو ان سے شخصی تعلق کے علاوہ اپنے مقام کی وجہ سے معتبر گردانے جاتے ہیں۔ مولانا شروانی فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے مولانا نے ان کی شعری خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ناقدین بالخصوص شبلی نعمانی کے حوالے سے انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مولانا کی تصانیف تذکرۂ بابر' علمائے سلف' نابینا علماء' استاد العلماء' فقہ حنفی' اسلامی اخلاق' سیرۃ الصدیق' مسلمانوں کی قدیم تعلیم کا نصب العین' حالات حزیں' قرۃ العین' ذکر محبوب' سرسید کی یاد' مقدمہ مثنوی مجنوں ولیلیٰ' مقدمہ تذکرۂ میر حسن' مقدمہ نکات الشعراء اور مقالات شروانی پر سیر حاصل تبصروں کے ذریعے علمی کاوش کو متعارف کرواتا ہے علمی شغف کے ضمن میں کتابوں سے ان کے عشق کی روئیداد بھی پیش کی ہے اس عشق کے نتیجہ کے طور پر انہوں نے ایک بڑی لائبریری قائم کی تھی۔ اس کے بارے میں مؤلف کا یہ خیال درست ہے کہ

"مولانا کا یہ کارنامہ صرف کتابوں کے جمع کرنے میں نہیں بلکہ ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے آثار و نشانی کی حفاظت اور گزرے ہوئے کارواں کی میراث کی بازیابی میں ہے۔" (۶۵)

کتاب کا ایک حصہ ان کی سیرت کی عکاسی کرتا ہے اس ضمن میں بتایا گیا ہے کہ مولانا کو شروع سے تقویٰ کا بڑا اہتمام تھا اور آخری دم تک تقویٰ و صلاح کی شان ان میں اسی طرح جلوہ گر رہی کہ اسے ان کی امتیازی صفت کہا جا سکتا ہے۔ معاشرت و معیشت' تحریر و تقریر زندگی کی ہر راہ میں تقویٰ ان کا رہنما تھا۔" (۶۶)

وہ نماز باجماعت کا خاص اہتمام کرتے تھے سفر میں دو آدمیوں کو ضرور ساتھ رکھتے تھے تاکہ سفر میں بھی نماز باجماعت نہ چھوٹے ذات نبوی سے بے پناہ عشق کے جذبہ سے سرشار تھے اور حرمین شریفین سے تعلق خاطر تھا اور ہر سال مدینہ طیبہ کے انتظام و انصرام کے لئے رقم ضرور بھجواتے تھے۔ علمائے دین سے محبت بھی ان کے مزاج کا وصف خاص تھی تمام دینی شعائر اور عبادات کا احترام کرتے اور ان کی درستگی کی سعی کرتے تھے۔ امانت و دیانت کے پیکر تھے خودداری اور عزت نفس کے معاملہ میں وہ مکمل پٹھان تھے۔ سرکاری دربار سے خطاب حاصل کرنے سے اجتناب کرتے تھے انگریزوں کی جانب سے بارہا خطاب کی پیشکش ہوئی لیکن انہوں نے قبول نہیں

کیا۔ مؤلف نے سوانح، سیرت، علمی و ادبی اور مذہبی خدمات کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو تشنہ چھوڑا ہو البتہ کتاب کو دوسروں کے حوالوں اور بیانات سے کچھ زیادہ ہی گراں بار کردیا گیا ہے پھر بھی اردو کی سوانح نگاری میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

## سید نجیب اشرف ندوی : ریاست علی تاج : حیدر آباد دکن : جنوری ۱۹۸۱ء

ریاست علی تاج کا بیان ہے کہ انہوں نے جامعہ عثمانیہ میں ایم اے میں داخلہ لینے کے بعد امتحانی ضرورت کے تحت مقالہ کا عنوان "سید نجیب اشرف ندوی حیات اور کارنامے" متعین کیا اور صرف دو سال کی مدت میں اسے مکمل کیا کوئی وجہ نہیں کہ ان کے بیان کو غلط مانا جائے اس صورت میں انہوں نے مواد کی فراہمی، ترتیب اور تحریر کے مراحل کو دو سال میں طے کرکے وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ برسوں کی کاوش کے بعد بھی ڈاکٹریٹ کے لئے انجام نہیں دیا جاتا۔ مواد اور معیار کے اعتبار سے یہ اس قدر مکمل ہے کہ ایم اے کے مقالات سے کہیں افضل دکھائی دیتا ہے انہوں نے جن ماخذات کا حوالہ دیا ہے ان میں ۵۷ کتب، ۷۰ رسائل و اخبارات، ۱۳ شخصی اور تحریری انٹرویو، ۳۱ مکاتب شامل ہیں۔

باب اول سیاسی پس منظر کے بارے میں ہے۔ باب دوم میں سید نجیب اشرف کے خاندانی حالات اور ان کے شجرۂ نسب، ولادت مقام پیدائش، ابتدائی دور سے لے کر مراحل حیات، وفات تک مکمل با تفصیل موجود ہیں۔ ان میں خصوصیت سے ان کی سیاست سے وابستگی اور علمی و ادبی کام کی طرف توجہ دی گئی ہے مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۶ء میں ہوا جو ۱۹۶۸ء تک جاری رہا گویا نصف صدی وہ تحریر و تصنیف کا کام کرتے رہے خلافت کی تحریک کے وقت سے ان کی سیاسی جدوجہد شروع ہوئی تھی اسی وجہ سے ان کے تعلیمی مراحل میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں انتہائی نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے ۱۹۳۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کی ڈگری بدرجہ امتیاز حاصل کی اور طلائی تمغے کے مستحق قرار پائے۔ مقالہ نگار نے ان کی نجی زندگی کا اجمالی حال بھی تحریر کیا ہے۔ باب سوم میں شخصیت کے خدوخال اور سیرت کو موضوع بنایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ نجیب اشرف اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے ان میں مطالعہ کا مستقل شوق تھا، تحقیقی ذوق بھی رکھتے تھے۔ تنقیدی شعور کے ساتھ زبان اور بیان کی خوبیوں کو نظرانداز نہیں کرتے تھے۔ ان میں "انا" کی ایک ہلکی لہر بھی تھی۔ ان کی بزم خیال میں جو حسن جو



نزاکت، جو پاکی اور نفاست تھی اس کی ساری آن، اس کا سارا پرتو ان کی ظاہری شخصیت میں جھلکتا تھا۔ ان کی دلچسپ گفتگو سے ان کی علمیت اور خلوص، شگفتہ مزاجی اور وقار، رومانیت اور ترقی پسندی ٹپکتی ہے۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں تو علمی ماحول دیکھا شعور آیا تو فقید المثال علماء سے اکتساب فیض کیا سیاسی بیداری پیدا ہوئی تو ہندوستان کے دیو پیکر رہنماؤں اور بہترین سیاست دانوں کا ساتھ ہو گیا ان حالات میں ان کی شخصیت کی تعمیر سیرت و اخلاق کی تشکیل اور ذہن و فکر کا حسین ارتقا ہوا۔ چوتھے باب میں ان کی تصنیفی زندگی اور ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا اس میں ان کے تحریر کردہ تمام مضامین، مقالات اور کتب پر تبصرہ بھی موجود ہے۔ مقالہ نگار نے ان کی تصنیفی زندگی کے ۳ دور متعین کئے ہیں پہلا دور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ء، دوسرا ۱۹۳۱ء تا ۱۹۵۰ء اور تیسرے دور میں اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹری کا زمانہ

مقالہ نگار نے سوانحی حالات، سیاسی خدمات اور ادبی و صحافتی مصروفیات اور کارناموں کی اس قدر تفصیل بیان کی ہے کہ کوئی تشنگی باقی نہیں رہ جاتی۔ ایک بھرپور زندگی گزارنے والے شخص کے حالات کے لئے ایسی ہی بھرپور کاوش کی ضرورت تھی۔ صاحب سوانح کے مزاج اور جامعاتی معیار کو پیش نظر رکھ کر مقالہ نگار نے سلجھی ہوئی صاف اور سادہ زبان استعمال کی ہے۔ طوالت کی غرض سے غیر ضروری عبارت آرائی سے گریز کیا ہے اور ہر جملہ کو کسی مقصد کا غماز بنایا ہے۔

## محمد حسین آزاد : آغا سلمان باقر : لاہور : ستمبر ۱۹۸۱ء

محمد حسین آزاد کی متنوع صفات شخصیت نے یادگار علمی، ادبی اور سماجی خدمات انجام دی ہیں جن کے پیش نظر جس قدر وقیع کام ان کے بارے میں ہونا چاہئے تھا نہیں ہوا ہے آزاد کے سوانح اور ادبی خدمات کے حوالے سے آغا سلمان باقر کی کتاب "محمد حسین آزاد۔ حیات شخصیت و فن" نہایت اہم ہے اور اس خلا کو پُر کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے مصنف کا تعلق صاحب سوانح کے خانوادہ سے ہے جن کی تحویل میں صاحب سوانح کے اہم کاغذات بھی ہیں اور وہ ان روایات کے امین بھی ہیں جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے ہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں خصوصیت سے "حیات" پر توجہ دی ہے اور ۱۳ سرخیاں قائم کرکے خاندانی حالات آزاد کی ولادت سے وفات تک کے واقعات کو تاریخی ترتیب میں پیش کیا ہے اپنی اس کاوش کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ

"میں نے اس سوانح کو ہر طرح سے مکمل انداز میں پیش کرنے کی ادنیٰ کوشش کی ہے جامع اور مختصر۔ میں نے اس میں اپنے گھرانے کی ان روایات اور واقعات کو بھی شامل کیا ہے جو مجھے میری والدہ اور والد مرحوم نے سنائے تھے مگر آج تک ضبط تحریر میں نہ آسکے تھے تمام تاریخی حقائق کو بھی اس سوانح میں پیش نظر رکھا گیا ہے خاص طور پر جن دستاویزات کا ذکر اور قلمی وغیر قلمی کتب کا تذکرہ اس سوانح میں آیا ہے وہ میرے پاس محفوظ ہیں۔" (۶۷)

مستند واقعات سے مرتبہ اس سوانح عمری کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہر دور اور اس کے جزوی یا ضمنی واقعات کو پیش نظر رکھا گیا ہے اس سے صاحب سوانح کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح سامنے آگئی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں آزاد کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو پوری وضاحت اور واقعاتی شہادت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے غرض سوانح اور سیرت دونوں اعتبار سے مکمل معلومات فراہم کی ہیں اور فن اور ضرورت دونوں کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔

## مرزا سلامت علی دبیر : مرزا محمد زماں آزردہ : سری نگر : ۱۹۸۱ء

مرزا دبیر اردو شعر و ادب بالخصوص مرثیہ کے حوالے سے انیسویں صدی کی ایک اہم اور قد آور شخصیت ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مرثیہ گوئی میں ان کے مدمقابل میر انیس رہے۔ ایک ہی عہد کے دو باکمالوں میں مرتبہ کا تعین کرنا اور کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا ممکن نہیں۔ شہرت کا تاج میر انیس کے سر سجا مگر دبیر کے کلام کے خلاف کبھی کوئی مؤثر آواز نہیں اٹھی۔

مرزا محمد زمان کو جن کا تعلق سری نگر یونیورسٹی سے رہا ہے دو وجوہات نے دبیر کے حالات زندگی اور ادبی کارناموں کی تحقیق پر مائل کیا ایک تو یہ کہ انیس پر جس قدر تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا ہے اس کے مقابلہ میں دبیر پر نہیں ہوا۔ دوسری وجہ انیس کی بے جا حمایت اور دبیر کی بے جا مخالفت ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ ہر دو صورتوں میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ اس بارے میں انہوں نے خاص طور پر شبلی پر تنقید کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ مولانا شبلی نے مرزا دبیر کا مطالعہ ہمدردی اور شغف سے نہیں کیا۔ متحد المضامین کلام کی مثالیں پیش کرنے میں موصوف نے جانبداری کا رویہ اختیار کیا۔ میر انیس سے اپنی ذاتی دلچسپی کی بناء پر وسیع النظر ناقد و محقق کے بجائے میر انیس کا وکیل بن کر جائز و ناجائز ہر طرح کے حربے استعمال کرکے اپنے مؤکل کی کامیابی کے لئے جدوجہد کی۔ یہاں تک کہ اکثر و بیشتر ایسا کلام مرزا دبیر کی طرف منسوب کردیا ہے جو الحاقی ہے۔" (۶۸)



ان وجوہ کی بناء پر مرزا محمد زمان آزردہ کو مرزا دبیر کے بارے میں تحقیق کی تحریک ہوئی اور انہوں نے محنت اور جستجو کے ذریعہ سوانحی حالات' کلام کے مصدقہ نسخے' غیر معروف اور غیر مطبوعہ تصانیف برآمد کرکے یہ مقالہ تحریر کیا جس پر سرینگر یونیورسٹی نے ۱۹۷۲ء میں انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی' مرزا دبیر کے بارے میں ایک کتاب "حیات دبیر" مرزا افضل حسین ثابت نے ۱۹۱۳ء میں شائع کی تھی اس میں سوانح عمری برائے نام ہے۔ اس زمانہ میں مرزا دبیر کی ذات اور شاعری کے بارے میں میں جو اعتراضات تھے ان کا جواب دینا مقصود تھا اس لئے اس میں لب ولہجہ کی تختی سے مناظرانہ رنگ پیدا ہوگیا تھا اسی وجہ سے اس تصنیف کی زیادہ شہرت نہیں ہوئی۔ مرزا ثابت کے مقاصد بھی وہی تھے جو مرزا آزردہ نے بتائے ہیں۔ مرزا ثابت نے سوانح نگاری کے فن سے واقفیت اور تنقید کے مسلمہ اصول کا خیال نہیں رکھا جبکہ مرزا آزردہ جو ادب کے استاد بھی ہیں۔ تحقیق کے ہنر سے واقف ہیں اور ادبی و فنی ضرورتوں کو سمجھتے بھی ہیں سلامت روی کا ثبوت دیا' ان کی تصنیف مرزا دبیر کے حالات زندگی اور کارناموں کے غیر جانبدارانہ مطالعہ پر مبنی ہے مقالہ نگار جو شواہد اور مواد حاصل کرسکا اسے اپنے اخذ کردہ نتائج کے ساتھ احسن طریقے سے تحریر کردیا ہے۔ اس میں خاندانی حالات' پیدائش' تعلیم و تربیت' مرثیہ گوئی سے رغبت کے علاوہ ان کی روزمرۃ مصروفیات' متعدد شہروں کے سفر کا احوال' نجی زندگی اور ان کے اوصاف اور صفات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ سیرت میں ان کی سلامت روی' سنجیدگی' دوسروں سے اخلاص' ہر ایک کا احترام یہاں تک کہ میر انیس کے لئے جذبۂ خیر سگالی کے واقعات کو شہادت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مرزا دبیر کے بارے میں یہ واحد جامع اور غیر جانبدارانہ تصنیف ہے۔ ایک ایسی شخصیت کے بارے میں جن کے فن کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ صحیح خدوخال میں پیش کرنا اور تحریر کو جذبات کے اثر سے پاک رکھنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ مصنف نے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ادبی معیار قائم رکھا ہے۔ ان کا انداز بیان بھی سنجیدہ اور تحقیقی مقالہ کے لئے موزوں ہے۔

## حیاتِ غالب : شیخ محمد اکرام : لاہور : طبع دوم ۱۹۸۲ء

غالب جیسی ہمہ گیر ادبی شخصیت کے مطالعہ کے لئے شیخ محمد اکرام جیسے صاحب نظر نقاد و مؤرخ ہی موزوں ہوسکتے ہیں۔ مصنف کے تبحر علمی کے نقوش رود کوثر' موج کوثر' آب کوثر' شبلی نامہ اور حکیم فرزانہ سے ظاہر ہیں حیات غالب ان کی علمی و تحقیقی کاوش میں ایک اضافہ ہے مطالعہ

غالب کے سلسلے میں مصنف نے تین اہم کتابیں مرتب کی ہیں ایک اردو فارسی کلام کا انتخاب جو ارمغان غالب کے نام سے ہدیۂ ارباب ذوق ہوا تھا۔ دوسری پیشکش حیات غالب تھی تیسرا حصہ تنقیدی نوعیت کا ہے اور غالب کے فلسفہ (دید و دانش) پر زیادہ توجہ کی بناء پر اسے حکیم فرزانہ کا نام دیا تھا۔ ان تینوں کو الگ الگ شائع کیا گیا جبکہ ان کے مجموعہ کا نام "غالب نامہ" ہے۔ حیات غالب کو ایک جداگانہ تالیف اس لئے بھی قرار دیا گیا ہے کہ اس میں سوانحی حالات کو باتفصیل مرتب کیا گیا اور غالب کی شخصیت کی نشو و نما کو زیادہ واضح صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

جدید سیرت نگاری کے ضمن میں مصنف کی پہلی پیشکش شبلی نامہ تھی غالب کی طبیعت میں شبلی کا پیچ و خم اور اتار چڑھاؤ نہ تھا اور نہ ہی ان کے متعلق مکمل مواد موجود ہے جیسا کہ شبلی کے متعلق ہے اس کے باوجود تمام مستند ماخذات سے استفادہ کرکے جدید سوانح و سیرت نگاری کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غالب کے خارجی حالات کے ساتھ ان کی داخلی کشمکش، شخصیت کی نشو و نما اور ذہنی و جذبات کے ارتقا کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا ہے۔

کتاب نو ابواب پر منقسم کی گئی ہے پہلے حصے میں آباؤ اجداد کے اذکار کے علاوہ حیات غالب کے اس دور پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اکبر آباد میں بسر ہوا۔ دوسرا باب دہلی منتقل ہونے کے بعد عالم شباب تک کا ہے۔ تیسرے باب میں غم روزگار کو موضوع بنایا ہے چوتھے باب میں بہار سخن کے عنوان سے ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کیا ہے۔ پانچواں باب قلعہ معلی سے توسل کے حوالہ سے ہے۔ چھٹا دہلی کی تباہی اور دلی کی بربادی کی روداد ہے۔ ساتویں باب میں ۱۸۵۷ء کے بعد کے واقعات اور حالات ہیں۔ "چراغ سحری" کے زیر عنوان عمر کے آخری حصہ کو پیش کیا ہے۔ نواں باب ان کی زندگی کے خاتمے اور بعض ضمنی موضوعات پر ہے۔ کتاب میں غالب کی زندگی کے کسی دور اور اس کی خصوصیات کو نظر انداز نہیں کیا گیا زمانہ کے انقلابات نے ان کی فکر و فن پر جو اثرات مرتب کئے ان سے منطقی انداز میں بحث کی ہے اس کے ذریعہ نہ صرف سوانح نگاری کا حق ادا ہوا ہے بلکہ ان کی سیرت کے تمام پہلو بھی اجاگر ہو گئے ہیں۔

## ڈاکٹر عبدالسلام: عبدالغنی : تصنیف انگریزی ۱۹۸۲ء : ترجمہ نورا کینہ قاضی ۱۹۸۳ء

ڈاکٹر عبدالسلام کی سوانح عمری ڈاکٹر عبدالغنی نے انگریزی میں لکھی تھی جو ۱۹۸۲ء میں کراچی سے شائع ہوئی تھی۔ صاحب سوانح اور مصنف دونوں کا تعلق سائنس کے ایک ہی شعبہ سے ہے



اور باہم مل کر کام بھی کیا ہے اگرچہ مصنف ڈاکٹر عبدالسلام سے عمر اور تجربے میں کم ہیں اس تصنیف کو ایسی سوانح قرار نہیں دیا جا سکتا جس میں صرف حالات زندگی بیان کئے گئے ہوں اور دیگر متعلقہ امور اور کارناموں کو ضمنی حیثیت دی گئی ہو بلکہ اس میں صاحب سوانح کی زندگی کو ان کے کارناموں سے اس طرح وابستہ کر دیا گیا ہے کہ ان کی علمیت اور تحقیق زیادہ واضح ہو گئی ہے اور صاحب سوانح کی شخصیت نسبتاً "پس منظر میں چلی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلام اس صدی کے عظیم ماہر طبیعیات ہیں جن کی خدمات کے سلسلے میں دنیا کی ۲۴ جامعات نے ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگریاں دی ہیں۔ عالمی اداروں نے ۲۰ ایوارڈز، ۴ حکومتوں نے قومی اعزازات دیئے۔ ۲۳ عالمی شہرت رکھنے والے سائنسی اداروں نے فیلوشپ دی۔ وہ اقوام متحدہ کے ۱۰ عہدوں پر فائز رہے اور ۲۵۰ سے زائد اعلیٰ پایہ کے تحقیقی مقالات لکھ کر شائع کر چکے ہیں وہ نوبل انعام کے بھی مستحق قرار پائے ہیں جو سب سے بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ ایسی شخصیت کا احاطہ اس کے کام کی نوعیت کے تعارف کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ اسی بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصنف نے ان کے کارناموں کی تفصیل اور ان کی تحقیق کی تشریح کی ہے ایک عام قاری کے لئے طبیعیات کی اصطلاحات کے ذریعہ ان پُر پیچ مرحلوں سے گزر کر ان کے کاموں کو سمجھنا آسان نہیں مصنف نے اپنی تمام علمی قابلیت روبہ کار لا کر ان کی سائنسی خدمات کا خاکہ بیان کیا ہے۔ باوجود ان علمی مباحث کے ڈاکٹر سلام کی زندگی کے مختلف ادوار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ تعلیم کے حصول کی دشواریوں، تحقیق کے میدان کی رکاوٹوں اور احمدی فرقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے پاکستان میں کام نہ کر سکنے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ان کے اوصاف پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مصنف کا پیش کردہ مواد ان کے ذاتی معلومات پر منحصر ہے یا براہ راست صاحب سوانح سے حاصل کیا گیا ہے اس لئے قابل یقین ہے۔ وہ ڈاکٹر سلام کو پختہ عزم کا مالک، کام کرنے کا دھنی، دن رات طبعی مسائل پر سوچ بچار کرنے والا، تمام مزاحمتوں کے باوجود اپنے کام کو تکمیل تک پہنچانے والا ثابت کرتے ہیں باوجود اس کے کہ ڈاکٹر سلام مادی علوم کے ماہر ہیں زندگی کا بڑا حصہ مغرب میں گزار چکے ہیں ان پر مذہب کا غلبہ ہے اپنے مذہبی ہونے کی سند کے طور پر انہوں نے داڑھی رکھ لی ہے اور کہتے ہیں کہ احمدی ہونے کے ناتے انہیں دائرہ اسلام سے تو خارج کر دیا گیا ہے لیکن انہیں سنت رسول سے روکا نہیں جا سکتا۔

یہ کتاب ثابت کرتی ہے کہ جس شخص میں توارث کی خوبیاں، تعلیم کی لگن اور ماحول کی مثبت لہروں کے ساتھ عزم اور لگن ہو وہ کارہائے نمایاں انجام دے کر دنیا کو ششدر کر سکتی ہے یہ بیک

وقت ڈاکٹر سلام کی سوانح بھی ہے اور ان کے سائنسی کارناموں کا جامع جائزہ بھی۔ مترجم نے کمال مہارت سے اردو میں پیش کیا ہے اور وہ بھی سائنس کے شعبہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس کے ترجمہ میں کامیاب رہے ہیں۔ آزادی کے بعد اردو سوانح نگاری کے باب میں ترجمہ کی روایت خال خال ہے۔

### حضرت خواجہ میر درد دہلوی : ڈاکٹر عبادت بریلوی : لاہور : ۱۹۸۳ء

خواجہ میر درد مسلم الثبوت استاد سخن کا درجہ رکھتے ہیں ان کے احوال اختصار کے ساتھ کتب تاریخ ادب اور قدیم تذکروں میں تو ملتے ہیں لیکن اتنے بلند پایہ شاعر اور صوفی کی سوانح عمری جس تفصیل اور جامعیت کی متقاضی ہے اس جانب خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کے مرتبہ کلیات کے مقدمہ نے اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کر دیا تھا ڈاکٹر عبادت بریلوی نے تمام شائع شدہ معلومات کے علاوہ درد اور ان کے خاندان کے افراد کی غیر مطبوعہ تحریروں سے استفادہ کرتے ہوئے جامع سوانح عمری تحریر کی ہے۔ تصنیف کے بارے میں مصنف نے اپنا رجحان بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"تیس چالیس سال خواجہ میر درد کی شاعری اور نثری تحریروں کے مطالعہ کے بعد یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی گئی ہے کہ اس عظیم صوفی درویش مفکر اور شاعر کی شخصیت اور شاعری پر جتنا تحقیقی اور تنقیدی کام ہونا چاہئے تھا وہ ابھی تک نہیں ہو سکا ہے اس احساس نے مجھے خواجہ میر درد کی شخصیت، شاعری اور افکار و خیالات پر کام کرنے کی طرف توجہ دلائی اور برسوں کی محنت کے بعد اس کے بارے میں یہ مبسوط کتاب پیش کرنے میں کامیاب ہوا اس میں خواجہ میر درد کے حالات، شخصیت، ماحول، تصانیف، تغزل، تصوف اور فن کا جائزہ تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے لیا گیا ہے۔" (٦٩)

مصنف بھی موجودہ دور کے اہم محقق ہیں جو ہمیشہ اپنے موضوع سے انصاف کرتے ہیں اس تصنیف میں بھی انہوں نے تحقیقی نقطۂ نظر سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے ان کے حقیقی ماخذات میں درد کے والد خواجہ ناصر عندلیب کی تصانیف نالۂ عندلیب (دو جلدیں) اور رسالہ ہوش فزا (قلمی) ان کے بھائی خواجہ میر اثر کی تصنیف بیان واقعی (قلمی) دیوان میر اثر (قلمی) کے علاوہ میر درد کی شعری اور نثری تصانیف دیوان میر درد (قلمی)، اسرار الصلوٰۃ (قلمی) واردات، نالہ درد، آہ سرد، شمع محفل، درد دل، رسالہ اربعہ، حرمت غنا، واقعات درد، سوز دل، دیوان درد



فارسی سے داخلی شہادتیں حاصل کر کے ان کے حالات زندگی شخصیت اور افکار کی تکمیل کی ہے۔

کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے ابتدائی ابواب میں حالات زندگی اور شخصیت کا مطالعہ سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور ادبی ماحول کے حوالہ سے کیا گیا ہے۔ خاندانی روایت کے طور پر تصوف سے شغف اور فقر و درویشی پر روشنی ڈالی گئی ہے ان کی قناعت پسندی کا حال یہ تھا کہ مال و زر کی تلاش کی غرض سے خراب سے خراب حالات میں بھی دہلی کو خیرباد نہیں کہا صاحب سوانح کی شخصیت کی تعمیر اس دور کے ماحول کے حوالے سے کی گئی ہے۔ اس بارے میں مصنف نے لکھا ہے کہ

"اس کتاب میں کوئی اور خوبی ہو یا نہ ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اسلامیان ہند کی فکری تاریخ، ان کے معاشرتی حالات، تہذیبی معاملات اور ادبی و شعری مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے غور و فکر کا خاصا سامان موجود ہے۔"

کوئی سوانح عمری اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ شخصیت کا مطالعہ خاندان اور ماحول کے پس منظر کے ساتھ نہ بیان کیا گیا ہو کیونکہ یہی فرد کی تعمیر و تشکیل میں مددگار ہوتے ہیں مصنف نے اس نکتہ کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب اسلوب ادیب ہیں ان کی تحریریں سنجیدہ اور باوقار ہوتی ہیں جو تحقیقی نوعیت کی سوانح عمریوں کے لئے ضروری ہیں۔

### ذوق، سوانح اور انتقاد : ڈاکٹر تنویر احمد علوی : لاہور : س ن (آزادی کے بعد)

دبستان دہلی میں ایک ہی زمانہ میں ذوق، مومن اور غالب گزرے ہیں۔ ان کی زندگی میں ذوق کے چرچے عام رہے اور وہی استاد شاہ تھے بلکہ استاد سخن بھی مانے جاتے تھے۔ غالب اور مومن کا درجہ ان کے بعد تھا۔ اس وقت کا معیار سخن کچھ اور تھا زمانہ کے ساتھ معیار اور ذوق بدلتے گئے اب غالب کو اپنے معاصرین پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے ذوق اور مومن پس منظر میں چلے گئے ہیں وہ تاریخ کا حصہ ہیں انہیں کسی حال میں فراموش نہیں کیا جا سکتا اس کے باوجود ان کے احوال و کلام پر جس قدر توجہ دی جانی چاہئے تھی نہیں دی گئی۔ تنویر احمد علوی نے ذوق کی زندگی کے واقعات کو توجہ اور تحقیق کا مستحق قرار دے کر یہ کاوش کی ہے ان کی راہ میں یہی رکاوٹ

نہیں تھی کہ ماخذات کی کمی تھی بلکہ یہ بھی کہ ان کے درمیان اختلافات بھی تھے اصل ماخذ آب حیات اور دیباچہ دیوان ذوق ہیں جو محمد حسین آزاد کے مرتبہ ہیں انہوں نے زندگی کے بہت سے گوشوں پر روشنی ہی نہیں ڈالی ہے بلکہ شاگرد ہونے کے اعتبار سے حسن عقیدت سے کام لیا ہے۔ منشی احمد حسین لاہوری نے "حیات ذوق ۱۸۹۰ء" میں ترتیب دی ان کے علاوہ بھی اس دور کے اور مابعد کے تذکروں میں ذوق کے تراجم شامل ہیں جو اختصار کی وجہ سے ضرورت کو پورا نہیں کرتے ان ماخذات میں واقعات کو بیان کرنے میں زمانی تقدیم و تاخیر اور منطقی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا۔ آزاد کے بیان کردہ واقعات آب حیات میں کچھ ہیں اور دیوان ذوق میں کچھ اور۔ ان تمام الجھنوں کو مد نظر رکھتے ہوئے محقق نے ان کا تجزیہ کرکے حقیقی صورت حال پیش کرنے کی کوشش کی ہے اپنی کوشش کے باوجود انہیں ذوق کے اجداد اور خاندان کے حالات کا علم نہ ہوسکا یہ باب ہنوز تشنہ ہے اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ ان کے والد کا نام شیخ رمضان تھا یا شیخ رمضانی اور وہ سپاہی پیشہ تھے یا کوئی اور کام کرتے تھے سال ولادت دہلی اردو اخبار نے ۱۲۰۳ھ لکھا ہے آزاد نے آب حیات میں ۱۲۰۳ھ درج کیا ہے جبکہ دیوان ذوق میں" ذی الحج ۱۲۰۴ھ لکھا ہے۔ محقق نے اپنے استدلال کے ذریعہ ۱۲۰۳ھ کو درست مانا ہے۔ ابتدائی حالات، تعلیم، شعر گوئی کا آغاز شاہ نصیر کی شاگردی اور ان سے اختلاف کے بارے میں محقق نے آزاد کی روایات پر بھروسا کیا ہے جزوی نکات یا زمانی تقدیم و تاخیر پر بحث کرنے کے علاوہ کسی نئی بات کا اضافہ نہیں کیا ہے۔ ولی عہد سے تعلق اور شاہ دہلی سے توسل کے بیان کا بھی یہی حال ہے۔ تنویر احمد علوی نے ایک غیر مکمل باب کی تکمیل کی کوشش ضرور کی ہے۔ ان کی کتاب تحقیقی اضافے کے بجائے موجود مواد کے تجزیاتی مطالعہ کی ہے اور اس حوالہ سے یقیناً" قابل تحسین ہے۔

## حیات وحشت : وفا راشدی : کراچی : ۱۹۸۳ء

بنگال کی سرزمین نے جن ممتاز اردو شاعروں کو پروان چڑھایا ان میں رضا علی وحشت بھی ہیں تاحال ان کے سوانح حیات غیر مکمل اور ان کا شاعری میں مرتبہ غیر متعین ہے۔ وفا راشدی نے اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے یہ مختصر کتاب لکھی ہے جو جامع نہیں ہے اس کے ابتدائی ۵۰ صفحات سوانح عمری کے لئے مختص کیے گئے ہیں اور اس سے ڈھائی گنا زیادہ صفحات ان کی شاعری کی خصوصیات کے بارے میں ہیں۔ سوانح حیات کے سلسلہ میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اسے جامع سوانح عمری نہیں بلکہ صرف سوانحی خاکہ کہا جاسکتا ہے۔ وحشت کے بارے میں جو باتیں



عام طور پر لکھی جاچکی ہیں انہیں کا اعادہ کیا گیا ہے۔ تحقیق کے ذریعہ اس میں اضافہ کی کوشش نہیں کی گئی۔ صاحب سوانح کی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات ہیں۔ مصنف شخصیت اوصاف اور کردار کے بارے میں قاری کو مطمئن کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔

## عبدالحق : مختار الدین احمد : نئی دہلی : ۱۹۸۴ء

مختار الدین احمد نے مطبوعہ ماخذات سے استفادہ کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی سوانح حیات مرتب کی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق مولوی عبدالحق ہاپوڑ سے لگی ہوئی چھوٹی سی بستی سراوہ میں پیدا ہوئے۔ (۷۰) ان کی کم عمری میں ان کا خاندان فیروز پور (پنجاب) کے اردگرد کے علاقوں میں منتقل ہوگیا اور مولوی صاحب نے پنجاب سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔(۷۱)

خاندان کی منتقلی کی بات صحیح ہے لیکن مولوی صاحب کا میٹرک کا امتحان پنجاب سے کامیاب کرنا حقیقت سے عاری ہے۔ ان کے والد شیخ علی حسین اسی علاقہ میں انسپکٹر مال مقرر ہوئے تھے۔ مصنف نے والدین کے اوصاف کے بارے میں لکھا ہے کہ

"ان کے والد ایسی سرکاری ملازمت میں تھے جہاں رشوت ستانی کا زور تھا۔ لیکن انہوں نے ساری زندگی اپنے پیر و مرشد کے ارشادات کو اپنے لئے مشعل راہ بنائے رکھا اور کبھی رشوت نہیں لی۔"

"عبدالحق کی والدہ بہت نیک اور عبادت گزار تھیں۔ گھریلو ذمہ داریوں کے علاوہ ان کے وقت کا بیشتر حصہ عبادت میں گزرتا تھا۔" (۷۲)

ان کے بھائی احمد حسن کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

"بھائی کے بچپن کا تذکرہ والدہ محترمہ بڑی خوشی اور فخر سے کرتی تھیں۔ شوخی شرارت اور لڑائی جھگڑا جو اکثر بچوں کی عادت ہوتی ہے۔ کم عمر عبدالحق اس سے دور تھے جب وہ بہت چھوٹے تھے تو ماں کے برابر نماز کی چوکی پر کھڑے ہونا ان کی نقل کرنا ان کا سب سے محبوب مشغلہ تھا۔ ذرا بڑے ہوئے تو کھیل کود کے بجائے لکھنے پڑھنے میں دل لگنے لگا مطالعہ کا جو شوق طالب علمی کے زمانہ میں پیدا ہوگیا تھا۔ وہ مرتے دم تک برقرار رہا اور اس کی بدولت انہوں نے وہ علمی کارنامے انجام دیئے جن سے وہ امر ہوگئے۔" (۷۳)

ایم اے او کالج علی گڑھ کے طالب علمی کے دور کے حوالہ سے ایک بات دلچسپ بیان کی گئی ہے وہ کالج کے یونیفارم سے متعلق ہے۔ سرسید نے طے کیا تھا کہ طلباء کا یونی فارم ترکی ٹوپی، ترکی وضع کا کوٹ، پتلون، پمپ شو ہونا چاہئے" چنانچہ انہوں نے کانپور کی کسی کمپنی سے گہرے رنگ کی

سرج کا ایک تھان منگوایا اور اس کے تین کوٹ سلوائے۔ ایک اپنے لئے ایک چھوٹے پوتے راس مسعود کے لئے اور ایک عبدالحق کے لئے۔"

"جب کوٹ تیار ہو کر آیا تو عبدالحق اس وقت سید محمود کے کمرے میں تھے انہیں بلایا گیا۔ درزی انہیں کوٹ پہنا چکا تو سید صاحب جھٹ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سلام کیا جس کے نصیب ایسے ہوں وہ اس پر فخر کرنے میں حق بجانب ہے۔ یہ سلام دراصل کالج کے یونیفارم کو تھا۔ عبدالحق کا کوٹ خواہ مخواہ نہیں تیار ہوا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ لباس پہن کر کالج کے طالب علموں کو دکھائیں اور پوچھیں کہ کالج کے لئے یہ قومی لباس انہیں پسند ہے کہ نہیں آخر کار یہ کالج کا یونیفارم طے ہو گیا۔" (۷۴)

کالج کے پرنسپل بیگ نے سرسید کے منتخب کردہ یونیفارم کی ترکی سے مناسبت کی وجہ سے اس کے رواج میں جو قدغن لگائی تھی اس کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔

مولوی صاحب کی ریاست حیدر آباد کی ملازمت انجمن ترقی اردو سے وابستگی' دہلی منتقلی اور پھر پاکستان ہجرت سے لے کر وفات تک کے حالات صرف چالیس صفحات میں بیان کئے ہیں مولوی صاحب نے جس قدر فعال زندگی گزاری اس کے پیش نظر اسے نہ تو تفصیلی اور نہ جامع سوانح عمری قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی نوعیت سوانحی خاکہ سے زیادہ نہیں ہے۔ کتاب کا تمام تر مواد مضامین سے لیا گیا ہے جو وقتاً "فوقتاً" رسائل میں شائع ہوتے رہے لیکن ان کا حوالہ دینے کی ضرورت مصنف نے محسوس نہیں کی۔ یہاں تک کہ کسی کا بیان واوین میں درج کیا ہے اس کا بھی حوالہ موجود نہیں ہے۔ مصنف کا سوانح نگاری کا رجحان سرسری نوعیت کا ہے۔ اس لئے کہیں بھی اختلافی امور کو نہیں چھیڑا ہے اور بغیر جواز بتائے کسی ایک کا بیان نقل کر دیا ہے۔

سوانح حیات کی نسبت عادات و خصائل پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ بیس صفحات کے اس باب میں مولوی صاحب کی گھریلو زندگی' فطرت کے حسن پر وارفتگی' باغ کی آرائش کا شوق' گھر کی نفاست کا خیال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مہمان نوازی' اچھے سے اچھا کھانا کھانے کا شوق' شاگردوں سے محبت' دوسروں کی مدد کا جذبہ' دادرسی' خودداری' بے نیازی' پابندی اوقات' قوت برداشت' شدت پسندی' محنت اور لگن کا حال واقعاتی شہادتوں سے بالتفصیل بیان کیا ہے۔ سوانحی حالات کے مقابلہ میں شخصیت نگاری کا فرض زیادہ احسن طریقہ سے ادا ہوا ہے۔



## سراج اورنگ آبادی' حیات' شخصیت اور فکر و فن : شفقت رضوی :

## کراچی : ۱۹۸۴ء

سراج اورنگ آبادی اردو کے ان شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جن کی زبان قدیم و جدید کی نقطۂ اتصال سمجھی جاتی ہے۔ ڈھائی سو سال قبل ایسی زبان میں شعر کہنا جو آج کی معلوم ہوتی ہے معجزے سے کم نہیں ہے۔ دکن کے شاعروں میں جنہیں استادی کا مرتبہ حاصل ہوا ان میں قلی قطب شاہ کے بعد ولی اور ولی کے بعد سراج ہی کا نام ملتا ہے۔ اور واقعہ یہی ہے کہ سراج ولی کے حقیقی جانشین تھے سراج کے حالات زندگی محتاج تحقیق تھے دکن میں لکھے گئے تذکروں میں ان کے مختصر احوال درج ہیں لیکن شمالی ہند کے تذکروں میں شاذ و نادر ہی ذکر ملتا ہے جو حقائق پر مبنی نہیں اور گمراہ کن ہے سراج کے حوالے سے ایک وقیع کام پروفیسر عبدالقادر سروری نے کیا تھا ان کے مرتبہ کلیات میں شامل طویل مقدمہ سراج کے حالات کے بارے میں ہے۔ انہوں نے زیادہ انحصار مطبوعہ ماخذات پر کیا ہے۔ شفقت رضوی نے متعدد تذکروں اور تواریخ سے استفادہ کرنے کے علاوہ ایک نئے ماخذ کو بھی تلاش کیا ہے۔ یہ "انوار السراج" ہے جسے سراج کے مرید ضیاء الدین پروانہ نے تحریر کیا تھا۔ مخطوطہ مرحوم تحسین سروری کی ملکیت تھا اس میں سراج اور پروانہ دونوں کے سوانح موجود ہیں۔ اس میں دیباچہ "منتخب دیوانہا" بھی شامل ہے جو سراج کی خودنوشت ہے اس کے بعض حصے تذکروں میں شامل ہیں۔ "منتخب دیوانہا" مکمل تا حال برآمد نہیں ہوا اس لئے اس میں شامل دیباچہ کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ شفقت رضوی نے انوار السراج کے مکمل متن مع دیباچہ منتخب دیوانہا شامل کتاب کر کے اسے پہلی بار شائع کیا ہے۔ سراج کے سلسلۂ رشد و ہدایت کے سلسلہ میں معلومات ان کے مرشد شاہ عبدالرحمٰن چشتی کی نسل کے لوگوں سے حاصل کی ہیں۔ اس طرح ان تمام ذرائع کو روبکار لا کر حیات و شخصیت کی تشکیل کی کوشش کی ہے جو دسترس میں تھے۔ باوجود اس کے نہیں کہا جا سکتا کہ موضوع تکمیل کی حد کو پہنچ گیا ہے اس میں تحقیق و تلاش کی گنجائش باقی ہے جو اس وقت مکمل ہو سکتی ہے جب نئے ماخذ بازیافت ہوں۔ بحالت موجود ہر ممکن ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مؤلف نے اکثر مسلمات کی مدلل تردید کی ہے۔ سراج کی تاریخ پیدائش کا تعین ان کے ایک قطعہ کے حوالے سے ۱۱۲۷ھ یا ۱۱۲۸ھ کیا جاتا رہا۔ انوار السراج میں پروانہ نے سراج کا تاریخی نام "ظہور احد" درج کیا ہے اور وضاحت کے ساتھ تاریخ ۱۳ صفر روز دو شنبہ ۱۱۳۴ھ درج

کی ہے اس حوالہ سے تاریخ پیدائش کا قطعی تعین ہوگیا ہے اور کسی بحث کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ بزرگوں کے بارے میں ایک سجع کا ذکر بھی ہے۔ "درویش گوہر پست زدریائے اولیاء" اس میں چار پشتوں کے نام آگئے ہیں۔ یعنی سراج ابن سید درویش ابن سید گوہر ابن سید دریا ابن سید اولیاء، سراج کی تعلیم و تربیت حالت جذب و بے خودی شاہ عبدالرحمٰن سے بیعت، ذریعۂ معاش، زمانۂ آخر میں مبتلائے آلام رہنا، دنیا داری سے اجتناب، غرض تمام کیفیات و احوال کی تفصیل بیان کردی گئی ہے۔

آخری باب تلامذۂ سراج کے ضمن میں متین برہانپوری، نثار اورنگ آبادی، ضیاء برہانپوری، عشرت، فتوت، کمتر، بے جان کے حالات بھی درج ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود قابل قدر دریافت ہیں جس سے مؤلف کے تحقیقی مزاج اور محنت کا پتا چلتا ہے۔

## علامہ سید سلیمان ندوی : محمد نعیم صدیقی ندوی : مکتبہ لکھنؤ : ۱۹۸۵ء

محمد نعیم صدیقی ندوی نے گورکھپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے جو مقالہ لکھا تھا اس کو "علامہ سید سلیمان ندوی" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ مقالہ نگار خود بھی ندوہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ ان کے والد اور نانا نے بھی وہیں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس طرح مقالہ نگار کے شعور و تعقل نے جس خاندانی ماحول میں آنکھ کھولی دن رات علامہ شبلی اور علامہ سلیمان ندوی کے چرچے ہوا کرتے۔ ان کی ذات سے صرف عقیدت کا جذبہ ہی نہ تھا بلکہ ندوہ اور دارالمصنفین نے جس طرز فکر و نظر کی بنیاد ڈالی تھی، اسلام سے جس محبت کا سبق دیا تھا، علوم اسلامی کو حیات نو عطا کرنے کی جو راہ کھولی تھی اور بزرگوں کے نقش قدم تلاش کرکے انہیں پیش کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا تھا مقالہ نگار نے انہیں حرز جان بنا کر سید صاحب کے لئے عقیدت کے چراغ روشن کئے ہیں۔ کتاب کی نوعیت تحقیقی اور علمی ہے۔ غیر معمولی محنت اور کدو کاوش سے واقعات اور ان کی جزئیات حاصل کی ہیں۔ ان تمام ماخذات سے استفادہ کیا ہے جو ۱۹۷۹ء تک شائع ہو چکے تھے۔ ان میں کتب، رسائل، اخبارات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ان سیکڑوں ماخذات کا نچوڑ اس مقالہ میں سمودیا ہے۔ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اس عہد اور ماحول پر تاریخی اور عمرانی نظر ڈالی ہے جس میں سید صاحب نے آنکھ کھولی، اس زمانہ کے تقاضوں اور رجحانات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ دوسرے باب کا ایک حصہ حیات اور دوسرا کردار و شخصیت کے بارے میں ہے۔ سوانحی حالات کے حوالہ سے زیادہ تفصیل میں نہیں



گئے ہیں۔ اہم واقعات کو تقریباً ۲۰ صفحات میں سمیٹ لیا ہے اور اس سے دوگنے صفحات کردار و شخصیت کے لئے وقف ہیں۔ سوانحی خاکہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے مضمون "حیات سلیمان" ابو ظفر ندوی کے مضمون "بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات" شاہ معین الدین ندوی کی کتاب "حیات سلیمان" احمد سعید کی کتاب "بزم اشرف کے چراغ" غلام محمد کی کتاب "تذکرۂ سلیمان" عبدالقدوس ہاشمی کے مضمون "سید سلیمان ندوی" غلام حسین کے مضمون "یگانۂ عصر صوفی" کے علاوہ سید صاحب کی تحریروں، خطوں وغیرہ کی مدد سے مرتب کیا ہے یہ تمام ماخذات معتبر اور مستند ہیں اسی لئے سوانح مختصر ہونے کے باوجود جامع اور حقائق پر مبنی ہے۔ کردار اور شخصیت کے حصے میں رئیس احمد جعفری، ابوالحسن علی ندوی، مالک رام اور غلام محمد کی تحریروں کو پیش کرکے سید صاحب کا سراپا بیان کیا ہے اس طرح دیگر اہل قلم حضرات کی نگارشات ان کی جامہ زیبی، دلکش ظاہری شخصیت کے بارے میں دی گئی ہیں۔ اوصاف اور کردار کے ہر پہلو کو مدنظر رکھا گیا اور انہیں مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ مقالہ کا تیسرا باب تصانیف کے تعارف اور ان پر تبصرے سے متعلق ہے اس میں نقوش سلیمانی، خیام، حیات شبلی، یادرفتگاں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ باب چہارم مکاتیب، شاعری، منفرد صحافت سے متعلق ہیں اس طرح سید صاحب کی زندگی اور کارنامے کے ہر گوشے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جامعات کے تحقیقی مقالوں میں ایک عام رجحان یہ ترقی پارہا ہے کہ کسی حقیقت یا تاثر کے بیان کے لئے دوسروں کے فرمودات و نگارشات کا سہارا ضرور لیا جائے اس طرح مقالہ نگار کا تاثر ان کے تابع بن کر رہ جاتا ہے۔ اس مقالہ کی بھی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ اس کا کوئی صفحہ حوالہ سے مبرا نہیں ہے۔ اگر تحقیق و اظہار کا یہی جامعاتی معیار ہے تو اس لحاظ سے خوب ہے۔

## بابائے اردو مولوی عبدالحق، حیات اور علمی کارنامے : شہاب الدین ثاقب کراچی : ۱۹۸۵ء

شہاب الدین ثاقب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم فل کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے "بابائے اردو مولوی عبدالحق، حیات اور علمی کارنامے" کے موضوع پر یہ مقالہ لکھا تھا۔ تحقیق کی نوعیت اور طرز تحریر کے اعتبار سے یہ واقعی اس معیار کا ہے۔

پہلے باب میں مولوی عبدالحق کے بزرگوں کے حالات، وطن، مولوی صاحب کے مولد، تاریخ ولادت، ابتدائی تعلیم، شادی، ملازمت جیسے اہم واقعات سے متعلق تمام سابقہ تحریروں کا جائزہ

لیا ہے اور غلط روایات کا استرداد کر کے مستند ماخذات کی روشنی میں حقائق کی چھان بین کی ہے۔ ہمارے محققین مطبوعہ، غیر مطبوعہ کتابوں، مضامین، خطوط اور زبانی بیانات پر انحصار کرتے ہیں اور ابھی تک ان روایتی ماخذات سے ہٹ کر غیر روایتی ماخذات تک رسائی حاصل کرنے کا رجحان عام نہیں ہوا ہے۔ مقالہ نگار نے تمام روایتی ماخذات کے علاوہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، محمڈن کالج ڈائرکٹری (مرتبہ محمد طفیل منگلوری) جیسے غیر روایتی ماخذات سے معلومات حاصل کی ہیں جو بلاشبہ مستند ہیں۔

مقالہ نگار نے ہر اختلافی امر پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جیسے مولوی صاحب کے والد کے نام میں اختلاف ہے مولوی صاحب کے چھوٹے بھائی احمد حسن اور ان کے برادر زادے محمد حسین کے علاوہ چند بزرگوں کے بیان کے مطابق ان کے والد کا نام علی حسین تھا۔ مقالہ نگار نے مولوی صاحب کے بیان کو تسلیم کرتے ہوئے نام علی حسن قرار دیا ہے۔ (۷۵)۔ اسی طرح ان کی تاریخ پیدائش میں بھی اختلاف رہا۔ تمام اہل قلم نے ۱۸۷۰ء سال پیدائش قرار دیا ہے لیکن مختلف تاریخیں بیان کی ہیں۔ مقالہ نگار نے اس معاملہ میں بھی مولوی صاحب کی تحریر دریافت کی ہے۔ انہوں نے ۶ مئی ۱۹۳۶ء کو بندوق کا لائسنس حاصل کرنے کے لئے جو فارم پر کیا تھا اس میں اپنی تاریخ پیدائش ۲۰ر اگست ۱۸۷۰ء لکھی تھی یہی اس کی صداقت کا ثبوت ہے۔ اکثر سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب نے پنجاب سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ مقالہ نگار نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابت ۲۸ر اپریل ۱۸۹۱ء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مولوی عبدالحق نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے ۱۸۹۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے انٹرنس کے امتحان میں شریک ہو کر فرسٹ ڈویژن سے کامیابی حاصل کی تھی۔ (۷۶)

مولوی صاحب کی شادی بھی متنازع مسئلہ ہے۔ مقالہ نگار نے ہفت روزہ "ہماری زبان" دہلی بابت ۲۲ر جولائی ۱۹۶۸ء میں شائع ہونے والے ایک مضمون کے حوالے سے جس میں ہارون احمد کا بیان شامل ہے لکھا ہے کہ ان کی کم عمری میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا مولوی صاحب نے شادی کے چند دنوں بعد بیوی کو طلاق دے دی تھی اور ہارون احمد کے والد سے کہا تھا کہ وہ شادی کرلیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

سرسید احمد خان کے فیض صحبت کا جو اثر مولوی صاحب کے کردار اور عمل پر پڑا ہے اس کا بھی جائزہ لیا ہے انتھک محنت اور کام کی لگن کے اعتبار سے مولوی صاحب سرسید ثانی کہے جا سکتے ہیں۔



یہ سوانح عمری تحقیقی رجحان کی حامل ہے مقالہ نگار نے کسی بات کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ زیادہ سے زیادہ معلومات جزئیات کے ساتھ تسلسل میں بیان کی ہیں۔ ماخذات کی نشاندہی ہر جگہ کی گئی ہے۔ صرف اختلافی امور کا ذکر نہیں کیا بلکہ استدلال اور ثبوت کے ساتھ صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔

## تذکرۂ سلیمانی : غلام محمد : کراچی : ۱۹۸۵ء

تذکرۂ سلیمانی کے مصنف مولانا غلام محمد، علامہ سید سلیمان ندوی کے ارادت مند اور مرید خاص تھے۔ اپنے تعلق خاص کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں کہ

"یوں تو روز اول ہی سے حضرت شیخ کی خصوصی توجہات میرے شامل حال رہیں لیکن سچ یہ ہے کہ انہی کی مقناطیسی توجہ نے اس ذرۂ ناچیز کو اپنی طرف کھینچا مگر کراچی کا سہ سالہ قرب تو میری زندگی کا سب سے قیمتی حصہ تھا اس پوری مدت میں حضرت والا نے مجھے ہمیشہ اپنے دامن سے چمٹائے رکھا گو میں ان کی کفش برداری کے لائق بھی نہ تھا خلوت و جلوت میں، سفر و حضر میں، حتیٰ کہ جمعہ و عیدین ہی میں نہیں بلکہ تراویح کی نماز اور فریضۂ قربانی کی ادائیگی تک میں ہمیشہ اپنے اس خادم کو اپنے ساتھ ہی رکھا۔" (۷۷)

ساری زندگی نہ سہی چند سال ضرور مولانا غلام محمد نے علامہ کے ساتھ اسی طرح گزارے تھے جس طرح باسول نے جانسن کے ساتھ۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ جو جوش عقیدت ان میں ہے وہ شاید باسول میں نہیں تھا اپنے ممدوح کے حالات زندگی معلوم کرنے کے لئے مستند اہل علم کی تحریروں سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان خطوط کو جو علامہ نے اپنے احباب کو لکھے تھے انہیں حاصل کر کے ان سے بھی روشنی حاصل کی ہے۔

سوانحی حالات کو تاریخی ترتیب میں بیان کیا ہے۔ پہلے باب میں ولادت سے شباب تک کے حالات دوسرے باب میں شباب سے آغاز پختہ عمر تک، تیسرے باب میں تلاش شیخ کا احوال ہے۔ اس خصوص میں علامہ کے خطوط کے علاوہ ان کے پیر و مرشد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے خطوط بھی شامل کر کے واقعات پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ چوتھا باب حضرت تھانوی سے بیعت کرنے، ان کے خلیفہ مقرر ہونے اور حضرت کی وفات تک کے حالات ہیں، پانچواں باب دارالمصنفین سے بے تعلقی اور قیام بھوپال کے بارے میں ہے۔ چھٹا باب پاکستان کو ہجرت کرنے اور یہاں کے دوران قیام سے رحلت تک کے واقعات پر مشتمل ہے، ان

چھ ابواب میں زندگی کے تمام پہلوؤں کو واضح کردیا گیا ہے۔ ساتویں باب میں ان کے خصوصی کمالات، عادات و اطوار، مزاج اور ذوق سے بحث کی گئی ہے۔ اس طرح سوانح عمری بھی مکمل ہوگئی ہے اور شخصیت نگاری کا حق بھی ادا ہوگیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں اپنے ذاتی مراسم اور خط و کتابت کو درج کیا ہے۔

معلومات کے لحاظ سے "تذکرۂ سلیمانی" نہایت وقیع اور بیش بہا ہے۔ مصنف نے اس ضخیم کتاب کی تیاری کے لئے یقیناً جانکاہی اور دلجوئی سے مواد اکٹھا کیا ہے۔ فن کے لحاظ سے حسن ترتیب بھی موزوں اور مناسب ہے لیکن ایک بات کھٹکتی ہے کہ سوانح عمری لکھتے ہوئے مصنف نے اپنی ذات کو بے تعلق نہیں کیا ہے اور جہاں بھی علامہ سید سلیمان ندوی کا ذکر کرتے ہیں بھاری بھر کم القاب سے جوش ارادت کا اظہار بھی کرتے جاتے ہیں حالانکہ علامہ نے اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی کی سوانح عمری لکھی تھی تو باوجود اس کے کہ وہ بھی اس دریائے ارادت و عقیدت میں غرق تھے اپنی تحریر کو الفاظ سے گراں بار نہیں کیا تھا۔ اگر مصنف نے غیر جانبدار رہتے ہوئے عقیدت کے جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر یہ سوانح عمری لکھی ہوتی تب بھی ان کی ارادت و عقیدت پر حرف نہ آتا۔

مولانا غلام محمد نے "علامہ سید سلیمان ندوی اور حیدر آباد آصفی" کے نام سے ایک اور کتاب تحریر کی ہے یہ علامہ کے سوانحی حالات کے ایک حصے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں علامہ کو ریاست حیدر آباد سے جو خصوصی لگاؤ تھا اس کا حال بھی ملتا ہے اور نظام سابع نے ان کی کتنی قدر و منزلت کی اس کے احوال سے بھی آشنائی ہوتی ہے۔ علامہ نے مختلف اوقات میں حیدر آباد دکن کے دورے کئے۔ ان کے دوران ان کی جو مصروفیات رہیں وہ بھی بیان کی گئی ہیں۔ یہ ایسی معلومات ہیں جن سے مستقبل کا سوانح نگار استفادہ کرسکتا ہے۔

**آغا حشر کاشمیری : ڈاکٹر مسز شمیم ملک : لاہور : مارچ ۱۹۸۶ء**

آغا حشر کاشمیری بیک وقت شعلہ نوا مقرر بھی تھے۔ اچھے بدیہہ گو شاعر بھی، عظیم ڈراما نگار بھی اور اعلیٰ پایہ کے مزاح نگار بھی۔ ان کے حالات زندگی اور خدمات کے بارے میں مسز شمیم ملک نے تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ مقالہ نگار کا ادعا ہے کہ

"آغا حشر کے تمام سوانح نگاروں نے ان کے حالات زندگی ترتیب دینے میں تقریباً" یکساں اسلوب اختیار کیا ہے۔ میں نے قدرے مختلف انداز میں ان کی سوانح حیات لکھی ہے اور ان



کے فن پر بحث کو بھی ایک نیا انداز دیا ہے۔" (۷۸)

لیکن اپنے نئے انداز کی وضاحت نہیں کی ہے۔ کتاب پانچ ابواب (۱) حالات زندگی (۲) آغا حشر سے قبل ڈرامائی فن کا ارتقا (۳) آغا حشر کے ڈرامے (۴) آغا حشر کی ڈراما نگاری (۵) آغا حشر کی شاعری پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں متعدد ضمنی عنوانات ہیں۔ پہلے باب میں جو تقریباً" ستر صفحات پر پھیلا ہوا ہے براہ راست سوانحی حالات بیان کئے ہیں جن میں خاندان، ولادت، بچپن، شادی اور اولاد، والدہ سے محبت و عقیدت، دوست اور خدمت گار، رہن سہن، شخصیت، انداز گفتگو، حسن پرستی، ارادے کی پختگی، ترک مے نوشی وغیرہ کے بارے میں تمام موجود ماخذات سے استفادہ کے علاوہ بصورت اختلاف صحیح صورت حال کی پیش کش کے لئے دقت نظری اور تحقیق کی جانکاہی سے کام لیا ہے، آغا صاحب کے جائے پیدائش میں اختلاف تھا، بعض سوانح نگاروں نے بنارس اور بعض نے امرتسر بتایا ہے۔ مقالہ نگار نے ان سب کا حوالہ دیا ہے اور شخصی طور پر آغا صاحب کے واقف کاروں سے معلومات حاصل کی ہیں۔ انہوں نے خم خانہ جاوید (سری رام) ناٹک ساگر (نور الٰہی و محمد عمر) تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ) کے حوالہ سے امرتسر کو جائے پیدائش قرار دیا ہے کیونکہ یہ کتابیں آغا صاحب کی زندگی میں شائع ہوچکی تھیں اور اس معاملہ میں ان کے بیانات کی انہوں نے تردید نہیں کی تھی۔

ان کی تاریخ پیدائش میں بھی اختلاف ہے۔ علم الدین سالک (تجلیات حشر) آغا اشکر (ہفت روزہ نگار کراچی، ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۵ء) عشرت رحمانی (اردو ڈراما کا ارتقا) نے سال پیدائش ۱۸۷۶ء بتایا ہے جبکہ امتیاز علی تاج (ماہنامہ ارمان جولائی ۱۹۳۵ء) نے ۱۸۸۰ء اور آغا محمود شاہ (نیرنگ خیال سالنامہ ۱۹۳۶ء) ڈاکٹر عبدالعلیم نامی (اردو تھیٹر) جاوید نہال (مجلہ قند، ڈراما نمبر ۱۹۶۱ء) اور محمد اسماعیل پانی پتی (رسالہ نقوش غزل نمبر ۱۹۵۶ء) نے ۱۸۷۹ء کو سال پیدائش قرار دیا ہے۔ سوانح نگار نے ان سب کی صداقت یا عدم صداقت پر بحث کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

"ان تمام قرائن کو یکجا کیا جائے تو صحیح تاریخ پیدائش ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ مطابق ۳ اپریل ۱۸۷۹ء ہوگی۔" (۷۹)

آغا صاحب کی سیادت سے سوانح نگار نے انکار کیا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے احوال با تفصیل دیئے ہیں اور انکشاف کیا ہے کہ ۱۸۹۷ء میں جب وہ آٹھویں جماعت میں تھے تو انہیں شاعری اور موسیقی سے لگاؤ پیدا ہوا۔ وہ والد سے چھپ کر ان دلچسپیوں کو جاری رکھتے تھے۔ ان کا پہلا ڈراما "آفتاب محبت" ۱۸۹۷ء میں لکھا گیا جو اسٹیج تو نہیں ہوا لیکن کتابی صورت میں شائع ہوا۔ ڈراما

سے دلچسپی کے ساتھ آغا صاحب کی توجہ تعلیم سے ہٹ گئی اور وہ بمبئی جا کر تھیٹریکل کمپنیوں سے وابستہ ہو گئے۔

مصنفہ نے ہر موضوع پر داد تحقیق دی ہے اور صحیح صورت حال پیش کرنے کی سعی کی ہے جس میں وہ کامیاب ہوئیں۔ زندگی کے واقعات اگرچہ مختصر ہیں ان پر مباحث سیر حاصل ہیں۔ اس طرح فطری صداقت کے ساتھ سوانح عمری مرتب کرنے کا حق ادا ہوا ہے۔

حالات زندگی کے علاوہ مصنفہ نے ان کی سیرت کردار اور مشاغل پر بھی روشنی ڈالی ہے اور مختلف حوالوں سے لکھا ہے کہ

"آغا حشر پُر تاثیر اور مزاحیہ گفتگو کرتے' ان کا دل کش انداز دوسروں کا دل موہ لیتا' اپنی دل نشین گفتگو کے باعث جان محفل بن جاتے۔ خشک موضوعات کو لطیفوں اور پھبتیوں سے رنگین بنا دیتے۔ ان کی گفتگو میں خود ستائی کا عنصر پایا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک اپنی تعریف آپ کئے بغیر بلند مقام حاصل کرنا ناممکن تھا۔ بھری محفل میں بھی شیخیاں بگھارنے سے گریز نہ کرتے۔ اپنی تعریف کروانے میں فخر محسوس کرتے اور انڈین شیکسپیئر کہلواتے رہنا اپنا حق سمجھتے۔" (۸۰)

وہ شعلہ نوا مقرر تھے اور مذہبی مناظرہ میں خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ مشہور اہل قلم نے آغا صاحب کا جو حلیہ بتایا ہے وہ بھی درج ہے۔

یہ سوانح عمری تحقیقی نوعیت کی ہے اور اس انداز کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ دیگر ابواب میں فن ڈراما نگاری اور شاعری کا جائزہ لیا ہے۔

**مخدوم محی الدین' حیات اور کارنامے : شاذ تمکنت : حیدر آباد دکن : ۱۹۸۴ء**

مخدوم محی الدین ترقی پسند شاعروں کے ہراول دستے میں شامل تھے۔ اسی طرح اشتراکی تحریک کے سرخیل بھی تھے۔ اشتراکیت سے ان کی وابستگی نظریاتی نہیں بلکہ عملی تھی۔ انہی کی رہنمائی میں "تلنگانہ" تحریک نے جنم لیا اور کامیاب ہوئی تھی۔ حیدر آباد دکن میں "مخدوم" ایک داستانی کردار رہے ہیں۔ نئی نسل میں جو چالیس کی دہائی میں جوان ہوئی بے حد مقبول تھے۔ انہیں نہ تو شہرت سے دلچسپی تھی اور نہ ذاتی مفادات کا خیال اس لئے مقبولیت کے باوجود ان کے کوائف زندگی پر گہرے پردے پڑے رہے۔ مخدوم پر پہلے بھی ایم اے کا ایک مقالہ داؤد اشرف نے لکھا تھا جو مصنف کی محنت کے باوجود تشنہ تھا شاذ تمکنت صاحب سوانح کے دوست تھے۔ روز مرہ کی ملاقاتوں کے علاوہ شہر شہر کے مشاعروں میں رات دن کا ساتھ رہا تھا وہ ان کی شخصیت



سے تو واقف تھے لیکن حالات سے واقف ہونے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ مخدوم کے انتقال کے بعد اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے لئے "مخدوم محی الدین۔ حیات اور کارنامے" کا انتخاب کیا اور ۱۹۸۳ء میں ڈگری حاصل کی۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں سوانح عمری اور شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ انداز محققانہ رکھا ہے۔ جزیات کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے تگ و دو سے کام لیا ہے۔ مخدوم کے اعزا و اقربا' ان کے خاندانی دستاویزات اور مسودات و بیاضات سے استفادہ کیا ہے۔ اس لئے واقعات کی صحت پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ جن امور میں اختلاف پایا ہے ان پر شواہد کی روشنی میں بحث کی ہے۔ مثلاً "مخدوم کے سال پیدائش میں اختلاف تھا۔ خود مخدوم نے ایک انٹرویو میں ۱۹۱۰ء کو سال پیدائش بتایا ہے۔ مرزا ظفر الحسن نے "عمر گزشتہ کی کتاب" میں ایک سے زائد اور سنین کے حوالے دیئے ہیں۔ محقق نے خاندانی قدیم بیاض کو مستند مانا اور اس کے حوالے سے ۴ فروری ۱۹۰۸ء کو صحیح سال بتایا ہے۔ بعض امور ہنوز متنازع ہیں۔ محقق نے ان پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ مخدوم کو ایک سال حاضری کی کمی کی وجہ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان دینے سے روک دیا گیا تھا۔ اس کی ذمہ داری مولانا مناظر احسن گیلانی پر ڈالی گئی ہے اور مخدوم کے ہم جماعت یحییٰ صدیقی کے اس بیان کو قابل اعتنا نہیں سمجھا جو رسالہ صبا کے مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء میں شامل ہے۔ جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مولانا مناظر احسن سے کلاس لے لی گئی تھی اور ان کی جگہ ایک نئے مولوی صاحب پڑھانے لگے تھے جن کے ساتھ شوخی و شرارت کے نتیجہ میں مخدوم سمیت آٹھ طالب علموں کی حاضری کم کر کے امتحان دینے سے روک دیا گیا تھا۔ مخدوم کے جامعہ کے ساتھی اور عزیز دوست مرزا ظفر الحسن نے عمر گزشتہ کی کتاب میں دینیات کے نئے استاد کا نام مولوی عبد المقتدر لکھا ہے۔ (۸۱) سوانح عمری کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ سوانح نگار کے پیش نظر تمام سابقہ تحریریں ہوں۔ اگر کسی بھی روایت سے اختلاف ہو تو اس پر شواہد یا استدلال کے ساتھ بحث کی جائے اور کسی نتیجہ پر پہنچا جائے۔ اختلافی امور سے صرف نظر سہل نگاری ظاہر کرتی ہے اور یہ عام رویہ بن گیا ہے۔ مخدوم کا زمانہ کوئی بہت پرانا زمانہ نہیں کہ حقائق معلوم کرنے میں دشواری ہو اس لئے سرسری طور پر چار یا پانچ شہروں کے نام لکھ دینا کہ وہاں اسکول کی تعلیم حاصل کی سوانحی تقاضے کو پورا نہیں کرتا۔

سوانحی کوائف مفصل ہیں۔ شخصیت نگاری پر بھی زور دیا گیا ہے اور یہی زمانہ حال میں روش بن گئی ہے۔

## شاعر خوش نوا (سچل سرمست، شخصیت اور شاعری) : آفاق صدیقی

## کراچی : اپریل ۱۹۸۶ء

سرزمین سندھ کے مشہور شاعر عبدالوہاب سائیں سچل سرمست ہر دور میں مقامی اور بین الاقوامی طور پر ان عالموں اور محققوں کی توجہ کا مرکز رہے ہیں جنہیں تصوف سے دلچسپی رہی ہے اس کے فکر و فن پر متعدد عالمی زبانوں میں مقالے لکھے گئے ہیں۔ مستشرقین میں ڈاکٹر ایچ ٹی سوالے اور ٹرمپ نے بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ سندھی ادبی بورڈ نے "سچل سرمست جو رسالو" کی صحت کے ساتھ تدوین کر کے ایک مبسوط مقالہ افتتاحیہ کے ساتھ شائع کیا تھا یہ ان کے تعارف کے کام کی توسیع میں اہم اقدام تھا۔ آفاق احمد صدیقی جنہوں نے ایک طویل عرصہ سندھ کے اندرونی علاقوں میں گزارا سندھی زبان اور ثقافت کا قریب سے مطالعہ کیا اور اس کے پس منظر کے ساتھ شاعری کی روایت کو پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ سچل سائیں کے ممدوحین میں شامل ہیں ان کا یہ اقدام سائیں کی شخصیت اور فن کو اردو دان طبقے تک پہنچانے 'ایک ادبی خدمت کے ساتھ سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی بڑھانے کی کوشش ہے۔ ابتدا میں سچل سائیں کی سوانح عمری تحریر کی ہے لیکن ماخذات کی واضح نشاندہی نہیں کی۔ جہاں کہیں ماخذ کا حوالہ موجود ہے تفاصیل غیر موجود ہیں۔ یہ بات تحقیق کے جدید اصول کے منافی ہے اور قاری کے ذہن میں شکوک پیدا کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق سچل سائیں کے جد امجد شیخ شہاب الدین محمد بن قاسم کے ساتھ مشیر کے طور پر آئے تھے اور یہاں ایک علاقہ کے گورنر مقرر کئے گئے تھے۔ ان کی وفات ۹۵ھ میں ہوئی۔ سچل کے دادا خواجہ محمد حافظ (۱۶۹۷ء۔۱۷۸۸ء) تھے۔ جو شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ہم عصر تھے اور میاں صاحب ڈنہ کے نام سے معروف تھے۔ ان کی اولاد میں خواجہ صلاح الدین اور خواجہ عبدالحق تھے۔ سچل سائیں' خواجہ صلاح الدین (۱۷۰۶ء۔۱۸۰۰ء) کے فرزند تھے جو ۱۱۵۲ھ م ۱۷۳۹ء میں پیدا ہوئے تھے بچپن ہی میں شاہ بھٹائی نے انہیں دیکھ کر پیش گوئی کی تھی کہ "ہم نے جو دیگ چڑھائی ہے اس کا ڈھکنا یہ خوش خصال اتارے گا۔" ان کی تعلیم و تربیت اس انداز کی ہوئی کہ ان میں خدا ترسی' انسان دوستی اور خدمت خلق کے جوہر نمایاں ہوتے گئے۔ صوم و صلوٰۃ اور شرعی احکامات پر سختی سے کاربند رہے۔ رفتہ رفتہ جذب و کیف روحانی سوز و سرور اور وجد و استغراق کا غلبہ بڑھتا گیا۔ یہاں تک اکثر ان پر خود رفتگی کا عالم طاری رہتا۔ ظاہری خدوخال کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ ان کا



چہرہ نورانی' صاف اور سفید رنگ تھا۔ چہرے کے نقوش دلکش تھے۔ چشم آہو صفت تھے' گیسو دراز تھے جو پیشانی کے بیچ میں جوڑے کی طرح بندھے رکھے جاتے تھے۔ ریش مبارک سفید اور گھنی تھی۔ قد درمیانہ تھا۔ ہمیشہ سفید پوش رہتے' سر پر سبز فقیرانہ کلاہ ہوتا کبھی حالت جذب میں اور کبھی عالم جلال میں شعر کہتے تھے۔ اپنے کلام کو خود صفحۂ قرطاس پر منتقل نہیں کرتے تھے بلکہ خواجہ عبدالحق نے جو ان کے چچا بھی تھے اور خسر بھی جو خادم ان کی خدمت پر مامور کر رکھے تھے وہی تحریر کا فرض ادا کرتے تھے۔ علوم ظاہری و باطنی کے حصول میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اپنے وقت کے جید عالم اور صوفی خدا رسیدہ شمار ہوتے تھے۔ سندھی اور سرائیکی ان کے گھر کی زبانیں تھیں۔ ان کے علاوہ عربی' فارسی' اردو' پنجابی' ہندی زبانوں پر کامل قدرت رکھتے تھے کہ ان میں بھی شعر کہہ سکتے تھے۔ انہیں شاعر ہفت زبان بجا طور پر کہا جاتا ہے۔ آفاق صدیقی نے محنت سے تحقیق کے بعد ان کے حالات اور کردار کو پیش کرتے ہوئے کمالات شاعری اور مزاج صوفیانہ پر تبصرے کئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "شاہ جو رسالو" کے سندھی کلام کے تجزیاتی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان جدید سندھی سے قریب تر ہے اور سچل سائیں نے وہی ہیئت اختیار کی ہے جو اس سرزمین میں رائج تھی۔ انہوں نے شاعری میں کلاسیکی اصناف یعنی بیت اور کافی کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ ان میں فنی اور فکری لحاظ سے جدت و ندرت پیدا کی۔ اس میں موسیقی اور شاعری دونوں فنون کے رموز سما گئے۔ دوہوں اور بیتوں کی ساخت میں روایتی اسالیب کی پاسداری کی اور عروض میں عربی و فارسی روایات کو مقامی رنگ و آہنگ میں پیش کیا۔ وہ سندھی شاعری میں عربی' فارسی' ہندی کے الفاظ بے تکلفانہ استعمال کر جاتے ہیں۔ سندھی شاعری میں "جھولنو" کی صنف کی ابتدا کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے۔ صوفیانہ خیالات کے اعتبار سے وہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔

آفاق صدیقی نے سچل سائیں کے ہر روپ کا جائزہ لیا ہے اور ان کی سرائیکی سندھی اور فارسی پر بھرپور تبصرہ کیا ہے ایک بڑا حصہ ان کے کلام کی خصوصیات کا احاطہ کرتا ہے اسی میں ان کا رازنامہ' وصیت نامہ' رہبر نامہ' دردنامہ' وحدت نامہ' تارنامہ' گدازنامہ' عشق نامہ' غزل' بحر طویل' نکات تصوف اور اردو کلام بھی شامل ہیں۔

## اکبر الہ آبادی' تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ : خواجہ محمد زکریا : لاہور ۱۹۸۶ء

یوں تو اکبر الہ آبادی اور ان کے طرز فکر و اظہار پر کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں صفدر

مرزا پوری کی مشاط سخن' طالب الہ آبادی کی "اکبر الہ آبادی" عشرت حسین کی "حیات اکبر" عبدالماجد دریا بادی کی "اکبر نامہ" اور نذیر لدھیانوی کی "لسان العصر اکبر الہ آبادی" قابل ذکر ہیں۔ سوانح کی حد تک عشرت حسین کی کتاب زیادہ معتبر اور معلومات افزا ہے لیکن جیسا کہ خواجہ محمد زکریا نے متعدد جگہ نشاندہی کی ہے مطبوعہ کتاب مسودہ کے مطابق نہیں ہے اور اس میں تحریف کی گئی ہے۔ خواجہ محمد زکریا نے نیشنل میوزیم کراچی میں مخزونہ اصل مسودہ اور دو ہزار سے زائد خطوط کی روشنی میں اکبر کے سوانحی حالات اور ان کے طرز فکر کا جائزہ لیا ہے۔ ماخذات کا جس تفصیلی طور پر مطالعہ کر کے اس کی مشمولات سے استفادہ کیا گیا ہے اس سے مصنف کی دقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق اکبر کا تاریخی نام "خورشید عالم" تھا جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا سن ولادت ۱۲۶۱ ہجری ہے اس پر اتفاق ہے لیکن اس کی مطابقت سن عیسوی میں اکثر اہل قلم نے درست نہیں کی ہے۔ مصنف نے اسے اکتوبر ۱۸۴۵ء قرار دیا ہے۔ البتہ تاریخ کے تعین کے امکان سے معذوری ظاہر کی ہے۔ مقام پیدائش کے بارے میں بھی اکثر لکھنے والوں میں اختلاف ہے۔ اس بارے میں مصنف نے طالب الہ آبادی کے بیان کو مستند قرار دیا ہے کہ وہ "الہ آباد کے قریب ایک نہایت معمولی سے موضع میں جس کا نام بارہ ہے" میں پیدا ہوئے۔ اس طرح متعدد غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق اکبر کو اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی پر کامل عبور حاصل تھا۔ آخر زمانہ میں عربی میں استعداد پیدا کرنے کے لئے انہوں نے ایک معلم کی خدمات بھی حاصل کی تھیں۔ سلسلۂ ملازمت کی مکمل تفصیل بھی دی ہے۔ ازدواجی زندگی اور اولاد کا حال بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ انہیں عشرت حسین سے جو محبت تھی اس کا اظہار ان کے خطوط سے ہوتا ہے ایک بیٹے ہاشم کو وہ سب سے زیادہ چاہتے تھے جس نے نوجوانی میں وفات پائی۔ بڑھاپے میں یہ صدمہ ان کے لئے ناقابل برداشت تھا البتہ ان کا سلوک اپنی پہلی بیوی اور ان سے ہونے والی اولادوں نذیر حسین اور عابد حسین کے ساتھ اچھا نہیں رہا۔ ہر شخص کی زندگی میں کوئی نہ کوئی قابل اعتراض پہلو ضرور ہوتا ہے' یہ اکبر کی سیرت کا تاریک گوشہ ہے اس کی بظاہر وجہ بیوی کے مزاج سے عدم مطابقت ہی معلوم ہوتی ہے زندگی کے آخری دور میں ریٹائرمنٹ کے بعد مالی پریشانیوں اور صحت کی خرابی کے علاوہ دیگر آلام کا حال بھی ان کے محفوظ خطوط سے اخذ کیا گیا ہے۔ افکار اور خیالات کے اعتبار سے ان کی جو اصول پسندی تھی وہ ان کے عدالتی فیصلوں کے حوالہ سے شامل کتاب کی گئی ہے۔ مقدمات کے فیصلہ میں وہ بڑی سے بڑی شخصیت کی خواہش یا حکم کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور فیصلہ ہمیشہ حقائق کی



روشنی میں کرتے تھے۔

اکبر کی شاعری پر بھی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ وہ قدامت پرست تھے اور ہر جدید نظریہ اور علم کے مخالف تھے۔ انہیں جدید ایجادات کی مخالفت کا بھی مجرم گردانا گیا ہے۔ مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ المیہ اکبر کا ہے بلکہ سراسر الزام ہے۔ دراصل وہ مغرب پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر بند باندھنا چاہتے تھے اور طرز معاشرت میں مغرب کی نقل کے مخالف تھے جہاں تک جدید علوم' طبعی سائنس اور ٹیکنالوجی کا تعلق ہے وہ ان کے مخالف نہیں تھے۔ ان کا محتاط انداز بیان غلط فہمی کا موجب ہے۔ وہ ایسے مزاح نگار بھی نہیں تھے کہ ان کے اشعار کو محض تفریح طبع کا ذریعہ سمجھا جائے بلکہ اس میں مقصدیت بھی بے پناہ تھی وہ ہر اچھی روایت کے حامی اور بری کے مخالف تھے۔ سرسید کی کوششوں سے مسلمانوں میں تعلیم عام ہوئی ساتھ ہی مغرب پرستی اور سرکار پرستی کی برائیاں پیدا ہوئیں۔ اکبر نے سرسید کی مساعی اور ان کی محنت کی داد دی لیکن حاصل شدہ نتائج سے عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ رعایت لفظی اور نئے نئے قوافی ایجاد کرنے کے تو وہ شہنشاہ تھے۔

اکبر کے حالات وافکار کا اس قدر وسیع جائزہ اس کتاب میں موجود ہے جو کسی تشنگی کو باقی نہیں رہنے دیتا اور محقق کی تلاش و جستجو اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔

## صہبائی' ایک مختصر تعارف : ڈاکٹر محمد انصار اللہ : علی گڑھ : ۱۹۸۶ء

فارسی کے مانے ہوئے عالم کامل امام بخش صہبائی کی علمی ادبی خدمات بے توجہی کی شکار ہیں۔ ان کے بارے میں معلومات کا فقدان ہے اور تحقیق و تلاش کی کاوشیں بھی نہیں کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر انصار اللہ نے زیادہ تر مطبوعہ مواد کو یکجا کر کے صہبائی کے حالات زندگی اور ادبی خدمات کا جائزہ لینے کی کوششیں کی ہیں اور وہ اس حد تک کامیاب ہوئے کہ بکھرے ہوئے مواد کو ترتیب سے پیش کر دیا ہے۔ مستند ماخذات کے ناپید ہونے کی وجہ سے وہ بھی حقائق تک رسائی حاصل نہیں کر سکے۔ یہاں تک کہ صاحب سوانح کے سال پیدائش کے تعین میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ ان کے والد کے بارے میں حالات کا پتا نہیں چلتا' سرسید' کریم الدین' قادر بخش صابر اور دین دیال نے قریبی روابط کے باوجود ان کا نام تک ظاہر نہیں کیا۔ مصنف نے "شرح معمائے ہمدانی" میں صہبائی کی تحریر کے مطابق ان کا نام "مولانا محمد بخش تھانیسری" قرار دیا ہے۔ شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں سکھوں نے تھانیسر کے مسلم گھرانوں کو بری طرح لوٹا تھا۔

اس لئے مسلم آبادی علاقہ کو چھوڑ کر منتشر ہو گئی تھی اسی زمانہ میں مولانا محمد بخش دہلی آ گئے تھے' ان کی اولاد میں پیر بخش اور امام بخش تھے۔ پیر بخش حکیم تھے اور سرسید نے انہیں شاہجہاں آباد کے ان بزرگوں میں شمار کیا ہے جو "ہزار ہزار خوبیوں کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہنر کا گلدستہ" تھے۔ امام بخش صہبائی کے بارے میں قیاس سے کام لیا ہے کہ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی ہوگی۔ اس پر یقین نہ کرنے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں ہے کہ مولانا محمد بخش متبحر عالم تھے کریم الدین صاحب طبقات الشعراء' نے ان سے فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھی تھیں۔ سرسید سے ان کے قریبی روابط ابتدائی عمر ہی سے تھا لیکن مصنف نے مولانا حالی کی حیات جاوید میں بیان کردہ اس بات کی تردید کی ہے کہ سرسید کے مکان کے ایک حصہ میں وہ لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے لئے یہ دلیل فراہم کی ہے کہ صہبائی نے جب لڑکوں کو پڑھانا شروع کیا تو اس وقت سرسید کی عمر نو دس سال سے زائد نہیں تھی۔ اس عمر کا لڑکا اتنا با اختیار نہیں ہو سکتا کہ اپنے مکان کا کوئی حصہ دوسرے کی تحویل میں دے دے۔ صہبائی فارسی پر غیر معمولی عبور رکھتے تھے۔ اس وقت دہلی میں ان کے مقابلے کا فارسی دان کوئی نہ تھا ان کے پڑھانے کا بڑا شہرہ تھا اور طلباء ان کی لکھی ہوئی شرحوں سے فیض پاتے تھے۔ اسی بناء پر ۱۸۴۲ء میں وہ دہلی کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے جبکہ ان کے مقابلہ میں غالب اور مومن بھی امیدوار تھے جو بالوجوہ امیدواری سے دستبردار ہو گئے تھے۔ ان کی زیادہ تر تصانیف اسی زمانے کی ہیں جب وہ دہلی کالج سے وابستہ تھے۔ انتخاب دواوین' شعرائے مشہور زبان اردو ۱۸۴۲ء' ترجمہ حدائق البلاغت' رسالہ قواعد صرف و نحو اردو ۱۸۴۵ء کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ بھی شامل کتاب ہے۔ یہی صہبائی کی اردو میں لکھی گئی کتب ہیں۔ ان کے علاوہ فارسی کتب میں رسالہ نادرہ' رسالہ گنجینۂ رموز' شرح نثر ظہوری کا خصوصی مطالعہ بھی کیا ہے' ایک باب اس بات کے لئے وقف کر دیا ہے کہ مولوی کریم الدین نے صہبائی کی تحریروں کو کس طرح نقل کر کے اپنے سے منسوب کر لیا ہے۔ خصوصاً "قواعد صرف و نحو اور انتخاب دواوین میں جملے کے جملے من و عن اڑا لئے ہیں۔ تصانیف اور علمی' ادبی کارناموں کے حوالے سے ڈاکٹر محمد انصار اللہ کی کوشش قابل تحسین ہے لیکن سوانحی حالات اور سیرت کے بارے میں تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے وہ مختصر ہی نہیں غیر مکمل اور غیر مربوط بھی ہیں۔

**مولانا غلام رسول مہر : ڈاکٹر شفیق احمد : لاہور : جون ۱۹۸۸ء**

مولانا غلام رسول مہر نے بڑی ہنگامہ خیز اور مصروف زندگی گزاری۔ وہ بے باک صحافی اور



اصول پسند سیاسی لیڈر بھی رہے اور کثیر تصانیف و تالیفات اپنی یادگار چھوڑیں' ایک معروف شخصیت ہونے کے باوجود ان کی حیات اور کارناموں پر ایسی توجہ نہیں کی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ خود مولانا مہر نے اپنے حالات زندگی کہیں رقم کئے اور نہ ان کے واقف کاروں نے اس ضروری فرض کو ادا کیا۔ ایسے میں شفیق احمد نے پی ایچ ڈی کے لئے ان کے بارے میں تحقیقی کام کیا تو یقیناً "انہیں انتہائی دشواریوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ اپنی مستقل مزاجی اور تلاش و تحقیق سے انہوں نے بہت مشکل مراحل طے کر لئے لیکن چند امور میں شکوک باقی رہ گئے۔ یہ مقالہ ۹ ابواب میں منقسم ہے۔ جس میں پہلا باب حیات و شخصیت سے متعلق ہے جو بسیط بھی ہے اور تمام ضروری مباحث کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ اس میں مولانا مہر کی تاریخ پیدائش پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اس میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے اگر یہ اختلاف سوانح نگاروں کی وجہ سے ہوتا تو عام سی بات ہوتی خود مولانا نے اپنی تحریروں کے ذریعہ الجھن پیدا کر دی ہے انہوں نے چھ مختلف اوقات میں اپنی تاریخ پیدائش الگ الگ بتائی ہے۔ ان پر بحث کرتے ہوئے مقالہ نگار نے درست تاریخ ۱۳ اپریل ۱۸۹۵ء قرار دی ہے۔ دیہات کے ماحول میں ان کی پرورش اور تعلیم کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد لاہور میں اعلیٰ تعلیمی مدارج طے کرنے کے مراحل خوش اسلوبی سے بیان کئے ہیں اس میں ان اساتذہ کا بھی ذکر شامل ہے جن سے وہ مستفیض ہوئے۔ کالج ہی کے زمانہ میں مولانا نے الہلال کا مطالعہ کیا تھا جس نے ان کی شخصیت پر دیرپا اثرات چھوڑے۔ اسی کے زیر اثر انہوں نے صحافت کو ذریعہ معاش بنایا' اس کی وجہ سے وہ ملت اسلامیہ کی خدمت گزاری پر کمربستہ ہوئے۔ اسی نے انہیں انقلاب کی تربیت دی اور اسی کے اسلوب نے ان کی نگارشات کو توانائی بخشی۔ وہ واحد شخص تھے جنہوں نے مولانا آزاد سے بیعت کی تھی مگر سیاسی امور میں ان کی مخالفت بھی کی۔ مقالہ نگار نے مولانا کی تحریروں کے حوالے سے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ وہ تقریباً" چار سال ریاست حیدر آباد میں وقار الامراء کی پائیگاہ میں انسپکٹر آف اسکولز کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ اس بارے میں بھی تعین زمانہ میں جو اختلاف رہا ہے اسے دور کرنے کی سعی کی ہے۔ صحافت میں وہ مولانا ظفر علی خان کے شاگرد رہے۔ "زمیندار" میں تربیت حاصل کرنے کے بعد "انقلاب" جاری کیا۔ محقق نے اس اختلاف اور صحافتی معرکہ کے اظہار سے گریز کیا ہے جو مولانا ظفر علی خان اور مولانا مہر کے درمیان ہوا۔ مولانا کے ادوار حیات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ان کی تصنیفی و تالیفی زندگی کو بھی موضوع بنایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے کارناموں کو ان کی زندگی اور سیرت سے جدا باب قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ انہیں کے ذریعہ

مولانا کی فطرت، ان کا رجحان طبع اور ان کا مقصد حیات سامنے آتا ہے۔ ان کی تحریروں کا جائزہ لینے سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ مولانا اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اسی حوالے سے ان کی تصانیف سیرت امام ابن تیمیہ، سیاسیات اسلامیان ہند، مختصر تاریخ اسلام، سید احمد شہید، جماعت مجاہدین، سرگزشت مجاہدین، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، تاریخ سندھ، سرور عالم، تالیف و ترتیب میں باقیات ترجمان القرآن، رسول رحمت، انبیائے کرام کا جائزہ دراصل ان کے ذہن کا مطالعہ ہے۔ کتاب کے دیگر ابواب اسی مطالعہ پر مبنی ہیں۔ اسی کوشش کے ذریعہ پہلی بار مولانا کی زندگی کے تمام پہلوؤں، ان کی سیرت اور کارنامے جامع طور پر منظر عام پر آئے ہیں۔

## سرسید احمد خان : راجہ طارق محمود : جہلم پاکستان : ۱۹۸۸ء

چوبیس ابواب پر مشتمل سرسید احمد خان کی سوانح عمری راجہ طارق محمود نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے لکھی ہے۔ بعض ابواب میں غیر ضروری طوالت ہے۔ ابتدائی ۱۳ ابواب تاریخی، سیاسی، مذہبی، پس منظر سے متعلق ہیں، جس کی وجہ سے ایک تہائی صفحات صرف تعارف میں صرف ہوگئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شخصیت کو سمجھنے کے لئے پس منظر ضروری ہوتا ہے لیکن یہ صرف حوالوں کی حد تک ہو تو بہتر اثر کرتا ہے۔ پہلا باب ولادت، خاندان، بچپن، تعلیم اور عنفوان شباب سے متعلق ہے۔ دوسرا ۱۸۳۸ء سے ۱۸۵۷ء تک کے زمانہ سے، تیسرا ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۸ء تک اسی طرح دیگر ابواب تاریخی اعتبار سے قائم کئے گئے ہیں۔ واقعات زندگی کو اسی طرح تاریخی تسلسل میں بیان کیا ہے۔ اہم ابواب وہ ہیں جو صاحب سوانح کی تعلیمی اور سماجی خدمات سے متعلق ہیں۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے جو کدو کاوش کی اور چندہ جمع کرنے کے لئے ہر طریقہ کو آزمایا یہ ان کے مقصد کے لئے لگن کو ظاہر کرتا ہے۔ مصنف نے سرسید کی سماجی، معاشرتی، سیاسی خدمات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ حیات اور کارناموں کی پیشکش اور شخصیت کے تعارف کے لحاظ سے کامیاب سعی ہے۔

## ابن انشاء، احوال و آثار : ریاض احمد ریاض : کراچی ۱۹۸۸ء

ہم اس نظریہ کی حمایت کرتے ہوئے کہ شخصیت کی زندگی یا ان کے انتقال کے بعد چند سال کے عرصہ میں لکھی گئی سوانح حیات ہی جامع اور مکمل ہوتی ہیں ریاض احمد ریاض کی کتاب "ابن انشاء" (مطبوعہ ۱۹۸۸ء) کا حوالہ دے سکتے ہیں۔ ابن انشاء کا انتقال جنوری ۱۹۷۸ء میں ہوا۔



ریاض احمد ریاض نے پی ایچ ڈی کے لئے ان کے احوال اور آثار کو موضوع بنایا۔ اس طرح اندرون دس سال ان کا ضخیم مقالہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آگیا۔ مقالہ نگار نے ان تمام خواتین و حضرات سے شخصی رابطہ کر کے معلومات حاصل کیں جو ابن انشاء کی زندگی کے مختلف ادوار میں ان کے ساتھ رہے۔ ابن انشاء کے ماموں عبدالرشید خلجی نے ابتدائی حالات، لدھیانہ کی رہائش، لڑکپن کی زندگی اور پاکستان آمد کے حوالے سے معلومات فراہم کیں۔ لوک پال سیٹھی بھی قبل از تقسیم برصغیر کے زمانے کے ان کے قریبی دوست تھے۔ ان سے طویل ملاقاتوں کے ذریعہ اہم اور قیمتی معلومات حاصل کیں۔ ابن انشاء کے صاحبزادے چوہدری عبدالستار نے ان کی تمام تحریریں بشمول غیر مکمل آپ بیتی اور تمام نجی خطوط مقالہ نگار کے حوالے کردیئے۔ پاکستان نیشنل بک کونسل میں موجود ان کا سروس ریکارڈ بھی حاصل ہوا۔ ابن انشاء کی بیگمات، ان کے برادر نسبتی، ان کے تمام احباب خصوصاً "احمد بشیر، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، انتظار حسین، اے حمید، جمیل الدین عالی، حمید اختر، خالد اختر، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، کرنل محمد خان، سید ضمیر جعفری، شفیق الرحمان، فرمان فتح پوری، مشفق خواجہ، مسز ایچ ڈاؤسن (انچارج ریفرنس سیکشن، انڈیا آفس لائبریری) نے ہر طرح تعاون کیا، مقالہ نگار نے پاکستان کے مختلف شہروں کے علاوہ لندن کا سفر کر کے حقائق معلوم کئے۔

ان ذرائع کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے بے حد تگ و دو کر کے زندگی کے ہر دور اور اس کے ہر گوشہ کے بارے میں درست معلومات حاصل کی ہیں۔ حاصل شدہ مواد کو فن سوانح نگاری کے مطابق سلیقہ اور ترتیب سے پیش کیا ہے۔ پہلا باب ۱۹۲۷ء۔ ۱۹۴۷ء کے عہد کے حوالے سے ہے یعنی پیدائش سے قیام پاکستان تک۔ اس میں ان کے سابقہ وطن (ضلع جالندھر) والدین، پیدائش، بچپن، گاؤں میں ابتدائی تعلیم، لدھیانہ ہائی اسکول میں تعلیم، عزیزہ بی بی سے پہلی شادی، (مارچ ۱۹۴۱ء) لاہور آمد، ملازمتوں کا حال بیان کیا ہے۔

دوسرے باب میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک کے حالات ہیں جن کا آغاز بعد قیام پاکستان لاہور آمد سے ہوا ہے بعد میں کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستگی، دستور ساز اسمبلی کی سیکریٹریٹ میں ملازمت، پہلی بیوی سے مفارقت (۱۹۵۱ء)، کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کرنا (۱۹۵۳ء)، بابائے اردو سے راہ و رسم۔

تیسرے باب میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۳ء کے احوال ہیں۔ اس دور میں وہ محکمۂ دیہات سدھار سے وابستہ رہے۔ مجلہ "پاک سرزمین" کی ادارت کی۔ مطبوعات فرینکلن کے لئے ترجمے کئے،

بچوں کے لئے کتابیں لکھیں، علاقائی زبانوں کے منظوم اردو تراجم کئے، کالم نگاری کا آغاز کیا، پاکستان رائٹرز گلڈ میں شمولیت اختیار کی۔ نیشنل بک سینٹر سے وابستہ ہوئے۔

چوتھے باب میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۸ء کا احوال ہے۔ اسی میں مختلف ممالک کے سفر کی تفصیل ہے۔ آخری بیماری کا ذکر ہے جس میں خصوصیت سے آخری ایام کی اندوہناک تفصیل موجود ہے۔

کتاب کے حصۂ دوم میں ان کی شاعری، شگفتہ نثر نگاری، تراجم، بچوں کے ادب اور ان کے خطوط پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

سوانحی حالات کی فراہمی میں تمام جزوی تفصیلات کے حصول اور پیش کش کا اہتمام کیا ہے اور انہیں تاریخی ترتیب میں مستند اور معتبر حوالوں کے ساتھ درج کیا ہے۔ اس خصوص میں مقالہ نگار کسی ذہنی تحفظ کا شکار نہیں ہوئے۔ جس اہتمام سے صاحب سوانح کی زندگی کے روشن پہلو پیش کئے ہیں اسی غیر جانبداری سے ان کے تاریک پہلوؤں پر سے بھی پردے ہٹائے ہیں۔ خصوصاً پہلی بیوی سے مفارقت کو شخصی المیہ اور معاشرتی المیہ بنا کر پیش کیا ہے حالانکہ عزیزہ بی بی سے ان کی شادی والدین کی رضامندی سے ہوئی تھی لیکن ساس بہو کے روایتی ٹکراؤ نے باوجود تین اولادیں ہونے کے انہیں بسنے نہیں دیا۔ ابن انشاء والدہ کو چھوڑ نہیں سکتے تھے اور عزیزہ بی بی مشترکہ خاندان میں رہ نہیں سکتی تھیں۔ اسی کشمکش میں ازدواجی رشتہ باقی نہ رہا۔ دوسری شادی کے بعد بھی ابن انشاء ایک عشق میں مبتلا رہے۔ اس واقعہ سے ان کی بعض ذہنی الجھنوں کی گتھیاں کھلتی ہیں۔ آخری دنوں میں جبکہ وہ سرطان میں مبتلا ہو کر موت سے لڑ رہے تھے حکومت پاکستان کا رویہ ان کے ساتھ ہمدردانہ نہ رہا۔ صدر ضیاء الحق کی مرضی سے وہ عہدہ ختم کر دیا گیا جس پر لندن میں وہ فائز تھے اور اس کی وجہ سے انہیں علاج کی سہولت حاصل تھی۔ عہدہ کے ختم ہونے کی اطلاع ان کے ذہن اور روح پر تازیانہ کا کام کر گئی۔ وہ اس طرح کوما میں چلے گئے کہ آخری سانس تک انہیں ہوش نہیں آیا۔

سوانحی کوائف کو دیگر حوالوں کے ساتھ پیش کرتے ہوئے مقالہ نگار نے ان کی تحریروں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ خصوصاً اشعار میں ہر دور کے واقعات پر ان کے جو تاثرات تھے انہیں اجاگر کیا ہے اس طرح زندگی اور فن میں ہم آہنگی کی نشاندہی کی ہے۔

ریاض احمد ریاض کی کاوش ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ انہوں نے حقائق کی دریافت میں جس قدر تگ و دو کی ہے اس کی پیشکش میں فن اور زبان کی تمام ضرورتوں کو مدنظر رکھا ہے۔ پی ایچ ڈی



کے بہت کم مقالے اس معیار پر لکھے گئے ہیں۔

## نیاز فتح پوری : اختر یزدان محسن : لکھنؤ : ۱۹۸۸ء

نیاز فتح پوری کے سوانحی حالات لکھنا تو آسان کام ہے لیکن ان کی شخصیت کے تعارف میں کامیابی حاصل کرنا بڑا مشکل مرحلہ ہے کیونکہ ان کی صفات اتنی نہیں ہیں اور ان میں باہم اتنی الجھنیں بلکہ تضاد ہیں کہ جب تک ان کی فکر کی گرہیں نہ کھول جائیں ان کو بیان کرنے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس متحرک عہد کے نمائندے اور ذہنی تشکیل نو اور بیداری کے نقیب کا اختر یزدان محسن نے نہایت محنت، جانفشانی، وسیع مطالعہ اور گہری فکر سے کیا ہے۔ ان کا حاصل مطالعہ وہ مقالہ ہے جس پر لکھنؤ یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ پچھلے ۴۲، ۴۳ سال کے عرصے میں صرف چند مقالہ ایسے متاثر کن رہے ہیں جن کی پیشکش پر ڈاکٹریٹ کی سند ملی ہو ان میں سے یہ ایک وقیع کاوش ہے۔ مقالہ کے پہلے باب میں نیاز کے ابتدائی حالات اور سوانح ترتیب دینے سے قبل ان کے خاندانی حالات اور ان کے والدین کا ذکر کیا گیا ہے چونکہ اس حوالے سے زیادہ معلومات منظر عام پر نہیں آئی ہیں اس لئے مقالہ نگار کو ان کی تلاش میں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہو گا اگرچہ موجودہ صورت میں بھی وہ خاندانی کوائف تفصیل سے حاصل نہیں کر سکیں ان کا زیادہ تر انحصار نیاز کی اپنی تحریروں پر رہا ہے۔ اسی باب میں سن ولادت، جائے پیدائش، وطن اصلی، عہد طفلی، تعلیم، اساتذہ، ملازمتیں، شادی، علم و ادب کے ذوق کی ابتدا اور اس کا پروان چڑھنا، ہم عصروں سے تعلقات، ان سے چشمک، ترک وطن، پاکستان میں گزارے ہوئے ایام پر روشنی ڈال کر ان کی زندگی کا واضح اور غیر مبہم خاکہ پیش کر دیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے عادات و اطوار کا بھی احاطہ کیا ہے۔ دوسرا باب ان کی نثری اور شعری خدمات، تیسرا باب صحافتی خدمات، چوتھا مذہبی خیالات، پانچواں تصانیف کے جائزے اور چھٹا ان کی ذہنی و فکری وسعت اور جامعیت کے مطالعہ پر منحصر ہے۔ جہاں تک سوانح عمری کا تعلق ہے باب اول ایک کامیاب کوشش ہے باقی ابواب ان کی شخصیت کے تنوع کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس علمی، مذہبی، ادبی اور صحافتی پس منظر کے بغیر نیاز کو سمجھنے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ مقالہ نگار نے ہر ممکنہ تحریری اور شخصی ذریعہ سے استفادہ کر کے ان ابواب کی اس طرح تکمیل کی ہے کہ نیاز کی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہ گیا۔ خصوصیت سے مذہبی رجحان کے بارے میں اتنی مختلف آراء رہی ہیں کہ ان کے درمیان اصل حقیقت کو تلاش کرنا آسان نہ تھا فاضل مقالہ نگار نے

تعقل پسندی کے ذریعہ مذہب کے رموز تک پہنچنے کی کوشش کا خوب تجزیہ کیا ہے۔ خدا اور مذہب کے معاملہ میں تعقل اور تفکر نے انسان کو تاریک راہوں میں مارا بھی ہے تو اس کا ذکر کرنا اور تجزیہ کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا خود ایمان لے آنا۔ صرف مذہب کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ جنسیات کے علمی پہلو کو پیش کرنے اور خاص انداز کی تنقید کی وجہ سے نیاز کی شخصیت متنازع رہی ہے۔ ان امور کے بارے میں بھی مقالہ نگار نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ اس مقالہ کے مطالعہ کے بعد بہت سی الجھنیں رفع ہو جاتی ہیں اور نیاز کی شخصیت واضح ہو کر نظر آنے لگتی ہے۔

## مولانا احسن مارہروی' آثار و افکار : صابر حسین خان جلیسری : کراچی: ۱۹۸۹ء

احسن مارہروی ایک ممتاز اور صاحب طرز شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ ادیب تھے انہیں عروض و املا' زبان و بیان' صرف و نحو' ادبی تاریخ اور تحقیق سے خصوصی دلچسپی رہی۔ ان کی متعدد تصانیف اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہیں۔ صابر حسین خان جلیسری نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے جو تحقیقی مقالہ لکھا تھا وہ بعد نظر ثانی "مولانا احسن مارہروی آثار و افکار" کے نام سے شائع ہوا۔ نظر ثانی مقالہ نگار کی خواہش کے برخلاف ناشر (انجمن ترقی اردو کراچی) کی ضرورت کی بناء پر کی گئی۔

احسن مارہروی (انتقال ۱۹۴۰ء) کو گزرے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ ان کے بارے میں معلومات کی فراہمی ان کے اہل خاندان' احباب' مداح اور واقف کار لوگوں سے ممکن تھی چنانچہ مستند اور معتبر معلومات کی فراہمی میں سوانح نگار نے ہر ممکن ذریعہ کو استعمال کیا۔ احسن' ان کے صاحبزادہ رفیق مارہروی اور معاصرین کی جتنی تحریریں' ان کے کوائف کے حوالے سے موجود تھیں سب سے استفادہ کیا ہے۔ ان کا حسب و نسب خاندانی حالات' پیدائش' تعلیم' ملازمت' شادی' اولاد' شاعری اور تلامذہ غرض کسی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے اور جہاں کسی امر میں اختلاف رائے ہوا ہے وہاں وضاحت ضرور کردی ہے اور حقیقت کے تعین کی سعی کی ہے۔ ان کی صورت ظاہری' پاک باطنی' علمی شغف اور سیرت کے دیگر پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ وہ سنجیدہ' متین' بردبار تھے ان کا چہرہ گول' اس پر نفاست سے ترشی ہوئی مناسب داڑھی' ابھرے ہوئے خدوخال' لبوں کی تراش سے معصومیت اور بھولپن' آنکھوں میں ذہانت کی چمک' پیشانی پر اقبال کی کشادگی و عالی ظرفی کے آثار' اچکن اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ وہ داغ کے خاص



شاگردوں کی غزلیں پیش کرتے اور حسب ہدایت استاد اصلاح کرتے جاتے۔ فصیح اللغات کی ترتیب کے سلسلہ میں الفاظ اور محاوروں کی سند کے لئے داغ سے شعر کہلواتے تھے اس لئے وہ باب جو اس تعلق کے بارے میں لکھا گیا ہے زیادہ تفصیلی اور وضاحت کے ساتھ ہے۔ برخلاف اس کے انہوں نے علی گڑھ میں ۱۵'۱۶ سال گزارے اس کا ذکر برائے نام ہے۔ ہر دور حیات کی تفصیلات میں جو توازن ہونا چاہئے موجود نہیں۔ اسی طرح ان کے مذہبی رجحانات کا حال بھی اجمال کی نظر ہو گیا ممکن ہے یہ خامیاں "نظر ثانی" (قطع و برید) کے مطالبہ کا نتیجہ ہوں۔

کتاب کا ایک حصہ ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کے بارے میں ہے۔ ان تمام اصناف سخن میں احسن کی خصوصی مہارت کا ذکر کیا ہے جن میں انہوں نے طبع آزمائی کی لیکن تاریخ میں ان کی جو مسلمہ مہارت تھی سرسری تبصرہ کی نظر ہو گئی ہے۔

باوجود اس کے کہ یہ پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے اس میں اضافہ کی کافی گنجائش موجود ہے۔

## مسعود حسن رضوی ادیب' حیات و کارنامے : طاہر تونسوی : لاہور : ۱۹۸۹ء

مسعود حسن رضوی ادیب ایک بلند پایہ ادیب' محقق' تنقید نگار اور ماہر قواعد تھے۔ اپنے متنوع کارناموں کی وجہ سے وہ اپنی ذات میں ایک دبستان تھے۔ طاہر تونسوی نے ان کی حیات اور کارناموں پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ۱۹۸۳ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔

مقالہ کی ہیئت ترکیبی وہی ہے جو عام طور پر جامعاتی مقالوں کی ہوتی ہے۔ ایک باب حالات زندگی پر مشتمل ہے جس میں پیدائش' تعلیم' ملازمت' مشاہیر سے تعلقات' عادات و خصائل اور سیرت و کردار کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ مشاہیر سے تعلق کے حوالہ سے جوش ملیح آبادی سے ان کے تعلقات کی تفصیل پیش کی ہے اور اس بحث کا حال درج کیا ہے جو غزل کے بارے میں ان دونوں کے درمیان ہوئی تھی اس بحث سے دونوں حضرات کے نکات نظر واضح ہونے کے علاوہ جوش کے بارے میں نادر معلومات بھی فراہم ہوتی ہیں۔

سوانح عمری مفصل اور جامع نہیں ہے اہم واقعات کے ذریعہ ایک سوانحی خاکہ مرتب ہوتا ہے البتہ دیگر ابواب تنقید اور تحقیق کے نقطہ نظر سے خاصے اہم ہیں دوسرا باب ادبی و شعری محرکات پر مبنی ہے۔ تیسرے باب میں صاحب سوانح کو بحیثیت نقاد متعارف کروایا ہے اس میں ان کی تصانیف کے حوالے سے ادبی خدمات کا تنقیدی نظریات اور عملی تنقید کے تناظر میں جائزہ لیا ہے۔ چوتھے باب میں تحقیقی کام کی تفصیل اور ان کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے انہیں تعبیری

تحقیق کے دبستان کا نمائندہ قرار دیا ہے۔ اس باب میں اہم انکشاف یہ ہے کہ انیس کی از سرنو دریافت کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ پانچویں باب میں "ادبی شخصیت کے تنوع" کے عنوان سے صاحب سوانح کی ادبی شخصیت کا بھرپور تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور غیر مطبوعہ مسودات کے حوالے سے ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

مقالہ کا مواد اور اس کی پیشکش کا انداز محققانہ، سنجیدہ اور عالمانہ ہے۔

**ذکاء اللہ، حیات اور علمی و ادبی کارنامے : ڈاکٹر رفعت جمال: انڈیا: ۱۹۹۰ء**

مولوی ذکاء اللہ بھی سرسید احمد خان کی طرح ان ہمدردان قوم میں شامل رہے ہیں جنہوں نے برصغیر کے انگریزوں کے اقتدار میں چلے جانے کے بعد قوم کی حیات نو کے لئے حصول علم کو سب سے بڑا ذریعہ سمجھا۔ وہ علوم مشرقی و مغربی خصوصاً ریاضی میں کمال رکھتے تھے۔ کثیر تعداد میں تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ عرصہ قبل اینڈریوز نے ان کی حیات و کارناموں پر ایک کتاب تحریر کی تھی۔ بعد میں قوم کا مزاج ایسا بدلا کہ اپنے بہی خواہوں اور قابل احترام بزرگوں کی یادیں ان کے ذہنوں سے محو ہو گئیں۔ ڈاکٹر رفعت جمال نے مولوی ذکاء اللہ کی زندگی اور ان کے کارناموں سے متعلق تحقیقی مقالہ لکھ کر ایک قرض ادا کیا ہے جو سو سال سے زائد عرصہ سے واجب الادا تھا۔ مقالہ نگار کو اس مقالہ پر روہیلکھنڈ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند دی ہے۔

تحقیقی مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ذکاء اللہ کے دور اور اس وقت کی سیاسی و سماجی حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کا براہ راست موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ گویا ہر مقالہ کا ایک روایتی جزو بن گیا ہے۔ پچھلی صدی کے اکابرین پر جتنا بھی تحقیقی کام ہوا ہے ہر ایک کے ساتھ یہ موضوع منتھی کیا ہوا ملے گا۔ اس کے بار بار اعادے کے بعد وہ قاری جو ان کوائف سے واقف ہو چکا ہے کوئی جاذبیت محسوس نہیں کرتا۔ اس کا ایک حصہ مولوی صاحب کے ابتدائی حالات پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں نہایت تفصیل سے اس دور پر روشنی ڈالی گئی ہے جب وہ دہلی کالج سے منسلک ہوئے اور ان پر ماسٹر رامچندر کے علاوہ سرسید تحریک کے اثرات بھی پڑے جنہوں نے ان کی زندگی کے نصب العین کا تعین کر کے انہیں فعال بنا دیا۔ اس باب میں مقالہ نگار کی پیش کردہ معلومات اور ان کے تجزیئے حقیقت پسندانہ اور قائل کرنے والے ہیں۔ تیسرا باب علمی و ادبی معتقدات و نظریات، ان کی تصانیف کے جائزہ پر منحصر ہے۔ مولوی صاحب کی ہر کتاب کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے جس میں ریاضی کی تقریباً ۵۰ کتب شامل ہیں۔ آخری باب مولوی صاحب کی طرز نگارش اور ادب میں ان کے مقام کے تعین سے متعلق ہیں۔



ان تمام تفصیلات کی روشنی میں مولوی صاحب کی شخصیت پورے خدوخال کے ساتھ سامنے آجاتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علم کے فروغ کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے تھے اور انتھک کام کر کے بڑے علمی ذخیرہ کو قوم کے حوالے کیا تھا۔ مؤلفہ نے خراج تحسین پیش کرنے کے انداز سے گریز کر کے حقائق پر مبنی ایسا مواد سیدھے سادے اسلوب میں اس طرح پیش کیا ہے کہ مولوی صاحب کا قد و قامت سرسید اور ان کے دیگر رفقاء کے برابر ہی نہیں بعض کے مقابلے میں نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

**محمد اکبر الدین صدیقی، حیات اور کارنامے : محمد قطب الدین فاروقی : حیدر آباد دکن : ۱۹۹۰ء**

سابق ریاست حیدر آباد جیسے ثقافتی مرکز سے تعلق رکھنے والے پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی اپنے علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ جن کے ذوق و شوق کو ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر سید محمد صاحب نے ابھارا اور ان کی ذہنی تربیت کی۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری کے بعد قدیم اردو ادب پر جن محققین نے کام کیا ہے ان میں موصوف کا نام بھی شامل ہے۔ جنوبی ہند میں اردو کے حوالے سے سب سے معتبر نام ادارۂ ادبیات اردو کا ملتا ہے جس کے قیام و ترقی کے لئے ڈاکٹر زور نے ساری عمر کد و کاوش کی۔ ان کے بعد محمد اکبر الدین صدیقی عرصہ تک اس کے نگران اور ماہنامہ "سب رس" کے مدیر رہے۔ زیر نظر کتاب میں ان کی سوانح اور ادبی و تحقیقی کارناموں کا جامع احاطہ کیا گیا ہے۔ دراصل یہ قطب الدین فاروقی کا وہ مقالہ ہے جو انہوں نے ایم فل کے لئے لکھا اور جامعہ عثمانیہ سے ڈگری حاصل کی چونکہ مصنف نے صدیقی صاحب کی زندگی ہی میں اس جانب توجہ کی اور معلومات بالراست ان سے معلوم کیں اس لئے ان کی صحت و صداقت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ مقالہ کو پانچ ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب پیدائش، بزرگوں کے حالات، ابتدائی تعلیم، تاہل، ملازمت سے متعلق ہے اس میں ایسی تفصیلات سے کام لیا گیا ہے جس سے زندگی کے کوائف پوری طرح منظر عام پر آگئے ہیں۔ باب دوم میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جو مصنف کے ذاتی علم پر مبنی ہیں نیز تائید کے لئے انہوں نے نصیر الدین ہاشمی (دکن میں اردو) شیخ محمد اسماعیل پانی پتی (مقالات سرسید) زبیدہ بیگم (تحقیقی مقالہ، بنگلور یونیورسٹی) رچرڈ میکسول ایٹن کے بیانات کا بھی سہارا لیا ہے۔ کتاب کا تیسرا باب صدیقی صاحب کی نثر نگاری کے بارے میں ہے اس میں ان کی کتابوں اور ان کے

مضامین کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جن میں ان کی کتابیں مشاہیر قندھار (۱۳۵۵ھ)' پریم چند اور ان کی افسانہ نگاری (۱۹۴۴ء) فہرست مطبوعات کتب خانہ ادبیات اردو جلد اول (۱۹۵۶ء) کلام بے نظیر (۱۹۵۸ء) فہرست مطبوعات کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو جلد دوم (دسمبر ۱۹۵۹ء)' دیوان عشق (۱۹۶۰ء)' یادگار امجد (۱۹۶۱ء)' فہرست مطبوعات کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو جلد سوم (۱۹۶۳ء)' کلیات ممنون (۱۹۷۳ء)' صحیفۂ اہل ہدیٰ (۱۹۶۶ء)' خطوط عبدالحق (۱۹۶۶ء)' سیف الملوک (۱۹۵۵ء)' مثنوی چندر بدن و مہیار (۱۹۵۶ء)' کلمۃ الحق از برہان الدین جانم (۱۹۶۱ء) مثنوی کشف الوجود (۱۹۶۵ء)' ارشاد نامہ از برہان الدین جانم (۱۹۷۱ء)' انتخاب محمد قلی قطب شاہ (۱۹۷۳ء)' بجھتے چراغ (دکنیات پر مضامین کا مجموعہ) (۱۹۷۵ء)' نقش دل پذیر کی جلدوں میں شامل وہ حصہ جو دکنیات سے متعلق ہے۔ (ناشر اسپوکن لینگویج سروسز انکارپوریٹڈ' نیویارک) (۱۹۷۷ء)' مثنوی شمع و پروانہ (۱۹۴۷ء)' مثنوی بھوبلبن (۱۹۴۷ء)' شامل ہے ان کے مندرجات سے آگاہی کے لئے مقالہ نگار نے ساری تفصیلات درج کردی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی درجنوں مضامین کا تعارف موجود ہے۔ چوتھا باب صدیقی صاحب کی شاعری سے متعلق ہے آخری باب میں صدیقی صاحب کے ان تبصروں کا حال ہے جو انہوں نے مختلف کتابوں پر کئے۔ مقالہ نگار نے موضوع سے انصاف کیا ہے اور نہایت محنت سے کام انجام دیا ہے۔ اس ضمن میں ان کا صدیقی صاحب سے رابطہ بھی رہا اور سوا سو کتابوں سے استفادہ بھی کیا ہے اس طرح مقالہ میں صدیقی صاحب کی جامع سوانح مرتب ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی' تحقیقی' ذوق اور کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔

## فیض احمد فیض : کے کے کھلر : نئی دہلی : ۱۹۹۰ء

فیض کی کوئی جامع سوانح عمری تاحال مرتب نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ اس کا مکمل مواد خود ان کی تحریروں' انٹرویو اور ان کے واقف کاروں کے مضامین کی صورت میں موجود ہے۔ کے کے کھلر نے منفرد انداز تحریر میں ان کا سوانحی خاکہ تیار کیا ہے اس تصنیف میں واقعاتی تسلسل تو موجود ہے لیکن وہ جامعیت نہیں جس کی سوانح عمری متقاضی ہوتی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ اردو ادبیات اور افکار کے بارے میں مصنف کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

مصنف کا انداز بیان بے حد شگفتہ ہے۔ شوخیٔ تحریر کا یہ عالم ہے کہ جگہ جگہ استہزاء نمایاں ہے۔ ان کی قائم کردہ سرخیاں بھی اس کی غماز ہیں جیسے "انقلاب آئے گا دبے پاؤں" "کچھ پی



بھی گئے' چھلکا بھی گئے" "میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا" "خیر ہو تیری لیلاؤں کی" "وہ شاہ نما چچا" "میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے" "غم جہاں کا حساب" "وہ آئے بزم میں۔۔۔" "راستے والا گھر" "تال کا رشتہ"۔

ابتدائی دو ابواب میں ترقی پسند شاعری اور بعض سرکردہ ترقی پسندوں کے اپنے ہی ساتھیوں بالخصوص فیض سے معاندانہ رویّہ کا ذکر ہے۔ ان ابواب کا تعلق فیض سے ضرور ہے لیکن براہ راست ان کی سوانح عمری سے نہیں ہے۔ تیسرے باب "میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا" میں بچپن سے تکمیل تعلیم تک کے مراحل جملہ ۹ صفحات میں بیان کئے ہیں۔ اس میں فیض کی تحریروں' ان کے انٹرویو' اور بی بی گل کے بیانات سے استفادہ کیا ہے جن کی صداقت سے انکار تو ممکن نہیں لیکن حاشیہ آرائی کچھ ضرورت سے زیادہ ہے۔ مصنف کا آبائی وطن بھی سیالکوٹ ہے اس شہر کے بارے میں لکھا ہے کہ

"سیالکوٹ نے عاشق زیادہ اور معشوق کم پیدا کئے ہیں۔ سدھوں اور جوگیوں نے سیالکوٹ کو ایک نیا کردار بخشا تھا۔" (۸۱)

فیض نے بچپن ہی میں انقلاب روس کا حال سنایا تھا اس حوالہ سے مصنف نے لکھا ہے کہ

"اس طرح فیض نے بچپن سے ہی ایسا خواب دیکھنا شروع کیا جہاں تاج اچھالے جائیں گے اور تخت گرائے جائیں گے۔" (۸۲)

فیض کی شاعری کی ابتدا اردو اور اردو زبان سے ان کی محبت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے کہ

"اور پھر جب فیض نے شعر کہنے شروع کئے تو ادبی تاج خود بخود اچھل گئے کئی ادبی تخت اپنے آپ گر گئے۔ اردو ادب میں وہ ایک آندھی کی طرح آئے لیکن بگولے کی طرح واپس نہیں گئے۔ انگریزی اور عربی میں ایم اے کرنے کے باوجود وہ اردو کے ہی رہے اردو زبان کا چسکہ ہی کچھ ایسا ہے اور خاص اگر پنجابی کو لگ جائے تو پھر چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔" (۸۳)

جن چیزوں سے انہیں ہمیشہ رغبت رہی ان کا ذکر بھی ایسے ہی شگفتہ انداز میں کیا ہے لکھتے ہیں

"حقیقت تو یہ ہے کہ اس لال پرچم کے شاعر کو کالج کی لڑکیوں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بہت پسند تھا۔ فیض صاحب کو جب بھی لڑکیوں کے کالج میں مشاعرے پر بلایا گیا ان کی شرط تھی کہ کھانا نازنینوں کے ہاتھوں سے بنے گا۔ ویسے انہیں افغانی پلاؤ' شب دیگ اور حبشی کھانے بے حد پسند تھے۔ وہسکیوں میں جانی واکر اور بیئر گولڈن ایگل۔" (۸۴)

چوتھے باب میں فیض کی سرزمین پنجاب بالخصوص سیالکوٹ امرتسر اور لاہور سے انسیت کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں ان کی ایلس سے شادی کا حال بھی آگیا ہے جو کشمیر میں ہوئی اور اس زمانہ کے اکثر سیاسی عمائدین نے اس میں شرکت کی تھی۔ شیخ عبداللہ نے نکاح پڑھایا تھا۔ بخشی غلام اور غلام محمد صادق براتی بنے کشمیر نیشنل کانفرنس کے تمام عہدیداران شادی میں شریک ہوئے۔ مصنف نے اسے "کشمیر نیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسہ" سے تعبیر کیا ہے۔

"وہ شاہ نما چچا" میں فیض اور اقبال کے تعلق پر حاشیہ آرائی کی ہے۔ اگلا باب فیض کے انگریزوں کی فوج میں شمولیت سے ہے۔ اسے "میں تو چھورے کو بھرتی کر آئی رے" کا عنوان دیا گیا ہے۔ اسی باب میں فوجی نوکری چھوڑ کر پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر بننے کی تفصیل ہے۔ یہاں بھی مصنف نے شوخیٔ تحریر سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے کہ

"فوج کی نوکری انہیں اتنی راس آئی کہ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر بننے کے بعد بھی کئی مہینے انگریزی وردی اور پستول پہنے رہتے تھے۔" (۸۵)

ایوب خان نے جب مارشل لا لگایا فیض تاشقند میں افرو ایشین ادیبوں کی دوسری کانفرنس میں اپنی دھواں دھار مخالف سامراجی تقریر کر رہے تھے۔ اس کے بعد محفل رنداں آراستہ ہوئی۔

"رات کو کسی نے ایوب خان والی خبر نہ سنائی صبح ہوتے ہی جب یہ خبر ان تک پہنچی تو فیض صاحب مس ہیم لتا کے ہاں بھیرویں سن رہے تھے۔"

"وہ فوری پاکستان کے لئے روانہ ہوئے۔ "ایئرپورٹ پر گارڈ آف آنر کے سوا سب کچھ تھا سیدھے جیل پہنچے اپنے ہی شعر کی ترجمانی کرتے ہوئے "جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔" (۸۶)

اگلے دو ابواب میں ان کے شاعرانہ رجحانات کا جائزہ لیا ہے اس میں فیض اور منٹو کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ دسویں باب "تال کا رشتہ" میں فیض کے خود عائد جلاوطنی ختم کرکے پاکستان آنے سے وفات تک کا حال تحریر کیا ہے۔

سوانحی معلومات کی حد تک یہ کتاب غیر مکمل ہے لیکن عبارت آرائی نے اس میں جان ڈال دی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف فیض کو موضوع بنا کر طبع آزمائی کرنے کے شوق سے آگے نہیں بڑھ سکے۔



# باب دوم (ب)

## علمی، ادبی و فنّی شخصیات کی مختصر سوانح عمریاں

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

### کلیات حسرت موہانی : مرتبہ مولانا جمال میاں فرنگی محلی : کراچی : ۱۹۵۷ء

مولانا جمال میاں فرنگی محلی' مولانا حسرت موہانی کے مرشد کے خانوادہ سے ہیں اور ان کا مولانا حسرت موہانی سے زندگی بھر قریبی تعلق رہا یہاں تک کہ انہوں نے مولانا جمال میاں کے گھر میں آخری سانسیں لیں اپنے دیرینہ رفیق کے کلیات مرتب کرتے ہوئے انہوں نے مقدمہ میں حالات زندگی بھی رقم کئے ہیں۔ ان کی معلومات کے ذرائع حالات حسرت از عارف ہنسوی' حسرت از پرنسپل عبدالشکور' مقدمہ کلیات حسرت مرتبہ عشرت رحمانی' حسرت نمبر نگار لکھنؤ اور حسرت نمبر رسالہ اردو ادب علی گڑھ مرتبہ آل احمد سرور رہے ہیں ان کے علاوہ ان کی یادداشتوں اور ڈائریوں سے بھی استفادہ کیا ہے جن واقعات کو اس مقدمہ میں درج کیا ہے وہ سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

حالات زندگی میں ولادت' تعلیم و تربیت' سیاسی' صحافتی اور ادبی خدمات کا عہد بہ عہد اس طرح جائزہ لیا ہے کہ وہ سوانح عمری کے اجزاء معلوم ہوتے ہیں ان کے حالات زندگی کی ضمن میں دو اہم ماخذات سے استفادہ کیا ہے ایک ان کے خطوط اپنے مرشد زادے' مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام اور دوسرے ان کی نجی ڈائری : دونوں ماخذ اہم ہیں اور نئی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ڈائری کے ۲۶ مارچ ۱۹۴۴ء کا اندراج نقل کیا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

"آج میں نے دفعتا" فیصلہ کیا کہ دہلی جا کر جناح صاحب کو پاکستان در برطانستان کی پالیسی ترک کرنے پر مجبور کروں گا اور ہوسکا تو کانگریس ورکنگ کمیٹی میں جا کر اس میں کانفیڈریشن آف الائیڈ فیڈریشن کی تجویز تسلیم کرنے پر مجبور کروں گا۔ (۸۷)

مولانا جمال میاں نے پہلی بار انکشاف کیا ہے کہ مولانا حسرت موہانی کی سیاست اشارۂ غیبی کی پابند تھی اس بارے میں انہوں نے وضاحت کی ہے کہ پاکستان کے قیام کے بارے میں انہیں بشارت بھی ہوئی تھی وہ لکھتے ہیں

"کبھی کبھی ان کے خواب یا مکاشفات بھی ہوتے تھے اور جب کسی معاملے میں اشارۂ غیبی انہیں مل جاتا تو عجب شان جلال سے وہ اپنے عقائد کی تبلیغ کیا کرتے ایک واقعہ اس سلسلہ میں درج کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کونسل کا ایک تاریخی اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا اس اجلاس میں شرکت کے لئے راقم بھی ہوائی جہاز میں ان کے ساتھ روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں انہوں نے فرمایا سنئے صاحب پاکستان تو مل جائے گا اب آئندہ کی فکر کرنا

چاہئے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کو یہ کیسے یقین ہے کہ پاکستان مل جائے گا۔ فرمانے لگے کہ میں نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے اور حافظ کے دیوان سے تفاول کیا تو شعر بھی نہایت مناسب نکلا۔" (۸۸)

آزادی کے بعد بھارت کے جو حالات تھے ان میں مولانا حسرت موہانی جس طرح سوچتے تھے اس کے احوال بھی ان کی ڈائری میں معلوم ہوتے ہیں۔ وہ صورتحال سے اس قدر برگشتہ تھے کہ حکومت سے گوریلا طرز کی جنگ کی سوچ رہے تھے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلم کانفرنس لکھنؤ میں بلوائی تھی ان کا مقصد تھا کہ مسلمان اپنی تمام سیاسی جماعتیں توڑ کر کانگریس میں شریک ہوجائیں مدعوئین میں مولانا حسرت موہانی بھی شامل تھے۔ مذکورہ تاریخ کے واقعات یوں لکھے ہیں۔

"آج صبح ساڑھے دس تک ناشتا اور اخباربینی سے فارغ ہو کر کل کے فیصلے کے مطابق ہم پانچ نمائندے رضوان اللہ، حسرت موہانی، ذاکر علی، نفیس الحسن، فاروق ۱۱ بجے کے قریب کارلٹن ہوٹل میں ابوالکلام صاحب سے بات چیت کرنے کو پہنچے مختصر گفتگو ہی کے دوران میں معلوم ہوگیا کہ میں نے جلسہ مشاورت میں جو بدگمانی مولانا ابوالکلام کی نیت کے متعلق ظاہر کی تھی وہ خود ان کی زبانی بھی تحقیق ہوگئی۔ انہوں نے صاف صاف اقرار کیا کہ آج کانفرنس کا صرف ایک مقصد ہے وہ یہ کہ تمام مسلم ادارے سیاسی حیثیت سے ختم ہوں، کل فرقہ وارانہ جماعتیں کانگریس میں مدغم ہوجائیں۔ اس پر ہم لوگ یہ کہہ کر چلے آئے تو ہم لوگوں کی شرکت بالکل بے کار ثابت ہوگی دوران گفتگو میں چلتے چلتے میں نے ایک فقرہ ابوالکلام کے متعلق چست کردیا جس سے ان کی ساری کارستانیوں پر پانی پھر گیا اور جس سے وہ انتہا درجہ بھنائے۔ میں نے کہا ۱۸۵۷ء میں برٹش گورنمنٹ کی بدگمانیاں رفع کرنے کی غرض سے جس طرح سرسید نے مسلمانوں کو صرف تعلیمی اور سماجی امور پر زور دینے اور سیاسی وفاداری برطانیہ کی تلقین کی تھی بالکل اسی طرح ۱۹۴۷ء میں آپ کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کو بلا شرط وفاداری سکھاتے ہیں اور اسلامی اداروں کو سماجی امور کے سامنے محدود کردینے کے درپے ہیں لاحول ولا قوۃ الاّ باللہ۔" (۸۹)

یہ واقعہ اپنی جگہ ایک اہم انکشاف ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سوانح نگاروں نے اس کا کبھی ذکر نہیں کیا ہے۔

ہر شخص کی زندگی کے بعض واقعات اور حالات مشہور نہیں ہوتے اس لئے تحریر میں بھی نہیں آتے۔ جن حضرات کی یادداشتوں میں ایسے واقعات محفوظ ہیں ان کا انکشاف ہونا چاہئے



تاکہ سوانح عمری اور شخصیت کی تکمیل ہوسکے ویسے بھی اس قسم کے واقعات تاریخ کا حصہ ہیں ان کے ذکر، تجزیئے اور تنقید کے بغیر تاریخ بھی مکمل نہیں ہوسکتی۔ مولانا جمال میاں کا سوانح عمری لکھنے کا یہ رجحان ہے کہ یہ واقعات منظرعام پر آجائیں۔ ان کی احتیاط مانع ہوئی ہے ورنہ ان کے یہاں جو ڈائریاں ہیں وہ ایسے بہت سے حقائق سے پردہ اٹھا سکتی ہیں۔

ان نئی معلومات کے ساتھ مصنف نے مولانا حسرت موہانی کے اوصاف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انہیں اسلامیت کا پیکر اور محشر عمل قرار دیا ہے۔ سوانحی حالات کے ضمن میں سلسلۂ طریقت کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں جو مصنف کے خاندانی کوائف ہیں اس لئے ان کے معتبر ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا آخری حصے میں حسرت کی شاعری سے بحث کی ہے۔

ستر صفحات کی یہ سوانح عمری نہایت جامع ہے مختصر ہونے کے باوجود معلومات کا ذخیرہ ہے۔

## حسرت کی کہانی، نعیمہ کی زبانی : نعیمہ بیگم : کراچی : ۱۹۵۹ء

مولانا حسرت موہانی کی صاحبزادی نعیمہ بیگم نے اپنی مختصر تصنیف میں مولانا کی نجی زندگی کے چند گوشوں کو منظرعام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے والد کے بارے میں وقیع اور معتبر معلومات پیش کرسکتی ہیں لیکن انہوں نے زیادہ محنت اور توجہ سے سوانحی حالات مرتب نہیں کئے ہیں یہاں تک کہ ان کے سال پیدائش کے تعین سے بھی گریز کیا ہے لیکن سلسلۂ نسب، سلسلۂ طریقت، لڑکپن، ذہانت، گھر کے ماحول، ان کی شرارتوں، تعلیم، شادی "اردوئے معلّی" کے اجراء، طبیعت کے رجحان، قید فرنگ کے حالات کے علاوہ بیگم حسرت کا احوال، ان کی جاں نثاری، محبت، وفا اور قربانیوں کو مختصراً" لیکن مؤثر طور پر بیان کیا ہے، اس میں گھریلو نوعیت کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی آگئی ہیں جن سے مولانا کے مزاج کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

## مولانا حسرت موہانی کی ذاتی زندگی : اشتیاق اظہر و نصرت موہانی : کراچی سن ندارد (آزادی کے بعد)

یہ نعیمہ بیگم کی کتاب "حسرت کی کہانی نعیمہ کی زبانی" کا نقش ثانی ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں بڑی حد تک ان باتوں کا اعادہ کیا گیا ہے جو نعیمہ بیگم نے لکھی ہیں لیکن چند باتوں کا اضافہ بھی ہے۔ مثلاً" رسالہ اردوئے معلّی کی بے سروسامانی، سودیشی اسٹور کا کاروبار، کانپور کی زندگی، اسمبلی کی رکنیت، سفر انگلستان اور اس کے اخراجات کی پابجائی، گیارہ بار حج کی سعادت حاصل کرنے کے بارے میں معلومات اجمالی ہیں۔ جو تحقیق مزید کی دعوت دیتی ہیں۔ نصرت موہانی (جو

مولانا حسرت موہانی کے داماد تھے) بہتر معلومات فراہم کرنے کے موقف میں تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے باوجود جو اشارے فراہم کئے ہیں وہ معلومات افزا ہیں۔ مولانا کے اوصاف میں مولانا جمال میاں فرنگی محلی اور نعیمہ بیگم کے اقوال اور آراء کے ساتھ اپنے مشاہدہ اور معلومات سے کام لیا ہے۔ مولانا کے عادات و اطوار میں شوق مطالعہ' خلوص' حق پرستی' احباب پرستی' پابندی اوقات' عجز و انکسار' درویشانہ روش' فقیرانہ انداز' سیاست میں ایمانداری کو نمایاں کیا ہے جن کے ذریعہ ان کی شخصیت کی مکمل ترجمانی ہوتی ہے لیکن سوانحی پہلو کمزور ہے۔

## سرسید احمد خان : انیس حسن الدین احمد : حیدر آباد دکن : ۱۹۶۱ء

حسن الدین احمد ایک معروف اہل قلم ہیں۔ ان کی اہلیہ انیس حسن الدین احمد نے سرسید کی مختصر سوانح عمری تحریر کی ہے جو صرف ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنفہ نے معلوم حقائق کو حد درجہ اختصار کے ساتھ تاریخ وار مرتب کردیا ہے اسے صرف سوانحی خاکہ کہا جاسکتا ہے۔ باوجود اس کے پروفیسر ہارون خان شیروانی نے اس کی توصیف میں لکھا ہے کہ

"محترمہ نے سرسید کی سوانح حیات کے اہم گوشوں کو گویاں ایک چھوٹے سے کوزے میں بند کرکے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔" (۹۰)

سرسید جیسی ہمہ جہت شخصیت کے سوانحی حالات کو ۲۲ صفحات پر سمویا جائے تو ایسی سوانح عمری کی جو اہمیت اور افادیت ہوسکتی ہے' ظاہر ہے۔

## مفکر مہران : اختر انصاری اکبر آبادی : حیدر آباد (پاک) : ۱۹۶۳ء

وادیٔ مہران کے عظیم مفکر اور صوفی شاعر شاہ عبداللطیف کے سندھی اشعار کی خوشبو سے پوری سرزمین مشک بار ہے اس خطۂ ارض کا رہنے والا کوئی ذی نفس ایسا نہیں جو ان کے خیالات کی بلندی اور شاعری کی دل نشینی سے مسحور نہ ہوا ہو شاہ کے افکار و خیالات سندھی زبان میں محفوظ ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ انہیں غیر سندھی دان طبقوں میں بھی متعارف کروایا جائے حقیقت یہ ہے کہ یہ طبقے خود بھی شاہ صاحب کے افکار سے استفادہ کے متمنی ہیں اس لئے اب ان کوششوں کا آغاز ہوچکا ہے کہ اردو میں شاہ صاحب کی زندگی' ان کے انداز بود و باش' ان کے عادات و اطوار اور ان کے طرز تعلیم و تبلیغ سے آگاہی پہنچائی جائے اس سلسلہ میں محکمۂ اطلاعات حیدر آباد (پاک) اور شاہ عبداللطیف ثقافتی مرکز کمیٹی سرگرم عمل ہیں اور سو سے زائد



مضامین منظر عام پر آچکے ہیں اس اہم اور خوش آئند اقدام کی ایک کڑی وہ کتابیں ہیں جو اختر انصاری اکبر آبادی نے مرتب کی ہیں ان میں "نغمات لطیف" ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو شاہ صاحب کے بارے میں اہل علم حضرات کے تحریر کئے ہوئے ہیں اسے اردو دان طبقہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مفکر مہران اور "شاہ عبداللطیف بھٹائی' حیات و شاعری" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں چونکہ شاہ صاحب کے حالات زندگی محفوظ نہیں ہیں اس لئے مختلف حوالوں سے انہیں تلاش کیا جاسکتا ہے یا انہی کے کلام سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ اختر انصاری نے ہر دو کتابوں میں سوانحی حالات یکجا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ یا تو اس میں کامیاب نہیں ہوئے یا ان کا بنیادی مقصد ان کی پیشکش نہ تھا کہ دونوں کتابوں میں اختصار سے کام لیا ہے جو ۲۰'۲۰ صفحات سے متجاوز نہ ہوسکے لیکن شاہ صاحب کے کلام کے حوالے سے ان کے صوفیانہ خیالات' زندگی کے بارے میں ان کے نظریات اور زبان و بیان کی خوبیوں کو پیش کرنے میں یقیناً" کامیابی ہوئی ہے۔ جس قدر توجہ ان کے افکار' نظریات اور خیالات پر دی جارہی ہے کیا ہی اچھا ہو کہ ان کے ساتھ جامع اور مستند سوانح کی تیاری پر بھی دی جائے بحالت موجودہ ان کتابوں کو سوانحی تعارف یا سوانحی خاکہ سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

## حیدر بخش حیدری : ڈاکٹر عبادت بریلوی : کراچی : ۱۹۶۶ء

فورٹ ولیم کالج سے متعلق' جدید اردو نثر کی تحریک کو آگے بڑھانے والے مشہور داستان "آرائش محفل" کے مصنف حیدر بخش حیدری کے سوانحی کوائف پر تا حال پردہ پڑا ہوا ہے ان کی شخصیت کے خدوخال اور ان کی تمام تصانیف بھی منظر عام پر آکر تاریخ ادب میں اپنا مقام حاصل نہیں کرسکی ہیں اس سلسلہ میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کوششیں لائق تحسین ہیں کہ انہوں نے حیدری کے سوانح کے مخفی گوشوں اور ادبی کارناموں کی بازیابی کے لئے انتھک کوشش کی ہے۔ برٹش میوزیم لندن' بالین لائبریری آکسفورڈ اور کوپن ہیگن کے کتب خانوں میں انہوں نے ایسے مخطوطات کا پتا چلایا ہے جو نہایت اہم ماخذ ثابت ہوئے ہیں حیدری کی نو دریافت تحریروں (حیدری کی کہانیاں اور دیوان حیدری) کے حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے حیدری کی زندگی کے بعض اہم پہلو اجاگر کئے ہیں مولف نے وہ تمام تحریریں من و عن نقل کردی ہیں پھر ترتیب میں سوانح بیان کی ہے لیکن صحیح تاریخ پیدائش کا پھر بھی علم نہیں ہوا۔ موجود مواد کی روشنی میں ڈاکٹر عبادت نے بتایا ہے کہ حیدری کے بزرگ نجف اشرف سے ترک وطن کرکے دلی آئے۔

حیدری وہیں پیدا ہوئے۔ حالات نے ان کے والد ابو الحسن کو دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا وہ لالہ سکھ دیو رائے کی ملازمت اختیار کر کے بنارس چلے گئے وہاں ابراہیم خلیل صاحب تذکرہ "گلزار خلیل" کے سپرد کردیئے گئے۔ انہوں نے ہی حیدری کی تعلیم و تربیت کے لئے قاضی عبدالرشید خان اور مولوی غلام حسین کی شاگردی میں دیا۔ انہوں نے سید جمعیت علی رضوی سے بھی استفادہ کیا۔ وہ ۱۲۱۳ھ تک بنارس میں رہے اور پھر فورٹ ولیم کالج سے ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو منسلک ہوگئے۔ یہیں سے ان کی باقاعدہ تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان کی تحریروں سے ہی استفادہ نہیں کیا بلکہ ان کے دیوان کے دو مخطوطے بھی تلاش کئے اور ان میں موجود اشعار سے بھی زندگی، شخصیت، مشاغل اور ذہنی رجحان کا اندازہ لگایا۔ ان کے کلام میں ایسے قطعات بھی موجود ہیں جن میں دو طوائفوں ببھجو اور ملائی کا ذکر ملتا ہے اور ان سے تعلقات کی نوعیت کا انکشاف ہوتا ہے ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ زندہ دل اور عیش پسند بھی تھے۔ ۴۳ صفحات پر پھیلے ہوئے مقدمہ دیوان حیدری میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ممکنہ حد تک حیدری کے حالات زندگی، ان کی فطرت، طبیعت، ادبی رجحان اور کارناموں کو پیش کر کے اپنی تحقیق کے ذریعہ ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

## مخدوم، ایک مطالعہ : داؤد اشرف : حیدر آباد آندھرا پردیش : ۱۹۶۷ء

مشہور ترقی پسند شاعر اور اشتراکی رہنما مخدوم محی الدین پر جامعاتی مقالہ ہے جو داؤد اشرف نے جامعہ عثمانیہ کے ایم اے اردو کے امتحان بابت ۱۹۶۶ء کے لئے ڈاکٹر مسعود حسین خان کی نگرانی میں لکھا اور ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔

کتاب میں سوانحی حالات کو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے حالات زندگی، شخصیت اور سیرت، شاعری کی ابتدا، سرخ سویرا کی شاعری، گل تر اور اس کے بعد کی شاعری پر عمومی جائزہ اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ مقالہ اس وقت لکھا گیا جب مخدوم زندہ تھے۔ اس وقت شائع ہوا جب ۱۹۶۶ء میں "جشن مخدوم" منایا جاچکا تھا اور رسالہ "صبا" کا مخدوم نمبر شائع ہوچکا تھا اس لئے مقالہ کے سلسلہ میں اہم اور مستند معلومات اور ان کی تفاصیل کی فراہمی زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ مقالہ نگار نے اپنی حد تک سعی کی ہے بعض انکشافات سے مقالہ کی اہمیت تسلیم کرنی پڑتی ہے پہلی بار خاندانی بیاض (رجسٹر) کے حوالہ سے مخدوم کی تاریخ پیدائش (۴ فروری ۱۹۰۸ء) کا تعین کیا ہے ان کے یہ انکشافات بھی اہم ہیں کہ طالب علمی کے زمانہ میں مخدوم کسب معاش کے لئے مجبور تھے اس لئے انہوں نے منزل پارٹس بیچے، پینٹنگز فروخت کیں اور مخدوم حسین



الیکٹریکل انجینئر بھی ان کی مالی اعانت کرتے تھے یہ باتیں اس سے قبل منظر عام پر نہیں آئی تھیں ان کا ذکر "صبا" کے مخدوم نمبر میں بھی نہیں تھا۔

کتاب کے دوسرے باب میں شخصیت اور سیرت کو پیش کیا گیا ہے اس میں مخدوم کی جامعاتی زندگی اور اس وقت کی شوخیوں، شرارتوں، بزلہ سنجیوں، لطیفہ گویوں کا کوئی ذکر نہیں ہے حالانکہ مفلسی اور نیم فاقہ کشی کے اس زمانہ میں اس طرح کی دلچسپیوں سے مخدوم کی شخصیت کی مضبوطی کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ زمانہ کے کسی بھی ستم اور جور سے شکست قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

تیسرے باب میں بھی چند اہم انکشافات ہیں جن کا تعلق مخدوم کی شاعرانہ زندگی سے ہے عام طور پر مخدوم کی پہلی نظم "پیلا دوشالہ" سمجھی جاتی ہے داؤد اشرف نے بتایا ہے کہ پہلی نظم "بچے" تھی اور دوسری "نقاد" دونوں کہیں شائع نہیں ہوئیں اور شاعر کے ذہن سے محو ہوچکی تھیں (شاذ تمکنت نے "نقاد" مخدوم کی بیاض کے حوالہ سے نقل کی ہے گویا وہ ذہن سے محو ہوئی تھی نہ زمانہ سے معدوم ہوئی تھی۔

باقی ابواب میں مخدوم کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اور "سرخ سویرا" کے دور کی شاعری اور "گل تر" کے دور کی شاعری میں پائے جانے والے طرز بیان اور طرز فکر کی نشاندہی کی ہے۔

داؤد اشرف نے ایک طالب علم کی حیثیت سے مخدوم کی سوانح عمری، سیرت اور شاعری کو موضوع تحریر بنایا ہے اور جس تعلیمی سطح کے لئے کام کیا ہے اس کے لحاظ سے بہت غنیمت ہے۔ سوانح عمری کے روایتی فن کو آزمایا ہے اور سنجیدہ انداز میں ہربات تحریر کی ہے۔

## شاہ عبداللطیف بھٹائی، حیات و شاعری : اختر انصاری اکبر آبادی : حیدر آباد : ۱۹۶۷ء

یہ ایک جزوی سوانح عمری ہے اور اختر انصاری اکبر آبادی نے شاہ صاحبؒ کے سالانہ عرس کے موقع پر اسے تحریر کیا اور شاہ عبداللطیف ثقافتی کمیٹی نے اسے شائع کیا۔ اختر انصاری، شاہ عبداللطیف بھٹائی کی حیات اور کلام سے پہلے بھی "مفکر مہران" کے نام سے ایک کتاب تحریر کرچکے ہیں جسے انہوں نے زیر نظر کتاب میں سمونے کی کوشش کی ہے اس میں عبداللطیف کے سوانحی حالات سے زیادہ شاعری پر گفتگو کی گئی ہے اور اس میں بھی تحقیق کی گہرائی نظر نہیں آتی

جو شاہ صاحب کے کلام کے لئے ضروری تھی۔ علاوہ ازیں سوانحی حالات میں بھی کوئی خاص کام انجام نہیں دیا صرف وہی حالات پیش کیئے ہیں جو سامنے کی چیز تھے یہ کتاب سوانح نگاری کے زمرے میں کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں۔

## رشید احمد صدیقی : شخصیت اور فن : سلیمان اطہر جاوید : ۱۹۶۹ء

سلیمان اطہر جاوید کی کتاب رشید احمد صدیقی کی سوانح اور شخصیت کا برائے نام احاطہ کرتی ہے حالانکہ یہ دونوں ابواب ایسے ہیں جن کے ذریعہ رشید صاحب کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا جاسکتا ہے پہلے باب میں سرسید کی خدمات اور علی گڑھ تحریک کا جائزہ ۴۲ صفحات میں لیا گیا ہے دوسرے باب میں صاحب سوانح کے حالات زندگی ہیں جو جامعیت سے خالی ہیں تیسرا باب رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ سے متعلق ہے طالب علمی کے دور سے لے کر استادی اور پھر گوشہ نشینی کے دور تک کے حالات بہت اختصار سے بیان ہوئے ہیں۔ سوانح نگاری کے ساتھ شخصیت نگاری کا فن بھی ادا نہیں ہوا ہے یہ مقالہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے لکھا گیا اور غالباً" رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح، مرقع نگاری، تنقید اور اسلوب تحریر ان کے خاص موضوع تھے ان سے انصاف کیا گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے ادبی کارنامے تو پوری طرح سامنے آجاتے ہیں لیکن حالات زندگی اور اوصاف کردار کی تشنگی موجود رہتی ہے۔

## کلیات آتش، جلد اول : مرتبہ سید مرتضٰی حسین فاضل : لاہور : ۱۹۷۳ء

سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی نے کلیات آتش جلد اول کے مبسوط مقدمہ میں آتش کی سوانح عمری پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے انہوں نے ۳۵ کتب اور بے شمار مضامین کے حوالے سے سوانحی حالات بیان کرتے ہوئے ان کے مابین پائے جانے والے اختلافات پر بحث کی ہے اور قابل قبول دلائل کے ذریعہ نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ قدیم شعراء کے کوائف کے بارے میں ماخذات کی کمی اس نوع کی تحقیقی کام میں مانع رہتی ہے زیادہ تر انحصار تذکروں پر کرنا پڑتا ہے لیکن ان کے تراجم بیشتر صورتوں میں درجہ صداقت پر پورے نہیں اترتے انہیں صرف رہنمائی کا ذریعہ بنا کر آگے بڑھا جاسکتا ہے مصنف محقق کی حیثیت سے ایک خاص مقام رکھتے ہیں انہوں نے آتش کے معاملہ میں بھی تحقیق کا حق ادا کیا ہے اور جہاں تک کتابی علم کا تعلق ہے ان سے مکمل استفادہ کرتے ہوئے ادوار حیات، سیرت و کردار اور شخصیت کے خدوخال کو



نمایاں کرنے کی سعی کی ہے اگرچہ مقدمہ صرف ۴۲ صفحات پر محیط ہے لیکن کار آمد اور معلومات افزا ہے۔

## غواصی : شخصیت اور فن : محمد علی اثر : حیدر آباد دکن : اگست ۱۹۷۷ء

دکنی زبان کے قدیم شاعروں میں وجہی کے بعد غواصی کا ذکر آتا ہے جس کی قادر الکلامی، غزلوں، مثنویوں، رباعیوں سے ظاہر ہے۔ محمد علی اثر نے ان کے کلام کے مطالعہ کے بعد انہیں دکن کا عظیم ترین شاعر قرار دیا ہے اس تاثر کی بناء پر انہوں نے اپنے ایم اے کے مقالہ کے لئے "غواصی، شخصیت اور فن" کا انتخاب کیا تھا جہاں تک غواصی کی شاعری کے تعارف، تجزیہ اور تنقید کا تعلق ہے مقالہ نگار نے محنت اور توجہ کے ساتھ انصاف پسندی کا ثبوت دیا ہے لیکن حالات زندگی اور شخصیت کو اجاگر کرنے میں وہ کامیاب نہ ہوسکے کیونکہ اس سلسلہ میں مواد کا فقدان ہے۔ بعض تواریخ کے حوالوں اور شاعری میں موجود داخلی شہادتوں کی مدد سے وہ ایک اجمالی خاکہ مرتب کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے کسی ذریعہ سے نہ تو غواصی کا سال ولادت معلوم ہوسکا اور نہ ہی سال رحلت۔ صرف اس حد تک تعین ہوسکا کہ وہ ابراہیم قطب شاہ (۱۵۵۰ء - ۱۵۸۰ء) میں پیدا ہوا عہد محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء - ۱۶۳۵ء) میں شاعری شروع کی اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں زندہ تھا۔ اس کے پورے نام کی وضاحت بھی نہیں ملتی وہ سید شاہ حیدر ولی اللہ سے بیعت تھے جن کا وصال ۱۰۳۳ھ میں ہوا مادہ تاریخ "حیدر آخری" ہے۔ غواصی کی یادگار کلیات کے علاوہ تین مثنویاں سیف الملوک و بدیع الجمال، مینا ستونتی اور طوطی نامہ ہیں موجود ماخذات کی مدد سے سوانح و شخصیت کے بارے میں جو کچھ لکھا جاسکتا ہے مقالہ نگار نے اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔

## روایات اقبال : ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی : لاہور : ۱۹۷۷ء

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، علامہ کے نیازمندوں میں ہیں جو علامہ کی علمی، شاعرانہ اور فلسفیانہ خیالات، افکار اور خدمات سے متاثر بھی رہے ہیں اور ان کی صحبت سے فیض پانے کے سبب ان کی شخصیت، کردار اور سیرت سے واقف بھی ہیں۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ نے اقبال شناسی کے لئے اہم، مستند معلومات یکجا کرنے کی سعی کے طور پر یہ کتاب مرتب کی ہے اس تالیف کے منظر عام پر آنے کا پس منظر یہ ہے کہ علامہ کے صد سالہ تقریبات ولادت (۱۹۷۷ء) کے سلسلہ میں جن

تصانیف و تالیفات کا اہتمام کیا گیا ان میں ایک ندرت یہ پیدا کی گئی ہے کہ سوانحی گوشوں اور سیرت کے چھپے پہلوؤں کی تلاش کے لئے مولانا غلام رسول مہرؔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی' پروفیسر شیخ عطا محمد اور جناب سید نذیر نیازی پر مشتمل ایک کمیٹی بزم اقبال لاہور نے قائم کی جس نے ایک سوال نامہ مرتب کیا اس میں دس سوالات متعلق خاندان' ۶ سوالات متعلق پیدائش' ۶ سوالات متعلق اساتذہ اقبال' ۳ سوالات متعلق شاعری کی ابتدا' ۸ سوالات متعلق شمس العلماء سید میر حسن تھے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص ہر سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا لیکن جو حضرات براہ راست کسی سوال سے متعلق رہے ہوں ان سے اسی کے بارے میں معلومات حاصل کیں اس منفرد انداز تحقیق کے سلسلہ میں اراکین کمیٹی کو کئی شہروں اور مقامات کے دورے کرنے پڑے۔ ۲۳ معتبر راویوں سے جوابات حاصل کرکے اسے کتاب کی صورت میں مرتب کیا گیا۔ جن حضرات سے رابطہ کیا گیا ان میں عمروں' تعلیمی درجات اور سماجی طبقات کے لحاظ سے فرق تھا۔ ان میں سو سال سے زائد عمر کے مولوی عبدالعزیز' مولوی سید میر حسن کے فرزند سید ذکی شاہ' علامہ کے ہم جولی' ہم مکتب حضرات' علامہ کے شاگرد' ان کے عام واقف کار' ان کے خادم خاص علی بخش اور بچپن کے ساتھی لالہ پہلوان بھی شامل ہیں ان سب نے اپنی ذہنی سطح شخصی مشاہدہ اور تجربے اور نقطۂ نظر سے علامہ کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے بلاشبہ کتاب کے بعض حصے غیر متعلق بھی معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے کارآمد ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سید ذکی شاہ کا طویل بیان اپنے والد مولوی سید میر حسن کے سوانح اور سیرت کے حوالے سے ہے اور غالباً" یہ پہلی وقیع کوشش اس ضمن میں کی گئی ہے اس بیان میں بعض واقعات علامہ سے متعلق ہیں لیکن بیشتر حصہ غیر متعلق ہے علامہ کے بچپن کے ساتھیوں سے ان کے مشاغل کا علم بھی ہو جاتا ہے اور پتا چلتا ہے کہ علامہ کو پہلوانی اور کبوتر بازی کا بھی شوق تھا ان کے دوستوں سے ان کی بزلہ سنجی اور لطیفہ بازی کا حال بھی معلوم ہوتا ہے غرض کہ بہت سے معلوم اور نامعلوم گوشوں کی تفصیل اس میں موجود ہے۔ کتاب کو ایسا منتشر خاکہ قرار دیا جاسکتا ہے جو علامہ کی سوانح و سیرت مرتب کرنے والوں کے لئے رہنماء بن سکتا ہے۔ چنانچہ مرتب نے ابتدا میں اس کی صراحت بھی کردی ہے کہ "ان روایات اور بیانات کی تاریخی اہمیت مسلم ہے اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ انہیں ایک مستقل کتاب کی شکل میں شائع کردیا جائے تاکہ اقبالیات کے طلبہ اور محققین اسے کتاب حوالہ کے طور پر استعمال کرسکیں۔"

متذکرہ کمیٹی کے اراکین نے حصول معلومات میں سعی و کاوش کا ثبوت دیا ہے اور ڈاکٹر محمد



عبداللہ چغتائی نے انہیں تحریر کرکے اور کتابی صورت میں سے مرتب کرکے اقبال سے نیازمندی کا حق ادا کیا ہے۔ مؤلف کی تحریر سادگی' اختصار پسندی اور مقصدیت کی حامل ہے جو قاری کو مطالعہ کے لئے راغب کرتی ہے۔

## آئینہ ایام اقبال : نسیم فاطمہ : کراچی : ۱۹۷۹ء

صد سالہ جشن اقبال کے سلسلے میں اقبالیات پر بہت سی کتب منظر عام پر آئیں جن میں ایک کتاب "آئینہ ایام اقبال" بھی ہے جس میں مصنف نے علامہ اقبال کے سلسلہ میں قابل ذکر مواد پیش کیا ہے اس میں علامہ کی پیدائش سے وفات تک کے تمام واقعات سلسلے وار اور سن وار درج کئے گئے ہیں جس سے اقبال کی ذاتی زندگی سے لے کر ان کی علمی و ادبی زندگی' ان کی تحریک' ان کا فلسفہ' ان کی شاعری اور ان کے فکر کے تمام پہلو اجاگر ہوگئے ہیں۔ مصنفہ نے اپنی کاوشوں سے اقبالیات کے سلسلے میں ایسا مواد یکجا کردیا ہے جس سے ایک عام قاری سے لے کر ایک اعلیٰ درجے کا محقق تک اپنی ضرورت کے مطابق استفادہ کرسکتا ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ صد سالہ جشن اقبال کے موقع پر ایسی کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی جس میں اقبال کی زندگی کے تمام پہلو اختصار کے ساتھ سلسلہ وار اور تاریخ وار درج ہوں اس کے ذریعے علامہ اقبال کی شخصیت کا ایک جامع خاکہ قاری کے ذہن میں سما جاتا ہے اور ان کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے جو آج تک اوجھل رہے "آئینہ ایام اقبال" میں ان کی خانگی زندگی' تعلیم و تربیت' پیشہ ورانہ مصروفیات' مختلف شخصیات کے بارے میں ان کی رائے' مختلف کتابوں اور رسائل اور اخبارات کے سلسلے میں ان کے تاثرات' مسئلہ کشمیر' فلسطین اور تقسیم ہند کے بارے میں ان کے ذاتی نظریات کی وضاحت بھی ملتی ہے۔ مذکورہ کتاب میں قیام پاکستان کے سلسلے میں ان کی تجاویز کا بھی ذکر ہے جو انہوں نے وقتاً" فوقتاً" اکابرین اور قائدین کے سامنے پیش کیں۔ زندگی کے مختلف موضوعات کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کیا تھا' مختلف شخصیات سے ان کے تعلقات اور ملاقاتوں وغیرہ کا ذکر بھی تفصیل سے موجود ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کتاب کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں۔

"آئینہ ایام اقبال" میں کیا کیا ہے؟ حیات اقبال کی کیسی کیسی جزئیات اس میں جگہ پاگئی ہیں واقعات کی چھان بین کے بعد اندراج میں کس قسم کی توضیح و اختصار سے کام لیا گیا ہے اور کس قسم کی زحمت اٹھائی گئی ہے اس کا کچھ اندازہ مصنفہ کے ابتدائیہ سے اور بھرپور اندازہ کتب کے

مطالعے کے بعد ہی ہو سکے گا۔" میں اس قدر ضرور کہوں گا کہ "آئینہ ایام اقبال" سوانح اقبال کے سلسلے میں ایک بنیادی اور ممتاز و منفرد تالیف ہے اور اقبال کے سوانحی ذخیرے میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔" (۹۰)

### میر تقی میر : ڈاکٹر عبادت بریلوی : لاہور : ۱۹۸۰ء

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کلیات میر مرتب کر کے شائع کرتے ہوئے جو مقدمہ لکھا تھا اس کو ترامیم و اضافہ کے ساتھ "میر تقی میر" کے نام سے کتابی صورت دی ہے اس میں لگ بھگ ۵۰ صفحات میں میر کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال ہے حالات زندگی تمام تر "ذکر میر" سے استفادہ ہیں ان میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا بلکہ میر کے بیان کردہ حالات پر تاثراتی تبصرہ کیا ہے اس میں بھی بعض باتوں کا بار بار اعادہ ہے مطالعۂ شخصیت کے ضمن میں انہوں نے میر اور ان کے اجداد کی مفلوک الحالی اور معاشی پریشانی کو زیادہ اہمیت دی ہے ان کے خیال میں اسی وجہ سے میر کے مزاج میں سوز و گداز کی کیفیات پیدا ہوئیں۔ اس نے انہیں فقر و فاقہ کا عادی اور درویش منش بنایا۔ اسی کی بناء پر وہ تصوف کی طرف مائل ہوئے۔ اسی نے ان میں خودداری اور "بددماغی" پیدا کی۔ میر نے زندگی بھر ٹھوکریں کھائیں ان کا اثر بھی ان کی شخصیت پر پڑا۔ کم عمری میں والد اور چچا کا انتقال، سوتیلے بھائیوں کا ناروا سلوک، غم روزگار، ان سب نے مل کر ان کا دل دنیا سے اچاٹ کر دیا۔ اس پر مستزاد عشق اور اس میں ناکامی ہے۔ ان کی شخصیت میں عقل پر جذبہ حاوی رہا اس لئے انہوں نے حالات کا واقعاتی تجزیہ نہیں کیا بلکہ ان کے ردعمل میں پیدا ہونے والے جذبات کا سہارا لیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے المیوں میں زمانہ کی المناکیوں کو دیکھا اور ان دونوں کے درمیان کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا انفرادی غم بھی اجتماعی غم بن کر شاعری میں ظاہر ہوا۔

کتاب میں سوانح عمری میں جو تشنگی ہے وہ شخصیت کے مطالعہ میں کسی حد تک باقی نہیں رہی چنانچہ اسے میر کی سوانح سے زیادہ شخصیت کا مطالعہ کہا جا سکتا ہے۔ دیگر ابواب میں جہاں خصوصیات شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے وہاں بھی ان کی شخصیت کے پرتو کی نشاندہی کی گئی ہے۔

### فیض بیدل : ڈاکٹر عبدالغنی : لاہور : جون ۱۹۸۲ء

فیض بیدل ڈاکٹر عبدالغنی کے ۱۳ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ سب بیدل کی سوانح، مولد، شخصیت، تصوف کے علاوہ بیدل اور غالب، بیدل اور اقبال کے موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں



سوانحی واقعات کا تسلسل ہے اور نہ سیرت نگاری کے تمام پہلو یکجا کئے گئے ہیں۔ تمام مضامین کے مطالعہ کے بعد بیدل کی سوانح کا ایک خاکہ مرتب ہو جاتا ہے اور ان کی روشنی میں ان کے نظریات، خیالات، افکار اور اعمال کے نقوش واضح ہو جاتے ہیں۔ مضمون "بیدل کا مولد و موطن" میں تذکروں، تواریخ اور تاریخوں کے حوالے سے ان میں پائے جانے والے اختلاف کا تجزیہ کیا ہے اور ان کا قیاس بھی یہی ہے کہ بیدل کا مولد صوبہ بہار تھا۔ اگرچہ یہ مضمون مولد و موطن کے بارے میں ہے اس میں بیدل کی زندگی کے مختلف پہلوؤں، ان کے دیگر شہروں سے خصوصاً" دہلی سے تعلق کو واضح کرنے کے ساتھ اہل کابل کی ان سے عقیدت کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مضمون "میرزا بیدل کی شخصیت اور ان کا اسلوب" ان کے کردار، سیرت، افتاد طبع اور صوفیانہ مزاج پر روشنی ڈالتا ہے۔ اپنے والد عبدالخالق کی طرز زندگی کے مشاہدہ اور چچا شاہ قلندر کے فیضان صحبت سے وہ مائل بہ درویشی ہوئے تھے لیکن گوشہ نشینی اور زمین گیری کو شعار نہیں بنایا بلکہ نہایت فعال زندگی گزاری۔ فوج سے متعلق بھی رہے اور شہزادوں کے یہاں باریاب بھی ہوئے۔ ان کے بارے میں اشعار بھی کہے۔ دربار رسی کے باوجود ان کی زندگی سادگی سے بسر ہوئی۔ ان کے خیالات میں رفعت تھی، طبیعت آزاد تھی اور وہ وسیع جذبہ ہمدردی کے مالک تھے۔ پاکیزگی اخلاق کو وہ دیگر تمام باتوں پر فوقیت دیتے تھے۔ منکرات سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ ان کا دل تعصبات سے پاک تھا اور طبیعت فیاضانہ تھی۔ خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے وہ بڑے مہربان اور شفیق تھے۔ خاندان کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ان کی شفقت اور خوش خلقی سے اثر پذیر ہوتے تھے۔ وہ وفور جذبات سے محبت کرتے تھے۔ نفرت و حقارت، کینہ اور غرض مندی سے مبرا تھے۔ کاروبار دنیا میں مصروف رہنے کے ساتھ غور فکر کا مادہ بھی موجود تھا۔ استغراق سے نکلتے تو خیالات کو شعر کی صورت دے دیتے تھے۔ حسن پرستی ان کی فطرت میں شامل تھی۔ اس نے کبھی ہوس پرستی کی صورت اختیار نہیں کی۔ ڈاکٹر عبدالغنی نے ان اوصاف کو بیان کرتے ہوئے شاعری پر ان کے اثرات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اس طرح شخصیت اور شاعری ایک دوسرے کے عکس نظر آتے ہیں۔ "بیدل آئینہ ماہ و سال میں" کے زیر عنوان اختصار کے ساتھ واقعات زندگی سن وار درج کئے ہیں۔ "میرزا بیدل کا تصوف" ان کے صوفیانہ خیالات کے بارے میں اہم معلومات کا حامل ہے۔ یہی گویا حیات بیدل کا اہم ترین پہلو ہے۔ ۳ مضامین بیدل اور غالب کے حوالے سے ہیں۔ ایک میں بتایا ہے کہ غالب طرز اظہار میں کس حد تک ان سے متاثر تھے۔ کہیں کہیں انہوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ دوسرے مضمون میں

جائزہ لیا گیا ہے کہ "طاؤس" کی علامت کو کس یکسانیت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ تیسرے مضمون میں انکشاف کیا ہے کہ بیدل کی مثنوی "طور معرفت" غالب کی حرز جان رہی تھی۔ ان کا مملوکہ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ غالب کی مثنوی "چراغ دہر" پر اس کے واضح اثرات ہیں۔ ایک مضمون کلام اقبال کے حوالے سے لکھا گیا ہے جس میں فکر اقبال پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان تمام مضامین کے ذریعے بیدل کے سوانحی کوائف، ان کے کردار و سیرت، افکار اور طرز حیات، مابعد شعراء، خصوصاً "غالب اور اقبال پر ان کے اثرات سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مضامین نوعیت اور مواد کے اعتبار سے بہت اہم اور معلوماتی ہیں۔

## ہاشمی بیجاپوری : محمد احسان اللہ : لاہور : اپریل ۱۹۸۲ء

محمد احسان نے جامعہ عثمانیہ میں ایم اے کے لئے دکنی کے ریختی گو اور مثنوی نویس شاعر ہاشمی بیجاپوری پر مقالہ لکھا۔ اس وقت تک شاعر کی تمام تصانیف دریافت نہیں ہوئی تھیں اس لئے جو مقالہ تحریر کیا وہ حیات کے علاوہ چند شعری تصانیف تک محدود تھا لیکن جب ان کے تمام ادبی کارنامے منظر عام پر آگئے تو انہوں نے از سر نو اس موضوع پر توجہ کی اور نئی معلومات کے ساتھ کتاب "ہاشمی بیجاپوری" لکھی۔ اس میں مختلف حوالوں سے انہوں نے ثابت کیا ہے کہ شاعر کا نام سید میران المعروف میاں خان تھا۔ اپنے مرشد شاہ ہاشم مہدوی کی ارادت کی وجہ سے ہاشمی تخلص اختیار کیا۔ ان کا ذکر فرقۂ مہدویہ کی اکثر کتابوں میں ملتا ہے۔ انہیں حوالوں سے ان کا بیجاپوری ہونا ثابت ہے۔ وہ نابینا تھے اسی وجہ سے زیور تعلیم سے محروم رہے۔ انہوں نے اپنے مرشد کے کہنے پر مثنوی "یوسف زلیخا" تصنیف کی۔ اسی مثنوی میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ مرشد کا حکم تھا کہ دکنی میں شعر اس طرح کہو کہ کسی دوسری زبان کا کوئی لفظ دخیل نہ ہو۔ ان کے اشعار سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اکثر افراد ان کے قدردان تھے۔ ہاشمی کے پیدا ہونے اور رحلت کی قطعی تواریخ کا علم نہیں ہو سکا۔ محققین نے ان کے بارے میں محض قیاس آرائیوں سے کام لیا ہے۔ سب اس امر پر متفق ہیں کہ وہ گیارہویں صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ صاحب تصنیف نے زیادہ تر شائع شدہ معلومات سے استفادہ کیا ہے۔ مخطوطات ان کی دسترس میں نہیں رہے اس لئے تحقیق کا حق ادا نہیں کر سکے۔ اختلافی امور کا تذکرہ کیا ہے لیکن اکثر جگہ کوئی قطعی نتیجہ اخذ نہیں کر سکے۔ کتاب کا بڑا حصہ ہاشمی کی سات تصانیف کے تعارف کے لئے وقف ہے۔ مصنف ہاشمی کے سوانحی خاکہ مرتب کرنے میں ضرور کامیاب ہیں۔ اسے جامع سوانح نہیں کہا



جا سکتا اور تحقیق و اضافے کی گنجائش موجود ہے۔

## شیخ ایاز، شخص اور شاعر : حمایت علی شاعر : کراچی : ۱۹۸۳ء

حمایت علی شاعر نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر سرزمین سندھ کے اردو اور سندھی شاعر شیخ ایاز سے قریب تر پایا۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے مصنف کو جو روشنی ملی اس کے پس منظر میں شاعر کی حیات اور فکر کے بارے میں اپنے خیالات رقم کردیئے ہیں جو فن کے اعتبار سے نہ تو سوانح عمری ہے، نہ شخصیت نگاری بلکہ ایک ملی جلی کیفیت ہے۔ چند صفحات میں پیدائش، تعلیم اور ابتدائی ادوار حیات بیان ہوئے ہیں لیکن جلد ہی وہ سیاست اور شاعری کی بھول بھلیوں میں کھو کر سوانح نگاری سے ہٹ گئے ہیں۔ مصنف کا مقصد بھی غالباً "شاعری کا مطالعہ رہا ہے، سوانح نگاری یا سیرت نگاری نہیں رہا۔

## یادگار سلیمانی : عبدالقوی دسنوی : پٹنہ : دسمبر ۱۹۸۴ء

سید سلیمان ندوی کا بلحاظ پیدائش تعلق بہار کے شہر دسنہ سے تھا اس لئے سید صاحب کے یوم پیدائش کے صد سالہ جشن کے سلسلے میں بہار اردو اکادمی نے دیگر تقاریب کے انعقاد کے ساتھ ایک مجلہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جسے عبدالقوی دسنوی نے اپنی کتاب "یادگار سلیمانی" کی صورت میں مکمل کیا۔ یہ کتاب نسبتاً "مختصر ہے۔ ابتدائی حالات زندگی کے لئے ایک باب وقف کیا ہے۔ اس میں پیدائش، تعلیم، تربیت، عملی زندگی کے ادوار کو اجمالاً "بیان کیا ہے۔ ان تمام معلومات کے لئے حیات شبلی (سید سلیمان ندوی) حیات سلیمان (شاہ معین الدین ندوی) ارمغان سلیمان (سید محی الدین احمد ناشر) تاریخ ندوۃ العلماء، خطوط سید سلیمان ندوی اور خود اپنے شائع شدہ مضامین سے استفادہ کیا ہے۔ حیات و اوصاف سلیمان ندوی کا سرسری مطالعہ کرنے اور ان سے تعارف حاصل کرنے کے لئے تو کتاب مفید ہو سکتی ہے لیکن تحقیق اور تفصیل سے عاری ہے۔ سید صاحب کی نگارشات کا اشاریہ بھی مرتب کردیا ہے جو آئندہ کے محقق کے لئے نشان راہ ہے۔

## میر انیس، حیات و شاعری : ڈاکٹر فرمان فتح پوری : کراچی : نومبر ۱۹۸۶ء

"بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو" ایک پھبتی تھی۔ میر انیس نے اپنی مرثیہ نگاری کے ذریعہ اس صنف کو جس اعلیٰ مقام تک پہنچایا اس نے اس پھبتی کو بے معنی کردیا ہے۔ یہ اردو ادب کی بدنصیبی ہے کہ اس کامل فن کی جامع سوانح عمری بھی مرتب نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تمام

معلوم ماخذات کو پیش نظر رکھ کر ان کی سوانح عمری لکھنے اور ان کے فن کا جائزہ لینے کی کوشش اس کتاب میں کی ہے۔ جہاں تک تنقیدی جائزہ کا تعلق ہے اس میں مصنف بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں لیکن سوانحی حالات کی تحقیق میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس بارے میں مصنف نے اعتراف کیا ہے۔

"میں یہ دعوے نہیں کر سکتا کہ میر انیس کے فن اور سوانح حیات پر کوئی غیر معمولی کتاب ہے۔ یہ کتاب ایک غیر معمولی کتاب کی توقع کا خواب ہے۔" (۹۳)

مصنف نے تحقیق کی بنیاد ماقبل مطبوعات پر رکھی ہے اور اختلافی امور پر بحث کے ذریعہ کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود وہ سوانح حیات بیان کرنے میں ۲۵ صفحات پر اکتفا کر سکے۔ اسے جامع سوانح عمری تو نہیں کہا جا سکتا البتہ مصنف سوانحی خاکہ مرتب کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

**حیات شاداں بلگرامی : سید اصغر علی شادانی : کراچی : ستمبر ۱۹۸۷ء**

سید اصغر علی شادانی کو کم عمری میں بیگم شادان بلگرامی نے گود لے لیا تھا اس لئے انہوں نے زندگی کا بڑا حصہ شاداں کے زیر سایہ گزارا۔ ان سے توقع کی جا سکتی تھی کہ شادانی کے خاندانی حالات، ان کی زندگی کے واقعات، کردار، اوصاف اور گھریلو زندگی کے علاوہ فکر و شاعری اور علمیت پر بھرپور روشنی ڈالیں گے لیکن وہ ذہنی رو میں بہہ گئے ہیں۔ کتاب کا بڑا حصہ شاداں سے غیر متعلق ہے اور جو باتیں لکھی ہیں ان میں کوئی تفصیل نہیں ہے۔ سرسری طور پر کچھ حالات کا پتا ضرور چلتا ہے۔ فن سوانح نگاری سے یا تو مصنف کو واقفیت نہیں یا اپنی تمام یادداشتوں کو سپرد قلم کرنے کے شوق میں انہوں نے اس کا خیال نہیں رکھا۔ کتاب کو "حیات شاداں" کے بجائے "اصغر بلگرامی کی یادداشتیں" کا عنوان دیا جاتا تو وہ حق بجانب ہوتا۔

**شاد عظیم آبادی، ایک تحقیقی جائزہ : خاور حسین رضوی نگرامی : کراچی ۱۹۸۷ء**

بھارت کے علاقہ بہار نے فارسی اور اردو کے بڑے شاعر، ادیب اور عالم پیدا کئے۔ اس سرزمین نے شاد کے نام سے بھی عزت و توقیر حاصل کی۔ ان کے سوانحی کوائف ان کی آپ بیتی "شاد کی کہانی، شاد کی زبانی" میں بڑی حد تک محفوظ تھے۔ تحقیق مزید کے ساتھ خاور حسین رضوی نگرامی نے "شاد عظیم آبادی ایک تحقیقی جائزہ" میں پیش کی ہے۔ شاد کے وطن کے حوالہ سے سرزمین بہار کی ان اہم شخصیات کا بھی تعارف کروایا ہے جو ان سے قبل گزرے اور ان کے نام



تاریخ میں محفوظ ہیں۔ سوانح نگار نے شاد کے ایک خط موسومہ نواب عماد الملک بھی شامل کتاب کیا ہے۔ جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

"ان کا شجرہ دادا کی طرف سے لطف اللہ خان صادق پانی پتی اور نانی کی طرف سے علی وردی خان مہابت جنگ تک منتہی ہوتا ہے۔ (۹۳)

علی محمد شاد ایک رئیس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ زمانہ کے ہاتھوں سب کچھ ختم ہو گیا۔ اس کا احوال انہیں کی تحریروں کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ سوانحی حالات مختصر ہونے کے باوجود شاد کے حقیقی خدوخال کی وضاحت کرتے ہیں۔ اصول فن سوانح نگاری کو ملحوظ رکھے بغیر معلومات جمع کر دی گئی ہیں جن میں تسلسل بیاں کا خیال نہیں رکھا گیا۔ زیادہ زور ان کی سابقہ امارت اور بعد کی تباہ حالی کے بیان پر صرف ہوا ہے یا شاعرانہ کمالات پر۔ شاعری پر تبصرے کے اعتبار سے کتاب کی اہمیت زیادہ ہے سوانح کی حیثیت سے کم۔

**مخدوم محی الدین، حیات و شاعری : عطاء الرحمٰن : مظفر پور، بہار : ۱۹۸۸ء**

کتاب عطاء الرحمٰن کے پی ایچ ڈی کے مقالہ کی ترمیم شدہ شکل ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ

"یہ اس قدر تبدیل شدہ ہے کہ ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے لکھے گئے مقالے سے اس کا کوئی تال میل نہیں رہ گیا۔" (۹۴)

انہوں نے ۱۹۸۲ء میں یونیورسٹی مظفر پور سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور انہیں دعویٰ ہے کہ مخدوم پر اس ڈگری کے لئے پہلا مقالہ لکھنے کا اعزاز انہیں کو حاصل ہے۔

زیر نظر کتاب تحقیق کے سانچے کے مطابق نہیں ہے جو ڈگری کے لئے عام طور پر رائج ہے اور اس میں ۱۹۸۸ء میں شاذ تمکنت کی اس موضوع پر شائع شدہ کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس طرح ان کا دعویٰ درست ہے کہ یہ ۱۹۸۲ء میں لکھا ہوا مقالہ نہیں بلکہ جدید تصنیف ہے۔ سوانح نگاری میں مروجہ طریقے سے ہٹ کر مولانا عبدالماجد دریا بادی کی کتاب "حکیم الامت" اور قاضی عبدالغفار کی "آثار ابوالکلام" کے رنگ کو اپناتے ہوئے تاثراتی تجزیہ نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ ان کے خیال میں

"حیات اور فن دونوں کے ہمہ جہت تجزیے کی ضرورت بھی تھی۔ یہاں مخدوم کی حیات کے مختلف پہلوؤں کو عصری تناظر میں پیش کرنے میں زیادہ کوتاہی مجھ سے نہیں ہوئی۔" (۹۵)

حالات زندگی کے بارے میں مصنف کے پیش نظر وہ تمام تحریریں رہی ہیں جو ماقبل لکھی گئی

تھیں اختلافی امر پر محاکمانہ نظر ڈال کر قطعی رائے قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور زیادہ تر شاذ تمکنت کے نتائج کو قبول کیا ہے۔ اجداد کا حال' تاریخ پیدائش وہی درست تسلیم کی ہے جو شاذ نے لکھی ہے۔ کم وبیش ہر صفحہ پر "مخدوم محی الدین' حیات اور کارنامے" کے حوالے موجود ہیں۔ اس سلسلے میں مصنف سے نادانستہ طور پر بعض غلطیاں سرزد ہو گئی ہیں حالانکہ ان کے بارے میں کوئی ابہام یا اختلاف نہیں پایا جاتا۔ جیسے

"۱۹۳۷ء میں ایم اے اردو میں کامیابی حاصل کی۔ ایم اے میں ان کا خصوصی مضمون اردو' ڈراما اور ناٹک تھا۔" (۹۶)

"جب انہوں نے ۱۹۳۷ء میں ایم اے کی تعلیم مکمل کی۔ (۹۷)

مخدوم نے ۱۹۳۶ء میں ایم اے کیا اس میں کوئی اختلاف نہیں ایم اے میں ان کے مقالہ کا موضوع تھا "اردو ڈراما اور اسٹیج کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ۔"

"رفتہ رفتہ مخدوم عملی سیاست میں شریک ہونے لگے جس کا نقطۂ عروج جامعہ سے نوکری چھوڑ کر کل وقتی کارکن بن جانے تک سامنے آجاتا ہے۔" (۹۸)

مخدوم نے جامعہ میں کبھی نوکری نہیں کی البتہ وہ سٹی کالج کے ہائی اسکول سیکشن میں اردو کے استاد کی حیثیت سے ڈیڑھ سال کارگزار رہے۔

بعض اغلاط کے علاوہ بھی واقعات زندگی پر توجہ دینے کے بجائے جن چند واقعات کے سہارے مقالہ مرتب کرنے کی سعی کی گئی اس کا تاثراتی اور تجزیاتی حال بیان کیا ہے۔ اگرچہ یہ ایک تجزیاتی عمل ہے اور کسی حد تک کامیاب بھی ہے' لیکن اس نوع کی تصنیف اس وقت زیادہ کارآمد ہوتی ہے جب معلومات کتابی نہ ہوں' شخصی اور ذاتی ہوں۔ صاحب سوانح سے ربط وضبط اور قرب رہا ہو۔ مشاہدہ' مطالعہ اور تجزیے کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل رہے ہوں یا کم از کم صاحب سوانح نے اپنے قلم سے ایسی تفصیلات قلمبند کی ہوں جو تجزیے کی بنیاد بن سکتی ہوں۔ بہرحال' مصنف نے سوانحی ادب میں ایک اہم اور مشکل روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

**دیوان مہ لقا بائی چندا : شفقت رضوی : لاہور : اپریل ۱۹۹۰ء**

اردو کی اولین شاعرات میں مہ لقا بائی چندا اور لطف النساء امتیاز کے نام ملتے ہیں۔ امتیاز نے اپنا دیوان ۱۲۱۲ھ میں مرتب کیا تھا اس کے ایک سال بعد دیوان چندا مرتب ہوا اس کے باوجود تقدم کی شہرت چندا کے حصے میں آئی تمام مورخین اور تذکرہ نویسوں نے چندا کو پہلی صاحب دیوان شاعرہ کا اعزاز بخشا اس کے حالات زندگی جس تحقیقی کاوش کے متقاضی تھے ان کی جانب



کبھی توجہ نہیں کی گئی سہل پسند مضمون نگاروں نے تذکروں کے تراجم پر انحصار کیا۔ اس شاعرہ کا دیوان بھی ایک بار ۱۳۲۴ھ میں شائع ہوا تھا جو کمیاب ہو چکا ہے۔ ایسے میں تاریخ کے اس اہم باب کی تکمیل کی طرف شفقت رضوی نے توجہ کی۔ انہوں نے دیوان چندا مرتب کیا ہے اور اس میں ۵۵ صفحات کا مقدمہ شامل ہے جو چندا کے سوانحی حالات اور شخصیت کے مطالعہ پر مبنی ہے ان کے پیش نظر وہ تمام تذکرے' تواریخ اور مضامین رہے ہیں جن میں چندا کا ذکر موجود ہے ان ماخذات کا تجزیاتی مطالعہ کر کے اکثر امور کی تردید کی ہے اور حقیقی صورتحال کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے رہنمائی اس تاریخ سے حاصل کی ہے جو چندا نے اپنی زندگی میں جوہر بیدری سے لکھوائی تھی اس کا ایک باب چندا اور اس کے اجداد کے بارے میں ہے یہ تاریخ ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے اس کے مخطوطے سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور جو امور صرف بطور حوالہ درج تھے ان کی تفصیلات دیگر کتب سے حاصل کی ہیں۔ اس محنت کا نتیجہ یہ ہے کہ چندا کی زندگی اور کردار پہلی بار ممکنہ جزئیات کے ساتھ منظر عام پر آئے ہیں اور بہت سی غلطیوں اور خام خیالیوں کی تردید ہو گئی ہے چندا کو تمام اہل قلم حضرات نے ایمان کا شاگرد لکھا ہے جس کو مؤلف نے دلائل کے ذریعہ مسترد کر کے شاعرہ اور اس کے استاد کے حوالہ سے ارسطو جاہ کا شاگرد قرار دیا ہے چندا کی روز مرہ معمولات اور طرز حیات کا خاکہ پیش کرتے ہوئے اس داغ کو دھونے کی بھی کوشش کی ہے جو طوائف اور زن بازاری کہہ کر اس پر لگائے گئے ہیں۔

اگرچہ مقدمہ زیادہ طویل نہیں لیکن پُر مغز اور معلومات افزا ہے اور ایک گم شدہ باب کی بازیافت کہا جا سکتا ہے۔

# باب دوم (ج)

## علمی، ادبی و فنی شخصیات کی جزوی سوانح عمریاں

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

## شبلی کی حیات معاشقہ : وحید قریشی : لاہور : ۱۹۵۰ء

ڈاکٹر وحید قریشی نے "حیات شبلی" میں صاحب سوانح کی زندگی کے ایک خاص پہلو کو شامل نہ کرنے کے ردِ عمل کے طور پر کتاب لکھی جو ایک طرح علامہ شبلی کی زندگی کے ایک پہلو پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے نفسیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے۔

مصنف نے علامہ کی زندگی کے چند واقعات کی بناء پر ان کی شخصیت پر پڑنے والے اثرات کی نشاندہی کی ہے ان کا خیال ہے کہ

"ان کی (علامہ شبلی) زندگی ایک مستقل جدوجہد رہی جس میں فتحیں کم اور شکستیں زیادہ تھیں۔" (۹۹)

علامہ کی تعلیم روایتی مشرقی طرز پر ہوئی تھی بعد میں ان کے خیالات بدل گئے اور انہوں نے زمانہ کے تقاضوں کے مدِ نظر جدید طرزِ تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کرلیا اور ان کے چھوٹے بھائی مہدی کو جدید تعلیم دلائی۔ انہیں اپنے بھائی میں عظمت کے جو آثار نظر آئے وہ ان میں موجود نہ تھے علامہ اور ان کے بھائی نے بھی وکالت کا امتحان دیا۔ علامہ ناکام ہوئے اور ان کے بھائی کامیاب ہوئے اور وہ یورپ چلے گئے۔ ان تمام باتوں نے ان میں احساس شکست پیدا کیا۔ علی گڑھ میں سرسید کے ساتھ رہتے ہوئے انہیں روشنی ملی۔ وہ اس احساس کے بھی شکار رہے کہ سرسید کی عظمت و رفعت کو وہ چھو نہ سکے۔ قدامت اور جدیدیت کی کشمکش نے ندوۃ العلماء کو جنم دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا خیال ہے کہ اسی طرح ان کی بہت سی ناکام آرزوئیں دل میں چھپی رہیں ان میں سے ایک کو پورا کرنے کی صورت اس وقت پیدا ہوئی جب وہ عطیہ فیضی سے ملے۔ مصنف نے علامہ کے خطوط اور شاعری کے حوالوں سے اس جذبہ کا اظہار کرنا چاہا ہے جو "حیات شبلی" میں نظرانداز کردیا گیا۔ مصنف ایک سنجیدہ مزاج اور باوقار شخصیت کے حامل ہیں انہوں نے احتیاط اور اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ ان کا رجحان اپنے مطالعہ سے حاصل نتائج کے اظہار کا ہے نہ کہ طعن و تشنیع کا۔ ان کا تجزیاتی مطالعہ قابلِ قدر ہے لیکن یہ سوال اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ اسے "حیات معاشقہ" کہا جائے یا صرف ذوقِ جمال کی تسکین کا ذریعہ سمجھا جائے۔

## شبلی کی رنگین زندگی : محمد امین زبیری : لاہور : ۱۹۵۲ء

محمد امین زبیری کو یہ اعتراض تھا کہ علامہ شبلی کے سوانح نگاروں نے ان کی زندگی کے خاص پہلو کو عموماً "نظرانداز کر کے نہ تو سوانح نگاری کا حق ادا کیا ہے اور نہ صاحب سوانح کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اس اعتراض کا براہ راست تعلق "حیات شبلی" (مصنف علامہ سلیمان ندوی) سے ہے مصنف نے لکھا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے

"یہ خیال کرتے ہوئے کہ ایک عظیم انسان تمام تر فضیلتوں ہی کا پیکر ہوتا ہے شبلی کو اس رنگ میں پیش کیا ہے کہ وہ محض ایک دیوتا معلوم ہوتا ہے۔ جس سے ہم مرعوب تو ہو سکتے ہیں لیکن اسے دیکھ کر کوئی کشش محسوس نہیں کرتے۔" (۱۰۰)

علامہ سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کی زندگی کے اس پہلو کو بیان کرنے سے گریز کیا ہے جسے محمد امین زبیری نے "رنگین" اور ڈاکٹر وحید قریشی نے "حیات معاشقہ" قرار دیا ہے۔ اشارہ علامہ ندوی اور عطیہ فیضی کے تعلقات کی طرف ہے۔ مصنف نے علامہ کے خطوط اور اشعار کی مدد سے ان کے ذہنی رجحان کی نشاندہی کی ہے مصنف نے اعتراض کیا ہے کہ

"ان کے ساتھ (خاندان فیضی کی خواتین کے ساتھ) مولانا شبلی کو جو لگاؤ تھا اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مولانا اپنے سابقہ خشک زاہدانہ ماحول سے نکل کر دفعتاً "ایک زیادہ خوشگوار اور حیات افروز ماحول سے دوچار ہوئے۔ جس نے ان کے خوابیدہ جمالیاتی احساسات کو بیدار کر دیا۔ ہم ان کے اس لگاؤ کو زیادہ سے زیادہ افلاطونی وضع کا معصوم عشق ہی قرار دے سکتے ہیں اور بس۔" (۱۰۱)

افلاطونی وضع کے معصوم عشق کو "رنگین" قرار دینا بھی انصاف پر مبنی نہیں علامہ شبلی عالم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب ذوق شاعر بھی تھے ان کی حیات عام انسانوں سے کہیں زیادہ تیز تھیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عطیہ فیضی کی ذات سے ان کے ذوق جمال کی تسکین ہوئی اور جمالیاتی ذوق پر قدغن لگا کر اسے "رنگین" یا "معاشقہ" قرار دینا مناسب نہیں دراصل یہ کتاب "حیات شبلی" کے ردعمل کا نتیجہ ہے اگر علامہ سید سلیمان ندوی نے اس موضوع کو تشنہ نہ چھوڑا ہوتا اور محتاط انداز میں حقائق کے انکشاف کا حق ادا کیا ہوتا تو اتنا شدید ردعمل نہ ہوتا۔

کتاب سوانح عمری کے صرف ایک پہلو کو پیش کرتی ہے اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ماخذ صاحب سوانح کی اپنی تحریریں ہیں۔



کتاب کی ابتدا میں علامہ کے "مختصر حالات زندگی" (ص ۳۶ تا ۳۸) درج کیے ہیں۔ مصنف کا عام رویہ ہمدردانہ نہیں ہے جو اعتراض "حیات شبلی" کے مصنف پر کیا گیا وہی اس کتاب کے مصنف پر بہ انداز دگر عائد ہوتا ہے۔ ایک نے حسن عقیدت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا تو دوسرے نے اختلاف میں شدت پسندی کا مظاہرہ کیا ہے۔

## ذکر آزاد : عبدالرزاق ملیح آبادی : کلکتہ : فروری ۱۹۶۰ء

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی کتاب "آزاد کی کہانی' آزاد کی زبانی" مولانا آزاد کے انتقال کے ایک ماہ بعد شائع ہوئی تھی اس میں واقعات ۱۹۲۱ء تک کے بیان ہوئے تھے اسی سال مولانا ملیح آبادی کی ان سے تعلق خاص کی ابتدا ہوئی تھی اس کے بعد ۳۸ برس ان کا ساتھ رہا اور وہ بھی اس طرح کہ عرصہ دراز تک وہ مولانا آزاد کے ساتھ انہیں کے گھر میں مقیم رہے ساتھ کھاتے پیتے اور دن رات کا بیشتر حصہ ساتھ گزارتے۔ مولانا آزاد کے دور دوم کی صحافتی زندگی میں وہ برابر کے شریک رہے اس طرح انہیں سمجھنے ان کے کردار کے ہر پہلو کا مطالعہ کرنے اور تمام خوبیوں خامیوں کا بہ چشم خود مشاہدہ کرنے کا انہیں جیسا کچھ موقع ملا کسی اور کو میسر نہ آیا ہوگا۔ مولانا ملیح آبادی نے ان ۳۸ سالوں کی رفاقت کے حوالہ سے اہم واقعات کو اس کتاب میں بیان کیا ہے جو مولانا آزاد کے کردار و سیرت کو سمجھنے میں ممد ہو سکتے ہیں ان میں کوئی ترتیب بھی نہیں ہے زمانی تقدیم و تاخیر کا خیال نہیں رکھا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جو بات جب یاد آ گئی لکھ دی گئی ہے اس میں بعض اہم انکشافات ہیں مثلاً " یہ کہ مولانا کی خواہش تھی کہ انہیں "امام الہند" بالاتفاق تسلیم کر لیا جائے اس سلسلہ میں کوششیں بھی ہوئیں مولانا آزاد اور مولانا ملیح آبادی نے اکابر علمائے اسلام سے شخصی یا بذریعہ مراسلت رابطہ کیا اسی نوع کی کوشش مولانا محمود حسن اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے مقلدین و پیروین بھی کر رہے تھے۔ اجماع ملت کسی ایک کے لئے نہیں ہو سکا اور بات ختم ہو گئی اس حوالے سے بعض اہم خطوط بھی نقل کیے گئے ہیں۔ سیاست اور صحافت کے بارے میں جو کچھ اس کتاب میں موجود ہے وہ عام قاری کے لئے اب نیا نہیں ہے لیکن گھریلو زندگی' روزمرہ عام معاملات کے بارے میں ان کی روش' زندہ دلی' بزلہ سنجی' دوسروں سے مذاق کر کے لطف اندوز ہونا' سفر کے حالات' پیشگی وقت دیے بغیر یا آرام کے وقت کے دوران گاندھی جی سے بھی ملنے سے معذرت' پیر گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود ان کی روش سے فرار کی وجوہ' جوانی کی رنگین داستانیں' ایسے موضوعات ہیں جن پر سے پہلی بار پردہ اٹھا ہے یہ ان کی سیرت کے اہم نقوش ہیں۔ کتاب میں بے شمار خطوط شامل ہیں جو

تاریخی اور شخصی اعتبار سے اہم ہیں لیکن بعض تقاریر کے طویل اقتباسات گراں گزرتے ہیں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ نہ تو سوانح ہے نہ سیرت بلکہ مولانا آزاد کے حوالے سے مولانا ملیح آبادی کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔

**دانائے راز : سید نذیر نیازی : لاہور : ۱۹۷۹ء**

علامہ اقبال کی ایک مفصل اور اہم سوانح عمری "دانائے راز" ہے جسے سید نذیر نیازی مکمل نہ کرسکے اس کی صرف ایک جلد شائع ہوئی جس میں ۱۹۰۸ء تک کے حالات ہیں اس وقت تک جتنی سوانح عمریاں شائع ہوئی ہیں (بالاستثنیٰ "رود اقبال") ان میں یہ سب سے مفصل ہے۔ مصنف نے تمام منتشر مواد کو محنت اور کاوش سے یکجا کر کے اسے زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کی کوشش کی ہے سوانح نگاری کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ کوئی واقعہ نظرانداز نہ کیا جائے اور اس کی جزئیات بھی بیان کی جائیں۔ اس اعتبار سے دانائے راز کو ممتاز مقام حاصل ہے لیکن اس میں چند خامیاں بھی ہیں محولہ واقعات اور حالات کے لئے استناد کی کمی ہے جو موجودہ دور میں اہم سمجھی جاتی ہیں۔ مصنف کا انداز اس قدر بیانیہ ہے کہ انہوں نے کسی نتیجے تک پہنچنے کا رجحان ظاہر ہی نہیں کیا ہے۔

**حیات اقبال کے چند مخفی گوشے : محمد حمزہ فاروقی : لاہور : مارچ ۱۹۸۸ء**

یوں تو حیات اقبال پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں زیادہ تر وہی باتیں ہیں جو واقف کار حضرات نے بیان کیں اور ان کی روایات کو دیگر اہل قلم نے دہرایا ہے تحقیق کے لئے ایسے بہت سے ماخذ ہوتے ہیں جن تک عام نگاہیں نہیں پہنچ پاتیں ان میں خصوصیت سے اخبارات' رسائل اور اداروں کی رپورٹیں ہیں ان ذرائع سے مستند معلومات فراہم ہوسکتی ہیں لیکن اس نوع کے بیشتر ماخذات محفوظ نہیں ہیں یا عام دسترس سے باہر ہیں اس لئے توجہ سے محروم ہیں۔ حیات اقبال کے حوالے سے جو خبریں' اداریے' مضامین وغیرہ اخبار انقلاب' لاہور میں شائع ہوئے انہیں یکجا کرنے کی زحمت حمزہ فاروقی نے اٹھائی ہے حاصل کردہ معلومات کو فکروفن' نقدو تبصرہ' علمی و تہذیبی مجالس سے وابستگی' استفسار معاصرین واحباب' مولانا حسین احمد مدنی سے روابط' علمی و سماجی سرگرمیاں' کلام اقبال کی ترویج واشاعت' فکر اقبال سے خوشہ چینی' تبلیغ اسلام' زندگی کے مختلف پہلو "افکار وحوادث" کے کالم' طالب علم تنظیموں کی سرپرستی' قدردانی عام' چراغ آخر شب اور ماتم اقبال جیسے عنوانات کے تحت تقسیم کر کے نہایت سلیقے سے مرتب کیا ہے کتاب کے مندرجات یقیناً "معلومات افزا ہیں اور بعض ایسے گوشے بھی ان کے ذریعے



سامنے آئے ہیں جن کا ذکر دیگر سوانح عمریوں میں نہیں ملتا۔ ان میں سے بعض اہم نہیں لیکن علامہ کے حوالے سے ان کی اہمیت مسلمہ بن جاتی ہے اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کی سماجی مصروفیات کتنی وسیع تھیں مثلاً" علامہ کے حوالے سے ان کی اہمیت مسلمہ بن جاتی ہے اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کی سماجی مصروفیات کتنی وسیع تھیں مثلاً" علامہ نے کن کن مقدمات کی پیروی کی۔ افغان ہاکی ٹیم کی لاہور میں آمد اور علامہ کی جانب سے لنچ کی دعوت' دی مسلم ان ایمپلائیڈ یونین کی سرپرستی' نظام حیدر آباد کی سلور جوبلی کے جشن کے سلسلہ میں مشترکہ اپیل پر دستخط' اسلامیہ اسکول فاضلکا کی بزم ادب کی سرپرستی وغیرہ صرف انقلاب میں شائع ہونے والا مواد پونے چھ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس وقت کے ممتاز و مقبول اخبارات چاہے علامہ کے مؤید ہوں یا مخالف اگر ان کے مندرجات سے اس نوع کا مواد اکٹھا کیا جائے تو یقیناً" ہزاروں صفحات پر محیط ہوگا اور کارآمد بھی ان معلومات کی بنیاد پر مستقبل کا سوانح نگار علامہ کی بہتر اور جامع سوانح عمری لکھنے کے قابل ہوسکے گا۔

**غالب درون خانہ : کالیداس گپتا رضا : بمبئی : ۱۹۹۰ء**

اردو کے نامور شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب کے شیدائیوں اور سخن فہم طرفداروں میں کالیداس گپتا کا نام بہت عام ہے انہوں نے غالب پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں اور نہایت محنت اور تحقیق سے کلیات بھی مرتب کئے ہیں۔ "غالب درون خانہ" ان کی مرتبہ سوانح غالب ہے اس میں غالب کے سال پیدائش' ان کے نام و مذہب' خاندان' اہلیہ' اعزہ اقربا اور ملازم خاص وغیرہ کے بارے میں ان کی نجی زندگی کے اہم پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے ہر عنوان کے تحت واقعات کو سنین کی ترتیب میں بیان کیا ہے اکثر امور میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے لیکن بعض کے سلسلہ میں محض قیاس سے کام کیا ہے اس بارے میں انہوں نے خود اظہار کردیا ہے کہ ان سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے پھر بھی قرائن اور شہادت سے ہی اپنے خیال کو موثر قرار دیا ہے غالب کے اسلاف کے متعدد بزرگوں کے حال میں اہم معلومات کا اضافہ ملتا ہے۔ غالب کی تاریخ پیدائش اور سفر کلکتہ کے بارے میں مصنف کی تحقیقات لائق توجہ اور قابل داد ہیں۔ غالب کی نجی زندگی کے جو گوشے تاحال عام نگاہوں سے چھپے رہے اس کتاب کے ذریعے منظر عام پر آئے ہیں اگرچہ یہ مکمل سوانح نہیں ہے مصنف نے اپنی تحقیق کو چند موضوعات اور زندگی کے چند پہلوؤں تک محدود رکھا ہے لیکن انہوں نے اپنے موضوعات سے انصاف کیا ہے طرز تحریر استدلالی اور دلچسپ ہے۔

# باب دوم (د)

## علمی، ادبی و فنّی شخصیات کی مختصر

## سوانح عمریاں (اجتماعی)

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

**غالب نام آور : انجمن ترقی اردو : کراچی : ۱۹۴۹ء**

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ادارت میں شائع ہونے والا سہ ماہی رسالہ "اردو" تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے ہمیشہ نمایاں رہا۔ اسی رسالہ میں وقتاً فوقتاً غالب کے بارے میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کی صد سالہ برسی تک سب سے زیادہ بلند پایہ تحقیقی مضامین "اردو" میں شائع ہوئے غالب پر لکھی گئی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جس میں ان مضامین سے استفادہ نہ کیا گیا ہو۔ ۱۹۶۹ء میں صد سالہ برسی کے موقع پر رسالہ "اردو" میں شائع شدہ مضامین کا ایک انتخاب "غالب نام آور" کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس کا ہر مضمون "غالبیات" کے ضمن میں اہمیت رکھتا ہے بابائے اردو نے غالب کی خودنوشت سوانح عمری بازیافت کر کے شائع کی تھی جو کتاب میں موجود ہے۔ یہ دراصل سید افتخار عالم کی دریافت ہے جو بابائے اردو تک پہنچی خودنوشت کے ورق کا عکس بھی شامل کتاب ہے۔ یقیناً "یہ غالب کے قلم سے ہے طرز عبارت اس طرح کی ہے کہ غالب نے خود کو شخص غیر تصور کرلیا ہے خودنوشت کسی تذکرہ کے لئے لکھی گئی تھی عبارت کا رنگ ڈھنگ بتارہا ہے یہ غالب کی عبارت ہے بابائے اردو کے پاس ان کے لکھے ہوئے متعدد خطوط بھی تھے انہوں نے ملا کر دیکھا تو عین وہی پایا اس نادر خودنوشت کے ساتھ خواجہ قمرالدین راقم دہلوی کی خودنوشت بھی ہے جو غالب کے شاگرد ہی نہیں تھے بلکہ ان کے خاندان سے تعلق بھی رکھتے تھے وہ اپنے کو رشتے میں غالب کے پوتے بتاتے ہیں اس نسبت سے جو حالات راقم نے اپنے اجداد کے بتائے ہیں ان سے غالب کا نسب نامہ مرتب ہوجاتا ہے اور ہر ہر بزرگ کے حالات تفصیل سے فراہم ہوجاتے ہیں ڈاکٹر سید سجاد نے مارچ ۱۸۶۸ء کے انگریزی اخبار سیٹلائٹ میں شائع ہونے والے ایک خط کا متن شائع کرتے ہوئے اس مقدمہ کی روداد پر مختلف حوالوں سے روشنی بھی ڈالی ہے جو غالب نے ازالہ حیثیت عرفی کے لئے قاطع القاطع کے مؤلف امین الدین کے خلاف دائر کی تھی۔ یہ بھی حالات غالب کی گمشدہ کڑی تھی حالی نے یادگار غالب میں اس مقدمہ کا ایک سرسری ذکر کیا ہے کتاب میں شامل خط کے ذریعہ اس کی مکمل روداد سامنے آگئی ہے اسی مقدمہ کے حوالے سے بابائے اردو کا ایک طویل اور تفصیلی مضمون بھی ہے جو مقدمہ کی پوری مسل کی نقل دستیاب ہونے پر اسی کی روشنی میں لکھا گیا جو جزئیات ڈاکٹر سید سجاد کے مضمون میں فراہم نہ ہوسکیں وہ اس مضمون میں موجود ہیں مقدمہ کی کارروائی اس تفصیل سے بیان ہوئی ہے کہ ایک ایک لفظ جس پر غالب کو اعتراض تھا زیر بحث آیا اس وقت کے علماء پر جن کے معنے و مفہوم پر جرح ہوئی، خاص مواقع پر ان کے

استعمال سے کیا مفہوم پیدا ہوتا ہے اخذ کیا گیا اور اس کی مکمل روداد مضمون میں شامل کرلی گئی
ایک طرح سے یہ مسل متعلقہ لغت تصریحاتی ہے مالک رام نے ریاست رامپور سے غالب کے
تعلق کو واضح کرنے کے لئے حقائق پر مبنی مقالہ لکھا ہے اس میں دیگر ماخذات کے علاوہ
خصوصیت سے خطوط غالب سے استفادہ کیا گیا ہے مضمون سے انکشاف ہوتا ہے کہ برے وقت
میں والیان ریاست نے غالب کی دستگیری کی۔

کتاب کے ڈیڑھ سو سے زائد صفحات متذکرہ مضامین پر مشتمل ہیں جن کا براہ راست تعلق
غالب کے سوانحی حالات سے ہے دیگر مضامین فکر و فن سے متعلق ہیں جن میں عبدالرحمٰن
بجنوری کا مقالہ محاسن غالب قابل ذکر ہے۔

## پنجابی کے پانچ قدیم شاعر : شفیع عقیل : کراچی ۱۹۷۰ء

شفیع عقیل اردو اور پنجابی پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "پنجابی کے پانچ
قدیم شاعر" تحریر کرکے ایک صحت مند رجحان کا اظہار کیا ہے۔ ادب میں آئے دن مغرب کے
حوالے دیئے جاتے ہیں۔ اردو کے شاعروں ادیبوں کا موازنہ انگریزی فرانسیسی اور روسی ادیبوں
سے کیا جاتا ہے ہمارے منفرد انداز فکر رکھنے والے اہل ادب پر طرح طرح کی چھاپ لگائی جاتی
ہے۔ وہ لوگ جو اپنی زمین سے پیار کرتے ہیں "قصہ زمین برسرزمین" کے قائل ہوتے ہیں اور
ایک ہی زمین پر بولی جانے والی زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے لئے ایک زبان کے
ادب کو دوسری زبان میں متعارف کرواتے ہیں۔ اسی رجحان کے تحت شفیع عقیل نے پنجابی کے
پانچ شاعروں سید ہاشم شاہ، حامد شاہ عباسی، خواجہ غلام فرید، میاں محمد بخش کے بارے میں تفصیلی
معلومات فراہم کی ہیں۔ کتاب تذکرہ کی نوعیت کی نہیں ہے بلکہ ہر شاعر کے بارے میں ایسی مفصل
سوانحی معلومات فراہم کی گئی ہیں کہ ہر ایک مضمون کو جداگانہ تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے۔

مصنف نے ہر شاعر کے حالات زندگی اور ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کا
رجحان محققانہ ہے۔ ہر شاعر کے بارے میں جتنی تحریریں یا روایات دور ماقبل سے فراہم ہوئیں
ان سب کا حوالہ دیتے ہوئے استدلال کے ذریعہ ان کے درست یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان
شاعروں کے حالات زندگی کے ساتھ پنجاب کی ثقافت، ذہنی افتاد، شاعرانہ مزاج اور مجموعی طور
پر تاریخ سے بھی واقفیت ہوتی جاتی ہے اپنے وسیع مطالعہ، تنقیدی شعور اور تحقیقی جستجو سے کام
لے کر مصنف نے موضوع اور مواد کے لحاظ سے ایک گراں قدر کتاب تصنیف کی ہے۔



## تذکرۂ خوش معرکہ زیبا : سعادت خان ناصر : مرتبہ مشفق خواجہ : لاہور اپریل ۱۹۷۰ء

شعراء کا تذکرۂ موسومہ "خوش معرکہ زیبا" مصنفہ سعادت خان ناصر گوشۂ گم نامی میں تھا اس
کے چند قلمی نسخے خدا بخش لائبریری، پٹنہ، انجمن ترقی اردو پاکستان، لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری اور
مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ تھے۔ مشہور محقق مشفق خواجہ نے انہیں حاصل کرکے
اسے مرتب کیا۔ باہم تقابل کرکے اختلافات کی نشاندہی کی اس کے طویل و بسیط مقدمہ میں جہاں
تذکرہ کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے وہاں سعادت خان ناصر کی مختصر سوانح تحریر کی ہے اور ان
کے ذاتی اوصاف بھی بیان کیے ہیں۔ تذکرہ کی طرح اس کا مصنف بھی گم نامی میں تھا دیگر تذکروں
میں ان کا خال خال ترجمہ ملتا ہے۔ ناصر کی ادبی خدمات اور خصوصیات شاعری کی جانب حسرت
موہانی نے توجہ کی تھی۔ انہوں نے اپنے مجوزہ تذکرۃ الشعراء کے سلسلہ میں ناصر کے بارے میں
ایک مضمون اپنے رسالہ اردوئے معلی بابت مارچ ۱۹۱۱ء میں شائع کیا تھا۔ مشفق خواجہ نے تمام
قدیم تذکروں کے علاوہ اس مضمون سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان سب کی مدد سے ایک سوانحی
خاکہ مرتب کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن مستند شواہد کی عدم موجودگی میں نہ تو ناصر کے سال
ولادت کا تعین کرسکے اور نہ سال کا وفات کا گویا اس خصوص میں تلاش و تحقیق کی گنجائش باقی
ہے۔ مشفق خواجہ نے سراپا سخن (میر محسن علی محسن) سخن شعراء (نساخ) تاریخ ادب ہندی و
ہندوستان (گارساں دی تاسی) دیوان غریب (کلب حسین خان نادر) شاگردان سودا (مقالہ
حسرت موہانی) قاموس المشاہیر (نظامی بدایونی) تذکرۂ ارباب سخن (حسرت موہانی) سے استفادہ کیا
ہے ناصر نواب مہدی علی خان حسن کی سرکار سے وابستہ رہے اور ان کے استاد ہونے کا شرف
پایا تھا۔ واجد علی شاہ اختر کے حکم سے روضۃ الشہداء کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ ان کا علاقہ بیسواڑہ
کے ناظم سید احمد علی خان سے بھی تعلق رہا ان کے احباب میں مصحفی، امام بخش ناسخ، کرامت
علی اظہر، مرزا علی حسین راج، آغا علی رضا خان عالی، میر علی اوسط رشک، مرزا خان نوازش، میر
ہدایت علی جلیل، نواب عاشور علی خان، لالہ فتح چند شائق اور محمد علی خان تھے ان کا ذکر ناصر نے
خود کیا محقق نے تذکروں اور مضامین کے علاوہ ناصر کی تحریروں سے ان کے بارے میں معلومات
اکٹھی کی ہیں جن سے حالات زندگی پر تو کم روشنی پڑتی ہے لیکن ان کے اوصاف بڑی حد تک ظاہر
ہوجاتے ہیں۔ ان کا ادبی، علمی ذوق اعلیٰ معیار کا تھا، ان پر مذہب کا نمایاں غلبہ تھا، مجالس اعزہ
میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ مرثیہ گوئی کو مذہبی فریضہ جانتے تھے۔ اہل بیت سے ان کی

محبت عشق کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی وہ مذہبی معاملات میں ہر طرح کے تعصبات سے بالاتر تھے۔ مذہبیت کے باوجود رنگین طبع بھی تھے۔ اپنے اور احباب کے عشق کا حال مزے لے کر بیان کرتے ہیں۔ شاعری میں ان کی غزلیات کے علاوہ متعدد قصائد اور مثنویاں یادگار ہیں۔ نثر میں "خوش معرکہ زیبا" نہ صرف معلوماتی بلکہ ان کی طرز نگارش کا نمونہ بھی ہے اس میں مزاح کی چاشنی بھی ہے۔ طنز کے تیر بھی اور بے لاگ تنقید و تبصرے کے نشتر بھی اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ادبی خدمات کے بیان کے سلسلہ میں کسی رورعایت کے قائل نہیں تھے۔ مشفق خواجہ نے ان تمام اوصاف کو مستند حوالوں کے ساتھ بیان کیا ہے اور ناصر کی شخصیت کو متعارف کروانے کا حق ادا کیا ہے۔

**عمر گزشتہ کی کتاب : مرزا اظفر الحسن : کراچی : جنوری ۱۹۷۸ء**

مرزا اظفر الحسن اپنے ادبی ذوق کی وجہ سے اردو کی تین شخصیات کے والہ و شیدا تھے 'غالب' مخدوم اور فیض۔ غالب سے عقیدت و ارادت کا اظہار انہوں نے کراچی میں "ادارۂ یادگار غالب" اور "غالب لائبریری" کے قیام سے کیا ہے تو ہم عصر شخصیات مخدوم اور فیض کی یاد تازہ کرنے کے لئے ایسی کتاب مرتب کی جس میں بیک وقت دونوں کی سوانح عمریاں بھی ہیں اور ان کی شخصیتوں کا مطالعہ بھی۔

مخدوم اور فیض میں بہت سی قدریں مشترک بھی تھیں اور انداز زندگی میں بعد المشرقین بھی تھا وہ ایسے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے جو انتہائی مذہبی تھے۔ دونوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ رومانی اور انقلابی شاعری کی ان میں نظریاتی ہم آہنگی بھی تھی لیکن مزاج یکسر مختلف تھے۔ فیض خاموش فطرت' تنہائی پسند' منکسر المزاج' ہر اچھی بری بات کو سہ جانے والے مخدوم تیز طرار' شریر' ہنس مکھ' لطیفہ گو' بذلہ سنج' نظریاتی ہم آہنگی کے باوجود فیض عملی طور پر زیادہ آگے نہ بڑھ سکے۔ مخدوم عملی طور پر اس حد تک پہنچے کہ تلنگانہ تحریک کے اہم لیڈر بن گئے جہاں تک مقبولیت اور محبوبیت کا تعلق ہے فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس کو سبقت حاصل تھی۔ دونوں متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے فیض اس طبقے کے اس حصے میں رہے جو امیر طبقے سے قریب تر رہا تو مخدوم غریب ہی نہیں بلکہ غریب ترین طبقے سے قرب رکھتے تھے۔ ان شخصیات کی محبوبیت پر زیادہ توجہ دی ہے بڑے شاعر بڑے انقلابی کے بجائے اچھے انسان ثابت کرنا چاہا ہے۔ بیان میں مصنف کے جذباتی لگاؤ کو دخل حاصل ہے لیکن وہ محتاط رہے ہیں اور اس کو غلبہ حاصل نہیں کرنے دیا۔ سوانح اور سیرت کے بارے میں ان کی معلومات ذاتی مشاہدہ اور مطالعہ پر مبنی ہیں اس لئے ان کی اصابت



سے انکار کی گنجائش نہیں۔ غالب کے یادگار نقوش قلم بند کرنے کا اعزاز حالی کو حاصل ہوا تو فیض اور مخدوم کے لئے مرزا صاحب نے وہی فرض ادا کیا ہے۔

**جنوبی افریقہ کے اردو شاعر : امداد صابری : دہلی : ۱۹۷۸ء**

امداد صابری اپنی تحقیقی کاوشوں کی وجہ سے اردو ادبیات میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک نامانوس موضوع "جنوبی افریقہ کے اردو شاعر" کو منتخب کر کے داد تحقیق دی ہے۔ ابتدائی ۸۰ صفحات میں افریقہ کی عہد بہ عہد کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مذاہب اور زبانوں کے پھیلاؤ کا تذکرہ کیا ہے اس ضمن میں انہوں نے متعدد حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ برصغیر کے بڑے بڑے تاجر تجارت کی غرض سے اقصائے افریقہ جاتے رہے۔ ان میں زیادہ رجحان جنوبی افریقہ جانے کا تھا وہیں اس معاشرے نے جنم پایا جو برصغیر کی اخلاقی' مذہبی اور لسانی روایات کا حامل تھا۔ اپنی ثقافتی سرگرمیوں کو اصلی وطن کے انداز میں جاری رکھتے ہوئے اردو شاعری کو فروغ دیا۔ مشاعرے منعقد کئے اور ایک نیا دبستان قائم کیا۔

کتاب کا انداز "تذکرہ" کا ہے اس میں ۴۵ شعراء کے تراجم شامل ہیں برخلاف قدیم تذکروں کے حالات زندگی مفصل اور جامع ہے چند شعراء سے براہ راست معلومات حاصل کی ہیں۔ اردو زبان و ادب کی آفاقیت کا اندازہ اس تذکرہ کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔

**سخنور (تذکرۂ شعرائے پاکستان) : سلطانہ مہر : کراچی : ۱۹۷۹ء**

اردو شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں عام رویہ (بہ استثنائے چند) یہ رہا ہے کہ ان کے حالات زندگی' نجی احوال' ان کے گھریلو ماحول اور طرز بود و باش کے بارے میں ان کی زندگی میں نہیں لکھا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرور زمانہ کے بعد جب اس طرف توجہ کی جاتی ہے تو درست معلومات فراہم ہونے کا امکان نہیں رہتا۔ سلطانہ مہر نے معاصر شعرائے پاکستان کا تذکرہ "سخنور" لکھ کر ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ کہنے کو یہ ادبی تذکرہ ہے لیکن قدیم تذکروں سے مختلف ہے اس میں جن شاعروں کے سوانحی حالات درج ہیں وہ براہ راست شاعر سے معلوم کئے ہیں اس لئے ان کے معتبر ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ مصنفہ نے سوانح عمریاں خود مرتب کی ہیں لیکن ان میں جابجا متعلقہ شاعروں کے بیانات کو من و عن نقل کردیا ہے اس لئے ان میں مضامین کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ

"یہ کتاب تذکرہ بھی ہے اور خود نوشت بھی" (۱۰۲)

روایتی تذکروں کے برخلاف اس کتاب میں شامل کوائف تفصیلی ہیں۔ مصنفہ نے ہر شاعر

سے مخصی ربط پیدا کر کے سوالات کے ذریعہ انہیں حاصل کیا ہے اور جو بنیادی نکات زندگی اور فن کے بارے میں ہو سکتے ہیں وہ سب ان میں آگئے ہیں۔ اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر ممتاز حسین نے لکھا ہے۔

"اس تذکرے کی جو تاریخی افادیت ہے وہ اظہر من الشمس ہے کل کے مؤرخ ہوں یا دور حاضر کے' وہ اس تذکرے سے بڑا قیمتی مواد حاصل کریں گے۔ کاش ایسے تذکرے عہد ماضی میں لکھے گئے ہوتے تو ہمیں اپنے کلاسیکی شعراء کے سمجھنے میں کتنی مدد ملتی" (۱۰۳)

کتاب کی نوعیت کے بارے میں مشفق خواجہ نے لکھا ہے کہ

"شعراء کے جو حالات ملیں گے ان کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ سلطانہ مہر نے ہر شاعر سے ملاقات کر کے اس کے حالات معلوم کئے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض سوانحی خاکوں میں آپ بیتی کا رنگ نمایاں ہے سلطانہ مہر نے ہر شاعر کے بارے میں بنیادی معلومات ہی جمع نہیں کی ہیں بلکہ بعض اہم مسائل پر ان کی آراء کو بھی اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ ہر شاعر کے ذہنی رجحانات اور ادبی نقطہ نظر سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے۔" (۱۰۴)

مصنفہ نے معاصر شعراء کے مستند حالات زندگی ان کے انداز فکر کے بارے میں صد فیصد درست معلومات یکجا کر کے مستقبل کے مؤرخ اور سوانح نگار کے لئے بنیادی مواد فراہم کر دیا ہے جو ہمیشہ حوالے کے طور پر کام آئے گا۔ طرز نگارش سادہ اور عام فہم ہے مصنفہ جو شاعرہ' افسانہ نگار' ناول نگار اور صحافی ہیں اس کتاب میں ان کی طرز تحریر قدرے مختلف اور ادبی شان لئے ہوئے ہے جو مذکورہ موضوع کے لئے ضروری ہے۔

### تلامذۂ مصحفی : افسر صدیقی امروہوی : کراچی : ۱۹۷۹ء

افسر صدیقی امروہوی نے مصحفی کے بارے میں ایک مبسوط تحقیقی کتاب لکھنے کے بعد ان کے تلامذہ کو بھی گوشۂ گمنامی سے نکالنے اور تاریخ اور ادب کے ایک اہم باب کی تکمیل کے لئے اس موضوع پر داد تحقیق دی ہے یہ کتاب ان کی سابقہ کاوش کے تسلسل میں ہے مصحفی شاگردوں کی تعداد کے اعتبار سے نہایت ممتاز رہے ہیں ان کے شاگردوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے ان میں سے تقریباً "ڈیڑھ سو ایسے شاعروں کے حالات بطرز "تذکرہ" مرتب کئے ہیں جن کی شاگردی مسلمہ تھی ان میں چند مثلاً" خواجہ حیدر علی آتش' میر مستحسن خلیق' شیخ عیسٰی تنہا' فصاحت لکھنوی' امیر لکھنوی' عیش لکھنوی' ناسخ معروف شعراء ہیں جن کے اذکار مل جاتے ہیں دیگر غیر معروف شعراء ہیں جن کا کلام بھی محفوظ نہیں رہا۔ افسر صدیقی نے دقت نظر اور تلاش بسیار سے



ان کے کوائف اور کلام کو یکجا کیا ہے ان کو طویل عرصہ تک بابائے اردو کے کتب خانہ خاص سے تعلق رہا جہاں غیر مطبوعہ تذکروں اور دواوین کا بڑا ذخیرہ موجود ہے انہیں ان سے استفادہ کا موقع بآسانی حاصل رہا صاحب ذوق ہونے کی وجہ سے انہوں نے تمام ماخذات کا غائر مطالعہ کیا اور نہ صرف اہم معلومات کو فراہم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں بلکہ بعض غلط روایات کی تصحیح بھی کی ہے۔ افسر صدیقی سے قبل مصحفی اور تلامذۂ مصحفی کے تعارف کے سلسلے میں اہم خدمات صرف حسرت موہانی نے انجام دی تھیں اور اپنے مجوزہ تذکرۃ الشعراء کے ضمن میں متعدد شعراء کے تراجم اپنے رسالے اردوئے معلٰی میں شائع کئے تھے اور انتخاب سخن کے سلسلے میں ان کے دواوین کی تدوین کر کے شائع کیا تھا۔ تلامذۂ مصحفی کے کلام کو محفوظ کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی افسر صدیقی نے ان تراجم اور مطبوعات سے استفادہ کیا ہے اگر ان کی عمر وفا کرتی اور وسائل فراہم ہوتے تو ہر شاعر پر ایک جلد مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

### امیر مینائی اور ان کے تلامذہ : کریم الدین احمد : لاہور ۱۹۸۲ء

کریم الدین احمد نے ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان کی نگرانی میں جامعہ سندھ سے ڈی فل کی ڈگری کے لئے امیر مینائی اور ان کے تلامذہ پر تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے ان سے قبل ممتاز علی آہ نے سیرت امیر' جلیل مانک پوری نے سوانح امیر' احمد علی علوی کاکوری نے طرۂ امیر' عبدالحکیم حکمت نے دبدبۂ امیری مرتب کئے تھے۔ مقالہ نگار نے ان سے استفادہ کرنے کے علاوہ بعض ایسے ماخذات تلاش کئے جو عام دسترس میں نہیں تھے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ امیر کے مکاتیب اہم ہیں۔ ان میں اردو کے ۱۳۰ اور فارسی کے ۸۰ مکاتیب شامل ہیں۔ انہی کے ذریعہ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۰ء تک کے حالات زندگی مرتب کئے گئے ہیں باقی حالات دیگر اسناد سے حاصل کی گئی ہیں۔ پہلے باب میں جو سوا سو سے زائد صفحات پر پھیلا ہوا ہے حالات زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کر کے پیش کیا ہے۔ پہلے حصے میں مختصر سوانح عمری ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے غیر مطبوعہ اور مطبوعہ خطوط کی روشنی میں زندگی کا خاکہ ہے تیسرا حصہ روایتی طور پر سیاسی اور معاشی حالات کے جائزہ پر مشتمل ہے جس میں زیادہ انحصار نجم الغنی کی تاریخ اودھ پر کیا گیا ہے لیکن ان حالات کو امیر کی زندگی سے ربط دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی اور نہ یہ بتایا گیا کہ ان حالات کا ان کی زندگی اور کردار پر کیا اثر پڑا۔ باقی ابواب ان کی شاعری (غزل' مثنوی' واسوخت' قطعات' رباعیات' مسدسات' قصائد' نعت گوئی اور نثری کارناموں سے متعلق ہیں۔ آخری باب ان کے چند تلامذہ کلب علی خان' جلیل' ریاض' ممتاز علی آہ کے بارے میں ہے زندگی کے کوائف کے ساتھ ان کی

شخصیت کے ظاہری اور باطنی روپ کو اجاگر کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ ان کے سراپا کے بارے میں ممتاز علی آہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"امیر کشیدہ قامت، ہڈی چوڑی، رنگ گورا چٹا، جسم بھر بھرا، ہنستی پیشانی، آنکھیں بڑی نہ تھیں نگاہ میں شوخی کے ساتھ تیزی، دل میں گھر کر لینے والی تھی، سر کے بال کان کی لو تک رہتے تھے داڑھی نہ زیادہ لمبی نہ چھوٹی، جوانی میں خوش لباسی کا شوق تھا اور زمانہ کی روش کے مطابق جوتا گٹھیلا پہنتے تھے۔ بڑھاپے میں لباس میں سادگی آگئی تھی گرمیوں میں قالب پر چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی ململ یا باریک تن زیب کا کرتہ جس کی آستینیں گرمیوں میں پسینے کے باعث اکثر کہنیوں تک الٹی رہتی تھیں چھالٹین کا پاجامہ جس کے پائنچے عرض کئے ہوتے تھے۔ تن زیب یا کسی باریک کپڑے کی اچکن پہنتے تھے۔" (۱۰۵)

امیر زندگی کے نشیب و فراز سے گزرے آسودگی کی گود میں کھیلے اور بدحالی کا زمانہ بھی دیکھا۔ مقالہ میں ان کی اجمالی کیفیت ملتی ہے۔ حالات زندگی کی نسبت ان کی خدمات پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

**اردو کے یوروپین شعراء : شفقت رضوی : کراچی : ۱۹۸۱ء**

اردو زبان نے اپنی وسعت اور پھیلاؤ کے لحاظ سے عالمگیر زبان ہونے کا درجہ حاصل کر لیا ہے ملکوں کی سیاست اور مصلحت اس حقیقت کو قبول کرے یا نہ کرے، برصغیر کے افراد بلا لحاظ مذہب و ملت، نسل و رنگ جس خطہ ارض میں جا کر آباد ہوئے وہاں اردو کے وجود کی شہادت بن گئے ہیں اس کے اثرات یوں ظاہر ہوتے ہیں کہ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی میں اس کی تعلیم ہوتی ہے اردو کے ادبی اجتماعات ہوتے ہیں اور اردو رسائل جاری ہوئے ہیں لیکن اس وقت بھی جب برصغیر پاک و ہند میں اس کی جان کے درپے متعدد قوتیں تھیں اس نے اپنے حسن، اپنی شیرینی اور اپنے رچاؤ سے اپنوں کے ہی نہیں بلکہ غیروں کے دل موہ لئے تھے انگریزوں کے دور اقتدار میں کئی کئی یوروپین قوتیں کارفرما تھیں۔ سرکاری سطح پر اردو ایک ضرورت تھی۔ سات سمندر پار سے آئے ہوئے حکام کے لئے عوام سے رابطے کا کام دیتی۔ ہندوؤں سے متاثر انگریز حکام ایسے بھی تھے جو اسے مسلمانوں کی زبان جان کر اسے تباہ و برباد کرنے کے درپے تھے کیونکہ انگریز ہر معاملہ میں وسیع النظر ہونے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اس صفت سے عاری ہو جاتا ہے۔ اہل یورپ کا تیسرا طبقہ وہ تھا جس نے یہاں کی تہذیب اور زبان کی خوبیوں کے پیش نظر انہیں اپنانے کا عزم کیا تھا۔ موجودہ زمانہ میں مغرب زدگی مہذب اور



دانشور ہونے کی علامت ہے اس وقت مشرق کی پیروی کو تہذیب اور دانشوری کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ تعصبات سے پاک افراد نے مشرقی تہذیب کی تمام اقدار کو بہ رضا و رغبت اپنانے کی سعی کی یہاں تک کہ برصغیر کی مقبول عام زبان کو اپنایا اس میں تصنیف و تالیف اور شاعری کا آغاز کیا جیسا کہ مؤلف نے دیباچہ میں لکھا ہے بعض شعبوں میں آغاز کا تقدم بھی انہیں حاصل ہے۔ اہل یورپ کی اردو خدمات کا دائرہ بہت وسیع رہا ہے۔ جس پر ابھی تک جامع تحقیقی کام نہیں ہوا۔ مؤلف نے اس کتاب میں اپنی تحقیق کو شاعری تک محدود رکھا ہے بلاشبہ اس موضوع پر چند کتابیں ماقبل میں لکھی گئیں جن کی نوعیت اردو میں شعراء کے تذکروں کی رہی ہے۔ مؤلف نے ان کی نسبت زیادہ مناسب طریقہ سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے اور شعراء کے حالات دریافت کرنے خصوصاً "ان کی ذات کے حوالوں سے تواریخ اور سنین کی دریافت کا التزام رکھا ہے۔

کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب انگریز شعراء کے بارے میں ہے اس میں ۵۱ شعراء اردو کے حالات اور ان کا نمونہ کلام درج ہے۔ ان میں سے چند ایسے بھی ہیں جو برصغیر کبھی نہیں آئے اپنے شوق کی بناء پر اپنے وطن میں رہتے ہوئے زبان سیکھی اور عروض کے رموز سے واقف ہوئے اور نادر نمونے تخلیق کئے انہیں میں پامر جیسا شاعر بھی شامل ہے۔ الیگزینڈر ہیدرلی آزاد کے بارے میں عام روایت یہ ہے کہ وہ غالب کے شاگرد تھے۔ مؤلف نے مستند اور معتبر اسناد سے اس کی تردید کی ہے اور آزاد کے حقیقی بھائی کی تحریر سے ثابت کیا ہے کہ

"نواب زین العابدین خان دہلی کے امیرزادے، عالی خاندان، جو عارف تخلص کرتے تھے وہ نجم الدولہ، اسد اللہ خان بہادر غالب کے شاگرد تھے وہ اوس (آزاد) کے استاد تھے۔" (۱۰۶)

آزاد کا ترجمہ تحریر کرتے ہوئے ان کا دیوان بھی پیش نظر رکھا ہے اور اس کے مندرجات سے استفادہ کیا ہے۔

دوسرا باب اطالوی شاعروں کے تراجم پر مشتمل ہے اس میں صرف ۳ شاعر شامل ہیں تیسرے باب میں ۱۱ پرتگیزی شعراء چوتھے باب میں ۲ جرمن شعراء پانچویں باب میں ۱۷ فرانسیسی شعراء چھٹے باب میں ڈنمارک کے دور جدید کے شاعر فین تھمنس اور آخری باب میں ۱۶ امریکی شعراء کے تراجم شامل کئے ہیں اس طرح انہوں نے ۹۲ ایسے شعراء کے حالات پر روشنی ڈالی ہے جن کا تعلق دول یورپ اور امریکہ سے رہا ہے۔ ترتیب روایتاً "تخلص کے حروف تہجی کے لحاظ سے ہے لیکن معلومات کے لحاظ سے جامع اور مبسوط تراجم قلم بند کئے ہیں اس میں دور جدید کے شعراء بھی ہیں ضروری ہے کہ ایک "قاموس شعرائے اردو" مرتب کی جائے اور انہیں بھی ان میں جگہ دی

جائے۔

**مرثیہ نگاران امروہہ : مرتب عظیم امروہوی : کراچی : ۱۹۸۴ء**

برصغیر پاک و ہند کے ہر خطہ میں اردو کا ایک مرکز ضرور قائم ہے جو اپنی مخصوص روایات میں پروان چڑھا اور کسی خاص مصنف کی وجہ سے ممتاز رہا۔ انھیں میں سرزمین امروہہ بھی ہے جو سادات کا شہر کہلاتا ہے۔ وہاں شعروادب کی روایت عرصہ سے قائم ہے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کرنے والے شاعر وہاں پیدا ہوئے اردو کی تاریخ ادب میں مصحفی کو کون فراموش کرسکتا ہے جو ناسخ اور آتش کے استاد تھے۔ امروہہ میں لکھنؤ کی طرح مرثیہ نگاری وہاں کے سادات کی توجہ اور دلچسپی کی وجہ سے زیادہ مقبول رہی اس لئے عظیم امروہوی نے وہاں کے مرثیہ گو شعراء کا ایک تذکرہ مرتب کیا ہے جس میں ہر دور کے شعراء شامل ہیں۔ آغاز گیارہویں صدی ہجری کے شاعر سید اسماعیل سے کیا گیا ہے۔ دوسرے دور میں بارہویں صدی ہجری کے نصف اول کے شاعر تیسرے دور میں اس صدی کے نصف آخر کے شاعر چھٹے دور میں چودہویں صدی کے نصف اور ساتویں میں اس صدی کے نصف آخر کے شاعروں کو شامل کیا ہے جن کی ترتیب بلحاظ حروف تہجی نہیں بلکہ بلحاظ زمانہ ہے۔ ان میں چند ہی نام ہیں جو پاک و ہند سے شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن اکثر کا حال تذکروں اور بعض کا تواریخ میں موجود ہے۔ اس بکھرے ہوئے ذخیرے کو محنت و کاوش سے جمع کرکے حسن ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ دور قدیم کے شاعروں میں مصحفی کا نام ملتا ہے تو بعد کے ادوار میں مولوی سید شفیق ایلیا، سید قائم رضا نسیم، سید محمد مہدی رئیس کے نام بھی شامل ہیں۔ شعراء کے حالات زندگی مستند ماخذات سے حاصل کئے گئے اور ان کے حوالے بھی دیئے گئے۔ اصل موضوع مرثیہ نگاری ہے اس صنف کے نمونے تو بکثرت ہیں لیکن اگر شاعر نے کسی اور صنف میں طبع آزمائی کی ہے تو اس کا حال بھی درج ہے۔ اس نوع کے تذکرے تاریخ کی تکمیل اور اردو کی خدمت کرنے والوں کے نام زندہ رکھنے کی سعی کے حوالے سے اہمیت رکھتے ہیں۔

**غزل نما : ادا جعفری : کراچی : ۱۹۸۷ء**

تذکرہ نگاری کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان کا سلسلہ قدیم دور سے جاری ہے۔ میر کا تذکرہ "نکات الشعراء" کو تقدم حاصل ہے جن شعراء کے قدیم تذکروں میں تراجم شامل ہیں ان کے نام صرف حوالے کے طور پر لئے جاتے ہیں نہ تو ان کے بارے میں مزید تحقیق کی گئی اور نہ ان میں سے اکثر کو تاریخ ادب میں وہ مقام ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ ادا جعفری نے ایسے ہی شعراء کو



"غزل نما" میں متعارف کروانے کی کوشش کی ہے ان کے پیش نظر ایسے شعراء رہے جن کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ

"سب سے اہم بات یہ ہے کہ "غزل نما" اپنی سوچ کو حرف کا پیکر عطا کرنے والوں کے سفر کی روداد ہے۔ ان اشعار کا تقابل شاعری کے اعلیٰ فن پاروں سے جائز نہیں سفر کے کس مرحلے پر کس کی سانس ٹوٹ گئی اور کس نے منزل کو جالیا اس کا فیصلہ انفرادی صلاحیت پر بھی تھا اور وقت کے ہاتھ میں بھی۔" (۱۰۷)

"غزل نما" تذکرہ ہے لیکن مفصل ترتیب روایتی طور پر حرف تہجی کے لحاظ سے نہیں کی گئی بلکہ تاریخی اعتبار سے ہے۔ اس طرح تسلسل زمانہ کے ساتھ شعراء سامنے آتے ہیں جس کے ذریعہ زبان میں تبدیلی خیال میں نیا پن اور قوت اظہار میں اضافہ کی بآسانی نشاندہی ہوتی ہے۔ مصنفہ نے تاریخ شاعری کی ترتیب کے لئے اچھا خام مواد فراہم کردیا ہے۔

**چند فارسی شعراء : ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان : حیدر آباد سندھ : ۱۹۸۹ء**

ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان تحقیق کے حوالے سے ایک نمائندہ شخصیت سمجھے جاتے ہیں انہوں نے ادب کے ایسے گوشوں سے قارئین کو روشناس کروایا ہے جن تک رسائی آسان نہ تھی وہ اردو کے علاوہ عربی اور فارسی پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ اپنی کتاب چند فارسی شعراء کے ذریعہ ادب کے ذخیرہ علم وادب میں اہم اضافہ کیا ہے موجودہ زمانہ میں فارسی سے واقفیت برائے نام رہ گئی ہے اردو دان طبقہ فارسی شعراء میں بیشتر کے نام سے واقف ہے لیکن ان کے حالات زندگی، زمانہ اور خصوصیات شاعری سے لاعلم ہے مصنف نے اس کمی کو اپنی کتاب کے ذریعہ پورا کیا ہے اور بالواسطہ طور پر ان سے واقف کروایا ہے۔

کتاب میں حکیم ارزقی، عثمان مختاری، عمادی غزنوی، عبدالواسع جبلی، سوزنی، ظہیر، سنائی، رضی الدین نیشاپوری، نجیب الدین جرباد قانی، خواجہ حسن مروی کاملی، مظہر، امیر خسرو، بیدل، غالب، صہبائی، حالی، ادیب صابر الوری کے حالات زندگی اور کلام کی خصوصیات مع نمونہ کلام شامل کئے ہیں۔ مصنف کی تحریر کا رجحان تحقیقی بھی ہے اور تنقیدی بھی، مصدقہ حوالوں اور ماخذات کی نشاندہی کے ساتھ سوانح عمریاں مرتب کی ہیں اگرچہ یہ طویل نہیں ہیں مختصر ہونے کے باوجود متعلقہ تمام معلومات سے پر ہیں۔

**ایک علمی خاندان : شفقت رضوی : کراچی : ۱۹۹۰ء**

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے علمی، ادبی اور مذہبی مرتبے کی بناء پر ہمیشہ قابل احترام سمجھے گئے ہیں ان کی سیاسی روش سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن ان کے متذکرہ اوصاف سے اجتناب

ممکن نہیں ان کی زندگی اور خدمات پر درجنوں کتابیں بھارت اور پاکستان میں لکھی جا چکی ہیں لیکن ان کے خاندانی حالات کے بارے میں تفاصیل یکجا نہیں ملتیں اس موضوع پر یہ پہلی کاوش ہے جو کسی بھی اعتبار سے ناکام نہیں مؤلف نے ہر اختلافی مسئلہ خصوصاً "برصغیر کی سیاست کے بیان سے گریز کر کے اپنے مطالعہ اور تحریر کو موضوع کی حد تک محدود رکھا ہے۔ اس کتاب میں مؤلف نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ مولانا آزاد اپنے خاندان کی واحد علمی شخصیت نہیں تھے بلکہ ہمہ خانہ آفتاب تھا۔ ان کے والد مولانا خیرالدین دہلوی ایک عالم دین، شیخ طریقت اور متعدد مذہبی کتب کے مصنف ہونے کے علاوہ اردو فارسی اور عربی کے شاعر بھی تھے۔ مؤلف نے ان سب کے نمونے بھی شامل کتاب کئے ہیں اور چند کتابوں کے سرورق کے عکس بھی دیئے ہیں۔ مولانا آزاد کے بڑے بھائی ابوالنصر یاسین آہ، عالم دین، خطیب، شاعر، ادیب، صحافی کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے ان کی کتاب "الخیام" اس موضوع پر اردو میں پہلی تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ آہ کا کلام اور ان کے مضامین اس دور کے مشہور اور معیاری رسائل میں چھپتے اور پسند کئے جاتے یہاں تک کہ ان کے مضامین کے بلند معیار اور اشعار کے حسن کی وجہ سے بعض اہل قلم نے انہیں مولانا آزاد سے منسوب کردیا ہے۔ مؤلف نے ان کی نشاندہی کردی ہے۔ **الخیام** کا سرورق اور اس کی فہرست مضامین شامل کرنے کے علاوہ ان کا وہ تمام کلام یکجا کردیا ہے جو رسائل میں شائع ہوا اور ان کے حوالے بھی درج کردیئے ہیں۔ غالباً "کتاب کی ضخامت مانع تھی کہ ان کے شائع شدہ مضامین شامل نہیں کئے بلکہ ان کی فہرست، موضوع کی صراحت اور خصوصیات کے ساتھ دی ہے آہ کو مولانا آزاد نے بھی بڑا شاعر اور ادیب مانا ہے اس میں کسی جانبداری کو دخل نہیں لیکن وہ کم عمری میں انتقال کر گئے اس لئے ان کی شہرت نے دوام حاصل نہیں کیا۔ مولانا آزاد کی بہنوں آرزو بیگم اور آبرو بیگم کا احوال بھی درج ہے۔ وہ خواتین بھوپال میں قیام پذیر تھیں لیکن اس دور میں خواتین کی تعلیمی اصلاح کی جو تحریکات برصغیر کے گوشے گوشے میں جاری ہوئیں ان سے ان کا قریبی تعلق رہا۔ خصوصاً " آل انڈیا خواتین کانفرنس کی وہ فعال رکن ہیں۔ آبرو بیگم کی متعدد تقریروں اور ان کے اشعار کے ذریعہ ان کے خیالات اور نظریات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہی آبرو بیگم ہیں جن کے بارے میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا آزاد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انھوں نے مولانا آزاد کو اردو پڑھائی تھی۔ ان کے حالات کے ضمن میں نہایت اہم ان کے خطوط ہیں جن کے عکس دیئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ تاج دلہن، زلیخا بیگم اہلیہ مولانا آزاد کی شخصیت کی پیشکش میں ان کی نجی ڈائری کے اوراق سے استفادہ کرتے ہوئے کمال مہارت سے کام لیا ہے ان کے علاوہ مولانا کے



خسر آفتاب الدین اور برادر نسبتی بدرالدین کے مختصر کوائف اور مولانا سے ان کے تعلق خاطر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

موضوع کے لحاظ سے گراں بہا معلومات درج ہونے کے سوا خطوط کے عکس، کتابوں کے سرورق کے عکس اور آرزو بیگم اور آبرو بیگم کی تصاویر اس کتاب کی اہم خصوصیات ہیں ان خواتین کی تصاویر پہلی بار منظر عام پر آئی ہیں۔ "شعبہ ابوالکلامیات" کے تحت یہ منفرد انداز کا اضافہ ہے۔

علمی، ادبی و فنی شخصیات کی مختصر، جزوی انفرادی و اجتماعی سوانح عمریوں کی نوعیت اور ان کے رجحان کا اندازہ اس تجزیے سے ہوجاتا ہے جو اس سے قبل میں پیش کیا گیا۔ ان میں نہ تو ندرت بیان ہے نہ وہ ذوق تحقیق کی بناء پر لکھی گئی ہیں۔ چند اہم واقعات اور محدود معلومات کو سرسری اور اجمالی طور پر پیش کردیا ہے اس لئے ایسی تمام تحریروں کا جائزہ لینا لاحاصل ہے۔ یہاں اس نوعیت کی سوانح عمریوں کی نشاندہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

## مختصر و جزوی سوانح عمریاں

### ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

۔ فائزہ دہلوی، حیات و شاعری از مسعود حسین رضوی ادیب، (مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۷ء)، نظیر اکبر آبادی، ان کا عہد اور شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، (مطبوعہ کراچی ۱۹۵۷ء)، میاں داد خان سیاح از ظہیرالدین مدنی (مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۵۷ء)، ارمغان امجد مرتبہ خواجہ حمیدالدین شاہد (مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۵۷ء)، حیدر آباد کے بڑے لوگ از سید غلام پنجتن (مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۵۷ء)، میر حسن اور ان کا زمانہ از ڈاکٹر وحید قریشی (مطبوعہ ۱۹۵۹ء)، مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام از عبدالرزاق قریشی (مطبوعہ بمبئی ۱۹۶۱ء) انشاءاللہ خان، عہد اور فن از اسلم پرویز (مطبوعہ دہلی ۱۹۶۱ء) جگر، فن اور شخصیت از شارب ردولوی (مطبوعہ الہ آباد ۱۹۶۱ء)، مذہب عشق (نہال چند لاہوری) مرتبہ و مقدمہ خلیل الرحمان داؤدی (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۱ء)، حیات لطف از ثمینہ شوکت (مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۶۳ء)، مہتاب داغ مرتبہ و مقدمہ سید سبط حسن (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء) نورتن مرتبہ و مقدمہ خلیل الرحمان داؤدی (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء)، مرزا محمد ہادی رسوا، حیات اور کارنامے از میمونہ بیگم (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء)، مثنوی بہار دانش مرتبہ و مقدمہ خلیل الرحمان داؤدی (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء) اخلاق ہندی (بہادر علی حسینی) مرتبہ و مقدمہ ڈاکٹر

وحید قریشی' (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء) شکنتلا (کاظم علی جوان) مرتبہ و مقدمہ ڈاکٹر محمد اسلم' (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء) خرد افروز (حفیظ الدین احمد) مرتبہ و مقدمہ ڈاکٹر عابد علی عابد' مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء) سروش سخن (فخر الدین حسین سخن) مرتبہ و مقدمہ خلیل الرحمان داؤدی (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء) جوہر اخلاق (جیمز فرانسس کارکرن مرتبہ و مقدمہ ڈاکٹر محمد باقر' (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء) کلیات مومن مرتبہ و مقدمہ کلب علی خان فائق' (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء) کلیات شیفتہ مرتبہ وہ مقدمہ کلب علی خان فائق (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء) کلیات نظام مرتبہ و مقدمہ کلب علی خان فائق (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء) کلیات نسیم مرتبہ و مقدمہ کلب علی خان فائق (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء) باغ اردو (شیر علی افسوس) مرتبہ و مقدمہ کلب علی خان فائق (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء)' توتا کہانی (حیدر بخش حیدری) مرتبہ و مقدمہ ڈاکٹر اسلم قریشی (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء)' آرائش محفل (حیدر بخش حیدری) مرتبہ و مقدمہ ڈاکٹر اسلم قریشی' (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء)' بیتال پچیسی (مظہر علی خان ولا) مرتبہ و مقدمہ گوہر نوشاہی' (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء) نتائج المعانی (محمود بیگ راحت) مرتبہ و مقدمہ گوہر نوشاہی' (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء) سرور سلطانی (رجب علی بیگ سرور) مرتبہ و مقدمہ آغا سہیل' (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء) بہارستان ناز (حکیم فصیح الدین رنج) مرتبہ و مقدمہ خلیل الرحمان داؤدی' (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء)' میر انیس از سفارش حسین رضوی (مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء) میر انیس از محمد حسین حسان' (مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء) مرزا سودا' حیات اور ناول نگاری از آدم شیخ' (مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۵ء) مطالعہ امیر از ابو محمد سحر' (مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۵ء) مطالعہ سودا از محمد حسن (مطبوعہ کراچی ۱۹۶۵ء)' مثنویات میر حسن مرتبہ و مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی' (مطبوعہ کراچی ۱۹۶۶ء)' مطالعہ شاد از عطا کاکوروی (مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۶ء)' مرزا محمد رفیع سودا مرتبہ خلیق انجم (مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۶ء) کلیات سالک مرتبہ و مقدمہ کلب علی خان فائق (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء) کلیات قلق مرتبہ و مقدمہ کلب علی خان فائق' (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء)' اخوان الصفا (شیخ اکرم علی) مرتبہ و مقدمہ ڈاکٹر احراز نقوی (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء) گلستان سخن (تذکرہ: قادر بخش صابر) مرتبہ و مقدمہ خلیل الرحمان داؤدی (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء) بہادر شاہ ظفر' فن اور شخصیت از خواجہ تہور حسین (مطبوعہ کراچی ۱۹۶۷ء) کلیات غالب (فارسی) مرتبہ و مقدمہ مرتضیٰ حسین فاضل (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء) کلیات نظم حالی مرتبہ و مقدمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء) فانی' حیات' شخصیت اور شاعری کا تنقیدی مطالعہ از مفتی تبسم (مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۶۹ء) وحید الدین سلیم' حیات اور ادبی خدمات از منظر عباس نقوی' (مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۹ء) کلیات انشاء مرتبہ و مقدمہ خلیل الرحمان داؤدی (مطبوعہ



لاہور ۱۹۶۹ء) منور لکھنوی' شخصیت اور شاعری از راج نارائن (مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۷۰ء) دین یار جنگ' زندگی اور کام از برق موسوی (مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۷۱ء) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' سوانح اور ادبی خدمات از مرزا ممتاز اختر (مطبوعہ دہلی ۱۹۷۱ء) مثنوی ہشت وعدل اور واسخت (محمود بیگ راحت) مرتبہ و مقدمہ گوہر نوشاہی' (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء) حضرت نظام الدین اولیاء' حیات اور تعلیمات از پروفیسر محمد حبیب' (مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء) نوح ناروی' حیات اور شاعری از ظفر اسلام' (مطبوعہ دہلی ۱۹۷۳ء) کلیات جرات مرتبہ و مقدمہ ڈاکٹر اقتدا حسن' مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء) ممنون' حیات اور شخصیت اور شاعری از منشاء الرحمان منشاء (مطبوعہ ناگپور ۱۹۷۳ء)' منتخب مراثی انیس مرتبہ وہ مقدمہ مرتضیٰ حسین فاضل' (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء) تذکرہ گلشن بے خار (شیفتہ) مرتبہ و مقدمہ' کلب علی خان فائق (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء) البیرونی از خاطر غزنوی (مطبوعہ کراچی ۱۹۷۳ء)' میران جی شمس العشاق از محمد ہاشم علی' (مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۷۴ء) ریاض خیر آبادی از خلیق اللہ خان (مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۷۴ء) مسعود حسین ادیب مرتبہ مالک رام (مطبوعہ دہلی ۱۹۷۴ء) توفیق حیدر آبادی' حیات اور شاعری از سید موسیٰ کاظم (مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۷۴ء) تاج اولیاء حضرت لعل شہباز قلندر شائع کردہ محکمۂ اطلاعات سندھ (مطبوعہ کراچی ۱۹۷۴ء) شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری از وہاب اشرفی (مطبوعہ گیا ۱۹۷۴ء) مولانا محمد علی شخصیت اور خدمات از سید نظر برنی (مطبوعہ دہلی ۱۹۷۶ء)' کلیات میر مرتبہ و مقدمہ کلب علی خان فائق (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء)' کلیات سودا مرتبہ و مقدمہ ڈاکٹر شمس الدین قادری (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء)' دیوان میر مہدی مجروح مرتبہ و مقدمہ ریاض احمد چوہدری (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء)' مولانا ظفر علی خان' احوال و آثار از نظیر حسنین زیدی (مطبوعہ لاہور ۱۹۸۱ء) ڈاکٹر زور' شخصیت اور کارنامے از عطیہ رحمانی (مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۸۲ء) خطوط ماجدی مرتبہ و مقدمہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری (مطبوعہ کراچی ۱۹۸۶ء) امجد سے شاذ تک مرتبہ ادارہ اخبار سیاست (مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۸۸ء) محی الدین قادری زور' مرتبہ خلیق انجم (مطبوعہ دہلی ۱۹۸۹ء)

## مختصر' اجتماعی سوانح عمریاں

## ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

حیدر آباد کے قانون دان از خواجہ حسن نظامی (مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۳۹ء)' راہ رو اور کاروان از حفیظ قتیل (مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۵۰ء)' تذکرۂ نادر مرتبہ مسعود حسین رضوی ادیب

(مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۷ء)' حیدر آباد کے ادیب از زینت ساجدہ (مطبوعہ حیدر آباد دکن' جلد اول ۱۹۵۸ء جلد دوم ۱۹۶۳ء) حیدر آباد کے شاعر از خواجہ حمید الدین شاہد' (مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۵۸ء)' تذکرہ شعرائے جے پور از احترام الدین احمد شاغل (مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء) میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعراء از محمود فاروقی (مطبوعہ لاہور ۱۹۵۹ء) ۱۸۵۷ء کے غدار شعراء از امداد صابری' (مطبوعہ دہلی ۱۹۶۰ء)' تذکرۂ شاعرات پاکستان از شفیق بریلوی (مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء) حیدر آباد کے شاعر از سلیمان ادیب (مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۶۳ء)' میر اور سودا کا دور از ثناء الحق صدیقی (مطبوعہ کراچی ۱۹۶۳ء)' بزم غالب (غالب کے معاصرین اور تلامذہ کا تذکرہ) از عبدالروف عروج (مطبوعہ کراچی ۱۹۶۹ء)' اسلاف انیس از مسعود حسین رضوی ادیب' (مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۷۰ء) تذکرہ مسلم شعرائے بہار (۵ جلدیں) از حکیم سید احمد اللہ (مطبوعہ کراچی ۱۹۷۰ء)' تذکرہ فارسی شعرائے اردو از عبدالروف عروج (مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء) سخنوران قصبہ کڑہ از محمود واصل (مطبوعہ کراچی ۱۹۷۸ء)' تذکرۂ نعت گویاں (دو حصے) از سید یونس شاہ (مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء)' سخنوران گجرات از سید ظہیرالدین مدنی' (مطبوعہ ۱۹۸۲ء)' تذکرۂ نعت گو شاعرات از ابو سلمان شاہجہانپوری (مطبوعہ کراچی ۱۹۸۴ء)' تذکرہ مرثیہ نگاران اردو (دو حصے) از سید امیر علی جونپوری (مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۸۶ء)' مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۸۶ء' تین شاعر مرتبہ وزیرالحسن وغیرہ (مطبوعہ کراچی ۱۹۸۷ء)

"مقتدرہ قومی زبان" اسلام آباد کی طرف سے اردو زبان وادب سے متعلق مختلف موضوعات پر جو پمفلٹ شائع کئے جارہے ہیں ان میں سے ایک سلسلہ "مشاہیر اردو" سے تعلق رکھتا ہے جس کے تحت اردو کے معروف قلم کاروں کے بارے میں جملہ معلومات کو جدید تحقیقی انداز میں اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے تاکہ وہ دانشور جنھوں نے اپنی ساری زندگی اردو زبان وادب کی خدمت کے لئے وقف کئے رکھی ان کی علمی وادبی خدمات کی تفصیلات یکجا ہو جائیں اور زبان و ادب کے طلباء عام قارئین اور آئندہ کام کرنے والے محقق اس سے استفادہ کر سکیں۔"

اس سلسلہ میں جو کتابچے "کتابیات" کے طور پر شائع ہوئے ہیں ان کی ابتدا میں "مختصر سوانحی خاکہ" کا التزام بھی رکھا گیا ہے جو حالات زندگی کے بارے میں بنیادی مواد کا حامل ہوتا ہے۔ ۱۹۹۰ء سے قبل جو کتابچے مع مختصر سوانحی خاکہ شائع ہوئے حسب ذیل ہیں۔

آغا حشر کاشمیری از ڈاکٹر اے بی اشرف (۱۹۸۶ء)' سید مسعود حسین رضوی از ڈاکٹر طاہرہ تونسوی (۱۹۸۶ء) عزیز احمد از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ (۱۹۸۶ء) امام بخش ناسخ (۱۹۸۷ء) حکیم احمد



شجاع از ڈاکٹر اے بی اشرف (۱۹۸۷ء)' خواجہ حیدر علی آتش از صابر کلوری (۱۹۸۷ء) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم از ڈاکٹر ممتاز گوہر (۱۹۸۷ء)' ڈپٹی نذیر احمد از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷ء) سید عابد علی عابد از ڈاکٹر عبدالروف شیخ (۱۹۸۷ء) محمد دین فوق از اجمل نیازی (۱۹۸۷ء) مرزا غالب از ڈاکٹر انعام الحق کوثر (۱۹۸۷ء)' نسیم حجازی از ڈاکٹر تصدق حسین زیبا (۱۹۸۷ء)' ڈاکٹر سید عبداللہ از سید جمیل احمد رضوی (۱۹۸۹ء)' ممتاز شیریں از ڈاکٹر انوار احمد (۱۹۸۹ء)' مولانا صلاح الدین احمد ڈاکٹر انور سدید (۱۹۸۹ء)

# باب دوم

## مصادر و ماخذات

١ "The histrory of a particular mans life"

The development of English biography by Herald

Nicolson(Fifth edition)London 1966.P.71

٢ "Biography is if various kinds of narrative Retaining That

which is most easily read and

most easily applied to the persons life-"

Biography is an art by James L. Clifford New York 1962.

۳- یادگار حالی : صالحہ عابد حسین : مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی : ستمبر ۱۹۴۹ء : صفحہ ۸

۴- حوالہ مذکورہ بالا : صفحہ ۱۱

۵- پیش لفظ یادگار حالی از مولانا ابوالکلام آزاد : حوالہ مذکورہ بالا : صفحہ ۱۱

۶- ڈاکٹر سید شاہ علی : اردو میں سوانح نگاری : رائٹرز گلڈ پاکستان : ۱۹۶۱ء : صفحہ ۵۴

۷- آثار ابوالکلام آزاد : قاضی عبدالغفار : کوہ نور پرنٹنگ پریس : دہلی ۱۹۴۹ء : صفحہ ۱۰

۸- آثار ابوالکلام آزاد : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۱

۹- آثار ابوالکلام آزاد : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۵۴

۱۰- پریم چند : ہنس راج : رہبر : حالی پبلشنگ ہاؤس : دہلی : ۱۹۵۰ء : صفحات ۲۴، ۲۵

۱۱- دیباچہ ذکر غالب از سید عابد حسین : مکتبہ جامعہ ملیہ : دہلی : اکتوبر ۱۹۵۰ء : صفحہ ۸

۱۲- ذکر غالب : مالک رام : مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی : اکتوبر ۱۹۵۰ء : صفحات ۵۵، ۳۶

۱۳- حیات سرسید : نورالرحمان : انجمن ترقی اردو ہند : علی گڑھ : جولائی ۱۹۵۰ء : صفحات ۵۵، ۵۶

۱۴- حیات سرسید : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۵۶

۱۵- حکیم الامت، نقوش و تاثرات : عبدالماجد دریا بادی : طبع معارف : اعظم گڑھ : ۱۹۵۳ء

۱۶۔ حکیم الامت، نقوش و تاثرات : صفحہ ۱۳۹

۱۷۔ میر تقی میر، حیات و شاعری : انجمن ترقی اردو ہند : علی گڑھ : جولائی ۱۹۵۳ء : صفحہ ۱۳

۱۸۔ ذکر اقبال : عبدالمجید سالک : دین محمدی پریس : لاہور : ۱۹۵۵ء : صفحہ ۳

۱۹۔ ذکر اقبال : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۰

۲۰۔ ذکر اقبال : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۳

۲۱۔ ذکر اقبال : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۳

۲۲۔ حضرت امیر خسرو : تقی محمد خان خورجوی : ٹائمز پریس : کراچی : ۱۹۵۶ء : صفحہ ۱۱

۲۳۔ حضرت امیر خسرو : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۱

۲۴۔ شبلی ایک دبستان : ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی : ڈھاکہ : ۱۹۵۷ء : صفحہ

۲۵۔ داغ : تمکین کاظمی : آئینہ ادب : لاہور : ۱۹۶۰ء : صفحہ ۱۵

۲۶۔ داغ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۷

۲۷۔ داغ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۷

۲۸۔ مومن، حالات زندگی اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر : کلب علی خان فائق رام پوری : مجلس ترقی ادب اردو : لاہور : ۱۹۶۱ء : صفحہ ۲۷

۲۹۔ مومن اور مطالعۂ مومن : ڈاکٹر عبادت بریلوی : صفحہ ۲۸

۳۰۔ مومن اور مطالعۂ مومن : ڈاکٹر عبادت بریلوی : اردو مرکز : کراچی : نومبر ۱۹۶۱ء : صفحہ ۱۱

۳۱۔ مومن اور مطالعۂ مومن : ڈاکٹر عبادت بریلوی : کراچی : نومبر ۱۹۶۱ء : صفحہ ۱۱

۳۲۔ مومن اور مطالعۂ مومن : صفحہ ۴۳

۳۳۔ مومن اور مطالعۂ مومن : صفحہ ۴۳

۳۴۔ مومن اور مطالعۂ مومن : صفحہ ۴۳

۳۵۔ تذکرہ جگر : محمود علی خان جامعی : اردو اکیڈمی سندھ : کراچی : ۱۹۶۱ء : صفحہ ۱۲

۳۶۔ تذکرہ جگر : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۹



۳۷۔ محمد حسین آزاد (جلد اول) : ڈاکٹر اسلم فرخی : انجمن ترقی اردو پاکستان : ۱۹۶۱ء : صفحہ ۳۵۸

۳۸۔ حیات سلمان : شاہ معین الدین ندوی : مطبع معارف، اعظم گڑھ : ۱۹۷۳ء : صفحہ ۶۷۷

۳۹۔ حیات سلمان : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۷۹

۴۰۔ علامہ سید سلمان ندوی، شخصیت اور ادبی خدمات : محمد نعیم صدیقی ندوی : مکتبۂ فردوس : لکھنؤ : ۱۹۷۳ء : صفحہ ۷، ۸

۴۱۔ علامہ سید سلمان ندوی، شخصیت اور ادبی خدمات : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۸

۴۲۔ حیات سلمان : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۶

۴۳۔ ابوالکلام آزاد : عرش ملسیانی : دہلی : اگست ۱۹۷۴ء : پیش لفظ

۴۴۔ ناسخ، تجزیہ و تقدیر : سید شبیہہ الحسن نونہروی : اردو پبلشرز، لکھنؤ : ۱۹۷۵ء : صفحہ ۷، ۸

۴۵۔ ناسخ، تجزیہ و تقدیر : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۲

۴۶۔ ناسخ، تجزیہ و تقدیر : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۲

۴۷۔ ناسخ، تجزیہ و تقدیر : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۲

۴۸۔ ناسخ، تجزیہ و تقدیر : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۲

۴۹۔ مولانا حیدر حسن : عبدالسلام ندوی : مطبع معارف، اعظم گڑھ : ۱۹۷۵ء : صفحہ ۱۰

۵۰۔ امیر خسرو دہلوی : ممتاز حسین : کراچی : ۱۹۷۵ء : صفحہ ۱۳۶

۵۱۔ امیر خسرو دہلوی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۴۷

۵۲۔ اختر شیرانی اور جدید اردو ادب : ڈاکٹر یونس حسنی : انجمن ترقی اردو پاکستان : کراچی : صفحہ ۴۲

۵۳۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد، حیات اور ادبی خدمات : ڈاکٹر حبیب ضیاء : نگاہ پبلی کیشنز : حیدر آباد دکن : ۱۹۷۸ء : صفحہ ۱۰

۵۴۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد، حیات اور ادبی خدمات : حوالہ مذکورہ ۴۶

۵۵۔ زندہ رود : جاوید اقبال : شیخ غلام علی اینڈ سنز : لاہور : ۱۹۷۹ء : صفحہ ۴

٥٦- زندہ رود جلد اول : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٩

٥٧- زندہ رود جلد اول : حوالہ مذکورہ : صفحہ ١٢

٥٨- زندہ رود جلد اول : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٤٥

٥٩- زندہ رود جلد دوم : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٢٥٠

٦٠- زندہ رود جلد دوم : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٢٥١

٦١- مرزا علی لطف' حیات اور کارنامے : مرزا اکبر علی بیگ : ادارہ شعر و حکمت : حیدر آباد دکن : ١٩٧٩ء : صفحہ ٦٠

٦٢- مرزا علی لطف : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٦٠

٦٣- فکر تونسوی حیات' شخصیت اور طنز نگاری : یوگس حیدر آبادی : زندہ دلان حیدر آباد دکن : مئی ١٩٨٠ء : صفحہ ٥٧

٦٤- فکر تونسوی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٦٣

٦٥- صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی : شمس تبریز : مجلس اشاعت اسلام : کراچی : ١٩٨١ء : صفحہ ٩٨

٦٦- صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٣٦١

٦٧- محمد حسین آزاد : آغا سلمان باقر : سنگ میل پبلی کیشنز : لاہور : ستمبر ١٩٨١ء : صفحہ ١٣

٦٨- مرزا سلامت علی دبیر : مرزا محمد زمان آزردہ : مرزا پبلیکیشنز : رعنا وادیٔ سرینگر : ١٩٨١ء : صفحہ ٧

٦٩- حضرت خواجہ میر درد دہلوی : ڈاکٹر عبادت بریلوی : ادارہ ادب و تنقید : لاہور : ١٩٨٣ء : صفحات ٦' ٧

٧٠- عبدالحق' مختار الدین احمد : ساہتیہ اکادمی : نئی دہلی : ١٩٨٣ء : صفحہ ١٢

٧١- عبدالحق : حوالہ مذکورہ : صفحہ ١٢

٧٢- عبدالحق : حوالہ مذکورہ : صفحہ ١٣

٧٣- عبدالحق : حوالہ مذکورہ : صفحہ ١٣

٧٤- عبدالحق : حوالہ مذکورہ : صفحہ ١٤' ١٥

٧٥- بابائے اردو مولوی عبدالحق' حیات اور کارنامے : شہاب الدین ثاقب : انجمن ترقی



اردو پاکستان : کراچی : ١٩٨٥ء : صفحہ ١٣

٧٦- بابائے اردو مولوی عبدالحق حیات اور کارنامے : حوالہ مذکورہ : صفحات ٢١' ٢٢

٧٧- تذکرۂ سلیمانی : غلام محمد : ادارۂ مجلس علمی : کراچی : ١٩٨٠ء : صفحات ١١' ١٢

٧٨- آغا حشر کاشمیری : ڈاکٹر شمیم ملک : مجلس ترقی ادب : لاہور : ١٩٨٦ء : صفحہ ١

٧٩- آغا حشر کاشمیری : حوالہ مذکورہ : صفحہ ١٣

٨٠- آغا حشر کاشمیری : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٥٦

٨١- فیض احمد فیض : کے کے کھلر : ادارہ فکر جدید : نئی دہلی : ١٩٩٠ء : صفحہ ٤١

٨٢- فیض احمد فیض : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٤٤

٨٣- فیض احمد فیض : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٤٦

٨٤- فیض احمد فیض : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٤٩

٨٥- فیض احمد فیض : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٧٧

٨٦- فیض احمد فیض : حوالہ مذکورہ : صفحہ

٨٧- کلیات حسرت موہانی : مرتبہ مولانا جمال میاں فرنگی محلی : شیخ غلام علی اینڈ سنز : پاکستان : ١٩٥٧ء : صفحہ ٢٧

٨٨- کلیات حسرت موہانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٢٨

٨٩- کلیات حسرت موہانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٣١

٩٠- سرسید احمد خان : انیس حسن الدین احمد : اورینٹل اکیڈمی : حیدر آباد دکن : ١٩٩١ء : صفحہ ٤

٩١- آئینہ ایام اقبال : نسیم فاطمہ : کراچی : ١٩٧٩ء : مقدمہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

٩٢- میر انیس : ڈاکٹر فرمان فتح پوری : اردو اکیڈمی سندھ : کراچی : نومبر ١٩٦١ء : صفحہ ١٧

٩٣- شاد عظیم آبادی' ایک تحقیقی جائزہ : خاور حسین بلگرامی : کراچی : ١٩٨٧ء : صفحہ ١٢

٩٤- مخدوم محی الدین' حیات اور کارنامے : عطاء الرحمان مقبول پور' بہار : صفحہ ٥

٩٥- مخدوم محی الدین' حیات اور کارنامے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ٦

۹۶- مخدوم محی الدین' حیات اور کارنامے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۹

۹۷- مخدوم محی الدین' حیات اور کارنامے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۵

۹۸- مخدوم محی الدین' حیات اور کارنامے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۸۲

۹۹- شبلی کی حیات معاشقہ : ڈاکٹر وحید قریشی : مکتبۂ جدید : لاہور : ۱۹۵۰ء : صفحہ ۲۶

۱۰۰- شبلی کی رنگین زندگی : محمد امین زبیری : فاروق عمر پبلشرز : لاہور ۱۹۵۲ء : صفحہ ۵

۱۰۱- شبلی کی رنگین زندگی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۶

۱۰۲- سخنور : تذکرہ شعرائے پاکستان : سلطانہ مہر : ادارۂ تحریر' کراچی' ۱۹۷۹ء : صفحہ ۱۰

۱۰۳- سخنور : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۱

۱۰۴- سخنور : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۵

۱۰۵- امیر مینائی اور تذکرہ کریم الدین احمد : آئینۂ ادب : لاہور : ۱۹۸۲ء : صفحہ ۱۶

۱۰۶- اردو کے یورپین شعراء : شفقت رضوی : ماڈرن پبلشر : کراچی : ۱۹۸۱ء : صفحہ ۱۷

۱۰۷- غزل نما : ادا جعفری : انجمن ترقی اردو پاکستان : کراچی : ۱۹۸۷ء : صفحہ ۱۰' ۱۱



# باب سوم

## سیاسی' سماجی اور تاریخی شخصیات کی سوانح عمریاں

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

## تمہید

بیدار مغز اور باشعور اقوام سچائی پر مبنی اپنی تاریخ بھی مرتب کرتی ہیں اور ان سے سبق بھی حاصل کرتی ہیں کیونکہ سابقہ تجربات سے استفادہ کئے بغیر آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کرنا ممکن نہیں۔ تاریخ اور مشاہیر لازم و ملزوم ہیں۔ مشاہیر ہی تاریخ ساز ہوتے ہیں اور تاریخ ان کے کارناموں کی روداد ہوتی ہے۔ آج کی سیاسی اور سماجی شخصیات مستقبل میں تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ اقوام جنہوں نے تاریخ ساز شخصیات پیدا کیں۔ انسانی تجسس تاریخ سے مطمئن نہیں ہوتا وہ مشاہیر کی ذات کے حوالے سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے سوانح عمریاں تحریر کی جاتی ہیں۔

ابتدا میں تاریخ اور سوانح عمری میں فرق نہیں برتا جاتا تھا اور سوانح عمری کو بھی تاریخ کا حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ دونوں کے درمیان فرق کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ تاریخ گزرے ہوئے واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان کرتی ہے جس کے ذریعہ کسی مثبت یا منفی نتیجہ تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اس میں اہمیت واقعات اور نتائج کو دی جاتی ہے جبکہ سوانح عمری شخصیت کے کردار، اوصاف، عزائم، نصب العین، ظاہر اور باطن کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔ شخصیت کی تعمیر نو کا نام سوانح نگاری ہے۔ تاریخ واقعات کے حوالہ سے اور سوانح عمری شخصیت نگاری کے ذریعہ بصیرت کا باعث بنتی ہیں۔

یوں تو تمام اقوام عالم میں تاریخ نگاری اور سوانح نگاری کا جداگانہ شعور کم یا زیادہ رہا ہے لیکن مسلمانوں کو ان ہر دو اصناف سے خصوصی لگاؤ رہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہنگامہ پرور ادوار میں اس قوم نے زیادہ سے زیادہ قد آور شخصیات پیدا کی ہیں اس کی وجہ اس کا عموی مزاج ہے امن و سکون اور آشتی میں یہ قوم تعمیری رجحان سے عاری اور فکر فردا سے غافل ہو جاتی ہے جبکہ آزمائش کی گھڑیوں میں اس کے اصلی جوہر کھلتے ہیں۔ اس قوم کی چودہ سو سالہ تاریخ میں ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والی عظیم ہستیاں پیدا ہوئیں۔ ان کے حالات، کوائف، اقوال، آثار، ملفوظات محفوظ رکھے گئے اور انہی کی مدد سے سوانح عمریاں مرتب کی گئی ہیں۔

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد جس مشترکہ تہذیب نے جنم لیا اس میں جہاں مسلمانوں نے دیگر اقوام کی علمی اور تہذیبی روایات سے استفادہ کیا وہاں بہت کچھ ان اقوام کو دیا بھی ہے۔ انہی میں تاریخ کا شعور اور سوانح عمری کی اہمیت بھی ہیں۔ مسلمانوں اور اقوام ہند کی تاریخ

برصغیر کے حوالے سے مسلمانوں اور اقوام ہند کی سیاسی اور سماجی تاریخ محمد بن قاسم کے وارد سندھ ہونے کے بعد سے مشترک ہے۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں اولالعزم سپاہی، مشترکہ تہذیب کو فروغ دینے والے حکمران اور امراء علم و ادب کی خدمت کرنے والے صوفیاء، علما، سنت، جوگی، بیراگی گزرے ہیں جنہوں نے اپنی خدمات اور کارناموں سے وہ نور پھیلایا ہے جو آنے والی نسلوں کی رہنمائی کا باعث بنا۔ ان تمام ہستیوں کے حالات اور کوائف زندگی کے نشیب و فراز ان کے کردار اور ان پر پڑنے والے اثرات، جذبات و احساسات عام واقعات پر ان کے داخلی اور خارجی ردعمل کو سمجھنے کے شعور، لائحہ عمل تیار کرنے کی صلاحیت، منزل کے تعین کرنے کا شعور اور اس کے حصول کے لئے روبعمل آنے والے عزائم کو سوانح عمریوں میں محفوظ کرلیا گیا ہے۔ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ سوانح نگاری کے فن کے اصول اور لوازمات بھی متعین ہوئے اور ان میں تجربات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ موجودہ دور (۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء) کے سوانح نگاروں نے قدیم اور جدید عہد کی اہم تاریخ، سیاسی اور سماجی شخصیات کے حالات زندگی کو تجسس، تلاش اور تحقیق کے ذریعہ مرتب کیا ہے اور ہر سوانح نگار نے اپنے لگاؤ، رغبت اور عقیدت کے تحت اس کام کو اس طرح سرانجام دیا ہے کہ ان کی زندگی کے کسی گوشے کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ آزادی سے قبل کی کوئی قابل ذکر ہستی ایسی نہ ہوگی جس کی سوانح عمری نہ لکھی گئی ہو۔ البتہ آزادی کے بعد کی شخصیات کے حوالہ سے بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اب بھی ضرورت ہے کہ رن کچھ، کشمیر معرکہ ۱۹۷۱ء کے جاں بازوں کی سوانح عمریاں تصنیف کی جائیں اور اب جبکہ تعصب اور عناد کی گرد بیٹھتی جارہی ہے تو پاکستان کے اہل قلم بھارت کے مشاہیر اور بھارت کے اہل قلم پاکستان کے مشاہیر کی سوانح عمریاں تحریر کریں۔ ان میں تنقید کی گنجائش ہوسکتی ہے لیکن وہ عصبیت سے مبرا ہوں۔

اس باب میں تاریخی، سیاسی اور سماجی شخصیات کی ان سوانح عمریوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان اردو زبان و ادب میں اضافہ کا باعث بنیں۔



# باب سوم (الف)

## سیاسی، سماجی اور تاریخی شخصیات کی مستقل سوانح عمریاں

## ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

## حیات اجمل : قاضی عبدالغفار : دہلی : ۱۹۵۰ء

قاضی عبدالغفار نے حکیم اجمل خان کی زندگی کے اہم واقعات وحالات اور ان کے کردار کا تفصیلی جائزہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ سوانحی حالات تاریخی ترتیب میں اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ ایک ہی زمانہ کے مختلف النوع حالات کو یکجا کردیا ہے جس سے خاص زمانہ میں ان کی ملی، قومی، سیاسی اور پیشہ ورانہ خدمات اجاگر ہوجاتی ہیں لیکن موضوعاتی ترتیب باقی نہیں رہتی۔ یہی اعتراض مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا تھا۔ انہوں نے تحریر کیا ہے

"صاحب سیرت کی زندگی کے مشغلے بڑی مختلف نوعیتوں کے تھے اس لئے سیرت کی ترتیب بہترین یوں ہوسکتی تھی کہ ہر شعبۂ زندگی کا تذکرہ اور اس پر تبصرہ الگ الگ عنوان کے تحت کیا جاتا۔ مثلاً" ایک حصہ طبی خدمات کے لئے وقف ہوتا اور اس کے ماتحت مستقل باب "طبی اداروں کی تشکیل اور معالجہ" "فنی اجتہادات" وغیرہ پر ہوتے۔ اسی طرح ایک حصہ کارناموں کے لئے وقف ہوتا اور اس کے تحت لیگ، کانگریس اور خلافت کمیٹی وغیرہ پر ایک ایک باب ہوتا۔ ایک حصہ "معاصرین سے تعلقات" کی نذر ہوتا۔" (۱)

مروجہ اصول سوانح نگاری میں دونوں طریقے رائج ہیں۔ قاضی عبدالغفار نے تاریخی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔ کتاب میں پیش کردہ معلومات سے حکیم اجمل خان کی زندگی کے اہم واقعات سے بھی واقفیت ہوجاتی ہے۔ ان کے کارناموں اور سیرت کا بھی بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کی سیاسی اور معاشرتی جھلکیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ اس بارے میں مصنف نے خود وضاحت کردی ہے۔

"اس کتاب کی ترتیب میں جو سوانحی حیات بھی ہے اور ایک حد تک ہندوستان کے ایک دور کی سیاسی تاریخ بھی، میں نے تاریخی واقعات کے چوکھٹے میں حکیم صاحب کی تصویر اس طرح لگائی ہے کہ جو کوئی ان کی زندگی کے حالات پڑھے وہ اس زمانے کے سیاسی ماحول سے واقف ہوجائے۔" (۲)

تاریخی صداقتوں کو سچائی کے ساتھ پیش کرنا چاہئے۔ اس معاملہ میں مصنف سے بھول چوک بھی ہوئی ہے۔ ان کے دانشورانہ مرتبہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ان غلطیوں پر حیرت بھی ہوتی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ حکیم صاحب بددل ہوکر ۱۹۲۴ء میں خلافت تحریک سے الگ ہوگئے تھے حالانکہ

واقعہ یہ ہے کہ وہ اواخر ۱۹۲۵ء تک اس کے صدر رہے اور اسی سال خلافت کا جلسہ ان کی قیام گاہ پر ہوا تھا۔

مصنف کو جس حد تک غیر جانبدار ہونا چاہئے اس کا حق بھی ادا نہیں ہوا ہے۔ اس دور کے اکثر لکھنے والے ذہنی تحفظات بلکہ تعصبات کے شکار رہے۔ جہاں اسلام اور اسلامی خدمات کا حوالہ آتا ہے وہ چشم پوشی کر جاتے ہیں۔ مصنف نے بھی یہی رویہ اختیار کیا ہے۔ خلافت تحریک کے حوالہ سے بھی حکیم صاحب کے خیالات کے بجائے مصنف کے خیالات کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اس کی غمازی ان کا یہ جملہ بھی کرتا ہے۔

"اس بے وقوفوں کی جنت سے بعد کے واقعات نے انہیں بہت بے وقوف بنا کر نکالا۔" (۳)

اکبر الہ آبادی کا جہاں ذکر آیا ہے وہاں ان کے لئے بھی بے موقع "سرکار پرست شاعر" کا فقرہ چست کردیا ہے۔ (۴)

مصنف نے صاحب سوانح کے ابتدائی حالات زندگی' ان کے کردار' شخصیت اور ذہنی رجحانات کو دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے سیاسی کارناموں کے ذکر کے ساتھ معاصرین کے تبصروں کو تنقیح کے طور پر پیش کیا ہے۔ وافر معلومات' حسن ترتیب اور دلکش انداز بیان نے اسے کامیاب سوانح عمری کا درجہ دے دیا ہے۔ تھوڑی سی احتیاط ان کے رتبہ کو اور بلند کر سکتی تھی۔

مصنف صاحب طرز ادیب ہیں۔ جب وہ انشا پردازی پر مائل ہوتے ہیں تو عکاسی نہیں کرتے بلکہ نقاشی کرتے ہیں۔ ان کے جملوں کا حسن قاری کے ذہن کو مسحور کرلیتا ہے۔ جس کی مثال میں یہ چند جملے پیش کئے جاتے ہیں۔

"تین ہزار تین سو برس --- اس سے بھی کچھ زیادہ۔ اتنے دن گزرے جب جمنا کے کنارے اندر پرست آباد تھے۔ اس کے افسانے رامائن کے صفحات میں بکھرے پڑے ہیں۔ حساب تو لگائیے' اس دن سے آج تک جمنا کے دھارے پر کتنا پانی بہہ چکا ہوگا۔ اس بہتے ہوئے پانی میں اگر دو آنکھیں ہوتیں تو انہوں نے اندر پرست کی پہاڑیوں پر انسانی آبادی کے کیا کیا تماشے دیکھے ہوتے۔" (۵)

**مہاراجہ کشن پرشاد : مہدی نواز جنگ : حیدر آباد دکن : ستمبر ۱۹۵۰ء**

مہاراجہ کشن پرشاد کی ذات ہمہ صفت موصوف تھی۔ وہ راجہ ٹوڈرمل کی نسل سے تعلق



رکھتے تھے۔ ان کے بزرگوں میں چندولال شاداں امور انتظامی اور شاعری کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ مہاراجہ کے انتقال کے بعد ان کی یادگار باقی رکھنے کے سلسلے میں جو کمیٹی قائم ہوئی تھی اس کی تحریک پر مہدی نواز جنگ نے ان کی مبسوط سوانح لکھی۔ صاحب سوانح کے مستند حالات کی دریافت ان کے لئے کوئی مشکل نہ تھی۔ مہاراجہ کی غیر مکمل خودنوشت 'ان کے اہل خاندان' دوست احباب اور دیگر لوگوں سے ضروری معلومات حاصل کرکے اس طویل اور جامع سوانح کو مکمل کیا گیا ہے۔ مصنف نے ان کی زندگی کے چار ادوار قرار دیئے ہیں۔ پہلا دور ان کی پیدائش' بچپن اور شباب کا (۱۲۸۰ھ - ۱۳۱۱ھ) ہے۔ جس کے دوران ان کی تعلیم و ترتیب مکمل ہوئی شاہی دربار میں جاتے اور سفر میں نظام سادس میر محبوب علی خان کے ہم رکاب رہے۔ دوسرا دور (۱۳۱۱ھ - ۱۳۱۹ھ) کا ہے جبکہ وہ اپنے آبائی عہدہ پیشکاری پر فائز ہوئے اور وزارت فوج ملی۔ تیسرے دور (۱۳۱۹ھ - ۱۳۴۱ھ) میں وہ مدارالمہام رہے۔ ۱۳۴۵ھ میں انہیں وزارت عظمیٰ پر فائز کیا گیا۔ اس عہدہ پر وہ ۲۹ ذوالحجہ ۱۳۵۵ھ (۱۳ مارچ ۱۹۳۶ء) تک مامور رہے۔ بالآخر ۴ ربیع ۱۳۵۹ھ (۳ مئی ۱۹۴۰ء) کو اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ ہر دور کی تفصیلات اس طرح بہم پہنچائی گئیں کہ ان کی زندگی کا کوئی رخ تشنہ نہیں رہا۔ ان کے دیگر اشغال بھی وضاحت سے بیان ہوئے ہیں جن کے ذریعہ ان کی جامع شخصیت اور اوصاف کے تمام پہلو سامنے آگئے ہیں۔ وہ وسیع المشرب تھے۔ تمام مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے بعد ان کا رجحان اسلام کی طرف تھا۔ خواجہ حسن نظامی سے روایت ہے کہ مہاراجہ نے خود بتایا تھا کہ وہ سلسلۂ قادریہ میں حضرت چندا صاحب سے بیعت تھے اور خواجہ حسن نظامی کے ہاتھ پر سلسلۂ چشتیہ میں بیعت کرنا چاہتے تھے۔ (۶) وہ اکثر فقراء اور اولیاء کے مزاروں پر حاضری دیتے۔ وہ موحد تھے۔ تصوف سے خاص شغف تھا۔ ان کی لکھی ہوئی حمد اور نعت (جو کہ بے شمار ہیں) ان سے ان کے قلبی لگاؤ کا پتا چلتا ہے۔ سرکاری فرائض توجہ اور تندہی سے ادا کرتے۔ رعایا کی معمولی سے معمولی ضرورت یا پریشانی بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہ رہتی اور ان پر پوری توجہ دیا کرتے۔ فرصت کے اوقات میں صوفیاء' شاستریوں' شعراء' علماء و اطباء کا مجمع رہتا۔ علمی مباحث' شعر و سخن' فنون لطیفہ' تشخیص امراض' تجویز ادویات پر باتیں ہوتیں۔ وہ شاعر اور نثر نگار بھی تھے۔ کئی تصانیف خصوصاً "نعتیں" یادگار چھوڑی ہیں۔ ہمدرد مزاج' غریب پرور اور صوفی منش تھے۔ گھر سے نکلتے تو روپیہ پیسہ کی تھیلیاں ساتھ رہتیں اور وہ سڑکوں پر پھینکتے جاتے کہ ضرورت مند اٹھالیں۔ کوئی عالم اور شاعر ایسا نہ ہوگا کہ ان کے دوران حیات حیدر آباد گیا ہو اور انہوں نے ضیافت نہ کی ہو۔ علامہ

اقبال سے انہیں خاص عقیدت تھی۔ مصنف نے ان تمام پہلوؤں کو حسن ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ طرز تحریر سنجیدہ' باوقار اور حقیقت پسندانہ ہے۔ صرف حالات اور واقعات بیان کرنے پر انحصار کیا گیا ہے۔ مدح و قدح سے گریز ہے۔ حسن عقیدت کے باوجود غیر جانبداری برتنا سوانح نگاروں کا وصف ہونا چاہئے جو اس میں موجود ہے۔ پرشاد کی ادبی خدمات کی نسبت ان کی سیاسی اور انتظامی خصوصیات پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔

**باپو کے قدموں میں : راجندر پرشاد : علی گڑھ : ۱۹۵۳ء**

موہن داس کرم چند گاندھی کانگریس کے مسلمہ رہنما اور جنگ آزادی میں اپنے انداز کے سپاہی تھے۔ ان کی زندگی' افکار اور کارنامے تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ راجندر پرشاد جو آزادی کے بعد صدر جمہوریہ ہند ہوئے ان کے قدیم سیاسی ساتھی اور عقیدت مند تھے۔ راجندر پرشاد اور دیگر کانگریسی رہنما گاندھی جی کو باپو (باپ) کہا کرتے تھے اور اسی مناسبت سے عزت واحترام کرتے تھے اس کا اظہار کتاب کے نام سے ہوتا ہے۔

یہ گاندھی جی کی مکمل اور جامع سوانح عمری نہیں ہے۔ ان کے جنوبی افریقہ سے واپسی کے بعد خاص حلقوں نے ان کی پذیرائی کی اور جنوبی افریقہ کے کارناموں پر مبارکباد دینے کے لئے جلسے منعقد کئے ایسا ہی ایک جلسہ کلکتہ میں ہوا جہاں راجندر پرشاد کی ان سے پہلی ملاقات ہوئی اور انہیں کے اصرار پر گاندھی جی بہار کے علاقے چمپارن گئے جہاں طویل عرصے قیام کر کے کسانوں کے مسائل حل کئے جو نیل کی کاشت کرنے والے مالدار زمینداروں کی جانب سے پیدا کئے گئے تھے۔ مصنف ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۸ء تک ان کے ہم خیال' پیروکار کی طرح رہے۔ اس دوران جو سیاسی تحریکات کانگریس نے چلائیں ان میں بھی ساتھ رہا۔ خلافت تحریک سے لے کر گاندھی جی کے قتل ہونے تک کے سیاسی حالات کی روداد اس کتاب کا موضوع ہے۔ اسے نہ تو باضابطہ سوانح عمری کہا جاسکتا ہے اور نہ شخصیت نگاری۔ یہ یا تو سیاسی وقائع نگاری ہے یا رپورتاژ کا ایک انداز۔ البتہ سیاسی واقعات کے ضمن میں گاندھی جی کے افکار اور کردار کے بارے میں اشارے مل جاتے ہیں۔ عام طور پر سیاسی تاریخیں ذہنی تحفظات کے ساتھ لکھی جاتی ہیں۔ اس کا انداز بھی وہی ہے اس میں شخصیت کے کارناموں کا جانبدارانہ مطالعہ ہے۔

**محمد علی' ذاتی ڈائری کے چند ورق : مولانا عبدالماجد دریا بادی : حصہ اول اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء : حصہ دوم ۱۹۵۶ء**

یہ عبدالماجد دریا بادی کی دوسری سوانحی تصنیف ہے جسے انہوں نے گزشتہ روایات کی طرح



ذاتی تاثرات اور یادداشتوں کے سہارے ترتیب دیا ہے۔ اس سلسلے میں عبدالماجد خود لکھتے ہیں۔

مجھے ان سے شرف ونیاز وسط ۱۹۱۲ء سے ان کی آخری عمر یعنی ختم ۱۹۳۰ء تک کہنا چاہئے کہ ۱۷۔۱۸ سال کی مدت تک رہا۔ آئندہ صفحات پر میں نے اپنے اتنے دن کے تاثرات ومشاہدات کو یکجا قلم بند کردینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی مستقل سیرت یا سوانح عمری ایک بالکل الگ چیز ہے۔ کوئی صاحب اس ذاتی ڈائری کو اس کا بدل یا قائم مقام نہ خیال فرمالیں۔" (۹)

مولانا کے اس بیان کی روشنی میں مذکورہ تصنیف کا جائزہ لیا جائے تو یہ پتا چلتا ہے کہ اگرچہ ان کی یہ تصنیف سوانح عمری کے زمرے میں نہیں آتی لیکن یہ ایک بہترین سوانحی مرقع ضرور ہے۔ جس میں سوانح نگاری کے بنیادی اصول بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔

ایک اچھے سوانح نگار سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ سن وار یا ترتیب کے ساتھ موضوع کے سوانح اس طرح تحریر کرے کہ اس کی شخصیات کے تمام قابل ذکر اور اہم پہلوؤں پر بھرپور روشنی پڑے اور جزئیات و واقعات کی تعبیر و تشریح اس طرح کی جائے کہ موضوع کا ہر پہلو واضح ہوجائے اور وہ ایک بھرپور اور جامع انداز میں قاری کے سامنے آجائے لیکن مولانا نے مذکورہ تصنیف میں ترتیب وار یا سن وار واقعات تو پیش نہیں کئے مگر ان تمام باتوں پر خصوصی توجہ دی ہے جس کے سبب ہیرو کی زندگی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات اس کی شخصیت کے حوالے سے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے رفاقت کا ایک طویل عرصہ محمد علی کے ساتھ گزارا۔ ان کی عادات واطوار' رہن سہن' علمیت' صحافت' عام برتاؤ' گھریلو زندگی' غرض ہر بات سے ذاتی تاثرات کی بناء پر آشنائی حاصل کی اور یہی قربت جب ان کے دل میں محبت بن کر گھر کر گئی تو ان کے دل میں محمد علی کے حالات لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ تب انہوں نے ڈائری اور ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر یہ کتاب تحریر کی جس کے لئے احتیاطاً "یہ بھی بتا دیا کہ کوئی اس کو روایتی سوانح سمجھ کر خامیاں نہ تلاش کرنا شروع کردے۔ دراصل مولانا نے سوانح نگاری کے زمرے میں اپنی ایک انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔

عبدالماجد دریا بادی نے مولانا محمد علی سے پہلی ملاقات کو دلچسپ اسلوب میں بیان کیا ہے جو مرقع کشی کی اعلیٰ مثال بھی ہے۔

"کمیٹی کے سامنے وقت کے بڑے بڑے اہم اور نازک مسئلے پڑے ہوئے تھے۔ میز کی ایک

ست میں ایک جوان رعنا تندرست و تنومند کوئی ۳۳۔۳۴ سال کی عمر کا اعلیٰ درجہ کے انگریزی سوٹ میں ملبوس بیٹھا ہوا تھا۔ داڑھی تازہ منڈھی ہوئی' موچھیں ذرا گھنی اور نوکیلی' ذہانت بشرے سے ٹپکتی ہوئی۔ شوخی وذکاوت چہرے سے برستی ہوئی۔ ممبروں میں ایک سے ایک قابل فاضل۔ اس سے بڑے اور مخدوم بھی لیکن نظر بار بار اس کی طرف اٹھ رہی ہے اور کان اس کی آواز کی طرف لگے ہوئے۔ وہ بولا تو سب سننے لگے۔ وہ ہنسا تو کوئی ہنسا' کوئی بگڑا مگر سب ہی متوجہ ہو گئے۔ یہ تھا کامریڈ کا شہرۂ آفاق ایڈیٹر محمد علی۔ رامپور کا باشندہ اور علی گڑھ اور آکسفورڈ کا گریجویٹ جس کی جادو نگاری اور انگریزی انشاء پردازی کا سکہ اس وقت بھی دلوں پر بیٹھ چکا تھا۔ حالانکہ کامریڈ کو نکلے ہوئے ابھی سال یا ڈیڑھ سال ہی ہوا تھا اردو کا روزنامچہ "ہمدرد" کا ابھی وجود بھی نہ تھا۔" (۸)

مصنف نے مولانا محمد علی کے بارے میں قومی امور سے متعلق جو باتیں تحریر کی ہیں' ان سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ قومی امور کے سامنے ذاتی زندگی اور خانگی معاملات کو بھی پس پشت ڈال دیتے تھے جیسا کہ مصنف لکھتے ہیں۔

"جنازہ بھی گھر میں رکھا ہوا تھا اور چہیتا اور ماں کا دلدادہ بیٹا کامریڈ کے لئے مضمون ہی لکھنے کے لئے نہیں بلکہ پروف درست کرنے میں بھی مشغول تھا۔" (۹)

مصنف نے ہیرو کی زندگی کی ہر بات کو جس طرح تحریر کیا ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہیرو کی زندگی کا ہر پہلو کُلّی طور پر مصنف کے سامنے ہے۔ ہیرو کے خاندانی حالات' بیٹی کی بیماری' انتقال' اس کے دفنانے کا معاملہ لیکن ہیرو ہر صورت میں ذاتی معاملات پر قومی مفادات کو ترجیح دیتا نظر آتا ہے۔

تصور کیا جاتا ہے کہ سوانح عمری میں جب تک معاصرین یا دوسرے لوگوں کی رائے شامل نہ ہو' مکمل سوانح عمری نہیں ہوتی لیکن مولانا نے صرف ذاتی یادداشتوں اور ڈائری کے سہارے سوانح مکمل کرنے کی کوشش کی ہے اور اگر ان پر اعتراض کیا بھی جائے تو ابتدا میں انہوں نے خود اس بات کی نفی کی ہے کہ اسے سوانح یا اس کا نعم البدل نہ سمجھا جائے۔ پھر بھی مولانا نے ہیرو کی ذاتی' سیاسی' سماجی' صحافتی زندگی' ان کے خیالات' تصانیف' طرز تحریر' عادات و اطوار اور خانگی زندگی کو جس خوبصورت اور دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے' وہ جدید سوانح نگاری کا بدلتا ہوا رجحان ہے جس میں مصنف نے ترتیب اور غیر ضروری باتوں سے اجتناب کیا ہے اور اپنے خوبصورت اسلوب اور دلکش انداز تحریر سے سوانح نگاری کا ایک تیکھا اور جدید رجحان ہمارے



سامنے پیش کیا ہے۔

## بلبل ہند سروجنی نائیڈو : وزیر حسن : حیدر آباد دکن : ۱۹۵۷ء

وزیر حسن نے سروجنی نائیڈو کی سوانح عمری کے ماخذات کے بارے میں ابتدائیہ "دو باتیں" میں تحریر کیا ہے کہ

"اس کتاب میں کچھ باتیں تو ایسی ہیں جو سروجنی کے لئے لکھی لکھائی مل جاتی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جو ان کے چھوٹے بیٹے رندھیر نائیڈو سے سننے میں آئیں۔ کچھ کچھ ان کے انگریزی گیتوں سے لی ہیں۔" (۱۰)

اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ سوانحی معلومات مصدقہ ہیں۔ کتاب کو ۲۲ عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں ان کے بچپن' تعلیم' شادی' شاعری' فن تقریر' سیاسی زندگی' پاکیزہ اور بے مثل کردار کو پوری خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مصنف نے ان کی گھریلو زندگی کو اس تفصیل سے بیان کیا ہے کہ حیدر آبادی معاشرت کے حسن کا نکھار دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح ان کی خارجی زندگی کے حوالے سے جو کوائف لکھے گئے ان میں سیاسی اور معاشی کشمکش کی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ سروجنی نائیڈو نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس کا تقاضا ہندو مسلمان اتحاد پر ایمان رکھنا' اردو سے محبت کرنا اور اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طور پر استعمال کرنا تھا۔ سروجنی نائیڈو کی ذات میں یہ تمام خصوصیات موجود تھیں۔ وہ انگریزی کی شاعرہ تھیں۔ آبائی وطن بنگال تھا لیکن اردو سے بے پناہ محبت کرتی تھیں اور جامعہ عثمانیہ کو نوجوانان حیدر آباد کی ذہنی اور عملی تربیت کا اہم مرکز گردانتی تھیں۔ ان کے بیانات کے حوالہ سے مصنف نے ان کے خیالات' رجحانات اور کردار کا جامع خاکہ پیش کیا ہے۔ مختصر سوانحی ادب میں مشمولات کے اعتبار سے اس کی جامعیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ فن کے نقطۂ نظر سے کوئی اعتراض ممکن ہے۔

## ظفر علی خاں : شورش کاشمیری : لاہور : ۱۹۵۹ء

مولانا ظفر علی خاں اپنے دور کی بے باک سیاسی شخصیت تھے اور حق پسند صحافی بھی تھے۔ ان کی شخصیت اتنی متنوع تھی کہ اس کے ہر پہلو پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ انہیں کی طرح بے باک سیاسی شخصیت' بلند آہنگ شاعر اور حق پرست صحافی شورش کاشمیری نے ان کے حوالے سے اپنی یادداشتوں اور تاریخ آزادی میں ان کے اہم کردار کو پیش کیا ہے۔ "ظفر علی خاں" نہ تو سوانح کے ضمن میں آتی ہے اور نہ شخصیت نگاری کے۔ بلکہ یہ شخصیت اور تاریخی واقعات کے بیان کے ساتھ لکھنے والے کے تاثرات کا مجموعہ ہے۔ شورش کو مولانا سے محبت ورثہ میں ملی

تھی۔ ان کے والد مولانا کی شان لیڈری کے معتقد تھے۔ "زمیندار" ان کے لئے اوڑھنا بچھونا تھا۔ شورش نے کم عمر میں مولانا کو پہلی بار دیکھا تھا اور بارہا ان کے سایہ کی طرح ساتھ رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شورش کی سیاست' خطابت و صحافت میں مولانا کے انمٹ اثرات رہے۔

ابتدائی باب میں مولانا کے والد مولوی سراج الدین احمد کے احوال بیان کئے ہیں کہ وہ بھی انگریز دشمن اور حریت پسند تھے۔ وہ بھی کسی کا سخت برتاؤ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس اعتبار سے وہ خوش نصیب تھے کہ ان کی اولادوں میں سبھی نامور اور معزز بنے۔ ظفر علی خاں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ حیدر آباد دکن کی فوج میں ملازم رہے۔ بعد میں ہوم سیکریٹری عزیز مرزا کے ساتھ بطور مترجم کام کیا اور ترقی پاتے ہوئے ہوم سیکریٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ حیدر آباد سے رسالہ "افسانہ" اور "دکن ریویو" جاری کیا۔ حیدر آباد سے نکالے جانے کے سلسلہ میں شورش نے واقعہ بتایا ہے کہ انگریزی طرز کے رقص کے بعد اس کی مذمت میں مولانا نے تقریر کی تھی جس سے ریذیڈنٹ ناراض ہو گیا تھا۔ اس کے برخلاف ایک روایت یہ بھی ہے کہ انگریز فنانس منسٹر واکر کے بارے میں ایک نظم پیسہ اخبار لاہور میں چھپی تھی اسے مولانا کے زور طبع کا نتیجہ قرار دیا گیا۔ دونوں وجوہ تسلی بخش نہیں معلوم ہوتیں کیونکہ ایک ہی فرمان کے ذریعہ مولانا' عزیز مرزا' عبدالحلیم شرر اور صفی الدین ملک بدر کئے گئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسی کوئی وجہ ہوگی جس کا الزام ان چاروں پر آتا ہے۔ ویسے اصل حقیقت ہنوز تحقیق طلب ہے۔

سراج الدین احمد اخبار "زمیندار" نکالتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا نے اسے حیات نو دی اور اس کا انداز بدل کر خالص سیاسی اور حریت پسند اخبار بنا دیا۔ اس کے ادارہ سے نیاز فتح پوری' عبداللہ العمادی اور وحید الدین سلیم منسلک ہو گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پنجاب کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار بن گیا جس نے آئندہ نسل کے صحافیوں کی تربیت بھی کی جن میں عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت بھی شامل تھے۔

۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی تحریک اور اس میں فعال کردار ادا کرنے پر مولانا کی سزا کا حال بھی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ مولانا کے سیاسی کارناموں کا ذکر کرنے کے ساتھ ان کی سیاسی اہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ موجودہ پنجاب میں اس زمانہ میں سیاسی اعتبار سے سناٹا تھا۔ پنجاب کے علاقہ میں ظفر علی خاں اور اقبال نے سیاسی شعور کے تخم بوئے۔ اگر یہ دو ہستیاں نہ ہوتیں تو

"ہماری سیاسی حیثیت سندھ اور بلوچستان کے عوامی اور جمہوری ریگستان کی سی



ہوتی۔" (۱۳)

وہ سیاست میں دوڑنے کے عادی تھے۔ انہوں نے چلنا تو سیکھا ہی نہ تھا اور بیٹھ جانا ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔ انہوں نے سیاسی ہیجان پیدا کیا۔ جس تنظیم میں گئے وارفتہ مزاج ہو کر گئے۔ تمام عمر دماغ کے بجائے دل سے سوچتے رہے۔ اسلام ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ حضور سرور کائناتؐ سے انہیں والہانہ لگاؤ تھا۔ وہ تو ان کو ضابطۂ حیات کو حرف آخر مانتے تھے۔ وہ سیاست میں بھی شاعری کرتے اور شاعری میں بھی سیاست بیان کرتے تھے۔

شخصیت کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ان کی شاعری کی خصوصیات' نثر نگاری کی خوبیاں اور تراجم کی سلاست و روانی کا بھی جائزہ لیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جری مجاہد ہی نہیں ایک فنکار بھی تھے جو ہر فن کی نوک پلک درست کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

شورش نے شخصیت نگاری اپنے مخصوص رنگ میں کی ہے۔ ان کی تحریر میں بھی تقریر کی شان موجود ہے۔ وہی زور بیانی' وہی الفاظ میں جاہ و جلال' شخصیت نگاری میں جو سلاست روی اور اعتدال ہونا چاہئے' نہیں ہے کیونکہ زندگی بھر وہ مولانا کے مداحوں میں شامل رہے۔ ان کی تحریر میں عقیدت کی سلگتی چنگاریاں جگہ جگہ روشن نظر آتی ہیں۔

## عزیز بھٹی شہید: اصغر علی گھرال: گجرات: مئی ۱۹۶۷ء

عزیز بھٹی شہید کی زندگی پاکستان کے ہر فرد کے لئے اسلام پرستی وطن پرستی' شجاعت اور فرض شناسی کی بصیرت افروز داستان ہے۔ گجرات کے ایک چھوٹے سے گاؤں لادیاں میں آباد خاندان کے اس قابل فخر فرزند نے اپنی زندگی کو تمام پاکستانیوں کے لئے نمونہ بنانے کی ترغیب بنا دیا ہے۔ ہانگ کانگ میں پیدائش اور پر آشوب زندگی گزارنے' برصغیر جنوبی ایشیا میں بحریہ کی ملازمت کرنے' پاکستان آرمی فوج میں شمولیت اختیار کرنے سے لے کر لاہور کے محاذ پر مسلسل چھ روز بغیر کچھ کھائے پئے بغیر سوئے اور بغیر آرام کئے انہوں نے کس طرح مختصر نفری چند سپاہیوں کے ساتھ لگاتار بڑے بڑے حملوں کا مقابلہ کیا مصنف نے ان سب کا حقائق پسندانہ احاطہ کیا ہے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان کے مستند بیانات اور حوالے دیئے گئے ہیں جو قاری کے لئے یقین کی بنیاد بنتے ہیں اس حوالہ سے انہوں نے چار' پانچ درجن شخصیات سے براہ راست رابطہ کیا اور ان سے بے لاگ تفصیلات اور تبصرے حاصل کئے۔ حقائق کی دریافت کے لئے اس قدر محنت بہت کم سوانح عمریوں میں ملتی ہیں۔

مصنف نے واقعات زندگی کو ترتیب وار مرتب کرنے کی انتہائی کامیاب کوشش کے ساتھ شخصیت اور سیرت نگاری پر بھی پوری توجہ کی ہے۔ کوئی فرد اس وقت ہیرو بنتا ہے جب اس کی ذات عام انسان کی سطح سے بلند ہو۔ کارنامہ شاید کبھی حادثاتی طور پر رونما ہوتا ہے لیکن حقیقت میں زیادہ تر کارناموں کے مواقع قدرت کی طرف سے غیر معمولی شخصیات کے لئے تفویض ہوتے ہیں۔ عزیز بھٹی بھی ایک غیر معمولی شخصیت تھے۔ وہ مذہب پرست اور صوم و صلاۃ کے پابند تھے ان کا کارنامہ انسانی کمزوریوں سے مبرا تھا۔ جھوٹ اور منافقت سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اس خدشہ کے باوجود کہ سچ ان کے لئے نقصان کا باعث ہو سکتا ہے انہوں نے سچ بولنے سے گریز نہیں کیا۔ انہیں خدا کی طرف سے غیر معمولی ذہنی صلاحیتیں ودیعت کی گئی تھیں۔ وہ اساتذہ کے طویل لیکچر ترتیب وار یادداشت میں محفوظ رکھنے کی صفت رکھتے تھے وہ تفکر کے بھی عادی تھے کثرت مطالعہ کے بعد تمام امور کا تجزیہ کرتے اور نتائج اخذ کرتے۔ انہیں ہر ایک سے محبت تھی۔ میدان جنگ میں بھی اپنے ایک ایک سپاہی کا خیال رکھتے۔ جب تک محاذ پر لڑنے والے ہر سپاہی کی روزمرہ ضروریات پوری نہ ہوتیں خود اپنے حلق سے نوالہ نہیں اتارتے تھے۔ اگر سپاہیوں کے لئے روٹی پکی ہو اور ان کو پوریاں پیش کی جاتیں تو وہ کھانے سے انکار کر دیتے تھے۔ جب محاذ پر یہ حال ہو تو روزمرہ زندگی میں بیوی' بچوں عزیز و اقارب اور دوستوں' ملنے جلنے والوں کے ساتھ ان کا جو سلوک ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ مصنف نے ان سب باتوں کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی زندگی کے احوال بیان کئے ہیں۔ ایک فوجی کی زندگی کی تمام خوبیاں ان میں موجود تھیں۔ کتاب میں میجر عزیز بھٹی شہید کی زندگی کے مختلف ادوار کی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں اور ان کی شہادت کے بعد جس بحری جہاز کا نام عزیز بھٹی شہید رکھا گیا اس کی بھی تصویر شامل ہے اور بی آر بی نہر کے پاس جو شہید کی یادگار بنائی گئی ہے اس کی تصویر بھی شامل ہے۔ غرض یہ کہ مصنف نے نہایت عرق ریزی سے عزیز بھٹی شہید کے واقعات زندگی کو تحریر و تصویر کے حوالوں کے ساتھ محفوظ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور آخر میں اپنی مشکلات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ کتاب میں عزیز بھٹی شہید کے احباب و اقارب کی آراء اور ان کے خطوط کو بھی جگہ دی گئی ہے اور ان کی شہادت کے بعد اخبارات اور میڈیا نے شہید کے بارے میں جس طرح قوم کے احساسات و جذبات کا خراج پیش کیا ہے نہایت خوبصورتی سے جگہ دی ہے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرکے بہادری سے شہادت پانے والے عظیم سپاہی میجر راجہ عزیز بھٹی شہید "نشان حیدر" کی سوانح عمری جس خوبصورتی اور فخر سے لکھی جانی چاہیے تھی



مصنف نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کیونکہ وہ قومیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں جو اپنے قابل فخر سپوتوں کے کارناموں کو کبھی نہیں بھلاتیں۔ بلکہ ان کے کارناموں کو قومی بصیرت کا ذریعہ بناتی ہیں۔

وقائع نگاری اور سیرت نگاری کے لحاظ سے بھی یہ ایک مکمل اور جامع تصنیف ہے مصنف نے جوش عقیدت اور محبت سے کہیں کام نہیں لیا ہے ہر واقعہ ماخذ کے ساتھ اور سیرت کا ہر پہلو شہادت کے ساتھ بیان کرکے تصنیف کو سند کا درجہ دے دیا۔ جامعیت اور فن کے تمام لوازمات کا خیال رکھتے ہوئے تخلیقی عمل سے گزرنے والی چند کامیاب سوانح عمریوں میں اس کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک مجاہد کی کہانی ہے اس میں جوش سے کہیں کام نہیں لیا گیا ساری باتیں ہوش کی غماز ہیں۔ مصنف کے اظہار کا رویہ سنجیدہ' سادہ اور باوقار ہے جو پڑھنے والوں کو متاثر کرتا ہے۔

حیات قائداعظم : چوہدری سردار محمد خاں عزیز : لاہور : ۱۹۶۲ء

قائداعظم کی سیاسی زندگی کے حوالہ سے ایک تفصیلی اور معلومات افزا کتاب ہے۔ اسے قائد کی مکمل سوانح نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں ان کے حالات زندگی تاریخ وار ترتیب میں ہیں اور نہ نجی زندگی' گھریلو معاملات اور معاشرتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صرف ایک پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ پہلو تاریخ کا اہم حصہ ہے اور ان کی ذات سے متعلق ہی نہیں بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا سنہرا باب ہے۔ جہاں تک تاریخی اور سیاسی مواد کا تعلق ہے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ فن سوانح نگاری کے تقاضوں پر پوری نہیں اترتی۔

تذکرۂ شیخ الہند : مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری : بجنور : ۱۹۶۵ء

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی تحریک جہاد کے بارے میں اہم اور مستند معلومات مولانا حسین احمد مدنی کی تصانیف "سفرنامہ شیخ الہند" "نقش حیات" اور "تحریک ریشمی رومال" کے علاوہ بعض دیگر کتب میں فراہم کی گئی ہیں۔ مفتی عزیز الرحمان بجنوری نے "تذکرۂ شیخ الہند" میں ان بنیادی ماخذات کے علاوہ ضمنی اور ثانوی ماخذات سے فائدہ اٹھایا ہے اور شیخ الہند کی سیاسی سوانح عمری ان کے سیاسی مقاصد اور کارناموں کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس تصنیف کے ذریعہ جہاں شیخ الہند کی شخصیت کے لئے جذبات احترام ظاہر کئے گئے ہیں' وہیں ان کی تاریخی جدوجہد کو آشکار کیا ہے۔ مضامین کی ترتیب و تدوین میں علمی انداز ہے۔ مصنف مرکز علمی و تعلیمی دیوبند کے تربیت یافتہ اور صاحب سوانح کے دائرہ فکر و عمل سے وابستہ رہے ہیں اس لئے واقعات کی

ترتیب کا اہتمام بھی کیا ہے اور جوش عقیدت میں مبالغہ یا حاشیہ آرائی سے کام نہیں لیا ہے۔ اس کا رجحان شخصیت کی توصیف کے ساتھ کارناموں کی دریافت بھی ہے۔

**محمد علی جناح : ہیکٹو بولائتھو : ترجمہ زہیر صدیقی : لاہور : (ترجمہ)۱۹۶۵ء : (انگریزی ایڈیشن ۱۹۵۴ء)**

ہیکٹو بولائتھو (Hector Bolitho) عالمی شہرت یافتہ صحافی اور سوانح نگار ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ' شہزادہ ایلبوٹ اور جارج ہشتم کی سوانح لکھنے کے بعد انہیں برصغیر کے مسلمانوں کے عظیم رہنما کے حالات زندگی لکھنے کا خیال ہوا۔ قیام پاکستان کے چند سال بعد تک قائداعظم کی کوئی جامع اور مستند سوانح عمری مرتب نہیں ہوئی تھی۔ اس کام کا بیڑا بولائتھو نے اٹھایا تو انہیں معلومات جمع کرنے کے لئے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے لئے یہ امر بھی باعث زحمت ہوا کہ ان کا تعلق نہ اس ملک سے تھا اور نہ اس معاشرہ سے۔ ایک اجنبی ماحول میں اجنبی لوگوں سے معلومات اخذ کرنا دشوار مرحلہ تھا اور پھر قائد کو قریب سے جاننے والے' رفیق کار اور ساتھی بھی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ انہیں قائد کے کاغذات' دستاویزات اور نوٹس بھی نہیں مل سکے جو محترمہ فاطمہ جناح کی تحویل میں تھے۔ بولائتھو حکومت وقت کی سرپرستی میں کام کر رہے تھے اور محترمہ اس سے برگشتہ خاطر تھیں۔ زبان کی اجنبیت ان کے اہل خاندان سے راست رابطہ میں مانع رہی۔ باوجود ان دشواریوں کے بولائتھو نے پاکستان اور ہندوستان میں رہ کر جہاں تک ممکن ہوا ان بزرگوں سے رابطہ پیدا کیا جن سے براہ راست معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں۔ کراچی میں انہوں نے قائد کے گم نام رشتہ داروں کو ڈھونڈ نکالا جن کے درمیان قائد کا بچپن گزرا تھا۔ ان میں قائد کی رشتے کی بھاوج فاطمہ بائی اور ان کے بچپن کے رفیق نانجی جعفر بھی تھے۔ لندن میں ان کے زمانۂ طالب علمی اور بیرسٹری کے زمانہ کا حال معلوم کیا۔ بمبئی میں پارسی رہنما سر کاوس جی جہانگیر سے ملے جو قائد کے اس وقت کے ساتھی تھے جب قائد گم نام وکیل تھے۔ غرض کہ حصول معلومات میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ تحقیق کی سنگلاخ زمین پر چلتے چلتے ان کے پیر لہولہان ہو گئے اور بالآخر وہ اس تصنیف کی تکمیل میں کامیاب ہوئے اور ۱۹۵۴ء میں اسے شائع کیا۔

اس تصنیف کے اندراجات کو مستند مانا جاتا ہے۔ بعد کے بعض محققین نے جزئیات پر اعتراض کیا ہے لیکن بحیثیت مجموعی اس کاوش کو سراہا گیا ہے۔ قائد کے بچپن کے حالات' اس زمانہ میں ان کے مشاغل اور دلچسپیوں سے لے کر لندن میں طالب علمی کے زمانہ' وکالت کے سرد



و گرم جھیلنا' سیاست میں داخل ہونا' اپنے لئے اصولوں پر مبنی راہ عمل اختیار کرنا اور مسلمانوں کو متحد و منظم کر کے منزل مراد تک پہنچانا قائد کی زندگی کے مدارج ہیں جن میں ہر ایک کے بارے میں وافر معلومات موجود ہے۔ سوانح اور سیاسی واقعات کو تاریخی ترتیب میں پیش کرنے کے ساتھ اس امر کا خیال رکھا گیا ہے کہ ان کی شخصیت اور سیرت کی بھی تشکیل ہوتی رہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد نہ صرف سیاسی تاریخ سے واقفیت ہو جاتی ہے بلکہ اس میں قائد کا رول بھی سامنے آجاتا ہے اور ان کی شخصیت کے تمام پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔ مصنف نے حقائق معلوم کرنے اور انہیں پیش کرنے میں استناد کا ہر جگہ خیال رکھا ہے۔ جو بات جس سے معلوم ہوئی' اسی کے حوالے سے کہہ دی تاکہ بحث اور توثیق کی ذمہ داری ان پر نہ رہے۔ اس لئے انہوں نے ایسی روایات کو جن کی کوئی بنیاد نہ تھی' پیش نہیں کیا اور اگر کہیں ذکر آیا بھی ہے تو ان پر غیر مستند ہونے کی مہر لگا دی ہے۔ مصنف ایک غیر جانبدار شخص ہے۔ وہ نہ تو قائد کا عقیدت مند ہے اور نہ اس کے پیش نظر کوئی بڑا ذاتی مفاد تھا اس لئے اس کے بیانات اور تجزیاتی نتائج پر کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ فرقہ پرستی' باہمی عدم اعتماد بلکہ عناد کے ماحول میں جہاں افواہوں اور روایات سازی کا دور دورہ بھی رہا ہو' حقیقت کو دریافت کرنا اور انہیں مؤثر انداز میں پیش کرنا مصنف کا خصوصی وصف ہے۔ انہوں نے صرف وقائع نگار یا داستان گو کا طرز اختیار نہیں کیا بلکہ انسانی عظمت اور کردار کا حقیقت پسندانہ مطالعہ شواہد کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کی نظر ظاہر تک محدود نہیں رہی۔ وہ انسانی نفسیات کا ادراک بھی رکھتے تھے۔ اسی کے ذریعہ باطن کو پڑھنے کی بھی کوشش کی ہے۔

کتاب انگریزی میں جس مؤثر انداز اور خوشگوار اسلوب میں لکھی گئی ہے' ترجمہ میں اسے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس میں تصنیف و تحریر کی روانی اور بے ساختگی ہے اور کہیں شبہ نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ کی ہوئی کتاب ہے۔ مترجم نے ضروری حوالہ جات اور حواشی سے مطالب کی تفہیم کو آسان بنا دیا ہے۔ ترجمہ ہونے کے باوجود یہ کتاب قائد کے حوالہ سے سوانحی ادب میں سنگ میل ہے۔

**حسین شہید سہروردی : شورش کاشمیری : لاہور : ۱۹۶۷ء**

شورش کاشمیری صاحب طرز ادیب' بے باک خطیب اور صحافی تھے۔ ان کی شہرت لوگوں کی شدت کے ساتھ مخالفت کی وجہ سے قائم ہوئی۔ جن اکابرین سے وہ متاثر ہوئے ان کے بارے میں اپنے نیک خیالات کو بھی اسی شد و مد سے پیش کیا ہے۔ بحیثیت ایک فعال صحافی اپنے دور کے

تمام حکمرانوں اور سیاست دانوں کا مطالعہ کرنے کا انہیں موقع ملا۔ حسین شہید سہروردی بھی اس دور کے اہم سیاست دان تھے جن سے مصنف نے خوشگوار اثرات قبول کئے۔ ہمارے ملک کا یہ المیہ ہے کہ سنجیدہ فکر اور پر خلوص جذبات رکھنے والے حضرات شیوۂ بے اعتنائی کا شکار ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کی زندگی کے افکار اور اعمال ہماری قومی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان کی یادیں قوم کے دل میں تازہ رہنی چاہئیں۔ مصنف نے اسی جذبے سے کام لیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم کو میں نے جس طرح دیکھا' پڑھا' پرکھا اور ان سے سیکھا وہ سب تاریخی امانت ہے اور بہرحال مجھے یہ امانت ملک کے حوالے کرنی چاہئے کیونکہ جن لوگوں سے ملک متاثر ہوتا ہے ان کے سوانح و افکار ملک ہی کا ورثہ ہوتے ہیں۔" (۱۲)

مصنف نے صاحب سیرت کے حوالے سے تمام واقعات کو غیر جانبداری سے تحریر کر دیا ہے اور ان سے جو نتائج وہ اخذ کر سکے وہ بھی لکھ دیئے ہیں۔ پاکستان کی سیاست بہت سے نشیب و فراز سے گزری ہے۔ اس میں کامرانیوں اور کامیابیوں کی عظمت کے نشاں بھی ہیں اور سازش اور دغا و فریب کی سیاہیاں بھی۔ ان حالات میں ملک کی پُرخلوص خدمت کا جذبہ رکھنے والے حسین شہید سہروردی کو عروج اور زوال دونوں صورتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ عروج کے وقت بھی جس پُرسکون طمانیت سے سرشار رہے' زوال میں بھی ان کی شخصیت اسی مضبوطی سے قائم رہی۔ تاسف یا انتقام ان کے دل میں جگہ نہ پا سکے۔ وہ ایک اچھے کارکن بھی تھے اور اچھے لیڈر بھی لیکن ہمارے ملک کے لیڈروں کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے کہ ان میں سازش اور جوڑ توڑ کا ملکہ بھی ہونا چاہئے۔ اصولی سیاست دان صرف اصول کے قائل ہوتے ہیں۔ وہ سازشوں کے جال نہیں بنتے اور جوڑ توڑ نہیں کرتے۔ یہی تمام باتیں مصنف نے اپنے ممدوح کی ذات میں پائیں اور انہیں واقعات کے ذریعہ ثابت کیا ہے۔ واقعات کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ

"جہاں تک کسی واقعہ کا تعلق ہے' جو واقعہ بھی قلم سے نکلا اور جس مرحلہ پر پیش آیا' اس کی صحت کو بہ کمال ملحوظ رکھا ہے۔ میں تاریخ میں افسانہ آرائی اور داستان سازی کو جرم سمجھتا ہوں۔" (۱۳)

اس وعدے کے ساتھ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے' اس سے حسین شہید سہروردی کی ہمہ جہت شخصیت مکمل طور پر سامنے آتی ہے۔ ان کی بعض کمزوریوں کا ضمنی طور پر حوالہ بھی موجود ہے لیکن اچھائیوں پر نہ تو داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے اور نہ کمزوریوں پر ملامت اور نفرین کے تیر چلائے گئے۔ شورش کاشمیری کا تحریر میں توازن برقرار رکھنا بذات خود ایک کارنامہ ہے



اور اس کی بڑی وجہ ممدوح کی شخصیت کا توازن ہے۔

### شہریار دکن (آصف جاہ سابع میر عثمان علی خان) : محمد عبدالہادی ہاشمی : کراچی : فروری ۱۹۶۸ء

آصف جاہی خاندان کے آخری تاجدار نواب میر عثمان علی خاں جہاں تاریخ میں کئی اعتبار سے اہم ہیں' وہاں اپنی شخصی خصوصیات کی بناء پر بھی ایک داستانی کردار کا درجہ رکھتے ہیں۔ عبدالہادی ہاشمی جو پیدائشی طور پر سرزمین حیدر آباد دکن سے تعلق رکھتے ہیں نظام سابع سے حسن عقیدت رکھتے ہیں۔ اس کی جھلک ان کی تحریر میں موجود ہے۔ تاریخی پس منظر میں آصف جاہ اول سے دور آخر تک جائزہ لیتے ہوئے ملکی سیاست' معاشرت اور ثقافت کے پس منظر میں میر عثمان علی خاں کے حالات زندگی کو صرف اسی حد تک تفصیل سے بیان کیا ہے جو بارہا لکھے جا چکے ہیں۔ شخصی اعتبار سے فقیر منش لیکن رفاہی امور میں حاتم ثانی کا کردار ادا کرنے والے اس تاجدار کے اوصاف کو واقعات کے ذریعہ نمایاں کیا گیا ہے۔ وہ اس قدر روشن خیال بھی تھے کہ حالات زمانہ کا اندازہ کرتے ہوئے اصلاحات کا نفاذ کیا اور سب سے بڑی اور اہم خدمت اردو کی انجام دی۔ ان کے دور حکمرانی میں تعلیم کے تمام مدارج پر اردو کو ذریعہ بنایا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔ نصابی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دارالترجمہ جیسے ادارہ سے کام لیا گیا۔ تعلیمی طور پر حیدر آباد تمام دیسی ریاستوں سے زیادہ نمایاں رہا بلکہ برطانوی ہند کا ہم پلّہ بھی تھا۔ ہندو مسلم اتحاد اور اسی یگانگت کی وجہ سے پیدا ہونے والی تہذیب ان ہی کی سرپرستی میں پروان چڑھی۔ انہوں نے جس فراخ دلی سے علی گڑھ اور دیگر مسلم اداروں کی سرپرستی کی' کثیر مالی امداد فراہم کی' وہاں درخواست پر ہندو یونیورسٹی کو بھی نوازا۔ اس کتاب میں تاریخی و سیاسی واقعات اور شہریار دکن کے شخصی کردار کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

### سید امیر علی : شاہد حسین رزاقی : لاہور : ۱۹۷۰ء

مسلمانان برصغیر میں سید امیر علی کا نام کئی اعتبار سے اہم اور تاریخی ہے۔ ان کی شخصیت ہمہ گیر تھی اور ان کی خدمات متعدد شعبۂ حیات کا احاطہ کرتی ہیں۔ جس فراخ دلی اور جذبۂ احترام کے ساتھ ان کی یاد کو تازہ رکھنا چاہئے تھا اس کا حق ان کی قوم نے ادا نہیں کیا۔ شاہد حسین رزاقی ایسے صاحب نظر محقق ہیں جو گنج ہائے گراں مایہ کی تلاش میں رہتے ہیں اور جو ہر قابل کی دریافت' تعارف اور تحسین سے گریز نہیں کرتے۔ انہوں نے سید امیر علی کی زندگی اور ہمہ جہت خدمات کے اعتراف کے لئے تحقیق کے ذریعہ جامع کتاب مرتب کی ہے جو تین حصوں پر مشتمل

ہے۔

پہلا حصہ "حالات زندگی" کے بارے میں ہے۔ تمہید میں ان کے آباؤ اجداد' ان کی ہندوستان آمد اور سکونت' ان کے والد کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ حیات امیر علی کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور (۱۸۴۹ء تا ۱۸۶۷ء) پیدائش اور ابتدائی تعلیم سے متعلق ہے۔ دوسرا دور (۱۸۶۸ء۔۱۸۷۲ء) انگلستان میں حصول تعلیم اور اس دوران کی علمی' ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں سے متعلق ہے۔ تیسرے دور (۱۸۷۳ء۔۱۹۰۴ء) میں برصغیر واپسی' وکالت' سرکاری ملازمت' قانون ساز کونسل کی رکنیت' کلکتہ یونیورسٹی میں قانون کی پروفیسری' اودھ کمیشن کی رکنیت' ملازمت سے استعفیٰ' دوبارہ وکالت کی ابتدا' بنگال ہائی کورٹ میں جج کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ چوتھا اور آخری دور ۱۹۰۴ء سے ۱۹۲۸ء کے حالات کے بارے میں ہے جبکہ انہوں نے انگلستان میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اس دور کی تمام مصروفیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ ان کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں ہے۔ اس میں واضح کیا گیا ہے کہ سرسید سے ملاقات کے بعد سید امیر علی بھی اس نظریہ کے حامی ہوگئے تھے کہ برصغیر کے مسلمان ایک اقلیت نہیں بلکہ قوم ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے وہ مسلمانوں کی خدمت کرنے میں پیش پیش رہے۔ سینٹرل محمڈن ایسوسی ایشن سے وابستگی اختیار کی اور پھر کل ہند مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور اس کی صدارت پر مامور ہوئے۔ لندن مسلم لیگ کا قیام بھی ان کی کوششوں سے عمل میں آیا۔ ان کی ہمہ جہتی جدوجہد' دستوری اصلاحات کے لئے کوشش' اسلامی ممالک کے لئے خدمات' مسئلہ خلافت کی حمایت کا جامع جائزہ اسی حصہ میں شامل ہے۔

تیسرا حصہ دینی اور علمی خدمات کو پیش کرتا ہے۔ اس حوالے سے ان کی انگریزی تصانیف نہایت گراں قدر اور مستند سمجھی جاتی ہیں۔ نبی کریمؐ کی سیرت' روح اسلام' اسلام میں عورت کا قانونی مقام' اسلام میں عورت کا مرتبہ' تاریخ اسلام' شریعت محمدی اسلامی قانون شخصی' قانون اوقاف وصایا اور دوسری کتابیں انگریزی میں تحریر کرکے جن کی تعداد ۱۳ ہے' انہوں نے اسلام کی صحیح اور واضح تصویر اہل مغرب کے سامنے پیش کی۔ سیرت اور تاریخ اسلام کے بارے میں جو شکوک اور غلط فہمیاں غیروں کے دل میں تھیں ان سب کے ازالہ کی سعی کی۔ سید امیر علی کی یہی خدمات اتنی وقیع ہیں کہ اگر وہ اور کچھ نہ کرتے تو ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔ ان تصانیف کے علاوہ ملکی اور بین الاقوامی سیاسی امور پر ان کے متعدد مقالات اور خطوط اہم اخبارات اور جرائد میں شائع ہوئے۔ ان کی بھی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ شاہد حسین رزاقی نے تمام



تحریروں کا تعارف کروایا اور ان کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

ان تینوں ابواب کے مطالعہ کے بعد سید امیر علی کے حالات زندگی' ان کی دینی' قومی' ادبی اور سیاسی خدمات کے بارے میں کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ مصنف نے تحقیقی دقتِ نظر سے تفصیلات کو جمع کیا اور حاصل شدہ معلومات کو حسن ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ابواب کی جس طرح تقسیم عمل میں لائی گئی ہے اس سے کسی قسم کے ابہام یا الجھن کا امکان باقی نہیں رہا۔ انداز بیان سنجیدہ اور سادہ ہے۔ کہیں بھی اپنے کسی نقطہ نظر کو حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ انصاف پسندی سے حالات و واقعات کو جوں کا توں پیش کردیا ہے۔ جگہ جگہ زیر بحث موضوع کے حوالے سے ضمناً "سید امیر علی کے اوصاف بھی واضح کیے ہیں۔

### سید ابوالاعلیٰ مودودی : چوہدری عبدالرحمٰن عبد : لاہور : ۱۹۷۱ء

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی دو اعتبار سے خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ایک جذبۂ خدمت اسلام اور دوسرے حاکم جابر کے خلاف برملا امر حق کا اعلان۔ ان کے مسلک سے اختلاف رکھنے والے بھی ان کی دو خصوصیات کے معترف ہیں۔ عبدالرحمان عبد نے ان کے سوانحی حالات تحقیق اور محنت سے مرتب کیے ہیں۔ کتاب میں ۲۷ ابواب ہیں۔ مصنف کے بیان کے مطابق

"اس کے پہلے سولہ ابواب اگست ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئے تھے۔ اس بات کو میں اپنے لئے باعث شرف و سعادت سمجھتا ہوں کہ سید محترم' سید ابوالاعلیٰ مودودی نے طبع اول پڑھنے کے بعد کچھ واقعات کی تصحیح فرمادی جو صرف وہی کرسکتے تھے۔" (۱۲)

کتاب کا آغاز خلاف معمول انداز میں کیا گیا۔ ۲۸ مارچ ۵۳ء کو صاحب سوانح کی گرفتاری' ان کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ کی سماعت اور سزائے موت' ان کا رحم کی اپیل سے انکار' یہ واقعات صاحب سوانح کی جانب متوجہ ہونے کے سبب بنے اور اس عزم و استقلال کو جس شخصیت میں پایا اس کی سوانح عمری لکھنے کے محرک ثابت ہوئے۔

ابتدائی ابواب میں آباواجداد' والد گرامی' مولانا مودودی کی پیدائش' لڑکپن اور تعلیم کا حال ہے۔ عملی زندگی میں داخل ہوئے تو ایک صحافی کی حیثیت سے تاج جبل پور' الجمعیتہ دہلی سے وابستہ رہے۔ اسلام کی خدمت اور سیاست میں حصہ لینے کا ولولہ مولانا محمد علی جوہر کے کارنامے کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ احیائے دین کی خاطر "ترجمان القرآن" خود نکالنے لگے۔ تحریک آزادی میں مسلمانوں کے کردار پر اپنے نقطہ نظر سے روشنی ڈالی۔ "مسلمانوں کی سیاسی کشمکش" تحریر کی جو متنازع ہونے کے باوجود لائق مطالعہ ہے۔ ۱۹۳۷ء میں شادی کے بعد علامہ اقبال کے

کینے پر پنجاب منتقل ہوئے۔ قیام پاکستان سے قبل اور اس کے بعد جماعت اسلامی کی تنظیم اور اس کے ذریعہ اپنے افکار کی تشہیر اور تفہیم کرتے رہے۔

ان تمام حالات اور واقعات کو کتاب میں تفصیل سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ مناسب ابواب اور ذیلی سرخیاں قائم کر کے مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ان میں گنجلک کا شائبہ بھی نہیں چونکہ سوانح میں سیاسی اور تاریخی واقعات آگئے ہیں اس لئے ان کے تناظر میں شخصیت نگاری کی گئی ہے۔ فن کے تمام لوازمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے صحت واقعات کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ کہیں کہیں جوش عقیدت نظر آتا ہے لیکن بیشتر غیر جانبداری سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

**ڈاکٹر ذاکر حسین : احسن علی مرزا : حیدر آباد دکن : ۱۹۷۱ء**

ڈاکٹر ذاکر حسین ایک سیاسی رہنما اور ماہر تعلیم تھے۔ سیاست سے ان کی دلچسپی کا آغاز ترک موالات کی تحریک کے دوران ایم اے او کالج علی گڑھ پر یلغار کے وقت سے ہوا۔ وہ مولانا محمد علی جوہر کی قائم کردہ نیشنل یونیورسٹی (جامعہ ملیہ) کے حامی اپنے طالب علمی کے زمانہ سے تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد اسی جامعہ سے منسلک رہے۔ سیاست نے انہیں اوج کمال تک پہنچایا اور وہ بھارت کے صدر جمہوریہ بن گئے۔ احسن علی مرزا نے ان کے حالات اس کتاب میں مرتب کئے ہیں جسے نہ تو سوانح عمری کہا جا سکتا ہے اور نہ شخصی خاکہ۔ یہ صرف ان کے کارناموں کا ریکارڈ ہے جو باہم مربوط بھی نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے، جو ایک صحافی ہیں، اخباری ضرورتوں کے تحت مختلف موضوعات پر مضامین لکھے اور اس کتاب میں جمع کر دیئے ہیں جہاں سیرت نگاری کے مواقع پیدا ہوئے ہیں وہاں مصنف نے دیگر اہل قلم حضرات کے بیانات نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

**حیات عثمانی : محمد انوار الحسن شیرکوٹی : کراچی : طبع اول ۱۹۷۲ء : دوم ۱۹۸۸ء**

شیخ الہند علامہ شبیر احمد عثمانی وسیع و عمیق علم، شگفتہ اور رواں قلم، دلنشین خطابت، ملت مسلمہ کے اجتماعی مسائل میں معتدل اور سیاست میں مدبرانہ فکر کے مالک تھے۔ پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی کو ان سے قلبی لگاؤ ہے جس نے ان سے موصوف کے بارے میں متعدد کتب تحریر کرنے پر مائل کیا۔ انہوں نے "تجلیات عثمانی" کے نام سے پہلی کتاب ۱۹۵۷ء میں شائع کی جسے وہ ان کی علمی سوانح قرار دیتے ہیں۔ اس میں موصوف کے علوم و فنون، تفسیر و حدیث، فقہ، منطق و فلسفہ، علم کلام، اردو، عربی اور فارسی ادب پر دسترس، تقریر و تحریر پر قدرت، سیاست میں



فعال کردار کو موضوع بنایا ہے۔ دوسری کاوش "مکتوبات عثمانی" کا مجموعہ بنام "انوار عثمانی" (مطبوعہ ۱۹۶۹ء) ہے اس کے بعد خطبات عثمانی (۱۹۷۲ء) مرتب کئے۔ ان خطبات کا تعلق ترک موالات، مسلم لیگ، نظریۂ پاکستان، استصواب صوبہ سرحد، مکالمۃ الصدرین، میرٹھ کانفرنس، خطبۂ صدارت جمعیۃ العلماء لاہور، خطبۂ صدارت ڈھاکہ، قرارداد مقاصد، خطبۂ عیدالفطر کراچی سے ہے۔ "حیات عثمانی" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ تسلسل مضامین کی خاطر اسے جلد اول، تجلیات عثمانی کو جلد دوم، انوار عثمانی کو جلد سوم اور خطبات عثمانی کو جلد چہارم قرار دیا جائے تو علامہ عثمانی کے حیات و کارناموں کے تمام گوشے صحیح ترتیب میں سامنے آجاتے ہیں۔

حیات عثمانی بحالت موجودہ غیر مکمل ہے اس کی اشاعت اول کے بعد مزید ۳۴ صفحات کا مسودہ برآمد ہوا جسے اشاعت دوم میں شامل کر لیا گیا۔ اس میں واقعات ۱۹۴۶ء تک کے ہیں۔ آخری تین سالوں کے حالات لکھنے کی غالباً" مصنف کو مہلت نہ مل سکی اور وہ دنیا سے رحلت کر گئے۔

ابتدائی باب میں پیدائش، والد محترم کے ذکر، خاندان کے حالات شجرۂ نسب، شجرۂ زرین کی جامع تفصیلات موجود ہیں۔ تعلیم کے ضمن میں بھی غیر معمولی تحقیق کے ذریعہ معلومات فراہم کی ہیں یہاں تک کہ سال بہ سال ہر مضمون میں حاصل کردہ نمبر تک دیئے ہیں۔ درس و تدریس کے سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند، مدرسہ فتح پور دہلی اور پھر دیوبند میں واپسی، مدرسہ ڈابھیل کی صدارت کا احوال سال بہ سال درج کیا ہے۔

صاحب سوانح کی قومی خدمات کے سلسلہ میں جمعیت الانصار سے وابستگی، اس کے اجلاسوں میں شرکت، علامہ عبیداللہ سندھی سے قربت کے بارے میں نہایت وضاحت اور طوالت سے کام لیا ہے۔ اس کے بعض حصے مثلاً" مولانا سندھی کی کہانی خود ان کی زبانی، ریشمی خطوط کی سازش یا تحریک، رولٹ ایکٹ کا تجزیہ، دارالعلوم دیوبند کا ذکر پارلیمنٹ میں، براہ راست سوانح عمری سے تعلق نہیں رکھتے لیکن سلسلۂ بیان میں انہیں بھی شامل کر لیا ہے۔ کتاب کا ایک پہلو ان کے خانگی حالات اور علمی و تدریسی مشاغل سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا ان کی سیاسی مصروفیات پیش کرتا ہے۔ اس کا آغاز جمعیت الانصار میں شمولیت سے ہو چکا تھا۔ تحریک عدم تعاون کے دوران اسے ان کی حمایت حاصل رہی بعد میں جب کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان خلیج حائل ہو گئی اور علمائے دیوبند میں بیشتر کانگریس کی حمایت کرتے ہوئے "نیشنلزم" کے حامی ہو گئے تو علامہ عثمانی نے حتی الامکان دیوبند کو کانگریس کے اثر سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ اس

بارے میں ان کا ایک خط موصولہ ایڈیٹر عصر جدید کلکتہ بھی شامل کیا گیا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

"میں نہ کبھی کانگریس میں شامل ہوا اور نہ اب شامل ہوں بلکہ اس شمول پر میں نے کانگریسی علماء سے کئی دن تک بہت شد و مد سے بحث کی --- قومیت متحدہ کا نظریہ جو کانگریس کے دستور اساسی کا بنیادی پتھر ہے اس معنی میں جو کانگریس کے آئمہ اس سے ارادت رکھتے ہیں میرے نزدیک شرعی نقطۂ نظر سے کبھی قابل تسلیم نہیں ہو سکتا ہے۔"

"ہمارے لئے سب سے پہلے ایک اسلامی وحدت و مرکزیت پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے بدون کسی نام نہاد قومی متحدہ کے تیز رو دھارے میں گھاس کے تنکوں کی طرح اپنے کو ڈال دینا خودکشی کے مترادف ہے۔"

"مسلمان دوسری قوم سے صلح کرسکتے ہیں۔ عہد و پیمان کرسکتے ہیں بہت سے امور میں تعاون کرسکتے ہیں لیکن وہ اپنی ہستی کو دوسروں میں مدغم نہیں کرسکتے۔ میں اپنے لئے فرقہ پرست کا خطاب پسند کرتا ہوں مگر اپنی قوم کا غدار یا قوم فروش کہلانا کبھی قبول نہیں کرسکتا۔" (۱۵)

ان نظریات کی وجہ سے انہیں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا آزاد سے سیاسی اختلاف رہا لیکن شخصی طور پر وہ ان کا احترام کرتے رہے چنانچہ ۲۴ جون ۱۹۳۲ء کو جب مولانا مدنی کو گرفتار کیا گیا تو دیوبند میں احتجاجی جلسہ ہوا۔ اس میں علامہ عثمانی نے پُرجوش انداز میں حکومت کی کارروائی کی مذمت کی۔ سیاسی خلفشار کے اس دور میں طلبائے دیوبند بھی احتجاج میں حصہ لینے لگے تھے اور کانگریس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے ایسے میں انہوں نے دارالعلوم کی صدارت سے دستکش ہونا ہی مناسب سمجھا اور ۱۹۴۴ء میں منصب سے مستعفی ہوگئے۔ ایک سال بعد وہ مسلم لیگ اور نظریہ پاکستان کے زبردست حامی کے طور پر ابھرے جس کی وجہ سے مصنف نے انہیں "تعمیر پاکستان کا معمار ثانی" (۱۶) قرار دیا ہے۔ دو قومی نظریہ اور پاکستان کی حمایت میں ان کے متعدد پیغامات اور بیانات اخبارات کے حوالہ سے نقل کئے ہیں۔

انگریزوں کے دور اقتدار میں جو آخری بار انتخاب ہوئے ان میں بھی علامہ نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ شہید ملت جس حلقہ سے امیدوار تھے وہ مسلم اکثریت کے باوجود مولانا حسین احمد مدنی کے ارادت مندوں کا مخصوص حلقہ تھا۔ شہید ملت کو شکست دینے کے لئے

"نہرو سے لے کر پٹیل و پنتھ تک سیم و زر کی تھیلیاں نچھاور کرتے" شب و روز حلقۂ انتخاب کا طوفانی دورہ کر رہے تھے۔ ٹاٹا اور برلا کی تمام دولت روپہلی چاندی بن کر صرف ایک نشست کے



لئے وقف ہو کر رہ گئی تھی۔" (۱۷)

اس زمانہ میں علامہ علیل تھے اس کے باوجود مسلم لیگ کانفرنس میرٹھ منعقدہ ۳۰ دسمبر میں شرکت کی۔ اپنے خطبے میں احکام خداوندی کی تعمیل اور شعار اسلامی کے تحفظ کی خاطر مسلم لیگ کو ووٹ دینے پر زور دیا۔ مصنف نے متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ اور تعمیر پاکستان کے لئے علامہ کی تمام کوششوں کا تاریخی ریکارڈ یکجا کردیا ہے مصنف نے مستند معلومات کے ذریعہ صاحب سوانح کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور ان کے کارناموں کی نوعیت کو واضح کرنے کے لئے جگہ جگہ تاریخی پس منظر سے کام لیا ہے۔ انداز بیان عام فہم ہے کہیں کہیں جذبات ارادت کا غلبہ ہے بحیثیت مجموعی ایک نہایت کامیاب سوانح عمری ہے۔

## شیخ الہند مولانا محمود حسن 'حیات اور علمی کارنامے : ڈاکٹر اقبال حسن خاں علی گڑھ : ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر اقبال حسن خاں نے "شیخ الہند مولانا محمود حسن 'حیات اور علمی کارنامے" کے موضوع پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے زیر نگرانی تحقیقی کام انجام دے کر جو مقالہ تحریر کیا تھا اس پر انہیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ یہ اسی مقالہ کی کتابی صورت ہے۔ عام طور پر شیخ الہند کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں کسی ایک شعبۂ زندگی کے حوالہ سے تفصیلات ملتی ہیں۔ ڈاکٹریٹ کے لئے بھی محدود موضوع کے انتخاب کا رجحان عام ہے لیکن اس مقالہ کی تیاری کے لئے وسیع موضوع منتخب کیا گیا۔ خاندان اور حالات زندگی کے علاوہ علمی کارنامے' اصلاحی کارنامے' سیاسی زندگی اور ہندوستان میں سیاسی رہبری اس کے ابواب ہیں۔ ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک ہی تصنیف میں صاحب سوانح کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔ ہر باب اپنی جگہ مکمل اور تحقیقی کاوشوں کا مظہر ہے۔ مقالہ نگار کا رجحان تمام معلومات کو یکجا کردینے کا ہے۔ اس میں داد و ستائش کا انداز کہیں نمایاں نہیں۔ مقالہ کی افادیت میں اضافہ کی خاطر شیخ الہند کے مکاتیب کے علاوہ ممتاز تلامذہ' خلفائے مجاز کا تذکرہ بطور ضمیمہ شامل کردیا گیا ہے۔

## ذوالفقار علی بھٹو : توصیف چغتائی : کراچی : ۱۹۷۴ء

توصیف چغتائی نے ذوالفقار علی بھٹو کی سوانح عمری تاثراتی انداز میں تحریر کی ہے۔ عام سوانح عمریوں کی طرح اس میں سلسلہ وار واقعات نہیں ہیں۔ ان کی پیدائش کے سال اور والدین کا

کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ بھٹو کے بارے میں بات وہاں سے شروع ہوئی جہاں انہوں نے ان کے معتمد خاص شیخ محمد دین کے حوالہ سے ان کے بچپن کے واقعات لکھے ہیں۔ ان کے بچپن کی اہم باتوں کے بارے میں بیان کیا ہے کہ بہت ضدی تھے۔ کرکٹ کا بے حد شوق تھا۔ کھیلتے بھی تھے اور کمنٹری بھی توجہ سے سنتے تھے۔ کبھی کبھی طالب علموں کے جلسوں میں تقریریں بھی کرتے۔ سیاسی رجحان اسی وقت سے تھا۔ بچپن کا ذکر چند سطروں میں ختم کرکے قیام پاکستان کے بعد کے حالات بیان کئے ہیں جو بے حد مختصر اور بے ربط ہیں۔ شیخ دین محمد کے بیانات کے بعد بھٹو کے دوست بھارت کی سوتنترا پارٹی کے لیڈر مودی کے بیانات شروع ہوگئے ہیں۔ اس میں نوجوانی کے زمانہ کے لاابالی پن کا ذکر ہے۔ مودی کے حوالہ سے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ وہ ایک لڑکی پر عاشق ہوگئے تھے لیکن لڑکی کے والدین مزاحم رہے۔ اسی غم میں وہ سینئر کیمبرج کے امتحان میں ناکام رہے۔ ان کا ذہن نپولین کے کارناموں سے متاثر تھا۔ انہوں نے سوشلزم پر بہت سی کتابیں پڑھی تھیں۔ ہیرالڈ لاسکی کے اکثر لیکچر سنے تھے اور اس کی مشہور کتاب "گرامر آف پالیٹکس" سے بھی متاثر تھے۔ کتاب کا اصل موضوع دور اقتدار کے کارنامے ہیں ان پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور ان کے ہر عمل کے لئے جواز تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں بات بنتی نظر نہیں آئی وہاں جذباتی انداز میں صرف وکالت کی ہے۔ ان میں بھی زیادہ زور خارجی معاملات پر دیا گیا ہے۔ صاحب سوانح جس المیہ سے دوچار ہوئے اس کے حوالہ سے مصنف کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوگئے ہیں۔

بھٹو کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں پر مصنف نے روشنی ڈالی ہے جیسے ان کا مطالعہ کا شوق، کام کرنے کی امنگ، مصروفیت کار میں کبھی تھکن سے دوچار نہ ہونا، اپنی بات منوانا، اسلام اور سوشلزم کو ہم آہنگ کرنے کی سعی، اگر کتاب عقیدت مندی اور جذباتیت کے بجائے سنجیدگی اور علمی انداز میں لکھی جاتی تو شاید زیادہ کار آمد ہوتی۔ بحالت موجودہ یہ ایسی عقیدت کی نشاندہی کرتی ہے جو بالکل یکطرفہ اور غیر متوازن ہے۔

**اللہ کی تلوار، خالد بن الولید : میجر جنرل آغا ابراہیم اکرم : کراچی : ۱۹۷۵ء**

یہ سوانح ۷۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے شروع اور آخر میں ان علاقوں کے نقشے پیش کئے گئے ہیں جو حضرت خالد بن الولید کے دور میں فتح ہوئے۔

اس کتاب میں اسلام کے جید جرنیل حضرت خالد بن ولیدؓ کی سوانح کو بڑے سادہ اور دلکش



انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ان کی پیدائش سے قبول اسلام تک اور پھر ان کی جنگی فتوحات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ کتاب کو ۳۷ عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں لڑکپن، جوانی، قبول اسلام، جنگ خندق، جنگ احد، جنگ حنین، فتح مکہ، محاصرۂ طائف، جنگ یمامہ، جنگ سلاسل اور دیگر جنگوں کے ساتھ ان کی سپہ سالار کی حیثیت سے برطرفی کے واقعات کو تفصیل سے قلمبند کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ۲۹ نقشوں کی صورت میں تمام جنگوں اور فتوحات کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ قاری کو ان جگہوں کے نقشوں کے حوالے سے علاقوں کا اندازہ ہو سکے۔ یہ کتاب دراصل ایک فوجی جرنیل نے تحریر کی ہے اس لئے انہوں نے اپنے نقطۂ نظر سے تمام نقشے بھی فراہم کردیئے جو اگر نہ بھی ہوتے تو کتاب کی افادیت میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس سلسلے میں مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے۔

"سب سے مشکل جو اس نوعیت کے تحقیقی کام میں کسی تحقیق کرنے والے ادیب کو پیش آتی ہے وہ جغرافیائی مواد کا فقدان ہے۔ جغرافیہ چونکہ فوجی حکمت عملی کی ایک طبعی بنیاد ہوتا ہے اس لئے جب تک کہ اس وقت کے صحیح جغرافیائی حالات کا علم نہ ہو، کوئی بھی فوجی تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی۔" (۱۸)

یہ سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی تمام تاریخ فوجی کارناموں سے بھری پڑی ہے اور مسلمانوں کی فتوحات، ان کی بہادری کی داستانیں اور فوجی حکمت عملی ہماری تاریخ کے روشن باب ہیں۔ حضرت خالد بن ولید کی اس سوانح کے سلسلے میں مصنف نے بڑی محنت، جانفشانی اور تحقیق سے کام لیا ہے اور اس کام کی تحقیق کے لئے مصنف خود ان جگہوں پر گئے جہاں حضرت خالدؓ نے جنگیں لڑیں۔ دنیا بھر کے کتب خانے دیکھے۔ محققین کی تحقیقات کی روشنی میں اپنے کام کو مزید آگے بڑھایا پھر بھی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اس سلسلے میں یورپ اور لندن وغیرہ میں قیام کے دوران تمام مواد کھنگال ڈالا۔ عراق، شام اور ان تمام جگہوں پر جاکر خود معائنہ کیا۔ اردن، بیروت اور بغداد بھی گئے اور مشرق وسطیٰ میں تحقیق کے سلسلے میں تقریباً" چار سو میل کا سفر پیدل طے کیا پھر کہیں جاکر مطمئن ہونے کے بعد اسلام کے اس جیالے، بہادر و نڈر جنرل کی داستان شجاعت تحریر کی جو اعلیٰ تحقیقی مواد کے ساتھ ہی انداز تحریر کے اعتبار سے سادگی اور مرقع کشی کی اعلیٰ مثال کہی جا سکتی ہے۔ حضرت خالدؓ کی داستان حیات شاید ہی اس تحقیق و جستجو کے ساتھ دنیا کی کسی دوسری زبان میں پیش کی گئی ہو۔ بلاشبہ اس معیار کی تاریخی سوانح حیات اردو زبان و ادب کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔

## مولانا محمد علی جوہر' حیات اور تعلیمی نظریات : ثناء الحق صدیقی : کراچی : ۱۹۷۵ء

مولانا محمد علی کا شمار ان مسلمان مشاہیر میں ہوتا ہے جو جدوجہد آزادی کو مہمیز کرتے رہے۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے' مالی زیاں سے دوچار ہونے اور ہر نوع کے ذہنی اور روحانی صدمات برداشت کرنے کے باوجود آزادیٔ وطن کے عظیم مقصد کے لئے جان ہتھیلی پر لئے صف اول میں رہتے ہوئے قیادت کا حق ادا کرتے رہے۔ حیات محمد علی جن تفصیلات اور تاریخی شواہد کے ساتھ مرتب ہونی چاہئے ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ ثناء الحق صدیقی نے اس جانب توجہ کرکے اہم ضرورت کو پورا کرلیا ہے۔ اگرچہ ان کی کتاب "مولانا محمد علی جوہر اور تعلیمی نظریات" مختصر ہے۔ احوال و کوائف کا سرسری جائزہ لیا ہے پھر بھی صاحب سوانح کے خدوخال اور ان کے کارناموں کو منظر عام پر لانے کا حق ادا کیا ہے۔ سید الطاف علی بریلوی مرحوم کی تحریک پر مولانا کے تعلیمی نظریات کو پیش کرنا مقصود تھا۔ مولانا سیاست' خطابت اور صحافت کے حوالوں سے تو پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی تھی اور وہ بھی ایم اے او کالج کے مدمقابل علی گڑھ میں۔ اس لئے ان کے تعلیمی نظریات کو سمجھنے اور علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کی مخالفت کے محرکات کو جاننے کے لئے اس پہلو کو بھی اجاگر کرنا ضروری تھا۔ اس خاص مقصد کے لئے کتاب کا بڑا حصہ تعلیمی نظریات کی وضاحت میں صرف ہوا ہے جو صاحب سوانح کی شخصیت و فکر کو سمجھنے میں ممد ہے۔ ابتدا میں ان کے حالات زندگی بیان کئے ہیں۔ ادوار میں وہ تفصیل موجود نہیں جو جامع نقش قاری کے ذہن پر مرتب کرسکے۔ واقعات اور بیانات سرسری طور پر ہیں۔ گویا تسلسل قائم رکھتے ہوئے ایک ایسی زنجیر بنادی ہے جو مکمل تو ہے مگر موثر نہیں البتہ چند باتوں پر مصنف نے خصوصی توجہ دی ہے۔ ان میں مولانا کی جرأت اظہار' قوت عمل اور نڈرپن شامل ہیں اور حق یہ ہے کہ انہیں کے امتزاج سے ان کی شخصیت کی صورت گری ہوئی ہے۔ مصنف نے ان صفات کا ذکر کیا ہے واقعات کے حوالہ سے ان کی تصدیق کی ہے اور اپنے بیانات کی صداقت پر مہر لگادی ہے۔ یہ مزید تفصیل اور جزئیات کے متقاضی تھے۔ انداز بیان کو پُرجوش بنانے کی سعی کی ہے تاکہ تحریر صاحب سوانح کی صفات سے ہم آہنگ ہوسکے۔

مولانا جوہر کے کارناموں کے حوالے سے جو اعتراضات ہوتے رہے ہیں ان کے جواب دینے یا انہیں رد کردینے کی جانب توجہ نہیں دی گئی۔

اس کتاب کو جامع سوانح عمری کے بجائے ایسا خاکہ قرار دیا جاسکتا ہے جس کی بنیاد پر عظیم



عمارت تعمیر ہوسکتی ہے۔

## قائداعظم کے ۷۲ سال : خواجہ رضی حیدر : کراچی : ۱۹۷۶ء

قائداعظم کی صد سالہ یوم پیدائش پر جو کتابیں ان کے بارے میں شائع ہوئی ہیں خواجہ رضی حیدر کی تالیف "قائداعظم کے ۷۲ سال" معلومات کے لحاظ سے ایک اہم اور قابل قدر اضافہ ہے۔ مؤلف نے قائداعظم کی زندگی اور تاریخی واقعات کو ادوار یا ابواب میں تقسیم کرنے کے بجائے انہیں ایک ڈائری کے طور پر تاریخ وار مرتب کیا ہے۔ سنین کو ہر حصہ کا عنوان قرار دیا ہے اس طرح ۱۸۷۶ء سے ۱۹۴۸ء تک کے حالات تقریباً" ساٹھ حصوں میں بیان کئے ہیں۔ ان کے ماخذات میں وہ تمام انگریزی اردو کتابیں اور مضامین شامل ہیں جو تالیف سے قبل شائع ہوچکے تھے۔ ان کی تفصیل "کتابیات" میں موجود ہے اور جو معلومات جس ماخذ سے حاصل کی گئی ہیں ان کا دیانت داری سے متن میں حوالہ بھی دے دیا ہے۔

کتاب دو اہم رجحانات کی نشاندہی کرتی ہے۔ ایک رجحان یہ ہے کہ قائداعظم کے حالات زندگی کے بارے میں مختلف اہل علم نے جو تحقیق کی ہے اور جن کے معتبر و مستند ہونے سے انکار نہیں کیا گیا انہیں اس طرح یکجا کردیا جائے کہ ایک سے زائد کتابیں پڑھنے کی ضرورت باقی نہ رہے اور قائداعظم کی سوانح عمری بھی مکمل و جامع ہوجائے۔ ابتدائی زندگی کے بارے میں انہیں معتبر معلومات جی الانہ کی تحقیقی تصنیف "قائداعظم جناح" (مطبوعہ ۱۹۶۷ء) سے حاصل ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ مطلوب الحسن سید' سروجنی نائیڈو' زیڈ اے سلہری' چوہدری خلیق الزماں' ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی شائع شدہ شخصی معلومات بھی اہم ہیں۔

دوسرا اہم رجحان یہ ہے کہ ہر سال کے اہم سیاسی ملکی و بین الاقوامی واقعات کو بھی ساتھ ساتھ بیان کردیا ہے اور اس سلسلہ میں بعض اہم انکشافات بھی کئے ہیں مثلاً" قائداعظم ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو پیدا ہوئے ۱۴ دن بعد ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد ڈالی گئی۔ ۲ نومبر ۱۸۷۷ء میں کراچی میں سر سلطان محمد آغا خان کی ولادت ہوئی۔ پھر ٹھیک اس کے سات دن بعد سیالکوٹ میں ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو علامہ اقبال نے جنم لیا۔ اس طرح ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو پاکستان کی لیڈرشپ' ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو سنگ بنیاد کا پہلا پتھر' ۲ نومبر ۱۸۷۷ء کو وسائل اور ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو نظریہ وجود میں آیا۔ (۱۹)

ان تاریخوں سے سب واقف ہیں۔ مؤلف نے ان کی یاد تازہ کرتے ہوئے ان کو باہم مربوط کردیا ہے۔ بہت سے تاریخی واقعات اس کتاب میں ایسے ملیں گے جن کا قائد کی زندگی سے کوئی

تعلق نہیں ہے اور نہ ان کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے یہ محض قاری کی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے ہیں اور پس منظر کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔

تالیف کی نوعیت سرسری نہیں ہے ہر وہ واقعہ' تقریر' سیاسی بیان جو کتابوں' رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو چکا تھا اسے شامل کتاب کرنے کی بھرپور سعی کی گئی ہے۔ عام طور پر قائد کی نجی اور ازدواجی زندگی کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ مؤلف نے اسے تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ ہیکٹر بولائتھو (۲۰)' مقصود احمد خان (۲۱)' جی الانہ (۲۲)' رئیس احمد جعفری (۲۳)' چوہدری خلیق الزماں (۲۴)' کے حوالوں سے ان کے ۱۱ سالہ ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز سے آگہی پہنچائی ہے۔ اس سے قارئین کے ایک طبقہ کا تجسس ختم ہو گیا ہے۔

مؤلف نے سیرت و کردار کا جداگانہ طور پر جائزہ نہیں لیا ہے جو واقعات بیان کئے ہیں انہیں سے قائد کی سیرت کے نقوش واضح ہوتے جاتے ہیں کہیں کہیں مؤلف نے خود بھی اس کی صراحت کر دی ہے۔

**ہمارے قائداعظم : اعجاز احمد : لاہور : ۱۹۷۶ء**

قائداعظم محمد علی جناح کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ان کے سوانحی کوائف پر جو کتب مرتب کی گئیں انہیں میں سے ایک اعجاز احمد کی "ہمارے قائداعظم" ہے جس کے ڈیڑھ سو صفحات میں قائد کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے اس ضخامت کے ساتھ جو سوانح مرتب ہو گی اس کی نوعیت سرسری اور اجمالی ہی ہو سکتی ہے۔ تمام حالات عام کتابوں سے اخذ کئے گئے لیکن کسی کا حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس لئے سوانح کو جو درجہ استناد کا حاصل ہونا چاہئے حاصل نہیں ہو گا۔ اس تالیف کے ذریعہ مؤلف نے قائداعظم کے حالات زندگی مکمل طور پر بیان کرنے کا حق ادا کیا ہے اور نہ ان کی شخصیت کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ کتاب زیادہ سے زیادہ اسکول کے طالب علموں کے لئے مفید ہو سکتی ہے اور غالباً" انہیں کے لئے لکھی گئی ہے چونکہ مؤلف نے دیباچہ یا مقدمہ شامل کتاب کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا ہے اس لئے ان کے حقیقی مقصد کی نشاندہی بھی نہیں کی جا سکتی۔ البتہ آخری ۴۵ صفحات پر ارشادات قائد (بلا حوالہ) درج ہیں اور اس نوع کے اقتباسات طالب علموں کے لئے ہی مفید ہو سکتے ہیں۔

**بابائے قوم : حمید اللہ ہاشمی : لائل پور : ۱۹۷۶ء**

قائداعظم کے صد سالہ جشن پیدائش کے سلسلہ میں یہ کتاب لکھی گئی۔ اس میں قائد کے



سوانح' ان کی سیرت' وجاہت' قابلیت اور سیاسی بصیرت کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب اگرچہ مجمل اور مختصر ہے لیکن مذکورہ تمام پہلوؤں کا خوش اسلوبی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کسی خاص اور جدید تحقیق پر مبنی نہیں بلکہ مؤلف نے تمام شائع شدہ کتب' اخبارات اور جرائد سے مواد اخذ کیا ہے۔ اگرچہ ان کا حوالہ نہیں دیا لیکن سلیقے سے مرتب کیا ہے جس سے عام قاری جو زیادہ معلومات کا حامل نہیں ہے بہتر طور پر استفادہ کر سکتا ہے۔ سیاسی حالات اور واقعات کو تاریخی ترتیب میں بیان کرتے ہوئے ان میں قائداعظم کے کردار (رول) کی وضاحت کر دی ہے۔ اس طرح کتاب بیک وقت تاریخ' سیاسیات ہند اور قائداعظم کے سیاسی کارناموں کا احاطہ کرتی ہے۔ تقریباً" ۸۵ صفحات میں سیاسی سوانح بیان کرنے کے بعد باقی صفحات کو ان کی سیرت و شخصیت کے لئے وقف رکھا ہے۔ اس میں ان کی عظمت کردار' قوت عمل' عزم راسخ' بلند حوصلگی' اصول پسندی' ارادے کی پختگی' ظاہر و باطن کی یکسانیت' حق گوئی و بے باکی' ایثار و قربانی' اسلام سے محبت اور کبھی شکست قبول نہ کرنے کی خوبیوں کا دلنشین انداز میں ذکر ہوا ہے۔

آج کے نوجوانوں کے لئے قائد کے کردار کی بار بار تفہیم کی ضرورت ہے۔ اس نقطہ نظر سے یہ نہایت کامیاب اور کارآمد حصہ ہے۔ کردار و سیرت کے حوالے سے مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید مشاہیر کے ان بیانات سے ہوتی ہے جو کتاب کے آخری حصے میں شامل ہیں۔ ان میں ملکی اور بین الاقوامی' مسلم اور غیر مسلم' اپنے اور پرائے سب شامل ہیں۔ ان سب کے خراج عقیدت سے قائد کی سیرت ایک تابندہ خورشید کی طرح سامنے آجاتی ہے۔ ان کے کارنامے تو تاریخ اور نصاب کا حصہ بن چکے ہیں۔ اب ضرورت ان کے کردار کی عظمت کی اس طرح تشہیر کی ہے جس سے نوجوان انہیں آئیڈیل بنا کر ان کی پیروی کر سکیں۔ اس حوالے سے کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ اس میں یہ کاوش موجود ہے۔

آخر میں "حیات قائداعظم ایک نظر میں" حوالہ کی خاطر اچھا اضافہ ہے۔

**قائداعظم جناح : جی الانہ : ترجمہ' رئیس امروہوی : ۱۹۷۶ء : کراچی**

ڈاکٹر جی الانہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں۔ وہ انگریزی زبان کے شاعر اور مصنف ہونے کے باوجود فعال سیاست دان رہے ہیں جو سندھ مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری اور آل انڈیا مسلم لیگ کے فنانس سیکریٹری بھی رہے۔ سفارت کار کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ان کے شخصی تعلقات معاصرین میں بے شمار ملکی اور غیر ملکی شخصیات سے رہے جن میں قائداعظم بھی شامل تھے اور قائد ان کے لئے محبوب ترین ہستی کا درجہ رکھتے تھے۔ اس محبت اور عقیدت کی بنا پر جو

انہیں قائد سے تھی' انہوں نے ذاتی معلومات کے علاوہ ہر ممکن ذریعہ سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ ان کا ادعا ہے کہ کم و بیش ۲۰۰ کتابوں سے استفادہ کرنے کے علاوہ بے شمار معروف اور غیر معروف حضرات سے معلومات اخذ کی ہیں چنانچہ کتابیات کے تحت ۱۰۱ انگریزی کتب درج ہیں۔ مؤلف کا تعلق قائد کے آبائی علاقہ سے ہے اس لئے ان کے لئے سہولت رہی کہ قائد کے خاندان کے افراد اور اس خاندان سے واقف افراد سے شخصی رابطہ پیدا کر کے درست حالات معلوم کر سکیں چنانچہ خاندانی حالات اور قائد کے بچپن کے واقعات کے ضمن میں انہوں نے اکثر سوانح نگاروں سے اختلاف کیا ہے۔ رضوان احمد نے اپنی کتاب "قائداعظم کے ابتدائی تیس سال" میں محترمہ شیریں بائی کے بیانات پر انحصار کیا ہے اور انہیں کے حوالے سے قائد کے والدین کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تحریر کے مطابق ان کے والد جناح پونجا ہجرت کر کے کراچی نہیں آئے تھے بلکہ ان کے دادا پونجا میگھ جی آئے تھے۔ قائد کی والدہ کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ وہ آغا خان کے وزیر قاسم موسیٰ کی اولاد سے تھیں۔ جی الانہ نے ان واقعات کی صداقت کو تسلیم نہیں کیا ہے کیونکہ والدین کے انتقال کے وقت وہ کم سن تھیں بلکہ بھال جی' بھائی پیرجی پٹیلی والا' ان کی بیوی موتی بائی' فاطمہ بائی گانجی والی اور کریم قاسم کی بیان کردہ روایات کو زیادہ مستند مانا ہے۔ یہ سب لوگ محترمہ شیریں بائی سے عمر میں خاصے بڑے تھے اور ان کی نسبت قائد کے بزرگوں کو بہتر طور پر جانتے تھے۔ جی الانہ نے غیر ملکی نقادوں اور کانگریس کے نکات نظر کو بھی موضوع بنایا ہے اور سیاسی تاریخ کے ضمن میں قائد کے موقف اور کردار کو واضح کرنے کے لئے مضبوط دلائل سے کام لے کر مخالفانہ رویہ کی تکذیب کی ہے۔

قائداعظم کی مبسوط اور مستند سوانح عمری کے طور پر اس کتاب کو پیش کیا جا سکتا ہے جو حالات اور واقعات کے علاوہ سیاسی کشمکش' رویوں اور نتائج کی روشنی میں ان کی شخصیت کو جامع انداز میں پیش کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ اردو میں جی الانہ کی تحریر نہیں ہے بلکہ اصل کتاب انگریزی میں لکھی گئی تھی اور رئیس امروہوی نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ یہاں کامیاب ترجمہ پر رئیس امروہوی داد کے مستحق ہیں۔ انہوں نے کمال مہارت سے ترجمہ کیا ہے جس میں پڑھنے والوں کو کہیں بھی یہ تاثر نہیں ملتا کہ یہ ترجمہ ہے۔ عبارت رواں' سلیس اور تخلیقی شان کی حامل ہے۔

**دیدہ ور: (طبع سوم) کوثر نیازی: شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور' مارچ ۱۹۷۷ء**

کوثر نیازی کی کتاب "دیدہ ور" کے مطالعہ کے بعد ہم اس غور و فکر کے شکار رہے کہ اسے کس



صنف میں شامل کیا جائے چونکہ اس کے فلیپ میں لکھا گیا ہے کہ

"یہ ایک تاریخ ساز رہنما کی سوانح حیات ہے جس نے اپنی سیاسی بصیرت' تدبّر و فراست' حسن عمل اور تخلیقی سیاست سے تصور پاکستان کو حقیقت کا روپ دیا۔"

ہم نے اس کا تجزیاتی مطالعہ کیا اور اس لئے بھی کہ اس کی شہرت سوانح حیات کی ہے حالانکہ یہ سوانح عمری کے مسلمہ اصولوں میں کسی پر پورا نہیں اترتی۔ اس میں نہ تو زیڈ' اے' بھٹو کے پیدائش کا حال معلوم ہوتا ہے نہ ان کی تعلیم و تربیت کی تفصیل ملتی ہے۔ اصل میں اس کا موضوع بھٹو کی زندگی کا وہ دور ہے جو نظریات و عمل کے اعتبار سے ان کی سیاست سے متعلق ہے۔ اسی صدی میں بھٹو کے علاوہ دنیا کا کوئی رہنما ایسا نہیں ہوگا جس کے سیاسی نظریات اور اعمال اتنے متنازع ہوں۔ اگر مصنف ان کے بارے میں اعتراضات سے واقف تھے (اور یقیناً ہونا چاہیے) تو ان کا فرض تھا کہ ان کے جواب لکھتے۔ قدرت اللہ شہاب نے "شہاب نامہ" اسی لئے لکھا تھا۔ ان کی خودنوشت دراصل ان کا بیان صفائی ہے۔ کوثر نیازی نے اس حوالہ سے دوسرا رویّہ اختیار کیا ہے۔ بجائے متنازع مسائل میں الجھنے کے انہوں نے تعریف' ستائش' توصیف اور مدح سرائی تک اپنے بیانات کو محدود رکھا ہے۔ یہ ایک نیازمند کی لکھی ہوئی "کتاب مناقب" ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ مدح بلادلیل ہے۔ اول تو انہوں نے کسی امر پر دلیل' استدلال' حوالہ' سند پیش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اور اگر کی ہے تو وہ مضحکہ خیز ہوگئی ہے۔

کتاب کے صفحہ نمبر "۴۳" پر ماؤزے تنگ جیسے عظیم رہنما کے بارے میں لکھا ہے کہ

"ماؤزے تنگ کو گاؤں کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا"

اور قائداعظم کے بارے میں اظہار کیا ہے کہ

"خود ہمارے قائداعظم درمیانہ طبقے کے تاجر گھرانے میں پیدا ہوئے۔"

ان زعماء کی صف میں بھٹو کو شامل کرنے کے لئے انہوں نے لکھا ہے کہ

"ذوالفقار علی بھٹو کو جنم دینے کے لئے گھرانے کا انتخاب کرتے وقت بھی شاید قدرت انہی اصولوں پر کاربند تھی"

دنیا جانتی ہے کہ بھٹو کا تعلق سندھ کے وڈیروں کے خاندان سے تھا۔ وہ چند چنندہ دولت مندوں میں شامل تھے اور اس بات کا فخریہ ذکر ان کی اولاد بھی کر رہی ہے انہیں ماؤ اور قائداعظم کی طرح غریب

گھرانے کا فرد قرار دینا حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

اسی طرح زرعی اصلاحات کے بارے میں ان کا بیان ہے کہ

"آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ بھٹو اس وقت اپنے پورے خاندان کے پاس صرف ڈھائی سو ایکڑ زمین رکھ کر ساری زمین حکومت کو دینے کو تیار تھے لیکن یہاں ایوب خان کے خود اپنے مفادات آڑے آگئے۔ اس کے اپنے خاندان کے لوگوں نے بہت سی زرعی زمین اونے پونے میں خرید کر روایتی جاگیرداروں کے مفادات کے طبقے میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اس طرح ایوب خان خود جاگیرداروں کے مفادات کا نگہبان بن گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایوب خاں نے جو زرعی اصلاحات نافذ کیں وہ بھٹو کی اصل تجاویز کے برعکس صرف ایوب خان کے مفادات کی تابع زرعی اصلاحات تھیں۔" (دیدہ ور ص ۵۷)

ایوب خان نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا فی الوقت یہ ہمارا موضوع نہیں۔ بھٹو نے زرعی اصلاحات بقول مصنف جو تجاویز پیش کی تھیں ان کے حوالے سے کوئی دستاویز کتاب میں شامل نہیں۔ آخر ایک مرعوب شخص کے بیان کو کیوں مستند تسلیم کیا جائے۔ زرعی اصلاحات بھٹو کے قانون کے مطابق تھیں یا نہیں یہ ایک الگ بحث طلب مسئلہ ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زرعی اصلاحات کے قانون میں ایسی کوئی شق شامل تھی جس کی وجہ سے بھٹو اپنی آرزو پوری نہیں کر سکے "کہ ان کے خاندان کے پاس صرف ڈھائی سو ایکڑ زمین رہے" اپنی یہ خواہش پوری کرنے میں کوئی قانونی مسئلہ حائل نہ تھا تو انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ محض ایوب خان کے "روایتی جاگیردار" بننے کے شوق کو دیکھتے ہوئے خود "روایتی جاگیردار" بنے رہنے کو کیوں ترجیح دی۔

یہ دو مثالیں ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ مصنف کے پاس یا تو مناسب دلائل نہ تھے یا وہ اس امر میں ذہنی طور پر معذور تھے۔

سب جانتے ہیں کہ ملک کا دستور ہے کہ حکومت اور سربراہ حکومت کی ایک متعینہ پالیسی ہوتی ہے وزراء اسی لیے مقرر کئے جاتے ہیں کہ وہ حکومت کی بنائی ہوئی پالیسیوں کو کامیاب بنائیں۔ اگر کسی وزیر کو اختلاف ہو تو آبرومندانہ طریقہ یہ ہے کہ وہ منصب سے استعفےٰ دے دے۔ مصنف کے مطابق چین، روس، انڈونیشیا، مصر اور دیگر ممالک سے دوستی کے رشتے مضبوط کرنا بھٹو کا کارنامہ ہے۔ لیکن انہوں نے اس امر کی وضاحت نہیں کی کہ اس معاملے میں کیا حکومت کو اختلاف تھا اور اس کے باوجود بھٹو



اتنے طاقتور تھے کہ حکومت کی پالیسی کو نظر انداز کرتے ہوئے سب کچھ انفرادی حیثیت میں کیا۔ اسی طرح مسئلہ کشمیر پر مصنف نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کے طبع زاد نہیں تھے بلکہ برسوں سے حکومت اور قوم کے خیالات کے عکاس تھے۔ لیکن مصنف نے اسے بھی بھٹو کے شخصی اور انفرادی کارنامے کے کھاتے میں ڈالا ہے۔

کوثر نیازی نے متنازع امور پر بھٹو کے یا اپنے خیالات پیش کرنے سے گریز کیا ہے انہوں نے "ادھر تم ادھر ہم" کے فلسفہ کی تشریح کرنے کی سعی نہیں کی۔ معاہدۂ تاشقند کے بعد بھٹو نے بار بار کہا کہ ان کی بوتل میں پس پردہ راز کا جن ہے جسے وہ باہر نکالیں گے لیکن وہ جن کبھی باہر نہیں آیا۔ مصنف بخوبی واقف ہوں گے کہ ایسا کوئی جن تھا بھی یا نہیں وہ اس کے ذکر سے قلم کو بچا گئے۔

"ادھر تم ادھر ہم" کے حوالے سے یہ بات زیر غور رہے کہ راقم الحروف (حسن وقار گل) خود نشتر پارک کراچی میں اس جلسے میں شریک تھا جب بھٹو نے اقتدار سنبھالنے کے بعد پہلی بار عوامی اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے مجیب الرحمن کو (جو اس وقت تک جیل میں تھے) مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ادھر تم ادھر ہم" اور اسی رات مجیب کو رہا کر کے مغربی پاکستان سے روانہ کر دیا گیا۔

دنیا کے پہلے اور آخری سول چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر زیڈ اے بھٹو نے بالآخر مجیب الرحمن کو مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کا موقع فراہم کر دیا۔ مصنف نے اس سلسلے میں پہلوتہی کی ہے۔

کوثر نیازی نے بھٹو کو بہت بڑا سوشلسٹ ثابت کرنے کے لئے اپنا سارا زور بیان صرف کیا ہے لیکن اس بارے میں غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ نظریہ کو لفظ معنے کوئی اہم اور معقول بات نہیں۔ دیکھنا یہ پڑتا ہے کہ نظریہ کے حامل شخص نے اپنی زندگی اس کے اصولوں پر ڈھالی بھی ہے یا نہیں ظاہری صورت حال بالکل مختلف ہی نہیں، متضاد ہے۔ بھٹو کی پُر تعیش زندگی سے کون واقف نہیں۔ ان کے طرز زندگی کا سوشلزم سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ "وڈیرہ شاہی" کے عین مطابق تھا۔

یہی نہیں بلکہ وہ تمام پہلو جو بھٹو کی شخصیت پر داغ ہیں مصنف نے ان سے گریز کیا ہے۔ کونشن مسلم لیگ کے قیام، اس کے سیکرٹری کے عہدہ پر فائز اور فعال رہنے کا معاملہ، بنیادی جمہوریت، عام انتخابات میں ایوب خاں کی حمایت اور مادر ملت کی مخالفت کا جواز، مجیب الرحمن سے خفیہ گفت و شنید، دو اسمبلیوں کے بیک وقت کارگزار ہونے کا فلسفہ غرض پردہ پوشی کی وارداتیں کہاں کہاں ہوئی ہیں اس کے اظہار کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔

مصنف اس بات کی وضاحت میں بھی کامیاب نہیں ہوئے کہ ان لمحوں میں جو قوم کی قسمت کے

فیصلے کے لیے تھے۔ بھٹو بیمار کیوں ہو جاتے تھے۔ تاشقند میں بیمار ہوئے' جب پولینڈ کی قرارداد پیش ہوئی تو نزلہ کی وجہ سے سلامتی کونسل میں حاضر ہونے سے قاصر رہے اور جب حاضر ہوئے تو جذباتی طور پر قرارداد کو چاک کرنے کی راہ فرار اختیار کی۔ ایوب خان نے جب تمام سیاسی رہنماؤں کا اجلاس طلب کیا تو سارے مخالفین شریک ہوئے۔ بھٹو کیوں شریک نہیں ہوئے؟

مصنف نے بھٹو کی سیاسی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے سکندر مرزا سے کھلے اور درپردہ تعلقات کو نظرانداز کر دیا ہے۔ جن کے دور میں وہ پہلی بار وزیر بنے تھے۔

پاکستان کی حکومت کا حصہ بننے کے باوجود انہوں نے بمبئی میں واقع آبائی جائیداد کے حصول کی جن بنیادوں اور جواز کے ساتھ درخواست کی اس کا احوال بھی درج نہیں ہے۔

"دیدہ ور" دراصل پاکستان کی کامیابیوں کی داستان ہے جو بھٹو کے کھاتے میں ڈال دی گئی ہیں۔ ان کی شخصی اور ذاتی کمزوریوں' غلطیوں' اور بے راہ رویوں کے ذکر سے یہ داستان خالی ہے۔

فلیپ میں لکھا گیا ہے کہ

"اس کتاب کے آئینے میں پاکستان کی تقدیر بدلنے والی شخصیت ذوالفقار علی بھٹو کا انداز فکر و عمل پوری تابناکیوں کے جلوہ گر نظر آتا ہے۔

اگر پاکستان کو توڑنا ہی اس کی تقدیر قرار پاتا ہے تب بھی اس کتاب میں ان کے انداز فکر و عمل کی تابناکی نظر نہیں آتی۔ عظیم سیاسی رہنماؤں کے سوانح حیات لکھنے والے بھی عظیم ہوا کرتے ہیں مگر جب پارٹی کا کوئی آدمی سوانح لکھنے بیٹھ جائے تو سوائے مدلّل مداحی کے اور کچھ سامنے نہیں آتا۔ جیسا کہ مولانا کوثر نیازی نے بھٹو کی سوانح نگاری میں بھٹو کی زندگی کا ایک رخ دکھا کر اور بقیہ زندگی کو پردۂ اخفاء میں رکھ کر اپنے علمی قد کو مزید چھوٹا کر لیا ہے حالانکہ مولانا کوثر نیازی کی علمیت میں کوئی شک نہیں مگر جب یہ طے کر کے سوانح لکھی جائے کہ صرف کارنامے گنوانے ہیں تو ایسی مدلّل مداحی کی باتیں سامنے آتی ہیں حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ پاکستان ٹوٹنے کی ذمے دار تینوں شخصیات کی موت غیر طبعی واقع ہوئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بھٹو میں عظیم قائدانہ صلاحیتیں تھیں مگر انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے وہ کام نہ لیا جس سے وہ قوم کے ہیرو بن سکتے تھے بلکہ اپنے مشیروں اور وزیروں کی خوشامد میں اس طرح گھرے کہ ان کے مزاج میں رعونت اور تکبر آ گیا اور یہی تکبر ان کو لے ڈوبا۔ کاش کہ مصنف کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں بھٹو حکومت کے زوال اور عدالت سے ان کی سزائے موت تک کے واقعات



رقم کر کے اپنی تصنیف "دیدہ ور" میں مزید اضافے کر کے قارئین کی دلچسپی کا سامان فراہم کر سکتے کیونکہ یہ کتاب قاری کو متوجہ تو کر سکتی ہے فن سوانح نگاری کے حوالے سے سوانح نگاری کے معیار سے عاری ہے۔

## سید الاحرار : اشتیاق اظہر : بھاولپور : ۱۹۷۸ء

اشتیاق اظہر نے اپنی کتاب "سید الاحرار" میں مولانا حسرت کی زندگی کے دو پہلوؤں کو موضوع بنایا ہے۔ ایک ذاتی زندگی اور دوسرے سیاسی زندگی۔ ذاتی زندگی میں ازدواجی اور مذہبی زندگی کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس میں تمام اہم واقعات کو جس میں پیدائش سے لے کر رحلت تک کے تمام مراحل شامل ہیں پیش کیا گیا ہے۔ ازدواجی زندگی کے ضمن میں ان کی اہلیہ نشاۃ النساء بیگم کے حالات بھی شامل ہیں جن کے تذکرہ کے بغیر مولانا کی زندگی کا کوئی پہلو مکمل نہیں ہوتا۔ غالباً" اسی خیال سے مئولف نے مولانا کی نجی زندگی پر کم اور بیگم حسرت موہانی پر زیادہ لکھا ہے۔ دوسرا حصہ سیاسی زندگی کے بارے میں ہے۔ ۱۹۰۴ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کی حمایت میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ اسی سے ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا زمانہ کے نشیب و فراز سے گزر کر اور رہنمایان قوم کے انداز فکر اور طریق جدوجہد سے ٹکراتے ہوئے وہ کئی منزلوں سے گزرے۔ کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں میں حصہ لیا۔ کامل آزادی کی قرارداد یں ۱۹۲۱ء میں خلافت' مسلم لیگ اور کانگریس میں پیش کیں۔ پہلی آل انڈیا کیمونسٹ کانفرنس (۱۹۲۵ء) کانپور میں منعقد کی۔ ۱۹۳۷ء کے بعد مسلم لیگ میں سرگرم ہوئے اور آخر تک اس کا ساتھ دیا۔ اس نشیب و فراز کی کہانی مولانا کے فعال اور پُرخلوص مساعی کی ترجمان بھی ہے اور موقع پرست سیاست دانوں کی نقاب کشائی بھی۔ مئولف نے مختلف حوالوں سے کم و بیش نصف صدی کی جدوجہد کا حال لکھا ہے بلکہ ساتھ ہی برصغیر کی تمام تحریکات آزادی' تحریک پاکستان کا پس منظر' مسلم لیگ کی تاریخ اور تحریک پاکستان کے سلسلہ میں ان کے عظیم' ناقابل فراموش تاریخی کردار کو مربوط طور پر پیش کیا ہے جہاں تک مولانا کی نظریاتی فکر اور عملی جد کا تعلق ہے' کوشش کی گئی ہے کہ مولانا کی تقریروں اور تحریروں سے استفادہ کیا جائے تاکہ بیان کو مستند مانا جائے۔ ذاتی زندگی کے مقابلہ میں سیاسی زندگی پر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ اس کے ضمن میں بھی مولانا کا کردار اور ان کے اوصاف واضح ہوتے گئے ہیں۔ واقعات کو اس طرح سنین وار بیان کیا گیا کہ تاریخی تسلسل قائم رہے۔ کتاب میں دیگر اہل قلم حضرات کے حوالے بکثرت دیئے گئے ہیں۔ اس بارے میں دو

خامیاں باقی رہ گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ان بیانات کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور ہر بیان کو مستند مان لیا گیا۔ **مثلاً** "انہوں نے اس روایت کا اعادہ کیا ہے کہ

"دوران تعلیم مولانا کو کالج سے تین بار نکالا گیا۔" (۲۵)

اور یہ غور نہیں کیا کہ کسی بھی اچھے کالج کا یہ قاعدہ نہیں ہو سکتا ہے کہ ایک بار نکالے جانے والے طالب علم کو دوبارہ داخلہ دیا جائے چہ جائیکہ تین بار نکالے گئے اور پھر داخلہ بھی دیا یہاں تک کہ وہ بی اے کے امتحان میں شریک ہو گئے۔ دوسری خامی یہ ہے کہ جو بیانات نقل کئے گئے ان کی کوئی تفصیل نہیں کہ کس کتاب سے لئے گئے ہیں۔ حوالے کے بغیر کسی بیان کی درست نقل کو کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ مولانا کی تقریروں اور تحریروں کے سلسلہ میں بھی سارے اقتباسات کا یہی حال ہے۔ ان خامیوں کی موجودگی میں تحریر کا جو اثر ہونا چاہئے نہیں ہوتا۔ تحقیق کے جدید رویّہ میں یہ دونوں باتیں نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک کمزور روایت کی تحریر سے دیگر مستند روایات پر بھی زد پڑتی ہے۔ مؤلف نے خلوص نیت، محنت و کاوش سے معلومات جمع کی ہیں۔ اتنی معلومات مولانا کے بارے میں لکھی گئی کسی کتاب میں نہیں ملیں گی۔ اگر احتیاط اور اصول کو مدّ نظر رکھا جاتا تو اس کی افادیت کئی گنا بڑھ جاتی۔

**غازی عبدالرحمان شہید پشاوری : ابوسلمان شاہجہانپوری : کراچی : ۱۹۷۹ء**

یہ جذبۂ اسلامی اور جوش انقلاب سے سرشار ایسے شخص کی داستان حیات ہے جس کی ہر سانس جہد سے عبارت ہے۔ غازی عبدالرحمان کے نام سے اب بہت کم لوگ واقف رہ گئے ہیں۔ یہ ہماری تاریخ کا المیہ ہے کہ ملت کے درخشاں مستقبل کے لئے جنہوں نے زندگیاں وقف کردیں وہ ذہنوں سے محو ہو گئے ہیں۔ ارباب علم و دانش نے چند ناموں کا انتخاب کر لیا ہے اور انہیں کے بارے میں حقائق کا اعادہ کرتے رہتے ہیں۔ غازی عبدالرحمٰن کے سوانحی حالات ان کے بھائی محمد یوسف کی دلچسپی اور مولانا ابوسلمان شاہجہانپوری کی توجہ سے محفوظ ہو گئے ہیں۔

عبدالرحمان کے بزرگوں میں شیخ غلام صدیق مغلوں کے عہد عروج میں ہندوستان آئے تھے جو حضرت جاں بازولی کے مرید باصفا، نہایت سعادت مند، خدمت گزار، زہد و ورع، نیکی و تقویٰ کے پابند، اخلاص عمل اور پاکیزہ سیرت کے نمونہ تھے۔ انہیں کی نسل میں حاجی غلام صمدانی گزرے ہیں جنہوں نے بہت معمولی حیثیت سے عملی زندگی کی ابتدا کی اور سخت محنت و مشقت سے صاحب دولت و ثروت ہو گئے۔ ان کے فرزندوں میں عبدالرحمان بھی تھے جو ۶ دسمبر ۱۸۸۶ء کو پشاور میں



پیدا ہوئے۔ ناظرہ قرآن سے تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ ساتویں جماعت تک پشاور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں انہیں حسرت موہانی کے علاوہ راجہ غلام حسین، عبدالرحمٰن صدیقی، فضل امین جیسے انگریز دشمن نوجوانوں کی صحبت نصیب ہوئی۔ ۱۹۰۷ء میں راجہ غلام حسین کا پولیس سے جھگڑا ہوا اور کالج میں ہڑتال ہوئی تو اس میں شریک تھے۔ حسرت موہانی نے جو قابل اعتراض مضمون اپنے رسالے اردوئے معلی میں شائع کیا تھا اور جس کی پاداش میں انہیں سزائے قید ہوئی اس میں بھی عبدالرحمٰن کو ملوث کیا گیا تھا۔ ان کے بھائی کا بیان ہے کہ فضل امین اور عبدالرحمٰن کو ۳، ۳ سال کے لئے کالج سے خارج کیا گیا تھا۔ وہ ۱۹۱۱ء میں دوبارہ علی گڑھ گئے لیکن جب جنگ بلقان شروع ہوئی اور ڈاکٹر انصاری ترکوں کی طبی امداد کے لئے مشن لے کر گئے جس میں ۲۷، ۲۸ افراد شامل تھے تو ان میں عبدالرحمٰن بھی تھے۔ وفد تو واپس آگیا لیکن وہ ترکی میں قیام پذیر رہے اور مصطفیٰ کمال پاشا سے قربت حاصل کی۔ انہیں کابل میں ترکی کا سفیر بھی مقرر کیا گیا جہاں کئی برس مشکل حالات میں وہ سفارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس سے بے تعلق ہونے کے بعد بھی انہوں نے ترکی میں قیام جاری رکھا۔ ۲۰، ۲۱ مئی ۱۹۲۵ء کی درمیانی شب میں قسطنطنیہ میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ ان کی رؤف بے سے شباہت بہت ملتی تھی۔ انہیں کے دھوکے میں عبدالرحمٰن کو گولی ماری گئی تھی۔ اس مجاہد اور عالم اسلام کے خدمت گزار کی زندگی کا خاکہ اسی کتاب کے حوالے سے اس لئے درج کیا گیا کہ قاری اس فراموش کردہ شخصیت کے خدوخال سے واقف ہو سکے۔ صاحب سوانح کے حالات کی فراہمی میں ان کے بھائی محمد یوسف نے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا۔ عبدالرحمان کے خطوط، اس زمانہ کی اخباری اطلاعات سے بھی مصنف نے استفادہ کیا ہے اور ڈاکٹر ریاض الحسن کی شخصی معلومات کا اس میں اضافہ ہے۔ جہاں تک ممکن ہوا درست اور تفصیلی حالات جمع کئے گئے ہیں جو کہ صاحب سوانح کی بھولی ہوئی یاد تازہ کرنا تصنیف کا اصل مقصد تھا اس لئے مصنف نے اپنا پورا زور بیان صرف کیا ہے۔ عام سوانح کی طرح سنجیدگی اور غیر جانبداری کے رویّہ سے اجتناب کیا ہے۔ غالباً" شخصیت اور ان کے بارے میں عام رجحان کے لحاظ سے اس کی ضرورت بھی تھی حالانکہ عام تصانیف میں مصنف کا اشہب قلم اس نوع کی جولانی نہیں دکھایا کرتا۔

**ہمارے پیارے مولانا : نظر زیدی : لاہور : ۱۹۸۰ء**

نونہالوں کی تعلیم اور ذہنی تربیت کی خاطر نصابی کتب کے علاوہ بھی عام معلوماتی کتابیں فراہم کرنا تمام والدین کے ساتھ اہل علم کا بھی فرض ہے۔ یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ اس جانب

اتنی توجہ نہیں کی جارہی ہے جتنی کرنا چاہئے۔

قصہ کہانیوں کے ماسوا جو اہل علم اہم معلوماتی کتب تحریر کرتے ہیں وہ گویا قوم کے مستقبل کو سنوارنے میں تعاون کرتے ہیں ضروری یہی نہیں کہ بچوں کو ایسی کتابیں پڑھائی جائیں بلکہ انہیں ہر نوعیت اور مکتبۂ فکر کی کتابوں سے استفادہ کا موقع فراہم ہونا چاہئے تاکہ آنے والی نسلوں میں تعصب پیدا نہ ہو۔ اس نقطۂ نظر سے نظر زیدی نے "ہمارے پیارے مولانا" تصنیف کی ہے۔ کتاب کا موضوع مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی سوانح عمری ہے مقصد تحریر کے ضمن میں مصنف نے لکھا ہے کہ

"بچے یہ کتاب پڑھ کر سمجھ جائیں گے کہ ایک عام آدمی بھی بڑا آدمی بن سکتا ہے۔ مولانا کے حالات پڑھ کر تم بھی بڑا آدمی بننے کی کوشش کرو۔" (۲۶)

مصنف نے مولانا مودودی کے حالات زندگی کے اہم اور سبق آموز پہلوؤں پر خصوصی توجہ کی ہے۔ بچپن کے واقعات مولانا کے ایک عزیز ساتھی اور دوست کے حوالہ سے لکھے ہیں جن کو مولانا نے آپ بیتی سنائی تھی۔ یہ حصہ آپ بیتی کے طور پر ہی لکھا گیا ہے۔ بچوں کا ذہن نادانستہ طور پر دوسروں کے بیانات کی نسبت جس پر بیتی ہے اس کی زبان سے باتیں سن کر یقین کرلیتے ہیں اسی گر کو مدنظر رکھ کر آپ بیتی کا رنگ اختیار کیا ہے۔ مصنف کا طرز بیانیہ نہیں بلکہ وہ بچوں کو مخاطب کرکے ایک ایک بات کہہ جاتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی باہمی ذہنی رابطہ میں مدد دیتا ہے۔ مولانا کے واقعات زندگی کے ساتھ نصیحت اور اہم باتوں کی توجیہہ بھی کی گئی ہے۔ بڑی عمر والوں کے لئے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں ان میں اس طریقہ کو مستحسن خیال نہیں کیا جاتا لیکن بچوں کی تفہیم کے لئے یہی طریقہ مناسب ہے۔ مصنف نے بچوں کی معلومات میں اضافہ کی خاطر موقع موقع سے دیگر مشاہیر کا ذکر کیا ہے۔ جہاں مصنف نے ذکر کیا ہے کہ

"مولانا کم عمری میں اخبار کے باقاعدہ ایڈیٹر بنے اور اسے کامیابی سے چلایا وہیں انہوں نے مسلمان فاتح محمد بن قاسم کا تعارف کم عمر فاتح کے طور پر کیا ہے۔" (۲۷)

اور ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی ہے کہ کارنامے انجام دینے کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کی کشمکش اور جدوجہد کے حوالہ سے تعلیمی میدان میں سرسید احمد خان' مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سیاسی میدان میں مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی' مولانا ظفر علی خان' مولانا حسرت موہانی' مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور قائداعظم محمد علی جناح کے نام گنوائے ہیں۔ اس سے اور کوئی فائدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو کم سن بچے



مشاہیر کے ناموں سے واقف ہوسکتے ہیں۔ مولانا کی تصانیف' رسالہ ترجمان القرآن کی خوبیوں' جماعت اسلامی کے قیام اور اس کی کاوشوں کا ذکر بھی دلنشین انداز میں کیا ہے۔ صاحب سوانح کی سیرت پر خصوص توجہ دی ہے۔ کردار کے غازی' سب کی عزت' صاف ستھری زندگی' صاف ستھرا لباس' مہمانوں کی عزت' پاکیزہ مجلس ظاہر و باطن ایک' لالچ سے پاک دل' دین کی حفاظت کے لئے قربانیاں' تصنیف و تالیف سے شغف جیسے عنوانات کے تحت ان کے اوصاف پر روشنی ڈالی ہے اور ہر ایک کے بارے میں واقعات تحریر کئے ہیں۔ انتہائی آسان زبان' سلیس انداز بیان اور شگفتہ طرز تحریر سے بچوں میں پڑھنے کا ذوق بڑھایا ہے۔ اچھی اچھی باتیں ان تک پہنچائی ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو مولانا کے اوصاف سے روشناس کروایا ہے اور دوسری طرف انسانی عظمت اور بزرگی کے لئے جن فضائل کا ہونا ضروری ہے ان کی نشاندہی بھی کی ہے۔ کتاب صرف سوانح نگاری کا حق ادا نہیں کرتی بلکہ کردار سازی کی کوشش کے حوالے سے بھی اہم ہے۔

## ملت کا پاسبان : کرم حیدری : کراچی : ۱۹۸۱ء

پروفیسر کرم حیدری جو اعلیٰ علمی و ادبی ذوق رکھتے ہیں اردو انگریزی میں اعلیٰ قابلیت رکھنے کے ساتھ فارسی و عربی میں بھی خاصی استعداد رکھتے ہیں۔ کثیر تعداد میں کتابیں تصنیف و تالیف کرچکے ہیں۔ انہوں نے قائداعظم اکادمی کراچی کے لئے قائد کی سوانح مرتب کرکے ایک قومی فرض ادا کیا ہے۔ اپنے وسیع مطالعہ کی بناء پر انہوں نے تقریباً" تمیں مستند کتب سے استفادہ کیا اور ان کے بیان کردہ حالات و واقعات سے فیض اٹھاتے ہوئے درست اور مناسب نتائج اخذ کرنے کی کوشش کے ساتھ یہ جامع سوانح مرتب کی ہے۔ کتاب ۳۲ ابواب پر مشتمل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف نے قائد کی زندگی اور سیاسی تاریخ کے کسی دور یا پہلو کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ قائد کے اجداد کے حالات' ان کی پیدائش اور بچپن کے واقعات سے ابتدا کرکے تعلیم' وکالت اور سیاست کے ضمن میں پیش آنے والے تمام واقعات کا تفصیلاً" ذکر کیا ہے اور ان کی صحت کا خیال رکھا ہے۔ جن امور کے بارے میں دیگر مؤلفین سے اختلاف ہوا ان کی نشاندہی کرتے ہوئے شواہد کے ذریعہ اپنی صحیح رائے پیش کی ہے اور نتیجہ قاری پر چھوڑ دیا ہے۔ ایسا کہیں نہیں ہوا کہ اپنی رائے پر اصرار کیا ہو۔ سیاسی واقعات کے ضمن میں مخالف نقطۂ نظر اور وجہ اختلاف کو پیش کرتے ہوئے اس کا بھی حقیقت پسندانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کی نوعیت یکطرفہ مدح خوانی کی نہیں ہے بلکہ غیر جانبدار مؤرخ اور سیرت نگار کی کاوش معلوم ہوتی ہے اور

یہی اس کا امتیازی وصف ہے۔ قائد کے سوانحی حالات اور سیاسی واقعات کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان کا تجزیہ جس سنجیدہ اور باوقار طرز نگارش کا متقاضی تھا اسے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک تحقیقی کتاب نہیں بلکہ مستند و معتبر ماخذات سے استفادہ اور مناسب تدوین اور حالات و واقعات کے تجزیاتی مطالعہ پر مبنی ہے اور اس اعتبار سے ایک کامیاب کوشش ہے۔ سلسلہ وار حوالوں اور جامع اشاریہ نے اس کتاب کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

**بیگم حسرت موہانی : عتیق احمد : دہلی : نومبر ۱۹۸۱ء**

بی اماں کے ساتھ جن مسلم خاتون کا نام سیاسیات کے حوالے سے لیا جاتا ہے ان میں ایک قابل احترام نام نشاط النساء کا بھی ہے جو عام طور پر بیگم حسرت کہلاتی ہیں۔ یہ ایک تاریخی المیہ ہے کہ مولانا حسرت موہانی اور بیگم حسرت کے سوانحی حالات اور سیاسی کارناموں پر وقیع تحقیقی کام نہیں کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند بنیادی سوالات ہنوز حل طلب ہیں۔ عتیق صدیقی کی کتاب بھی ان سوالات کے جوابات فراہم نہیں کرتی اور نہ ان کے بارے میں کسی قسم کی کدوکاوش کا انہوں نے ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ بیگم حسرت کا سن ولادت کیا تھا؟ ان کا بچپن موہان میں گذرا یا اپنے والد کے ساتھ رائچور میں گزرا؟ ان کی شادی کس سال ہوئی؟ ان کی تعلیم کتنی تھی؟ وہ سماجی، تعلیمی و سیاسی معاملات میں کب سے شریک ہونے لگی تھیں؟ ان کے جوابات نہ اس کتاب میں موجود ہیں اور نہ کسی اور کتاب میں۔ اس وقت جبکہ بیگم حسرت کے ساتھ شخصی رابطے رکھنے والی خواتین اپنی زندگی کی آخری منزلوں میں تھیں، تب بھی کسی نے ان سے معلومات اخذ کرنے اور اہم کوائف جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ عتیق صدیقی نے کتابوں، رسالوں، اخبارات میں جو مواد منتشر تھا، اسے یکجا کر دیا ہے۔ اس کے باوجود بہت سی باتیں جو تحریر میں آچکی ہیں اور اہم بھی ہیں کتاب کا حصہ نہیں بن سکیں مثلاً "بیگم حسرت کی پہلی تقریر جو انہوں نے دسمبر ۱۹۰۵ء میں علی گڑھ میں مسلم خواتین کے اجتماع میں کی تھی۔ عبداللطیف صدر مجلس استقبالیہ مسلم لیگ اجلاس ۱۹۱۷ء نے جن موثر اور دلگداز الفاظ میں مولانا حسرت کی قید فرنگ ثانی کے دوران ان کی پریشانی اور بے بسی کا ذکر کیا ہے اس کتاب میں نہیں ہے بلکہ مولانا اور بیگم حسرت کے بارے میں لکھی گئی کسی کتاب میں شامل نہیں ہیں۔ حد یہ ہے کہ ان موصوفہ کی تاریخ رحلت بھی درست نہیں ہے۔ صفحہ ۱۱ پر درج ہے کہ سفر حج سے واپسی کے بعد ۱۸ اپریل ۱۹۳۷ء کو وہ سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔" حالانکہ تاریخ ۸ اپریل ۱۹۳۷ء ہونا چاہئے۔ اسے کتابت کی غلطی قرار دے کر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس غلطی کا اعادہ صفحہ ۸۴ پر کیا گیا



ہے۔ مقام تعجب ہے کہ صفحہ ۸۴ پر بیگم حسرت کے بارے میں وہ طویل تعزیتی نوٹ نقل کیا گیا ہے جو مولانا حسرت نے ان کی رحلت پر اردوئے معلی بابت مئی جون ۱۹۳۷ء میں شائع کیا تھا۔ نقل کرنے کے باوجود صحت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ صفحہ ۱۰۸ پر مولانا کی عبارت نقل کی گئی ہے کہ

"ان کی وفات جو ۸ر اپریل ۳۷ء مطابق ۲۵ر محرم ۱۳۵۶ھ کو واقع ہوئی۔" (۲۸)

ایک ہی کتاب میں مختلف تاریخوں کا بیان اور اختلاف کی وجوہ نہ بیان کرنا غیر سنجیدہ رویّہ کا اظہار ہے۔ جہاں تاریخ میں اختلاف ہے وہاں سن کی مطابقت بھی غلط ہے۔ بیگم حسرت کی وفات کی صحیح تاریخ ۸ر اپریل ۱۹۳۷ء مطابق ۲۵ محرم ۱۳۵۶ھ ہے۔ عتیق صدیقی تحقیقی کارناموں کے حوالے سے ایک اہم اور معتبر شخصیت ہیں۔ ان کی کتاب میں اس نوع کی غلطی کی تکرار بعد کے لکھنے والوں کو گمراہ کر سکتی ہے۔ اردوئے معلی کا مذکورہ شمارہ ہماری نظر سے گزرا ہے۔ اس میں واضح طور پر تاریخ رحلت ۸ اپریل ۱۹۳۷ء درج ہے۔

بحالات موجودہ جبکہ مولانا اور بیگم حسرت کو نظرانداز کرنے کا رویّہ عام ہے، یہ ابتدائی نوعیت کی کوشش بھی غنیمت ہے جو جامع تو نہیں لیکن تحقیق مزید کی راہیں کھولتی ہیں۔ بعض اخبارات کے اقتباسات، بیگم حسرت موہانی کا سفرنامۂ عراق اور ان کے خطوط بھی شامل کتاب ہیں جو یقیناً" معلومات افزا ہیں۔

**ظفر علی خاں اور ان کا عہد : عنایت اللہ نسیم سوہدروی : لاہور : ۱۹۸۲ء**

عنایت اللہ نسیم سوہدروی نے "ظفر علی خاں اور ان کا عہد" میں مولانا کی جامع سوانح تحریر کی ہے۔ مصنف کو عرصہ دراز تک تحریکات میں فعال کردار ادا کرنے، مولانا سے تقرّب خاص حاصل ہونے، ان کے مزاج اور رجحانات کا مطالعہ کرنے کا موقع حاصل رہا۔ ان کی معلومات شخصی ہونے کے علاوہ "زمیندار" پر منحصر ہیں۔ مصنف نے ابتدائیہ میں ان کے خاندان کا پس منظر تحریر کیا ہے اور ان کے والد مولوی سراج الدین احمد کے کوائف سے بھی آگاہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ والد کی بہت سی خصوصیات مولانا میں بھی موجود ہوں گی جو توارث اور تربیت کا نتیجہ تھیں۔ حق گوئی اور بے باکی، جذباتی ولولہ انگیزی دونوں کی مشترک اوصاف دکھائی دیتی ہیں۔ انگریز دشمنی میں بھی وہ ایک دوسرے کی مثل تھے اور نا حق کا دباؤ کسی طور پر قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ مولانا کی ولادت، ابتدائی تعلیم اور علی گڑھ کالج کے زمانہ کے واقعات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ حیدر آباد دکن میں ملازمت اور وہاں سے ملک بدری کا احوال بھی درج ہے۔ ملک بدری کی وجہ وہی لکھی ہے جو شورش کاشمیری نے تحریر کی ہے۔ اس کے بارے میں شک کا اظہار

پہلے ہی کردیا گیا ہے۔ لاہور واپسی 'زمیندار' کا احیاء اور سیاست سے وابستگی مولانا کی زندگی کے روشن باب ہیں۔ اس کے ہر پہلو پر مکمل تبصرہ موجود ہے۔ مولانا میں بہت سی خوبیاں تھیں جن کی تفصیلات درج ہیں۔ ان میں بے پناہ تحریری صلاحیتیں تھیں جن سے وہ متنوع کام لیتے رہے۔ شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو تاریخ کے ایک ایک واقعہ پر اپنے ردِعمل کو طنز' مزاح' تنقید اور تعرض کا نشانہ بنایا۔ پر گوئی کی ان میں غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ترجمہ کرتے تو انگریزی کے ایک ایک لفظ کو اپنی گرفت میں لے کر اردو متبادل لفظ کو نگینہ کی طرح جڑ دیتے۔ کرزن کی کتاب کا ترجمہ "خیابان فارس" کے نام سے اس طرح کیا ہے کہ ہر لفظ' ہر جملے اور ہر مصرعہ کو اردو میں منتقل کردیا۔ اردو سے انگریزی میں ترجمہ کی صلاحیت اس غضب کی تھی کہ مولانا شبلی کی کتاب الفاروق کو "Umer the Great" کے نام سے پوری مہارت کے ساتھ انگریزی کے قالب میں ڈھال دیا۔ سیاسی مضامین لکھے تو ان میں وہ زور بیان اور جوش و خروش ہوتا کہ حکومت کے درو بام تھرتھرا جاتے۔ سیاسی لیڈروں کی مخالفت کرتے تو انہیں کہیں کا نہ رکھتے۔ صحافت میں "افسانہ" "دکن ریویو" "ستارہ صبح" میں ادبی شان پیدا کردی۔ "زمیندار" کی ادارت کی تو جذبات کے طوفان اٹھائے۔ ان تمام کارناموں میں ان کی شخصیت کے پرتو نظر آتے ہیں۔ وہ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو رہتے۔ جمالی اور جلالی اجزاء ایک ساتھ ان کی ذات میں سمائے ہوئے تھے۔ مصنف نے ان کا کامیاب تجزیاتی مطالعہ کیا۔ واقعات زندگی کو سلسلہ وار بیان کیا ہے لیکن اس میں ایک کمی باقی رہ گئی ہے۔ مصنف نے سنین کی اہمیت کو نظرانداز کردیا ہے۔ بیشتر واقعات کے سنین درج نہیں کئے ہیں جو بغور مطالعہ کرنے اور کامل استفادہ کرنے والے قاری کی پریشانی کا باعث ہوتے ہیں۔

سوانح کا انداز بیان سنجیدہ اور پُروقار ہے۔ واقعات کی پیشکش میں کسی جانبداری سے کام نہیں لیا ہے مصنف کو صاحب سوانح کی ذات سے عقیدت تھی۔ انہوں نے اس کے اظہار کی کہیں کوشش نہیں کی ہے۔ شورش کاشمیری نے مولانا کی شخصیت نگاری میں جس جوش' ولولہ انگیزی اور زور خطابت سے کام لیا ہے اس کا شائبہ بھی اس میں نہیں ملتا۔ بیان کو واقعات اور تجزیے تک محدود رکھا ہے۔ ان میں جذبات کی رنگ آمیزی نہیں کی ہے۔ یہی تصنیف کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اس کی افادیت کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ مولانا کی سوانح کے پس منظر میں اس دور کی پوری تاریخ کا احاطہ کرلیا ہے۔ ان تمام تحریکات کے خدوخال بیان کردیئے ہیں جن سے مولانا کی وابستگی رہی۔ یہ کتاب مولانا ظفر علی خاں کی سوانح بھی ہے' ان کی شخصیت کا خاکہ بھی



ہے اور موجودہ صدی کی نصف اول کی علمی' ادبی' سیاسی' صحافتی تاریخ بھی ہے اور اس فن کاری سے ان سب کو یکجا کیا ہے کہ فنون سوانح نگاری و شخصیت نگاری متاثر نہیں ہوئے ہیں۔

**اتحاد جزیرۃ العرب (ابن سعود کی شخصیت اور کارنامے) : محمد المانع : ترجمہ رشید ملک : لاہور : ۱۹۸۲ء**

جزیرۃ العرب کے بارے میں یورپین مصنفین نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جو مغربی نقطۂ نظر کی حامل ہیں۔ "اتحاد جزیرۃ العرب" کے مصنف محمد المانع اسی سرزمین کے باشندے ہیں ان کا خاندان وسطی عرب کے صوبہ نجد سے ہے۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۵ء تک وہ ریاض میں شاہ عبدالعزیز کے دربار میں میر مترجم اور ترجمان کی حیثیت سے منسلک رہے۔ اس ملک کے باشندے ہونے کی وجہ سے وہ وہاں کی تاریخ سے واقف ہیں اور نو برس دربار سے تعلق کی بناء پر جنگوں میں' سفرِ حج میں اور تمام صحرائی مہمات میں شاہ کے ساتھ رہے اس دور کے سیاسی واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے ہوئے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز کی شخصیت کا جتنا قریب سے مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے مواقع انہیں حاصل رہے وہ شاہ کے اہل خاندان کے سوا شاید ہی کسی کو میسر آئے ہوں۔ اپنے مشاہدہ اور تجربے کی روشنی میں مصنف نے شاہ کے سیاسی کارناموں اور ان کے حالات زندگی اور اوصاف کو اس کتاب میں پیش کیا ہے یہ ایک باقاعدہ سوانح عمری نہیں ہے۔ تاریخ' سوانح اور شخصی خاکے کی ملی جلی شکل ہے مصنف کا رویّہ تاریخ کے تناظر میں شاہ کے نظم و ضبط' صبر و تحمل' عزم و ہمت اور طریق کار کا احوال بیان کرتا ہے اس سے شاہ کے تدبر اور دانشوری واضح ہوتی ہے۔

رشید ملک نے اس کتاب کو مصنف کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور تحریر کی روح کو باقی رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔

اس موضوع پر اردو میں کوئی باقاعدہ تصنیف موجود نہیں ہے اس لئے اس ترجمہ کو مقالہ میں شامل کیا گیا ہے۔

**مہاراجہ چندو لعل شاداں : ڈاکٹر ثمینہ شوکت : حیدرآباد دکن : دسمبر ۱۹۸۳ء**

چندو لعل شاداں (۸۰-۱۱۷۹ھ تا ۱۲۶۱ھ) ریاست حیدرآباد سے متعلق ایک تاریخی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی کے اہم شاعر بھی تھے۔ ان کا تعلق ٹوڈرمل کے اخلاف میں ہوتا ہے۔ ان کے والد نارائن داس تھے جنہیں مختلف اغراض کے لئے جو جاگیریں عطا ہوئی

تھیں ان کی مجموعی آمدنی تین لاکھ چھیالیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ گویا چندو لعل ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں السنہ و علوم شرقیہ کی تعلیم حاصل ہوئی تھی۔ ان کے ایک استاد سید غالب تھے جو فارسی اور عربی کے بڑے عالم تھے۔ ان کے علاوہ سید زین العابدین ہمدم طباطبائی سے بھی فارسی پڑھی تھی جو شیراز سے آئے تھے۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان اور ہندو طالب علموں میں مذاہب کے علاوہ باقی تعلیم ایک ہی نہج پر ہوتی تھی۔ دکن میں ہندو مسلم اتحاد و اختلاط مثالی نوعیت کا تھا۔ اسی ماحول میں بغیر کسی مذہبی تعصب کے وہ پروان چڑھے۔ ان کے ذمہ محلات شاہی کا انتظام تھا۔ ریاست کا شعبۂ مالیات ان کے تحت رہا۔ اپنے دور میں دکن کی مخصوص ثقافت اور تہذیب کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ خود اردو اور فارسی کے شاعر تھے اور دیگر شعراء کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ اس اعتبار سے دبستان دکن کا یہ درخشاں دور تھا کہ جس میں شاہ تجلی، شیر محمد خان ایمان، لچھمی نارائن شفیق، تمنا اورنگ آبادی، مہ لقا بائی چندا کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں شعراء گزرے جنہوں نے تمام اصناف سخن کی ترقی میں حصہ لیا۔ بیک وقت چندو لعل شادان اور ارسطو جاہ جیسے مخیر سرپرستان علم و ادب گزرے۔ ان کی سخاوتیں حاتم کو بھی شرمندہ کرتی تھیں۔ اسی دور کی دکن کی سیاسی اور ادبی تاریخ کے بہت سے گوشے اہل علم کی نگاہوں سے چھپے رہے۔ اب جو سلسلۂ تحقیق، تلاش اور جستجو کا شروع ہوا ہے تو خدوخال روشن ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت تاریخ دکن اور ادبیات دکن پر گہری نظر رکھتی ہیں اور تحقیق میں کاوش و جستجو کے جوہر دکھاتی ہیں۔ انہوں نے شادان کے سوانح، دکن کی تاریخ کے تناظر میں ان کی خدمات، شخصیت اور کردار کے روپ، شعر و شاعری کے شوق اور ذوق، ارباب علم و دانش کی سرپرستی کے واقعات کو دو سو سے زائد ماخذات کے حوالے سے ترتیب دیا۔ ان کے زیر نظر زیادہ تر مخطوطات رہے ہیں جن کا گراں بہا خزانہ دکن میں محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

اس میں ٹوڈرمل سے لے کر چندو لعل تک کے تمام لوگوں کے حالات اجمالی طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ بعد میں ان کی ولادت، پرورش، تعلیم و تربیت، ابتدائی ملازمت کی تفصیل دی ہے۔ ان کے پیشکاری کی خدمات پر مامور ہو کر ریاست کی خدمات انجام دینا، جس کے صلہ میں مہاراجہ کا خطاب اور منصب پانا، بعد میں راجہ راجایاں کا خطاب پانا، عروج کی وہ داستان ہے جو ایک طرف چندو لعل کی محنت، عقلمندی اور وفاداری کے عناصر کو اجاگر کرتی ہے تو دوسری طرف آصف جاہ ثانی کی مردم شناسی اور بلا امتیاز مذہب ان پر اعتماد کے جوہر کو ظاہر کرتی ہے۔ چندو لعل کی



سوانح دراصل تاریخ دکن کے ابواب ہیں۔ ان کی تفصیل مستند حوالوں سے بیان کی ہے۔ پورا ایک باب ان کی شخصیت اور کردار کے بارے میں ہے۔ وہ میانہ قد کے بہت دبلے پتلے اور کسی قدر سیاہ فام تھے۔ ان کے بشرہ سے نرمی، سوجھ بوجھ، غور و تعمق عیاں تھے، ناک اونچی اور طوطے کی چونچ کی طرح سامنے جھکی ہوئی تھی۔ لباس سادہ انگرکھا ہوتا تھا۔ عموماً دھوتی پہنتے تھے۔ سر پر پگڑی ہوتی تھی جس میں ہیرے جواہرات لگے ہوتے تھے۔ انہوں نے نہایت مصروف زندگی گزاری۔ شب و روز کا ہر لمحہ کسی نہ کسی منصوبے یا کام کا بوجھ ان کے سر پر سوار رہتا۔ وہ صبح اٹھ کر مذہبی فرائض انجام دیتے۔ اس کے بعد حکومت کے عہدیداروں سے بات چیت کا سلسلہ شروع ہوتا۔ انتظامی امور پر غور و خوض ہوتا۔ عوامی معاملات بھی نبٹائے جاتے۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو جاتی۔ اس وقت ان کا ناشتا ہوتا۔ اس کے بعد گھریلو معاملات پر توجہ دیتے۔ شام تک لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا۔ رات کے آٹھ بجے کھانا کھانے کے بعد سرکاری کاغذات دیکھتے۔ ضروری احکامات صادر کرتے۔ رات تفریحی مشاغل میں گزرتی جن میں موسیقی، رقص اور شاعری شامل ہوتے۔ موسیقی اور رقص کے حوالے سے وہ مہ لقا بائی چندا کی سرپرستی کرتے تھے۔ اس میں ایک مصلحت یہ تھی کہ چندا حضور رس اور صاحب اثر و رسوخ بھی تھے۔ انہیں تعمیرات کا بھی شوق تھا۔ داد و دہش میں وہ سب پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ان کی فیاضیوں کے بہت سے قصے اہل دکن کی زبانوں پر رہے۔ ڈاکٹر ثمینہ نے ان کی اولاد اور دیگر افراد خاندان کے تفصیلی حالات بھی تحقیق کے ساتھ درج کیے ہیں اور شادان کی شاعری کی خصوصیات پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

یوں تو پی ایچ ڈی کے لیے لکھے گئے مقالوں کی کمی نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ مقالے جو واقعی پی ایچ ڈی کے معیار پر اتر سکتے ہیں تو ان میں یہ بھی شامل ہے۔

**بہادر شاہ ظفر : اسلم پرویز : دہلی : ۱۹۸۶ء**

بہادر شاہ ظفر مغل سلطنت کے آخری تاجدار ہی نہیں تھے بلکہ مسلمانوں کی سلطنت کا نشان بھی ان کے ساتھ دم توڑ گیا تھا۔ وہ ان شاہوں کے وارث تھے جنہوں نے اپنی ذات میں ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی تہذیب میں اپنی ذات کو ضم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے تذکرے زبان زد خواص و عوام رہے۔ لال قلعہ کی داستانیں سب کی زبانوں پر رہیں لیکن تاریخی حقائق کی بازیابی سے شخصیت کے صحیح خدوخال پیش کرنے کی کوشش اسلم پرویز نے اپنی کتاب "بہادر شاہ ظفر" میں کی ہے۔ اس میں بہادر شاہ ظفر اور ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بارے

میں زیادہ تر معلومات ان سرکاری دستاویزات سے حاصل کی گئی ہیں جو نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہیں۔ ان کی تاریخی حیثیت اور صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے علاوہ قلعۂ معلی کی معاشرت اور تہذیب کے بارے میں درجنوں مستند کتابوں اور معتبر زاویوں سے استفادہ کیا ہے ساتھ ہی ریذیڈنٹ طامس مٹکاف کی بیٹی ایملی کی کتاب "The Golden Calm" بھی پیش نظر رہی جس کی نوعیت اس زمانہ کے رپورتاژ کی ہے۔

مصنف نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں ظفر کی زندگی اور ۱۸۵۷ء کے واقعہ میں ان کے کردار کو معروضی انداز میں پیش کیا ہے۔ دوسرے حصے میں ظفر کی ادبی شخصیت کا تعارف ہے۔ اس میں ان کے فکر و فن پر تنقیدی نظر نہیں ڈالی ہے البتہ ظفر کی شاعری کے بارے میں مصنف نے تنقیدی مضامین کو بطور ضمیمہ شامل کیا ہے۔

تحقیق کے مطابق بہادر شاہ ظفر کا پورا نام ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تھا۔ ان کی ولادت اکبر شاہ ثانی کے زمانۂ ولی عہدی میں ان کی ہندو بیوی لال بائی کے بطن سے ہوئی۔ تاریخ پیدائش ۲۸ر شعبان ۱۱۸۹ھ مطابق ۲۴ر اکتوبر ۱۷۷۵ء ہے۔ وہ ہفتہ کے روز غروب آفتاب کے وقت پیدا ہوئے۔ ابو ظفر ان کا تاریخی نام ہے اسی کی رعایت سے انہوں نے ظفر تخلص اختیار کیا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت قلعۂ معلی میں پورے اہتمام اور شان و شوکت سے ہوئی۔ انہوں نے مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کی۔ لال قلعہ کی تہذیبی زندگی اور مشاغل میں گہری دلچسپی لی۔ اکبر شاہ ثانی کے انتقال (۱۲۵۳ھ) کے فوراً بعد رات کے وقت تخت نشین ہوئے۔ انگریزوں نے معاہدوں کے ذریعہ شاہ دہلی کو اس طرح بے دست و پا کر دیا تھا کہ ان سے قلعہ میں مقیم تمام متعلقین و ملازمین کے اخراجات کی بجاآوری بھی ممکن نہ تھی۔ مزاجاً وہ نرم خو اور درویش صفت تھے۔ دوسرے بادشاہوں کی طرح عیش و عشرت میں کبھی مبتلا نہ رہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے دوران ان کا کردار بڑی حد تک بے عملی کا رہا۔ نہ تو وہ انگریزوں کا ساتھ دینے پر آمادہ تھے نہ باغیوں کا' اس کے باوجود انگریزوں نے کامیابی کے بعد ان پر بے جا الزامات لگا کر مقدمہ چلایا۔ محقق نے بہادر شاہ کا جواب دعویٰ محفوظ دستاویزات سے حاصل کر کے شامل کیا ہے اور ساری روداد سرکاری ریکارڈ' اس زمانہ میں لکھے گئے روزنامچوں اور اخبارات کی مدد سے مرتب کی ہے۔ ان کی بیگمات زینت محل' تاج محل' شاہ آبادی بیگم' اختر محل' سرداری بیگم کے علاوہ تمام صاحبزادوں اور صاحبزادیوں کے کوائف بھی معلوم کئے ہیں۔ بہادر شاہ کی رنگون روانگی کی مکمل روداد' وہاں قیام کی تفصیل' ہمراہیوں کے بارے میں معلومات' غرض کوئی پہلو ایسا نہیں



جو تشنہ رہا ہو۔

ظفر کی شاعری کے حوالے سے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کے استاد ذوق اور غالب انہیں شعر کہہ کر دیا کرتے تھے۔ ان امور کے بارے میں بھی مدلل اور مفصل بحث کی ہے۔ غلط فہمی محمد حسین آزاد کی پھیلائی ہوئی ہے۔ ظفر کے استادوں میں شاہ نصیر' کاظم حسین بے قرار' ذوق اور غالب شامل ہیں۔ ان میں ہر ایک کا انداز بیان جدا جدا ہے اور ظفر کے کلام کا انداز ان سب سے مختلف۔ محقق نے ظفر کے چاروں دواوین کی اشاعت کے بارے میں تفصیلات فراہم کی ہیں اور ایک نثری کتاب "خیابان تصوف" کا تعارف بھی کروایا ہے۔

ان سے قبل تنویر احمد علوی کی کتاب "ذوق' سوانح و انتقاد" (۱۹۶۳ء) شائع ہو چکی تھی اس کے بیشتر مشمولات و معلومات کی صداقت پر مدلل بحث کر کے انہیں مسترد کر دیا ہے۔

سوانح نگاری کے ضمن میں سابق حوالوں اور روایات سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ مصنف نے سہل نگاری سے کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ موضوع کی جزئیات کی تلاش میں سیکڑوں کتب' رسائل و اخبارات سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے ماخذات میں چند ایسی کتابیں بھی ہیں جو عام معلومات میں نہیں تھیں لیکن ان سب میں اہم اور مستند معلومات بھارت کے نیشنل آرکائیوز میں محفوظ Mutiny Papers اور وزارت خارجہ کے ریکارڈ ہیں جو شائع نہیں ہوئے۔ یہ اہم اور تاریخی ماخذات ہیں جو پہلی بار منظر عام پر آئے ہیں۔ مصنف نے تاریخ دانی' سوانح نگاری' شخصیت نگاری میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔

**مولانا ابوالکلام آزاد' شخصیت' سیرت اور افکار کا مطالعہ : ڈاکٹر شیر بہادر پنی : کراچی : فروری ۱۹۸۶ء**

ڈاکٹر شیر بہادر پنی مولانا آزاد سے ارادت و عقیدت رکھتے تھے جس کی ابتدا اس وقت ہوئی جب ان کی عمر ۱۲' ۱۳ سال سے زائد نہ تھی اور یہ روح اور دل کا رشتہ ستر سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہا اس لئے ان کی کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد' شخصیت' سیرت و افکار کا مطالعہ" ان کے عشق اور لگاؤ کا تذکرہ ہے۔ اسے موجودہ علمی مذاق کے معیار کے مطابق سیرت و شخصیت کا جامع تذکرہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے مطالب کی اہمیت اور مضامین کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر پنی نے اپنی یادداشت کے بھروسہ پر ان ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے جن میں وہ مولانا سے کچھ نہ کچھ سیکھنے میں کامیاب ہوئے۔ مولانا کے خاندانی حالات اور ان کے انتہائی مختصر حالات زندگی بیان کرنے کے ساتھ ان کے داعی قرآن اور اسلامی تہذیب کا نمونہ

ہونے کی حیثیتوں کو اجاگر کیا ہے۔ کتاب کا دلچسپ اور معلومات افزا باب "مولانا آزاد اور پاکستان" کے زیرِ عنوان ہے۔ اس میں مولانا کے اس نظریہ اور شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ باوجود شدید اختلاف کے جب پاکستان معرض وجود میں آگیا تو ان کی خواہش یہی تھی کہ پاکستان قائم رہے اور ترقی کرے کیونکہ پاکستان کی شکست و ریخت ملت اسلامیہ کی شکست و ریخت ہوگی۔ اس کی ترقی گویا مسلمانوں کی ترقی سمجھی جائے گی اس لئے انہوں نے ان پڑھے لکھے لوگوں کے پاکستان جانے کی ہمت افزائی کی جو حکومت ہند سے وابستہ تھے۔ اس حوالے سے متعدد شہادتیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ نظریہ کی شکست اور حقائق کو برخلاف آرزو قبول کرنے کی جس جرأت کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا عصبیت اور انا کے حصار سے باہر نکلنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے اور یہ خوبی بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ مصنف نے کتاب کے مضامین کو ان معلومات تک محدود رکھا ہے جن کے ذریعہ نئی نسل کی شخصیت سازی میں مدد مل سکتی ہے۔ اسے اپنے عقیدت مندانہ کلمات تحسین سے گرانبار نہیں ہونے دیا ہے۔

**امام الہند مولانا آزاد : مولانا امداد صابری : کراچی : اگست ۱۹۸۶ء**

مولانا امداد صابری جدوجہد آزادی میں شریک رہے ہیں اس لئے انہیں بیشتر اکابرین کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ان میں وہ سب سے زیادہ مولانا آزاد سے متاثر تھے۔ انہوں نے مولانا کے افکار کو جانچا، ان کی سیرت، عزائم اور مقاصد کو پرکھا اور جانا کہ وہ کڑے سے کڑے معیار پر بھی پورے اترے تب انہوں نے ان کی شخصیت، سیرت افکار اور خدمات کا یہ مرقع تیار کیا۔ کتاب مولانا آزاد کے حوالہ سے تالیف و تدوین کے حسن، مباحث کی جامعیت، تحقیق کے معیار صحت اور مواد کے درجہ استناد کی بناء پر اہم تالیف شمار ہوتی ہے۔ اس میں مولانا کی زندگی اور سیرت کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں رکھا ہے۔ اگرچہ مولانا امداد صابری کے ممدوح رہے ہیں، لیکن انہوں نے اس کتاب میں مورخ اور مصنف کی ذمہ داریاں خوبی سے نبھائی ہیں اور عقیدت مندی کو کہیں ظاہر نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے ہر پہلو پر مبصرانہ نظر ڈالی ہے۔ ان کا نقطۂ نظر متوازن اور مبنی بر انصاف ہے۔ وہ نہ تو محتسب بنے اور نہ قصیدہ خواں بنے ہیں۔ وہ کثیر التصانیف بھی ہیں اور ہر فن کو برتنا خوب جانتے ہیں۔ تحریر میں ان کا اپنا اسلوب ہے جو ادبی بھی ہے اور ہر قسم کے زوائد سے پاک ہے۔ زبان خالص دہلوی ! موضوع واضح ہو زبان پر قدرت ہو اور اپنا ایک اسلوب ہو تو ایسی کتابیں ہر ایک معیار پر پوری اترتی ہیں اور داد و تحسین حاصل کرتی ہیں۔



**سوانح حیات راجہ صاحب محمود آباد، محمد امیر احمد خان : سید اصغر علی شادانی : کراچی : دسمبر ۱۹۸۶ء**

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مرد مومن کے پیکر جمال و جلال کو دیکھنا ہو تو اس صدی کی دو عظیم شخصیات کا ہی حوالہ دیا جاسکتا ہے، ایک مولانا حسرت موہانی اور دوسرے راجہ صاحب محمود آباد۔ دونوں کی زندگیاں قوم کے لئے وقف تھیں۔ زندگی کی کوئی سانس ان کی اپنی نہ تھی، جو کچھ تھا وہ اسلام اور ملت کا قرض تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی اس قرض کو ادا کرنے میں بسر کی۔

راجہ صاحب محمود آباد محمد امیر احمد خان جدی نواب تھے۔ وسیع ریاست تھی، کروڑوں کی آمدنی تھی۔ اودھ میں جگہ جگہ ان کے محلات تھے جن میں اسباب زندگی ہی نہیں سامان آرائش و آرام کی فراوانی تھی۔ جب اس دور کے "ساحر" محمد علی جناح نے ان کی نوجوانی میں انہیں اپنا بھتیجا بنا کر اپنے مشن میں شریک کرنے کا ارادہ کیا تو گویا راجہ صاحب کی کایا پلٹ گئی۔ وہ فرد باقی نہیں رہے، اپنے آپ کو مسلم لیگ اور قائداعظم کے منصوبوں کا حصہ بنالیا۔ انہی کے آدرش پر قدم جمائے آگے بڑھتے رہے اور منزل کو پاکر دامن جھاڑتے ہوئے منزل سے بے نیاز ہوگئے۔

سوانح حیات راجہ صاحب کے مصنف سید اصغر علی شادانی شخصی طور پر ان تمام افراد سے قریب تر رہے ہیں جو راجہ صاحب کے خلوت و جلوت کے ساتھی تھے۔ ان سے مستند اور صداقت پر مبنی حالات دریافت کرکے بھی مطمئن نہیں ہوئے جب تک دیگر حضرات سے ان کی تصدیق و توثیق نہ کروالی۔ اسی احتیاط سے جو سوانح مرتب کئے گئے ہوں اس کے لفظ لفظ سے سچائی کی بو آتی ہے۔ مصنف نے اپنی تحقیق کے ذریعہ راجہ صاحب کے اسلاف اور اخلاف کے حالات بھی دریافت کرکے شامل کئے ہیں اس لئے اس کتاب کو راجہ صاحب کے سوانح قرار دینا درست نہیں ہوگا بلکہ یہ تو "تذکرۂ والیان ریاست محمود آباد" ہے۔ ابتدائی حصہ میں جو حالات بیان ہوئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ

"راجہ صاحب کا جدی سلسلہ براہ راست جناب محمد بن حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفۂ اول تک پہنچتا ہے اور نانہالی سلسلہ مجتہد العصر شمس العلماء مولانا سید ناصر حسینؒ صاحب قبلہ ناصر الملۃ ابن مولانا سید حامد حسین صاحب قبلہ مولف طبقات الانوار ابن سید محمد قلی نیشاپوری سے ہوتا ہوا امام ہفتم حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام تک جاملتا ہے۔ (۴۹)

ان کے جد اعلیٰ قاضی شیخ نصراللہ خلافت عباسیہ کے دور کے جید عالم، فاضل، نیک اور متقی بزرگ تھے جو بغداد میں رہائش پذیر تھے۔ شہاب الدین غوری کے فتح ہند کی خوشی میں خلیفہ کی

جانب سے اظہار خوشنودی کے لئے جو فرمان جاری ہوا اور خلعت عطا ہوا اسے شہاب الدین تک پہنچانے کا فرض انہی کے ذمہ کیا تھا۔ ہندوستان پہنچنے پر شہاب الدین ان سے اس قدر متاثر ہوا کہ انہیں اپنے ساتھ رکھنے کی منظوری خلیفہ سے حاصل کرلی۔ وہ ملتان میں قیام پذیر رہے۔ ان کے رشد وہدایات کے سلسلہ سے صرف ملتان کے لوگ فیضیاب نہیں ہوئے بلکہ سندھ کی قوم گھکو نے بھی ان کے دست حق پرست پر اسلام قبول کرلیا۔ ان کی نسل نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا۔ شیخ امجد، شیخ محمد، شیخ نصرت اللہ، شیخ نظام الدین، شیخ غلام مصطفیٰ قاضی القضاۃ کے منصب پر سرفراز رہے۔ عہد اکبری میں شیخ غلام مصطفیٰ کے صاحبزادے نواب داؤد خاں تلوار کے دھنی تھے۔ مغلیہ لشکر کے ساتھ اکثر داد شجاعت دی۔ ۱۵۶۹ء قلعہ رنتھنبور کی جنگ میں جام شہادت پیا۔ ان کے صاحبزادے نواب محمود خان نے محمود آباد آباد کیا۔ ان کے بعد خاندان تین شاخوں میں بٹ گیا۔ ہر شاخ نے ایک ریاست کی بنیاد ڈالی۔ نواب پہاڑ خاں، راج بھٹواھیو کے، شیخ محمد سعید خاں، بسوال کے شیخ، محمد محمود المعروف نواب بایزید خاں بلہرہ اور محمود آباد کے والی ہوئے۔ نواب بایزید خاں کے پوتے مصاحب علی خاں لاولد انتقال کرگئے تو ان کی بیوہ نے نواب کے بھتیجے نواب علی خاں کو متبنّیٰ کرلیا جو بلہرہ کے رئیس محمد امیر خاں کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ یہی محمد امیر احمد خاں راجہ صاحب کے پڑدادا تھے۔ ۱۸۵۷ء میں راجہ صاحب کے دادا، راجہ امیر حسن خاں نے اودھ کی حکمراں حضرت بیگم کا ساتھ دیا تھا اور اپنی فوج ان کے حوالے کردی تھی۔ ۳۰ر جون ۱۸۵۷ء کو اس فوج نے لکھنؤ کے نزدیک گگریل ندی کے کنارے سرہنری لارنس چیف کمشنر کو شکست فاش دی تھی اس کے بعد وہ ریزیڈنس میں پناہ لینے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اسی اقدام کی وجہ سے ریاست کے ضبط ہوجانے کا خدشہ تھا لیکن راجہ امیر حسن خاں انتقال کرگئے ان کا لڑکا علی محمد خاں نوعمر ہونے کی وجہ سے بے قصور قرار پایا اور ریاست بحال رہی۔ ریاست کی بحالی میں غالب کے بھانجے مرزا عباس بیگ کی انتہائی کوشش شامل رہی۔ راجہ علی محمد خاں کے صاحبزادہ ۵ر نومبر ۱۹۱۳ء یوم پنجشنبہ بہ وقت ایک ساعت دوپہر محمود آباد میں پیدا ہوئے۔

مصنف نے بزرگوں کے حالات کے ضمن میں تمام تاریخی واقعات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ "مہاراجہ سر محمد علی خاں بہادر" کے زیر عنوان راجہ صاحب کے والد کے کوائف درج ہیں۔ اس میں ان کی ازواج اور اولاد کے حالات کے ساتھ ان کے کردار میں خوش انتظامی، اسلامی شعائر کا احترام، غرباء کی مدد، رعایا سے سلوک، قومی معاملات سے دلچسپی، قائداعظم سے



برادرانہ تعلقات کو واضح کیا ہے۔ راجہ صاحب کے ابتدائی دور کے واقعات تعلیم کی جانب توجہ، صحت مندانہ کھیلوں سے رغبت، شاعری سے شغف کو بیان کرتے ہوئے ان کے مسلم لیگ میں شامل ہونے۔ قائداعظم کے حکم پر لیگ کے خزانچی مقرر ہونے اور ۱۹۳۷ء کے تاریخی سالانہ اجلاس لکھنؤ کا انعقاد کرکے لیگ کو حیات نو عطا کرنے تک کے تمام واقعات کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ مصنف نے ذکر کیا ہے کہ قائداعظم عرصہ تک صدر، لیاقت علی خان سیکریٹری اور راجہ صاحب خزانچی رہے لیکن اس حیثیت کی جانب توجہ نہیں فرمائی کہ لیگ کا خزانہ ہمیشہ خالی رہتا تھا پھر بھی ضروریات پوری ہوتی رہتی تھیں اس کے لئے رقم خزانے سے نہیں بلکہ خزانچی کی جیب سے نکلتی تھی اور انہوں نے جس قدر جیب خالی کی تھی اس کا حساب کبھی نہیں رکھا۔ وہ تحریک پاکستان کے ہراول دستہ میں شامل رہے۔ مسلمان طلبہ کی تنظیم کے صدر رہے۔ انہی کی کوششوں نے نوجوان نسل کو جدوجہد حصول پاکستان میں شامل کیا۔

راجہ علی محمد خان کی نجی زندگی کا بھی بھرپور جائزہ لیا گیا ہے ان کی شادی کا احوال اس طرح رقم ہوا ہے کہ ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے لیکن ہے دلچسپ اور سبق آموز بھی۔ اس میں خاندانی سیاست بھی ہے اور بزرگوں کی وہ وضع داری کہ چھوٹوں کے ناز کس طرح اٹھائے جائیں۔ کنیز عابد کے نکاح میں آنے کے بعد ان کے ہاں امیر محمد خان پیدا ہوئے۔ ولی عہد کی پیدائش کی خوشی میں تمام افراد خاندان سے روپیہ وصول کرکے "درویش راجہ" نے جمع شدہ تین لاکھ روپیہ آنکھوں کے اسپتال کے لئے دے دیا اور محل میں ایک زائد چراغ بھی روشن نہیں کیا۔

قائداعظم سے قریبی تعلقات کے حوالے سے بعض اہم واقعات کا انکشاف کیا گیا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ راجہ صاحب کا نوشتہ ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"جب قائداعظم محمد علی جناح سے والد مرحوم کے تعلقات استوار ہوئے تو اتحاد و یگانگت اس حد تک بڑھی کہ باقی تمام دوستیاں اور بھائی چارے ماند پڑ گئے۔ قائداعظم کے لئے ہمارے محل میں ایک کمرہ مخصوص تھا جسے ان کی پسند سے آراستہ کیا گیا تھا اس کمرے کو اسی وقت کھولا جاتا تھا جب قائداعظم ہمارے ہاں آتے تھے۔ مسٹر ایم اے جناح کے گہرے روابط اپنی جوانی کے ایام میں محمود آباد فیملی سے استوار ہوگئے تھے۔ میرے والد نے جناح صاحب کی شادی کے موقع پر ان کی طرف سے نکاح نامہ پر بطور گواہ دستخط کئے تھے جبکہ مولانا محمد حسین نجفی نے مسز جناح کی طرف سے گواہی کے دستخط فرمائے تھے وہ انگوٹھی جو مسٹر جناح نے شادی کے موقع پر مسز جناح کے ہاتھوں میں پہنائی تھی وہ میرے والد ہی کی طرف سے تحفہ میں دی گئی تھی۔ مسٹر اور مسز

جناح نے اپنا ہنی مون ہماری نینی تال والی کوٹھی میں منایا تھا۔" (۳۰)

راجہ صاحب زندگی بھر سیاست میں قائداعظم کے زیر تربیت رہے۔ گھر کے ماحول اور قائداعظم سے جو کچھ سیکھا اسے اپنی ذات کا حصہ بنایا۔ بے غرضی، قناعت پسندی، دوسروں کی دل کھول کر امداد کرنا، اپنی حیثیت منوانے کی کوشش نہ کرنا، برے حالوں میں شکوہ شکایت کا ایک حرف زبان پر نہ لانا، ان کی ایسی صفات تھی جو انہیں عام انسانی سطح سے بہت بلند کردیتی ہیں۔ مصنف نے ان تمام اوصاف کے بیان میں انصاف سے کام لیا ہے۔

راجہ صاحب شاعر بھی تھے، بحر اور محبوب تخلص کرتے تھے۔ گہر جائسی سے تلمذ حاصل تھا۔ غزل پر کم لیکن مرثیہ اور اسلام پر زیادہ توجہ فرماتے تھے۔ کتاب میں نمونۂ کلام بھی شامل ہے۔

اس کتاب کی نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسے مصنف نے اپنے قلم سے لکھ کر چھپوایا ہے۔ شکستہ خط ہونے کے باوجود خواندگی میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اس سے مصنف کا چاہے جو بھی مقصد ہو ان کی یہ ادا دل لبھاگئی۔ یہ ایک عقیدت مند کا نذرانہ ہے لیکن کوائف واحوال میں جوش عقیدت میں مبالغہ اور حاشیہ آرائی سے کام نہیں لیا گیا۔

## محمد عزیز مرزا، شخصیت، حیات اور کارنامے : مرزا اکبر علی بیگ :

## حیدر آباد دکن : ۱۹۸۷ء

محمد عزیز مرزا ایک ادیب، قوم کے بہی خواہ، ریاست حیدر آباد کے اعلیٰ درجہ کے منتظم اور کئی دیگر حیثیتوں سے ایک ممتاز شخص تھے۔ زمانے کی ستم ظریفی نے ان کی شخصیت اور کارناموں کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ مرزا اکبر علی بیگ نے ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کی خاطر تحقیقی کام سرانجام دیا ہے۔ عزیز مرزا کے عام حالات زندگی ان کے فرزندوں، اہل خانہ، احباب اور دیگر ذرائع سے حاصل کرنے کے علاوہ ریاست حیدر آباد کے دفتری ریکارڈ کی بھی چھان بین ہے اور ان سے متعلق امثلہ کے ضروری کاغذات کی نقلیں بھی شامل کتاب کی ہیں۔ ان کی تحقیق کے ضمن میں اہم کارروائی عزیز مرزا کے ریاست سے اخراج سے متعلق ہے۔ سرکاری دستاویز سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ وہ بعض عناصر کی تیار کی ہوئی سازش کا شکار ہوئے تھے اس باب کی اہمیت ان کی ذات کے حوالہ سے ہی نہیں ہے بلکہ مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالحلیم شرر اور مولوی صفی الدین کے حوالہ سے بھی اہم ہے جن کو انہیں کے ساتھ خارج البلاد کیا گیا تھا۔ ان کے موقف کی بھی وضاحت ہوتی ہے اس سلسلہ میں سازش کے علاوہ ایک



نظم "واکرنامہ" کو بھی وجہ قرار دیا جاتا ہے جس کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ مولانا ظفر علی خان نے لکھی تھی مرزا اکبر علی بیگ نے بھی نظم کو نقل کرتے ہوئے اسے مولانا موصوف سے منسوب کیا ہے حالانکہ مولانا نے زمیندار میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں اس کی تردید کی ہے۔ محقق کا یہ انکشاف بھی اہم ہے کہ نظام کو بعد میں اس سازش کا علم ہوگیا تھا اور ان حضرات کے خلاف ہونے والے اقدام پر انہیں تاسف بھی تھا۔

صاحب سوانح کا شجرہ، ان کے خاندان کے افراد بالخصوص اولاد کا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا ہے اس ضمن میں معلومات افراد خاندان سے ہی حاصل کی گئی ہیں اس لئے ان کے درست ہونے کے بارے میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی، دیگر انکشافات میں یہ بات بھی اہم ہے کہ عزیز مرزا مدرستہ العلوم علی گڑھ کے پہلے بیچ کے طالب علم تھے اور وہاں پہلی ہڑتال کروانے کی بھی ذمہ داری ان ہی پر رہی تھی اور اس حرکت پر انہیں زندگی بھر تاسف رہا۔ کتاب میں وہ خط بھی شامل کیا گیا ہے جو انہوں نے بطور معذرت سرسید احمد خان کو لکھا تھا۔ کتاب کا پہلا حصہ جو "حالات زندگی" کے زیر عنوان ہے تمام تر تحقیق کا نتیجہ ہے۔ دوسرے باب میں شخصیت اور سیرت پر روشنی ڈالی گئی اسی میں ان کا حلیہ بیان ہوا ہے کہ

"وہ قد آور آدمی تھے، پیشانی بلند، مونچھیں داڑھی ملی ہوئیں، داڑھی بھرے ہوئے چہرے پر بہت زیب دیتی تھی، ان کی آنکھیں کسی قدر ابھری ہوئی تھیں، کلائیاں چوڑی اور مضبوط، شخصیت انتہائی پُررعب تھی۔" (۳۱)

لباس کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ

"عموماً" شیروانی اور پتلون حسب رواج پہنا کرتے تھے اس کے ساتھ ٹوپی ضرور سر پر رہتی تھی۔ یہ دفتری لباس تھا دربار جاتے وقت سر پر دستار ہوتی تھی۔" (۳۲)

ان کے اوصاف کو یوں بیان کیا ہے کہ

"بہت ہی زندہ دل تھے۔ زندگی کا نظام الاوقات مقرر تھا وقت کی بڑی پابندی کا کرتے تھے۔ زندگی میں سادگی تھی، مجسم اخلاق تھے، طبیعت میں حلم، سنجیدگی، مروت اور نرمی تھی۔ بچوں کے تو گویا عاشق تھے۔" (۳۳)

ان میں خود احتسابی کا غیر معمولی مادہ تھا غلطی کو فوری اور برملا تسلیم کرلیتے تھے۔ کتاب کے تیسرے باب میں ادبی اور قومی خدمات کا ذکر ہے۔ وہ مسلم لیگ اور انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری رہے۔ انگریزی اور سنسکرت زبانوں پر کامل عبور رکھتے تھے ان کے تراجم میں "وکرم اروسی" کا

ترجمہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ تحقیقی نوعیت کا ہے باقی حصے تبصرے ہیں۔ طرزِ بیان سنجیدہ، سادہ اور باوقار ہے کہیں بھی صاحبِ سوانح کے اوصاف کے بیان میں حدِ اعتدال سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔

**ابوالکلام آزاد : شورش کاشمیری : لاہور : فروری ۱۹۸۸ء**

شورش کاشمیری، مولانا ابوالکلام آزاد کے مداحوں میں تھے۔ اپنی کتاب "ابوالکلام آزاد" کے ذریعہ اسی احترام اور عقیدت کو لفظی پیکر میں ڈھالا ہے اور اپنی تحریر کا تمام تر عجز اور بانکپن بروئے کار لانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مولانا کی اپنی شخصیت ہمہ جہت تھی اور شورش بھی ہمہ صفت موصوف اس لئے انہوں نے اپنے ممدوح کا امیج بنانے کے لئے ایک شاعر، ایک ادیب، ایک نقاد، ایک مؤرخ، ایک مدبر، ایک خطیب اور ایک نیازمند کے نکات نظر کو بیک وقت کام میں لاکر اس تصنیف کو مکمل کیا ہے۔

کتاب میں مولانا کے خاندانی حالات، ان کے بزرگوں کے کوائف، والد، والدہ، بھائی اور بہنوں کے احوال کا جامع جائزہ لیا ہے اور ان امور کے لئے جتنے بھی مستند ماخذ موجود تھے ان سب سے استفادہ کیا۔ مولانا آزاد کا سوانحی خاکہ مرتب کرتے ہوئے ان کے اوصاف پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی ذکاوتِ حس، عقلِ معاش، خودداری اور غیرتمندی، طریقِ گفتگو، معاملات میں راست بازی، انعقادِ مسلک، راست گوئی، نفاست پسندی، سادگی، رحمدلی، عیب بینی اور عیب گوئی سے اجتناب، مدح و قدح سے گریز، مطالعہ کی وسعت، خلوت پسندی، زبردست یادداشت، بذلہ سنجی، مناظرہ سے اجتناب، سفارشوں سے احتراز، پابندیِ اوقات، صبر و تحمل، موسیقی کا شوق، مخالفوں سے سلوک، طبیعت کی ہمہ گیری، حریفوں کی تحسین، غرض کہ کسی پہلو اور جزوی وصف کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے اور موضوع پر اپنی رائے کے استناد کے لئے واقعات بیان کئے ہیں اس بارے میں اتنی دقتِ نظر سے کام لیا ہے کہ مولانا کا کوئی وصف ذاتی ایسا نہیں جس پر انہوں نے توجہ نہ کی ہو۔ مولانا کی ادبی، صحافتی، سیاسی اور مذہبی زندگی کے ہر ہر گوشہ کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ طرزِ تحریر کی بلند آہنگی، جوشِ عقیدت میں زورِ بیان کو نظرانداز کر دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک سوانح و سیرت کا تعلق ہے یہ ایک جامع اور بھرپور کوشش ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد بھی ہے اس میں مولانا کی ذات کے بارے میں ہر نقش کو ابھارا ہے۔ موضوعات اور پہلوؤں کی وسعت کے باوجود کتاب ناگوار طوالت کی شکار نہیں ہوئی ہے۔



**ذوالفقار علی بھٹو، بچپن سے تختۂ دار تک : سلمان تاثیر : لاہور : ۱۹۸۸ء**

پاکستان کے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو سے انتہائی عقیدت مندانہ رشتہ رکھنے والے سلمان تاثیر نے ان کے حالاتِ زندگی پر اس انداز سے اظہارِ خیال کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے سوانح اور شخصیت کے ہر اس پہلو کو اجاگر کیا جائے جن سے ان کے روشن، فعال، با تدبیر اور بیدار مغز ہونے کا ثبوت فراہم ہو سکے اور ہر ایسے امر سے گریز کیا جائے جو متنازع رہا ہو حالانکہ سوانح نگاری کا بنیادی تقاضا یہ تھا کہ ان کی شخصیت پر چھائی ہوئی دھند کو صاف کرنے کی کوشش کی جاتی۔

مصنف اپنی ترقی پسندی اور بائیں بازو کی سیاست کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں چونکہ وہ بھٹو سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کو تمام برائیوں سے بالاتر ثابت کرنا چاہتے ہیں اس لئے ان کے والد سرشاہنواز کی اس سیاست کاری کی حمایت کرتے ہیں جو وڈیرہ ذہنیت کی نمائندہ تھی۔ ترقی پسندیت کا یہ عجب پہلو ہے کہ عوام کش بھی خاص مقاصد کے لئے عوام کے رہبر قرار دے دیئے جاتے ہیں۔ سرشاہنواز کو ان کی سیاسی بصیرت اور اپنے عوام میں مقبولیت کی وجوہات بتاتے ہوئے ان کو انگریزی گورنر سندھ کے مشیر ہونے کا جواز بنایا گیا ہے حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ انگریز حکمرانوں نے قوم کے ہمدردوں کو کبھی منہ نہ لگایا۔ عہدہ اور تقرب سے نوازنے کی وجوہ اور ہی کچھ ہوتے تھے جن سے ساری دنیا واقف ہے اس مقبولیت کے دعوے کے باوجود ان کا الیکشن میں ہار جانا بھی لمحۂ فکریہ ہے۔ ۱۹۴۷ء میں سرشاہنواز جوناگڑھ کے مختارِ کل وزیر تھے۔ اس بات کا ذکر انتہائی سرسری انداز سے ایک جملہ میں کر دیا گیا اور جوناگڑھ کے بھارت سے الحاق کے تاریخی واقعات کو سرے سے نظرانداز کر دیا یہ مصنف کی حقائق سے چشم پوشی کی ایک مثال ہے اسی طرح اعلان تاشقند کے بعد بھٹو نے بار بار کسی اندرونی سازش اور خفیہ معاہدہ کا ذکر اپنی تقریروں میں کیا تھا۔ مصنف نے تاشقند میں ہونے والے مذاکرات کا ہیرو بھٹو کو قرار دیا ہے اور وہ کشمیر کو اعلامیہ میں متنازع مسئلہ قرار دینے کے لئے بضد رہے جسے فریقین نے نہیں مانا۔ اس روداد کو بیان کرنے کے انداز اور لب و لہجہ سے مترشح ہے کہ وہ بھٹو کی برتری اور ایوب خان کی کمتری ثابت کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مضحکہ خیز دعویٰ کیا ہے کہ تاشقند میں بڑے بڑے روسی جنرل ایوب خان کو فیلڈ مارشل ہونے کی وجہ سے جس طرح سلام کرتے تھے اس سے ایوب خان اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے روس کی ہر بات مان لی اس کتاب میں اس یقین دہانی کا کہیں ذکر نہیں جو بھٹو نے ایوب خان کو کروائی تھی کہ کشمیر میں جنگ کے نتیجہ میں بھارت بین الاقوامی

سرحدیں عبور نہیں کرے گا کیونکہ اس سے بھٹو کی بصیرت اور پیش بینی پر حرف آتا تھا دہلی میں مقیم پاکستانی سفیر نے کئی دن قبل اشارہ دے دیا تھا کہ بھارت پاکستان پر حملہ کرنے والا ہے لیکن یہ بات وزارت خارجہ میں دبی رہی جس کے سربراہ بھٹو تھے اور اس کی اطلاع ایوب خان یا افواج پاکستان تک نہیں پہنچ سکی۔ اس سازش سے مصنف نے بھٹو کو برأت ولانے' اصل سازش کو بے نقاب کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ایسے متعدد پہلو ہیں جن سے عام آدمی واقف ہونا چاہتا ہے۔ مصنف کو ان کی جانب توجہ دینی اور تاریخ کے ریکارڈ کو درست کرنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔

کتاب میں متعدد باتیں بغیر کسی حوالے کے درج کی گئی ہیں انہیں صرف اس لئے قبول کر لیا جانا ممکن نہیں کہ سلمان تاثیر نے لکھا ہے مثلاً "صفحہ ۷ا پر لکھا ہے کہ

"میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے جناب بھٹو نے کہا تھا "میں نے قائد اعظم کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہمیں ہندوؤں کے تعلیمی اداروں کے اندر تک گھس جانا چاہئے جن میں سے ایک ادارہ الفنسٹن کالج بھی تھا۔ میں نے کہا ہم مسلمان لڑکیوں کو پلے کارڈ دے کر ان تعلیمی اداروں کے دروازے پر کھڑا کر سکتے ہیں تاکہ وہ طلبہ کو اندر جانے سے روک دیں۔ مسٹر جناح نے مجھے کہا کہ میں پروگرام کا انتظام سنبھالوں میں چونکہ الفنسٹن کالج کے بعض طلبہ کو جانتا تھا اس لئے ہم اس ایجی ٹیشن کو منظم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ کارروائی اپنا کام کر گئی کیونکہ اس سے دوسرے کالجوں کے طلبہ پر بھی اثر پڑا اور اخبارات نے بھی اس کی پوری طرح رپورٹنگ کی۔" (۳۴)

یہ واقعہ ۱۹۴۶ء کا بتایا جاتا ہے مقام حیرت ہے کہ قائد کے بارے میں لکھی ہوئی درجنوں کتابوں' تحریک پاکستان اور اس کے خلاف لکھی گئی درجنوں کتابوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ناواقفوں کے لئے مصنف نے کسی ایک اخبار کی رپورٹنگ درج کر دی ہوتی۔

اگر واقعات کا تانا بانا اس طرح جوڑا جائے کہ

"جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ایک مقامی اخبار میں لکھا تھا... (۳۵)

"انہوں نے بڑے مترنم انداز میں کہا تھا کہ... (۳۶)

"ایک خاندانی دوست کا کہنا ہے کہ... (۳۷)

"جناب بھٹو نے دسمبر ۱۹۵۶ء میں اس صورتحال پر ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "اے ڈویلپمنٹ فار ڈیموکریسی" (۳۸) (مضمون کہاں چھپا یا پڑھا گیا؟)



"انہوں نے اس موضوع پر لکھا تھا (۳۹) (کہاں اور کب چھپا؟)

غرض ایسے بیسیوں مقامات ہیں جہاں وقائع نگاری کے بنیادی لازمی اصولوں کا خیال نہیں رکھا گیا۔ مصنف کو غالباً" معلوم ہی نہیں کہ بغیر مستند شہادت اور مکمل حوالے کے صداقتیں اعتبار سے ساقط ہی ہوتی ہیں۔

بلاشبہ بھٹو اپنے دور کے اولوالعزم' صاحب بصیرت' زیرک سیاستدان اور تیز حرکت کرنے والے غیر معمولی شخصیت تھے۔ وہ نابغۂ روزگار تھے۔ ان کی عظمت کے کسی پہلو سے انکار نہیں کیا جا سکتا وہ انسان تھے اور کوئی انسان ایسا نہیں جو خامیوں اور کمزوریوں کا حامل نہ ہو۔ خیر و شر کے متوازن اجتماع سے متوازن شخصیت بنتی ہے۔ بھٹو میں خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی تھیں اس کا ادراک دوسروں کے علاوہ خود ان کو بھی تھا لیکن مصنف نے "مدلل مدح خوانی" کے زعم میں وہ توازن برقرار نہیں رکھا جو بھٹو جیسی شخصیت کے لئے ضروری تھا۔ توصیف کے امکانات پیدا کرنے کی جہاں کوشش کی ہے اسلوب پر تصنع غالب ہے اور محض لفاظی ہی لفاظی ہے۔ ہیرو پرستی کے نقطۂ نظر سے جو بھی لکھا جائے گا اس کی نوعیت اسی کتاب جیسی ہوگی۔

**پیکر حرمت (پیر صاحب پگارو) : خان خداداد خان برکی : لاہور : ۱۹۸۸ء**

مردان شاہ چہارم جو حرف عام میں پیر صاحب پگارو (ہفتم) کہلاتے ہیں جو پاکستان کی جانی پہچانی شخصیت ہیں ان کے اجداد مذہبی پیشوا ہونے کے ساتھ حریت پسند بھی تھے جو ملک کی آزادی کے لئے پیش پیش رہے۔ پیر صبغت اللہ' پیر پگارو اول سے اس خاندان کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ انہوں نے اپنے مریدوں کی ایسی سرفروش اور جانباز مجاہد فورس قائم کی تھی جو "حر" کہلاتے تھے۔ وہ سید احمد شہید کی تحریک کے حامی تھے اور جب انہوں نے عزم جہاد کیا تو حروں کی ایک بڑی جمعیت ان کے ساتھ کر دی گئی تھی۔ موجودہ پیر پگارو کے والد کو بھی بغاوت کے مقدمہ میں ملوث کیا گیا تھا اور سزائے موت دی گئی پیر مردان شاہ کم سن تھے انہیں اور ان کے بھائی کو سر ضیاء الدین احمد کی سرپرستی میں علی گڑھ میں رکھا گیا اور پھر تعلیم کے بہانے لندن بھیج دیا گیا جہاں وہ آزادی کے بعد تک رہے۔ شہید ملت نے انہیں واپس لانے کا انتظام کیا ان کی گدی بحال ہوئی اور حر ایک بار پھر منظم ہوئے۔ اگرچہ تقسیم ملک کے بعد وہ بھی تقسیم ہو گئے اور ایک بڑی تعداد بھارت میں ہے وہ بھی انہی کو مرشد مانتی ہے۔

مصنف نے تمام حالات تاریخ کی مستند کتابوں سے حاصل کئے ہیں اور ان کا حوالہ بھی دیا ہے جہاں تک پیر مردان شاہ کا تعلق ہے ان کی تفصیلات یا تو خود ان سے حاصل کی ہیں یا ان کی

دیکھی ہوئی ہیں۔

مردان شاہ پیر پگارو کے بارے میں مصنف نے تاریخی واقعات سے بیان کیا ہے کہ ان کی وطن دوستی ہر شک و شبہ سے بالا تر رہی ہے۔ ان کا سیاست میں عمل دخل رہا۔ وہ روز اول سے مسلم لیگ سے وابستہ رہے اس دوران بہت سے نشیب و فراز آئے زمانہ کبھی گرم رہا کبھی سرمُو ان کے پائے استقلال میں فرق نہ آیا۔ مصنف نے ان کے سیاسی کارناموں کو تفصیل سے مرحلہ وار پیش کیا اور بتایا ہے جبکہ خرید و فروخت کا بازار گرم تھا وہ بکے نہیں ان تفصیلات کے ساتھ مصنف نے ان کی سیرت اور کردار کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ مبالغہ سے خالی اور حقائق پر مبنی ہے۔ انہیں پیر صاحب کا مزاج شناس اور رمز شناس کہا جاتا ہے ایک عرصہ سے پیر صاحب کے سیاسی بیانات پر ابہام اور رمز کے پردے ہوتے ہیں ان کے قریبی حلقے ہی اس کے معنی و مطلب سے آگاہی رکھتے اور دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ مزاح' چٹکلوں اور اشاروں سے کام لینا پیر صاحب کا روز مرّہ کا معمول ہے انہیں اکبر الہ آبادی کا نثری سیاسی ایڈیشن کہا جاسکتا ہے ان کا تعلق سرزمین سندھ سے ہے جہاں علیحدگی پسند تحریکیں اٹھتی رہیں مصنف نے ثابت کیا ہے کہ ان کے مقابلہ میں بھی پیر صاحب اور ان کے حر سنگ راہ بنے رہے۔ یہی پاکستان کے لئے ان کی زبردست خدمت ہے۔ بھارتی حملوں کے وقت ان کے حر ہی فوج کے دوش بدوش معرکہ آراء رہے۔ پیر صاحب کے دیگر کارناموں کے حوالے سے مصنف نے بتایا ہے کہ ممتاز بھٹو کی چیف منسٹری کے زمانہ میں لسانی فسادات کی جو آگ دانستہ طور پر بھڑکائی گئی تھی اسے انہوں نے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ غیر سندھیوں کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کیا۔ آمریت کے بدترین ادوار میں جبکہ بڑے بڑے سیاسی رہنما یا تو اس کے زیر عاطفت تھے یا منقار زیر پر انہوں نے قومی' جمہوری اور اسلامی سیاست کے پرچم بلند رکھے UDF اور PNA میں قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ قوم جب بھی یاسیت اور قنوطیت کی شکار ہوتی ہے' ان کے بیانات کی پھلجھڑیاں اس کی شگفتگی کے باعث ہوتے ہیں۔ حیات' کردار اور کارناموں کو تصدیق اور توثیق کے ساتھ پیش کرتے ہوئے مصنف نے بیان میں توازن سے کام لیا ہے اور حسن عقیدت کو غالب نہیں آنے دیا۔ ان کی سیاسی زندگی کے ساتھ ساتھ دیگر مشاغل کو بھی کھل کر بیان کیا ہے۔ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روایتی انداز کے پیر نہیں بلکہ روشن خیال اور بالغ نظر انسان بھی ہیں جن کی زندگی متنوع مشاغل میں گھری ہوئی ہے۔



## حالات قائداعظم : خالد اختر افغانی : لاہور : ۱۹۸۸ء

قائداعظم محمد علی جناح کے حالات زندگی کے حوالے سے اس کتاب کو مکمل سوانح عمری قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ قائد کی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز سے ہٹ کر باقی حالات و کوائف کو قطعی طور پر نظرانداز کردیا گیا ہے۔ یہ برصغیر کی سیاسی تاریخ کا وہ حصہ ہے جس میں قائد نے فعال کردار ادا کیا یا قائد کے الفاظ کے حوالے سے اس سیاسی تاریخ کا احوال ہے جو انہوں نے بنائی ہے۔

خالد اختر افغانی ایک زمانہ میں خاکسار تحریک کے اصولوں اور علامہ مشرقی کی ساحرانہ تحریروں اور تقریروں کی وجہ سے اس تحریک کا ایک حصہ بنے رہے تھے۔

"اپنے باریک بین مطالعہ کے بعد اس حسن صباحی تحریک سے علیحدہ ہوگئے۔" (۴۰)

ایک عام قاری کی نسبت وہ صاحب نظر جو خود کسی تحریک کا حصہ ہو غیر جانبدارانہ مطالعہ مشاہدہ اور تجزیئے سے نظریات' خیالات اور شخصیات کا بہتر طور پر محاسبہ کرسکتا ہے چنانچہ ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ نہ صرف خاکسار تحریک سے وابستہ حضرات نے بلکہ دیگر سیاسی تنظیموں یہاں تک کہ انڈین نیشنل کانگریس سے تعلق رکھنے والوں نے علیحدگی اختیار کرکے قائد کے جھنڈے تلے امان حاصل کی تھی۔ حصول آزادی کا وہ اعلیٰ مقصد جو روز اول سے انہوں نے متعین کیا تھا مسلم لیگ کے لائحہ عمل کے ذریعہ حاصل کرنے کو ترجیح دی۔ ان حضرات میں اندھی تقلید اور بے جا شخصیت پرستی کا شائبہ بھی نہیں تھا اس لئے حالات و واقعات کی پیشکش اور ان کے تجزیئے میں ان کے نکات نظر زیادہ صائب اور قابل قبول بن گئے ہیں۔ اسی نوعیت کی یہ تصنیف ہے۔ اس میں سیاسی واقعات ہی بیان نہیں کئے گئے بلکہ ان کا غیر جانبدارانہ تجزیہ بھی کمال خوبی سے کیا گیا ہے اور کہیں بھی حسن عقیدت یا بے جا طرفداری کا شائبہ بھی آنے نہ دیا۔

قائد کے ابتدائی زندگی کے حالات مختصراً" بیان کرنے کے بعد مصنف نے کتاب کو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۸ء کی تاریخ کے لئے وقف کردیا ہے۔ قائد کے سیاسی سفر کی روداد' برصغیر کے سیاسی عمل کے علاوہ ان کے عزم و استقلال کا آئینہ ہے۔ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ ان کا ارادہ ناقابل شکست تھا۔ وہ جھوٹے وعدوں کے بل بوتے اور جذباتی نعروں کے بغیر مسلمانان برصغیر کی آنکھوں کا تارہ اس لئے بنے تھے کہ ان کا کردار بے داغ تھا' ہر طمع سے بالا تر تھا۔ انہوں نے تاریخ کا

مطالعہ بھی کیا تھا اور ہندو ذہنیت اور اس کی سیاست کا قریب سے مطالعہ بھی کیا تھا۔ اس لئے وہ جس نتیجہ پر پہنچے وہ حقیقت پر مبنی تھا اور حالات کے جبر کا انجام تھا۔ وہ ایک بیرسٹر تھے انہوں نے کوچہ و بازار کی سیاست گردی کو شعار بنانے کے بجائے قانونی طرز جنگ کو اختیار کیا۔ مصنف نے قائد کے سیاسی کردار (۱۹۳۶ء-۱۹۴۸ء) کو اجاگر کرنے کے لئے ہر ممکن تفصیل سے کام لیا ہے۔ انہوں نے کانگریسی زعماء ارباب اقتدار سے ہونے والی تمام مراسلت' قائد کے اخباری بیانات' اخبارات میں قائد کے بارے میں شائع ہونے والے مخالفانہ و موافقانہ مضامین کو اس طرح یکجا کردیا ہے کہ ہر واقعہ کی تمام جزئیات سامنے آجاتی ہیں ان کی روشنی میں قائد کا کردار اور نقطہ نظر واضح ہو جاتا ہے اور کوئی گوشہ تاریکی میں نہیں رہتا جس قدر ماخذات سے حوالوں کے ساتھ استفادہ کیا گیا ہے شاید ہی کسی کتاب میں مل سکے۔ ساتھ ہی بعض روایات کی تردید کرکے ان داغوں کو مٹانے کی کوشش کی گئی ہے جو دانستہ طور پر قائد کے دامن پر لگائے گئے تھے۔ مثلاً "عام طور پر یہ بیان قائد اعظم سے منسوب کیا جاتا ہے کہ "پاکستان' میں نے' میرے ٹائپ رائٹر اور میرے پرائیوٹ سیکریٹری نے بنایا ہے" بعض لوگ اسے یوں بھی بیان کرتے ہیں کہ "مسلم لیگ کیا ہے؟ میں' میرا ٹائپ رائٹر اور میرا پرائیوٹ سیکریٹری" اس کی تردید میں مصنف نے قائد کا اصلی بیان شامل کتاب کیا ہے کہ

"میری ذاتی قیام گاہ کو قابل رشک سمجھنے والے بتائیں کہ میرے پاس عملہ اور فوج اور اسلحہ کہاں ہے؟ میرا اسلحہ صرف ایک اٹیچی کیس' ایک ٹائپ رائٹر اور ایک پرسنل اسسٹنٹ ہے۔ ہاں میں ہار ماننے کا عادی نہیں۔" (۴۱)

"حالات قائد اعظم" میں جو واقعات اور بیانات شامل ہیں وہ قاری کو اس نتیجہ پر پہنچانے میں مددگار ہوتے ہیں کہ قائد اعظم بہت بڑے معاملہ فہم' سچے مسلمان' بڑے حریت پسند اور باکردار مسلمان تھے۔ جس نقطہ نظر اور مقصد سے کتاب لکھی گئی ہے اس سے انصاف کیا گیا اور مصنف اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

**جنرل اختر عبدالرحمٰن (شہید جہاد افغانستان) : عرفان صدیقی : ۱۹۸۹ء**

دنیا کے نقشے پر موجود ایک چھوٹے سے ملک پاکستان کی چھوٹی سی فوج کا بڑا سپہ سالار جس نے ایک دنیا کو حیرت میں ڈال دیا جنرل اختر عبدالرحمٰن تھے۔ بڑے بڑے ملکوں کی عظیم افواج کے سپہ سالار تاریخ میں وہ مقام حاصل نہ کرسکے جو انہوں نے اپنی عسکری سوجھ بوجھ' منصوبہ بندی اور جنگی کارناموں سے ایک سپر پاور کو ایسی شکست فاش دے کر حاصل کیا کہ جس کا منطقی نتیجہ اس



سپر پاور کی شکست و ریخت کی صورت میں سامنے آیا۔

مصنف نے سرزمین پاکستان کے اس عظیم فرزند کے حالات زندگی تحقیق سے مرتب کئے ہیں لیکن انکساری کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ

"یہ مختصر سی کتاب جنرل کے بے مثال کارناموں کی تفصیلات سے انصاف نہیں کرتی اس سے ان کی شخصیت کا خاکہ ضرور سامنے آتا ہے۔ ایک ایسے پاکستانی جنرل کی تصویر کسی نہ کسی حد تک بہرحال ابھرتی ہے جسے اپنے موقف کی صداقت پر یقین ہو اور جو اسلام پر غیر متزلزل ایمان رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شخصی زندگی کے بہت سے پہلو بھی سامنے آتے ہیں اور پہلی بار ان کی مکمل داستان حیات بھی مرتب ہوگئی ہے۔ جنرل اختر عبدالرحمٰن کی قد آور شخصیت کے حوالے سے یہ کتاب محض ابتدائی درجہ کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ اس پر زیادہ مکمل اور جامع کتاب کی گنجائش بہرحال باقی ہے۔" (۴۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ عظیم انسانوں کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا ایک ہی وقت میں احاطہ کرنا آسان نہیں لیکن یہ امر باعث اطمینان ہے کہ اہل قلم قوم کے سپوتوں کے کارناموں کو زندہ رکھنے کا شعور رکھتے ہیں اور خود پرستی کے اس دور میں بھی ہیرو پرستی سے منہ نہیں موڑا ہے ایسی ہی جائز اور حقیقت پسندانہ ہیرو پرستی کا نتیجہ یہ تصنیف ہے۔

مصنف نے صاحب سوانح کے خاندانی پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ

"وہ باپ کی طرف سے ایشیا کے نامور ترین فاتح امیر تیمور کی پانچویں پشت اور مادری نسبت سے چنگیز خان کی چودھویں پشت سے تھے۔ اس کی رگوں میں دو عظیم المرتب فاتحین کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس میں منگولوں کی سنگ دلی بھی تھی اور ترکوں کی جرأت و استقامت بھی' ان موروثی صفات کے علاوہ وہ اہل فارس کی شائستگی اور متانت کا نمونہ بھی تھا۔" (۴۳)

ان کے اسلاف میں ایک سپاہی پیشہ بزرگ جن کے نام کی تحقیق مصنف نہیں کرسکے ظہیر الدین بابر بانئ سلطنت مغلیہ کے لشکر میں شامل تھے۔ انہوں نے پانی پت کے میدان میں اپنے جنگجویانہ مہارت کے ثبوت پیش کئے تھے اور مغلوں کی حکومت کے قیام کے بعد ان کے خاندان نے اس سرزمین کو وطن بنالیا تھا۔ انہیں کی اولاد میں بعد شاہجہاں عادل خان گزرے ہیں جنہیں شجاعت اور بہادری کے بے مثل کارنامے انجام دینے پر ضلع جالندھر کی تحصیل اجنالہ میں جستروال کی وسیع جاگیر بطور انعام دی گئی تھی۔ صاحب جاگیر ہونے کے بعد بھی خاندان میں پیش آباء کی حرمت کا احساس تابندہ رہا اور صاحب سوانح تک کی نسل تک عادل خان کے بعد

سلطان خان ان کے بعد الست خان ان کے بعد عزیز خان اور ان کے بعد بدرالدین خان نے اس طرز کی زندگی گزاری کہ ان کی تلواریں زینت طاق نسیاں نہیں ہوئیں بدرالدین خان نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا تھا۔ ان کے بیٹے بلند خان کو تاریخ نے قوت آزمائی کا موقع نہیں دیا یہی صورت حال ان کے صاحبزادے ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے ساتھ رہی۔ ان دو پشتوں کے کارناموں کا قرض ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے فرزند اختر عبدالرحمٰن نے ادا کر دیا جو ۱۱ جون ۱۹۲۴ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔

ماہرین نفسیات شخصیت سازی میں خاندان اور ماحول کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور توارث کو ثانوی حیثیت' صاحب سوانح کے بزرگوں کے حالات گواہی دیتے ہیں کہ جو افتاد ان کی تھی دو پشتوں میں موقع فراہم نہ ہونے کی صورت میں دبی رہی اور تیسری پشت میں ظاہر ہوئی تو پوری آب و تاب سے۔ اس بات کی طرف مصنف نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ڈاکٹر عبدالرحمٰن علامہ مشرقی کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ شاید اس دوستی کے پس منظر میں بھی وہ سپاہیانہ فطرت کارفرما ہو جو ڈاکٹر صاحب کو ورثے میں ملی تھی۔" (۴۴)

مصنف نے سوانحی حالات تاریخ وار بیان کئے ہیں ان کا مقصد چاہے کچھ بھی ہو اختر عبدالرحمٰن کی زندگی ایک داستان نہیں معلوم ہوتی بلکہ سبق آموز واقعات کا مجموعہ دکھائی دیتی ہے مصنف جب یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ اس صدی کے سب سے بڑے جرنل کی تعلیم کی ابتدا جستروال کے اس پرائمری اسکول میں ہوئی جہاں فرنیچر کے بجائے بوریاں بچھتی تھیں تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عظیم مائیں اپنے یتیم بچے کی شخصیت سازی میں وہ کردار ادا کر سکتی ہیں جو کسی ادارے کے بس کی بات نہیں۔

"جستروال اور اجنالہ میں تعلیم پا کر جب وہ امرتسر کے ایم اے او کالج میں داخل ہوئے تو ان کی رگوں میں موجود ان کے بزرگوں کا خون رنگ لانے لگا۔ کالج کے زمانہ میں اختر نے ریسلنگ کی طرف توجہ دی شاید سپہ گری کے فن کا خاندانی اثر تھا کہ اختر نے جسمانی چستی اور توانائی کو ہمیشہ زبردست اہمیت دی۔ وہ کالج کے زمانہ میں "پہلوان" کے نام سے مشہور تھے اس کے علاوہ سائیکلنگ اور باکسنگ بھی ان کے پسندیدہ کھیل تھے۔ انہیں اپنے زمانہ طالب علمی میں ریسلنگ' باکسنگ اور سائیکلنگ میں پنجاب یونیورسٹی کی نمائندگی کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ (۴۵)

اس سوانح عمری میں خاندانی اوصاف اور روایات کے حوالے سے جو باتیں بیان کی گئی ہیں



ان میں یہ بھی شامل ہے کہ صاحب سوانح نے تکمیل تعلیم کے بعد پولیس کی نوکری اختیار کر لی تھی اور ڈی ایس پی جیسے بلند عہدہ پر ابتدا ہی میں مامور ہو گئے تھے۔ اس موقع پر ان کی بہن خاندانی روایت کی امین بن کر ناگپور سے جستروال آئیں اور بھائی کو یہ ملازمت ترک کر دینے کا مشورہ دیا جسے انہوں نے فوری طور پر قبول کیا اور مستعفی ہو گئے۔ چند دنوں بعد وہ فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ تھے۔ انہوں نے بھارت سے لٹے ہوئے مسلمانوں کے قافلوں کو بحفاظت لانے کا فرض خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ صاحب سوانح کے فوجی کارنامے خصوصیت سے اس سوانح عمری کا حصہ ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں پانڈو ایکشن کے ہیرو تھے۔ ۱۹۵۶ء کی جنگ میں برکی کے محاذ پر اگلے مورچوں پر ڈٹے رہے اور لاہور جیم خانہ میں داد عیش دینے کے ہوائی قلعہ بنانے والوں کے ہوش اڑا دیئے۔ ۱۹۷۱ء میں حسینی والا سیکٹر میں دشمن کو ۹ گھنٹوں کے اندر اندر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور آخری معرکہ آرائی سوویت روس کے ساتھ افغانستان میں کی۔ یہ فوجی زندگی کے انمٹ نقوش ہیں لیکن ان کے ساتھ سیاست دانوں کی بوالعجبیاں بھی ہیں جو زیر بحث آئی ہیں۔

مصنف نے خلوص لگاؤ اور محنت سے تفصیلات جمع کی ہیں۔ ان میں ایک خامی یہ نظر آتی ہے کہ جن اہم سنین اور تواریخ کا حوالہ دینا ضروری تھا ان کی تحقیق کی طرف توجہ نہیں دی ہے۔ مصنف کا طرز تحریر شگفتہ اور جاندار ہے کہیں کہیں لگاؤ نے واضح ہیرو پرستی اور ستائش کا رنگ اختیار کر لیا ہے جو ناگواری کی حدوں کو نہیں چھوتا۔

یہ فن کے لحاظ سے بھی کامیاب سوانح ہے اس کے ترتیب و تدوین فن کے قدیم اندازہی میں ہے۔ مصنف کا رویّہ صرف حالات زندگی بیان کرنا نہیں ہے بلکہ واقعات سے ایسے نکتے بھی نکالے ہیں جو سبق آموز ہیں اس اعتبار سے یہ ایک حقیقت پسندانہ تصنیف ہی نہیں بلکہ مقصدی تصنیف بھی ہے۔

صاحب سوانح کی پُراسرار ہوائی حادثہ میں شہادت پر کتاب کا خاتمہ ہوتا ہے جو پڑھنے والوں کے ذہن میں کئی سوالات پیدا کرتا ہے۔

جیسی پُرکشش اور حوصلہ دینے والی یہ تصنیف ہے اسے پڑھ کر خواہش ہوتی ہے کہ ۱۹۴۸ء' ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے شہیدوں اور غازیوں کی سوانح عمریاں بھی قومی بصیرت کی خاطر اس طرح لکھی جائیں بالخصوص جنرل ضیاء الحق اور ان تمام ساتھیوں کو موضوع بنایا جائے جنھوں نے زندگی میں یا بعد از مرگ شجاعت کے تمغے حاصل کئے۔ ان کی کہانیوں کے محفوظ کرنے کا یہی

موزوں وقت ہے۔

## تلاش آزاد : عبدالقوی دسنوی : دہلی : ۱۹۹۰ء

عبدالقوی دسنوی کی تالیف "تلاش آزاد" ۹ مختصر ابواب پر مشتمل ہے جس میں تحقیق کے اعتبار سے کوئی نئی بات سامنے آئی ہے اور نہ بیان کے لحاظ سے کوئی ایسی خصوصیت ہے جو قاری کو متوجہ کر سکے۔ دراصل مولانا آزاد کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئیں اور ان کی اپنی جو تحریریں موجود تھیں انہیں موضوعات اور عنوانات کے تحت مرتب کر دیا گیا ہے جہاں مؤلف نے خود خیال آرائی کی ہے وہاں وہ واقعہ کی صحت سے گریز کر گئے ہیں۔ پہلے باب میں مولانا کے حالات زندگی اختصار سے بیان کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"۵ جنوری ۱۹۰۲ء کو مولانا آزاد کی پہلی کتاب اعلان الحق شائع ہوئی جسے انہوں نے والد مولانا خیر الدین کی حمایت میں اور بعض علماء کی رد میں تحریر کی تھی۔ اس سے پہلے مولانا آزاد کے مضامین احسن الاخبار' مخزن' تحفہ احمدیہ' الہنیح وغیرہ میں شائع ہو چکے تھے۔" (۴۶)

مؤلف نے ۵ جنوری ۱۹۰۲ء سے قبل مخزن میں مولانا کے مضامین کی اشاعت کی نوید دی ہے جبکہ مخزن اس سے چند ماہ بعد شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ صفحہ ۱۷ پر اطلاع دی گئی ہے کہ جنگ عظیم اول کے دوران الہلال روزانہ ضمیمہ کی صورت میں شائع ہونا شروع ہوا' لیکن الہلال کی مکمل جلدوں کی جو عکسی اشاعت ہوئی ہے ان میں نہ تو ضمیمے شامل ہیں اور نہ ناشرین نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے دوسرا باب مولانا کی ۱۹۱۸ء تک کی صحافتی سرگرمیوں سے متعلق ہے معلومات کے فقدان کی وجہ سے اس میں تشنگی کا احساس باقی ہے دراصل اس دور کی صحافت کے حوالے سے سوائے لسان الصدق کے کسی گلدستے یا اخبار کے بارے میں صحیح علم کسی کو نہیں ہے اس لئے اسے موضوع بنانا محض الفاظ سے کھیلنا ہے البتہ اس زمانہ میں جو مضامین رسائل میں شائع ہوئے ان کی مختصر فہرست ضرور مرتب کر دی ہے۔ یہ بیان صحافت کے بجائے "مضمون نگاری" یا "انشاء پردازی" کے ضمن میں ہونا چاہئے تھا۔ تیسرا باب "نوعمر صحافی ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی" کے زیر عنوان ہے جس میں ماہنامہ لسان الصدق کی اشاعتوں کا حال اور اس پر ہونے والے تبصروں کو جگہ دی گئی ہے۔ لسان الصدق کے تمام شمارے دوبارہ مرتب ہو کر کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس لئے یہ مضمون اسی کے تعارف کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اگلا باب ہفتہ وار "پیغام" کلکتہ کے بارے میں ہے جس کے مالک اور مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ مولانا آزاد کی سرپرستی اس اخبار کو حاصل تھی اور ان کے مضامین بھی شائع ہوتے



تھے چونکہ پیغام کے تمام شمارے کتابی صورت میں پاکستان اور پٹنہ سے شائع ہو چکے ہیں اس لئے اس کی اہمیت بھی تعارفی مضمون سے زیادہ نہیں ہے مؤلف نے بجائے مضامین پر تبصرہ کرنے کے صرف فہرست مضامین درج کرنے پر اکتفا کیا ہے ایک باب میں مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی سفر' پہلی گرفتاری تک کا حال بیان ہوا ہے اس کے لئے لسان الصدق اور الہلال میں شائع شدہ تحریروں سے استفادہ کیا گیا ہے اس دور میں مولانا مسلم قومیت کے حامی تھے اور کانگریس سے بیزار تھے۔ مؤلف نے مولانا کی مسلم لیگ میں شمولیت اور لیگ کے جلسوں میں فعال کردار کو نظر انداز کر کے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ "مولانا آزاد نظر بندی" کے زیر عنوان مکاتیب ابوالکلام غبار خاطر' تذکرہ' قول فیصل کے بیانات کو یکجا کر دیا گیا ہے "مولانا آزاد پہلی بار قید فرنگ میں" کے زیر عنوان ہفت وار پیغام کے ۱۱ حوالوں اور قول فیصل کے ۲۳ حوالوں کے ساتھ ۱۷ صفحات کا مضمون بھی شامل ہے۔ دو چار جملوں کے بعد اقتباس درج کرنا اور ان کے سارے بیان کو آگے بڑھانا دراصل "شوق مضمون نویسی" پورا کرنا ہے۔ ایک باب مولانا کی شاعری سے بھی متعلق ہے جس میں ان کی شاعرانہ خصوصیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ ان ہی باتوں کا اعادہ کیا ہے جو مولانا نے تحریروں میں بیان کی تھیں یا مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے "آزاد کی کہانی" میں درج کی ہے۔ آخری باب بیگم آزاد یعنی زلیخا بیگم کے سرسری تعارف سے متعلق ہے مولانا آزاد پر شائع ہونے والی کتابوں میں اسے کوئی اہم مقام نہیں دیا جا سکتا۔

## کلیم طور سیاست : ولی مظہر : ملتان : ۱۹۹۰ء

قائداعظم کی سیاسی زندگی اور ان کے تاریخی کارناموں کے احوال پر مشتمل اس کتاب میں ان کی نجی زندگی' ابتدائی حالات اور خاندان کے کوائف کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس کا آغاز ۱۹۰۳ء سے ہوتا ہے جبکہ قائد بیرسٹرین کر بمبئی آگئے اور سیاست میں ان کا عمل دخل شروع ہوا۔ تقریباً چار سو صفحات میں ان کی سیاسی زندگی کا مکمل خاکہ پیش کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ ساری معلومات مختلف ذرائع اور ماخذات سے حاصل کی گئی ہیں لیکن تصنیف و تالیف کے بنیادی اصول کے مطابق کہیں بھی حوالوں سے کام نہیں لیا جس کی بناء پر اس ضخیم کاوش کو استناد کا جو درجہ حاصل ہونا چاہئے تھا حاصل نہ ہو سکا۔ بعض امور میں غیر معمولی جزئیات کے اظہار سے کام لیا گیا ہے مثلاً ۱۹۴۶ء کے تاریخ ساز انتخابات کا پورا ریکارڈ یکجا کر دیا ہے۔ علامہ اقبال اور قائد اعظم کی پوری خط و کتابت شامل کر کے ان کے درمیان ذہنی ہم آہنگی ثابت کی ہے۔ ۱۹۴۰ء کا قائد کا تاریخی خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس لاہور بھی شامل ہے۔ قائد کی سیاسی سوانح

کی حد تک یہ ایک مکمل و جامع تالیف ہے ضروری حوالوں سے اس کی اہمیت اور وقعت میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا۔

سوانح سے قطع نظر تحریک آزادی کے ضمن میں بہت سا تاریخی مواد تصاویر اور عکس کی صورت میں شامل ہے جو نہایت اہم حصہ ہے مثلاً قائد کا نکاح نامہ' روزنامہ پیسہ اخبار کی خبر کہ "ایک پارسی بیرونٹ کی لڑکی کا قبول اسلام" مولانا اشرف علی تھانوی کا خط' قائداعظم کا مسلم لیگ میں شمولیت کا فارم' انقلاب' ٹریبون' قائداعظم کے بے شمار خطوط' مسلم لیگ کے شائع کردہ پمفلٹ اور پوسٹر' ان سب کے عکس شامل کتاب ہیں۔ اس طرح کا بہت سا کارآمد مواد کسی اور کتاب میں یکجا نہیں ملے گا۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس کی جو اہمیت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آخری حصے میں تقریباً دو سو صفحات میں قائد کے ہم عصر مشاہیر کے خیالات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سے بیشتر انگریزی سے ترجمہ ہیں۔ ان کی روشنی میں قائد کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

**شہید ملت : ولی مظہر : ملتان : ۱۹۹۰ء**

ولی مظہر بہت پرانے مسلم لیگی ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ سیاست میں حصہ لینے لگے تھے اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر بھی رہے۔ ان کی مسلم لیگ اور تحریک پاکستان سے وابستگی اور جدوجہد کے اعتراف کے طور پر ۱۹۹۰ء میں حکومت پاکستان نے انھیں گولڈ میڈل سے نوازا۔ "شہید ملت" ان کی ایسی تالیف ہے جس میں نوابزادہ لیاقت علی خان کی سوانح عمری کے علاوہ ان کے کارناموں اور شخصیت سے متعلق جس قدر مواد فراہم ہو سکا شامل کر لیا گیا ہے۔ اسے جامع اور مکمل سوانح عمری کے زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوانح نگاری کی کاوش کے بجائے صرف معلومات کو یکجا کرنے کے مقصد سے کتاب مرتب کی گئی ہے۔ اس میں یوسف ہارون کی انگریزی تحریر کے علاوہ بے شمار ملکی اور غیر ملکی اخبارات کے اقتباس بھی شامل کر دیے ہیں۔ لیاقت علی خان کی شہادت اور اس کے بعد واقعات خود بیان کرنے کے بجائے "بے تیغ سپاہی" کے ۵۰ سے زائد صفحات نقل کر دیے ہیں شہید ملت کی سوانح عمری مرتب کرنے کے لئے بہترین مصدقہ خام مواد اس کتاب میں موجود ہے۔

**محمد بن ابی بکر : مرزا محمد عالم لکھنوی : لاہور : (سن ندارد) آزادی کے بعد**

محمد بن ابی بکر اصحاب امیر المومنین حضرت علیؓ میں ایک نمایاں شخصیت تھے۔ خلافت اول وثانی کا زمانہ صاحب سوانح کی کم عمری کا تھا۔ ان کی تاریخ پیدائش کی مصنف سے تحقیق نہ ہو



سکی۔ البتہ یہ صراحت کی ہے کہ ان کا نام ام المومنین حضرت عائشہؓ نے رکھا تھا۔ ان کے والد عبداللہ بن عثمان معروف بہ ابوبکر بن قحافہ بن عامر بن کعب بن سعد بن تیم بن عامر بن کعب بن لوی تمیمی تھے اور والدہ جناب اسماء بنت عمیس تھیں۔ مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ ان کے ابتدائی حالات زندگی تحریر میں نہیں ملتے صرف خلافت ثالث کے آخری دنوں سے لے کر خلافت چہارم کے آخری حصہ تک کی معلومات محفوظ ہیں جن کا اختتام ان کی شہادت پر ہوا۔ مصنف نے توجہ' محنت اور تحقیق سے ممکنہ حد تک حالات زندگی دریافت اور تحریر کئے ہیں۔ اپنی جستجو کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ

"ہمیں جناب محمد کے حالات کسی ایک کتاب میں یکجا نہیں ملے۔ مختلف کتابوں کے جابجا منتشر اجزاء کو ایک سلسلہ میں جوڑ دیا ہے۔ چند گنتی کے مقامات پر شیعہ مولفین کی کتابوں کو ماخذ بنایا ہے ورنہ پوری کتاب کا مدرک اہلسنت کی مشہور کتابیں ہیں جن کے نام آپ کو رسالے میں جابجا ملتے رہیں گے۔" (۴۷)

اگرچہ اس نوعیت کی صراحت نہیں ہونی چاہئے۔ ہمارے مورخین اور سوانح نگاروں نے شخصیات کا اسی طرح بٹوارہ کر لیا ہے کہ ہر فرقہ اور طبقہ ان مخصوص شخصیات کے علاوہ دیگر شخصیات پر قلم اٹھانا جائز نہیں سمجھتا۔ مذہب' تاریخ اور ادب میں یہ عصبیت مناسب رویّہ نہیں ہے۔ ہونا یہی چاہئے کہ وسیع النظری اور غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا جائے۔ مصنف نے اپنی غیر جانب داری کا ثبوت پیش کرنے کے لئے جو طرز تحقیق اپنایا ہے وہی مناسب ہے لیکن اس کا اظہار گراں گزرتا ہے۔ مذہبی کتب کی عام روشنی کے مطابق حوالے متن کے درمیان میں درج کئے ہیں یہ طریقہ اب متروک ہو گیا ہے۔

معلومات کے فقدان کی وجہ سے سوانح عمری جامع نہ ہو سکی۔ خلافت سوم و چہارم کے تاریخی واقعات کے پس منظر میں زیادہ تفصیلات حاصل ہو سکی ہیں۔ بالخصوص خلافت چہارم میں صاحب سوانح کو مصر کا حاکم بنایا جانا اور اس فیصلہ کے خلاف ردعمل جو ان کی شہادت پر منتج ہوا نسبتاً" تفصیلی ہے بہر صورت مصنف نے ایک مذہبی اور تاریخی شخصیت کے حالات زندگی کو بڑی حد تک مرتب کرنے کی سعی کی ہے انداز بیان میں محققانہ اور عالمانہ رنگ ہے۔

# باب سوم (ب)

## سیاسی، سماجی اور تاریخی شخصیات کی مختصر و جزوی

## (انفرادی/اجتماعی) سوانح عمریاں

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

مختصر وجزوی (انفرادی اور اجتماعی) سوانحی حالات پر مبنی تصانیف کی کیفیت اور ان کی اہمیت وفادیت گزشتہ باب میں بیان ہو چکی ہے۔ یہاں سیاسی' سماجی اور تاریخی شخصیات کے حوالے سے اسی نوعیتوں کی سوانحی عمریوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

### اکابر تحریک پاکستان : محمد صادق قصوری : گجرات : ١٩٥٦ء

تحریک پاکستان مسلمانان برصغیر کی اجتماعی خواہش اور کوشش کا نام ہے۔ کہنے کے لئے تو مسلم لیگ اور قائداعظم کی قیادت میسر آئی تھی لیکن معاشرہ کے تمام طبقات نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اس کے لئے کام کیا تھا۔ ان میں علمائے کرام اور مشائخ عظام بھی شامل تھے جن کے اثر ورسوخ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ محمد صادق قصوری نے ان علماء و مشائخ کے حالات زندگی اور جدوجہد قیام پاکستان میں جو کردار ادا کیا اس کا تاریخی اعتبار سے جائزہ اس کتاب میں پیش کیا ہے تقریباً پونے تین سو صفحات میں ٥٠ علماء کے سوانحی حالات مرتب کردیئے ہیں جو مختصر ہیں لیکن ایک بڑے اور وقیع کام کے لئے بنیاد کا کام کرسکتے ہیں ان اجتماعی سوانح عمریوں میں ضروری اور بنیادی معلومات فراہم کردی گئی ہیں۔ بعض بزرگوں کے حالات کے ضمن میں اس نوع کے اعتراف بھی ملتے ہیں کہ

"افسوس کہ پاکستان میں مولانا (آزاد سبحانی) کی خدمات تفصیلاً "نہیں مل سکیں" (٤٨)

۔ بعض معلومات ناقص بلکہ غلط ہیں مثلاً مولانا حسرت موہانی کے بارے میں لکھا ہے کہ

"تیسری بار ١٩٢٢ء میں زیر دفعہ ١٢٤ الف ٢٢ سال قید کی سزا ہوئی لیکن دو سال بعد ہی رہا کردیئے گئے۔" (٤٩)

امر واقعہ یہ ہے کہ مولانا حسرت مولانا کے خلاف دفعہ ١٢٤ کے تحت مقدمہ قائم ہوا تھا اور مجسٹریٹ نے ٢ سال قید کی سزا دی تھی۔

کتاب سے اس بات کا واضح اظہار ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان میں ہر فرقہ، مکتب فکر اور فقہ کے پابند بزرگوں نے جی جان کی بازی لگادی تھی اور تمام فروعی اختلافات کو پس پشت ڈال یا تھا سوانح نگاری مصنف کا مقصد نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس میں تحریک آزادی کے اکابرین کے حالات سرسری طور پر بیان کرکے سیاسی کارناموں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔

### حیدرآباد کے بڑے لوگ : غلام پنجتن شمشاد : حیدرآباد دکن : ١٩٥٧ء

غلام پنجتن شمشاد نے مرحوم ریاست حیدرآباد کی اہم شخصیتوں کے حالات زندگی اور ان

کے کارناموں کو اجاگر کرنے کے لئے ڈاکٹر زور کی فرمائش پر "حیدر آباد کے بڑے لوگ" مرتب کی۔ یہ کتاب ان مرحوم باکمال لوگوں کی سوانح حیات ہے جنھوں نے موجودہ صدی میں سقوط حیدر آباد سے قبل حیدر آباد کی تعمیر و ترقی اور نیک نامی میں اضافہ کی خاطر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان میں اصفریار جنگ' سر افسر الملک' سرامین جنگ' رائے بچناتھ' رفعت یار جنگ' سالار جنگ' سروجنی نائیڈو' سید علی بلگرامی' علی نواز جنگ' سر کشن پرشاد' کشوراو' سر نظامت جنگ' راجہ وینکٹ راما ریڈی شامل ہیں۔

ان حضرات کے سوانحی حالات کے ساتھ اہم سیاسی' تاریخی اور سماجی امور پر بے باکانہ تنقید و تبصرے بھی شامل ہیں ہر شخصیت کے بارے میں پوری تفصیل موجود ہے جس میں تعلیم و تربیت اور عملی زندگی کے ہر پہلو کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ حیدر آباد کی گزشتہ دور کی زندگی نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے اور ایسے حضرات کے کردار اور اعمال سامنے آتے ہیں جو اخلاص نیت اور اخلاص عمل کے پیکر تھے۔ ان شخصیات کو اور ان کے کردار کو حیدر آبادی تمدن کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مصنف نے کسی ذہنی مرعوبیت اور تحفظ کے بغیر حقائق' واقعات' اوصاف اور اعمال پیش کئے ہیں انداز بیان محتاط اور موثر رکھا ہے۔

### اقبال کے آخری دو سال : عاشق حسین بٹالوی : لاہور : ۱۹۶۰ء

علامہ اقبال کا برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی سے گہرا تعلق رہا ہے وہ عملی سیاست دان نہیں تھے لیکن تاریخ پر گہری نظر رکھنے کی وجہ سے سیاسی فکر رکھتے تھے۔ عملی سیاست سے ان کا تعلق صرف اس حد تک رہا کہ ۱۹۲۷ء میں وہ پنجاب لیجس لیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی تھی اور مسلم لیگ سے ان کو والہانہ رغبت تھی۔ انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس الہ آباد ۱۹۳۰ء میں تاریخی خطبہ دے کر مسلمانوں کی منزل کا تعین کیا تھا۔ عملاً ان کا تعلق مسلم لیگ سے برائے نام ہی کیوں نہ رہا ہو وہ پس پردہ بڑی قوت کے طور پر موجود رہے۔ خاص طور پر ۱۹۳۶ء کے بعد پنجاب کی سیاست انہیں کے اثر و رسوخ کی مرہون منت رہی۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں قائد اعظم مسلم لیگ کا پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے لاہور آئے اس وقت زمینداروں اور سرمایہ داروں کی با اثر سیاسی جماعت یونینسٹ پارٹی تھی جس نے قائد اعظم کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ علامہ کے ہاں اعانت کے لئے پہنچے اس وقت سے لے کر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء تک جو علامہ کی رحلت کا دن ہے اپنی صحت کا درماندگی کے



باوجود گرم جوشی' انہماک' جرأت کے ساتھ قائد اعظم کا ساتھ دیا اس کتاب میں اسی دور کا تاریخی مواد پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں خاصا طویل پس منظر ہے جس کی ابتدا اس صدی کی دوسری دہائی کے سیاسی واقعات سے ہوتی ہے قاری کے لئے ۱۹۳۵ء تک کی سیاسی تاریخ کا خاکہ فراہم کرنے کے بعد حصہ دوم میں علامہ کی سیاسی زندگی کے آخری دو سال کو تمام تر تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے مصنف اس عرصہ میں پنجاب مسلم لیگ میں شامل اور ان کی درون خانہ و بر سر عام کارروائیوں کے عینی شاہد ہیں اس لئے انہوں نے زیادہ باتیں اپنی یادداشتوں پر انحصار کر کے لکھی ہیں اور ان کی تائید میں اخبارات یا مسلم لیگ کے ریکارڈ کے حوالے دیئے ہیں اسی دور میں علامہ نے "قائد اعظم کے سپاہی" کے طور پر خدمات انجام دی تھیں جو ان کی زندگی کا اہم حصہ ہی نہیں ہے بلکہ تاریخ پاکستان کا بھی حصہ ہے اس اعتبار سے اس روداد کی بڑی اہمیت ہیں۔ مصنف نے تاریخ کو تاریخ کے طور پر پیش کیا ہے اس میں نہ تو جذباتیت کو داخل ہونے دیا اور نہ تعصب کو! حیات اقبال' تاریخ مسلم لیگ اور تاریخ پاکستان کے حوالے سے مفید اور مستند معلومات پر مبنی کتاب ہے۔ آخر میں بطور ضمیمہ جات اہم دستاویزات بھی شامل کر دی گئی ہیں۔

### مولانا محمد علی' بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز : محمد سرور : ۱۹۶۲ء

محمد سرور نے مولانا محمد علی کی چند شخصی خوبیوں کو ظاہر کرنے کے لئے ان کی تحریروں' تقریروں اور خطابات پر انحصار کیا ہے۔ پیش کردہ مواد سے مولانا کے مذہبی' سیاسی اور صحافتی رجحانات اور کارناموں سے واقفیت ضرور ہو جاتی ہے لیکن کتاب سوانحی تقاضوں یا شخصیت نگاری کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی۔ اس سے شخصیت کے چند پہلو ہی سامنے آتے ہیں اور جو عظمت و وقار مولانا کو حاصل ہے اس کا شائبہ بھی اس میں نہیں ملتا۔

### قائد اعظم' ابتدائی تیس سال : رضوان احمد : کراچی : دسمبر ۱۹۷۷ء

پاکستان کے بانی اور برصغیر کے مسلمانوں کے مقبول رہنما قائد اعظم محمد علی جناح کی حیات و سیرت سے دلچسپی کی وجہ سے ان کے احوال و کوائف پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں واقعات و معلومات کی تکرار ہی نظر آتی ہے۔ چند کتابیں ایسی ہیں جن میں تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہے اور نامعلوم گوشوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس خصوص میں رضوان احمد کی کتاب "قائد اعظم' ابتدائی تیس سال" کو نمایاں حیثیت حاصل ہے کیونکہ اس سے قائد کے

سیاسی کارنامے اور ان سے متعلق معلومات حاصل ہو جاتی ہیں قائد کے ابتدائی زندگی اور ان کے بزرگوں کے حالات پردہ اخفا میں رہے ہیں۔ محقق نے ان لوگوں تک رسائی حاصل کی جو قائد کے خاندان سے کسی نہ کسی نوعیت کا تعلق رکھتے تھے ان میں محترمہ فاطمہ جناح اور محترمہ شیرین فاطمہ تو معروف ہستیاں ہیں جو قائد کی بہنیں ہیں ان کے علاوہ محترمہ زلیخا سیدہ سے مدد حاصل کی جن کا تعلق قائد کی ننھیال سے ہے انہوں نے نہ صرف خاندانی شجرہ فراہم کیا بلکہ ان کی مدد سے خاندانی روایات کے بعض اہم گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ محقق کو قائد کے پھوپھا جمال کے برادر حقیقی کے پوتے اکبر علی بھنبھا اور جناح پونجا کے دوست نور محمد لالن کے پوتے عاشق علی لالن کا تعاون بھی حاصل رہا۔ محمد علی گھانچی والجی نے ددھیال کا شجرہ فراہم کیا۔ اس کام کے سلسلہ میں محقق کو جگہ جگہ کی خاک بھی چھاننی پڑی تمام ذرائع کی تلاش اور ان سے اخذ معلومات کے بعد رضوان احمد نے ۱۹۰۶ء تک کے حالات کو مستند طور پر پیش کیا ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ نئی معلومات ہیں بلکہ بعض روایات کی سختی سے تردید بھی ہے۔

رضوان احمد کی تحقیق کے مطابق قائد کے بزرگ کاٹھیاواڑ کے رہنے والے تھے ۱۹۴۰ء میں جب قائد اس علاقے میں گئے تھے تو "پانیلی" جانے کی خواہش کی تھی کہ وہاں بزرگوں سے وابستہ یادگاریں تھیں۔ ان کے دادا نے ۱۸۶۱ء میں ترک وطن کیا اور کراچی آکر یہاں آباد ہو گئے۔ ان کی اولادیں ماں بی، والجی، ناتھو بھائی اور جینا بھائی کاٹھیاواڑ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ جینا بھائی کی شادی آغا خان کے وزیر موسیٰ جمعہ کی صاجزادی شیریں سے ۱۸۷۶ء میں ہوئی۔ محقق نے انکشاف کیا ہے کہ کراچی میں جناح بھائی کی شادی کے موقع پر ایک شاندار ضیافت ہوئی (مقدمہ نمبر ۱۱، ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۱۷ ایگزیبٹ ایل) میں محفوظ ہے۔ محمد علی جناح ان کے بڑے بیٹے تھے ان کے علاوہ بھی سات اولاد تھیں کتاب میں ان سب کے نام اور سن پیدائش درج ہیں جبکہ عام طور پر ان کی صرف سات اولادیں بتائی جاتی ہیں۔ کتاب پر سندھ مدرسہ کے رجسٹر داخلہ کے اس صفحہ کا عکس بھی شامل ہے اس میں محمد علی جناح کے بارے میں اندراجات ہیں اکثر سوانح نگاروں بالخصوص بولا تھو نے تحریر کیا ہے کہ قائد کا خاندان نہایت غریب تھا اور یہ روایت بھی عام ہے کہ وہ اتنے غریب تھے کہ سڑک کے کنارے لیمپ پوسٹ کے نیچے بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ کتاب میں ان باتوں کی تردید ۱۰ مئی ۱۹۰۰ء کے سول ملٹری گزٹ اور مسز سروجنی نائیڈو کے بیانات کی روشنی میں کی گئی ہے۔ متذکرہ گزٹ میں چھپنے والی اطلاع کے مطابق "محمد علی جناح کے والد سندھ کے پرانے اور انتہائی معزز اور محترم تاجروں میں ہیں" سروجنی نائیڈو نے بھی اپنی کتاب "محمد علی جناح، سفیر



اتحاد" میں لکھا تھا کہ "محمد علی جناح ایک دولت مند تاجر کے سب سے بڑے فرزند ہیں۔"

قائد چند ماہ سندھ مدرستہ الاسلام میں زیر تعلیم رہنے کے بعد بمبئی چلے گئے تھے اور وہاں انہوں نے انجمن اسلام ہائی اسکول میں انگریزی کی پہلی جماعت میں داخلہ حاصل کیا تھا اور پھر واپس آکر دوبارہ سندھ مدرسہ میں داخل ہوئے کتاب کے صفحہ ۲۶ پر دوبارہ داخلہ کے بارے میں رجسٹر کا عکس شامل ہے اس میں قائد کی تاریخ پیدائش ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۵ء درج ہے محقق نے اس اندراج کے وجود سے بحث نہیں کی ہے اور عام طور پر جو تاریخ بتائی جاتی ہے اس سے اختلاف کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سندھ مدرسہ کے رجسٹر داخلہ کے عکس کے مطابق ان کا داخلہ ۲۳-۱۲-۸۷ کو ہوا اور ۵-۱-۹۱ء کو مسلسل غیر حاضری کی وجہ سے نام خارج ہوا تھا۔ صفحے پر دیئے گئے رجسٹر داخلہ سندھ مدرسہ کے مطابق ۹-۲-۹۱ء کو ایک بار پھر داخلہ لیا اور ۳۰-۱-۹۲ء کو مدرسہ کو چھوڑا۔ قائد کی پہلی شادی ۱۸۹۲ء میں ہوئی لیرا کھیم جی کی بیٹی امربائی سے ہوئی لیکن قطعی تاریخ محقق نہیں ہوئی۔ صفحہ ۷۶ پر چرچ مشن اسکول کے رجسٹر داخلہ کا عکس دیا گیا ہے رضوان احمد کی وضاحت کے مطابق قائد ۸ مئی ۱۸۹۲ء کو اس اسکول میں داخل ہوئے تھے لیکن عکس کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر درج تاریخ ۸ مارچ ۱۸۹۲ء ہے۔ اس اسکول کو انہوں نے ۳۱ اکتوبر ۹۲ء کو چھوڑا۔ قائد کی سوانح عمریوں میں ان کے لندن جانے کا سن ۱۸۹۲ء درج ہے رضوان احمد نے شواہد کے ذریعہ اسے ۱۸۹۳ء قرار دیا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ بات بھی کہانی معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے ۱۸۹۲ء میں دادا بھائی نوروجی کے برطانوی پارلیمنٹ کے لئے انتخاب میں ان کے لئے کام کیا تھا وہ اپنی تجارتی کمپنی کی لندن میں جمع شدہ رقم حاصل کرنے گئے تھے لیکن وہاں قیام کے دوران انہیں بیرسٹری کرنے کا خیال ہوا صفحہ ۱۰۸ پر لنکن ان کے داخلہ رجسٹر پر قائد کے دستخط کا عکس بھی دیا گیا ہے اس کے علاوہ بھی متعدد اہم دستاویزات کے عکس شامل کتاب ہیں اور قائد کے بارے میں لکھی گئی بہت سی باتوں کی تردید بھی کی گئی ہے جس محنت، جانفشانی اور عرق ریزی سے مواد جمع کیا گیا ہے وہ قابل داد ہے بعض مباحث تشنہ رہ گئے ہیں ممکن ہے ان کے بارے میں محقق کا ذہن صاف نہ ہو۔

**علامہ سید سلیمان ندوی کی سیاسی زندگی : سید فخر الحسن : مجلس علوم اسلامیہ کراچی : ۱۹۸۵ء**

علامہ سید سلیمان ندوی کی خدمات کے پہلوؤں میں ایک، ان کی سیاسی خدمات بھی ہیں جو عام طور پر نظروں سے اوجھل رہی ہیں۔ ایک صحافی کی حیثیت سے جب وہ مولانا ابو الکلام آزاد

کے ہفت روزہ "الہلال" سے منسلک رہے اسی وقت سے ان کی گہری نظر ملکی سیاست اور اغیار
کی ریشہ دوانیوں پر تھی۔ کانپور کی مسجد کی شہادت اور معصوم اور بے گناہ مسلمانوں کے قتل عام
پر ان کا معرکہ آراء مضمون "مشہد اکبر" ان کے دلی جذبات کا ترجمان ہے آریہ سماج کی مسلم
دشمن کارروائیوں کے خلاف مدافعت کے لئے ۱۹۱۲ء میں جب علامہ شبلی نے مجلس اشاعت
وحفاظت اسلام قائم کی تو انہیں اس کا جوائنٹ سیکریٹری بنایا گیا تھا۔ تحریک خلافت کے دوران
مولانا محمد علی کے اصرار پر وہ اس سے وابستہ ہوئے اور جو وفد خلافت کے مسئلہ پر مسلمانوں کے
خیالات کو اکابرین برطانیہ کو واقف کروانے کے لئے بھیجا گیا تھا وہ اس کے رکن تھے انگلستان
میں دوران قیام انہوں نے علمی اور اسلامی نقطہ نظر سے خلافت کی بقا کے لئے انگریزوں کو قائل
کرنے کی کوشش کی برصغیر میں تحریک کو آگے بڑھانے میں ان کا اہم کردار رہا۔ انہوں نے ۱۹۲۰ء
میں میرٹھ خلافت کانفرنس اور ۱۹۲۳ء میں بہار خلافت کانفرنس کی صدارت کی اور اپنے خطبات
کے ذریعہ مسلمانوں میں بیداری پیدا کی۔

سید فخرالحسن نے ان تمام تاریخی حالات کو پیش کرتے ہوئے علامہ کی سیاسی زندگی کا جامع
نقشہ پیش کیا ہے اور اس خاص پہلو کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مصنف کا رجحان
محققانہ ہے اور انہوں نے تمام متعلقہ مواد، ماخذات، خطبات وغیرہ سے استفادہ کرتے ہوئے
موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ ان کی کاوش سے تاریخ کے اہم باب کے تجزیات منظر عام
پر آگئی ہیں۔

### قائداعظم کے شب وروز : خورشید احمد خان : اسلام آباد : ۱۹۸۶ء

مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کی مطبوعات میں خورشید احمد خان کی مرتبہ کتاب قائداعظم
کے شب وروز بھی شامل ہے۔ اس میں مرتب نے یہ ندرت پیدا کی ہے کہ برصغیر کے تقریباً ایک
درجن اردو، انگریزی اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں اور قائداعظم کی غیر مطبوعہ ڈائری
کے علاوہ غیر مطبوعہ انٹرویوز اور چند مضامین کی مدد سے ان کی یکم جولائی ۱۹۴۴ء سے ۱۴ اگست
۱۹۴۷ء تک کی مصروفیات تاریخی ترتیب میں یکجا کردی ہیں۔ ان میں بہت سے اہم حوالوں کے
ساتھ غیر اہم اور غیر مکمل حوالے بھی موجود ہیں جبکہ بعض اہم حوالوں کا ذکر نہیں ہے جن
ماخذات تک مرتب کی رسائی ہو سکی انہیں سے استفادہ کیا گیا ہے اور زیادہ چھان بین کرنے یا
حالات وواقعات کے بارے میں ہونے والے ردعمل کے اظہار سے گریز کیا ہے اگر قائد کی
حمایت کرنے والے ماخذات کے علاوہ مخالف نظریہ رکھنے والے بالخصوص کانگریس کے حمایتی



پریس اور غیر ملکی اخبارات سے بھی استفادہ کیا جاتا تو تاریخ اور واقعات کے اظہار کے ساتھ
ان کی شخصیت کے نمایاں پہلو بھی اجاگر ہو سکتے تھے۔ کتاب اس اعتبار سے اہم ہے کہ قائد کی
سوانح لکھنے کے لئے اس سے مدد مل سکتی ہے لیکن جو واقعات درج کئے گئے ہیں ان کے ماخذ کا
حوالہ موجود نہیں ہے۔ آخر میں ماخذات کی فہرست درج کردینے سے قاری کی صحیح رہنمائی ہو سکتی
ہے اور نہ استفادہ کرنے والوں کو فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

### عظمتوں کے چراغ : ولی مظہر : ملتان : ۱۹۸۶ء

ولی مظہر جو قومی جذبے سے سرشار ہیں ۱۹۴۶ء میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن ضلع حصار کے
جنرل سیکریٹری بننے سے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ پہلے تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن رہے
اور قیام پاکستان کے بعد استحکام پاکستان کی سعی کرتے رہے "عظمتوں کے چراغ" چھ جلدوں میں
مرتب کی ہے ہر جلد میں تقریباً سات سو صفحات ہیں۔ اس طرح چار ہزار سے زائد صفحات میں
تقریباً دو سو مسلم زعماء کے حالات زندگی یکجا کئے ہیں جلد اول کی ابتدا علاؤالدین غوری سے اور
جلد ششم کا اختتام قائداعظم پر ہوا ہے اس میں مسلمان فاتحین، حکمران، قومی اور سیاسی رہنما
بھی شامل ہیں۔ ہر ایک کے حالات اپنے علم کی بنیاد پر تفصیلاً درج ہیں جو زیادہ تر مطبوعہ کتب
سے حاصل کئے گئے ہیں اگرچہ تاریخی واقعات میں تسلسل کا فقدان ہے اور بعض صورتوں میں
سنین کی دریافت میں سہو ہوا ہے اسے "قاموس المشاہیر" قرار دیا جا سکتا ہے۔ تنہا اتنے بڑے
منصوبے کی تکمیل میں مؤلف کی فروگزاشتیں قابل مواخذہ نہیں ہو سکتیں۔ مشاہیر کے حالات
زندگی کی فراہمی میں مؤلف نے وسیع النظری سے کام لیا ہے ان جلدوں کی اہمیت اس وجہ سے
بھی بڑھ گئی ہے۔ کہ اہم اخباری خبروں، تاریخی دستاویزات اور خطوط کے عکس بھی شامل کئے
گئے ہیں۔ انداز بیان قدرے جذباتی ہے جو تاریخی اور تحقیقی کاموں کے لئے موزوں نہیں۔
نظریاتی اختلاف کی صورت میں مؤلف حد اعتدال کو باقی نہیں رکھ سکے۔ اس خامی کے سوا یہ
جلدیں اہم واقعات کی دریافت میں رہنمائی کا کام دینے کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہیں۔

### حسرت موہانی : مجاہد آزادی کامل : شفقت رضوی : کراچی : ۱۹۸۷ء

مولانا حسرت موہانی کی شخصیت کے ایک پہلو سیاست کو موضوع بنا کر ۱۹۰۳ء سے ۱۹۴۷ء
تک کے سیاسی عمل کا احاطہ کیا گیا ہے مولانا نے انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت سے سیاسی
زندگی کا آغاز کیا تھا جو نشیب وفراز سے گزرتی ہوئی تحریک پاکستان کی حمایت پر ختم ہوئی۔ مصنف

نے پس منظر میں ان تمام تاریخی واقعات پر روشنی ڈالی ہے جن سے صاحب سوانح کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق رہا۔ خصوصیت سے کانگریس کی ریشہ دوانیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ کتاب کا اہم ترین حصہ ۱۹۲۱ء کے احمد آباد کے سیاسی اجتماعات ہیں۔ کانگریس، لیگ اور خلافت جیسی تنظیموں سے صاحب سوانح کا تعلق تھا۔ انہوں نے ان کے اجلاسوں میں ایک قرارداد پیش کی تھی چونکہ ان تنظیموں نے "حصول سوراج" کو اپنا مقصد قرار دیا تھا اور گاندھی جی کے اصرار پر لفظ "سوراج" کی توضیح یا تشریح نہیں کی تھی اور اسے مبہم رکھا تھا مولانا حسرت موہانی نے تینوں جماعتوں کے اجلاسوں میں قرارداد پیش کی تھی کہ "سوراج" کے معنی "کامل آزادی" لئے جائیں ان کی قرارداد کسی اجلاس میں بھی گاندھی جی کی مخالفت کی وجہ سے منظور نہیں ہو سکی اس حوالے سے مصنف نے ان اجلاسوں کی تقریریں نقل کی ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کی وہ تقریر نہایت اہم ہے جو انہوں نے بحیثیت صدر مسلم لیگ کی تھی۔ اس وقت اسے کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا تھا حکومت نے تقریر کو باغیانہ قرار دے کر مولانا پر مقدمہ قائم کیا تھا اور تقریر کا مطبوعہ کتابچہ ضبط کر لیا تھا۔ یہ تقریر مکمل حالت میں کہیں نقل نہیں کی گئی۔ مصنف نے مطبوعہ کتابچہ حاصل کر کے اس کا عکس شامل کتاب کیا ہے اور مولانا پر جو مقدمہ بمبئی ہائی کورٹ میں چلا اس کی کارروائی بمبئی لاء رپورٹز کے حوالے سے درج کی ہے۔

مصنف کا رجحان تحقیق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں جو مولانا حسرت موہانی کے بارے میں لکھی گئی کتب میں نہیں آئیں مصنف کی کاوش سے ان کا انکشاف ہوا ہے یہ مکمل اور جامع سوانح ہیں لیکن مولانا کی سیاسی زندگی کے بارے میں اس سے بہتر مواد کسی کتاب میں نہیں ملتا۔

**شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی : ایک سیاسی مطالعہ : ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہانپوری : کراچی : ۱۹۸۸ء**

شیخ الہند ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ذات تغیر و تبدل کے آغاز سے انقلاب حالات تک، مسند درس و تعلیم اور ذوق عمل کی تربیت سے لے کر میدان جہاد تک، مسلمانوں کی عام اجتماعی زندگی سے لے کر بین الملی سطح تک، ملکی حالات سے لیکر بین الاقوامی مسائل تک اور دینی دائرے سے قومی سیاست کے تمام گوشوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ فکر و عمل کے ہر شعبہ میں ان کے چھوڑے ہوئے نقوش موجود ہیں جن کا احاطہ کرنے کے لئے بہت ضخیم تصنیف کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری نے ان کے سیاسی افکار اور اعمال کے ذریعہ اس شعبۂ زندگی میں ان کے مرتبہ اور عظمت کے تعین کی سعی کی ہے۔ تقریباً بیس صفحات میں صرف سیاست کے



حوالے سے واقعات زندگی بیان کئے ہیں۔ حصول تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے تدریس کو بطور پیشہ اختیار کیا دیوبند میں معلم مقرر ہوئے۔ مولانا قاسم نانوتوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ انہیں سے سیاست کی تعلیم حاصل کی تھی اور ان کی درس گاہ میں تدریس کا کام انجام دینے کے ساتھ ان کی تحریک جہاد کو آگے بڑھانے کا فرض بھی پورا کیا۔ ان کے شاگردوں میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبید اللہ سندھی، مفتی کفایت اللہ، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا محمد صادق سندھی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا اشرف علی تھانوی شامل تھے۔ مسلم رہنماؤں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خان، مولانا آزاد، مولانا محمد علی سب ہی سیاست میں ان کے حلقہ بگوش تھے۔ انگریز حکمرانوں کے خلاف تحریک جہاد کے بانی اور روح رواں وہی تھے جن کو عالم ہجرت میں انگریزوں نے حجاز میں گرفتار کر کے مالٹا میں قید رکھا لیکن ان کی تحریک کی روح برصغیر کے گوشے گوشے میں کارفرما رہی۔

دین اور سیاست کی یکجائی کی نظیر شیخ الہند اور ان کے پیروؤں نے قائم کی۔ ان تمام واقعات کا احاطہ مصنف نے اس مختصر سوانح عمری میں لینے کے بعد صاحب سوانح کے افکار اور عزائم کی وضاحت کے لئے ان کے سیاسی خطابات، سیاسی فتاوئ اور خطوط بھی الگ الگ ابواب میں شامل کر دیئے ہیں۔

برصغیر کی سیاسی تاریخ کئی زاویوں سے لکھی جاتی ہے۔ ایک نقطۂ نظر کانگریس کا ہے دوسرا مسلم لیگ کا، تیسرا انگریز حکمرانوں کا، لیکن "دینی سیاست" اس کے دائرہ عمل اور اثرات کی جانب کم توجہ کی جاتی ہے۔ علماء اور بزرگان مذہب اسلام نے آزادی کے حصول کے لئے جداگانہ اکائی کے طور پر جو جدوجہد کی تھی اس کے بغیر تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ مصنف نے تاریخ کی اس فراموش کردہ کڑی کی طرف توجہ کر کے نہ صرف اپنے جذبات عقیدت کو تسکین پہنچائی ہے بلکہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کیا ان کا مطالعہ حقائق پر مبنی ہے اور طرز اظہار غیر جانبدارانہ ہے۔ مصنف کی حیثیت تسلیم شدہ محقق کی ہے۔ اس میں بھی انہوں نے ذوق تحقیق سے کام لیا ہے اور روایات کے بجائے حقائق کو پیش کیا ہے۔

**قائداعظم اور ان کے سیاسی رفقاء: اقبال احمد صدیقی : کراچی : جولائی : ۱۹۹۰ء**

اقبال احمد خان نے آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔

وہ مسلم لیگ سے بھی وابستہ رہے۔ یوں تو سیاست میں علامہ قاری غلام محی الدین قادری نقشبندی کی مخصی رہنمائی انھیں حاصل رہی لیکن تحریک پاکستان کے لئے کام کرتے ہوئے انھیں صف اول کے قائدین سے ملنے یا ان کے بارے میں بالواسطہ معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اپنے مشاہدہ اور مطالعہ کے ذریعہ انھوں نے ان قائدین کے کردار کو سمجھا اور اسے اپنے لئے رہنما قوت بنایا۔ ان کے پیش نظریہ بھی رہا کہ اپنے مطالعہ اور تجربے سے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ نئی نسل کو منتقل کردینا چاہئے چنانچہ انھوں نے "قائداعظم کے سیاسی رفقاء" کے کردار اور کارناموں کو کتابی صورت میں پیش کرنے کا جو منصوبہ بنایا ہے یہ اس کی پہلی کڑی ہے۔ اس میں قائداعظم، شہید ملت لیاقت علی خان، سید الاحرار مولانا حسرت موہانی، چودھری رحمت علی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، بی اماں، سردار عبدالرب نشتر، خواجہ ناظم الدین، چودھری خلیق الزماں، قاضی محمد عیسیٰ، پیرالٰہی بخش، آئی آئی چندریگر، ابا حلیم، الطاف حسین ایڈیٹر ڈان اور بہادر یار جنگ کا تعارف پہلی جلد میں اس طرح پیش کیا ہے کہ مختصر سوانح کے ساتھ ان کے کردار اور کارناموں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مگر واقعات درج کرنے میں تاریخی تسلسل کا خیال نہیں رکھا گیا۔ متعین کی بعض غلطیاں بھی ہیں لیکن نوجوانوں کی دلچسپی اور ان کی ذہنی تربیت کے لئے یہ کتاب کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔

علاوہ ازیں مختصر واجتماعی سوانح عمریوں (سیاسی تاریخی) میں "اسلام کے مشہور سپہ سالار" از عبدالواحد سندھی مطبوعہ کراچی ۱۹۵۶ء "صورت گران دکن" شائع کردہ ادارۂ اخبار سیاست مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۵۹ء "اٹھارہ سو ستاون" از سندر لال مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۹ء "۱۸۵۷ء کے مجاہد" از غلام رسول مہر مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء اور "دہلی کی یادگار ہستیاں" از امداد صابری مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء بھی قابل ذکر ہیں۔



# باب سوم

## مصادر ماخذات


۱ - صدق جدید : یکم اگست ۱۹۵۷ء : صفحہ ۴

۲ - حیات اجمل : قاضی عبدالغفار : دہلی : ۱۹۵۰ء : صفحہ ۵

۳ - حیات اجمل : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۸

۴ - حیات اجمل : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۴

۵ - حیات اجمل : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۸

۶ - مہاراجہ کشن پرشاد : مہدی نواب جنگ : حیدرآباد دکن : ستمبر ۱۹۵۰ء : صفحہ ۱۶

۷ - محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق : مطبع معارف : اعظم گڑھ : ۱۹۵۶ء : صفحہ ۱

۸ - محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۲۶

۹ - محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۷۶

۱۰ - بلبل ہند : سروجنی نائیڈو : وزیر حسن : ادارۂ ادبیات اردو : حیدرآباد دکن : ۱۹۷۰ء : صفحہ ۵

۱۱ - ظفر علی خان : شورش کاشمیری : ادارہ چٹان : لاہور : ۱۹۵۹ : صفحہ ۶۰

۱۲ - حسین شہید سہروردی : شورش کاشمیری : ادارہ چٹان : لاہور : ۱۹۶۷ء : صفحہ ۷

۱۳ - حسین شہید سہروردی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲

۱۴ - سید ابوالاعلیٰ مودودی : چوہدری عبدالرحمٰن عبد : لاہور : ۱۹۷۱ء : صفحہ ۱۳

۱۵ - حیات عثمانی : پروفیسر محمد انوارالحسن شیرکوٹی : مکتبہ دارالعلوم : کراچی : ۱۹۷۲ء : صفحہ ۳۵۱، ۳۵۲

۱۶ - حیات عثمانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۵۲

۱۷ - حیات عثمانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۴۹۹

۱۸ - اللہ کی تلوار، خالد بن ولید : میجر جنرل آغا ابراہیم اکرم : نیشنل بک فاؤنڈیشن : کراچی : ۱۹۷۵ء (دیباچہ)

۱۹ - قائد اعظم کے ۷۲ سال : خواجہ رضی حیدر : پاکستان ہیرالڈ پریس :

کراچی : ۱۹۷۷ء : صفحہ ۱۵

۲۰ - پاکستان کے بانی : محمد علی جناح : ہیکٹر بولائتھو : ترجمہ زبیر صدیقی : ۱۹۶۵ء

۲۱ - قائداعظم کی ازدواجی زندگی (مضمون) : مقصود احمد خان مشمولہ سیارہ ڈائجسٹ :
لاہور : جون ۱۹۷۵ء

۲۲ - قائداعظم جناح : جی الانہ : کراچی : ۱۹۶۷ء

۲۳ - قائداعظم کا عہد : رئیس احمد جعفری : ۱۹۳۶ء

۲۴ - شاہراہ پاکستان : خلیق الزمان : کراچی : ۱۹۶۷ء

۲۵ - سید الاحرار : اشتیاق اظہر : اردو اکیڈمی بہاولپور : ۱۹۷۸ء : صفحہ ۱۱۴

۲۶ - ہمارے پیارے مولانا : نظر زیدی : المنار بک سینٹر : لاہور : ۱۹۸۲ء :
صفحہ ۸

۲۷ - ہمارے پیارے مولانا : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۹

۲۸ - بیگم حسرت موہانی : عتیق احمد : دہلی : نومبر ۱۹۸۱ء : صفحہ ۱۰۸

۲۹ - سوانح حیات راجہ صاحب محمود آباد : سید اصغر علی شادانی : کراچی : ۱۹۸۶ء
صفحہ ۳۲

۳۰ - سوانح حیات راجہ صاحب محمود آباد : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۰۳

۳۱ - محمد عزیز مرزا، شخصیت اور کارنامے : مرزا اکبر علی بیگ : ادارہ شعر و حکمت :
حیدر آباد دکن : ۱۹۸۷ء : صفحہ ۱۰۲

۳۲ - محمد عزیز مرزا، شخصیت اور کارنامے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۰۲

۳۳ - محمد عزیز مرزا، شخصیت اور کارنامے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۰۲

۳۴ - ذوالفقار علی بھٹو، بچپن سے تختۂ دار تک : لاہور : صفحہ ۱۷

۳۵ - ذوالفقار علی بھٹو، بچپن سے تختۂ دار تک : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۲

۳۶ - ذوالفقار علی بھٹو، بچپن سے تختۂ دار تک : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۴

۳۷ - ذوالفقار علی بھٹو، بچپن سے تختۂ دار تک : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۰

۳۸ - ذوالفقار علی بھٹو، بچپن سے تختۂ دار تک : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۳

۳۹ - ذوالفقار علی بھٹو، بچپن سے تختۂ دار تک : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۸

۴۰ - حالات قائداعظم، خالد اختر افغانی : آتش فشاں





پبلیکشنز : لاہور : ۱۹۸۸ء : صفحہ ۲۰

۴۱ - حالات قائداعظم : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۰۸

۴۲ - جنرل اختر عبدالرحمٰن (شہید جہاد افغانستان) : عرفان صدیقی : جنگ پبلی کیشنز :
لاہور ۱۹۸۹ء : صفحہ ۱۲

۴۳ - جنرل اختر عبدالرحمٰن : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۵

۴۴ - جنرل اختر عبدالرحمٰن : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۹

۴۵ - جنرل اختر عبدالرحمٰن : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۲

۴۶ - تلاش آزاد : عبدالقوی دسنوی : مکتبہ جامعہ : دہلی : ۱۹۹۰ء : صفحہ ۱۳

۴۷ - محمد بن ابر بکر : مرزا محمد عالم لکھنوی : حق برادرز : لاہور س ن : صفحہ ۴

۴۸ - اکابر تحریک پاکستان : محمد صادق قصوری : مکتبہ رضویہ :
گجرات : ۱۹۵۶ء : صفحہ ۳۷

۴۹ - اکابر تحریک پاکستان : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۸۱

# باب چہارم

## اہل فلسفہ و مذہبی شخصیات کی سوانح عمریاں

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

## تمہید

مسلمانوں کے علم وشعور نے ہمیشہ علم وحکمت کی آبیاری کی ہے اور ان کو وسعت دے کر نئے نئے شعبوں کا اضافہ کیا ہے۔ اسلام کے اقصائے عالم میں پھیلنے کے ساتھ ہی نئے علوم کی شاخیں پھوٹنے لگیں جو قرآن کریم اور حدیث وسنت رسول کی روشنی میں پھلتی پھولتی گئیں۔ ان علوم کے اہم ماخذ یہی دو سرچشمے تھے ادب، تاریخ اور سوانح نگاری کے حوالے سے دیکھا جائے تو نعت کی صنعت شاعری ذات رسول اقدس سے وابستہ رہی حضرت حسان بن ثابتؓ اور ان کے معاصرین نے اس نوع کی شاعری کو عروج کمال کو پہنچایا۔ "مغازی" وجود میں آئیں جو تاریخ کے بارے میں شعور کا پتا دیتی ہیں اور پھر سیرت نگاری کی ابتدا ہوئی۔ ان کو منضبط کرنے کے اصول کے لئے قرآن حکیم اور حدیث رسول سے رہنمائی حاصل کی ان کے علاوہ روایت اور درایت سے استفادہ کے اصول بنائے گئے جس کے ساتھ سخت شرائط بھی رکھی گئیں۔ اس طرح سیرت، تاریخ اور سوانح نگاری مستقل اور جداگانہ علوم کے طور پر مسلمانوں میں رائج ہیں۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ اصول فن اور طرز اظہار میں تبدیلی بھی ہوئی لیکن سوانح وسیرت رسول پاکؐ صحابۂ کرام، خلفائے راشدین، آئمہ اربع، آئمہ دوازدہم اور معصومین چہاردہم کے احوال میں قرآن وحدیث کے اصولوں اور روایت اور درایت کی پابندیوں کو نظرانداز نہیں کیا گیا۔

گزشتہ چند صدیوں کے دوران مذہبی شخصیات کا دائرہ عمل دین تک محدود نہیں رہا وہ امور دنیاوی میں بھی دخل انداز ہونے لگے اور کوشش کی کہ احکامات خداوندی اور ارشادات نبویؐ سے روشنی حاصل کر کے باطل کے مقابلہ میں صف آراء ہوں کسی نے علم جہاد بلند کیا، کسی نے سیاسی میدان فتح کیا، کوئی تلوار سے لڑتا رہا، کوئی قلم سے لڑتا رہا، ان کی کاوشیں مختلف نوعیت کی تھیں لیکن ان کے فکر وعمل کی بنیاد مذہب تھی۔ وہ کہیں مجاہد ہیں تو کہیں سیاسی کردار ہیں، کہیں ادیب ہیں، کہیں مقرر ہیں اور کہیں صحافی لیکن ہیں بنیادی طور پر مذہب سے تعلق رکھنے والے۔ ان کی سوانح عمریاں بھی ہمارے موضوع کا حصہ ہیں جن کا تعارف اس باب میں کروایا گیا ہے۔

# باب چہارم (الف)

## سوانح و سیرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

### خاتم الانبیاء : ڈاکٹر شیخ محمد اقبال : لکھنؤ : ۱۹۵۳ء

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبی سے متاثر ہو کر اس کی ابتدائی دو جلدوں کو عام فہم انداز میں اختصار کے ساتھ مرتب کر کے "خاتم الانبیاء" کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان کا مقصد نوجوانوں اور طالب علموں کو سیرت طیبہ کے اہم پہلوؤں سے روشناس کروانا تھا چنانچہ وہ اپنا مقصد تحریر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"میں نے جب سیرت النبی کی دونوں جلدیں پڑھیں تو میری پرانی خواہش میں ایک تازہ ولولہ پیدا ہوا کہ طالب علموں اور مبتدیوں کے لئے اس کتاب سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے ایک ریڈر لکھ دوں تاکہ طالب علم اور طالبات، طالب علمی ہی کے زمانے میں جس طور پر اور مضامین پڑھتے ہیں یہ ضروری مضمون بھی پڑھیں۔" (۱) سیرۃ النبی پر بنیادی نوعیت کی کتاب مگر کامیاب کوشش ہے۔

### سیرت قرآنیہ رسول عربی : محمد اجمل خان : دہلی : ۱۹۵۶ء

قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں سیرۃ النبیؐ مرتب کرنے کا اکثر علماء نے قصد کیا ہے اس سلسلہ کی ایک ابتدائی نوعیت کی کوشش محمد اجمل خان کی "سیرت قرآنیہ رسول عربی" بھی ہے۔ جس میں سیرت طیبہ کی مطابقت تعلیمات و آیات قرآنی سے ظاہر کی گئی ہے۔ ضمنی طور پر تاریخ اسلام، نزول اسلام کے وقت کا تاریخی، مذہبی اور ذہنی پس منظر بھی بیان کیا ہے اور اسلام کا موازنہ دیگر مذاہب خصوصاً یہودیوں اور نصرانیوں سے کیا گیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے کتاب اہم ہے لیکن جس قدر وقیع ہونی چاہئے تھی نہیں ہے۔

### سیرت پاک : بشیر محمد شارق دہلوی : کراچی : ۱۹۵۶ء

بشیر محمد شارق دہلوی نے "سیرت پاک" نہایت آسان اور سلیس زبان میں بچوں کے لئے ترتیب دی ہے اس میں حضورؐ کے حالات زندگی تاریخی تسلسل میں بیان کئے گئے ہیں اور آخر میں کچھ سبق آموز واقعات شامل کئے ہیں جو بچوں کی سیرت سازی کے لئے رہنما ہو سکتے ہیں چالیس ایسی احادیث مع ترجمہ شامل ہیں جو بچوں کے اخلاق کی درستی کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔ بچوں کے لئے مرتبہ یہ کتاب اپنی زبان، انداز بیان اور سوانحی واقعات کے لحاظ سے یقیناً ایک کامیاب اور اہم کوشش ہے۔

## سیرت نبویؐ قرآنی : عبدالماجد دریابادی : لکھنؤ : ۱۹۶۳ء

مولانا عبدالماجد دریابادی مفسر قرآن بھی تھے اور سیرت نگار بھی! وہی ایسے مشکل موضوع پر قلم اٹھانے کا فرض ادا کر سکتے تھے۔ سیرت نبوی قرآنی میں قرآن حکیم سے سیرت نبویؐ کے تمام پہلوؤں کو اخذ کیا گیا ہے اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ انہوں نے ظہور' نام' نسب' وطن' زمانہ' خصائص' مشاغل' فضائل' رسالت وبشریت' ہجرت' غزوات' محاربات' معاصرین' مشرکین' یہود' نصاریٰ' منافقین' مومنین' معجزات ودلائل' خانگی اور ازدواجی زندگی کے عنوانات وابواب میں قرآن حکیم کی آیات کو پیش نظر رکھ کر حیات طیبہ کی تفصیل دی ہے۔ اس سے ان کی دونوں موضوعات پر گہری نظر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ عام سیرت نگار حضورؐ کے روحانی پہلوؤں پر زیادہ زور دیتے ہیں صاحب تصنیف نے ان کے ساتھ ساتھ حضور کے بشری پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ایک موقع پر سورۃ التحریم کی تین آیات کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ

"اس تمام خانگی قصہ کے لئے آنے سے سبق ایک نہیں کئی کئی نکلتے ہیں چنانچہ پہلی تو یہ بات نکلی کہ آپ کی معیشت اور خانگی زندگی جنت کی نہیں اسی خاکی دنیا کی زندگی تھی جو نوع بشری کے ہر فرد کے لئے نمونے کا کام دے سکتی ہے۔ پیچیدگیاں اس میں وہی پیش آئی تھیں جو ہر انسان کو اپنی ازدواجی زندگی میں پیش آسکتی ہیں اور علاوہ ملکی انتظامات اور اجتماعی معاملات میں امت کی رہنمائی وپیشوائی کے آپ کو خانگی معیشت کے مرحلوں سے گزرنا تھا کہ بغیر اس کے اسوۂ حسنہ کے کامل وجامع ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ دوسرا سبق یہ ملا کہ حسن معاشرت ومعیشت گویا آپ پر ختم تھا۔ عین ناگواری کے عالم میں بھی رفق وملاطفت کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا۔ تیسرا پہلو یہ ملاحظہ ہو کہ زبان سے یہ نہ ارشاد ہوا کہ خبر مجھے کیوں نہ ہو جاتی۔ سبب نہ اپنی فراست کو پیش فرمایا نہ اپنے اشراق وکشف کو فرمایا تو ایک عبد کامل کی طرح یہ فرمایا کہ اس خدائے علیم وخبیر نے مجھے خبر فرمادی" (۲)

قرآن حکیم میں ایک ہی لفظ مختلف مقامات پر مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرح کے ہر لفظ اس کے معانی ومفاہیم پر انہوں نے پوری توجہ دی ہے۔ یہ امر اختلافی ہے کہ حضورؐ کے والد ماجد کی وفات آپ کی ولادت سے قبل ہوئی تھی یا بعد اس پر انہوں نے بحث کی ہے سورۃ الضحیٰ کے حوالے سے لفظ یتیم کی تشریح کی ہے عربی میں یتیم اس کو کہتے ہیں جس کے باپ کا انتقال اس کے بلوغ سے قبل ہو جائے اور قبل ولادت کا عرصہ بھی قبل بلوغ میں شامل ہے۔

"مردوں کی مسیحائی" کے برخلاف اس کا اسلوب تحریر مختلف ہے۔ اس میں لفظی وفنی تزئین



کاری اور جوش خطابت سے ہٹ کر تفہیم وترسیل مطالب پر توجہ دی گئی ہے۔

## محسن انسانیت : نعیم صدیقی : دہلی : ۱۹۶۴ء

یوں تو سیرۃ النبیؐ پر بہترین معلومات کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ نعیم صدیقی کی کتاب کا خاص وصف یہ ہے کہ انہوں نے حضور اکرمؐ کو ایک تحریک کے بانی' اس دور کے مصلح اور معرکہ خیر وشر کے مجاہد کے طور پر پیش کیا ہے اس لئے جو واقعات بیان کئے ہیں وہ متعینہ مقصد کی وضاحت کرتے ہیں اس کے ذریعہ مصنف یہ بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ دور کی طاغوتی قوتوں کے مقابلہ میں حضورؐ کی پیروی ہی باعث نجات ہو سکتی ہے۔ بامقصد تصنیف کے لئے واقعات کا انتخاب مصنف کے وسیع مطالعہ اور ذوق کا مرہون منت ہے۔ انداز تحریر نے اسے دلنشین بھی بنا دیا ہے اور سبق آموز بھی۔

## سیرت المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم : محمد ابراہیم سیالکوٹی : سیالکوٹ : جون ۱۹۷۳ء

مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی نے اپنے علم اور بصیرت کی بنیاد پر سیرت نبی تحریر کی ہے اس کے مقدمہ میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت بھی کر دی ہے وہ سیرت کی تحریر کو سادگی سے مملو اور تصنع سے پاک ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں طرز بیان کو سادہ ہونے کے ساتھ دلکش بھی ہونا چاہئے اور معنی خیز بھی۔ موقع کی مناسبت سے انداز بیان اختیار کیا جائے تاکہ وہ مؤثر بھی ہو۔ اسی طرح ضروری نہیں کہ اپنی رائے کا خواہ مخواہ اظہار کیا جائے اس کے لئے موقع ومحل ہونا چاہئے اور اسباب وعلائل واستدلال کے ذریعہ کو پائے ثبوت کو پہنچانا چاہئے۔ خود ساختہ اور کمزور وناقص روایات سے پرہیز کیا جائے۔ مصنف نے ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے سیرت تصنیف کی ہے جس میں طویل وبے سروپا کہانیوں سے پرہیز کرتے ہوئے حضورؐ کے فضائل وخصائل اور اہم تاریخی واقعات تک محدود رکھا ہے جس سے سیرت وکردار پر پوری طرح روشنی پڑ سکی۔ مصنف نے یہ التزام بھی کیا ہے کہ سیاسی وتاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ اشاعت اسلام اور اس کے مناسب حال آیات قرآنیہ کا نزول بھی مذکور کیا ہے کیونکہ آنحضرت کی بعثت کا اصل مقصد اعلائے کلمۃ الحق ہے گویا قرآن ایک پہلو ہے تو سیرت دوسرا پہلو۔ اس لزوم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جلد اول ابتدائی حالات سے بعثت تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ باب اول فصل اول

"نبی کریم کے آباؤ اجداد، فصل دوم آنحضرت کے آباؤ اجداد کے مذہب، فصل سوم دلائل خلیفہ اور ان کے جواب، باب دوم "آنحضرت کے ذاتی حالات، ولادت، خاندان، نام اور عقیقہ اور رضاعت سے متعلق ہیں۔ بعثت سے قبل کے حالات زندگی نہایت تفصیلی وضاحت اور ضروری حوالوں سے بیان کئے گئے ہیں جن کی صداقت سے انکار ممکن نہیں۔ ہر ضروری امر کے لئے ممکنہ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس طرح حیات نبویؐ کے مختصر دور کا احاطہ کرنے کے باوجود تفاصیل کی وجہ سے کتاب طویل ہو گئی ہے۔

مصنف صاحب علم و قلم ہیں انہوں نے اپنے علم سے فیض پہنچانے کے لئے ایسا طریق تحریر اختیار کیا ہے جس میں سنجیدگی اور وقار ہے اور قاری کو متاثر کرتا ہے۔ بغیر ثبوت اور دلیل کے وہ کسی واقعہ کو بیان نہیں کرتے۔ یہی سیرت نگاری کے بنیادی تقاضے ہیں۔

**سیرت سرور دو عالم (جلد اول، دوم و سوم) : سید ابوالاعلیٰ مودودی : مرتبہ نعیم صدیقی : لاہور : اکتوبر ۱۹۷۸ء**

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی زندگی بھر تفہیم، ترویج اور استقامت دین اسلام کے لئے کام کرتے رہے۔ ان کی متعدد تصانیف اس کا ثبوت ہیں۔ ان سے تقرّب خاص رکھنے والے نعیم صدیقی نے مولانا موصوف کی تحریروں سے استفادہ کرتے ہوئے اندازہ لگایا کہ ان منتشر معلومات کو مربوط کر کے سیرت النبیؐ مرتب کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ تفہیم قرآن کی چھ جلدوں اور دیگر تحریروں کی مدد سے انہوں نے "سیرت سرور دو عالم" تین جلدوں میں مرتب کی۔ موضوع اور متعلقات کی وسعت و کثرت کی وجہ سے یہ ضخیم جلدیں بھی مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتیں لیکن اردو میں سیرت شناسی کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان میں انہیں اہم اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ "سیرت سرور دو عالم" جلد اول چار حصوں، سلسلۂ نبوت سے متعلق اصولی حقیقتیں، بعثت سے پہلے کا ماحول (اقوام ماضیہ) بعثت سے پہلے کا ماحول (مذاہب) بعثت سے پہلے کا ماحول (جزیرۃ العرب کی جغرافیائی و تمدنی اہمیت) پر مشتمل ہے۔ یہ جلد قبل از اسلام کے حالات کو با تفصیل پیش کرتی ہے۔ اس پس منظر کے بغیر حضور کی تشریف آوری کے مقاصد اور اسلام کی تعلیمات میں پیش آنے والی مشکلات کا اندازہ ممکن نہیں ہے اس کے بارے میں مرتبین نے وضاحت کی ہے کہ

"اس میں بنیادی مباحث کے زیر عنوان مولانا محترم کی ان تمام تحریروں اور تقریروں اور



ضروری اقتباسات کو جمع کیا گیا ہے جو یا تو منصب نبوت، نظام وحی، تصور دین اور دوسرے متعلقہ موضوعات پر روشنی بہم پہنچاتے ہیں اور دوسری طرف بعثت کے دور اور اس سے پہلے کے تہذیبی، تاریخی، مذہبی اور سیاسی ماحول کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ مباحث اگرچہ براہ راست سیرت پاک کے سلسلۂ واقعات کو پیش نہیں کرتے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت، آپ کے منصب اور آپ کی جدوجہد کو سمجھنے میں ان سے بہت زیادہ مدد ملتی ہے۔"(۳)

دوسری اور تیسری جلد کا براہ راست تعلق حضورؐ کی زندگی کے سلسلۂ واقعات سے ہے۔

"دوسری جلد حضورؐ کی پیدائش سے لے کر ہجرت مدینہ تک احوال و واقعات پر مشتمل ہے۔ تیسری جلد میں انتہائی سرگرم تحریکی زندگی کا مرقع سامنے آتا ہے جو لمحۂ وصال تک حضورؐ نے مدینے میں گزاری۔"(۴)

دوسری جلد کا آغاز "قرآن اپنے لانے والے کو کس حیثیت میں پیش کرتا ہے۔" کے مباحث سے ہوا ہے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاندانی پس منظر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب تک بیان ہوا ہے۔ ابواب مابعد میں حالات و واقعات زندگی اور اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کی سعی و کاوش ہے۔

واقعات زندگی تاریخی ترتیب میں ہیں جہاں ممکن ہوا قرآن سے تصدیق بھی کی گئی ہے۔ جزئیات میں اختلاف کی صورت میں تمام حوالوں کے ساتھ ان کا محاکمہ کر کے زیادہ مستند روایت کو ترجیح دی ہے یا استدلال کے ذریعہ ایسا نتیجہ اخذ کیا ہے جو قرین عقل ہے۔ تاریخ اور روایات میں جس قدر واقعات آئے ہیں ان میں سے شاید ہی کسی کو نظر انداز کیا ہے۔ باوجود اس کے کہ افضل الخلائق کی سیرت پاک قلم بند کی ہے جن سے مصنف کو حد درجہ عقیدت وارادت رہی ہے۔ انہوں نے تحریر میں احترام ملحوظ رکھا ہے۔ اسے جذبات سپاس سے گرانبار نہیں ہونے دیا۔

حضورؐ کی نبوت سے پہلے کی زندگی اور بعثت کے بعد کی زندگی کے ہر پہلو کا جائزہ موجود ہے آپ کی قبل نبوت کی سیرت کے بارے میں لکھا ہے کہ

"زندگی بے داغ ہی نہ تھی بلند ترین سیرت و کردار کا ایک نمونہ تھی جس معاشرے میں آپ بچپن سے ادھیڑ عمر تک رہے بسے تھے۔ جس کے لوگوں کو ہر پہلو سے آپ کے ساتھ رشتہ داری، ہمسائیگی، میل جول، دوستی، لین دین، غرض طرح طرح کے معاملات میں شب و روز سابقہ پیش آتا رہا تھا ان سے کوئی ایسا نہ تھا جو آپ کی سچائی، آپ کی دیانت، آپ کی شرافت، آپ کی اخلاقی

پاکیزگی، آپ کے حسن سلوک، آپ کی رحم دلی اور آپ کی ہمدردی وفیاضی کا معترف نہ ہو۔ آپ مجسم خیر تھے۔ کسی کو آپ سے شر کا تجربہ تو درکنار اس کا اندیشہ تک بھی نہ ہوا تھا۔ آپؐ کے اوپر لوگوں کو اتنا اعتماد تھا کہ وہ آپؐ کو "امین" کہتے تھے اور یہ اعتماد اس وقت بھی قائم رہا جب اسلام کی دعوت پیش کرنے کی وجہ سے لوگ آپؐ کے دشمن ہو گئے تھے اس حالت میں بھی دوست دشمن سب اپنی امانتیں آپؐ کے پاس رکھواتے تھے۔ کسی کو آپؐ سے خیانت کا خطرہ نہ تھا۔" (۵)

مصنف نے جن امور کے سلسلہ میں استدلال کیا ہے وہ لائق توجہ ہیں اور مصنف کی اعلیٰ علمی قابلیت کے مظہر ہیں۔ حضورؐ کو نبی اور اسلام کو دین الٰہی نہ ماننے والے بھی آپؐ کی شخصیت سے مرعوب تھے۔ اس کے بارے میں لکھا گیا کہ۔

"جس درجہ کی دشمنی ان کے سینوں میں آگ کی طرح بھڑک رہی تھی اور جس دشمنی کی بناء پر وہ اپنے بیٹوں، بھائیوں اور قریب ترین رشتہ داروں تک کو اذیت ناک مظالم سے معاف نہیں کر رہے تھے۔ اس کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص رعب تھا جو آپ کے مقابلہ میں آخر انہیں بے بس کر دیتا تھا۔" (۶)

معلومات کی فراوانی، حسن ترتیب، اختلافی امور کو استدلال کے ذریعہ حل کرنے اور حضورؐ کی زندگی کے واقعات کو ممکنہ تفاصیل اور جزئیات کے ساتھ پیش کرنے کی وجہ سے یہ اعلیٰ پایہ کے سیرت نگاری کا نمونہ ہے۔ انداز بیان علمی لیکن عام فہم ہے۔ اگرچہ منتشر تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے لیکن دو ایک جملوں کے اضافہ سے انہیں اس طرح مربوط کر دیا گیا ہے کہ سلسلہ بیان میں کوئی سقم نظر نہیں آتا۔

## سلطان با محمد : عبدالماجد دریا بادی : مرتبہ تحسین فراقی : ۱۹۸۲ء : لاہور

عبدالماجد دریا بادی کے سیرت النبیؐ سے متعلق متعدد مضامین "سچ" اور "صدق" میں شائع ہوئے تھے انہیں ڈاکٹر غلام دستگیر رشید نے مرتب کر کے "مردوں کی مسیحائی" کے نام سے شائع کروایا تھا ان میں بعض مضامین کا سیرت سے براہ راست تعلق نہیں تھا۔ کتاب کے نام پر بھی بعض حضرات کو اعتراض تھا مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا کہ

"میں سمجھا تھا کہ اشتہار مقویات ہے۔" (۷)

عبدالماجد دریا بادی ارتداد کی عارضی سراب گردی سے نکل کر ایمان کی طرف لوٹ آئے تھے اس لئے ان کے خیالات میں وہی شدت تھی جو نو مسلموں کے خیالات میں ہوتی ہے ایک بڑے انشا پرداز کا پورا زور قلم ان مضامین میں نظر آتا ہے ان کے اسلوب میں والہانہ پن اور



سپردگی ہے جو جوش بیان اور شدت جذبات کے ساتھ خطیبانہ رنگ اور منطقی استدلال نے مضامین کو ہر اعتبار سے شاہکار بنا دیا ہے۔ اسی باعث محمد ہاشم فرنگی محلی نے ان سیرت مقالات کو نثری نعت کہا ہے۔ (۸) واقعہ بھی یہی ہے کہ نعت کا مقصد وحید بھی منعوت (رسول اللہ) سے ایک شدید قسم کی قلبی وابستگی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ عشق رسولؐ میں ڈوبے ہوئے عبدالماجد دریا بادی نے اس کا حق ادا کیا ہے۔

انہوں نے ایک مقالہ "میلادی روایات" میں اس امر کی تائید کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کی پیدائش کے وقت یا قبل وبعد کچھ خوارق عادت کا ظہور ضرور ہوا ہے اسی طرح رسولؐ کی ولادت کے موقع پر بھی ہوا اور اس کی تائید میں انہوں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مدارج النبوۃ اور شاہ ولی اللہ کی سرور المحزون میں شامل روایات کو مستند قرار دیا ہے۔ اس کتاب کا ایک اہم مضمون "سیرت نبوی اور علمائے فرنگ" ہے اس میں عبدالماجد دریا بادی نے ان تمام مستشرقین کے حوالہ سے جنہوں نے ذات رسول کی سیرت پر قلم اٹھایا تنقید کی ہے مخالفین کا کیا ذکر کارلائل جیسے انصاف پسند کی نظر بھی اس بلندی کو نہ چھو سکی جس پر حضورؐ متمکن تھے وہ بھی انہیں ایک مصلح اور ہمدرد قوم سے زیادہ کا رتبہ نہ دے سکا۔ مولانا کا انداز اس قدر مدلل ہے کہ وہ قاری کو قائل کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

حسن بیان، بہتر معلومات، مخالفانہ وموافقانہ آراء پر استدلال کے ذریعہ ان مقالات کو سیرت نبویؐ کی تفہیم کے سلسلے میں اہم کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔

## سیرت احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ظہور قدسی سے مسجد قبا تک : شاہ مصباح الدین شکیل : ۱۹۸۸ء : کراچی

"سیرت احمد مجتبےٰ" کے مصنف شاہ مصباح الدین شکیل نے ذات رسول اقدسؐ کی زندگی کے ایک دور کو اپنی کتاب کا موضوع بنایا ہے۔ ابتدا ملک عرب کے مختصر جغرافیائی اور معاشرتی وسیاسی حالات سے کی ہے۔ حضورؐ کی ولادت اور اس کے بعد ہجرت یعنی مکہ سے روانہ ہو کر قبا تک پہنچنے کی تفصیلات قلم بند کی ہیں۔ معراج کے واقعہ اور اس کی خصوصیت اور عظمت کے بارے میں بحث دلنشین اور جاذب توجہ ہے۔ کتاب سلیس وشگفتہ زبان اور مؤثر ودلکش پیرایہ بیان کے علاوہ اس کی ترتیب وتہذیب سے بھی مصنف کی خوش ذوقی اور سلیقہ کا پتا چلتا ہے۔ واقعات کے بیان میں تسلسل ہے اور اوصاف حمیدہ کے بیان میں توازن ہے ہر جگہ مصرعوں اور

پرمعنی فقروں سے اپنے بیان کو مؤثر بنایا ہے۔ کتاب کا محدود موضوع ہے لیکن سوانحی نقطہ سے اس کے ساتھ انصاف کیا ہے اور اپنی معلومات کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

### جمال مصطفیٰ (جلد اول، دوم، سوم) : عبدالعزیز عرفی : کراچی : ۱۹۸۹ء

سیرۃ النبیؐ پر حسب توفیق بے شمار اہل قلم اہل علم نے کتابیں لکھی ہیں۔ ایک رجحان یہ بھی رہا ہے کہ آیات قرآنی کی روشنی میں رسول اقدس کے عمل اور سیرت کا جائزہ لیا جائے۔ عبدالعزیز عرفی کی کتاب "جمال مصطفیٰ" میں اسی نوعیت کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلی جلد میں حالات قبل از اسلام، حضور کی عالم ظاہر میں تشریف آوری سے لے کر ابتدائی دور کے حالات پیش کئے ہیں دوسری جلد میں مکی اور تیسری میں مدنی دور کے حالات اور واقعات پیش ہوئے ہیں۔ ان میں مصنف نے یہ التزام رکھا ہے کہ قرآنی آیات کا ترجمہ دیتے ہوئے سیرۃ النبیؐ کے واقعات کو بطور حاشیہ درج کیا ہے۔ اس کوشش میں جو لفظی و معنوی ربط ہونا چاہئے تھا وہ قائم نہیں رکھا جا سکا اور بیشتر دور از کار توجیہہ سے کام لے کر آیت اور سیرت میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً جلد دوم کے آغاز میں سورۂ یونس کی آیات کا ترجمہ دے کر "(۱) مشرکین کے اعتراضات اور آپ کی قبل بعثت زندگی (۲) دشمن رسول مسیلمہ کذاب (۳) آپ کی دعا سے عذاب قہر دور ہوا (۴) قرآن انسانیت کا نقیب اور معجزہ رسولؐ" کی تفصیل بیان کی ہے۔ جب سورۃ کی شان نزول کو مدنظر رکھا گیا ہے تو پھر آپ کی قبل از بعثت کی زندگی کا حوالہ اس کے ضمن میں کہاں سے آسکتا ہے۔ اسی طرح مسیلمہ کذاب کا واقعہ حضورؐ کی مدنی زندگی کے آخری دور سے متعلق ہے لیکن جس طرح کی جدّت طرازی کی گئی ہے وہ نہ تو مربوط ہے اور نہ مؤثر۔ متذکرہ مثال کی طرح کی بے شمار بے اعتدالیوں سے کام لیا گیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے سیرۃ بالقرآن لکھنے کا قصد کیا تھا وہ اس کی مشکلات سے واقف تھے اس لئے بات خیال سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ مصنف نے انہیں کے نظریہ پر سیرۃ مرتب کرنے کی کوشش کی اور بے ربطی مضامین کے اس طرح شکار ہوگئے کہ سیرت نگاری کا حق ادا نہیں کر سکے۔

### سب سے بڑے انسان : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : حکیم محمد سعید : کراچی : ۱۹۸۹ء

بچوں کے لئے کتابیں لکھنا نہایت مشکل فن ہے اس کے لئے نہ صرف بچوں کی ذہنی سطح کا خیال رکھنا پڑتا ہے بلکہ ان کی ذہنی سطح تک اترنا بھی پڑتا ہے۔ حکیم محمد سعید اور ان کے



ادارہ "ہمدرد" نے بچوں کے لئے متعدد کتابیں شائع کی ہیں انہیں میں ایک کامیاب کوشش "سب سے بڑے انسان" ہے یہ مختصر کتابچہ بچوں کے لئے آسان اور سلیس زبان اور شگفتہ و دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔ اختصار کے ساتھ حضورؐ کی پاکیزہ و مقدس زندگی اور عمدہ اخلاق و عادات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ بچوں کے لئے نقش راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ بچوں کی ضروریات کے لحاظ سے قابل تحسین کوشش ہے۔

# باب چہارم (ب)

## اہل فلسفہ و مذہبی شخصیات کی

## مستقل سوانح عمریاں

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

**حیات اسلام: مولانا سید محمد میاں: ۱۹۴۹ء**

مولانا سید محمد میاں نے مولانا حسین احمد مدنی کی سوانح عمری "حیات شیخ الاسلام" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں صاحب سوانح کے حالات زندگی پر روشنی ڈالنے سے زیادہ ان تحریکات اور سیاسی امور کا زیادہ تذکرہ کیا گیا ہے جن سے مولانا مدنی وابستہ رہے۔ اس سے ان کی سیاسی شخصیت ضرور واضح ہو جاتی ہے۔ مولانا کے مذہبی اور قومی رجحانات بھی زیر بحث آئے ہیں۔ مجموعی طور پر سوانح نگاری کا حق ادا نہیں ہوا ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ سوانحی خاکہ کہا جا سکتا ہے۔

**سیرت سجاد : سید احمد حسین ترمذی : لاہور : ۱۹۴۹ء**

حضرت سید سجاد، امام حسین کے فرزند دوم تھے۔ ان کے بڑے بھائی علی اکبر اور چھوٹے علی اصغر کربلا میں شہید ہوئے۔ ان کا نام بھی علی تھا۔ بھائیوں سے امتیاز کی خاطر ان کے نام کے ساتھ "اوسط" استعمال ہوتا ہے۔ وہ امام زین العابدین اور سید سجاد کے نام سے مشہور ہیں آپ کی والدہ شہربانو کا تعلق فارس کے شاہی خاندان سے تھا مصنف نے ان کا شجرۂ نسب بھی بتایا ہے جو نوشیروان عادل سے ملتا ہے۔ امام زین العابدین کے حالات زندگی کے بارے میں زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا ہے۔ معلومات سرسری نوعیت کی ہیں۔ سیرت کے بارے میں وہ کچھ لکھا ہے جو عام طور پر مشہور ہے۔ جن واقعات کو شامل کتاب کیا ہے ان کے ماخذات کا کہیں کوئی حوالہ نہیں۔ اگرچہ واقعات کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن تمام مکتبۂ فکر کے قارئین کو مطمئن کرنے کے لئے اسناد کے حوالے ضرور ہونے چاہئیں۔ مصنف نے نہایت آسان زبان اور سیدھے سادے انداز میں سوانح و سیرت تحریر کی ہے، جو اوسط ذہنی استعداد اور علمیت رکھنے والے قارئین کو متوجہ کر سکتی ہے۔

**امام رازی : عبدالسلام ندوی : اعظم گڑھ : ۱۹۵۰ء**

سوانح نگاری کے دبستان شبلی کی خصوصیت یہ رہی کہ صاحب سوانح کے حالات زندگی کی تفصیلات کی نسبت ان کے علمی، دینی اور دیگر کارناموں کو اجاگر کرنے کی زیادہ سعی کی جاتی ہے۔ علامہ شبلی کے طرز خاص کے پیروین میں مولانا سید سلیمان ندوی کے بعد اہم نام عبدالسلام ندوی کا آتا ہے جس طرز میں علامہ شبلی نے الغزالی تحریر کی تھی اسی طرز میں عبدالسلام نے "امام رازی" کی تکمیل کی ہے اس کا انہوں نے اعتراف بھی کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ

"جس طرح مولانا شبلی مرحوم نے الغزالی میں فلسفہ وکلام کے متعلق امام غزالی کے خیالات

ونظریات کی تشریح کی ہے یہ کتاب اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔"(۹)

کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں پہلے حصے کا تعلق سوانح سے ہے جو مختصر ہونے کے باوجود بنیادی نوعیت کی معلومات فراہم کرتا ہے جس سے صاحب سوانح کے اوصاف واطوار مشاغل' روزمرہ زندگی کی مصروفیات سامنے آجاتی ہیں ان کی عالمانہ شان وشوکت اور خطابت کے جوہر کو واضح کرنے کے لئے متعدد واقعات بیان کئے ہیں۔ صفات کے بیان میں توازن کا خیال رکھا ہے اور صرف خوبیاں بیان کر کے خامیوں سے صرف نظر نہیں کی ہے اور واضح کر دیا ہے کہ اپنی تمام عظمتوں کے باوجود وہ حلیم وبردبار نہیں تھے بلکہ کسی قدر تند مزاج تھے (۱۰) دیگر تین ابواب میں ان کی تصانیف' علوم وفنون پر مہارت اور تفسیر ومسائل دینی کی تشریح کی ہے ان کا تعلق امام رازی کے علمی ودینی کارناموں سے ہے۔ ان میں امام صاحب کے اجتہادات پر زور دیا گیا ہے۔ ان کارناموں کے ذریعے ہی ان کی حقیقی شخصیت سامنے آتی ہے۔

**سید احمد شہید (جلد اول ودوم) : غلام رسول مہر : لاہور : ۱۹۵۱ء**

مولانا غلام رسول مہر اردو کے مایہ ناز محقق ہیں۔ اپنے مطالعہ کی وسعت' نظر کی گہرائی' تجزیہ اور فیصلہ کی قوت کی وجہ سے ان کی تحریریں معیار کے اعلیٰ درجہ پر رکھی جاتی ہیں۔ سید احمد شہید اور ان کی تحریک جہاد کے اذکار تو بہت ہوتے رہے لیکن حقیقت پسندانہ مطالعہ اور پیشکش کی کوشش کبھی نہیں کی گئی مولانا مہر نے جانفشانی اور عرق ریزی کے ساتھ تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ماخذات تک رسائی حاصل کی اس کے لئے پاک وہند کے کتب خانوں کے علاوہ ذاتی ملکیت میں جو دستاویزات ہیں ان کا مطالعہ کیا اور ان کی مدد سے سوانحی حالات' سیرت اور کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ مقدمہ میں ۴۴ نایاب ماخذات کا حوالہ دیا ہے جن میں زیادہ تر غیر مطبوعہ ہیں۔ ہر مخطوطے کے کئی کئی نسخے ان کے پیش نظر رہے جن کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اتنی محنت سے لکھی ہوئی کم کتابیں اردو میں ملیں گی۔

کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے پہلی جلد میں ابتدائی زندگی سے دعوت جہاد تک کے حالات ہیں اس میں ۳۹ ابواب ہیں دوسری جلد عملی جدوجہد کے آغاز سے شہادت تک کے واقعات پر مشتمل ہے جس میں ۳۵ ابواب ہیں۔

ابتدا میں صاحب سوانح کے حسب ونسب اور اجداد کا حال بیان ہوا ہے۔ شجرہ میں بتایا ہے کہ ۳۶ واسطوں سے ان کا نسب امیرالمومنین حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے۔ ان کے اجداد میں کئی بزرگ ایسے گزرے جنہوں نے اسلام کی خدمت کے لئے زندگیاں وقف کر دی تھیں اور اس راہ



حق میں جام شہادت نوش کیا تھا۔ خاندانی روایات اور بزرگوں کے احوال نے کم عمری ہی میں ان کی ذات پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر ان میں جوش جہاد پیدا ہو گیا تھا۔ حصول علم کے ساتھ وہ ورزش بھی کرتے اور فنون حرب پر بھی مہارت حاصل کرتے رہے۔ ان کے کھیلوں میں سب سے دلچسپ "جہاد" ہوتا تھا۔

"بستی کے کم سن لڑکوں سے ایک لشکر اسلام جمع کرتے بہ طور جہاد بہ آواز بلند تکبیریں کہتے ہوئے ایک فرضی لشکر کفار پر حملہ کیا کرتے تھے اور "وہ مارا" "یہ فتح ہوا" کی صدائیں لشکر اسلام سے بلند ہوتی تھیں۔"(۱۱)

مصنف نے اس عام خیال کی تردید کی ہے کہ سید احمد شہید پڑھے لکھے نہیں تھے۔ انہوں نے شواہد سے ثابت کیا ہے کہ وہ علم دین سے خوب واقف تھے باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی عربی اور فارسی پر بھی عبور رکھتے تھے۔ انہوں نے زندگی اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی شہر شہر' قریہ قریہ گھوم کر تبلیغ اور اصلاح کا کام انجام دیتے رہے۔ شمالی ہند کا شاید ہی کوئی شہر ہو جہاں ان کے عقیدت مندوں کی تعداد ہزاروں میں نہ رہی ہو۔ مصنف نے بیشتر شہروں میں ان کے قیام کے زمانے اور امراء اور عوام سے ان کے روابط کا حال قلمبند کیا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں جذبۂ جہاد بیدار کیا۔ ان کے موقف کے مطابق جہاد بغیر امام کے جائز نہیں اس لئے امامت کے لئے خود کو پیش کیا لوگوں سے بیعت جہاد لی اور میدان عمل میں اتر گئے یہاں تک کہ شہادت پائی۔

مصنف نے ادوار حیات کو درجہ بدرجہ اس طرح بیان کیا ہے کہ تسلسل زمانہ باقی رہا ہے۔ معلومات کی کثرت کا یہ حال ہے کہ کہیں بھی جزئیات کو فراموش نہیں کیا ہے جہاں روایات میں اختلاف رہا ہے وہاں مستند ماخذ سے صحیح صورتحال پیش کی ہے۔ سید احمد شہید ایک شخصیت بھی ہیں اور تاریخی کردار بھی! عموماً" ہر ایک کا احوال جداگانہ اس طرح پیش کیا جاتا رہا ہے کہ شخصیت پر عقیدت چھائی رہی وہ فوق البشر بنتے رہے اور ان کے کارناموں کو مبالغہ کی انتہائی حدوں تک پہنچا دیا گیا تھا جس کسی نے انہیں تاریخی کردار بنایا وہ وقائع نگاری سے آگے نہ بڑھ سکا مولانا مہر نے کامیابی سے حقیقت پسندانہ وقائع نگاری بھی کی ہے لیکن کتاب کو تاریخ نہیں بننے دیا واقعات سے شخصیت کی تعمیر بھی کی ہے۔ عقیدت کے باوجود ان کے قلم سے کوئی بات خلاف واقعہ ظاہر نہیں ہوئی اور انہوں نے اس بات کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کیا ہے کہ صاحب سوانح کی شہادت واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ روپوش ہیں اور کسی بھی وقت ظہور فرمائیں

گے۔ ان کا کہنا ہے کہ

"ان تصورات یا معتقدات پر نہ بحث کی ضرورت ہے اور نہ بحث مناسب معلوم ہوتی ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ مجاہد کبیر و غازی شہید سید احمد بریلوی ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہو گئے اور جس دعوت کو لے کر کھڑے ہوئے تھے اس پر اپنے خون سے سچائی کی مہر لگا دی۔ نہ غائب ہوئے تھے اور نہ ان کے ظہور کا انتظار کرنے کی کوئی عقلی و شرعی وجہ موجود تھی۔" (۱۲)

باوجود اس کے کہ واقعات کے ذریعہ سید احمد شہید کی سیرت کے نقوش جگہ جگہ ابھر گئے ہیں۔ مصنف نے انہیں ایک باب میں یکجا بھی کر دیا ہے اس میں ان کی جسمانی قوت، فنون حرب سے واقفیت، مقصد حیات کی وضاحت، عبادت و ریاضت، رضا بہ قضا، عفو و درگزر، حلم، حیا، مروت، شجاعت، فراست، سخاوت، صبر و استقامت، توکل، رحم جیسے ظاہری اور باطنی اوصاف کو شہادتوں اور اسناد کے ساتھ پیش کیا ہے۔

معلومات کی فراہمی میں جانکاہی، ان کی ترتیب و تدوین میں مہارت کے علاوہ عبارت میں عالمانہ سنجیدگی اور وقار نے اس کتاب کو ایک اہم علمی کاوش اور کامیاب سوانح بنا دیا ہے۔

**حکیم الامت : نقوش و تاثرات : عبدالماجد دریا بادی : اعظم گڑھ : ۱۹۵۲ء**

مولانا اشرف علی تھانوی بیک وقت عالم دین، مفسر قرآن، حکیم و دانشور، فقیہ و متکلم، محدث و واعظ، صاحب عرفان اور شیخ طریقت تھے۔ ایسے ہمہ گیر شخصیت پر قلم اٹھانا اور تحریر کا حق ادا کرنا آسان نہیں۔ عبدالماجد دریا بادی بیعت تھے مولانا حسین احمد مدنی سے لیکن انہیں سب سے زیادہ عقیدت حکیم الامت سے تھی۔ اس عقیدت کے باوجود انصاف کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا جو عبدالماجد دریا بادی کا کارنامہ ہے۔

ایک مبصر ہی کے لئے نہیں بلکہ مصنف کے لئے بھی یہ مسئلہ بنا رہا کہ اس کتاب کو کس صنف میں شامل کیا جائے۔ ۵ ستمبر ۱۹۵۲ء کے صدق جدید میں خود اپنی کتاب پر مفصل تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"پہلی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ضخیم کتاب اول سے آخر تک پڑھ جائیے یہی نہ کھلے گا کہ کتاب ہے کس موضوع پر اور اسے آخر کس فن کے تحت میں لائے، حیات و سوانح عمری؟ سفرنامہ؟ مجموعۂ مکاتیب؟ تصوف یا کلام؟ کتاب المناقب؟ ملفوظات؟ مجالس؟ آخر کیا؟ ابھی خطوط نقل ہو رہے ہیں کہ ملفوظات چھڑ گئے۔ بیان ابھی علمی تحقیقات کا ہو رہا تھا کہ ذکر مصنف کی



بالکل نجی اور گھریلو حالات، بیوی بچوں کی علالت وغیرہ کا شروع ہو گیا۔ نقل تفسیر کے مقامات ہو رہے تھے کہ سیاسیات کے تذکرے آ گئے۔ گفتگو عقلیات و کلامیات پر جاری تھی کہ تبصرۂ شعر و ادب ہونے لگے۔ تشبیب ابھی قصیدے کی شروع ہی ہوئی تھی کہ معاً "گریز کی باری آ گئی۔" (۱۳)

مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں صراحت کی ہے کہ

"ان کی عمر کے آخری ۱۵، ۱۶ سال کے زمانہ میں اس نامہ سیاہ کو ان سے نیاز اور اپنی بساط کی حد تک گہرا نیاز حاصل رہا اور اس نے لمبے تجربے اور سابقے میں انہیں بہترین انسان پایا۔ بس ان کی اسی انسانی زندگی کا ہلکا سا عکس ان نقوش و تاثرات کے اندر بند کر دینے کی کوشش الٹی سیدھی آپ کو یہاں ملے گی۔" (۱۴)

اپنے مرشد کا مطالعہ اور جائزہ بحیثیت انسان کر کے مصنف نے ایک طرز نو کی بنیاد رکھی ہے۔ انہوں نے حکیم الامت سے تعلق باطنی و داخلی کو حجاب اور نقاب نہیں بننے دیا۔ یہی اس کتاب کی بڑی خوبی ہے جہاں حکیم الامت سے عقیدت کے موتی پروئے ہیں وہیں فقہی، کلامی، تفسیری اور ادبی مسائل پر اختلاف بھی کیا ہے۔

حکیمانہ اور علمی نکات پر بحث کے ساتھ حکیم الامت کے مزاج، میلانات، شخصیت، لباس، چال ڈھال، معمولات غرض تمام پہلوؤں کو ایسے بے مثال انداز میں پیش کیا ہے کہ کتاب ایک آئینہ بن گئی ہے جس میں صاحب سوانح کا مکمل عکس نظر آتا ہے۔ واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تمام جزئیات کے ساتھ تصویر سامنے آ جاتی ہے محاکات کا کامیاب انداز اس میں موجود ہے۔ کتاب میں سوانحی ترتیب موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے باضابطہ سوانح کے اصولوں پر یہ کتاب پوری نہیں اترتی۔ اس میں نہ ابتدائی حالات ہیں نہ تعلیم نہ اساتذہ، کتب سے فیض کا ذکر ہے۔ نہ عہد جوانی کے کوائف بیان ہوئے ہیں نہ شادیوں کے بارے میں معلومات ہیں۔ والدین اور اجداد کی تفصیل بھی نہیں ہے جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان میں بھی کوئی ترتیب زمانی نہیں ہے۔ یہ محض مصنف کے دیدہ کی روداد اور ذہن میں محفوظ باتوں کی بازیافت ہے۔ معارف کے تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ

"حضرت حکیم الامت کی علمی و دینی، اخلاقی و روحانی عظمت و جلالت مسلم اور کسی کے اعتراف و داد تحسین سے بے نیاز ہے لیکن اگر قلم سے اس کی مصوری ممکن ہو تو اس سے بہتر موقع تیار نہیں کیا جا سکتا۔" (۱۵)

اس کی ایک اور منفرد خصوصیت ہے جو مصنف نے بیان کی ہے۔

"اور یہ لطیفہ بھی خوب ہے کہ کتاب جتنی اپنے مخدوم و محترم "ہیرو" (موضوع تصنیف) کے حالات میں ہے تقریباً" اسی قدر کتاب نویس کا بھی "کچا چٹھا" ہے۔ تصویر کشی میں ندرت وحلاوت و دلکشی کچھ اس بلا کی نکلی کہ مصور خود اپنے کو مسلسل بے نقاب کرتا چلا گیا۔" (۱۶)

تیرے نقشہ میں قیامت کا اثر ہے ظالم
خود کھنچا آتا ہے نقاش بھی تصویر کے ساتھ

عام طور پر اسے سوانحی ادب میں شامل کیا جاتا ہے لیکن فن کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ شخصیت وسیرت نگاری کا کامیاب تجربہ ہے۔

### خواجہ دستگیر : محمد مسلم احمد نظامی : دہلی : ۱۳۷۵ھ م ۱۹۵۵ء

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی جو خواجہ دستگیر' بڑے پیر یا پیران پیر کے نام نامی سے شہرت رکھتے ہیں مسلمانوں میں نہایت قابل تعظیم ہستی ہیں۔ حضرت کی ذات بابرکات کی سوانح عمری تحقیق اور تجسس کے ذریعے لکھنے کے بجائے عوام کی خوشنودی کی خاطر ان کے کشف وکرامات' ارشادات اور ملفوظات پر انحصار کیا گیا ہے حالات زندگی برائے نام ہیں۔ طرز بیان پُرجوش عقیدت غالب ہے۔ ممکن ہے عوام اس سے متاثر ہوں لیکن یہ کتاب سوانح نگاری کے فن کو ملحوظ رکھ کر تصنیف نہیں کی گئی ہے۔

### سیرت اشرف : منشی عبدالرحمان : ملتان : ۱۹۵۶ء

مولانا اشرف علی تھانوی موجودہ صدی کے جید عالم دین تھے جن کے مریدین اور عقیدت مند اقصائے پاک وہند میں ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے حالات زندگی اور سیرت پر عزیز الحسن ندوی کی جامع تصنیف جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے مولانا کی زندگی میں شائع ہو چکی تھی۔ اس موضوع پر دوسری اہم کتاب مولانا عبدالماجد دریا بادی کی تالیف "حکیم الامت" ہے ان کے علاوہ بھی متعدد کتابچے اور رسائل شائع ہوئے۔ منشی عبدالرحمان نے ما قبل شائع شدہ کتابوں کی مدد سے "سیرت اشرف" مرتب کی ہے اس میں مولانا تھانوی کے سوانح ان کے اخلاق وسیرت' عادت وفضائل' کمالات وخصوصیات اور علمی ومذہبی کارناموں کو بڑی جامعیت لیکن اختصار کے ساتھ مرتب کیا ہے سوانحی حالات نسبتاً" مختصر ہیں ان کی نوعیت خلاصہ کی ہے کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر موضوع کے لئے الگ عنوان قائم کیا گیا اور اس کی ذیل میں ضروری معلومات فراہم کی ہیں اس لئے مولانا اشرف تھانوی کے حالات اوصاف اور کارناموں



کے حوالے سے جس امر کی تلاش ہو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں نئی معلومات کم ہیں لیکن شائع شدہ حالات وکوائف واوصاف سے سلیقہ سے استفادہ کیا گیا ہے اسے متعدد کتب' مضامین' رسائل اور کتابچوں کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔

### شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ : سید ابوالحسن علی ندوی دارالمصنفین' اعظم گڑھ : ۱۹۵۷ء

اسلام کے مشہور عالم و مصلح شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کو اردو طبقہ سے متعارف کروانے کی اولین سعی علامہ شبلی نعمانی نے کی تھی انہوں نے ۱۹۰۸ء میں الندوہ میں جو سلسلہ "مجددان اسلام" کا شروع کیا تھا اس کے ضمن میں ابن تیمیہ کی سوانح پر ایک مضمون لکھا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے "تذکرہ" (۱۹۱۹ء) میں ان کی تعلیمات اور مقام دعوت اور عزیمت کا ذکر کیا اگرچہ سیرت لکھنے کا خیال ظاہر کیا جو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا۔ غلام رسول مہر نے مولانا آزاد کے خیال کو عملی صورت میں "سیرت امام ابن تیمیہ" کے نام سے (۱۹۲۵ء) میں پیش کیا۔ ان میں ابتدائی کوششوں کے بعد سید ابوالحسن علی ندوی نے جامع تالیف کی۔ اس میں حضرت شیخ اسلام کی زندگی کے تمام پہلو پوری صحت اور تحقیق کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ کتاب کے مطالب ومباحث کو گیارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ مصنف حضرت شیخ الاسلام سے خاص رشتہ مودّت اور ان کے علوم معارف پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی ذات سے عقیدت وارادت' ان کے علوم واوصاف پر نظر و تبحر اور خصائص سیرت اور علم وعمل کے کمالات سے عشق کا اظہار مصنف کے ایک ایک جملے ہوتا ہے بزرگان دین اسلام کی ستائش اور ان کے کارناموں کے تعارف کے سلسلہ میں جو خاص انداز تحریر مروج رہا ہے وہ اپنی پوری شان کے ساتھ اس میں موجود ہے۔ اگرچہ کتاب کا بڑا حصہ دعوت وعزیمت کے بارے میں ہے پھر بھی امام موصوف کی سوانح وسیرت کے کسی پہلو سے صرف نظر نہیں کیا گیا۔

### سیرت سید احمد شہید : ابوالحسن علی ندوی : لاہور : ۱۹۵۸ء

سیرت سید احمد شہید کی پہلی بار اشاعت ۱۹۳۹ء میں ہوئی تھی اس کے بعد ہر اشاعت میں ایسی ترامیم اور غیر معمولی اضافے ہوتے رہے کہ ہر ایڈیشن میں تازہ تصنیف کی شان پیدا ہو گئی یہاں تک کہ چوتھا ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۵۸ء) ایک مستقل اور جامع تصنیف کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ یہ مصنف کی ۲۰' ۲۲ سال کی تلاش وجستجو کا حاصل ہے۔ کتاب ۲۵ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں خاندان کے حالات اور سید صاحب کی پیدائش' ابتدائی تعلیم' سفر لکھنؤ' دلی کے

تین سفر کی مکمل روداد' دو آبے کے علاقہ میں تبلیغ اسلام کی مساعی' مشرقی اضلاع کا دورہ اہم اصلاحی کام' حج کے لئے روانگی کے دوران مرزا پور' بنارس' کلکتہ اور مکہ معظمہ کے حالات' سرزمین حجاز کی مصروفیات' واپسی' جہاد کے اسباب ومقاصد' عزم جہاد کے ساتھ ماڑواڑ سے سرحد تک کا سفر' سندھ' شکار پور' شالی' پشاور' چمکنی' نوشہرہ میں قیام' اکوڑے کی جنگ' حضرو کا چھاپہ' جہاد کا آخری معرکہ اور شہادت غرض کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو تشنہ رہ گیا ہو۔ جن نایاب ماخذات سے استفادہ کیا گیا ان کے حوالوں سے ہر امر کو مستند بنا کر لکھا ہے۔ انداز تحریر پروقار اور مؤثر ہے۔ بربنائے عقیدت جوش وجذبے سے کہیں کام نہیں لیا گیا۔ مولانا مہر اور مصنف اس کام میں ایک دوسرے کے معاون رہے۔ دونوں مصنفین کا نقطۂ نظر اور انداز بیان ایک ہی رہا ہے ابوالحسن علی نے کوشش کی ہے کہ مولانا مہر جن تفاصیل میں نہ جاسکے یا جن ماخذ تک ان کی رسائی نہ ہو سکی اس کتاب میں شامل کر لئے جائیں۔ ان دونوں مصنفین کی کتابوں کو یکجا کر دیا جائے تو سید احمد شہید کے حالات اور کارنامے تمام تر تفصیل اور جامعیت کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔

**سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری : سید محمد الحسینی : لکھنؤ : ۱۹۵۸ء**

برصغیر پاک وہند کی ۲۰ ویں صدی کی تاریخ میں ندوۃ العلماء کا قیام ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے اور یہ مولانا محمد علی مونگیری کے رفیع تخیل کا مرہون منت ہے انہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا۔ اس کے مقصد و وسائل کی تنقیح کی۔ قدیم نصاب میں علوم عالیہ (صرف ونحو ومنطق) کے غلبہ اور کتب معقولات کی بے جا کثرت پر جرأت مندانہ تنقید کی۔ مسلمانوں کے لئے عربیت میں کمال اور علوم اسلامیہ میں مہارت خصوصی پر زور دیا۔ فقہ کی تدوین جدید اور جدید مسائل وضروریات پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت کی نشاندہی کی۔ وہ ایک انقلابی فکر کے مالک تھے علوم اسلامی ہی نہیں امور تنظیم پر بھی ماہرانہ قدرت رکھتے تھے۔ ان باکمال شخصیت کے سوانحی حالات سید محمد الحسینی نے اپنی کتاب "سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری" میں تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ندوۃ العلماء نے بیسیوں مصنف اور اہل قلم پیدا کئے جنہوں نے سیرت نگاری اور تذکرہ نگاری کا ایک نیا دبستان قائم کیا۔ مصنف اسی دبستان سے ذہنی مطابقت رکھتے ہیں اور ماقبل سوانح وسیرت نگاروں کی پیروی میں واقعات کی صحت' بیان کے تسلسل' کارناموں کی تنقیح اور دیگر تمام امور کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنے فرض کو نبھایا ہے۔ صاحب سوانح کے ذہنی رجحان' اسلام سے رغبت اور تعلیم سے دلچسپی کے عناصر کو اجاگر کرنے کے لئے سلسلۂ نسب' خاندان' اسلاف کے اوصاف کا بھی تذکرہ کیا ہے تاکہ تاریخی' خاندانی اور



معاشرتی پس منظر میں ان کی شخصیت کی مکمل صورت گری ہو سکے۔ مولانا کے ابتدائی حالات زندگی اور تعلیم کے مکمل کوائف باب اول میں درج کرنے کے بعد دوسرے اور تیسرے ابواب میں ان واقعات کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے جن سے متاثر ہو کر مولانا کے ذہن میں نئی اسلامی تحریک کا خیال پیدا ہوا۔ ان میں ایک اہم تاثر عیسائیت کی تبلیغ اور اسلام پر اعتراضات سے مرتب ہوا' جس کے شر سے مسلمانوں کو بچانا ضروری تھا اور اس کے لئے لازم تھا کہ آنے والی نسلوں کو راہ حق پر ثابت قدم رکھنے کے لئے ان کے شعور کو حقیقی روح اسلام سے واقف کروایا جائے دوسرا امر جس نے مولانا کو متاثر کیا وہ مسلمانوں کے درمیان معمولی اور چھوٹے اختلافات کو بڑھا چڑھا کر ایسا نزاع پیدا کرنے کا عام رجحان تھا جس سے تکفیر کے قلمدان کھل جاتے یا باہم دست وگریباں ہوتے کہ مقدمات عدالتوں تک جا پہنچتے اور فریقین کی معاشی زبوں حالی کا سبب بنتے۔ مولانا نے تکمیل تعلیم کے بعد جب مسلمانوں کے عمومی حالات کا جائزہ لیا تو انہیں اصلاح کی تحریک شروع کرنے کی توفیق ہوئی۔ مصنف نے عمومی حالات کا بہت تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے اگرچہ قاری کے ذہن کو تیار کرنے کے لئے اس کی ضرورت تھی لیکن اختصار سے کام لینا مناسب تھا۔ فن کے نقطۂ نظر سے یہ طویل بیان سوانح نگاری کی ضرورت قرار دیا جاسکتا ہے لیکن سوانح کا حصہ نہیں بن سکتا۔

علم کی فراوانی اور نظر کی وسعت نے مولانا کو ہر نوع کے تعصبات سے بالاتر کر دیا تھا سیرت کے اس پہلو کی وضاحت کے لئے جو مصدقہ واقعات بیان کئے گئے ہیں متاثر کن ہی نہیں سبق آموز بھی ہیں۔

کتاب کے چوتھے باب میں ندوۃ العلماء کے قیام' اس کی نظامت کی ذمہ داری نبھانے کے حوالے سے ان کی تمام کوششوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اس کی ترقی کا سبب بنے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب فکر ہی نہیں صاحب عمل بھی تھے۔ ندوہ کے ابتدائی دنوں میں جن علماء کی وابستگی کا حال ملتا ہے ان میں ہر ایک منتخب اور جید علم تھا۔ یہ بانی کی پُرخلوص نیت کا فیض تھا کہ اسلامی ہند کے آفتاب وماہتاب نے دست تعاون بڑھایا اور تمام مسلمان رہنما کو اس کا گرویدہ بنائے رکھا۔ ندوہ کو متعارف وروشناس کروانے کے لئے مولانا محمد علی کو کس قدر کاوش کرنی پڑی اس کی تفصیلات بھی درج ہیں اور متعدد اجلاسوں کی کارروائیاں بھی دی گئی ہیں۔ ندوہ کے قیام کے وقت جن دشواریوں کا سامنا تھا ان میں سب سے اہم نصاب کا تعین تھا مولانا کی خواہش تھی کہ انگریزی زبان' تاریخ اقوام عالم' فلسفۂ جدید اور علم الکلام جدید بھی نصاب میں داخل ہوں لیکن

اس وقت ان شعبوں کی مستند کتابیں موجود نہ ہونا سد راہ تھا۔ وہ تو انقلاب انگیز نصاب جاری کرنا چاہتے تھے اس کو مرحلوں میں تقسیم کردیا تھا مگر یہی بات ان سے دوسرے لوگوں کے اختلاف کا سبب بھی بن گئی۔ مصنف نے اس امر کو واضح کیا ہے کہ صاحب سوانح کو مقصد سے محبت تھی اعزاز سے نہیں۔ اس لئے اختلاف کی صورت میں کسی بحث میں پڑنے پر انہوں نے ہمیشہ اپنے قائم کئے ہوئے ادارہ سے بے تعلق ہوجانے کو ترجیح دی جن حضرات سے اختلاف کی وجہ سے وہ بددل ہوئے ان میں نمایاں شخصیت علامہ شبلی کی تھی۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۲۱ھ م ۱۹ جولائی ۱۹۰۳ء کو ان کا استعفیٰ منظور ہوگیا۔ مصنف نے مولانا کی تصانیف کا تعارف بھی کروایا ہے اور قادیانیت کے مقابلہ میں ان کی سعی کا بھی ذکر کیا ہے۔

باب ششم ان کی سیرت کے لئے وقف ہے۔ اس میں تعلق باللہ' مرشد سے تعلق' استغنا وعالی ظرفی' امراء کی دعوت قبول کرنے سے اجتناب' عام وعظ اور تقریر سے بے رغبتی' درویشی میں سلطانی' ترک دنیا کے بجائے اصلاح دنیا کا جذبہ' "عشق رسول" نماز سے عشق اور مزاج کی نفاست کا حال ملتا ہے۔

انداز تحریر میں سنجیدگی و وقار ہے۔ اختلافی مباحث کے بیان میں استدلال سے کام لیا ہے جذبات سے نہیں۔ مولانا محمد علی کی حیات کے ادوار بالترتیب معاشرتی اور ذہنی حالات کے پس منظر میں اس طرح بیان ہوئے ہیں کہ کتاب کے زیادہ تر حصہ پر سوانح نگاری اور سیرت نگاری کا ہنر غالب ہے۔ صاحب سوانح کے خارجی حالات کے علاوہ ان کے ذہن و شعور و فکر کو بھی سمجھنے اور متعارف کروانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

**امام ابن تیمیہ : شمس العلماء محمد یوسف کوکنی عمری : مدراس : اگست ۱۹۵۹ء**

امام ابن تیمیہ مسلمانوں میں ایسی نابغہ روزگار ہستی تھے ان کے ہم عصر صاحبان علم اور بعد کی نسلوں کے تمام علماء و مفکرین نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں ان کی عظمت کا اعتراف اور ان کی دعوت عزیمت کا ذکر مولانا ابوالکلام نے "تذکرہ" میں ایسے دلنشین اور مؤثر انداز میں کیا ہے کہ اکثر اہل علم کی توجہ ان کے احوال و آثار کی طرف مبذول ہوگئی۔ اردو میں ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی جس سے امام ابن تیمیہ کا جامع تعارف ہو سکتا۔ عربی میں ایک ضخیم اور مفصل کتاب محمد ابوزہرہ' پروفیسر فواد یونیورسٹی' مصری تھی جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں میں عربی دان حضرات برائے نام ہیں اس لئے ضرورت تھی کہ اردو میں ان کے بارے میں تصانیف شائع ہوں۔ اگرچہ رئیس احمد



جعفری نے محمد ابوزہرہ کی کتاب کا اردو ترجمہ ۱۹۶۱ء میں شائع کیا اس سے قبل ہی مدراس یونیورسٹی کے (سابق) ریڈر عربی' فارسی و اردو شمس العلماء محمد یوسف کوکن نے اس شخصیت کے احوال و آثار میں ایک جامع وبسیط کتاب مرتب کرکے ۱۹۵۹ء میں شائع کی۔ اس بارے میں انہوں نے لکھا کہ

"تحقیقاتی کام میں تربیت حاصل کرنے کی غرض سے خاکسار کو دارالمصنفین اعظم گڑھ بھیجا گیا جب وہاں پہنچا تو حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے ۱۹۳۷ء میں میرے لئے "سوانح ابن تیمیہ" کا موضوع تجویز کیا دو سال کی مسلسل محنت کے بعد میں نے ابن تیمیہ کی سوانح حیات مرتب کرلی۔" (۱۷)

تعلیمی مصروفیات اور فکر معاش کی وجہ سے امام کے علمی اور اصلاحی کارناموں پر تحقیق میں دیر ہوئی جو کام ذوق وشوق اور اطمینان خاطر سے کیا جاتا ہے وہی ہر اعتبار سے لائق تحسین ہوتا ہے چنانچہ یہ کتاب بھی اس موضوع پر معیار کے درجہ کمال پر ہے۔

مصنف نے امام احمد ابن تیمیہ کے آبائی وطن حران کی تاریخ اور اسلاف میں ابوالقاسم الخضر بن محمد الخضر بن محمد بن عبداللہ سے امام کے والد شہاب الدین ابوالمحاسن عبدالحلیم ابن تیمیہ (۳۶۷ھ تا ۶۸۲ھ) تک کے بزرگوں کے حالات تفصیل سے درج کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے ان میں ہر ایک بحر علوم تھے۔ قرآن اور حدیث کا جامع علم رکھتے تھے اور قوائے ذہنی کے اعتبار سے عام آدمیوں سے کہیں بلند تھے۔ یہ اوصاف توارث میں منتقل ہوتے رہے یہاں تک کہ شیخ تقی الدین ابوالعباس احمد بن تیمیہ (۶۶۱ھ تا ۷۲۸ھ) تک پہنچے۔ ان کی ولادت بھی حران میں ہوئی۔ چھ سال کی عمر میں والد کے ساتھ ترک وطن کرکے دمشق چلے گئے۔ ان کی تعلیم کی ابتدا حراں میں ہوئی لیکن تکمیل دمشق میں ہوئی۔ علم سے رغبت اور کتاب سے شغف کے حوالے سے جو واقعات درج کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کم عمری ہی میں "علم" کی اہمیت و افادیت سے واقف ہوچکے تھے اور اس کے حصول کو دنیا کی ہر نعمت پر ترجیح دیتے تھے انہوں نے حدیث کے موضوع کو خصوصی اہمیت دی تھی اور قریب پچاس معتبر راویوں سے سن کر حدیثیں جمع کی تھیں۔ ان کے مطالعہ کی وسعت میں عربی ادب' صرف و نحو' معانی و بیان و بدیع' حدیث' فقہ' فرائض' ریاضی' جبر و مقالہ' اقلیدس' فلسفہ' کلام اور منطق بھی شامل تھے۔ خدا نے ذہن ایسا دیا تھا کہ وہ جو تحریر ایک بار نظر سے گزر جاتی من و عن محفوظ رہ جاتی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف ہوگئے اور ۵۰۰ کتب مختلف

موضوعات پر اپنی یادگار چھوڑیں۔ وہ صاحب قلم ہی نہ تھے بلکہ صاحب سیف بھی تھے۔ تاتاریوں کے خلاف جنگ میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ مصنف نے ان کے کارناموں تفسیر قرآنی' رد شرک وبدعت' فقرائے رفاعیہ کے ساتھ مناظرے' فتنۂ عقائد کا دفعیہ' صوفیہ پر تنقید' یہودیت اور نصرانیت کی تردید' علوم عقلیہ پر نقد' شخصیت پرستی سے انکار کے بارے میں پوری پوری تفصیل درج کردی ہے لیکن سوانح نگاری کے فن کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا۔ جو واقعات بیان کیے گئے وہ کارناموں کے ضمن میں آتے ہیں ان میں تاریخی تسلسل ہے اور نہ گھریلو اور نجی زندگی کے بارے میں معمولی سا بھی اشارہ' البتہ کتاب کے آخر میں "ذاتی اوصاف اور اخلاق وعادات" کے زیر عنوان روزانہ کی معمولات' ذوق مطالعہ' تبحر علمی' خطابت' حق گوئی وبے باکی' شجاعت وبہادری' حدت وشدت' عاجزی وانکساری' زہد واتقا' ایثار وسخاوت' عبادت' عفو ودرگزر' کشف وکرامات اور فراست پر روشنی ڈالی گئی ہیں۔ ان کی مدد سے شخصیت کا ایک خاکہ ضرور مرتب ہو جاتا ہے۔ متاہل زندگی کے بارے میں ایک لفظی اشارہ بھی کہیں نہیں ملتا۔

تاریخی اور علمی معلومات کی فراہمی' امام کے کارناموں کے اذکار اور ان کے تجزیے کے حوالے سے یقیناً یہ ایک لاجواب کوشش ہے لیکن سوانح نگاری کا حق ادا نہیں کرتی۔

**صدیق اکبر : سعید احمد اکبر آبادی : طبع اول : ۱۹۵۷ء : طبع دوم : کراچی : ۱۹۶۱ء**

صاحب سوانح کا نام عبداللہ' کنیت ابوبکر اور عتیق' لقب صدیق اکبر' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اول ہیں جن کی ذات بابرکات مذہبی اور تاریخی اعتبار سے مسلم اور اہم ہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی جو اس سوانح عمری کے مصنف ہیں خود بھی جید عالم شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے خلیفۃ الرسول کی نہایت مفصل ومبسوط سوانح عمری جس میں آپ کے ذاتی حالات وسوانح' عظیم الشان کارناموں' دینی اور سیاسی خدمات جلیلہ' اخلاق ومکارم اور عہد صدیقی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات کے علاوہ اس دور کے اہم دینی' سیاسی' فقہی اور تاریخی مباحث ومسائل پر بڑی جامعیت اور تحقیق سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ مقدمہ میں متقدمین ومتوسطین کی ان تصانیف کا ذکر کیا ہے جو یا تو صدیق اکبر سے متعلق ہیں یا جن میں ان کے بارے میں بکثرت معلومات درج ہیں۔ ان میں بیشتر غیر مطبوعہ ہیں اور مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ مصنف نے ان سب سے استفادہ کیا ہے صحیح روایات کو بلا رد وقدح قبول کرلیا اور اختلاف کی صورت میں دیگر اسناد کا حوالہ دے کر محاکمہ کے بعد مسترد کردیا ہے۔



سوانحی حالات کو ابواب میں تقسیم نہیں کیا گیا ہے واقعات تاریخی تسلسل میں لکھے گئے ہیں "مقدمہ" میں قدیم تواریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ان میں قابل اعتبار اور ناقابل اعتبار کی حد بندی کردی ہے اور بعض متنازع فیہ مسائل کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ خصوصیت سے اس امر پر توجہ دی گئی ہے کہ حضرت علی نے خلیفہ اول کی بیعت کی تھی یا نہیں۔ اگر کی تھی تو کب؟

کتاب کے پہلے حصے میں صاحب سوانح کی پیدائش' ان کے والدین اور خاندان کے دیگر بزرگوں کا تعارف ہے جس کے ذریعے وضاحت کی گئی ہے کہ قبل ظہور اسلام بھی یہ خاندان بلند مرتبہ کا حامل تھا اور صاحب سوانح کی رسول پاکؐ سے رشتۂ دوستی اور مودّت استوار تھا۔ آپ کے تاہل کا بیان نہیں ہوا ہے لیکن اس حصے میں حضرت عائشہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح جن حالات میں ہوا اس کا ذکر موجود ہے۔ دوسرا حصہ ہجرت مدینہ اور اس کے بعد کے واقعات میں ہے تیسرے حصے میں مدنی زندگی بیان ہوئی ہے اس کے ضمن میں غزوات بدر' احد' خندق' بنی مطلق' خیبر' حنین' طائف' ذات السلاسل' تبوک وغیرہ کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ اس حصہ کا خاتمہ حجۃ الوداع نبوی پر ہوا ہے۔ اگلے حصے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کے حالات وواقعات ہیں۔ ضمناً" خلافت کی شرعی نوعیت' صاحب سوانح کے استحقاق خلافت اور حضرت علی کی بیعت کرنے یا دیر سے کرنے پر سیر حاصل معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر حصوں میں دور خلافت کے کارناموں' اس دور میں ارتداد اور بغاوت اور اس کے اسباب' مدعیان نبوت کی سرکوبی' جنگی اقدامات' فتوحات' نظام حکومت اور وفات کی سرخیوں کے تحت تاریخی مواد یکجا کیا ہے۔

ان کے انتظامی کارناموں کا ذکر بالکل آخر میں ہے جس میں مالی نظام' فوجی نظام' تعزیرات اور حدود اور دینی خدمات میں جمع قرآن' اجتہاد اور قیاس' علمی مفاخر وکمالات کے علاوہ سیرت وکردار' فضائل ومناقب' ازدواج اور اولاد بیان ہوئے ہیں۔

سوانح عمری اس انداز سے لکھی گئی ہے کہ واقعات زندگی اور تاریخ ایک ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ جن اہم واقعات کا ذکر آیا ہے ان کے ماخذ کی نشاندہی بھی کردی ہے۔ مصنف نے جس کثرت سے حوالے دیے ہیں ان سے ان کے وسیع مطالعہ اور ذوق تحقیق کا پتا چلتا ہے۔ متنازع امور کی بحث میں جانبداری یا مناظرہ کی صورت پیدا نہیں ہونے دی۔ ان کے بارے میں مصنف کا رویہ منطقی' استدلالی اور لہجہ ملائم اور نرم ہے جو کسی بھی قاری کو ناگوار نہیں گزرتا بلکہ فکر

دعوت دیتا ہے۔

سیاسی حالات کے تسلسل ہی میں ملکی، مالی، فوجی اصلاحات اور خانگی زندگی، شادیوں اور اولاد کی ولادت کا ذکر ہونا چاہئے تھا۔ وفات کا واقعہ لکھنے کے بعد ان امور کا ذکر خیالات کو تقسیم کرنے کے مترادف ہے۔ یہ جداگانہ حصے بن گئے ہیں جبکہ ایک دوسرے میں انہیں مدغم ہو جانا چاہئے تھا۔

مصنف نے صاحب سوانح کے علمی تفاخر و کمالات کے ضمن میں علم الانساب میں مہارت، ایام العرب پر عبور، ذوق شعر و سخن، تحریر و تقریر میں ملکہ، فن کتابت سے لگاؤ اور خصوصی طور پر عشق رسول کی کیفیات۔ حوالوں اور واقعات کی شواہد کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ مکارم اخلاق میں تقویٰ و طہارت، زہد و ورع، تواضع و سادگی، فقر و درویشی، انفاق فی سبیل اللہ، شجاعت، حلم و بردباری اور حسن خلق کے ذکر سے ان کی سیرت کا جامع نقشہ کھینچا ہے۔ جس قدر خوبیاں گنائی گئی ہیں ان سے ایک ایسی بزرگ شخصیت کی تعمیر ہو جاتی ہے جو امور دنیاوی اور دینی میں یکتائے روزگار تھی۔ حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں اس سے بہتر اور مؤثر سیرت نگاری اور کردار نگاری ممکن نہیں۔ "ذاتی حالات و سوانح" کی سرخی کے تحت مختصراً" حلیہ، لباس، غذا، ذریعۂ معاش، حقوق العباد کا خیال، رقت قلب، ازدواج اور اولادوں کا ذکر ہے۔ مصنف نے ان کی ازدواج میں قبیلہ بنت عبدالعزیٰ، اسماء بنت عمیس، حبیبہ بنت خارجہ اور اولاد میں عبدالرحمان عبداللہ، محمد بن ابی بکر، حضرت عائشہ اور ام کلثوم کا تعارف بھی کروایا ہے۔

کتاب معلومات کے لحاظ سے بے بہا، بیان کے تفہیمی انداز کی وجہ سے قابل قبول اور سادہ طرز عبارت کی بنا پر دلنشیں بن گئی ہے۔ مصنف سوانح نگاری کے فن سے واقف ہیں اور پڑھنے والوں کے ذوق و شوق کو بلند کرنے کے جذبے سے سرشار حقائق کی تلاش میں سرگرداں رہ کر برسوں کی مشقت کے بعد اس تصنیف کو تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

### سوانح اعلیٰ حضرت امام احمد رضا : بدرالدین احمد قادری رضوی : لاہور : ۱۹۶۳ء

بدرالدین احمد قادری رضوی کی تصنیف "سوانح اعلیٰ حضرت امام احمد رضا" طویل ہونے کے باوجود سوانحی تقاضوں کو پورا نہیں کرتی اس میں سوانحی واقعات کم ہیں۔ افکار زیادہ ہی نہیں بلکہ مناظرہ کے رنگ میں جذباتیت سے مملو ہیں۔ ممکن ہے متفق الخیال قاری کو اس کے پڑھنے میں لطف آئے لیکن اس سے بصیرت حاصل کرنے اور ذہن کے نئے دریچے وا کرنے میں



کوئی مدد نہیں ملتی۔ کتاب کے اکثر حصے غیر متعلق ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے والد مولانا خیرالدین کی وہابی دشمنی کا طول طویل احوال جو موضوع سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ہر ہر سطر میں حسن عقیدت اور ہر ہر لفظ میں شان احترام اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ ایک غیر جانبدار قاری یا شخصیت سے تعارف حاصل کرنے کا متمنی اس کی گران باری میں کام کی بات حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ معلومات کی پیش کش اور ترتیب اور طرز بیان میں شان عقیدت اور مناظرہ کی کیفیت اس کتاب کو اچھی سوانح عمری قرار دینے میں مانع ہیں۔

### مخدوم جہانیاں گشت : محمد ایوب قادری : کراچی : ۱۹۶۳ء

شخصیت کے ساتھ جب عقیدت انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو حقائق کے بجائے روایات میں کھو جاتی ہے یہی حال حضرت مخدوم جہانیاں گشت کا ہوا ہے۔ وہ درویش صفت عالم تھے۔ اپنے علم و کردار سے فیض پہنچایا کرتے تھے۔ ان سے عقیدت رکھنے والوں نے حقائق کو پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ محمد ایوب قادری نے جانکاہی سے ان کے بارے میں اہم معلومات جمع کیں ہیں جن کے اسناد پر حرف نہیں آسکتا۔ اس طرح صاحب سوانح کے تمام حالات زندگی، پیدائش، بچپن، تعلیم، جوانی، بڑھاپا، ان کے فیوض و برکات کے بارے میں تحقیق سے کام لے کر ان کو ایک عام انسان کی طرح پیش کیا ہے اور امور دنیاوی و امور دینی سے متعلق تمام گوشوں پر سے پردے اٹھائے ہیں۔ اس نوع کے سوانحی حالات کی فراہمی کے لئے ترتیب و تجزیہ کے لئے تحقیق اور تلاش بسیار کی دشواریوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ مصنف نے اپنی مساعی سے ان منزلوں کو طے کیا ہے اور بزرگان دین کی زندگی کو عام انسانی کیفیات کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

### خواجہ غلام فرید : مسعود حسن شہاب : اردو اکادمی : بہاولپور : ۱۹۶۳ء

خواجہ غلام فرید متنوع شخصیت کے مالک تھے وہ متبحر عالم، صوفی باصفا، درویش صفت اور ملتانی و سرائیکی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ انہوں نے علوم ظاہری سے ہزاروں طالبان علم کو سیراب کیا اور باطنی علوم اور روحانی فیوض سے لاکھوں انسانوں کو بہرہ اندوز کیا۔ ان کی شاعری ان کے خیالات کو حیات جاوداں عطا کرتی ہے۔ مسعود حسین شہاب نے تحقیق اور جستجو سے ان کی سوانح عمری مرتب کرنے کا حق ادا کیا ہے۔

کتاب کے ابتدائی حصے میں خاندان اور نسب کا حال بیان کرتے ہوئے انہیں فاروقی النسل، عربی نژاد اور ولی الاصل قرار دیا ہے۔ ان کے جد اعلیٰ یحییٰ بن مالک تھے جو ناصر بن

عبداللہ بن عمر کے پڑپوتے تھے۔ مالک کی ساتویں پشت میں عیسیٰ بن یوسف نے ترک وطن کر کے سندھ میں قیام کیا جہاں انہوں نے اور ان کی آئندہ نسلوں نے اسلام کی خدمت میں زندگیاں گزار دیں۔ پیدائش اور پرورش کے حالات بیان کرنے کے بعد ان کی تعلیم و تربیت کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے بھائی مولانا فخرالدین کے شاگرد اور مرید تھے انہی کی رہنمائی میں طریقت کے جملہ رموز اور راہ حقیقت کے تمام اسرار سے واقف ہوئے۔ وہ ہر مادی اور روحانی موضوع پر شرح وبسط کے ساتھ اظہار پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کی وسیع القلبی کا یہ عالم تھا کہ ہر طرح تعصب سے پرہیز کرتے تھے۔ انگریز دشمنی کے دور میں بھی انگریزی زبان سیکھنے کی کوشش کی ۲۸ برس کی عمر میں ۲۸۸ھ میں مولانا غلام فخرالدین کی وفات کے بعد مسند ارشاد پر متمکن ہوئے۔ مصنف نے ان کے مسلک پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور زندگی میں انہیں جو مقبولیت حاصل رہی اس کی شہادت میں متعدد واقعات بھی تحریر کئے ہیں۔

خواجہ غلام فرید کی سیرت کے بارے میں لکھا ہے کہ خواجہ صاحب طبعاً" خلوت نشین کم گو کم خور واقع ہوئے تھے۔ انہیں عام ملاقاتیوں سے ملنا دو بھر معلوم ہوتا تھا۔ رات دن خلوت میں رہتے۔ سیر وسیاحت کا بڑا شوق تھا۔ ہندوستان کے اکناف و اطراف کا بارہا دورہ کیا تھا۔ مشہور تاریخی مقامات بالخصوص مزارات بزرگان کرام ضرور دیکھتے تھے۔ وہ سادگی اور صفائی کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں جود و سخا کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ مال و دولت سے کوئی محبت نہ تھی۔ موسیقی سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ قوالی سنا کرتے تھے۔

زندگی کے اہم واقعات اور سیرت کے تمام پہلوؤں کا مکمل جائزہ کتاب میں شامل ہے۔ مصنف سوانح نگاری کے فن کے تقاضوں سے خوب واقف ہیں اور اس تصنیف میں انہوں نے ان کا خیال رکھا ہے۔ کتاب کے مقدمہ نگار (میجر شمس الدین محمد' سابق وزیر معارف' ریاست بہاولپور) نے اس تصنیف کا موازنہ اسی نوعیت کی دیگر تصانیف سے کرتے ہوئے درست لکھا ہے کہ

"اکثر سوانح نگار عقیدت کے جوش میں بعض شخصیتوں کی زندگی کے ایسے گوشوں کو تاریکی میں چھوڑ دیتے ہیں جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کی عظمت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب کے سیرت نگار اب تک یہی کرتے آئے ہیں انہوں نے خواجہ صاحب کو گوشت پوست والا انسان بنانے کے بجائے عالم بالا کا کوئی فرد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس



عقیدت نے خواجہ صاحب کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر پردہ ڈال دیا۔ زیر نظر کتاب اس اعتبار سے اور بھی وقیع ہے کہ اس میں صاحب تصنیف نے تحقیق اور تجسس سے کام لے کر بعض پوشیدہ حقیقتوں کو بے نقاب کر دیا ہے خاص طور پر خواجہ صاحب کا رومان ایک ایسا موضوع تھا جسے ان کی شاعری کے واضح اشاروں کے باوجود اب تک غلط ثابت کیا جاتا رہا تھا۔ یہ موضوع جہاں تحقیق کا طالب تھا وہاں حزم و احتیاط کا بھی متقاضی تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس اہم ذمہ داری سے صاحب کتاب پوری طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں۔" (۱۸)

خواجہ غلام فرید کے رومان کے بابا میں (۱۹) ان کی تحریری شہادتوں کے حوالے کے ساتھ بحث کی ہے ان کی عائلی زندگی کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔

سوانحی حالات کے بعد اس تصنیف میں خواجہ صاحب بحیثیت شاعر کو موضوع بنایا ہے اور ان کی زبان' شاعری' تصور عشق' مجازی رنگ' یاس و رجائیت میں ہم آہنگی' بہاریہ اور اردو شاعری پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔

معراج روحانی : سوانح عمری سر آمد اولیا' شیخ الاسلام' شیخ الہند' ماہ اوج شرف حضرت سلیم چشتی رحمتہ اللہ علیہ فتح پور سیکری' اکبر آبادی : سراج احمد عثمانی :- کراچی : ۱۹۶۳ء

حضرت سلیم چشتی کی سوانح عمری "معراج روحانی" سراج احمد عثمانی کی عقیدت و ارادت سے معمور تصنیف ہے سرورق کی تحریر (جو اوپر نقل کی گئی ہے) انداز تحریر اور رجحان تصنیف کی غماز ہے۔ اکثر اولیائے کرام اور صوفیائے عظام سے جو رشتۂ مودّت دلوں میں پایا جاتا ہے وہ تحریر کی گرانبار سے ظاہر ہو جاتا ہے ہر جگہ جہاں صاحب سوانح کا نام آیا احترام کے ساتھ القاب سے مملو ہے۔

ابتدا میں شجرہ دیا گیا ہے اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ صاحب سوانح بابا فرید کی نویں پشت میں تھے۔ وہ ۱۴۷۷-۷۶ء م ۸۸۳ھ میں پیدا ہوئے ۱۵۷۱ء م ۹۷۹ھ میں ان کا وصال ہوا۔ نو برس کے تھے کہ خاندان نے قصبہ سیکری میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کی تعلیم' روحانی مدارج کا طے کرنا' ۲۴ بار حج کی سعادت حاصل کرنا' ان کے کشف و کرامات' تبلیغ اور روحانی برکات کا حال اس طرح بیان کیا ہے کہ سوانح عمری اور اس دور کی تاریخ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ تصنیف کا یہ رجحان لائق تحسین ہے ورنہ عام طور پر تاریخ کو سوانح عمری سے جدا رکھ کر بیان کیا جاتا ہے اور ربط پیدا

کرنے کا فرض قاری پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

صاحب سوانح کے اعلیٰ مرتبت ہونے کے ثبوت کے طور پر یہ بھی لکھا گیا کہ شیر شاہ کے مصاحب اور مشیر خاص ان کے مرید تھے اکبر اعظم کو ان سے خاص عقیدت تھی۔ شہزادہ سلیم انہیں کی دعاؤں کے اثر سے پیدا ہوا اور اکبر نے اپنے بیٹے کا نام انہیں کے نام پر رکھا تھا۔ اس کے دل میں جناب کے نام کا اس قدر احترام تھا کہ وہ اپنے بیٹے کا نام بھی عزت سے لیتا تھا۔

سوانحی حالات مختصر ہیں' کتاب کا بڑا حصہ تاریخ نگاری پر مشتمل ہے۔ مصنف نے غیر معمولی عقیدت کا اظہار کر کے غیر جانبدار قاری کے لئے عدم دلچسپی کا سامان مہیا کیا ہے۔

**حضرت بابا فرید گنج شکر : وحید احمد مسعود : کراچی : ۱۳۸۴ھ (م ۱۹۶۴ء)**

حضرت بابا فرید گنج شکر کے حالات زندگی انتہائی تحقیق اور تلاش سے فراہم کئے گئے ہیں جہاں تک معلومات کا تعلق ہے اس موضوع پر اس سے جامع تصنیف اور کوئی نہیں ہے مواد کے درست یا غلط ہونے کے بارے میں مصنف نے تنقید سے بھی کام لیا ہے اور غیر معتبر روایت کو رد کر دیا ہے لیکن سوانح نگاری کے فن سے ناواقفیت کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اس کی ترتیب مناسب نہیں ہے۔ پہلے ان کے بیعت ہونے کا ذکر ہے اس کے بعد ولادت' تعلیم و تربیت کا اور آگے چل کر نسب اور شجرہ شامل کیا ہے جو منطقی ترتیب کے بالکل برعکس ہے۔ اس جدت کی مصنف نے کوئی وجہ بھی نہیں بیان کی ہے۔

**حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی : خلیق احمد نظامی : لکھنؤ : ۱۹۶۴ء**

یہ سوانح عمری پانچ حصوں پر مشتمل ہے جس کے ہر حصے میں الگ الگ ابواب کے تحت موضوعات کی تقسیم کی گئی ہے۔ حصہ اول میں ۱۴ ابواب ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندانی حالات رقم کیے گئے ہیں دوسرے حصے کے سولہ ابواب ہیں جن میں سے سیزدہم تک ان کے ذاتی حالات تحریر کیے گئے ہیں۔ حصہ سوم میں بھی دس ابواب ہیں جو شاہ صاحب کے معاصرین کے حالات پر مشتمل ہیں اور حصہ چہارم میں دو ابواب ہیں جس میں شیخ صاحب کی اولاد کا تذکرہ ہے حصہ پنجم یعنی آخری حصے میں شیخ صاحب کی دینی و علمی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ایک صوفی بزرگ گزرے ہیں۔ مصنف نے مذکورہ تصنیف میں وہ تمام تفصیلات دلکش انداز میں پیش کی ہیں جو شیخ صاحب کے معاصرین اور ان کی تصانیف کے حوالے سے مصنف کو مل سکیں۔ اسی لئے شیخ صاحب کی نجی زندگی کے چند پہلو تشنہ معلوم ہوتے



ہیں۔ مصنف نے ہیرو کے عادات و اطوار اور عزیز و اقارب کے زمرے میں بہت کم معلومات پیش کی ہیں اور اس کی کمی کو ہیرو کی تصانیف اور ان کی خدمات پر تفصیلی معلومات کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ خلیق احمد نظامی کا اسلوب میانہ روی کا آئینہ دار ہے اور ان کی تحریر میں اعتدال پایا جاتا ہے۔

**سوانح عمری حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری : ابوالحسن علی ندوی : لکھنؤ : ۱۹۶۵ء**

مذکورہ سوانح عمری پر شبلی کی طرز تحریر کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ جو پندرہ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں ہیرو کے بچپن اور تعلیم و تربیت کے معاملات کو پیش کیا گیا ہے۔ ہیرو بچپن ہی سے توکل و استغنا محنت و لگن حصول تعلیم کا ذوق رکھتا تھا۔

مولانا عبدالقادر رائے پوری کی تمام زندگی سادگی و قناعت پسندی میں گذری مصنف ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"رات کے وقت حضرت نے کہیں سے بستر مانگ کر والد صاحب کے لئے بچھایا عرض کیا کہ آپ آرام فرمائیں میں مطالعہ کر آؤں آپ مسجد کے چراغ کی روشنی میں ازراہ احتیاط مطالعہ نہیں فرماتے تھے۔ بازار کی لالٹین کی روشنی میں مطالعہ کرتے تھے اور کئی کئی وقت اسی پر گزارہ ہوتا تھا۔" (۲۰)

اس حوالے سے مولانا کی سادہ مزاجی و احتیاط پسندی کا اظہار ہوتا ہے اور اس باب سے ان کی سیرت کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ آگے چل کر مصنف نے ہیرو کی دینی خدمات ان کے عہد کے علمی و معاشرتی ماحول پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ساتھ ہی ان کی کرامات کا تذکرہ بھی تفصیل سے کیا ہے جس سے مولانا کی زندگی کی سادگی' دین سے اور لوگوں سے محبت اور اصول پسندی کا پتا چلتا ہے۔

مذکورہ سوانح عمری طرز تحریر اور پیش کش کے اعتبار سے دبستان شبلیؒ سے متاثر نظر آتی ہے۔

**حضرت بندہ نواز : احمد ادریس قادری : کراچی : ۱۹۶۵ء**

حضرت بندہ نواز اپنے دور کے مبلغ اسلام اور صوفی بزرگ تھے انہیں حضرت نظام الدین اولیاء کے معاصر حضرت نصیر الدین چراغ دہلی سے شرف بیعت حاصل تھا۔ ان کے بارے میں تذکرے اور تواریخ میں معلومات انتہائی اختصار کے ساتھ درج ہے حالانکہ ان کے معتقدین اور

ارادت مندوں کی کسی دور میں کمی نہیں رہی۔ احمد ادریس قادری نے اپنی تصنیف "حیات بندہ نواز" کو ان روایتی ماخذات کے علاوہ چند نادر مخطوطات کی مدد سے مکمل کیا ہے۔ اس بارے میں مصنف نے لکھا ہے کہ

"خوش قسمتی سے چند ایسے ماخذ کا ہمیں پتا چلا ہے جو ہم عصر ہونے کے علاوہ صرف حضرت مخدوم کی ذات کے لئے مختص ہیں۔ ان کتابوں میں "سیر محمدی" (۲۱) کو استناد کا درجہ حاصل ہے۔ مصنف حضرت کے مرید تھے اور سفر و حضر میں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔ دوسری کتاب "تاریخ حبیبی" (۲۲) ہے جو حضرت کے نامعلوم مرید نے احمد شاہ ولی کی فرمائش پر ان کے انتقال کے چند دنوں بعد تحریر کی تھی۔" (۲۳)

ان اہم اور مستند ماخذات کے علاوہ مصنف نے دیگر ۳۰ سے زائد کتب سے استفادہ کیا ہے اور جس قدر معلومات فراہم ہو سکی ہیں تصنیف میں شامل کر لی ہیں سوانح عمری تحقیقی نوعیت کی ہے۔ ہر واقعہ معتبر سند کے ساتھ لکھا گیا ہے لیکن تحریر پر بھی عقیدت و احترام کا رنگ چھایا ہوا ہے۔

پہلا باب حالات زندگی سے متعلق ہے جو تقریباً "۵۶ صفحات (۱۵ تا ۷۱) پر پھیلے ہوئے ہیں ان میں صاحب سوانح کا نسب نامہ بھی ہے اور خاندانی کوائف بھی ہیں۔ حالات زندگی کو تاریخی تسلسل میں بیان کیا ہے ساتھ ہی اس وقت کے اہم تاریخی واقعات اور معاشرتی ماحول کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان موضوعات کو سلیقہ سے باہم مربوط رکھکر سوانح عمری مکمل کی ہے۔

مصنف کا رجحان تحقیق کے ذریعہ حقائق کی بازیافت ہے۔ سوانحی حالات' تاریخی واقعات اور عام حالات کو ربط دے کر سوانح نگاری کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ حسب روایت صاحب سوانح کا ذکر احترام سے ہوا ہے۔ ایک حصہ ان کے معاصرین حضرت امیر خسرو' حضرت شیخ محمود' حضرت شیخ علاؤ الدین کے احوال اور صاحب سوانح سے ان کے روابط کے بارے میں بھی شامل ہے۔

### حضرت محمد یوسف کاندھلوی : محمد ثانی حسنی : لکھنؤ : ۱۹۶۷ء

محمد ثانی حسنی مصنف سوانح عمری حضرت محمد یوسف کاندھلوی نے سوانح نگاری کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر کتاب نہیں لکھی ہے۔ ممکن ہے کہ انہیں ضروری معلومات فراہم ہی نہ ہو سکی ہوں۔ کتاب کے دوسرے باب میں سوانحی حالات سرسری اور مختصر ہیں آٹھ سو صفحات میں ان کے مذہبی افکار اور اصلاحی تحریکات کو موضوع بنایا ہے اس طرح یہ سوانح عمری سے زیادہ تاریخ



بن گئی ہے۔

### ولی اللہ : ابوالعلا محمد اسمٰعیل گودھروی : لاہور : ۱۹۶۸ء

شاہ ولی اللہ برصغیر کے ان بزرگوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں جو مرجع علوم اسلامی ہونے کے ساتھ ترویج قرآن و اسلام کو فرض اولین گردانتے ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کو محض متبرک و مقدس کتاب ماننے کی عام روایت کے برخلاف اس کی تفہیم اور اس پر عمل کی توفیق کو مسلک بنایا۔ قرآن علم و اصلاح کے لئے اتارا گیا تھا اس کو انہیں مقاصد کے تحت پڑھنا اور سمجھنا چاہئے۔ شاہ ولی اللہ نے اس کی دعوت دی۔ اس کام کے ضمن میں "اصول تفسیر" "فوز کبیر" اور مشکل لغات میں "فتح خبیر" وغیرہ لکھیں۔ قرآن مجید کی طرح احادیث کی اہمیت اور افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں کی اہمیت اجاگر کرنے کے لئے شاہ صاحب نے جو خدمات انجام دیں ان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ابوالعلا محمد اسمٰعیل گودھروی نے ایک کتابچہ "ولی اللہ" تحریر کیا ایک طویل مقدمہ کے بعد شاہ صاحب کے حالات بیان کئے ہیں۔

پہلے ان کے آباؤ اجداد کا ذکر ہے جن میں خصوصیت سے ان کے دادا شیخ وجیہہ الدین اور والد شیخ عبدالرحیم کا ذکر ہے۔ ولادت کے سال کا تعین کرنے کے بعد ایام طفولیت اور تعلیم' استغراق علمی' درس و تدریس' ترجمۂ قرآن' مسلک' انشا پردازی' اولاد وغیرہ کا حال بیان ہوا ہے۔ سوانحی حالات اگرچہ مختصر ہیں لیکن زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو منظر عام پر نہ آیا ہو۔ ان کے اوصاف و کردار کو بھی واضح کیا ہے اور ان کی تعلیمات اور رجحان کا بھی احوال موجود ہے۔ یہ کتاب اگرچہ جامع نہیں ہے اس کی حیثیت ایک طرح سے تعارف کی ہے اور اس مقصد میں مصنف کامیاب ہیں۔ اکثر مقامات پر مصنف نے جذباتیت سے مغلوب ہو کر ایسا طرز تحریر اختیار کیا ہے جو سنجیدہ طبع قاری پر خوشگوار اثر نہیں ڈالتا۔

### ولیٔ کامل : (سوانح عمری مولانا محمد ذکریا) : مفتی عزیز الرحمان : بجنور : ۱۹۶۹ء

مفتی محمد عزیز الرحمان نے مولانا محمد ذکریا کی سوانح عمری "ولی کامل" میں ان کے خود نوشت حالات کو بھی شامل کیا ہے اور تعلیم و تربیت' بچپن کے واقعات' ان کی مجلسی زندگی اور معاصرین سے تعلق کو معتبر روایتوں کے ذریعے خود بھی لکھا ہے۔ مولانا محمد ذکریا ایک مذہبی اور علمی شخصیت تھے اس پہلو کو واضح کرنے کے لئے ان کے عہد کے مذہبی رجحانات' خاندان کا مذہبی پس منظر' اساتذہ جن کی شخصیت اور علمیت کے ان پر اثرات پڑے اور بزرگان دین جن سے وہ متاثر

ہوئے ان کے احوال کی بھی تفصیل ہے۔ ان کے علاوہ ابتدائی تین ابواب صاحب سوانح کے عہد اور ماحول کے پس منظر کے لئے وقف رکھے گئے ہیں۔ ساتویں اور آٹھویں باب میں جامع مظاہر اور اس کی علمی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان ابواب کی وجہ سے کتاب ایک عہد کی تاریخ معلوم ہوتی ہے نہ کہ مستقل سوانح عمری۔

**حیات عبدالحئی : مولانا ابوالحسن علی ندوی : لکھنؤ : ١٩٧٠ء**

یہ ایک ایسی سوانح حیات ہے جس میں مولانا ندوی نے کھل کر اپنی طرز تحریر کے جوہر دکھائے ہیں اور اپنے موضوع کے ہر ہر پہلو پر بھرپور روشنی ڈالی ہے لیکن بعض واقعات کے سلسلے میں اپنی کم علمی کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"اگر یہ سوانح سالہا سال پہلے مرتب کر لی جاتی جب مصنف کا ولولۂ تصنیف تازہ، قلم جواں اور رواں اور بصارت صحیح اور محفوظ تھی تو ذرا بھی تعجب کی بات نہ ہوتی اس وقت ایسے بھی لوگ موجود تھے جن سے بہت سی ضرور معلومات اور چشم دید واقعات مہیا ہو سکتے تھے۔ مولانا عبدالحئی سوانح نگار کے والد تھے اور سوانح نگار سے زیادہ معلومات کون اکٹھی کر سکتا تھا لیکن انہیں خدشہ لاحق تھا کہ کہیں لوگ اسے تشہیر کا ذریعہ نہ سمجھنے لگیں۔ پھر بھی مصنف نے کسی کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کام کو مکمل کر ڈالا کیونکہ ان کے خیال میں صاحب سوانح کی زندگی، صاحب کمال و کشف کی زندگی تھی جس سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔" (٢٤)

"علوم دینیہ اور مدارس عربیہ کے طلبہ سے لے کر ملک کے ممتاز فضلاء اہل قلم و مصنفین اور ملک و ملت کے خادموں اور قائدین کے لئے اس میں بصیرت و عقیدت اور ذکر و موعظت کا بڑا سامان موجود ہے۔" (٢٥)

مذکورہ تصنیف میں مولانا حسنی کے اسلاف اور ان کے خاندانی حالات، بزرگوں کی خوبیوں اور خامیوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی گئی ہے جو خاندانی ذرائع سے مصنف کو معلوم ہو سکتی تھیں کیونکہ خاندان کا اندازہ اسلاف کے کارناموں سے لگایا جا سکتا ہے اور اسلاف کے کارناموں، عقائد و کردار اور روایات کا اثر سیرت و کردار پر پڑ سکتا ہے اس لئے مصنف نے مولانا عبدالحئی کے اسلاف کے کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ مواد ایسا پیش کیا جائے جس کے سبب ہیرو کی مکمل شخصیت سامنے آجائے اور سوانح نگاری کے جدید انداز میں سن وار ترتیب کے بغیر بھی ان واقعات کو پیش کیا جا سکتا ہے جس کے سبب موضوع کا اصل رنگ روپ سامنے آجائے اور اس کے کردار و سیرت کے سیاہ و سفید پر بھی روشنی پڑ



جائے۔ مولانا ابوالحسن ندوی اس انداز میں نہایت کامیاب سوانح نگار کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ صاحب سوانح کو بچپن میں کھیل کود سے زیادہ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ رحمدلی، خوش اخلاقی اور سنجیدگی و قناعت ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے ہیرو کی زندگی کا بڑا حصہ تعلیمی خدمات اور علمی تحریکوں کے فروغ میں بسر ہوا اور مصنف نے نہایت چابک دستی سے ہیرو کی زندگی کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

"درحقیقت اس کے کامل انسان اور مثالی مسلمان ہونے کا یہی معیار و میزان ہے۔"

مولانا عبدالحئی کی تمام زندگی اعتدال و توازن کا اعلیٰ نمونہ تھی اور ان کی خانگی زندگی میں بھی ان کے یہ اوصاف نمایاں نظر آتے ہیں اس لئے ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کے اثرات اولاد پر بھی پڑے اور مصنف جیسے لائق فرزند سامنے آئے جنہوں نے عقیدت و محبت کے جذبے کے باوجود ندوۃ العلماء کے ان اختلافات کو بھی نہایت غیر جانبداری سے پیش کر دیا جو مولانا عبدالحئی کی زندگی میں ہوئے۔ جس کے سبب مولانا ابوالحسن علی ندوی ایک نہایت کامیاب اور ایسے سوانح نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں جس کا قلم اپنے اور پرائے میں تمیز نہیں کرتا بلکہ حقائق پر نظر رکھتا ہے۔ اس طرح یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ایک بیٹے نے جب اپنے باپ کے سوانح تحریر کئے تو اپنی فطری محبت و عقیدت کے جذبے کو سوانح نگاری کے مسلمہ اصولوں پر قربان کر دیا۔ بلاشبہ "حیات عبدالحئی" اردو کی ایک نہایت کامیاب اور عمدہ سوانح عمری ہے۔

**تین مسلمان فیلسوف : سید حسین نصر : ترجمہ پروفیسر محمد منور : لاہور : ١٩٧٢ء**

کتاب "تین مسلمان فیلسوف" انگریزی سے ترجمہ ہے اس کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ بو علی سینا، ابن عربی اور سہروردی کے بارے میں اردو میں مختصر یا مستقل سوانح عمریاں برائے نام ہیں۔ ہمارے ملک میں ان مسلمان فلسفیوں کا جس وسیع پیمانے پر تعارف ہونا چاہیے تھا نہیں ہو سکا ہے۔ اس کے مصنف سید حسین نصر از روئے وطن ایرانی ہیں۔ وہ ایک عالی قدر عالم، مفکر اور ادیب کی حیثیت سے عالمگیر شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب Three Muslim Sages کو بھی عالمگیر شہرت حاصل رہی ہے۔ کتاب دراصل ان تین مسلم فلسفیوں کے فکر و فلسفہ کے بارے میں لکھی گئی ہے ساتھ ہی سوانحی خاکے بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔

ابن سینا کے سوانحی خاکے میں اس کا سال پیدائش ٣٧٠ھ (٩٨٠ء) بتلایا ہے۔ اس کے

والد بھی عالم تھے اور ان کا گھر دور و نزدیک کے اہل علم کے لئے مقام ملاقات کی حیثیت رکھتا تھا۔ ابن سینا کی تعلیم کے بارے میں لکھا ہے کہ دس برس کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا اور صرف و نحو بھی، بعد ازاں وہ منطق اور ریاضی کی جانب متوجہ ہوا۔ علم ریاضی عبداللہ الفاتلی کے یہاں حاصل کیا۔ ابو سہیل المسیحی سے مابعد الطبیعیات اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ علم طب میں وہ ماہر تھا جس کی وجہ سے حکمران بخارا کا منظور نظر بنا۔ محل کے کتب خانے کے دروازے اس کے لئے کھول دیئے گئے۔ سلطان محمود غزنوی نے وسط ایشیا میں جو انتشار پیدا کیا جس کی وجہ سے ابن سینا کو ترک وطن کرنا پڑا۔ اپنی مفلوک الحالی اور دربدر ٹھوکریں کھانے کے زمانہ میں بھی اس نے سائنسی تحقیق کا کام جاری رکھا۔ وہ صاحب تصانیف تھا افراتفری کے زمانہ میں اس کی متعدد تحریری ضائع ہو گئیں جو باقی بچی ہیں ان پر ہی جدید مغربی سائنس کی بنیادیں پڑیں۔

شہاب الدین یحیٰی بن حبش ابن امیرک سہروردی دوسرے فلسفی ہیں جن کے افکار بیان کرنے سے قبل ان کی مختصر سوانح عمری بھی کتاب میں شامل کی گئی ہے۔ سہروردی ایران کے شہر زنجان کے قریب ایک گاؤں میں ۵۴۹ھ (م ۱۱۵۳ء) میں پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی تعلیم مراغہ میں مجدالدین الجیلی کے یہاں ہوئی۔ بعد ازاں اصفہان گیا جو اس زمانہ میں اسلامی تعلیمات کا اہم مرکز تھا۔ حصول تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس نے سیاحت کے شوق میں دور دور کے سفر کئے۔ وہاں کے علماء اور صوفیاء سے ملاقاتیں کر کے بہت کچھ سیکھا۔ بالآخر صلاح الدین ایوبی کے فرزند ملک طاہر کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ دیگر دربار رس علماء اس کی موجودگی سے خوش نہ تھے۔ انہوں نے اصرار کر کے اسے قید کروایا جہاں ۵۸۷ھ (م ۱۱۹۱ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔

تیسرے فلسفی ابوبکر محمد العربی الحاتمی الطائی ہیں جن کو عام طور پر ابن عربی کہا جاتا ہے۔ وہ شہر مرسیہ میں ۵۶۰ھ (۱۱۶۵ء) تولد ہوا۔ اس نے ابتدائی ایام مرسیہ میں بسر کئے پھر اشبیلیہ کا رخ کیا۔ اس کا تعلق ایک امیر گھرانہ سے تھا اس لئے اس کی زندگی آرام و آسائش سے بھری ہوئی تھی لیکن دو عورتوں نے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ایک مرسیہ کی یاسمین تھی اور دوسری قرطبہ کی فاطمہ: مصنف کا کہنا ہے کہ

"ان دونوں نے اس کی زندگی کا رخ بدلنے میں بڑا حصہ لیا۔ یہ بات خصوصاً "فاطمہ پر صادق آتی ہے جو کمسن سالہ عورت تھی لیکن اس رونق اور جمال کی مالک تھی کہ ابن عربی اسے سولہ سال کی دوشیزہ سے مماثل جانتا تھا فاطمہ نے دو سال تک اس کے مرشد روحانی کا کام کیا اور اپنے آپ کو ابن عربی کی روحانی والدہ جانتا۔" (۳۶)



ابن عربی نے چوبیس سال کی عمر میں گہری روحانی بصیرت حاصل کر لی تھی۔ اس نے بھی سیر وسیاحت اختیار کی جہاں بھی کسی درویش مرد یا عورت کی موجودگی کا علم ہوتا اس سے ضرور ملاقات کر کے استفادہ کرتا۔ اسی شوق میں جب وہ قرطبہ پہنچا تو ابن رشد سے ملاقات ہوئی۔ مصنف نے ابن رشد سے ملاقاتوں کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ سیاحت کرتا ہوا شمالی افریقہ بھی پہنچا وہاں بھی صوفیاء اور علماء سے ملاقاتیں کیں۔ معتزلہ جیسے مختلف الخیال عالموں سے بحث اور مناظرہ بھی کرتا رہا۔ اس دوران اسے عرفانی مشاہدات کا تجربہ بھی ہوا۔ ان کی تفاصیل بھی موجود ہیں۔ اس نے دمشق میں قیام کا ارادہ کیا۔ زندگی ہی میں وہ ایک عالم اور صوفی کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا۔ اس نے دمشق میں ۶۳۸ھ (م ۱۲۴۰ء) میں وفات پائی۔

تینوں فلسفیوں کے حالات زندگی اختصار کے حامل ہونے کے باوجود اہم معلومات سے مملو ہیں مصنف کا رجحان یہ رہا ہے کہ جن عوامل نے ان کے ذہنی اور روحانی ارتقا میں مدد دی ان کا حال وضاحت سے بیان کرے۔ پروفیسر محمد منور نے موضوع کے لحاظ سے سنجیدہ اور پُروقار طرز تحریر اختیار کیا ہے۔ جس کی روانی ترجمہ کی غماز نہیں ہے۔

### عبداللہ خویشگی : محمد اقبال مجددی : لاہور : ۱۹۷۲ء

عبداللہ خویشگی قصوری ایک صوفی اور کثیر التصانیف بزرگ تھے جو عہد عالمگیری میں گزرے ہیں ان کی تمام تصانیف قلمی صورت میں محفوظ ہیں ان کی اشاعت کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ ان کے نام سے مورخین تو واقف ہیں عہد عالمگیری کی تواریخ میں ان کا نام ملتا ہے لیکن ان کی تصنیف و تالیف کے بارے میں پہلے کچھ نہیں لکھا گیا۔ محمد اقبال مجددی نے اس حیثیت سے ان کا پہلی بار تعارف کروایا ہے ان کے حالات زندگی انہیں کی تصانیف سے اخذ کر کے مرتب کئے ہیں اور تمام تصانیف پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عبداللہ خویشگی سلسلۂ مجددیہ کے سخت مخالف تھے اور زندگی بھر ان کے خلاف سرگرم رہے اور اب سلسلۂ مجددیہ کے ہی ایک فرد نے ان کے نام کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب میں ان کی سوانح، سیرت اور کارناموں پر متوازن اور غیر جانبدارانہ کوشش کی گئی ہے کہیں بھی متعصبانہ یا مخالفانہ جذبات کو حاوی نہیں ہونے دیا گیا۔ ہر بات کو سلیقے اور متانت میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے عبداللہ خویشگی کے حالات پر ہی روشنی نہیں پڑتی بلکہ کئی خاندانوں کے تعارف اس خوش اسلوبی سے کروائے گئے ہیں کہ یہ بجائے خود ایک قاموس بن گئی ہے۔

## حضرت مجدد الف ثانی : سید زوار حسین شاہ : کراچی : ۱۹۷۲ء

وہ بزرگ جن کا نام احمد، لقب بدر الدین، کنیت ابو البرکات، منصب خزینۃ الرحمۃ، قیوم زمان، مجدد الف ثانی اور عرف امام ربانی، محبوب صمدانی تھے اپنے علمی تبحر، روحانی کمالات اور رشد وہدایت کے لئے شہرۂ آفاق ہیں اردو زبان میں جس جامع اور مفصل سوانح عمری کی ضرورت تھی اسے سید زوار حسین شاہ نے عرق ریزی، جانکاہی اور سخت جستجو سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ ابتدا میں سلسلۂ نسب اور سلسلۂ طریقت کا خاکہ پیش کیا ہے تیسرے باب میں سوانحی حالات کا آغاز ہوا ہے مصنف کی تحقیق کے مطابق صاحب سوانح کی ولادت شب جمعہ ۱۴ شوال ۹۷۱ھ کو ہوئی۔ اس وقت چند متحیر العقول واقعات ہوئے جن کا ذکر موجود ہے۔ اس باب میں حصول تعلیم اور ابتدائی دور کے واقعات لکھے ہیں تیسرا باب ان کے معمولات کے بارے میں ہے جس میں شبانہ روز اعمال، آداب وضو، تہجد گزاری، مراقبہ کا حال ہے۔ اگلا باب ان کے کشف وکرامات کے بارے میں ہے ایک باب ان کے ملفوظات کے بارے میں 'ایک دعوت تجدید کے ضمن میں سیاسی پس منظر بالخصوص اکبر کی بے دینی کے بارے میں ہے۔ صاحب سوانح کے تجدیدی کارناموں کے لئے ایک باب وقف رکھا گیا ہے اور ان کی تعلیمات علیحدہ باب میں بیان ہوئی ہیں۔

کتاب انتہائی تحقیق سے مرتب کی گئی ہے بے شمار کتابوں سے معتبر حالات اخذ کئے گئے ہیں۔ زیادہ انحصار ان کے مکتوبات اور ملفوظات پر کیا گیا ہے کیونکہ ان سے بہتر سند کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ حضرت مجدد الف ثانی، ان کی اولاد، اجداد، خلفائے عظام کے حالات مرتب کرنے میں "زبدۃ المقامات" اور "حضرات القدس" خصوصیت سے پیش نظر رہیں سنہ وار واقعات کے لئے "روضۃ القیومیہ" سے مدد لی ہے۔ صاحب سیرت کی تعلیمات کا باب سب سے طویل ہے جو زیادہ تر مکتوبات پر مشتمل ہے۔

یہ تحقیق کے ذریعہ صحیح حالات کی تلاش اور اسے حسن سلیقے سے پیش کرنے کے وصف کے اعتبار سے ایک شاندار تصنیف ہے۔ باوجود اس کے مصنف صاحب سیرت سے عقیدت وارادت رکھتے ہیں۔ اسلوب بیان میں وہ گراں باری پیدا نہیں ہونے دی جو عام طور پر بزرگان دین کے تذکروں میں پائی جاتی ہے۔



## سید شاہ امین الدین اعلیٰ : ڈاکٹر حسینی شاہد : آندھرا پردیش

اگست ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر حسینی شاہد نے اردو ادب کی تاریخ میں دکنیات کا اختصاصی مطالعہ کیا ہے یہ باب ارتقا زبان کے حوالے سے اہم ہونے کے باوجود غیر واضح ہے کیونکہ اول تو مواد کی فراہمی امر محال ہے اور اگر فراہم ہو جائے تب بھی ان میں ابہام یا تضاد کے اتنے پہلو ہوتے ہیں کہ ان کی ترتیب، تہذیب اور اخذ مطالب کی مہم سر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری نے جو تحقیقی نتائج پیش کئے تھے ان میں سے اکثر کی تردید ہو چکی ہے کیونکہ اس موضوع پر ان کے کام کی بنیاد دو ایک مخطوطات تھے حسینی شاہد نے ارض دکن کے چپے چپے میں گھوم کر درجنوں مخطوطات کا مطالعہ کیا خاندان یا سلسلہ رشد وہدایت کے شجرے دیکھے ان کا تقابل کیا انتہائی احتیاط سے جانچ پرکھ کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش ہے۔ ایک ایک نکتہ پر اس قدر تفصیلی بحث ہے کہ کئی کئی صفحات صرف ہو گئے ہیں جب کہیں قاری کو قابل قبول نتیجہ پہنچایا ہے۔ دکنیات کے ضمن میں دواوین اور مثنویوں کو مرتب کر دینا سہل ہے اس کے برخلاف صوفیوں کے رسائل کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر اخذ نتائج کرنا جان لیوا کارنامہ ہے۔ حسینی شاہد نے تحقیق کے لئے ایک اہم نکتہ انکشاف کیا ہے کہ ان رسائل کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تمام مکاتب فکر کے تصوف سے اور ان کی وضع کردہ اصطلاحات سے آگاہی حاصل کی جائے ورنہ بڑی الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اسی نکتے کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر حفیظ قتیل نے "معراج العاشقین" کے مصنف کا تعین کیا ہے اور سابقہ نظریے کی تردید کی ہے۔ کتاب کا ایک باب "تصوف" کے نظریاتی مطالعہ پر مبنی ہے اس میں شاہ امین کے تصوف کو تمام جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔

دکن کے صوفیاء کے سوانح مرتب کرنا بھی دشوار طلب ہے خاص طور پر سنین کے تعین میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ حسینی شاہد نے شاہ برہان الدین جانم اور شاہ امین کی ولادت ووفات کی جو تاریخیں طے کی ہیں ان کی صحت میں کلام نہیں۔ اس خصوص میں فاضل مقالہ نگار نے صوتی اور نحوی کے ایک ساتھ مطالعہ پر زور دیا ہے شاہ امین کے شاگردوں، مریدوں اور اہل خاندان کی تحریروں کی باقیات سے استفادہ کرکے جو حالات لکھے گئے ہیں وہ موجودہ مواد کی حد تک مکمل ہیں لیکن اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ حسن ارادت نے ایسے انکشافات کئے ہیں جو بادی النظر میں قابل قبول نہیں۔

ڈاکٹر حسینی شاہد کا یہ مقالہ جامعہ عثمانیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے لکھا گیا تھا امر واقعہ یہ ہے کہ اس غرض سے لکھے گئے مقالوں میں چند ہی ایسے ہوں گے جن کے لئے اس قدر عرق ریزی کی گئی اور کثیر ماخذات فراہم کرکے ان کا تقابل کیا گیا اور نتائج مرتب کئے گئے ہوں۔

**حضرت عثمان شہید : تصنیف محمد بن یحییٰ بن ابی بکر مالقی : مرتبہ ڈاکٹر محمود یوسف زائد : اردو ترجمہ کوکب شادانی : کراچی : اگست ۱۹۷۸ء**

حضرت عثمان شہید کے حالات پر یہ کتاب آٹھویں صدی ہجری کے معروف اندلسی عالم قاضیٔ غرناطہ ابوبکر محمد بن نحفی المالقی الاشعری کی محققانہ کتاب "التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان" کا اردو ترجمہ ہے۔ ابوبکر محمد بن نحفی صحابیٔ رسول حضرت ابو موسیٰ عبداللہ بن قیس الاشعری کی اولاد امجاد میں تھے۔ وہ امام ابن تیمیہ کے معاصر، اپنے زمانہ میں علم و فضل، ذہانت و فطانت اور زہد و تقویٰ کے علاوہ معدلت پروری، حق گوئی اور بے باکی کے لئے معروف تھے۔ ان کی عربی تصنیف کے مخطوط مخزونہ دار الکتب المصریہ قاہرہ کو ڈاکٹر محمود یوسف زاہد پروفیسر امریکن یونیورسٹی لبنان نے متعدد کتب کی مدد سے تصحیح و تنقیح کے بعد مرتب کیا اور کوکب شادانی نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔

ابوبکر محمد بن یحییٰ نے تحقیق کے ذریعہ غیر جانبدارانہ طور پر واقعات کو یکجا کیا ہے کتاب کے تین ابتدائی ابواب ۱۔ نسب، اولاد و ازواج ۲۔ قبول اسلام اور ہجرت ۳۔ ذکر بیعت و مجلس شوریٰ حالات قبل از خلافت سے متعلق ہیں جو نہایت مختصر ہیں باب چہارم تا دہم کا تعلق اسباب و واقعات شہادت کے بارے میں ہے۔ اصل نسخہ کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ مصنف کا مقصد مکمل سوانح عمری مرتب کرنا نہیں تھا بلکہ شہادت کی وجوہات اور واقعات کا ذکر کرنا تھا اس لئے متعینہ موضوع سے انصاف کیا گیا ہے۔ کتاب کو جامع سوانح عمری میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

**ذکر احسن : محمد صدیق الہ آبادی : کراچی : ۱۹۷۸ء**

صاحب حال و قال بزرگ حضرت اشرف علی تھانوی نے بے شمار حضرات کو روحانی فیوض و برکات سے نوازا ہے اور ہر ایک کو معیار کے مطابق عطا کیا ہے۔ محمد نجم احسن نگرامی بھی ان کی صحبت سے فیضیاب تھے اور انہیں حقیقی معنوں میں اپنا مرشد تسلیم کرتے تھے محمد صدیق الہ آبادی نے کمال حسن عقیدت سے محمد نجم احسن نگرامی کی سوانح مرتب کی ہے۔ جس میں ان کے



حسب نسب، شجرۂ خاندانی، والد محترم، والدہ محترمہ وغیرہ کے اجمالی حالات بھی ہیں مصنف کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ بہ پاس ادب انہوں نے نام لینے کے بجائے صرف "بابا صاحب" لکھا ہے ظاہر ہے جب اس انداز کو ملحوظ رکھ کر قلم اٹھایا جائے گا تو غیر جانبداری کا حق ادا ہونے سے رہا لیکن واقعات زندگی کی صحت پر مصنف کو اصرار ہے کیونکہ بیشتر باتیں انہیں صاحب سوانح سے ہی معلوم ہوئی ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ حضرت نگرامی کا سلسلۂ نسب حضرت عبادہ بن صامت انصاری سے ملتا ہے۔ ان کے والد حاجی محمد احسن وحشی نگرامی باکمال اور صاحب علم و تقویٰ بزرگ تھے شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ ۱۹۲۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔ محمد نجم احسن نگرامی کی ولادت ۱۳۱۰ھ میں ہوئی۔ انہیں عربی، فارسی زبانوں کے علاوہ دینی تعلیم بھی دی گئی بعد میں وہ جدید تعلیم سے بھی بہرہ اندوز ہوئے اور ۱۹۲۹ء میں بی اے کیا اردو میں شاعری ہی نہیں کی بلکہ مضمون نگاری بھی کی جو معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہے ان کے والد نے انہیں بیعت کے لئے کہا لیکن مرشد کا انتخاب ان پر چھوڑ دیا کئی بزرگوں کی صحبت میں رہنے کے بعد دل حضرت اشرف علی کی جانب رجوع ہوا اور زندگی بھر انہیں سے فیض پایا۔ مرشد سے ان کے تعلقات کی نوعیت اور ذہنی رجحانات کے اظہار کے لئے مصنف نے ان کے متعدد خطوط اور حضرت تھانوی کے جوابات بھی شامل کتاب کئے ہیں۔ نجم احسن نگرامی کے روحانی تصرفات کا حال تفصیلاً درج ہے اور ان کی شاعری کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔ خانگی حالات نسبتاً اجمالی ہیں۔ ان کی دو ازواج کا ذکر ہے حالات کو موضوعات میں تقسیم کرکے ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس نوع کی عقیدت مندانہ تحریروں میں یہ کتاب اس لئے بہتر ہے کہ صاحب سیرت کی داخلی و ازدواجی زندگی کے بہت سے گوشوں کو واضح کیا گیا ہے۔

**حیات مولانا احمد رضا خان بریلوی : ڈاکٹر محمد مسعود احمد : سیالکوٹ : جنوری ۱۹۸۰ء**

مولانا احمد رضا خان بریلوی (۱۸۵۶ء۔۱۹۲۱ء) برصغیر پاک و ہند کے جید عالم گزرے ہیں جن کی اسلامی تعلیمات میں اجتہاد غالب ہے اور ان کے پیروؤں کی ایک کثیر تعداد اقصائے برصغیر میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کی مذہبی خدمات، سیاسی افکار، اردو، فارسی، عربی شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر محمد مسعود احمد نے "حیات مولانا احمد رضا خان بریلوی" مرتب کی ہے۔ خاندانی حالات کے ضمن میں مولانا کے دادا مولانا محمد رضا علی خان (۱۸۰۹ء تا ۱۸۶۶ء) اور والد محمد نقی علی خان

(۱۸۳۰ء تا ۱۸۸۰ء) کا اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے ان کی اسلام سے محبت، علم سے رغبت اور اہم خدمات کا ذکر بھی کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاندانی روایات اور گھریلو ماحول کا ان پر کتنا اثر تھا۔ بزرگوں کی روایات ان کی تعلیم و تربیت ہی تھی جس نے مولانا کو ایسا صالح مسلمان بنا دیا جو دوسروں کے لئے راہ نما ثابت ہوا۔ ان کی تعلیم کا آغاز بھی پرانے مذہبی گھرانوں کے طرز پر ہوا۔ مصنف کی صراحت کے مطابق انہوں نے آٹھ مستند علماء و فضلاء سے سند حدیث و فقہ حاصل کیا۔ اپنے والد سے ۲۱ علوم حاصل کئے۔ ان کے علاوہ تقریباً "۳۵ علوم و فنون کو مطالعہ سے حاصل کیا اس قدر جامع العلوم ہستی شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہے۔ ریاضی، ہیئت اور نجوم کے حوالے سے بھی ان کی توقیت کے واقعات درج کئے گئے ہیں۔ مولانا کی عظمت کے بارے میں مصنف نے صرف مدح خوانی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ ہر وصف کو مستند و معتبر حوالوں کے ساتھ لکھا ہے۔

انہوں نے بریلی میں منظر اسلام کے نام سے ایک مدرسہ ۱۹۰۴ء میں قائم کیا جہاں بنگال، بہار، پنجاب اور سرحد کے سیکڑوں طلباء ہر سال حصول علم کے لئے آتے تھے۔ وہ تدریس کے علاوہ فتاویٰ کے ذریعہ بھی مسلمانوں کی رہنمائی کرتے تھے اور دور دور سے استفتاء ان کے ہاں آیا کرتے تھے۔ ان کے فتاویٰ کو بھی خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ مصنف نے بعض فتاویٰ کے حوالے سے ان کی وسیع النظری اور مسائل پر عبور کی عکاسی کی ہے سیاسی معاملات میں بھی انہوں نے فتوے جاری کئے ان کی تاریخی اعتبار سے خصوصی اہمیت ہے کیونکہ تحریکات خلافت و عدم تعاون اور ہجرت کے سلسلہ میں جب تمام اقوام ہند خصوصاً" مسلمان جذبات کی رو میں بہہ رہے ہیں جن اہم سیاسی رہنماؤں نے ان کی تائید نہیں کی ان میں علامہ اقبال اور قائد اعظم کے علاوہ مولانا بریلوی بھی شامل تھے۔ حقائق کو پیش نظر رکھ کر اور جذباتیت سے مبرا ہو کر تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ان بزرگوں کا خیال درست تھا۔

کتاب کے ایک باب میں اولاد، اخلاف اور احباب کا بھی ذکر کیا گیا ہے لیکن نجی زندگی، روز مرہ مصروفیات، اہل خاندان سے سلوک کے بارے میں تفصیلات درج نہیں ہیں۔ اس سے صاحب سوانح کی زندگی کا ایک پہلو تشنہ رہ گیا ہے۔

کتاب فن سوانح کے تمام تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ خانگی زندگی کے چند گوشوں پر سے پردہ ضرور اٹھایا گیا ہے لیکن تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے غالباً" مصنف کا مقصد مولانا کے کارناموں کو اجاگر کرنا تھا ان پر سیر حاصل معلومات فراہم کی ہیں جبکہ سوانح کو ضمنی اہمیت دی ہے۔



## عثمان ذوالنورین : مولانا سعید احمد اکبر آبادی : دہلی : ۱۹۸۲ء

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا دور حاضر کے اکابر علماء میں شمار ہوتا ہے ان کا انتقال ۱۹۸۵ء میں ہوا۔ انہوں نے اپنی وسیع معلومات، تجزیاتی مطالعہ اور اخذ نتائج سے تحریری طور پر مسلمانوں کو بہرہ اندوز کیا ہے ان کی یادگاروں میں "صدیق اکبر" اور "مسلمانوں کا عروج و زوال" کے علاوہ "تذکرۂ عثمانی ذوالنورین" ہیں۔

تذکرۂ عثمان ذوالنورین بیک وقت خلیفہ سوم کے سوانح، سیرت کے مطالعہ اور اس دور کی جامع تاریخ ہے کیونکہ سوانح اور تاریخ لازم و ملزوم ہیں۔ انہیں باہم مربوط رکھا گیا ہے تواریخ کا مطالعہ کیا ہے اور استفادہ کیا ہے بلکہ مقدمہ میں ان کی بیان کردہ باتوں کی صداقت و عدم صداقت سے بھی بحث کر کے اپنے وسعت مطالعہ اور قوت استدلال کو لوہا منوالیا ہے سابقہ تواریخ، سوانحی حالات اور روایات میں جو باہم اختلاف ہیں ان پر بھی نظر رکھی ہے منطقی تجزیے کے ذریعے صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اس میں نہ تو جوش عقیدت میں جانبدارانہ رنگ ہے اور نہ کسی نوع کا شبہ، شبلی اسکول کی سوانح نگاری کو آگے بڑھانے کے سلسلہ میں یہ ایک اہم تصنیف ہے۔

صاحب تذکرہ کی سیرت کے حوالے سے نہایت گراں قدر مواد کو ضروری حوالوں، ان کے بارے میں توضیحات اور تشریحات کے ساتھ جمع کیا ہے۔ مصنف نے حضرت عثمان کے نسب و خاندان، ان کی ولادت، تجارت، قبول اسلام، نکاح، نکاح ثانی، قبول اسلام کے بعد کے شواہد، ہجرت حبشہ، ہجرت مدینہ، غزوات اور سرایہ میں شرکت، حضور کے عین حیات اسلام کی خدمت، عہد خلافت اول و ثانی میں مشاورت، ان کے اپنے دور خلافت کے کارنامے، وہ سیاسی وجوہ جن کی وجہ سے انتشار اور اختلاف پیدا ہوئے، سب کا حال تفصیل سے تاریخی تسلسل میں بیان کیا ہے۔ اس کے ذریعہ ان کی زندگی کے تمام ادوار قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔ ان کی سیرت کے حوالے سے بھی ہر نوع کی تفاصیل موجود ہیں۔ حضرت عثمان صاحب ثروت تھے لیکن جاہ پسند نہیں تھے انہوں نے اسلام کے مقاصد، اس کی اشاعت اور دفاع کے لئے ہمیشہ اپنی دولت نثار کی۔ وہ نرم خو اور احتیاط پسند بھی تھے اس کے باوجود امور شریعت میں سختی بھی فرماتے تھے۔ اجرائے حد میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ دیگر اہل مذاہب سے بھی حسن سلوک فرماتے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ جمع قرآن مجید ہے اس سلسلہ میں انہوں نے ہر طرح کی کوشش بھی کی اور احتیاط سے بھی کام لیا۔

سکندریہ کی دوبارہ فتح لیبیا اور اندلس کی فتح، اندلس پر حملہ، جزیرۂ قبرص کی فتح، جزیرۂ ارواد کی فتح، جزیرۂ روس کی فتح، جزیرۂ صقلیہ پر حملہ رومیوں کے بحری بیڑے کی شکست، خراساں کی فتح، سیستان اور کابل کی فتح، آل سامان کی طاقت کا خاتمہ انہیں کے عہد کے کارنامے ہیں۔ ان کے عہد میں جو وسیع و عریض مملکت اسلامیہ وجود میں آئی تھی اس میں نظم و نسق کے قیام میں بھی ان کی مساعی قابل ستائش ہی نہیں قابل تقلید تھیں وہ اعلیٰ عمال کے کاموں کی نگرانی کرتے، ان کا محاسبہ کرتے یہاں تک کہ معزول بھی کردیا جن میں عمرو بن العاص اور ولید بن عقبہ شامل تھے۔ صوبوں کو مناسب طور پر تقسیم، دیوان عطا کا قیام، مالیاتی نظام کا قیام فوجی چھاؤنیوں کا قیام، محکمۂ احتساب کا قیام، رفاہ عام کے کام، مسجد نبوی کی توسیع وہ اہم خدمات ہیں جو انہوں نے انجام دیں ان کے عہد میں اسلامی جمہوری نظام رائج رہا جبکہ عام آدمیوں کو عمال اور گورنروں کے خلاف شکایات کرنے کا حق تھا۔ وہ خود ان شکایات کو سنتے اور ان کے ازالہ کی کوشش کرتے۔ ان تمام کارناموں کی وجہ سے مسلمان مال و زر کی افراط کا شکار ہوئے جو رحمت کے بجائے فتنہ کا سبب بنتی رہی ہے مصنف نے اس پہلو کو زیر بحث لا کر ان منظم سازشوں کا تفصیلی احوال لکھا ہے جو خصوصاً "مصریوں کی جانب سے کی گئیں اور ان کی شہادت پر منتج ہوئیں۔

مصنف نے تاریخ اور سوانح کو ساتھ ساتھ بیان کرنے کا حق ادا کیا ہے اور اسے محض تاریخ نہیں بننے دیا ہے ان کا طرز تحریر اور نقطۂ نظر سنجیدہ باوقار اور (Objective) استدلالی ہے۔ وہ حالات اور واقعات سے بھی بیان کرتے ہیں ان کا تجزیہ بھی کرتے ہیں اور نتائج کی تاریخ سے مطابقت بھی پیدا کرتے ہیں۔ اس دور میں لکھی گئی سوانح عمریوں میں اسے ہر اعتبار سے ایک ممتاز مقام پر رکھا جا سکتا ہے۔

### عرفان قادر (سیرت شیخ عبدالقادر جیلانی) : عبدالعزیز عرفی : کراچی : ۱۹۸۴ء

عبدالعزیز عرفی نے "عرفان قادر" کے نام سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے سوانحی حالات، اسلام کے لئے ان کی خدمات اور طریقت میں ان کے مسلک کی وضاحت کی ہے۔ ابتدائی ابواب میں خاندانی پس منظر ہے۔ آپ کے والد سید موسیٰ جنگی دوست اور والدہ سید فاطمہ ام الخیر کے اوصاف حمیدہ کو بھی موضوع بنایا ہے صاحب سیرت کی ولادت کا ذکر اور بعض متحیر العقول واقعات کے حوالے بھی دیئے ہیں لیکن بچپن کے حالات تشنہ ہیں صرف حصول علم کے ذوق و شوق کے حوالہ سے چند باتیں تحریر کی ہیں۔ اسی شوق کو پورا کرنے کے لئے بغداد کا سفر اختیار کیا جہاں حصول علم کا سلسلہ آٹھ برس جاری رہا۔ اس حوالہ سے بھی تفصیلات موجود نہیں۔



البتہ آپ کے مسلک طریقت پاکیزگی اطوار کا حال نسبتاً" تفصیل سے ہے۔ مصنف نے حالات زندگی بیان کرنے کے دوران بعض مباحث چھیڑ دیئے ہیں جو طوالت کلام کی وجہ سے سلسلۂ بیان میں حارج ہیں اور سوانح نگاری یا سیرت نگاری کا حق ادا کرنے میں مزاحم ہیں۔

### حضرت سید صاحب بانسوی (سید شاہ عبدالرزاق بانسوی) : مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی : کراچی : ۱۹۸۸ء

برصغیر میں قائم رشد و ہدایت کے بڑے اور اہم مراکز میں فرنگی محل بھی شامل ہے جس کے صوفیاء و علماء دینی خدمات کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست میں بھی مثالی کردار ادا کرتے رہے اس میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا صبغۃ اللہ شہید اور خود مؤلف کا نام قابل ذکر ہیں۔ صوفیاء و علمائے فرنگی محل کے جد سید شاہ عبدالرزاق بانسوی تھے۔ اپنے زمانہ کے عالم اور صاحب کرامات بزرگ مانے جاتے تھے۔ مفتی محمد رضا انصاری نے اپنے ان نامور اور قابل احترام بزرگ کی سوانح، مستند ماخذات اور روایات کی بنیاد پر مرتب کرکے نہ صرف اس خانوادہ سے وابستہ لوگوں کی تسکین کا سامان کیا ہے بلکہ عام لوگوں تک ان کے حالات پہنچا کر ان کے فیوض و برکات کا چرچا عام کیا ہے۔ سوانح تحقیقی نوعیت کی ہے جس میں ضروری حوالوں کے ساتھ ہر بات تحریر کی ہے۔ شان حسن عقیدت و ارادت کا کہیں شائبہ نہیں۔ مدح و قصیدہ خوانی سے گریز کرکے حقائق کے انکشاف پر توجہ مبذول رکھی ہے۔ گویا احترام فن ملحوظ رکھا ہے۔ موضوعات کو ۲۳ سرخیوں کی ذیل میں بیان کیا ہے ان میں خاندان، شجرۂ نسب، ولادت اور بچپن، مراحل عمر شریف، مرشد کامل کی خدمت میں، حلیہ مبارک اور خصائل و شمائل، حکم اظہار و اعلان ولایت، غیر مسلموں سے میل جول، تیہواروں میں شرکت، وصال و صایا، اہل و عیال کا تعلق براہ راست حیات و سیرت سے ہے انہیں سے سوانح نگاری کا حق ادا ہوا ہے دیگر موضوعات سید صاحب کے کارناموں، کرامات اور خرق عادات، صوفیانہ فکر و عمل کے حوالے سے ہیں۔ انہیں بھی سیرت و کردار سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے بغیر سید صاحب کی شخصیت مکمل نہیں ہو سکتی اس لئے ہر موضوع پر مکمل روشنی ڈالی ہے سید صاحب کے صوفیانہ مسلک کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر سامنے آئی ہے کہ وہ میل جول میں مذہب اور ذات پات کا خیال نہیں رکھتے تھے اور دیگر مذاہب کی قابل احترام ہستیوں کے لئے بھی احترام کے جذبات رکھتے تھے۔ مولانا حسرت موہانی اس خانوادے کے مرید تھے ان میں بھی یہ خصوصیت موجود تھی جس کا

اظہار ان کے ان اشعار سے ہوتا ہے جو ہندوؤں کے اوتاروں کی شان میں کہے گئے ہیں۔

فرنگی محل رشد وہدایت کے علاوہ علوم شرقیہ کا مرکز بھی رہا ہے۔ مؤلف نے ضمناً "درس نظامیہ" کے اجراء اور اس کی ترقی و ترویج کا حال بھی بیان کردیا ہے اس کتاب میں سید صاحب کی زندگی اور سیرت کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔

**صاحب السیف والقلم (سوانح اور کارنامے) : سید حسن حسنی**
**گوجرانوالہ : پاکستان : ۱۹۸۸ء**

امام ابن تیمیہ کے سوانح اور کارناموں کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئیں اس سلسلہ کی ایک کڑی جو سب سے زیادہ مختصر اور سرسری نوعیت کی ہے۔ اسے ماقبل کی کتب مصنفہ محمد ابو زہرہ (ترجمہ رئیس احمد جعفری) پروفیسر محمد یوسف کوکن عمری، ڈاکٹر غلام جیلانی برق اور ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری کے حوالوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں نہ تو سوانحی معلومات مکمل ہیں اور نہ کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے مصنف نے حسن عقیدت کے اظہار کے طور پر یہ تعارفی کتابچہ تحریر کیا ہے۔

**سیرت شیخ الاسلام : نجم الدین اصلاحی : دیوبند : بھارت : ۱۹۸۸ء**

مولانا نجم الدین اصلاحی اپنے ممدوح مولانا سید حسین احمد مدنی سے خاص قربت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ وہ مولانا کے خاص فیض یافتہ اور مسترشد ہونے کے علاوہ ان کے علوم و معارف کے شارح و ترجمان بھی ہیں۔ ان کے سوانحی حالات اور تمام علمی، ادبی و دینی کارناموں پر محیط ایک کتاب چار حصوں میں مرتب کی ہے اس کی پہلی جلد "سیرت شیخ الاسلام" سوانح عمری سے متعلق ہے جو تین ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں ولادت سے وفات تک کے حالات سنین کی ترتیب میں بیان کئے ہیں اس کا زیادہ حصہ مولانا کی خود نوشت "نقش حیات" سے ماخوذ ہے اس لئے مستند ہے اضافے بھی کارآمد ہیں۔ دوسرا باب ان کے اخلاق و سیرت کا مرقع ہے۔ تیسرے باب میں ان کے سلوک و تصوف سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب کو سوانح نگاری کے فن کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز کو بے کم و کاست بیان کیا ہے پہلے باب سے مولانا مدنی کے جامع حالات زندگی سے واقفیت حاصل ہوجاتی ہے۔ عالم ظاہری کی روداد کے ساتھ ان کے اخلاق و اوصاف کو بیان کرنے میں بھی حقیقت پسندی سے کام لیا گیا ہے کہیں کہیں عقیدت مندی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں لیکن جس ہستی میں خلق محمدی کا جلوہ اور



اسوۂ صحابہ آشکار ہو اس سے عقیدت کا اظہار نہ کرنا بھی سعادت مندی کے برخلاف سمجھا جاسکتا ہے۔ باب اول کی افادیت اور فنی اہمیت سے انکار کئے بغیر باب دوم کو سراہا جانا چاہئے کیونکہ ماخوذ معلومات نسبت شخصی تجربے سے معلوم سیرت کو کامیابی سے پیش کرنا ہی اصل ہنر ہے اور اس میں مصنف کامیاب رہے ہیں۔

**نواسۂ رسول : ڈاکٹر سید حیدر مہدی نقوی : حیدر آباد (سندھ) : ۱۹۸۸ء**

آنحضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے امام حسین کی یہ سوانح عمری سات ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں پیدائش سے قبل واقعۂ کربلا تک کے حالات زندگی تحریر کئے گئے ہیں۔ اس میں زندگی کے واقعات برائے نام ہیں البتہ ان کے مرتبہ اور رسول اللہ کی ان سے محبت کے بیان کو ترجیح دی گئی ہے اور ان کی سیرت کے نمایاں پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں علم، عفو و درگزر، تواضع، سخاوت، غرباء پروری اور عبادت الٰہی کو نمایاں کرنے کے لئے چند واقعات کی شہادت دی گئی ہے۔ صاحب سوانح کے فضائل سے انکار ممکن نہیں لیکن ان کے ذکر کو مستند حوالوں سے جس طرح بیان کرنا چاہئے اس کی جانب توجہ نہیں دی گئی دوسرے باب کا عنوان "واقعۂ کربلا کا آغاز" ہے جس میں یزید کی تخت نشینی، امام حسین کا یزید کی بیعت سے انکار، مدینہ سے روانگی، مکہ میں قیام، کوفیوں کی جانب سے خطوط کی وصولی، امام حسین کی جانب سے کوفیوں کو جواب، حصول معلومات کے لئے مسلم بن عقیل کا کوفہ روانہ ہونا، وہاں ان کی شہادت کے تاریخی واقعات شامل کئے ہیں۔ تیسرا باب امام حسین کی مکہ سے روانگی سے کربلا تک پہنچنے کے حالات پر مشتمل ہے۔ اگلے باب میں بہت زیادہ تفصیلات کے ساتھ واقعۂ شہادت کو پیش کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں شہدائے کربلا کی تفصیل ہے اور آخری باب میں شہادت امام حسین کے بعد کے وہ واقعات ہیں جو ان کے اہل خانہ پر گزرے۔

مذہبی شخصیات کی سوانح عمریوں میں عام رجحان ایک خاص طبقہ اور مکتبۂ فکر کے پڑھنے والوں کو مطمئن کرنا ہوگیا ہے یہ کتاب بھی اسی رویئے کی پابند ہے عام طور پر مشہور واقعات کو اپنے انداز میں پیش کردینا نہ سوانح نگاری کے حق کو ادا کرتا ہے اور نہ تمام مکتبۂ فکر کے قارئین کو مطمئن کرسکتا ہے۔ سوانحی واقعات کے لئے جس طرح استناد ہونا چاہئے موجود نہیں اور جہاں کہیں ہے یا تو اصول کے مطابق نہیں یا جدید دور کی کتب سے استفادہ ہے۔ پُرجوش اور عقیدت مندانہ طرز بیان سوانح نگاری کے لئے مفید نہیں جبکہ اس کتاب میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

## شیخ الاسلام امام تیمیہ (حیات وسیرت) : ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری : کراچی : ۱۹۸۹ء

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری' مولانا ابوالکلام آزاد کے علمی کارناموں سے متاثر اور ان کی شخصیت کے بے حد مداح ہیں اس وسیلے سے یا اپنی ہی افتاد طبع کی وجہ سے شیخ الاسلام کے حلقہ بگوش بھی ہیں۔ انہوں نے امام موصوف کے بارے میں اس تالیف کو ۱۹۶۹ء میں ہفت روزہ چٹان لاہور میں قسط وار شائع کیا تھا اور تقریباً ۲۰ سال بعد اسے کتابی صورت دی ہے اس تالیف اور اس کی اشاعت کا جو مقصد ان کے پیش نظر رہا وہ آسان زبان اور سہل اسلوب میں اردو کے عام قاری کے لئے کم سے کم قیمت میں زیادہ سے زیادہ ایسی معلومات فراہم کرنا تھا جو امام موصوف کی زندگی کے اہم نقوش' سیرت کے فضائل ومحاسن' ان کی علمی و عملی فتوحات اور استقامت و عزیمت و دعوت میں ان کے عظیم مقام کی آئینہ دار ہو۔ اس مقصد میں مصنف بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ شیخ الاسلام کے خاندان کے حالات' ان کی پیدائش' تعلیم و تربیت' مسند درس و تدریس پر فائز ہونا' میدان سیاست و تدبر میں جوہر دکھلانا' ان کے ادوار' حوادث وابتلا' زندگی کے آخری ایام اور اوصاف و کمالات کو جدا جدا سرخیوں کے تحت اس طرح پیش کیا ہے کہ معمولی پڑھا لکھا بھی دلچسپی سے پڑھ سکتا ہے اور استفادہ کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر ابو سلمان نے "امام ابن تیمیہ" کے نام سے ایک مختصر رسالہ حالات زندگی' اخلاق وسیرت اور علمی کارناموں کے تعارف کے طور پر بچوں کے لئے نہایت آسان زبان میں بھی لکھا ہے جس کی اشاعت ۱۹۷۰ء میں ہوئی تھی۔

## حیات مولانا گیلانی : مولانا مفتی ظفر الدین مفتاح : بنارس : بھارت : ۱۹۹۰ء

مولانا مناظر احسن گیلانی کا شمار موجودہ صدی کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے۔ وہ معقولات اور منقولات میں یکساں درک رکھتے تھے وہ جدید افکار و خیالات اور عصری تقاضوں سے کماحقہ واقف تھے۔ وہ نامور خطیب ومدرس اور صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ مصنف کو صاحب سوانح سے ذاتی طور پر ربط و تعلق رہا ہے اس نے کتاب میں ان کے خاندان' تعلیم و تربیت' دارالعلوم دیوبند میں تحصیل علم اور فراغت کے بعد تلاش معاش کے مراحل' دیوبند میں خدمت تدریس اور حیدر آباد دکن میں جامعہ عثمانیہ اور دارالتالیف و ترجمہ سے منسلک ہو کر علمی و دینی خدمات کے



حوالے سے اہم اور جزوی تمام معلومات جمع کر دی ہیں۔ ان کے علاوہ فہم قرآن' خطابت' شعرو شاعری' سیاست اور تصنیف اور بعض دیگر امور و مسائل میں مولانا کے مخصوص رجحان اور انفرادی خیالات پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے ان کے اخلاق و عادات کا مرقع بھی جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے گویا صاحب سوانح کے مکمل حالات زندگی' ان کے احوال دنیاوی مصروفیات اور دینی خدمات کے ساتھ ان کی سیرت اور باطنی کیفیات اور ذہنی رجحان کو ۳۳۶ صفحات میں سمیٹ لیا ہے۔ مصنف جو خود بھی عالم اور ادیب ہیں سوانح کے فنی تقاضوں کا بھی خیال رکھا ہے اور اپنے طرز تحریر سے قاری کے لئے معلومات اور دلچسپی کا سامان بھی فراہم کیا ہے۔

## المرتضیٰ : سید ابوالحسن علی ندوی : طبع اول : ۱۹۸۸ء' طبع دوم ۱۹۸۹ء' طبع سوم : کراچی : ۱۹۹۰ء

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی موجودہ دور کے عالم' محقق اور متعدد کتب کے مصنف ہیں۔ ان کی تصانیف برصغیر پاک وہند میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاتا ہے کہ زیر نظر تصنیف کے تین ایڈیشن تین سالوں کے اندر شائع ہوئے اردو کی مطبوعات میں مقبولیت کی ایسی سند شاید ہی کسی کو حاصل ہوئی ہے۔

"المرتضیٰ" حضرت علی کی جامع سوانح عمری ہے جو اولاً "اور اصلاً" عربی میں مکمل ہوئی اور دمشق سے شائع ہوئی تھی۔ مصنف نے خود اسے اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ ترجمہ نہیں "تفتیش ثانی بہ انداز دیگر" ہے۔ عربی کتاب کے مقابلہ میں اضافے بھی ہیں۔ تحقیق میں کبھی "حد تکمیل" نہیں آتی کیونکہ معلومات کے خزانے ختم نہیں ہونے پاتے۔ اس لئے اس کتاب کو تصنیف کا درجہ حاصل ہے۔

کتاب بالکل نئے انداز سے مرتب کی گئی ہے۔ عام رجحان حالات زندگی کو تاریخی تسلسل میں بیان کرنے کا ہے لیکن مصنف نے موضوعات کی اہمیت کے پیش نظر ابواب قائم کئے ہیں۔

باب اول میں پیدائش سے ہجرت تک کے واقعات اور باب دوم میں ہجرت سے وفات تک کے واقعات شامل ہیں۔ ان دو ابواب میں سوانحی خاکہ مکمل ہو گیا ہے چونکہ بہت سے امور ایسے ہیں جو اختلاف بلکہ تنازع کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ مصنف نے صحیح صورت حال پیش کر کے انہیں رفع کرنے اور ملت کو متحد الخیال بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی سوانح وسیرت کے حصے ہیں۔ باب سوم حضرت علی کرم اللہ وجہہ' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ' کے عہد خلافت میں'

باب چہارم سیدنا عثمان بن عفانؓ کے دور خلافت میں' باب ششم حضرت علی کرم اللہ وجہ اپنے دور خلافت میں' باب ہفتم حضرت علی خوارج اور اہل شام باب ہشتم "سیدنا علی خلافت کے بعد" کے عنوانات کے تحت بیش قیمت تحقیقی مواد یکجا کیا ہے۔ ایک باب "جوانان اہل جنت کے سردار حسن اور حسین رضی اللہ عنہا کے لئے مختص ہے۔

کتاب میں مضامین کی ترتیب تاریخی تسلسل میں ہے۔ ہر دور کے تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ گھریلو زندگی کے بارے میں بھی انتہائی چھان بین سے کام لیا ہے اور اس سلسلہ میں مصنف کو سخت مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ اس بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ

"ایک ایسی اولوالعزم نادرہ روزگار "عبقری" شخصیت پر قلم اٹھانا آسان نہیں جس کی اصل شخصیت افراط و تفریط اور اختلافات کے پردوں کے پیچھے پوشیدہ ہو اور جس کو ہر فریق اپنی خاص عینک سے' اپنے افکار و نظریات اور روایتی عقائد کے آئینہ میں دیکھتا ہو۔ یہاں تک کہ پوری زندگی چند متضاد خیالات و تصورات کا مجموعہ بن گئی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نام تو ایک ہے مگر شخصیتیں متعدد اور متضاد ہیں اور اصل شخصیت اور اس کی "عبقریت" اب بھی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔"(۲۷)

مصنف نے حضرت علی کی سوانح عمری اس انداز میں مرتب کی ہے کہ ان کے عصر کی بھی تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے اور ان کے ان تعلقات پر بھی روشنی پڑے جو خلفائے ثلاثہ سے تھے تاکہ ان میں موجود باہم اخلاص و تعاون کا اظہار ہو سکے۔ صاحب سیرت کے دور خلافت پر بھی مؤرخانہ روشنی ڈالی ہے جو نازک مسائل و مشکلات سے معمور تھا۔ اس زمانہ میں بھی وہ اپنے انتظامی اور اصلاحی اصول پر سختی سے قائم رہے اور اعلیٰ اسلامی اقدار میں ذرا سی بھی لچک پیدا کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ ان تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ ان کی پاک اور بے داغ زندگی اور ان کی شخصی خصوصیات کے نمونے بھی پیش کئے ہیں اس تصنیف کی وقعت میں ان کے محققانہ اور باوقار انداز تحریر نے اضافہ کر دیا ہے۔

**سیرت حضرت عمرؓ : چراغ حسن حسرت : لاہور : س۔ن (آزادی کے بعد)**

حضرت عمر خلیفہ دوم کے حالات زندگی نہایت سلیس انداز اور آسان زبان میں بچوں کے لئے اردو کے معروف ادیب اور صحافی چراغ حسن حسرت نے تحریر کئے ہیں۔ ان کا انداز دلنشین ہے اور ان تمام اہم واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے جو کم عمر قاری کے لئے ضروری سمجھے گئے۔



تاریخی اعتبار سے عہد بہ عہد کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے سوانحی حالات کا سرسری جائزہ پیش کیا ہے۔ تاریخ کے اہم واقعات اور اس کے حوالہ سے صاحب سیرت کی شخصیت کو خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ فلاحی کاموں کا ذکر مؤثر انداز میں ہے۔ شہر آباد کرنے' نہریں نکالنے' آب پاشی کا بہتر انتظام کرنے' سرائیں' کنوئیں اور مسجدیں تعمیر کرنے' مالگزاری کا انتظام بہت کرنے' انصاف میں غیر جانبداری سے کام لینے کی خوبیاں بیان کر کے نوجوان ذہنوں میں یہ بات ڈال دی ہے کہ حکومت خدمت کی خاطر ہوتی ہے نہ کہ جاہ و جلال کے لئے! مصنف نے مقصد کے لحاظ سے موضوع سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔

# باب چہارم (ج)

## اہل فلسفہ اور مذہبی شخصیات کی مختصر و جزوی

## (اجتماعی، انفرادی) سوانح عمریاں

## (۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء)

## حضرت امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی : علامہ مناظر احسن گیلانی : کراچی : ۱۹۴۹ء

علامہ مناظر احسن اپنے عہد کے جید عالم تھے۔ وہ دینی مسائل' فقہ اور تاریخ اسلام پر کامل دسترس رکھتے تھے انہوں نے امام ابو حنیفہ کے ان کارناموں کو جو حکومت اور دین کے استحکام کے مقصد کے تحت سرانجام دیئے مکمل تاریخی تناظر میں پیش کیا ہے۔ بنی امیہ کے زوال کے اسباب اور بنی عباس کے دور حکومت کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر امام صاحب نے ایسے فرائض اپنے ذمہ لے لئے تھے کہ ان سے ملت و حکومت میں استحکام پیدا ہو۔ انہوں نے بنی امیہ کے خلاف تحریک کے آغاز ہی میں اس ضرورت کو محسوس کر لیا تھا کہ معاشرے میں ایسے تربیت یافتہ افراد ہونے چاہئیں جو مستقبل میں حکومتی عہدیدار بن کر پوری تن دہی اور بے نفسی سے اپنی بساط بھر کوشش ملکی و قومی فلاح کے لئے انجام دے سکیں چنانچہ خلافت عباسیہ کے آغاز پر انہوں نے کئی سو افراد ایسے تیار کر لئے جو عالم با عمل تھے۔ ان میں دین داری' دیانت اور ساتھ ہی فرائض نظم و نسق کی پابندی بھی تھی۔ جب یہ ہو گیا تو انہوں نے رائے عامہ کو ہموار کیا تاکہ جاہل اور رشوت خور افسروں کو خدمت سے الگ کروایا جائے۔ ایسے قوانین اور طریق کار متعین کئے جائیں کہ خلیفہ بھی روزمرہ کے انتظام میں دخل اندازنہ ہو سکے۔ اپنے اصول حکمرانی کی تعلیم کو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے یہ پالیسی اپنائی کہ کبھی حکومت کا کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ اس رویّہ کی پاداش میں کبھی جیل گئے اور کبھی کوڑے کھائے لیکن اپنے اصول سے نہیں ہٹے یہاں تک کہ جب ابو جعفر نے انہیں قاضی القضاۃ مقرر کرنا چاہا اور انکار پر قسم کھائی کہ وہ اس عہدہ پر انہیں مامور کر کے رہے گا تو امام صاحب نے بھی اس کے روبرو قسم کھائی کہ اس عہدہ کو قبول نہیں کریں گے۔

امام صاحب نے نوجوانوں کی تربیت جس مقصد کے لئے کی تھی وہ ان کی وفات کے بعد اندرون دس سال حاصل ہو گیا جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے۔

دس سال بھی نہیں گزرے تھے کہ ان کے شاگرد نظم و نسق پر چھا گئے اور امام ابو یوسف کی سرکردگی میں ڈیڑھ سو سالہ اسلامی مملکت کو تباہی سے بچا کر مزید چند سو سال تک ایک نئی اور زیادہ صحت مند زندگی بخشنے کا سامان ہو گیا۔" (۲۸)

کتاب بنی امیہ اور بنی عباس کے ادوار کی تاریخ بھی ہے جن کی خوبیوں اور برائیوں کو بیان کرتے ہوئے امام صاحب کے ردّعمل کا جائزہ لیا گیا ہے خامیوں اور برائیوں کو دور کرنے کے

لئے انہوں نے جو فکری اور عملی اقدامات کئے وہ تاریخی پس منظر میں زیادہ واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔

مصنف نے تاریخ دانی اور سوانح نگاری کا حق ادا کیا ہے اور اس تحقیقی تصنیف کے ذریعہ علمائے حق کی شان' ان کی بے غرضی اور قومی احساس کو درس عبرت کے طور پر اجاگر کیا ہے۔ طرز تحریر عالمانہ ہے جو صاحب سوانح کے ذکر کے لئے ضروری تھا۔

**سیرت آئمہ اربعہ : رئیس احمد جعفری : لاہور : ۱۹۶۰ء**

رئیس احمد جعفری نے مسلمانوں کے چار بڑے فرقوں کے آئمہ کی سوانح عمریاں ایک ہی تالیف میں جمع کردی ہیں۔ امام ابو حنیفہ' امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے حالات الگ الگ چار ابواب میں بیان کئے ہیں۔ مصنف نے ان آئمہ کے بارے میں مختلف کتابوں میں موجود معلومات کو یکجا کردیا ہے اور اس میں نہ تحقیق کو دخل ہے اور نہ کسی قسم کا اضافہ! ایک طرح سے یہ ترتیب نو ہے۔ ہر ایک صاحب سوانح کے حالات زندگی کو تاریخی ترتیب اور ممکنہ تفصیل سے قلم بند کیا ہے۔ فن کے روایتی انداز کو کام میں لایا گیا ہے۔ پیش کردہ مواد اور طرز بیان میں کوئی نیا پن یا خصوصی حسن نہیں ہے۔

**چودہ ستارے : مولانا سید نجم الحسن کراروی : لاہور : ۱۳۹۳ھ (م ۱۹۷۳ء)**

مسلمانوں کے فرقہ اثناء عشری کے معتقدات کے مطابق بارہ آئمہ دینی اور روحانی پیشوا اور رہنمائی کے سرچشمے ہیں۔ ان میں حضرت علی' حضرت امام حسن' حضرت امام حسین' حضرت امام زین العابدین' حضرت امام باقر' حضرت امام جعفر صادق' حضرت امام موسیٰ' حضرت امام رضا' حضرت محمد تقی' حضرت امام علی نقی' حضرت امام حسن عسکری' حضرت امام مہدی آخر الزمان شامل ہیں۔ ان کے علاوہ رسول پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہرہ کی ذات بابرکات کو شامل کرکے چودہ معصومین سمجھا جاتا ہے۔ جن کی بزرگی اور طہارت کی یہ دلیل دی جاتی ہے کہ یہ مقدس ہستیاں خطا اور عیب سے مبرا تھیں۔ مولانا سید نجم الحسن کراروی نے ان شخصیات بلند مرتبت کے سوانحی حالات کتب تواریخ و سیر کی مدد سے مرتب کئے ہیں۔ اپنی اس تالیف کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ

"میں نے اس کی پوری سعی کی ہے کہ واقعات صحیح' الفاظ و عبارت موجز و مختصر اور حالات درست لکھے جائیں۔ تاریخ ولادت و شہادت کی صحت پر بھی پوری قوت صرف کی جائے اور میں



نے اس کی سعی بلیغ میں بھی دریغ نہیں کیا کہ صحیح تاریخ منظر عام پر آجائے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق اس کی بھی کوشش کی ہے کہ جو واقعات بعض معاصرین نے غیر مناسب لکھ دیئے ہیں وہ بھی صاف ہو جائیں اور اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے۔ میں نے ایسا بھی کیا ہے کہ جن معصومین کے کوائف و حالات مشہور ہیں انہیں زیادہ اختصار سے لکھا ہے اور جو زیادہ پردۂ خفا میں ہیں ان کی قدرے وضاحت کی ہے۔" (۲۹)

پہلے باب سے قبل حضور سرور کائناتؐ کے خاندانی حالات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آپ کے اجداد میں قصی' عبد مناف' ہاشم' جناب اسد' جناب عبدالمطلب' جناب عبداللہ' حضرت ابو طالب' جناب عباس اور جناب حمزہ کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ حضورؐ کے واقعات کو سنین کی ترتیب میں لکھا ہے کہ اور ساتھ ہی اس سال کے اہم تاریخی واقعات جن کا تعلق سرزمین عرب یا اس کے اطراف و جوانب سے تھا تحریر کیا ہے۔ اس طرح آپ کے حالات زندگی کے پس منظر میں تاریخ بھی بیان کردی ہے بعثت سے قبل اور بعد کے حالات اگرچہ مختصر ہیں لیکن جامع ہیں۔ ان میں گھریلو خانگی حالات' اسلام کی تبلیغ' جہاد' ہجرت' غرض تمام امور کا احاطہ کیا ہے اور سیرت کے جوہر کو نمایاں کیا ہے۔

ایک ایک باب ہر بزرگ شخصیت کے لئے وقف کرکے ان کی سوانح عمریاں مرتب کی ہیں۔ حضرت فاطمہ زہرا کے حالات کے ضمن میں اس امر پر بھی بحث کی گئی ہے کہ آیا آنحضرتؐ کی حضرت خدیجہ سے حضرت فاطمہ کے سوا بھی اولادیں تھیں یا نہیں مختلف تاریخی حوالوں پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے مؤلف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آپ کی واحد صاحبزادی حضرت فاطمہ تھیں جن کی ولادت ۶۱۴ / ۶۱۵ عیسوی میں ہوئی یکم ذی الحجہ ۲ھ میں آپ کا عقد حضرت علی سے ہوا' ور ۲۴ ذی الحجہ کو رخصتی ہوئی۔ انہیں رسول خدا نے جو جہیز عطا فرمایا تھا اس کی تفصیل بغرض عبرت و رہنمائی درج کردی ہے جہیز جو دیا گیا یہ تھا (۱) ایک قمیض قیمت سات درہم (۲) ایک مقنع (۳) ایک سیاہ کمبل (۴) ایک بستر کھجور کے پتوں کا بنایا ہوا (۵) دو موٹے ٹاٹ (۶) چمڑے کے چار تکیے (۷) آٹا پیسنے کی چکی (۸) کپڑا دھونے کی لگن (۹) ایک مشک (۱۰) لکڑی کا بادیہ (۱۱) کھجور کے پتوں کا بنا ہوا ایک برتن (۱۲) دو مٹی کے آبخورے (۱۳) ایک مٹی کی صراحی (۱۴) چمڑے کا فرش (۱۵) ایک سفید چادر (۱۶) ایک لوٹا ان کی گھریلو مصروفیات میں شوہر کی خدمت گزاری کے علاوہ تمام امور خانہ داری بھی شامل تھے ان کی وضاحت کرتے ہوئے مؤلف نے لکھا ہے کہ

"امور خانہ داری میں جناب سیدہ آپ ہی اپنی نظیر تھیں۔ ۷ھ تک آپ کے پاس کوئی کنیز

نہ تھی۔ کنیز نہ ہونے کی صورت میں گھر کا سارا کام خود کرتی تھیں۔ جھاڑو دیتیں، پانی بھرتیں، چکی پیستیں، آٹا چھانتیں، آٹا گوندھتیں، تنور روشن کر کے روٹی پکاتی تھیں۔" (۳۰)

خادمہ فضہ کے آجانے کے بعد تمام کاموں کے لئے باری مقرر کر دی تھی۔ ایک دن خود کام کرتیں اور ایک دن فضہ! بظاہر یہ کوائف ایک ہستی کے ہیں لیکن حقیقت میں ان کی زندگی کی روش امت کے لئے نمونہ تھی۔ مؤلف نے اس بات کا اشارہ کئے بغیر انہیں اہمیت کے ساتھ اسی مقصد کے تحت تحریر کیا ہے اور یہی سیرت نگاری کا وصف ہونا چاہئے حضرت فاطمہ کے بیان کے ضمن میں فضہ کی حالت پر بھی باتفصیل روشنی ڈالی ہے۔

تیسرے باب میں حضرت علی کی سوانح عمری ہے جو "مولود کعبہ، ابوالایمان حضرت ابو طالب اور جناب فاطمہ بنت اسد کے بیٹے، پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ کے سہیم نور، داماد، بھائی، جانشین اور فاطمہؑ کے شوہر، حضرت امام حسنؑ حضرت امام حسینؑ زینب وام کلثوم کے پدر بزرگوار تھے، (۳۱) آپ کی پیدائش ۱۳ رجب عام الفیل مطابق ۶۰۰ء یوم جمعہ خانہ کعبہ میں ہوئی تھی، آپ کی پرورش وپرداخت آغوش رسولؐ میں ہوئی تھی، یہ امر متفق علیہ ہے کہ کم عمر مردوں میں اسلام لانے والوں میں آپ کو سب پر تقدم حاصل تھا۔ مؤلف نے آپ کا حلیہ یوں بیان کیا ہے۔

"آپ کا رنگ گندمی، آنکھیں بڑی، سینہ پر بال، قد میانہ، داڑھی بڑی اور دونوں شانیں، کہنیاں اور پنڈلیوں پر گوشت تھا، آپ کے پاؤں کے پنجے زبردست تھے، شیر کے کندھوں کے مانند آپ کے کندھوں کی ہڈیاں چوڑی تھیں۔ آپ کی گردن صراحی دار اور آپ کی شکل نہایت پُر صفت اور حسین تھی۔ آپ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلا کرتی تھی۔ (۳۲)

حضرت علی کی علمی حیثیت، ان کی شجاعت اور فضیلت کی شہادت میں بکثرت کتب کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ دور خلافت کے حالات، اصلاحات اور دیگر امور کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔

امام حسن کے باب میں ان کی عام زندگی کے واقعات کے ساتھ ساتھ سیاسی حالات، ان کی صلح جویانہ فطرت، گوشہ نشینی، عبادت اور دینی رہنمائی میں مصروفیت اور شہادت کے واقعہ کی تفصیل موجود ہے۔ ضمناً "معاویہ ابن ابی سفیان کا تاریخی احوال پیش کیا گیا ہے۔ (۳۳)

امام حسین کے ذکر میں ان کے اس دور کا احوال زیادہ تفصیل سے بیان ہوا ہے جو آغوش رسول میں گزرا تھا اس سے مؤلف کا مقصد ان کی روحانی اور ظاہری تربیت کی مرجع کی نشاندہی



کرنا معلوم ہوتا ہے ان کے فضائل میں عبادت گزاری، سخاوت، شجاعت بتلائے ہیں ۶۰ھ کی تاریخ تمام تر جزئیات کے ساتھ تحریر کی ہے جس میں یزید کی بیعت سے انکار سے لے کر ۱۰ محرم کے واقعہ کربلا تک کی تفصیلات ہیں۔

دیگر آئمہ کے سوانحی حالات میں ان کے فضائل، دین کی خدمت، راہ حق میں مصائب سے دوچار ہونے اور ان کے دنیاوی اور دینی مرتبہ کے تعین کی کوشش کی گئی ہے ان بزرگوں کے سوانحی حالات کے مطالعہ سے ایک افسوسناک حقیقت ضرور سامنے آتی ہے کہ ان میں اکثر کو کسی نہ کسی طریقے سے شہید کیا گیا اور یہ کام غیروں نے نہیں مسلمانوں نے کیا۔

"چودہ ستارے" اجتماعی سوانح عمریوں پر مشتمل ایسی تالیف ہے جس میں مؤلف نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے ماخذات کی جو فہرست دی گئی ہے ان کی تعداد پانچ سو سے زائد ہے ان میں تمام نکات نظر کے مورخین شامل ہیں۔ اپنے بیانات کا انحصار انہیں پر کیا ہے جہاں کہیں روایات میں اختلافات پایا گیا اس کی نشاندہی کر دی ہے۔ ماخذات کے حوالے متن ہی میں شامل ہیں یہ رجحان عموماً "مذہبی کتابوں میں ملتا ہے۔ اکثر صفحات پر بکثرت حوالے آگئے ہیں جو خواندگی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ یہی شخصیات کی سوانح عمریوں کی نمایاں خصوصیات ہے کہ اسناد و مصادر کو ضروری سمجھا جاتا ہے تاکہ بیان کو یک طرفہ یا خود ساختہ خیال نہ کیا جائے۔ مؤلف نے مخالفانہ یا متنازع بیانات کو نظر انداز کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان پر محاکمہ شواہد کی روشنی میں کیا ہے۔

کتاب بے جا عبارت آرائی، حسن اعتقاد اور ذہنی مرعوبیت کی شکار نہیں ہوئی ہے مؤلف نے ایک عالم کی حیثیت سے پُروقار، مدلل، سنجیدہ رویہ اپنایا ہے جو کسی مکتب فکر کے قاری کو ناگوار نہیں ہو سکتا۔

**حیات حضرت معصومہ قم : ڈاکٹر سید حیدر مہدی : حیدر آباد (سندھ) : ۱۹۸۴ء**

حضرت فاطمہ بنت امام موسیٰ بن کاظم بن امام جعفر صادق عام طور پر حضرت معصومہ کہلاتی ہیں جن کا روضہ ایران کے شہر قم میں واقع ہے جو اپنی عظمت وجلالت، شان وشوکت اور فیوض وبرکات کی وجہ سے شہرت کا حامل ہے۔ انہیں کی ذات بابرکات کی وجہ سے شہر قم علم وفضل کا مرکز بنا۔ وہاں کے مدارس دینیہ کے فیض سے علماء وفقہاء ہزاروں کی تعداد میں تعلیم وتربیت پاکر اقصائے عالم میں پھیلے۔

انقلاب اسلامی کی تحریک علامہ خمینی کی سرکردگی میں یہیں سے اٹھی تھی اور علامہ خمینی کا تعلق مدرسہ فیضیہ سے تھا۔ اس کتاب میں مؤلف نے دو موضوعات پر معلوم فراہم کی ہیں۔ یہ شہر قم کی تاریخ و تعارف بھی ہے اور حضرت معصومہ قم کی سوانح عمری بھی!

امام موسیٰ کاظم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ (معصومہ قم) یکم ماہ ذی قعد ۱۷۹ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئی تھی۔ ۲۰۰ھ میں خلیفہ مامون رشید عباسی نے آپ کے بھائی امام رضا کو مدینہ سے خراسان طلب کیا تھا ان کے جانے کے بعد حضرت فاطمہ ان سے ملاقات کی غرض سے خراسان گئیں۔ راہ میں شہر ساوہ کے لوگ مزاحم ہوئے انہوں نے تمام ہمراہی مردوں کو قتل کردیا جب اس کی اطلاع قم میں پہنچی تو اس خاندان سے عقیدت رکھنے والے ساوہ پہنچے اور حضرت معصومہ کو قم لے آئے جہاں انہوں نے مختصر قیام کے بعد ۲۰۱ھ میں انتقال کیا۔

صاحب سوانح کے حالات زندگی انتہائی مختصر ہیں۔ شہر قم اور دیگر امور پر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ انداز بیان عقیدت و احترام کے جذبات سے معمور ہے۔ مؤلف فن سوانح نگاری کی ضرورتوں کو پورا نہ کرسکے صرف جذبات ارادت کی تسکین کے لئے یہ تالیف کی ہے۔

### شاہان بے تاج : وحیدہ نسیم : مکتبۂ آصفیہ کراچی : ۱۹۸۸ء

وحیدہ نسیم کا تعلق سابق ریاست حیدر آباد دکن کے علاقہ اورنگ آباد سے ہے۔ یہ شہر اولیاء اللہ کے مزارات کی بناء پر نشاندہی کرتا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں بزرگان دین نے اسے رشد وہدایات کا مرکز بنائے رکھا۔ ان بزرگوں کے حالات زندگی اختصار کے ساتھ مختلف کتابوں میں درج ہیں۔ برسوں قبل عبدالجبار ملکاپوری نے ایک ضخیم کتاب "تذکرۂ اولیاء اورنگ آباد" لکھی تھی جو تمام مکتب فکر کے لئے مستند سمجھی گئی۔ وحیدہ نسیم نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام اسی شہر میں گزارے۔ اسی زمانہ سے وہ ان اولیاء وصوفیاء کے لئے جذبات ارادت رکھتی ہیں۔ اس کتاب کی تالیف انہیں جذبات کی مرہون منت ہیں۔ اس میں تقریباً" دو درجن بزرگوں کے حالات اس حد تک بیان کئے ہیں جو ان کے مطالعہ میں آئے یا اہل اورنگ آباد کی زبانی معلوم ہوئے اس میں تحقیق کی وہ کاوش نظر نہیں آتی جو جستجو کے ذریعہ کوائف کی بازیافت کی غمازی کرے۔ حال و احوال کا سرسری انداز سے روایتی تذکروں کی سطح سے بلند نہیں کرتا۔ اکثر صورتوں میں تاریخ پیدائش و وفات معلوم کرنے کی سعی تک نہیں کی گئی۔ شان عقیدت اس طور سے ظاہر ہے کہ ان کے متصوفیانہ خیالات بیان کرنے کے بجائے خرق واقعات پر انحصار کیا گیا



ہے جن کی صداقت کے لئے بھی کوئی سند موجود نہیں۔ موضوع و مواد کی تشنگی اس ضرورت کی متقاضی ہے کہ دقت پسند محقق اس طرف متوجہ کریں۔

### شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا میں علمائے کرام کا حصہ : ڈاکٹر ایوب قادری : لاہور : ۱۹۸۸ء

ایوب قادری نے اسلامی مذہبی تحریکات اور شخصیات کے حوالہ سے کئی تحقیقی مقالے لکھے ہیں ان میں "شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا میں علمائے کرام کا حصہ" سب سے جامع اور وقیع ہے۔ اس مقالہ پر جامعہ کراچی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ مقالہ نگار نے ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے زمانے کی تمام مذہبی تحریکات کا جائزہ لیتے ہوئے ان علمائے کرام کے مفصل حالات زندگی بالتحقیق قلمبند کئے ہیں جنھوں نثری تصانیف کے تحقیقی' تنقیدی اور لسانی جائزے میں اردو نثر کے ارتقا جیسے موضوع کا احاطہ کیا ہے اگرچہ خدمات کا حال تفصیل سے بیان ہوا ہے لیکن جہاں تک سوانحی حالات کی دریافت کا تعلق ہے مقالہ نگار داد تحقیق کے مستحق ہیں اس طرح انہوں نے علمائے کرام کا ایک جامع تذکرہ بھی مرتب کردیا ہے۔

### سیرت زینب : سید احمد ترمذی : لاہور : س-ن (آزادی کے بعد)

حضرت علی کی صاحبزادی' حضرت حسین کی ہمشیرہ جناب زینب کے حالات زندگی پر مشتمل کتاب "سیرت زینب" سرسری نوعیت کی کاوش ہے۔ ان کی پیدائش' تعلیم و تربیت' شادی اور اولاد' کے علاوہ واقعۂ کربلا اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں منتشر اور معروف واقعات کو مرتب کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ تحقیق کی جانب قطعی توجہ نہیں دی گئی اور نہ کسی ماخذ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ علمی وفنی نقطۂ نظر سے تصنیف کسی بھی اہم خصوصیت کی حامل نہیں ہے اور خاص روایات کے حوالے سے عقیدت و احترام کے سوا اس کی اور کوئی خوبی نہیں ہے۔

---

مذہبی شخصیات کی سوانح عمریوں میں فن کی ضرورتوں اور تحقیق کے تقاضوں کو نظرانداز کرکے عام روایات کو بنیاد بنانے کا جو رجحان عام ہے اس کو مثبت رجحان قرار نہیں دیا جاسکتا۔

متذکرہ مذہبی شخصیات کی سوانح عمریوں کے علاوہ قابل ذکر سوانح عمریوں میں تذکرۂ صوفیائے سندھ از اعجاز الحق قدوسی مطبوعہ کراچی ۱۹۵۹ء' تذکرۂ حفاظ پشاور از امیر شاہ قادری مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء' تذکرۂ قادیان ہند از بسم اللہ بیگ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۴۹ء' بزم اشرف کے چراغ از سعید احمد مطبوعہ لاہور ۱۹۸۶ء وغیرہ بھی شامل ہیں۔

# باب چہارم

## مصادر وماخذات

۱۔ خاتم الانبیاء : ڈاکٹر محمد اقبال : الواعظ صفدر پریس، لکھنؤ : ۱۹۵۳ء : صفحہ ۵
۲۔ سیرت نبوی قرآنی : عبدالماجد دریا بادی : صدق جدید بک ایجنسی، لکھنؤ : ۱۹۶۲ء : صفحہ ۲۰۵
۳۔ سیرت سرور دوعالم : مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مرتبہ نعیم صدیقی، ادارہ ترجمان القرآن : لاہور : اکتوبر ۱۹۷۸ء : صفحہ ۱۳
۴۔ سیرت سرور دوعالم، حوالہ مذکورہ، صفحہ ۱۰
۵۔ سیرت سرور دوعالم، حوالہ مذکورہ، صفحہ ۷۵۳
۶۔ سیرت سرور دوعالم، حوالہ مذکورہ، صفحہ ۷۵۳
۷۔ مکتوبات سلیمانی، جلد دوم، صفحہ ۱۳۶
۸۔ بحوالہ رسالہ فروغ اردو، لکھنؤ، عبدالماجد دریا بادی نمبر : صفحہ ۲۹۳
۹۔ امام رازی : عبدالسلام ندوی : مطبع معارف، اعظم گڑھ : ۱۹۵۰ء : صفحہ ۲
۱۰۔ امام رازی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۹
۱۱۔ سید احمد شہید : غلام رسول مہر : شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور : ۱۹۵۱ء : صفحہ ۵۹
۱۲۔ سید احمد شہید : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۴۰۸
۱۳۔ سہ روزہ اخبار صدق جدید، لکھنؤ : ۵ ستمبر ۱۹۵۲ء : صفحہ ۳،۴
۱۴۔ حکیم الامت، نقوش وتاثرات (مقدمہ) : عبدالماجد دریا بادی دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۵۲ء : صفحہ ۷، ۸
۱۵۔ رسالہ معارف اعظم گڑھ : بابتہ ستمبر ۱۹۵۲ء : صفحہ ۲۳۱
۱۶۔ صدق جدید، لکھنؤ : ۵ ستمبر ۱۹۵۲ء : صفحہ ۴
۱۷۔ امام بن تیمیہ : شمس العلماء محمد یوسف کوکن عمری : مدارس، اگست ۱۹۵۹ء : صفحات ۵، ۶

۱۸۔ خواجہ غلام فرید : مسعود حسن شہاب : اردو اکیڈمی بہاولپور : ۱۹۶۳ء : صفحات ۱۳،۱۲

۱۹۔ خواجہ غلام فرید : حوالہ مذکورہ : صفحات ۶۹ تا ۷۷

۲۰۔ سوانح عمری حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری : سید ابوالحسن علی ندوی : نامی پریس لکھنؤ طبع دوم ۱۹۶۵ء : صفحات ۴۷، ۴۸

۲۱۔ "سیدِ محمدی" کے مصنف محمد علی سامانی ہیں یہ ۸۳۱ھ کی تالیف ہے

۲۲۔ تاریخ جیبسی تالیف ۹۰۱ھ

۲۳۔ خواجہ بندہ نواز : احمد ادریس قادری : کراچی : ۱۹۶۵ء : صفحہ ۴

۲۴۔ حیات عبدالحئی : مولانا ابوالحسن علی ندوی : نامی پریس، لکھنؤ : ۱۹۷۰ء : صفحہ ۵

۲۵۔ حیات عبدالحئی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۰۹

۲۶۔ تین مسلمان فیلسوف : تصنیف سید حسن نصر ترجمہ پروفیسر محمد منور : ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور : ۱۹۷۲ء : صفحہ ۱۴۰

۲۷۔ المرتضیٰ : مولانا ابوالحسن علی ندوی : کراچی، طبع سوم : صفحات ۲۳، ۲۴

۲۸۔ امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی : علامہ مناظر احسن گیلانی : نفیس اکیڈمی : کراچی : ۱۹۳۹ء : صفحہ ۲۵

۲۹۔ چودہ ستارے : مولانا سید نجم الحسن کراروی : لاہور : ۱۳۹۳ھ م ۱۹۷۳ء : صفحہ ۲

۳۰۔ چودہ ستارے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۷

۳۱۔ چودہ ستارے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۹۱

۳۲۔ چودہ ستارے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۲۲

۳۳۔ چودہ ستارے : حوالہ مذکورہ : صفحات ۲۰۴ تا ۲۱۰




# باب پنجم

## آپ بیتیاں

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

# آپ بیتی

## خودنوشت/بیانیہ

### تمہید

فن سوانح نگاری کی سب سے مستند صنف آپ بیتی ہوتی ہے کیونکہ روداد حیات وہی بیان کرتا ہے جس پر بیتی ہے وہ واقعات کو صحت کے ساتھ جائزاور مناسب تسلسل میں بیان کرتا ہے۔ آپ بیتی میں موجود ہر بیان کو صداقت اور سچائی کا ناقابل تردید ماخذ قرار دیا جاسکتا ہے۔
فن سوانح نگاری میں خارجی اور داخلی زندگی کی ترجمانی لازمی سمجھی جاتی ہے جہاں تک خارجی امور کا تعلق ہے سوانح نگار اپنے مشاہدہ' مطالعہ اور ذوق تحقیق سے معلوم کرلیتا ہے لیکن شخصیت کے اندرون تک رسائی آسان نہیں ہوتی۔ وہ چند گوشوں کی جھلکیاں تو فراہم کرسکتا ہے مکمل کیفیت کا پانا اور پیش کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ خودنوشت کی بڑی خوبی یہی ہے کہ لکھنے والا اپنے ظاہراور باطن سے دوسرے تمام لوگوں کی نسبت زیادہ واقف ہوتا ہے اس لئے اس صنف کے ذریعہ لکھنے والے کے احساسات' جذبات اور افکار سے بہتر طور پر واقف ہوا جاسکتا ہے۔

اردو میں خودنوشت سوانح عمری کا رواج بہت کم رہا ہے۔ ان کی نسبت یادداشتیں زیادہ لکھی گئی ہیں۔ یہ خودنوشت تو ہوتی ہیں مگر خودنوشت سوانح عمری نہیں ہوتیں۔ انہیں خودنوشت سوانح عمری کے بے ربط اور منتشر حصے قرار دیا جاسکتا ہے جو مستقل سوانح عمری کے ماخذ بن سکتے ہیں۔ اس کی نمایاں مثالیں دیوان سنگھ مفتون کی تصنیف "ناقابل فراموش" اور صدیق سالک کی "ہمہ یاران دوزخ" ہیں۔ روزناموں' خطوط' سفرناموں' رپورتاژ وغیرہ کو بھی اسی نوعیت کی خودنوشت میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

خودنوشت سوانح عمری کو واقعات اور نفسیاتی کیفیات کو صحیح تناظر میں پیش کرنے' غلط روایات اور غلط فہمیوں کو دور کرنے اور اپنے تجربوں سے دوسروں کو مستفید کرنے کے جذبے کے تحت تخلیقی صورت دی جاتی ہے۔ اس کے عناصر ترکیبی میں مقصد اور حسن بیان لازم و ملزوم ہیں۔

آزادی سے قبل اس صنف میں اہم تصانیف جو منظر عام پر آئیں ان میں تذکرہ (ابوالکلام آزاد : ۱۹۱۹ء) آپ بیتی (خواجہ حسن نظامی : ۱۹۱۹ء) اعمال نامہ (سر رضا علی : ۱۹۴۳ء) خوں

بہا (حکیم احمد شجاع ۱۹۴۳ء) قابل ذکر ہیں۔ آزادی کے بعد جو خودنوشت سوانح عمری لکھی گئیں ان کا جائزہ نکات مندرجہ بالا کی روشنی میں لے کر ادب میں ان کے مقام کے تعین کی سعی کی گئی ہے۔

ہمارے مطالعہ میں جو آپ بیتیاں آئی ہیں ان میں اکثر ایسی ہیں جو صاحب سوانح نگار نے خود لکھی ہیں۔ چند میں ان کی منتشر تحریروں کو مربوط کر کے خودنوشت کی صورت دینے کی کوشش کی گئی ہے اور جن میں ایسی بھی ہیں جو صاحب سوانح کے انتقال کے بعد ان کے مداحوں نے خودنوشت کا دعویٰ کر کے شائع کی ہیں۔ ان کی اہمیت اور حیثیت سے بھی مفصل بحث کی گئی ہے۔ اسے ہم نے "بیانیہ" آپ بیتی کا درجہ دیا ہے۔

○



# باب پنجم (الف)

## آپ بیتیاں (خودنوشت)

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

## یادایام : حافظ محمد احمد سعید چھتاری : کراچی : ۱۹۳۹ء

حافظ محمد احمد سعید چھتاری ایک جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو اس طبقہ کے لئے باعث امتیاز ہوتے ہیں۔ انگریزوں کے دور حکومت میں وہ اعلیٰ ترین مناصب پر فائز رہے اور ریاست حیدر آباد کے وزیر اعظم بھی رہے۔ انہیں زندگی میں وسیع اور متنوع تجربات حاصل ہوئے۔ ان کی پالیسی ہمیشہ صلح کُل رہی۔ اسی لئے انہوں نے خود نوشت میں متنازع امور پر تبصرہ اور بحران کے تجزیے سے گریز کیا ہے اور گزرے ہوئے حالات اور واقعات کو بغیر اظہار رائے کے بیان کردیا ہے۔ وہ خودنوشت کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ اس عمر میں پہنچنے کے بعد ایک نگاہ بازگشت ڈالی جائے اور ایام رفتہ کے تصور سے قلب میں ان جذبات اور محسوسات کو ٹٹولا جائے جس سے زمانہ گزشتہ میں میری زندگی متاثر رہی" (۱)

انہیں احساس تھا کہ وہ صاحب طرز ادیب نہیں ہیں۔ اس لئے یہ بھی لکھ دیا کہ ان کی کہانی ایسی دلچسپ بھی نہیں کہ پڑھنے والوں کے لئے باعث تفریح ہوسکے۔

"یادایام" کسی خاص مقصد سے نہیں لکھی گئی یہ صرف حالات اور واقعات کی بازگشت ہے۔ اسے تاریخ وار تسلسل میں تحریر کیا گیا ہے۔ واقعات اور طرز بیان دلچسپی سے خالی ہیں۔ فن کی ہر ضروریات کو پورا کرنے کے باوجود قاری کو متوجہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

## نقش حیات : حسین احمد مدنی : دہلی : ۱۹۵۲ء

مولانا حسین احمد مدنی کی شخصیت کے دو نمایاں پہلو ہیں۔ وہ ایک عالم دین تھے۔ دوسرے وہ ایک سیاسی رہنما تھے۔ کتاب میں شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں کو وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں مولانا کے خاندانی حالات، تعلیم و تربیت کے ادوار، علم و حکمت کے مراحل، سیاست کی جولانیاں سبھی نظر آتی ہیں اور ہر امر کا تذکرہ عالمانہ انداز میں ہوا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزوں نے علمائے ہند بالخصوص تحریک جہاد سے وابستہ علماء کے بارے میں غلط پروپیگنڈا کرکے انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے صحیح صورت حال کو واضح کرنے کے لئے انہیں یہ آپ بیتی لکھنی پڑی۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"خصوصاً" اس بناء پر کہ امید ہے کہ شاید لوگوں کو صحیح حالات معلوم ہونے کی بناء پر کچھ نفع

پہنچے یا کم از کم وہ ان بدظنیوں اور بدگوئیوں سے پرہیز کریں جو دشمنان دین ومذہب نے اپنی خود غرضیوں کے تحت یوروپین پروپیگنڈے سے پھیلائی ہیں" (۲)

کتاب کے ابتدائی حصے میں انہوں نے اسلاف کا ذکر کرتے ہوئے اپنی عالی نسبی کو فخر سے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں'

"شرافت نسبی بھی ایک غیر اختیاری نعمت اور عطیۂ خداوندی ہے۔ اس پر شکرگزاری کرنا ضروری ہے" (۳)

اسی کے ساتھ وہ حسب ونسب پر تفاخر کو نامناسب بھی گردانتے ہیں۔

"فخر بالانساب جو کہ مسلمانوں میں ہر جگہ اور بالخصوص ہندوستان کے سادات' پیرزادوں اور شیوخ میں پایا جاتا ہے۔ نہایت جھوٹا تکبّر اور بہت سی خرابیوں کا باعث ہے باوجودیکہ اسلام نے اس کی جڑ کھودنے میں کوئی کمی نہیں کی مگر بدقسمتی سے اس کا قلع قمع نہیں ہوا" (۴)

آپ بیتی میں مولانا کے نجی حالات زیادہ تفصیل سے نہیں ہیں' چند ادوار حیات کا ذکر کیا ہے اس کے حوالے سے سیاسی حالات پر خصوصیت سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کی جدوجہد آزادی سے جو وابستگی تھی اس نے خودنوشت کو تاریخ بنا دیا ہے۔ اسے ہندوستان پر انگریزوں کی فکری' معاشی' تہذیب' سیاسی اور سماجی یلغار کے نتیجے میں پیدا ہونے والے افسوسناک حالات کا ریکارڈ کہہ سکتے ہیں جن کے خلاف وہ برسرپیکار رہے۔ غالباً" ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ مستقبل کے مورخ کے لئے اہم اور ضروری معلومات صداقت کے ساتھ جمع کردیں' سیاسی اور تاریخی لحاظ سے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن آپ بیتی میں ذات اور خارجی حالات کے تجزیے کے درمیان جو توازن ہونا چاہیے اس کا فقدان ہے۔ اس لئے "خودنوشت سوانح عمری" کے اعتبار سے اسے زیادہ کامیاب کوشش قرار نہیں دیا جاسکتا مولانا عالم تھے۔ عربی' فارسی اور اردو پر کامل عبور رکھتے تھے۔ ان کی تحریریں ان کے تبحّر علمی کی غماز ہے۔ جو اکثر مواقع پر ثقالت سے خالی نہیں ہے۔

## سرگزشت : عبدالمجید سالک : لاہور : ۱۹۵۴ء

عبدالمجید سالک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بلند پایہ ادیب' خوش گو شاعر' مشاق صحافی اور کامیاب فکاہی کالم نگار تھے۔ دل نشینی اور روانی ان کے قلم کی خصوصیات ہیں۔

سرگزشت کے ابتدائی صفحات میں مولانا سالک نے اپنی بزرگوں دادا' والد' چچا وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے اس ماحول کا نقشہ کھینچا ہے جس میں ان کی ذہنی نشوونما ہوئی۔ بچپن کے حالات



کے ضمن میں خصوصیت سے اس امر کا ذکر کیا ہے کہ وہ والد کی ساتھ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ ماحول' والد کی تربیت اور انجمن کے جلسوں نے ان کے ذہن پر ایسے اثرات مرتب کئے جو ان کے قومی شعور کی بیداری میں معاون ثابت ہوئے۔ انجمن حمایت اسلام کے پہلے جلسہ کے بارے میں جس میں وہ شریک ہوئے لکھتے ہیں۔

"انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کو مسلمان اپنا سب سے بڑا قومی میلہ سمجھتے تھے اپنے بچوں کو بھی جلسوں میں لے جاتا کرتے تاکہ بزرگان قوم کے خیالات آغاز سے ہی ان کے کان میں پڑجائیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس سالانہ جلسے میں مولانا حالی اور مرزا ارشد گورگانی بھی تشریف لائے۔ مولانا حالی کی مقدس' پاکیزہ صورت اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ سر پر چھوٹی سی فلٹ ہیٹ ٹوپی' بند گلے کا سادہ کوٹ اور گلے میں رومال بندھا ہوا' سفید پُرنور داڑھی اور نہایت شفیق اور رحیم بشرہ!" (۵)

اس خودنوشت میں مولانا سالک نے اپنے حالات زندگی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس دور کی سیاسی اور ادبی سرگرمیوں کا ذکر بھی کیا ہے گویا وہ ان کی زندگی سے جدا حقائق نہ ہوں۔ ان کا علم اور مشاہدہ ان کی ذات کا حصہ بن گئے ہیں۔ ان آنکھوں نے اس زمانہ کے مسلم زعماء سے کسب نور کیا تھا۔ حالی' شبلی کی ناموں کا شہرہ تھا۔ محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد زندہ تھے۔ وہ گزرے ہوئے زمانہ کی یادگار ہستیاں تھیں۔ معاصرین میں تمام رہنماؤں شاعروں' ادیبوں اور صحافیوں سے ان کا واسطہ پڑا۔ ان میں سے بیشتر کو قریب سے دیکھا' ان سے بہت کچھ حاصل کیا ان میں مولانا ظفر علی خان' علامہ اقبال' مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا حسرت موہانی قابل ذکر ہیں۔ جن کے اذکار ان کے "شخصی خاکے" بن گئے ہیں۔ جو متنوع اور جاندار ہیں۔ بعض شخصیات کا بالکل نئے رنگ میں پیش کیا ہے مولانا گرامی کے حوالہ سے علامہ اقبال کا ذکر کیا ہے تو علامہ کی نئی تصویر سامنے آجاتی ہے وہ مولانا گرامی کے ایک چلبلے' اور بے تکلف دوست کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ ان کی شرارتیں اور دلچسپ شوخیاں قاری کے لئے نئی بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔

"سرگزشت" میں جو حالات بیان ہوئے ہیں ان میں ایک حصہ قید وبند سے متعلق ہے۔ وہ اس دار ورسن پر افسردگی کا اظہار نہیں کرتے اور نہ اس ظلم کے خلاف پُرزور اور پُرجوش احتجاج کرتے ہیں بلکہ زندگی کے عام واقعات کی طرح اس کو بھی محض ایک واقعہ قرار دے کرتے بیان کرتے ہیں۔ مصائب کو ان تیوروں سے برداشت کرجانا مصنف کی حقیقت پسندی کا مظہر ہے۔

مصنف اپنے دور میں سیاست' ادب اور صحافت کے شعبوں سے متعلق رہے "سرگزشت" میں حسب موقع ان کے ماحول اور اپنی وابستگی کی کہانی کا انکشاف کیا ہے۔ ہر شعبہ میں اپنی مسلمہ حیثیت کے باوجود اپنے قلم سے اپنی تشہیر کی کہیں کوشش نہیں کی جبکہ زیادہ تر خودنوشت میں اپنی ذات کو اہمیت دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس خامی سے "سرگزشت" عاری ہے۔ اس طرف دیباچہ نگار چراغ حسن حسرت نے بھی اشارہ کیا ہے۔

"بعض لوگوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیاتیں انا ولا غیری کا نغمہ اس زور سے الاپا ہے کہ وہ جس زمانہ کا حال بیان کرتے ہیں اس پر بظاہر چھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں سالک صاحب کے یہاں نہ تو یہ کیفیت ہے کہ انہوں نے جن صحبتوں کے نقشے کھینچے ہیں ان میں وہی صدر نشین نظر آئیں نہ انہوں نے انکسار برتا ہے کہ ایک کونے میں دبکے نظر آئیں اور کہیں دکھائی نہ دیں"۔

اسی کے ساتھ چراغ حسن حسرت نے ان کے فن کے بارے میں لکھا ہے کہ

"وہ انشاپردازی کے کوچہ کی رسم وراہ سے آگاہ اور سوانح عمری کے آداب سے پوری طرح باخبر ہیں"(۷)

مولانا سالک کا طرز تحریر سادا اور بے تکلف ہے۔ معمولی اور خشک موضوعات کے بیان میں بھی شگفتگی پیدا کرنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ کتاب میں بہت سے خوبصورت واقعات اور دلکش جملے موجود ہیں جو ان کے مزاج کے آئینہ دار ہیں۔ شخصیات کے حوالے سے لطائف بیان کر کے ان کے ذکر کو خوشگوار بناتے ہیں۔

"سرگزشت" بیک وقت مولانا سالک کی کامیاب خودنوشت سوانح عمری بھی ہے۔ ان کے عہد کی سیاسی' ادبی' صحافتی تاریخ بھی' شخصیت نگاری بھی اور پرُ مزاح تحریر کا اعلیٰ نمونہ بھی!

## مشاہدات : ہوش بلگرامی (ہوش یار جنگ) : حیدر آباد دکن : ۱۹۵۵ء

کتاب "مشاہدات" خودنوشت سوانح عمری کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ ابتدائی ابواب میں بچپن کے حالات' تعلیم اور مذہبی مسلک پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن اس کا بڑا حصہ اس دور حیات کا احاطہ کرتا ہے جو انہوں نے ریاست حیدر آباد میں گزارا۔ وہ اہم عہدوں پر فائز رہے اور نظام سابع کے مقربین میں بھی رہے اس لئے وہ ریاستی انتظامی امور اور سیاسی حقائق سے زیادہ واقف تھے۔ انہیں کا اظہار ان کی تحریر کا خاص مقصد ہے چنانچہ لکھا ہے۔

"یہ ایسے مشاہدات ہوں گے جن کو دیکھنے کے لئے مستقبل کی آنکھیں ترستی ہوں گی کیونکہ زمانہ کا انقلاب ہندوستان میں بھی جمشیدی تختوں کو الٹ رہا ہے۔ کیکاؤسی تاجوں کو اتروا رہا



ہے۔ شاہانہ کروفر کو ختم کر رہا ہے۔ امارات کے جاہ و حشم کو لٹا رہا ہے۔ خطابات کی لمبی فہرست کو گنگا میں بہا رہا ہے اور القاب و آداب کے تکلفات کو جمنا میں ڈبو رہا ہے۔ ملوکیت کے جنازے نکل رہے ہیں اور جمہوریت کی آغوش میں عوام کھیلنے لگے ہیں۔ ایسے وقت میں اگر ماضی وحال کے مشاہدات کو سمیٹ کر قلم بند نہ کیا گیا تو گزشتہ زمانوں سے مستقبل کو کن باتوں سے دلچسپی باقی رہ سکے گی۔ یہی خیال تھا جس نے مجھے آمادہ کیا کہ حافظے کی مدد سے وہ محفوظ کردوں جس کا تماشا کبھی مجھے ہنس ہنس کر دیکھنا پڑا اور کبھی رو رو کر۔"(۸)

ہوش یار جنگ نے ریاست کی عام زندگی اور درباری ریشہ دوانیوں کو موضوع بنایا ہے اور ہر دور کی تصویریں مصورانہ چابک دستی سے مکمل کی ہیں۔ جن میں جزئیات کی تفصیل اور پس منظر کو بھی مناسب جگہ دی گئی ہے۔

"دربار عثمانی" دسویں باب کا موضوع ہے جس میں صرف نظام سابع کا عہد ہی نہیں بلکہ دکن کی پوری تاریخ بیان کر دی گئی ہے اور گولکنڈہ اور آصف جاہی خاندانوں کے عروج وزوال کے حوالے سے ان کے خاتمہ کو حالات کا لازمی منطقی نتیجہ قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے۔

"عروج وزوال کی یہ داستان اور اکھاڑ پچھاڑ کے قصے کچھ ہندوستان کے لئے ہی نہیں بلکہ انقلابوں نے رومت الکبریٰ کی شان وشوکت کو باقی رکھا نہ قیصریت کو رہنے دیا' نہ مسولینی کے ارمان پورے ہونے دیے۔ اس نے ترکی عبائے خلافت کو تار تار کیا۔ اس نے ربت کو رضائیت کے حوالے کیا"(۹)

اس میں دیار دکن کی عظمت رفتہ کے نقوش کے ساتھ وہاں کے عام حالات اور انداز حکومت کے بہت اہم گوشے موجود ہیں۔ اس خودنوشت میں ذات کے حوالے سے بہت لکھا گیا ہے۔ ذات کے بارے میں کم! لیکن سچائی اور تاثیر سے بھرپور ہے۔

ہوش یار جنگ شاعر بھی تھے۔ ادیب بھی! حیدر آباد سے رسائل شائع کرتے تھے۔ ادب سے ان کا قریبی تعلق رہا۔ اس لئے تحریر جاندار ہے' زبان میں حلاوت ہے اور ہر نوعیت کے مضمون کو جداگانہ طرز کی عبارت آرائی سے دلنشین بنایا ہے۔

## شاد کی کہانی' شاد کی زبانی : مسلم عظیم آبادی : پٹنہ : ۱۹۵۸ء

شاد عظیم آبادی اردو کے اہم شاعر ہیں۔ ان کی سوانح عمری "شاد کی کہانی' شاد کی زبانی" اس اعتبار سے عجوبہ ہے کہ بقول ان کے شاگرد مسلم عظیم آبادی یہ خود شاد کی تحریر کردہ ہے جسے

وہ اپنے نام سے شائع کروانا چاہتے تھے اور نہ اسے خودنوشت کے انداز میں تحریر کیا تھا۔ مسلم عظیم آباد کا کہنا ہے کہ

"اگرچہ تذکرہ مولف نے اپنی طرف سے صیغہ غائب میں لکھا ہے مگر میں اسے اپنی طرف منسوب کرنا جائز اور قرین دیانت نہیں سمجھتا ہوں" (۱۰)

شاد نے خود کو شخص غیر فرض کر کے پوری روداد حیات اور اپنے دل کا حال قلمبند کر دیا ہے وہ چاہتے تھے کہ مسلم عظیم آبادی اسے اپنی تصانیف قرار دے کر شائع کروائیں۔ جس کے لئے موخرالذکر کا ضمیر اجازت نہیں دیتا یہی وجہ ہے کہ جو مسودہ ۱۹۲۱ء میں ان کے حوالہ کیا گیا اس کی اشاعت کی نوبت ۱۹۵۸ء میں آئی۔

ابتدا میں خاندانی کوائف ہیں۔ بچپن کے واقعات ہیں۔ حصول تعلیم کے مرحلے کا ذکر ہے۔ دیگر واقعات زندگی بھی بیان ہوئے ہیں اس طرح کتاب کا تقریباً" ایک تہائی حصہ سوانح عمری کا ہے۔ اس حصہ میں ضروری تفاصیل سے گریز کیا گیا ہے جو بھی واقعہ بیان کیا ہے اس میں تفاخر کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ملحوظ رکھا ہے۔ کتاب کو مذکورہ پس منظر میں پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شاد اپنے آپ کو بہت بڑا شاعر سمجھتے تھے۔ انہیں گلا تھا کہ زمانہ نے ان کی قدر نہیں کی۔ ان حالات کا جو نفسیاتی ردعمل ہو سکتا تھا تحریر اسی کی غماز ہے۔ انہوں نے اپنے قلم سے اپنی مدح سرائی کر کے اپنی بڑائی منوانا چاہی اور ناقدری کی شکایت کر کے زمانہ کو عبرت دلانی چاہی ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ شاد کے خلاف باقاعدہ ایک محاذ قائم کیا گیا تھا۔ اس کا احوال بھی انہوں نے درج کیا ہے۔ ان کی ایک کتاب "نوائے وطن" کے نام سے شائع ہوئی تھی یہی تنازع کا باعث بنی۔ شاد نے اعتراض کیا ہے کہ اس کتاب میں بعض مقامات پر کسی قدر سختی سے اپنے ہم وطنوں کو ٹوکا تھا۔ (۱) اس کے خلاف سخت ریویو شائع ہوئے اور نہ صرف علمی ادبی حلقے بلکہ عام لوگ بھی ان بیزار ہو گئے۔ ۱۸۶۰ء میں ان کے ایک قطعہ نے اردو ہندی تنازع کو بھڑکا دیا تھا یہ بھی ان کی مخالفت کا سبب بنا۔ شاد نے ان واقعات اور حالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کو زیادتی قرار دیا ہے۔ ان تنازعات کے علاوہ طویل بیان اپنی نظم و نثر کی خوبیوں کے بارے میں دیا ہے۔ کتاب کیا ہے ناقدروانی کے خلاف احتجاج اور دکھے دل کی آواز ہے۔

## آپ بیتی : ظفر حسن ایبک : لاہور : ۱۹۶۰ء

ظفر حسن ایبک ان مجاہدین میں ہیں جنہوں نے تحریک ہجرت کے دوران وطن کو خیرباد کہا اور



آزادی وطن کی جدوجہد کا سلسلہ بیرون ملک جاری رکھا۔ تقریباً" ربع صدی خود اختیاری جلاوطنی میں گزاری۔ ان کے ذہن میں تحریک آزادی کا ایک باب محفوظ تھا جس کے انکشاف کے لئے انہوں نے "آپ بیتی" تحریر کی۔ آپ بیتی میں بچپن کا تذکرہ کرتے ہوئے اس وقت کے سیاسی حالات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ جنگ بلقان کی وجہ سے مسلمانوں کے دل میں اہل یورپ بالخصوص انگریزوں کے خلاف جو جذبات بھڑک اٹھے تھے ان کے ذہن پر طاری رہے ان ابتدائی تاثرات نے انہیں اپنی زندگی برطانوی استعمار کے خلاف قوت آزمائی کے لئے وقف کر دینے پر کمربستہ کیا۔ وہ ۱۹۱۵ء میں ہجرت کر گئے۔ گیارہ سال مولانا عبیداللہ سندھی کے ساتھ رہے۔ ان سے مذہب اور سیاست کی تعلیم حاصل کر کے قلب و روح کو جلا بخشی۔ اس دوران انگریزوں کی حکومت کے خلاف جو منصوبے بنائے گئے اور جس سازش میں وہ ناکام ہوئے ان کی تفصیل بھی درج کر دی ہے۔ انہوں نے ایسے حقائق کی نقاب کشائی کی ہے جن سے عوام تو کیا خواص بھی باخبر نہیں تھے۔

"آپ بیتی" ذات کے انکشاف سے زیادہ تاریخی واقعات کے انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف نے خودنوشت سوانحی حالات کے ساتھ تاریخ کے اہم ابواب تحریر کئے ہیں۔ وہ طویل عرصہ افغانستان میں رہے۔ دوبارہ ہجرت کر کے ترکی گئے۔ جہاں فوج میں آرٹیلری کیپٹن کے منصب پر فائز رہے۔ وسیع تجربات کے ساتھ انہیں سفر کے تجربات بھی حاصل رہے۔ خصوصاً" افغانستان اور ترکی کے حالات 'تمدن' سیاسی رجحانات اور عوامی جذبات سے دوچار ہونے اور انہیں سمجھنے کے بہترین مواقع حاصل رہے۔ اس اعتبار سے خودنوشت کا ایک حصہ سفرنامہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ ذاتی حالات' تاریخی حقائق اور سفرناموں کے اس امتزاج نے "آپ بیتی" کو انفرادیت بخش دی ہے۔ مصنف نے خلوص اور سنجیدگی سے ساری باتیں تحریر کی ہیں۔ اگرچہ انہوں نے سپاہیانہ زندگی گزاری اس کے باوجود خودنوشت میں جوش نہیں ہے جو کچھ لکھا بقائم ہوش لکھا تاکہ صداقتوں کا اظہار ہو۔ تحریر عبارت آرائی' رنگین بیانی اور مبالغہ سے یکسر خالی ہے۔ اس کا سادہ اور عام فہم انداز ہی اس کی کامیابی کا ضامن ہے مذکورہ آپ بیتی کو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے "خاطرات" کے نام سے مرتب کر کے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا ہے۔ یعنی "خاطرات" ظفر حسن ایبک کی خودنوشت "آپ بیتی" کا نقش دوم ہے۔

## میری دنیا : ڈاکٹر اعجاز حسین : الہ آباد : ۱۹۶۵ء

"میری دنیا" ڈاکٹر اعجاز حسین کی آپ بیتی ہے جو چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب

اول "افسانۂ حیات" میں ابتدا سے ملازمت اختیار کرنے تک کے واقعات ہیں جس میں خاندان کے حالات، بزرگوں کے احوال، تعلیم و تربیت اور اس دور کے دوستوں کے اذکار ہیں۔ دوسرے باب میں دوران ملازمت کے واقعات ہیں۔ ان تمام مواقف اور مخالف حالات و واقعات کی تفصیل بیان کی ہے جن سے نشیب و فراز کی داستان مرتّب ہوئی ہے اور ان کے حوالے سے اپنے ردّ عمل اور نفسیاتی رجحانات کا تذکرہ کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں بلا کا صبر و ضبط تھا اور دوستداری میں وہ مالی زیرباری سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ تیسرے باب میں الہ آباد یونیورسٹی کے ماحول، وہاں کی شخصیات کے بارے میں اپنے مطالعہ و مشاہدہ کو قلمبند کیا ہے چوتھے باب میں یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے اہم واقعات کے ساتھ اساتذہ کے خاکے بھی شامل کئے ہیں ان میں ڈاکٹر سید حفیظ، احتشام حسین اور فراق گورکھپوری کے خاکے دلچسپ ہیں۔ پانچواں باب ان کے شاگردوں کے ذکر پر مبنی ہے۔ مجموعی طور پر اسے خالص خود نوشت سوانح عمری نہیں کہہ سکتے۔ یہ دراصل یادداشتوں کا مجموعہ ہے جس کے ذریعے مصنف کے رجحانات، خیالات افکار، افتاد اور تاثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

## جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی : محمد ایوب خان : پاکستان : ۱۹۶۵ء

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان سابق صدر پاکستان نے خودنوشت انگریزی میں Friends not Masters کے نام سے لکھی تھی۔ غلام عباس نے اس کا اردو ترجمہ "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" کے نام کیا ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ اردو تصنیف نہیں ہے اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے نظرانداز کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ خودنوشت اس اعتبار سے غیر مکمل بھی ہے کہ اس کا اختتام جنوری ۶۵ء کے حالات پر ہوا ہے جب بنیادی جمہوری نظام کے ماتحت وہ مادرِ ملّت کو انتخابات میں شکست دے کر صدر منتخب ہوئے۔ سیاسی بحران کے طویل، صبر آزما دور اور بھارت کے حملے کے مضمرات سے خود نوشت یکسر خالی ہے۔ اس دور کے بارے میں متنازع خیالات منظر عام پر آئے ہیں ہر ایک نے اپنے مفادات کی خاطر صورت حال کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے تاریخی منظر واضح ہونے کے بجائے تضادات کی آلودگی کا شکار ہوگیا ہے۔ حکومت سے سبکدوشی کے بعد مصنف تاریخی ریکارڈ کو درست رکھنے کے لئے اس دور پر روشنی ڈال سکتے تھے۔

خودنوشت میں جس نوع کی شخصی مرکزیت ہوتی ہے یہ کتاب اس سے خالی ہے۔ ابتدائی چار ابواب میں (۱) بچپن سے جوانی تک (۲) فوجی زندگی کا ابتدائی دور (۳) فوجی زندگی ۱۹۴۸-۱۹۵۰ء



(۴) کمانڈر انچیف، سوانحی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ باقی ابواب ملکی سیاسیات اور پالیسوں سے متعلق ہیں۔ پانچویں باب میں ان حالات اور کوائف کو پیش کیا گیا ہے جن کی وجہ سے نو تشکیل مملکت میں استحکام پیدا ہونے کے بجائے حکومتی بحران رہا۔ اس کے نتیجہ کے طور پر راولپنڈی سازش ہوئی جس میں فوجی افسر طاقت کے ذریعہ حکومت پر قبضے کے خواہاں ہوئے۔ اس سازش میں بعض سویلین بھی شامل تھے۔ مصنف نے ابتدائی رپورٹ ملنے پر بحیثیت کمانڈر انچیف جس طرح صداقت معلوم کرنے کی کوشش کی اور واقعہ کی تہہ تک پہنچے اس کی تفصیل سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سازش ہوئی تھی۔

مصنف نے نہایت دیانت داری سے واقعات بیان کئے ہیں اور مصلحت کو دخل انداز نہیں ہونے دیا۔ افراد کے بارے میں بھی ان کی رائے مناسب اور درست معلوم ہوتی ہے وہ وزیراعظم لیاقت علی خان کے مداح تھے وہ لکھتے ہیں کہ۔

"میں وزیراعظم لیاقت علی خان کا بڑا گرویدہ ہوگیا وہ بڑے دلاور اور جری انسان تھے کوئی بات انہیں پریشان نہ کرسکتی تھی۔ انہوں نے قائداعظم کے ایک وفادار نائب کی حیثیت سے کام کیا تھا اور ہمیشہ خود پیچھے رہ کر کام کرنے میں خوش ہوتے تھے"۔(۱۲)

ایوب خان ہی تھے جنہوں نے پاک فوج کو منظم و مستحکم کیا اس حوالے سے انہوں نے اپنے مساعی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے جن ترجیحات پر زور دیا ان میں سخت پیشہ ورانہ تربیت اسلحہ کے لئے دیسی وسائل پر زیادہ سے زیادہ انحصار، فوجی ضروریات کے سامان کی معیار بندی، حسب ضرورت اسلحہ کی ساخت میں تبدیلی وغیرہ ان کی ساری تیاری اس نظریہ پر مبنی تھی کہ ملک کا بدترین دشمن ہمسایہ ملک ہے جو بدخصلت اور کینہ پرور بھی ہے اس سے کبھی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس سے برطانوی حکومت سے اسلحہ کے انبار اور تربیت شدہ فوج ملی تھی اس کے اپنے بے پناہ وسائل تھے جنہیں وہ عوام کو بھوکا رکھ کر جنگی تیاریوں میں صرف کررہا تھا باوجود اس کے پاک فوج کی تعداد کی کمی اور اسلحہ میں نابرابری تنظیم اور تربیت کے ذریعہ اس سے نبرد آزما ہونے کے قابل ہوگئی۔

پاکستان کی پارلیمانی روایت اور جمہوریت ناشناسی سے وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا بھی منصفانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ پارلیمنٹ اور گورنر جنرل غلام محمد کے درمیان اختلافات نے مذموم سیاسی فضا پیدا کرتی تھی اس کا تفصیلی ذکر بھی کیا ہے اور اس راز سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ غلام محمد چاہتے تھے کہ ایوب خان تمام اختیارات سنبھال کر تین ماہ میں دستور تیار کریں۔(۱۳)

لیکن انہوں نے یہ پیشکش قبول نہیں کی اسی کشمکش کے دوران ۱۹۵۶ء میں دستور تیار ہوا۔ پھر بھی حالات میں بہتری کی صورت پیدا نہیں ہوئی اس ضمن میں سیاست دانوں کی کرشمہ سازیوں' مقابلہ بازیوں کے جو حالات بیان کئے ہیں وہ شرمناک بھی ہیں اور عبرت ناک بھی! صورت حال میں خوش آئند تبدیلی کے امکانات کے فقدان نے انہیں مارشل لا لگانے پر مجبور کیا اگرچہ اسکندر مرزا صدر رہے چونکہ وہ بھی محلاتی سازش میں ماہر تھے تبدیلی حالات کے باوجود ان میں نہ تو حب الوطنی کا جذبہ جاگا اور نہ ملک کی سلامتی کی فکر لاحق ہوئی۔ انہوں نے اپنا راستہ بنانے کے لئے ایئر کموڈور کو سینئر فوجی افسروں کو ختم کرنے کا حکم دیا جس پر ایئر کموڈور نے عملدرآمد سے انکار کیا۔ اسکندر مرزا کے چلن کو دیکھتے ہوئے ایوب خان نے ان سے چھٹکارہ حاصل کرلیا۔ اس نوع کی محلاتی سازشوں' سیاسی کرشمہ سازیوں سے وہی شخص دیانت دارانہ طور پر پردہ اٹھا سکتا ہے جو ان خباثتوں سے پاک ہو اور حقیقی حب الوطنی کا جذبہ رکھتا ہو۔

ایوب خان نے اپنے دور حکومت کے حالات بھی بالتفصیل لکھے ہیں۔ ان کی تمام کامیابیاں ان کے اردگرد پھیلے ہوئے حالات میں نمایاں نہ ہوسکیں لیکن دنیا جانتی ہے کہ ملک کی پیداواری ترقی جس تیز رفتاری سے ان کے دور میں ہوئی نہ اس سے قبل ہوئی اور نہ مابعد۔ بین الاقوامی تعلقات میں جس سے رشتہ دوستی جوڑنا چاہا وہ ملک آقا بننے پر مصر رہا۔ اندرون ملک جس پر بھروسا کیا وہی مار آستین ثابت ہوا۔ پاکستان کے حقیقی موقف اور اس کے ناجائز مطالبات کی تکمیل اور اس کے ناجائز مقام کے تعین کے لئے انہوں نے انتھک کوشش کی ایک فوجی کی حیثیت سے وہ صاف ذہن رکھتے تھے اور ہیرا پھیری کی سیاست سے ناواقف تھے۔ اس کا ثبوت کتاب میں شامل ان خطوط سے ملتا ہے جو انہوں نے صدر ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور وزیر اعظم ہند کو لکھے تھے۔

واقعات کو ان کی سچائی متاثر کئے بغیر بیان کرنے' کھلے دل ودماغ سے اپنے اغراض ومقاصد کی وضاحت کرنے اور حب الوطنی کے جذبے سے ہربار گراں کو اٹھانے اور مصائب کے لئے سینہ سپر ہونے کا حوصلہ رکھنے والے شخص کی جو سیرت ہوسکتی ہے وہ اس کتاب میں پوری طرح عیاں ہے۔

## سرگزشت : سیدذوالفقارعلی بخاری : کراچی : ۱۹۶۶ء

اس سے قبل "سرگزشت" کے عنوان سے عبدالمجید سالک کی آپ بیتی ۱۹۵۴ء میں لاہور



سے شائع ہوچکی ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والی سرگزشت سید ذوالفقار علی بخاری کی مکمل سوانح عمری نہیں ہے بلکہ روداد ہے ان دنوں کی جب وہ ریڈیو سے منسلک رہے۔ اس بارے میں انہوں نے لکھا ہے۔

"میری زندگی کے طوفان کا منجدھار ریڈیو ہے۔ جی چاہتا ہے کہ داستان کا آغاز اس منجدھار سے کروں"۔(۱۴) چنانچہ پوری کتاب ان یادداشتوں پر مشتمل ہے جو ریڈیو سے وابستگی سے متعلق ہیں۔ اس میں بے شمار اچھے اور برے افراد کے حوالے ان کے کردار اور افعال کی وضاحت کے ساتھ آئے ہیں۔ مصنف کا قلم ان کے حقیقی رنگ وروپ کو پیش کرنے میں چابک دستی دکھلاتا ہے۔ اس سے نہ صرف ان افراد سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ مصنف کے ذہنی رجحانات' پسند یا ناپسند' اور ہر واقعہ کے بارے میں رد عمل بھی سامنے آتا ہے۔ جس سے مصنف کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کے بیان میں اس قدر احتیاط اور سلامت روی ہے کہ انہوں نے جذبات کو غالب کرکے کسی کی مذمت نہیں کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ گوارا تمسخر کا سہارا لیا ہے۔ آپ بیتی انہوں نے اس وقت لکھی جب ملازمتوں کی قید وبند سے آزاد ہوچکے تھے اس لئے اپنے سے بڑے یا چھوٹے عہدیداروں یا اہل معاملہ کے بارے میں صحیح واقعات لکھنے میں کوئی امر مانع نہیں تھا۔ یوں بھی وہ بے باک اور جری آدمی تھے۔ ریٹائرمنٹ نے انہیں مزید حوصلہ دیا اس لئے جو کچھ لکھا وہ صداقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی صورت حال کے بارے میں ان کا کہنا ہے۔

"اب میں آزاد ہوں' دنیا ومافیہا سے آزاد' اب مجھے سچ بولنے سے کیا عذر ہوسکتا ہے چاہے وہ سچ اپنے متعلق ہو یا دوسروں کے متعلق"۔(۱۵)

انہوں نے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ۔

"میرا بھرم کھلے تو کھلے کسی کی دل آزاری نہ ہو"(۱۶)

مصنف نے ان یادداشتوں کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ بیان نہ تو تاریخوار ترتیب میں ہیں اور نہ تجربات کی اہمیت کے لحاظ سے۔ وہ ایک "انشائیہ" نگار کی طرح ذہنی رو میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ اور جو کچھ ذہن کی سطح پر ابھرتا ہے بیان کرجاتے ہیں۔ دوران ملازمت مصنف کو برصغیر کے متعدد شہروں بلکہ یورپ تک کے سفر درپیش رہے۔ ان شہروں اور وہاں کے شہریوں کا انہوں نے غائر نظر سے مشاہدہ کیا۔ ان کے اوصاف' خصوصیات کو نوٹ کیا اور اس کتاب میں ان کی عکاسی بھی کی ہے۔ جس میں سے ایک وقائع نگار اور کردار نگار کی حیثیت سے متعارف ہوئے ہیں۔

سرگزشت سوانح عمری نہیں لیکن آپ بیتی ہے جس میں جگ بیتی کے عناصر بھی شامل ہیں۔

اسے پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے مکمل سوانحی واقعات سے اجتناب برتا ہے۔ اپنی روزمرہ زندگی اور سماجی حالات بھی بیان نہیں کئے ہیں۔

## یادوں کی دنیا : یوسف حسین خان : اعظم گڑھ : ۱۹۶۷ء

قائم گنج کے فدا حسین خان نہایت خوش نصیب انسان تھے انہوں نے کامیاب زندگی گزاری اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، عابد حسین خان، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ڈاکٹر محمد حسین خاں جیسے نامور فرزند چھوڑے جن کے تبحر علمی، بلند اخلاق، اور خلوص کار نے ان سب کو عالمی شہرت دلائی۔ یوسف حسن خاں نے اپنی خودنوشت میں نہ صرف اپنے حالات قلمبند کئے ہیں بلکہ اس پورے ماحول کو پیش کیا ہے جس میں یہ عظیم ہستیاں پروان چڑھیں۔ خودنوشت کے ابتدائی دو ابواب خاندان کے تاریخی پس منظر اور گھریلو واقعات کے حوالے سے ہیں، تیسرے باب میں اپنے سات بھائیوں کے احوال اور قائم گنج کی زندگی پیش کی ہے، چوتھا باب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو "فخر خاندان" قرار دیتے ہوئے ان کی شخصیت کے جامع خاکے کے لئے وقف کر رکھا ہے، پانچواں باب اس زمانۂ تعلیمی کے بارے میں ہے جو انہوں نے جامعہ ملیہ میں گزارا۔ چھٹا باب فرانس میں زیر تعلیم رہنے کے دور کا احاطہ کرتا ہے۔ ساتواں باب حیدرآباد کے بارے میں ہے جہاں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ تاریخ سے وہ وابستہ رہے۔ آٹھواں باب علی گڑھ کے بارے میں ہے جہاں مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر کی حیثیت سے انہوں نے خدمات انجام دیں۔

بظاہر یہ یوسف حسین خاں کی خودنوشت ہے انہوں نے اپنی زندگی کے ہر دور کو مفصل طور پر پیش کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں وہ تمام یادیں شامل ہیں جو ان کے خاندان، ان کے بھائیوں، نجی زندگی، تعلیمی کوائف، عملی زندگی کے علاوہ ان تمام مقامات کے عمومی جائزے اور جن سے ربط ضبط رہا ان اشخاص کے کردار کے بارے میں ان کے ذہن میں محفوظ رہیں۔ ان میں اکثر واقعات سبق آموز ہیں اور اشخاص کے ساتھ ان کے رویہ ان کے کردار کے غماز ہیں! ان کی اکثر باتیں یوں تو معمولی معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کے علم اور فلسفیانہ نظر کو ظاہر کرتی ہیں۔ جب خوشبو کا ذکر کرتے ہیں تو عرب مفکر جاحظ اور مہایان مسلک کی کتاب "لنکاوتارسُتو" کے حوالے سے بات خوشبو تک باقی نہیں رہتی بلکہ اس سے متعلقہ ساری فلسفیانہ فکر زیر بحث آجاتی ہے۔ گھر کے کتوں کے حوالے سے ان کی تمام نفسیات بیان کر جاتے ہیں۔ گویا واقعات، احساسات، اور تاثرات میں فکر کو بھی شامل کردیا ہے فرانس کے دوران قیام کا حال بیان ہوا ہے تو اپنی زندگی کے بعض پہلوؤں کو پیش کرنے کے ساتھ وہاں کی تعریف، معاشرت، تمدن،



اور عام طرز زندگی کو سیاحانہ نظر سے دیکھ پرکھ کر الفاظ میں منتقل کردیا۔ یہی حال جنوبی ہند کے آثار قدیمہ، ایلورہ اور اجنتا کا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر مقرر ہوئے تو اس کے قیام کی پوری تاریخ عملی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

ذات کے حوالے سے جو کچھ بھی لکھا ہے۔ اس میں حقیقت پسندانہ توازن ہے۔ بہت سے علمی میدان سر کرنے کے باوجود واقعہ کو واقعہ کے طور پر بیان کیا ہے۔ لاف زنی سے اجتناب کیا ہے۔ علی گڑھ میں علی یاور جنگ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس کے بارے میں مختلف افواہیں مشہور تھیں یوسف حسین خان موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے حقیقی صورتحال بیان کردی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں چند لڑکوں کی خودسری تھی۔ وہاں دوسرے لڑکوں کی جانفشانی نے علی یاور جنگ کی جان بھی بچائی تھی۔ انہیں زندگی میں جتنے اہم یا غیر اہم لوگوں سے واسطہ پڑا ان سب کی شخصیات کو انہوں نے جس طرح دیکھا اسی طرح بیان کردیا ہے۔ اس تذکرہ میں بھی کوئی یک رخی یا عصبیت نہیں ہے وہ بیک وقت خوبیاں اور خامیاں بیان کرگئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی فہرست بہت طویل ہے ان میں افراد خاندان سے قطع نظر مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان، علامہ اقبال، مولوی عبدالحق، خلیفہ عبدالحکیم، آغا حیدر حسن، مسز سروجنی نائیڈو، شہزادی درشہوار، سر اکبر حیدری، اور لیڈی حیدری، مہدی نواز جنگ، غلام السیدین، مولانا سلیمان ندوی، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، قاضی عبدالغفار اور جوش جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ جہاں بھی کسی کا ذکر آیا ان کی جامع تصویر پیش کی ہے۔

یوسف حسین خان کی یہ کتاب ان کی آپ بیتی ہی نہیں اس میں ان کے دور کی تمدنی تاریخ ہے، فرانس اور آسٹریلیا کے سفرنامے ہیں۔ مشاہیر کے خاکے ہیں احساسات کی دنیا ہے۔ جذبات کی فراوانی ہے۔ فکر کے دھارے ہیں۔ سنجیدہ، باوقار لب ولہجہ میں سلامت کے ساتھ وہ سب کچھ پیش کردیا ہے جو ان کے ذہن اور دل میں تھا یہ پڑھنے والوں کے لئے معلومات کا خزانہ اور ذہن کے لئے دعوت فکر ہے۔ اسے پڑھکر اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا عام نظروں میں جو کچھ ہے عالم کی نظر میں اس سے کہیں زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی ہے۔

یادوں کی دنیا مصنف کی جامع سوانح عمری بھی ہے اور ان کے دور کی ثقافتی، علمی اور سیاسی تاریخ بھی، مصنف نے شخصیت نگاری کا حق بھی ادا کیا ہے اور تقریباً "ایک سو صفحات کو "یورپ کا سفرنامہ" بنا دیا ہے۔ غرض کہ ان کی ذات کے حوالے سے جو باتیں بھی ضروری اور اہم تھیں وہ سب شامل کتاب ہیں۔ خارجی حالات کے ساتھ اپنی فکر کے بعض گوشوں پر سے بھی پردہ

اٹھایا ہے اس طرح خود نوشت کو ہر اعتبار سے کامیاب کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔

## شاہراہ پاکستان : چودھری خلیق الزماں : کراچی : ۱۹۶۷ء

چودھری خلیق الزمان جدوجہد آزادی کے دوران ممتاز لیڈر رہے ہیں جن کی سیاسی زندگی کا آغاز کانگریس میں شمولیت سے ہوا۔ لیکن تجربات نے انہیں مسلم لیگ کا حامی بنا دیا اور وہ قیام پاکستان کے لئے کام کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی انگریزی کتاب Path Way To Pakistan کا اردو میں ترجمہ "شاہراہ پاکستان" کے نام سے کیا اور اس انگریزی کتاب کی نسبت بہت سے اضافے بھی کئے۔

شاہراہ پاکستان گیارہ سو صفحات سے زیادہ ضخامت کی حامل ہے۔ جس میں ان کے سوانحی حالات ابتدائی چند ابواب تک محدود ہیں۔ ان میں اپنے خاندان کا پس منظر' گھریلو ماحول' پیدائش اور تعلیم و تربیت علی گڑھ کا تعلیمی دور اور اس کے ہنگامے' لکھنؤ کی معاشرت کے بارے میں خاصی تفصیل موجود ہے۔ لیکن جہاں سے انہوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا ہے وہاں سے کتاب کو سوانح عمری سے زیادہ تاریخ بنا دیا ہے۔ اس بات کا انہوں نے کتاب میں اعتراف بھی کیا ہے۔ سوانح عمری تحریر کرنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"میں اپنے پیچھے ایک صحیح اور مکمل یادداشت متحدہ ہند میں مسلمانوں کی سیاسی پالیسیوں' تحریکات' اشخاص اور حالات کا مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ جاؤں کیونکہ قرون اولیٰ سے مسلمانوں کے حالات کسی وقت کیسے ہی رہے ہوں انہوں نے اپنی تاریخ کے سلسلہ میں غیر جانبداری اور انصاف کو کبھی قربان نہیں کیا ہے۔" (۱۷)

اپنے مقصد تحریر کے مطابق مصنف نے اس کتاب کو سیاسی اور تاریخی وقائع نگاری کا نمونہ بنا دیا ہے۔ انہوں نے یہ بات اس لئے بھی ضروری سمجھی کہ انہوں نے بھارت سے پاکستان آنے کے بعد چودہ برس تک لوگوں کے قلم اور زبان سے ان کی ہجرت کے اسباب پر اعتراضات سنے تھے اور انہیں ان کی صفائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے انہیں پوری تاریخ بطور پس منظر دہرانی پڑی۔ اس اعتبار سے کہ اس میں جدوجہد آزادی اور تحریک پاکستان کے بارے میں مستند معلومات ہیں۔ اس کی خاص اہمیت ہے اکثر مشاہیر کے خطوط اور دیگر نوعیت کی دستاویزات شامل کرکے بیان کی صداقت کا ثبوت بھی مہیا کیا ہے۔ اس کتاب کو جگ بیتی اور آپ بیتی کا امتزاج قرار دیا جاسکتا ہے۔ انداز بیان اخباری رپورٹنگ کا ہے۔ فن کے لحاظ



سے دیکھا جائے تو زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے میں ناکامی کی وجہ سے اسے کامیاب آپ بیتی قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن پھر بھی یہ ایک بامقصد تحریر ہے۔

## مزدور سے منسٹر : عابد علی : بمبئی : ۱۹۶۸ء

عابد علی کا تعلق نچلے طبقے سے تھا وہ اپنی تعلیم بھی مکمل نہ کرسکے تھے کہ کسب معاش کے جھمیلوں میں پڑ گئے۔ ان کی ہمت کی داد دینا چاہئے کہ جزو معیشت ہونے کے باوجود انہوں نے مزدوروں اور محنت کش طبقے کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور آزادی کی جدوجہد کے دوران ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کرنے کے باوجود برطانوی سامراج کی جڑیں اکھاڑنے سے باز نہیں آئے۔ اپنی آپ بیتی "مزدور سے منسٹر" ان کے بچپن سے لے کر آخر میں وزیر بننے تک کی مسلسل جدوجہد کی کہانی ہے۔ ان کی عوامی سطح پر آزادی کی تحریک کو فعال بنانے کی روداد ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کے مصنف نہ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور نہ رموز فن سے واقف ہیں۔ انہوں نے خشک سیاسی وقائع نگاری سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کی ذات میں ایک فن کار موجود ہے۔ جس کی تحریک سے انہوں نے نہایت سنجیدہ موضوع میں جان ڈال کر اسے افسانہ سے قریب تر کردیا ہے۔ اسلوب تحریر بھی جاندار ہے۔ یہ آپ بیتی سیاسی کشاکش تک محدود نہیں بلکہ اس میں ان کی نجی زندگی کے خاص پہلو بھی موجود ہیں۔ وہ سیاسی معاملات میں ثابت قدم رہے۔ لیکن خانگی زندگی میں ایسے لمحے بھی آئے کہ ان کی ذات کی استقامت میں کمی ہونے لگی۔ اپنی اہلیہ کے انتقال کے حوالہ سے انہوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے لکھتے ہیں۔

"میں نے زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں لیکن دل اور حوصلہ کبھی نہیں ٹوٹا۔ پولیس کی لاٹھی اور گولی بھی میری ہمت کو پست نہ کرسکی۔ لیکن اس دردناک واقعے نے مجھے بالکل بے بس اور نکما سا بنا دیا۔ ایک مرتبہ تو میری سوجھ بوجھ ختم ہوگئی۔ ہر طرف ناامیدی چھا گئی۔ اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دینے لگا" (۱۸)

نچلے متوسط طبقے کے سیاسی کارکن کے نقطۂ نظر سے آزادی کی جدوجہد اور اس کے متنوع تجربات کی وجہ سے یہ آپ بیتی اپنی نوعیت کی منفرد ہے۔ اس کی دوسری خصوصیت اس کا اسلوب نگارش ہے۔ ایک ایسے شخص نے جو ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا پوری ادبی شان کے ساتھ اسے تحریر کیا ہے۔

## نامۂ اعمال (دو جلدیں) : سر محمد یامین خان : کراچی : ۱۹۷۰ء

اردو کی خود نوشت سوانح عمریوں میں سر محمد یامین خان کی "نامۂ اعمال" سب سے زیادہ طویل ہے۔ یہ تقریباً" پونے دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں سوانحی حالت متوازن طریقے سے پیش نہیں کئے گئے۔ ابتدائی ابواب میں خاندانی حالات' بچپن اور تعلیم کے بارے میں تفصیلات درج ہیں جن سے ان کے خاندانی اور گھریلو امور کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ آگے چل کر جب انہوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تو اس کی مناسبت سے ملکی اور بین الاقوامی سیاست کو اتنی وضاحت کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ ابواب سوانح عمری کے بجائے تاریخ کے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ وہ خود بھی ملکی سیاست میں فعال رہے وائسرائے کی کونسل کے رکن بھی رہے حکومتی اور معاشرتی سربر آوردہ حضرات سے ان کا ملنا جلنا رہا۔ اسی لحاظ سے انہوں نے ہر ایک سے اپنے تعلقات اور سرکاری امور میں اپنے فعال کردار کے بیان پر زیادہ زور دیا ہے ان مواقع پر اپنی ذات کو اہمیت دینے' اپنے کارناموں پر فخر کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ خودستائی اکثر مقامات پر کھلے طور پر نظر آتی ہے۔ مجلس قانون ساز کا حال بھی اسی طرح لکھا ہے کہ جو کچھ ہوا ان کی وجہ سے ہوا اور جو نہیں ہو سکا وہ اس لئے کہ وہ نہیں چاہتے تھے۔ واقعات کے ذریعہ ہی اپنی اہمیت نہیں جتائی ہے بلکہ انداز بیان پر بھی فخر کا رنگ غالب ہے۔ مولانا شوکت علی خان اور مولانا ظفر علی خان کے احوال میں لکھتے ہیں کہ ان کے وظائف جو ریاست حیدر آباد سے ملتے تھے ان ہی کی کوشش سے بحال ہوئے۔ انداز بیان ملاحظہ ہو۔

مولانا ظفر علی خان نے مجھ سے کہا کہ

"آپ نے مولانا شوکت علی کی پنشن کھلوادی اور ہمارا وظیفہ جو نظام کے یہاں سے ملتا تھا اور ۱۹۱۹ء سے بند کرا دیا گیا۔ اگر وہ کھلوا دیں تو بڑی بات ہوگی۔ میں نے سر سکندر' نواب چھتاری' فضل الحق اور سب کی معرفت کوشش کرلی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اگر آپ کروا دیں تو میں جانوں میں نے کہا "اتنے دن سے کیوں نہیں کہا تھا میں کل ہی صبح جا کر پولیٹکل سیکرٹری سے ملوں گا" (۱۹)

حالانکہ تاریخی اعتبار سے اس بیان میں کئی غلطیاں ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کا وظیفہ ۱۹۱۹ء میں بند نہیں ہوا بلکہ انہیں ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۳۶ھ م ۱۹ اپریل ۱۹۱۸ء کو دارالترجمہ و تالیف میں بطور مترجم ملازم رکھا گیا تھا۔ ذریعہ فرمان مجاریہ ۲۷ شوال المکرم ۱۳۳۶ھ کو وہ اس عہدہ سے بر



طرف کئے گئے۔ اسی دوران اس عہدہ کی تنخواہ کے علاوہ سابق ملازمت کا وظیفہ بھی ملتا تھا جو برطرفی کے ساتھ ہی بند کر دیا گیا۔ (۲۰)

سر یامین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وظیفہ کی بحالی کے لئے مولانا ظفر علی خان نے ۱۹۴۰ء میں کہا تھا اور انہوں نے چند دنوں میں وظیفہ بحال کروادیا۔ حالانکہ وظیفہ کی بحالی ذریعہ فرمان ۲۰ رجب المرجب ۱۳۶۳ھ م ۱۲ جولائی ۱۹۴۴ء عمل میں آئی۔ (۲۱)

مصنف کے اس بیان کی تردید ممکن نہیں کہ وظیفہ انہوں نے بحال کروایا۔ لیکن تاریخوں کے معاملہ میں جس احتیاط کی ضرورت تھی اس کا انہوں نے لحاظ نہیں رکھا۔

جن لوگوں نے انگریزوں کے عہد حکومت میں سرکاری معاملات اور ملکی سیاست کو قریب سے دیکھا ان کی شہادت کی بنیاد پر بھی تاریخ مرتب ہوگی۔ بحوالہ بالا سہو اور اسی نوعیت کی بعض غلطیوں کی وجہ سے تاریخی اعتبار سے بھی اس خود نوشت کی اہمیت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ حالات اور واقعات کو تاریخی تسلسل میں لکھا گیا ہے انداز بیان سادہ اور خوشگوار ہے۔ جہاں کہیں مصنف کی تحریر خودستائی کے ضمن میں آگئی ہے وہ ہر اعتبار سے ناگوار گزرتی ہے۔

## تحدیث نعمت : محمد ظفر اللہ خان : لاہور : دسمبر ۱۹۷۱ء

تحدیث نعمت کو خود نوشت سوانح سمجھا جاتا ہے لیکن فن کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں سوانح عمری کے سوا اور سب کچھ موجود ہے۔ مصنف کی زندگی میں جو اہم اور غیر اہم واقعات گزرے اور ان کی یادوں میں محفوظ رہے انہیں بیان کر دیا گیا ہے حد یہ ہے کہ عدالتوں کی معمولی کارروائیوں اور مقدمات کی تفصیل تک موجود ہے اور کسی بھی حوالہ سے کوئی نام آگیا ہے تو اس کے بارے میں بھی ہر قسم کی معلومات جو مصنف کے علم میں ہیں بیان کر دی گئی ہیں۔ ابتدائی چند صفحات میں ضرور خود نوشت سوانح کی کیفیت ملتی ہے جس میں خاندانی حالات' پیدائش' ابتدائی تعلیم' والدین کا دین کی طرف رجحان' امریکن مشن اسکول سیالکوٹ' گورنمنٹ کالج لاہور' اور انگلستان میں تعلیم کے حصول کا ذکر ہے اگرچہ تعلیمی سلسلہ کے بیان میں تسلسل نہیں ہے اور بار بار قادیانی رہنماؤں کا ذکر عقیدت و احترام کے شدید ترین جذبات کے ساتھ کیا گیا ہے فارغ التحصیل ہونے کے بعد پیشہ ورانہ مصروفیات پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے اپنے اوصاف کے اظہار کے لئے واقعات بیان کرنے کے ساتھ بے شمار افراد کے اچھے اور برے خصائص کا تجزیہ بھی کیا ہے۔

کتاب بیک وقت قادیانیت کی تبلیغ' وکالت' کے پیشہ کے رموز' سرکاری پالیسیوں کے

احوال' امور مملکت (قبل از قیام پاکستان اور بعد از قیام پاکستان) میں مصنف کے کردار' بیسیوں شخصیات کے اوصاف غرض ہر موضوع پر وافر معلومات رکھتی ہے جس میں سوانحی عنصر نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ مصنف کی ذات سے متعلق بہت سی معلومات موجود نہیں۔ اپنے اہل خاندان میں والد' والدہ اور بھائی کے سوا کسی کا ذکر نہیں۔ اشارتاً" یہ بھی نہیں لکھا گیا کہ مصنف نے متاہل زندگی گزاری تھی یا قید تاہل سے آزاد ہے۔ انہیں "سر" کا خطاب کب ملا۔ تمام واقعات اس طور سے بیان ہوئے ہیں کہ ان کے تاریخ وقوع کا تو کیا ذکر سنہ وقوع تک کا حوالہ موجود نہیں ہے۔

"تحدیث نعمت" کے معلومات افزا ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے زندگی بھر ڈائری لکھی تھی اور اس میں سے واقعات کو چن چن کر شامل کتاب کردیا ہے لیکن جب ناشر دعوے کرتے ہیں کہ سب کچھ یاداشت سے لکھا گیا تو مصنف کے حافظہ کی داد دینی پڑتی ہے۔ اگر وہ کسی ترتیب کے بغیر یاد داشتوں کو قلمبند کرنے کے بجائے سوانح نگاری کا طرز اختیار کرتے تو اس کی افادیت بڑھ جاتی۔

اس خودنوشت میں مصنف کی سیرت کے عناصر کی بآسانی نشاندہی ہوتی ہے۔ انہیں اپنی ماں سے جو محبت اور عقیدت تھی وہ ان کے وجود کا لازمی حصہ بن گئی تھی یہی وجہ تھی کہ زمانہ طالب علمی میں وہ یورپ کی بوڑھی اور تنہا عورتوں سے ملاقاتیں کرکے ذہنی آسودگی محسوس کرتے تھے۔ انہیں میں اپنی ماں کی محبت کا عکس نظر آتا تھا اور ان عورتوں کے التفات سے مصنف کی روح تسکین پاتی تھی۔ دوسرا عنصر مذہب کے غلبہ کا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ان کے معتقدات کا ایک زمانہ مخالف ہے انہوں نے کسی پس و پیش کے بغیر انہیں بیان کرکے جرأت اظہار کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے کسی بھی واقعہ کو خواہ اہم ہو یا غیر اہم اگر یاداشت میں محفوظ رہ گیا ہے تو قرطاس ابیض پر منتقل کردیا ہے۔ یہاں تک کہ پیشۂ وکالت اور ہائی کورٹ کے جج ہونے کی بناء پر جن مقدمات سے سابقہ پڑا ان کو جزئیات کے ساتھ بیان کردیا ہے انہوں نے ان حالات اور کوائف کو بھی یکساں اہمیت دی ہے جو ان کی زندگی کے دوران سیاست میں ظہور پذیر ہوتے رہے۔ برصغیر کی جدوجہد آزادی نے جو جو رنگ اختیار کئے اور مسلم لیگ کی قیادت جس طرح ابھرتی ہوئی ایک اہم طاقت بن گئی وہ ان کے عہد کی تاریخ کا حصہ ہے۔ اپنے حالات زندگی کے ساتھ ایک ناظر کی طرح انہیں بھی سمیٹ لیا ہے۔ اور اس طرح کہ آپ بیتی اور جگ بیتی باہم ایک دوسرے میں مدغم نظر آتی ہیں۔



سر ظفراللہ خان کے انداز تحریر میں ایک طرح کا ضبط یا ٹھہراؤ ہے۔ وہ بھی "انا" کے شکار رہے ہیں لیکن اسے کھلے لفظوں میں ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اپنے "کشف" کے واقعات کو بھی عام اور معمولی سے واقعات کے انداز میں تحریر کرکے اس "انا" کی پردہ پوشی کی ہے۔ اپنی ترقیوں کو گنوایا ہے انہیں اپنے کارنامے قرار نہیں دیا ہے بلکہ اسے بزرگوں کی دعاؤں کا فیض بتایا ہے۔ وہ کبھی ادیب یا مصنف نہیں رہے۔ اس خودنوشت میں ان کی سادہ بیانی ہی منفرد اسلوب ہے جو غماز ہے کہ وہ اس کے کوچے میں ہوتے تب بھی ناکام رہتے۔

## بے تیغ سپاہی : صدیق علی خان : کراچی : ۱۹۷۱ء

"بے تیغ سپاہی" کے مصنف صدیق علی خان نے طالب علمی کے زمانہ سے سیاست میں حصہ لینا شروع کردیا تھا۔ وہ کئی اہم تنظیموں سے وابستہ رہے جن میں مسلم نیشنل گارڈ' مسلم اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد میں فعال کردار ادا کیا ہے۔ آزادی سے قبل کے واقعات کو اپنے شخصی تجربے کے طور پر بیان کیا ہے۔ ملکی سیاست اور آپ بیتی کو ہم آہنگ کردیا ہے۔ کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے قیام' ان حکومتوں کے مسلمانوں پر مظالم ان کی آنکھوں دیکھے احوال کی طرح کتاب میں شامل ہیں۔ وہ قائداعظم کے باڈی گارڈ رہے۔ لیاقت علی خان اور دیگر رہنماؤں سے ان کا قریبی تعلق رہا۔ ان حوالوں سے اہم تاریخ معلومات پیش کی گئی ہیں۔ یہ آپ بیتی کے ساتھ ساتھ جگ بیتی بھی ہے۔ وہ لیاقت علی خان کے قابل اعتماد ساتھی تھے۔ ان سے اتنی قربت اور انسیت تھی کہ ان کی شہادت کے بعد جب اور لوگ اقتدار کی کشمکش میں مبتلا تھے انہوں نے لیاقت علی خان کی میت سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدائی گوارا نہیں کی۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے وجوہ اور ان کی تدفین سے قبل پس پردہ جو کارروائیاں ہوئیں ان کو اشاروں میں بیان کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیسے کیسے زعماء اس نازک وقت میں سازش جیسے فعل قبیح میں ملوث تھے۔

صدیق علی خان نے آپ بیتی میں ایک دور کی سیاسی تاریخ رقم کردی ہے۔ بہت سے خطوط اور اہم دستاویزات کو شامل کرکے تاریخی ریکارڈ محفوظ کردیا ہے۔ اپنی ذات کے حوالے سے تمام سیاسی تجربات بیان کئے ہیں اور اپنے رہنماؤں بالخصوص قائداعظم اور لیاقت علی خان کی شخصیت کو اجاگر کرنے' ان کے اوصاف سے روشناس کروانے کے لئے حقیقت پر مبنی واقعات بھی تحریر کئے ہیں' مجموعی طور پر یہ آپ بیتی ایک وسیع کینوس میں لکھی گئی ہے جو سیاست کی تاریخ اور رہنماؤں کے شخصی خاکوں پر بھی مشتمل ہے۔

## جہان دانش : احسان دانش : لاہور : ۱۹۷۳ء

احسان دانش اردو کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ان کے بارے میں عمومیت سے یہ علم ہے کہ انہوں نے ایک انتہائی معمولی معاشرتی درجہ سے اپنی انتھک محنت اور ذوق وشوق سے ترقی کرکے علم وشاعری کے بلند درجات حاصل کئے ہیں لیکن ان کی تفصیلات پہلی بار ان کی خودنوشت کے ذریعہ سامنے آئی ہیں۔ بلند کردار اور حصول کمال کی امنگ کس طرح معاشرے کے اعلیٰ مقام تک پہنچا سکتی ہے اس داستان حیات کے مرکزی خیال ہیں۔ احسان دانش نے اپنی زندگی کے تمام نشیب وفراز کا جائزہ خارجی اور داخلی تجربات کے ساتھ پوری سچائی سے پیش کیا ہے اسی طرح خلوص بیان اور جرأت اظہار کی شرائط پوری کردیں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے تجربات زندگی میں ایسے واقعات فی الواقع موجود ہی نہیں جن پر وہ شرمسار ہوسکتے ہیں لیکن داستان عشق بیان کرتے ہوئے بھی جرأت اظہار سے باز نہیں رہے اور اسے اسی سطح پر رکھا ہے جو ان کے تجربہ کا تقاضا تھا کسی ناگفتنی کو گفتنی کے دائرے میں لانے اور شر کو خیر بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ واقعات کے انتخاب میں دیانت اور اظہار میں جرأت کے ذریعہ خودنوشت کا حق ادا کیا ہے جہاں وہ بحیثیت مزدور کے کام کرنے کا حال بیان کرتے ہیں وہاں بھی نہ تو اپنی مظلومیت ظاہر کی ہے اور نہ خواہ مخواہ تفاخر سے کام لیا ہے۔ ہر واقعہ میں حقیقت پسندی کو ملحوظ رکھا ہے اور اسی طرح پیش کیا ہے جس طرح وقوع پذیر ہوئے۔

احسان دانش ذات' شاعری اور نثر میں ہر طرح کی تصنع سے پرہیز کرتے تھے اسی لئے ان کے انداز بیان پُرخلوص' حقیقت پسندانہ اور سیدھا سادا ہے زبان صاف' شائستہ اور سلجھی ہوئی ہے عبارت کے لغات اور محاورات سے گراں بار نہیں کیا ہے کہیں کہیں غریب الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو عوامی بول چال میں آتے ہیں چونکہ وہ ان کی زندگی میں داخل تھے اس لئے بے تکلف برتے گئے ہیں۔ اور نثر میں نظم کا لطف پیدا ہوگیا ہے۔ بلاشبہ "جہان دانش" کا شمار اردو ادب کی عمدہ آپ بیتیوں میں کیا جاسکتا ہے۔

## ہماری زندگی : بیگم پاشا صوفی : کراچی : ۱۹۷۳ء

بہت کم خواتین نے اردو میں خودنوشت سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ بیگم پاشا صوفی نے "ہماری زندگی" میں اپنے حالات' زندگی کے علاوہ خاندانی کوائف اور آصفجاہی خاندان کی فیوض و برکات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اس میں مصنفہ کی ذات کے حوالہ سے معاشرتی ماحول کی



تفصیل ملتی ہے۔ حیدر آباد دکن کے آخری ایام اور قیام پاکستان کے فوری بعد کے زمانہ کی معاشرت' علمی و ادبی فضا' سماجی تنظیموں اور ان کی سرگرمیوں' خواتین کے تعلیمی اور فلاحی اداروں اور کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس احوال کے پس منظر میں انہوں نے اپنی ذاتی کاوشوں اور عمومی مسائل پر اپنے نقطۂ نظر کو بھی پیش کیا ہے۔ خواتین کی سماجی سرگرمیاں جو ریاست حیدر آباد اور پاکستان میں اس خاص زمانہ میں جاری رہیں اس کی بہتر انداز میں ترجمانی کی گئی ہے اس سے سماجی تاریخ کو سمجھنے اور مرتب کرنے میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔

## چشم دید : فیروز خان نون : لاہور : ۱۹۷۳ء

فیروز خان نون موجودہ صدی کے نصف اول کے دوران برصغیر پاک وہند کی سیاست میں اہم کردار ادا کرتے رہے ان کے کارنامے تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ سیاست میں اختلاف رائے کی وجہ سے ان کے بارے میں مختلف آراء رہی ہیں۔ اپنے موقف کو بیان کرنے اور زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کرنے کے خیال سے انہوں نے خودنوشت سوانح عمری مرتب کی۔ اسے صرف سوانح عمری کے ضمن میں شامل نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس میں ایک عہد کی پوری سیاسی' معاشی' معاشرتی زندگی کا عکس موجود ہے۔ اس کی دوسری خوبی یہ بھی ہے کہ صرف سوانحی حالات کے بیان پر انحصار نہیں کیا ہے بلکہ اپنی یادداشتوں کے جواہر کو لفظوں کی مالا میں پرو دیا ہے۔ ابتدائی حالات کے ضمن میں دیہی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ جو حکایات نہیں ان کے مشاہدات اور تجربات ہیں۔ زمیندار اور کسان کے درمیان تعلقات' دیہاتیوں کی سادہ لوحی' ان کے مصائب اور توہمات' ان کی محبت بھری اور پرخلوص گالیاں' پٹواری اور تھانیدار کی اہمیت' لگان کی وصولی کے طریقے' شادی بیاہ' رسومات اور ان پر بے جا مصارف کوئی پہلو ایسا نہیں جو تشنہ رہ گیا ہو۔

اپنے خاندان کی تاریخ' اجداد کا حال وہاں سے بیان کیا ہے جہاں وہ غیر مسلم راجپوت تھے اور مشرف بہ اسلام ہوئے' پہلا باب خاندان' دیہی زندگی اور پیدائش کے احوال میں ہے۔ اس میں بعض انکشافات حیران کن ہیں۔ ان کا نام والد نے نہیں رکھا بلکہ ان کے بھائی ملک سردار خان نے رکھا تھا۔ اس وقت کے حالات کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ۔

"ان دنوں آمدورفت کے لئے محض گھوڑے اور اونٹ کی سواریاں میسر تھیں میرے بچپن کی بات ہے کہ بارہا میری والدہ نے اونٹ کی پشت پر بندھے ہوئے کجاوہ میں سفر کیا۔ کجاوہ لکڑی کا صندوق تھا جو اونٹ کے دونوں طرف لٹکا دیا جاتا ہے۔ خادمائیں بھی اونٹ پر ہی سواری کرتیں

اور محافظ ساتھ ساتھ گھوڑوں پر سوار ہو کر چلتے تھے۔ ان دنوں گرمی کے موسم میں دھوپ اور تپش سے بچنے کے لئے بالعموم رات کے وقت سفر کیا جاتا تھا"(۲۲)

اسی طرح دیہاتیوں کی سادہ لوحی اور توہم پرستی کے بارے میں بیان کیا ہے۔

"میں نے اپنے بچپن میں یہ منظر اکثر دیکھا ہے کہ فجر کی نماز کے وقت بعض لوگ چھوٹے چھوٹے برتنوں میں پانی لے کر مسجد کے دروازے کے باہر کھڑے ہو جاتے اور جب نمازی مسجد سے نکلتے تو ان سے التماس کرتے کہ وہ پانی میں پھونک ماریں۔ ان کے خیال میں نمازی کی سانس سے وہ پانی برکت والا ہو جاتا ہے یہ لوگ پانی مریضوں کو پلاتے"(۲۳)

دوسرے اور تیسرے باب میں اپنی تعلیم کی تفصیل دی ہے یہ بھی ریکارڈ نہیں ہے بلکہ تجربات اور مشاہدات کا مجموعہ ہے۔ باقی ابواب میں سیاست سے وابستگی کا ذکر ہے جس کا سلسلہ قیام پاکستان کے بعد تک جاری رہا۔

مصنف نے حالات زندگی کے ایک نہایت وسیع کینوس میں بیان کئے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ زمانہ آگے کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا ہے راہ میں اشخاص آتے ہیں اور اپنے نقوش چھوڑ کر جدا ہو جاتے ہیں۔ بہت ہی چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعہ ان اشخاص کے اوصاف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ سلسلۂ کلام کا حصہ ہی نہیں بن گئے ہیں بلکہ مصنف کے تجربات زندگی کا بھی حصہ ہیں۔

نہایت شگفتہ انداز بیان' روانی میں کہیں ٹھہراؤ نہیں۔ پڑھنے والے کو مسحور کر دیتے ہیں۔ مصنف کا مقصد صرف حالات زندگی اور اپنے کارناموں کی تفصیل بیان کرنا نہیں بلکہ زندگی نے تجربات کی صورت میں جو کچھ انہیں دیا تھا اسے تخلیق ادب کی شان کے ساتھ دنیا کو لوٹا دینا ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

اس خودنوشت کی ایک خامی کی طرف مصنف نے خود اشارہ کیا ہے وہ اسے مصلحت کا تقاضا قرار دیتے ہیں لیکن نقاد یہی کہے گا کہ وہ ایسا نہ کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا کتاب کے ابتدائیہ میں انہوں نے لکھا ہے۔

"بعض اوقات جب حقائق کا بیان مقصود ہو تو کوشش کے باوجود ہر شخص کو خوش کرنا ممکن نہیں رہتا۔ میں نے مسودہ بار بار پڑھا ہے اور بہت سے ایسے حصے قلم زد کر دیئے ہیں جو میری رائے میں بعض دوستوں اور رفیقوں کی جن کے ساتھ میں نے کام کیا ہے ناراضگی کا موجب ہو سکتے ہیں"(۲۴)



اس بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ خودنوشت کا ایک وصف "جرأت اظہار" بھی ہے اور "جرأت اظہار" سے نہ تو اپنی ذات کے حوالہ سے اور نہ اپنے احباب کے حوالہ سے اجتناب کرنا چاہئے۔ موجودہ صورت میں ان کے گرد جن احباب کا ہالہ نظر آتا ہے۔ وہ "ناگفتنی" کے "گفتنی" ہو جانے سے زیادہ بہتر طور نگاہوں کے سامنے آ سکتے ہیں۔

"چشم دیدہ" اردو کی چند نہایت کامیاب خودنوشت سوانح عمریوں میں سے ایک ہے۔

## مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں : خواجہ غلام السیدین : دہلی : ۱۹۷۴ء

خواجہ غلام السیدین کی خودنوشت "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان" میں غیر مکمل ہے۔ موت نے مصنف کو مہلت ہی نہ دی کہ وہ اسے مکمل کر سکتے۔ ان کی ہمشیرہ صالحہ عابد حسین نے بغیر کسی ترمیم و اضافہ کے اسے شائع کروایا۔ خواجہ غلام السیدین کی آپ بیتی ہر اعتبار سے دلچسپ بھی ہے اور فن کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے کہ انہوں نے اپنے حالات زندگی مکمل وضاحتوں اور تفصیلات کے ساتھ بیان کرتے ہوئے ماحول اور معاشرت کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ابتدا میں اپنی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے فلسفیانہ اور کچھ تمسخرانہ انداز میں کہتے ہیں۔

"بعض لوگ اپنی پیدائش اور ابتدائی زندگی کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں گویا وہ اس وقت سعید خود موجود تھے اور انہوں نے اس کی تقریبوں میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ دنیا کے لئے اس بات کی اہمیت کیا ہے کہ فلاں شخص' فلاں دن' فلاں مہینہ' فلاں سال اور فلاں وقت پیدا ہوا۔ پیدا ہونا تو برحق ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے شاید ہوتا یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی زبانی سن کر بچوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود ان کی یاد کا کمال ہے کہ انہیں اپنے بچپن کے حالات اتنی چھوٹی سے عمر سے یاد ہیں"(۲۵)

مصنف نے اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ انہیں اپنے بچپن کا کوئی واقعہ یاد نہیں بچپن کے حالات جو انہوں نے بیان کئے ہیں ان کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ سب سنی سنائی ہوئی ہیں۔

ان کے ذہن میں پرانے زمانہ کی جو دھندلی سی تصویر محفوظ رہ گئی تھی وہ خواجہ الطاف حالی کی تھی۔ حالی کے انتقال کے وقت ان کی عمر دس سال تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی یاد کتنی مبہم رہی ہوگی۔

"بچپن کی یادوں میں جو اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں ایک محبوب یاد خواجہ الطاف

حسین حالی کی ہے۔ ان کے انتقال کے وقت میری عمر کوئی دس سال کی ہوگی لہٰذا میں اس وقت ان کی شاعرانہ عظمت اور اہمیت کو تو کیا سمجھتا لیکن جب میں ان سے ملتا تو یہ احساس ہوتا کہ ایک بہت ہی شفیق اور فرشتہ صفت انسان سے مل رہا ہوں یہ لفظ تو اس وقت نہ جانتا تھا لیکن فرشتے کا کچھ ایسا ہی شعور میرے ذہن میں تھا" (۲۶)

انہوں نے قصباتی زندگی سے ابتدا کی۔ اس کی خوبیاں اور خامیاں بھی ان کے ذہن میں محفوظ تھی۔ وہ بزرگوں کے اخلاق، شرافت اور مروّت کے رویّہ کا ذکر بھی کرتے ہیں اور ان پر ناز بھی۔ اسی کے ساتھ ہی بزرگوں کی انتہائی تعظیم عورتوں کی تعلیم کی طرف سے غفلت اور ان پر لکھنے پڑھنے کی پابندی کا حال بھی بیان کرتے ہیں۔ ان کی زندگی میں اس وقت ایک اہم انقلاب آیا جب وہ اپنے والد کے کتب خانے سے متعارف ہوئے۔ وہیں سے ان کے مطالعہ کا شوق پروان چڑھنے لگا اور عمر بھر کا روگ بن گیا۔

علی گڑھ میں انہوں نے طالب علمی کا جو زمانہ گزارا اس کے نقوش باقی رہے۔ وہیں انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ کئی زبانیں سیکھیں، لفظوں کے جادو سے واقف ہوئے۔ تقریر کرنا سیکھا، لکھنا سیکھا اور سب سے بڑھ کر پڑھنے کا شوق پورا کیا۔ علی گڑھ میں انہیں سامان علم و فکر بھی ملا اور سامان مسرت و انبساط بھی! انگلستان کا سفر، کشمیر کی ملازمت، نصاب تعلیم میں اصلاحات ان سب کو موضوع تحریر بنایا ہے۔ اور اپنے کارنامے بیان کئے ہیں جن میں تفاخر سے گریز اور انکسار نمایاں ہے۔

جہاں جس واقعہ کے ساتھ کسی دوست کا، استادوں کا یا قومی لیڈروں کا ذکر آیا ہے وہاں ان کا تعارف جامع انداز سے پیش کیا ہے گویا ان کی قلمی تصویریں تیار کردی ہیں۔

خواجہ غلام السیدین کی خودنوشت ان کی اہلیہ عزیز جہاں کے انتقال پر ختم ہوتی ہے۔ یہ بات غم انگیز جذبات کی ترجمان ہے۔ خواجہ غلام السیدین اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اصناف اور اس کے فنّی تقاضوں سے واقف تھے اس لئے ان کی اس غیر مکمل خودنوشت سوانح عمری میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو کسی بھی کامیاب خودنوشت میں ہونی چاہئیں۔ بیان میں تسلسل زمانی ہے۔ انداز میں اعتدال اور زبان میں سادگی اور روانی ہے۔ ان کے امتزاج نے خودنوشت کو جامعیت اور حسن عطا کئے ہیں۔ انہوں نے اس تصنیف کی غرض و غایت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

"میری خواہش یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ میں بیشتر اپنی زندگی کے حالات بیان کروں بلکہ



چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کی کچھ داستانیں سناؤں جن سے گزشتہ ساٹھ سال میں مجھے سابقہ پڑا۔ جن کی صحبت سے میں نے فیض پایا ہے جن میں سے بعض کی زندگی میں میں نے ان قدروں کا جلوہ دیکھا ہے جن کی بدولت انسان کبھی کبھی اپنی ابتدائی زندگی کے کیچڑ سے نکل کر آسمان کی رفعت تک پہنچتا ہے۔" (۲۷)

ان کی آپ بیتی اور جگ بیتی ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان کی داستان حیات کے ہی اجزاء معلوم ہوتے ہیں۔ فنّی اعتبار سے بلاشبہ اسے ایک کامیاب خودنوشت قرار دیا جاسکتا ہے۔

خواجہ غلام السیدین کی خودنوشت سوانح عمری غیر مکمل ہے۔ ان کی بہن صالحہ عابد حسین نے "ذکر جمیل" کے عنوان سے دوسرا حصہ لکھ کر اس کی تکمیل کی ہے۔ "ذکر جمیل" اپنی جگہ ایک تصنیفی شان رکھتی ہے۔ انہوں نے اپنی معلومات اور سیدین کے خطوط کی مدد سے سوانحی حصے کو مکمل کیا ہے۔ لیکن سوانح عمری لکھنے کے بجائے شخصیت نگاری کا فرض ادا کیا ہے۔ اس میں وہ نقوش واضح ہیں جن کے ذریعہ سیدین کی ہر ایک سے محبت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اپنی بہنوں، بھائیوں بیوی اور بیٹیوں سے بے اندازہ محبت کرتے تھے۔ یہی کیفیت عام انسانوں، عزیزوں، دوستوں اور اہل خاندان کے ساتھ تھی۔ وہ گھر کا ہر کام خوشی سے انجام دیتے، بچوں سے کھیلتے، ہنستے مذاق کرتے، کبھی کبھی ناراض بھی ہوجاتے۔ اس سلسلہ میں مصنفہ نے واقعات بھی لکھے ہیں۔ ان کے ذریعہ سیدین کے جذبات اور احساسات کی مکمل ترجمانی ہوتی ہے۔ سیدین آپ بیتی میں بھی شاید اپنے اوصاف کو اس طرح بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتے صالحہ عابد حسین کی تحریر نے سوانح اور شخصیت کی تکمیل کرکے اپنے بھائی اور ادب کی اہم خدمت انجام دی ہے۔

## کاروان حیات : مشتاق احمد خان : لاہور : ۱۹۷۴ء

مشتاق احمد خان جو پاکستان میں ریاست حیدر آباد کے ایجنٹ جنرل رہے "کاروان حیات" کے نام سے خودنوشت سوانح تحریر کی ہے۔ اس کے ابتدائی حصے میں ان کے خاندانی اور ذاتی حالات ہیں لیکن پس منظر میں اس دور کے معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی اقدار اور روایات کا ذکر بھی کیا ہے جو کتاب کے مشمولات میں سب سے اہم ہے۔ اگرچہ ان کے اجداد کا تعلق سرزمین پنجاب سے تھا اور یہ تعلق کبھی منقطع بھی نہیں ہوا تھا لیکن ان کے والد اور وہ خود نظام سابع کے انتہائی وفادار لوگوں میں شمار ہوتے تھے اس وجہ سے انہیں اس خدمت پر مامور کیا گیا تھا جو اس وقت کے حالات کے لحاظ سے بہت نازک تھا اور انتہائی رازداری کا متقاضی تھا۔ کتاب کا یہی

حصہ عام قاری کے لئے معلومات افزا اور دلچسپ ہے۔ اگست ۷ ۱۹۴ء میں برصغیر کی آزادی کے بعد دیسی ریاستوں کے لئے مشکل صورتحال پیدا ہوگئی۔ دوسری ریاستیں تو بلحاظ جغرافیائی وقوع سے بے دلی سے اس ملک میں شامل ہونے کو تیار تھیں جن سے وہ گھری ہوئی تھیں۔ حیدر آباد کی صورت حال قدرے مختلف تھی انگریزوں کے اقتدار کے زمانہ میں بھی اسے آزادی حاصل رہی وہاں ان کا ایک ریذیڈنٹ مقرر ہوتا جسے نچلے درجے کا عہدیدار سفارت کہا جا سکتا ہے۔ نظام اور قائداعظم چاہتے تھے کہ اس کی آزادی برقرار رہے۔ ہندو سامراجی ذہن کی توسیع پسندانہ ذہنیت روز اول سے ریاست پر قبضہ کرنے کی درپے تھے۔ اسے مناسب موقع کا انتظار تھا اس نے نظام سے خفیہ معاہدہ کرکے مراعات دی تھیں اسی خفیہ معاہدہ کے تحت نظام کو سفارت خانے کھولنے کی آزادی تھی۔ ان کا ایک ہائی کمشنر دہلی میں مقرر تھا پاکستان میں مشتاق احمد خان کو متعین کیا گیا تھا چونکہ معاہدہ کا انکشاف بھارت' حیدر آباد اور پاکستان کے حق میں مفید نہ ہوتا اس لئے اسے راز ہی میں رکھا اس سے مشتاق احمد خان کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان کی بیوروکریسی انگریز کی تربیت یافتہ تھی جو اصولوں اور قوانین کا سہارا لے کر اول تو ان کی حیثیت کو سفیر کے برابر قرار دینے پر آمادہ نہیں ہوئی گورنر جنرل پاکستان کی خدمت میں کاغذات سفارت پیش کرنے میں مزاحم رہی اور جب یہ مرحلے طے ہوگئے تو طریق کار کے اصولوں کا پابند کرکے ہر طرح قدغن لگانے کی کوشش کی۔ اس مخالفانہ اور معاندانہ ماحول میں صرف قائداعظم کی ذات تھی جو ریاست کی بقا کے لئے سوچتی اور نیک مشورے دیتی رہی مشتاق احمد خان نے بطور ہائی کمشنر اپنی ذمہ داریاں خیر و خوبی سے انجام دیں اور ایک موقع پر تو قائداعظم کا عندیہ نظام تک پہنچانے کے لئے ایک ہندو کا روپ دھار کر کراچی سے حیدر آباد' وہاں سے دہلی تک کا سفر کیا۔ بہت سی باتیں جن کی نوعیت راز کی ہے صاحب کتاب نے افشا کرنے سے گریز کیا ہے۔ لیکن انہوں نے جو حالات بیان کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طرف نظام گومگو کا شکار تھے۔ ان کی قوت فیصلہ سلب ہوچکی تھی وہ ہر مشورے پر غور کرتے رہے کبھی کسی نیک مشورے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے تو دوسری طرف جنہیں انہوں نے وفادار قرار دے کر اپنے گرد حصار بنا لینے کے مواقع فراہم کئے تھے وہی درپردہ بھارتی حکومت کے آلۂ کار بن گئے تھے جن میں سپہ سالار افواج باقاعدہ حیدر آباد اور ہائی کمشنر متعین دہلی کا کردار شک و شبہ سے بالا تر نہیں تھا بعض غیر متعلق لیکن اثر و رسوخ رکھنے والے مسلمان بھی ہندو سامراجیوں سے گٹھ جوڑ کرکے ان کے حق میں کام کر رہے تھے تیسری طرف قائداعظم کے سوا پاکستان میں کوئی ذی



حیثیت شخص نظام یا ریاست سے دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ معاملات کی دیکھ بھال کے لئے غلام محمد کو امور ریاست کا نگراں مقرر کیا گیا تھا جو عرصہ تک ریاست میں وزیر مالیات رہے تھے اور نظام کو غدار کہہ کر اپنا حق نمک ادا کرتے تھے۔ ان کا تکلیف دہ المناک واقعات کا ذکر صاحب کتاب نے انتہائی دکھ سے کیا ہے اور ریاست کی بقا کے لئے سب کچھ کر گزرنے کے عزم کے باوجود اپنی کسمپرسی اور بے دست و پائی کا جو احساس ان پر چھایا رہا اسی کے تحت واقعات کو بیان کیا ہے۔

ہندو سامراج کی ریشہ دوانیوں کا حال پڑھ کر غصہ آیا ہے تو پاکستان بیوروکریسی کی بے حسی پر آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے۔ یہ نہایت عجیب و غریب صورت حال صاحب کتاب نے بیان کی ہے کہ غلام محمد نے ہائی کمشنری کو بند کئے بغیر ہائی کمیشن کو عہدہ چھوڑنے پر مجبور کیا اور حکم دیا کہ وہ لاہور چلے جائیں اور محکمۂ ریلوے میں چھوٹا سا عہدہ قبول کرلیں۔ ان کے حسب الحکم صاحب کتاب نے عہدہ تو چھوڑ دیا لیکن ملازمت کی پیش کش قبول نہیں کی۔ کاغذوں میں کمشنری قائم رہی اور ہر سال شائع ہونے والے سرکاری ریکارڈ میں اس کے وجود کو تسلیم کیا جاتا رہا۔ یہ سلسلہ دور ایوب خان تک جاری رہا۔ ریاست کو فوجی طاقت کے ذریعہ زیر کرنے کے بعد وہ فنڈ جو پاکستان میں تھے بھارت ان پر اپنا حق جتاتا تھا صاحب کتاب نے دو کروڑ روپیہ بینک سے نکال کر حکومت پاکستان کے پاس امانت رکھوائے صاحب اقتدار کی منطق ہمیشہ درست ثابت ہوتی ہے چنانچہ یہ دو کروڑ روپیہ کبھی حیدر آبادیوں کے مفاد کے لئے واپس نہیں کئے گئے۔ بہرحال مقام شکر ہے کہ صاحب کتاب کی دانشمندی سے بھارت ان پر بھی غاصبانہ قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔

تقسیم ہند کے وقت کے حالات کے بہت سے گوشے ہنوز منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔ صاحب کتاب نے محتاط انداز بیان اختیار کرکے ان سازشی چہروں کو پوری طرح بے نقاب نہیں کیا ہے جو سقوط حیدر آباد کے سبب بنے پھر بھی ایسے حوالے موجود ہیں جو قاری کی رہنمائی کرسکتے ہیں۔ سطور میں اتنا کچھ نہیں ہے جتنا بین السطور میں ہے۔ طرز تحریر سادہ ہے اور مصنف کی ذات کے حوالے سے تاریخی واقعات کی جگ بیتی ہے۔

**یادوں کی برات : جوش ملیح آبادی : لاہور : ۱۹۷۵ء**

جوش ملیح آبادی کی مہارت فن شاعری اور زبان دانی پر کس کو کلام ہوسکتا ہے۔ نظم کی طرح نثر میں بھی ان کا خاص دلنشین اسلوب ہے جس میں دبستان لکھنؤ کے حسن اور ٹیگور کی خیال آرائی کا امتزاج ہے۔ جوش کی نثر کے ابتدائی نقش جو "روح ادب" میں نظر آتے ہیں ان کا نکھار یادوں کی برات میں ملتا ہے۔ یہ جوش کی خود نوشت ہے۔ جس میں اپنے خاندانی پس منظر'

بزرگوں کے حالات' ان کے کردار و اعمال بھی پوری وضاحت سے شامل کئے ہیں۔ واقعات و حالات میں تاریخی تسلسل نہیں ہے اس لئے اسے سوانح نگاری سے زیادہ یادداشتوں کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ جوش نے اپنے حالات ضرور تاریخی ترتیب میں لکھے ہیں لیکن سنین نہیں دیئے ہیں اور جہاں دیئے ہیں وہ درست نہیں ہیں۔

جوش میں بے پناہ صلاحیتیں قدرت کا عطیہ تھیں وہ سنجیدگی سے شاعری کرتے تو بہت بڑے شاعر بن سکتے تھے۔ اور نثر نگاری میں بھی سنجیدگی اختیار کرتے تو اس دور کے نمائندہ نثر نگار تسلیم کئے جاسکتے تھے۔ یادوں کی برات پڑھ کر قاری لطف اندوز ہو سکتا ہے لیکن اس میں بصیرت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اس طبقہ سے ان کی ذہنی اور روحانی وابستگی ہے۔ جس میں وہ پیدا ہوئے۔ نوابوں' جاگیرداروں اور تعلقہ داروں کا یہ طبقہ اپنے آپ کو تعلیم و تربیت سے بالاتر سمجھتا تھا اس کے اخلاقی اور سماجی اقدار عام معاشرتی قدروں سے مختلف تھے وہ "شر" پر "خیر" کا ملمع چڑھا کر اس کو صداقت تسلیم کرتا اور دوسروں کو تسلیم کرانے پر مصر رہتا تھا جوش کی زندگی ہی میں تاریخ کے جدلیاتی عمل نے اس طبقہ کو اس منزل پر پہنچادیا تھا جہاں آخری رسوم کی ادائیگی باقی رہ گئی تھی۔ جہاں رسی جل چکی تھی مگر بل باقی تھا۔ پرانی قدروں کے مسمار ہونے اور بصورت مجبوری نئی قدروں کو اپنانے کے دوران جو ذہنی اور روحانی کشمکش ہوتی ہے جوش اسی میں مبتلا رہے۔ اس کشمکش نے ان کی ذات کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا جو باہم دست گریباں رہے۔ وہ مزاجاً" جاگیردار تھے۔ ضرورت نے انہیں انقلاب پسند بنادیا تھا۔ اس کتاب میں ان کے یہ دونوں روپ نمایاں ہیں۔

کتاب کا وہ باب جو خاندانی حالات کے بارے میں ہے یقیناً معلوماتی ہے۔ اس کا طرز بیان فخرو مباہات کے جذبہ سے خالی نہیں۔ "پدرم سلطان بود" کی گونج ہر سطر سے نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنے جد یار بیگ خان کے ذکر سے خاندان کے تعارف کا آغاز کیا ہے جو درۂ خیبر کے "سرداروں" میں سے تھے۔ ۲۳۴ھ میں قائم گنج ضلع فرخ آباد میں سکونت اختیار کی تھی۔ نواب غازی الدین حیدر کے متوسلین میں شامل تھے۔ جوش کے دادا تہور جنگ حسام الدولہ۔ نواب فقیر محمد خان گویا تھے۔ جن کا ذکر خاص فخر سے کیا ہے۔ ان کی شخصیت جوش کے شعور پر ہمیشہ مسلط رہی اور وہ دادا کے جاہ و جلال' شان و شوکت' ثروت و امارت کے حصار سے کبھی باہر نہ نکل سکے۔ وہ گویا خود کو برصغیر کے تمام ریاستی حکمرانوں سے افضل و برتر خیال کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے والد بشیر احمد خان' والدہ اور دیگر افراد خاندان کے حالات اور اوصاف پر بھی



روشنی ڈالی ہے لیکن بزرگوں کے بیان میں بھی حفظ مراتب کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جرأت اظہار سے خود نوشت میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ اس سے حقیقت نگاری اور بے باکی کا اظہار ہوتا ہے لیکن بزرگوں کو اپنی سطح پر لاکر ان کی جنسی بے راہ روی کو فخریہ بیان کرنا ہمارے معاشرتی اصول و ضوابط کے منافی ہے۔ اسی طرح اگر یادوں کی برات کو "خود کشائی" قرار دیا جائے تو جوش کے بارے میں اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا۔

انہوں نے اپنی ذات کے "عناصر خمسہ" کی بھی نشاندہی کی ہے جن میں شعر گوئی' عشق بازی' علم طلبی اور انسان دوستی کو شامل کیا ہے۔ (۲۸) ان کی قدرت شعر گوئی میں کلام نہیں! ان کی "عشق بازی" وہی ہے جو جاگیردار طبقہ کا طرۂ امتیاز رہی اس ضمن میں جن واقعات کو بیان کیا ہے وہ "عشق" کے ضمن میں نہیں بلکہ "ہوس" کے ضمن میں آتے ہیں۔ "عشق بازی" کے سلسلہ میں وہ ضرورت سے زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ ہوسناکی" کو "مردانگی" قرار دیتے ہیں اور جو جنسی بدفعلی میں مبتلا نہ ہوا اسے مرد تسلیم کرنے کو تیار نہیں اس حوالہ سے انہوں نے بعض معزز حضرات کے رویہ کو تمسخر اور تضحیک کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ اگر ان کے نظریے کے مطابق جنسی بے راہ روی کو عام کردیا جائے تو انسانی معاشرہ کی بنیادیں ہل جائیں اور جنگل کا قانون نافذ ہو جائے وہ قاری تک کسی صالح اور تعمیری خیال منتقل کرنے کے بجائے اسے "جنس پرست حیوان" بنانے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ

"مسکرات و مستورات" نوع انسانی کے ایسے فطری رجحانات ہیں کہ وہ "انسان کو اکسا کر وجد میں لاتی اور اس کی نسل بڑھاتی ہیں" (۲۹)

غالباً" جوش پہلے اور آخری مفکر ہیں جنہوں نے "مسکرات" کو نسل بڑھانے کا ذریعہ قرار دیا ہے جبکہ سائنس نے اس کی نفی کی ہے۔ وہ "وجد" اور "نشہ" کے درمیان فرق کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ انسانی جبلتوں سے انکار نہیں انہیں تہذیب دینا ہی شرف انسانیت ہے وہ انسانی شرف کے قائل نہیں وہ اسے "جبلی حیوان" ہی دیکھنا چاہتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ مے خانے اور قحبہ خانے آباد رکھنے چاہئیں۔

ان کی "علم طلبی" کی شہادت نہ تو ان کی شاعری سے ملتی ہے اور نہ یادوں کی برات سے۔ ساڑھے سات سو صفحات کی اس کتاب میں چند سطریں بھی ایسی نہیں جو ان کی علم طلبی کی گواہی دے سکیں۔ ایک باب "ولولہ تعلیم" کے زیر عنوان بھی ہے۔ اس میں بھی نہ تو ولولہ ہے اور نہ تعلیم! وہ چند کتابوں اور استادوں کا حوالہ بھی نہ دے سکے جن سے علم حاصل کیا ہو۔ بہ این ہمہ

جب وہ سرسید احمد خان جیسے بزرگ پر اعتراض اور تنقید کرتے ہیں۔(۳۰) تو ناطقہ سربگریباں رہ جاتا ہے کہ اس کیا کہئے۔

علم طلبی کی طرح انسان دوستی کا دعویٰ بھی بے دلیل ہے۔ انسان دوستی کے ضمن میں انہوں نے چند واقعات بیان کئے ہیں ان میں انسان دوستی نظر نہیں آتی بلکہ ان کے بیان سے وہ اپنے جذبہ تفاخر کی تسکین کرتے ہیں۔ جس طرح وہ "غلام حسین بخشا پر تڑاتڑ چھڑیاں برسا کر" (۳۱) اس سے تسکین حاصل کرنے کا ذکر کرتے ہیں یا پھر "ماسٹر بن کر اپنا پڑھا ہوا سبق ساتھ کے بچوں کو پڑھاتے اور دوسرے دن سے آموختہ دہرواتے اور دھرا نہ سکنے پر ان کو ڈنڈوں سے پیٹتے اور ان کے کاندھوں پر سوار ہو کر ان کو خچروں کی طرح اس قدر سرپٹ دوڑایا کرتے کہ جانوں پر بن جاتی"(۳۲)

کون ہے جو ان واقعات کو پڑھنے کے بعد ان کی انسان دوستی کا قائل ہو سکتا ہے۔ بیشک دعوے اس احتیاط سے کرنے چاہئیں کہ واقعات وحالات انہیں ثابت بھی کرسکیں یادوں کی برات اس احتیاط سے بے نیاز ہے جہاں تک تاریخی واقعات بیان کئے ہیں وہ بھی صداقت سے عاری ہیں۔ انہوں نے احمد آباد میں مولانا آزاد اور مولانا محمد علی سے ملاقات کا حال بیان کیا ہے جبکہ اس وقت مولانا آزاد کلکتہ میں اور مولانا محمد علی کراچی میں مقید تھے۔ ریاست حیدر آباد میں ملازمت کے جو حالات بیان کئے ہیں وہ بھی درست نہیں ہیں۔ ڈاکٹر داؤد اشرف نے اپنی کتاب "بیرونی مشاہیر ادب حیدر آباد میں" (۳۴) شائع کی ہے۔ جس میں تمام دستاویزات کے عکس شامل ہیں۔ جوش لکھتے ہیں کہ نظام کی بڑی خواہش تھی کہ جوش ان سے ایک بار معافی مانگ لیں لیکن جوش کی خودداری نے اس کی اجازت نہیں دی جبکہ مذکورہ کتاب میں(۳۵) ان کے تحریری معافی نامہ کا عکس موجود ہے۔ حیدر آباد سے نکالے جانے کا انتقام انہوں نے اس طرح لیا ہے کہ ایک شہزادی کے خود پر عاشق ہونے کا قصہ گڑھ لیا ہے اور بیان کیا ہے کہ کنگ کوٹھی میں شہزادی نے انہیں زبردستی روکنا چاہا اور کہا کہ "رک جاؤ ورنہ جان دے دوں گی" (۳۶) دنیا جانتی ہے کہ کنگ کوٹھی میں داخلہ آسان نہ تھا اور پھر جہاں خواتین کا قیام تھا وہاں تک کسی غیر مرد کے پہنچنے کا امکان ہو ہی نہ سکتا تھا۔ جوش نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کی شان میں قصیدہ نہیں لکھا (۳۷) اس کی سچائی جانچنے کے لئے اخبار "الجمعیت" کا (۳۸) ۱۹۲۸ء کا خصوصی شمارہ دیکھا جا سکتا ہے۔ جس میں ان کا نظام سابع کی شان میں قصیدہ موجود ہے۔

جوش نوابوں اور جاگیرداروں کی اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ وہ بغیر محنت کئے اپنی



رعایا سے دولت سمیٹتے تھے۔ لیکن خود نظام سے جو بغیر استحقاق کے وظیفہ پاتے تھے اس کے لئے ان کے پاس جواز موجود ہے کہ "اگر ہم اپنے اصول قربان کئے بغیر ان سے ایک روپیہ بھی وصول کرلیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے ان کو بقدر ایک روپیہ کمزور کردیا اور اپنے کو بقدر ایک روپیہ قوی بنالیا" (۳۹)

یہ عجیب فلسفہ ہے کہ بغیر استحقاق جاگیردار روپیہ لے تو حرام جوش ایسا کریں تو جائز!

ان کی عملی زندگی کی ناکامی کی وجہ ان کی بے راہ روی اور دنیاوی کاروبار میں مستقل مزاجی کی کمی تھیں جن کا انہوں نے کبھی اعتراف نہیں کیا رسالہ "کلیم" جس اہتمام اور غیر معمولی سرمایہ کی امداد سے نکالا وہ ان کی زندگی سنوارنے کا سبب بن سکتا تھا لیکن انہوں نے اس کامیاب کاروبار کو غیر سنجیدہ طریقہ کار کی وجہ سے تباہ کیا۔ پاکستان آکر بھی وہ زیادہ کامیاب زندگی نہیں گزار سکے اور اپنی ہر ناکامی کا سبب دوسروں کو قرار دیا۔

خود نوشت میں سچائی کی جو بازگشت ہونی چاہئے یادوں کی برات میں موجود نہیں جوش نے غلط دعوے کئے ہیں اور تاریخ کو مسخ کرکے انہیں اپنے خیال کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے۔ اسے قاری کے ساتھ زیادتی ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر وہ واقعات میں صداقت کو ملحوظ رکھتے۔ اپنے دور کے ذہنی' ادبی سیاسی رجحانات کا تجزیہ کرتے انہیں کمال صداقت سے بیان کرتے' اپنی ناکامیوں کا اعتراف کرتے اور ان کی وجوہات کو تسلیم کرتے تو وہ ایک کامیاب آپ بیتی پیش کرسکتے تھے۔

یادوں کی برات سے لطف اندوز تو ہوا جا سکتا ہے لیکن جوش اپنی اور اپنے زمانہ کی جو تصویر پیش کرنا چاہتے تھے قاری اسے دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ بجائے اس کے کہ ان کی شخصیت کے نقش ونگار واضح ہوتے اس تحقیق کے بعد وہ دھندلا جاتے ہیں۔

تقریبا ۳۸۰ صفحات سوانحی احوال وکوائف پر مشتمل ہیں اور چار سو صفحات میں "چند قابل ذکر احباب" (۴۰) "چند عجیب ہستیاں" (۴۱) "معاشقے" (۴۲) ہیں جن کی حیثیت ضمنی ہے ان صفحات میں جو کچھ لکھا گیا وہ ان کی افتاد طبع کی غمازی کرتا ہے انہیں اچھے سے اچھے آدمی میں خوبی کبھی نظر نہیں آئی اگر کسی کے حوالے سے کوئی صفت بیان بھی کی ہے تو اپنے ذوق کے مطابق۔

یادوں کی برات نثرنگاری کے کمال حسن کا نمونہ ہونے کے باوجود وقائع نگاری کے لحاظ سے غیر معتبر اور انتہائی ناکام آپ بیتی ہے۔

## اپنی تلاش میں : کلیم الدین احمد : پٹنہ : ۱۹۷۵ء

کلیم الدین احمد الجھے ہوئے خیالات اور اس سے زیادہ الجھی ہوئی عبارت آرائی کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی خودنوشت سوانح عمری بھی اسی نوع کی الجھن کا شکار ہے۔ اس میں ذہنی رو ہے باتوں کا طومار ہے۔ اگر نہیں ہے تو سوانح عمری نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ انہوں نے یہ تحریر اس لئے یادگار چھوڑی ہو کہ کوئی ماہر نفسیات اس کا مطالعہ کرے اور ان کے شعور ولاشعور کی گرہیں کھول ان کی شخصیت کی تعبیر کر سکے۔

مصنف کا ارادہ تو سوانح عمری لکھنے کا تھا۔ انہوں نے موضوع اور فن کے تقاضوں کو یکسر فراموش کر کے غیر متعلق مباحث کو چھیڑا اور انہیں پر سارا زور بیان صرف کر دیا ہے۔ اپنی پیدائش کا ذکر کرتے ہین تب بھی بحث پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

"نہ ہوتا تو میں کیا ہوتا؟ خدا ہوتا؟ کچھ نہیں ہوتا؟ یہ تو محض شاعری ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہونے نے مجھے ڈبو دیا یا تیرایا؟ بلبلا ابھرتا ہے پھر ٹوٹ جاتا ہے یہ بنتا بگڑتا کیوں ہے؟ دریا کو بلبلوں کے بننے بگڑنے کی خبر ہے یا وہ بے خبر ہے؟" (۴۳)

یہ کوئی فلسفیانہ نئی بات نہیں ہے۔ اردو شاعری ان سوالوں سے بھری پڑی ہے۔ مصنف کا مطالعہ ان کے ذہن پر غالب رہا اور جو کچھ پڑھا تھا اسی کو بغیر تبدیلی کئے یا نیا زاویہ عطا کئے درج کر دیا ہے۔ موقع و محل کے لحاظ سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں۔ صرف بات بڑھانے کے لئے تحریر میں اضافی امور شامل کر دیئے ہیں۔ یہ کتاب کا غالب عنصر ہے۔ غیر ضروری اور غیر متعلق مباحث ہی نہیں بیسیوں شعر صرف اپنی پسند ظاہر کرنے کے لئے نقل کئے ہیں۔ بے ربطی اور تضاد بیانی اس پر مستزاد ہیں۔ قاری کو خودنوشت کے مطالعہ کے دوران جو دلچسپی ہونی چاہئے وہ ان کی وجہ سے متاثر ہوئی ہے۔ وہ مولانا محمد علی جوہر پر تو اعتراض کرتے ہیں کہ "ان کی تقریریں ضرورت سے زیادہ لمبی ہوتی ہیں" (۴۴) لیکن خود بھی طول کلام کے شکار ہو گئے ہیں۔

مصنف نے اپنی سیرت و کردار کے تشکیل میں جن عناصر کا ہاتھ رہا اس کا اظہار کھل کر کیا ہے۔ کسی مصلحت سے کام نہیں لیا یہ ایک اچھی بات ہے۔ خودنوشت اس کی متقاضی ہوتی ہے اور قاری کا بھی یہی مطالبہ ہوتا ہے۔ پہلا اہم اثر اپنے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد کا ہے جنہوں نے جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ نہایت قابل آدمی تھے علامہ اقبال کے حلقۂ احباب میں بھی شامل رہے اور اس دور کی تہذیب کی نمائندہ ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔

دوسرا اہم اثر وہابیت کا بتایا ہے اس بارے میں دو ابواب پر مشتمل ان کے مذہبی خیالات



اور مذہب کے حوالے سے عام رجحانات پر رد عمل سامنے آتا ہے۔ اس میں ایمان' شرک اور تشکیک کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔

تیسرا اثر ادبیات کا ہے۔ اپنے وسیع مطالعہ اور اس کے ماحصل کا ذکر ادیبانہ انداز میں کیا ہے اور واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ شعر و ادب کے حوالے سے فرد کا ذوق' ذہن کے پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔

ان موضوعات پر جس تفصیل سے لکھا گیا اس کے برخلاف ذاتی حالات کو پردۂ اخفا میں ہی رکھا ہے۔ اپنی نجی زندگی کے بارے میں لکھنے سے گریزاں رہے۔ کہیں کہیں ایک آدھ جملہ ضرور مل جاتا ہے۔ لیکن زندگی کے نشیب و فراز کا مکمل نقش سامنے نہیں آتا وہ تنقید کے ایک خاص دبستان کے موجد مانے جاتے ہیں اس حوالے سے بھی بیان نہیں کیا کہ اس کی تشکیل اور نشوونما کے کیا اسباب و محرکات تھے۔

مصنف نے ایسی خودنوشت پیش کی ہے جو سوانحی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی۔ شخصیت کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ تحریر کی طوالت نے ہر قدم پر الجھن کے اسباب مہیا کر دیئے ہیں۔

## زرگزشت : مشتاق احمد یوسفی : کراچی : ۱۹۷۶ء

مشتاق یوسفی کی خودنوشت "زرگزشت" مکمل سوانح نہیں۔ البتہ روداد ہے ان کی پیشہ ورانہ زندگی کی! وہ بینک کاری یا حسابات لکھنے کے عمل سے ناواقف ہونے کے باوجود بینکاری کے شعبہ سے اس لئے منسلک ہو گئے کہ وہیں انہیں ملازمت مل گئی تھی۔ ایک معمولی سے درجہ سے ترقی کرتے ہوئے بینک کے اعلیٰ ترین عہدوں تک پہنچے اور اس شعبہ کے رموز اور اس کی کارکردگی پر اتنے حاوی ہو گئے کہ انہیں عالمگیر شہرت ملی۔ بقول خود ان کے

"پیشہ سمجھے تھے جسے ہو گئی وہ ذات اپنی" (۴۵)

وہ اس تحریک کا مقصد یہ بیان کرتے ہیں کہ

"یہاں ایک چھوٹی سے جھلک دنیا کی دکھائی مقصود ہے جس کا ہر خانہ' ہر کابک' بھانت بھانت کے فرمان روایان ناوقت کا تجلۂ پندار ہے۔" (۴۶)

ان کے دعویٰ کے مطابق خودنوشت کا مقصد اظہار ذات کے سوا کچھ نہیں' یہ تو دنیا کی سبق آموزی کے لئے تحریر کی گئی اور نہ مزاح کے لئے۔ دونوں کی نفی کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ۔

"منشا سبق آموزی جہاں نہیں ہے نہ اپنے سینے میں کوئی امانت یا آگ کہ امیر خسرو کی طرح

یہ کہہ سکیں کہ صندوق استخوانی میں بے شمار تحفہ ہائے آسمانی ایسے تھے جو میں نے اس دن کے لئے بچا رکھے تھے۔

"اپنے وسیلہ اظہار مزاح کے باب میں کسی خوش گمانی میں مبتلا نہیں۔ قہقہوں سے قلعہ کی دیواریں شق نہیں ہوا کرتیں۔ چٹنی اور اچار لاکھ چٹکانے دار سہی لیکن ان سے بھوکے کا پیٹ بھرا جاسکتا نہ سراب سے مسافر کی پیاس بجھتی ہے" (۴۷)

ان کا دعویٰ ہے کہ ان کی شخصیت مشاہیر سے متاثر نہیں۔ البتہ ان میں اور بعض مشاہیر میں چند باتیں مشترک ہیں مثلاً

"نپولین کا قد، جولیس سیزر کا چٹیل سر جینا لولو بریجڈا کا وزن، سموئل جانسن کی بینائی ناک بالکل قلوپطرا کی مانند کہ اگر آدھا انچ بھی چھوٹی ہوتی تو اس دکھیا کا شمار بد صورتوں میں اور اپنا خوبصورتوں میں ہوتا" (۴۸)

اپنے سراپا کو اتنے پُر مزاح انداز میں پیش کرنا مشتاق یوسفی کا ہی حق ہے۔ پوری کتاب اس نوع کے پُر مزاح اور طنزیہ جملوں سے بھری پڑی ہے اور یہی اس کتاب کا حسن اور مصنف کا ہنر ہے۔ اس نے انہیں صاحب طرز انشاء پردازوں کی پہلی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ یہ ہنر اکتسابی ہے اور نہ کسی کا فیض، اسے ایجادہ بندہ کہہ سکتے ہیں جس کی مثال نہ پہلے ملتی ہے اور نہ بعد میں کوئی اس کی پیروی میں کامیاب ہوا۔

جہاں تک خود نوشت میں "سچائی" اور حقیقت نگاری کا تعلق ہے مصنف نے اس کی وضاحت کردی ہے لکھتے ہیں۔

"نامۂ اعمال میں چند تبدیلیاں بوجوہ ناگزیر تھیں اس میں پردہ نشینوں کے علاوہ کچھ کرسی نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ چنانچہ باستثنائے مسٹر اینڈرسن نام اور مقام بدل دیئے گئے ہیں کہیں کہیں واقعات وابواب میں تقدیم و تاخیر نظر آئے گی۔ چند کردار بھی عمداً "گڑ بڑ" کردیئے ہیں اور خوف فساد خلق سے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کردیا ہے۔ اس کے باوجود اگر کہیں کسی شخصیت یا حیثیت سے مماثلت پائی جائے تو "فکشن" کا سقم تصور کیا جائے۔" (۴۹)

کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرز ادا ہے

مصرعہ محولہ بالا میں تحریر کے جن اجزائے ترکیبی کا ذکر کیا ہے اسی نے خود نوشت کو مضمون اور بیان کا حسن عطا کیا ہے۔

زندگی کے نشیب و فراز کو بیان کرتے ہوئے مصنف کو جھجھک کی بناء پر واقعات سے چشم



پوشی کرنا چاہئے اور نہ کسی امر پر فخر و مباہات سے کام لینا چاہئے۔ یہ دونوں اوصاف خود نوشت میں موجود ہیں۔ مصنف نے ابتدائی زندگی کی بے سروسامانی بھی مزے لے لے کر جرأت کے ساتھ تحریر ہے۔ اس پر نہ شرمائے ہیں اور نہ اپنے کو چھوٹا محسوس کیا ہے۔ بینکنگ کے بلند ترین مناصب پر فائز ہونے کے بعد کسی شان شوکت کا انداز اختیار نہیں کیا اور نہ یہ دعوے کیا ہے کہ ان کی کامیابیاں جانکاہی کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنی ذات کی اچھائیوں اور برائیوں پر تبصرے سے گریز کرتے ہیں اور نتائج کے اخذ کی ذمہ داری قاری پر ڈال دیتے ہیں۔ یہی غیر جانبداری کا تقاضا ہوتا ہے۔

لکھنے والے دوسروں پر تو بے تحاشہ طنز کرتے ہیں۔ حوصلے کی بات یہ ہے کہ اپنی ذات کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے "زرگزشت" شاہد ہے کہ مشتاق یوسفی میں یہ حوصلہ بھی موجود ہے۔

بیان کی صداقت اور تحریر کی دلکشی اس خود نوشت کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔

## آپ بیتی : عبدالماجد دریا بادی : لکھنؤ : ۱۹۷۸ء

مولانا عبدالماجد دریا بادی کی "آپ بیتی" اس صنف کی ایک کامیاب تصنیف ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مولانا نے ساری زندگی مطالعہ اور تحریر کا کام کیا۔ ان کے مطالعہ کی وسعت نے انہیں علم کے اس نشیب و فراز سے گزارا جہاں کبھی وہ فلسفہ، منطق اور نفسیات کی موشگافیوں کی وجہ سے تشکیک ہی نہیں الحاد کے بھی شکار رہے اور اپنے ہی مطالعہ اور غور و فکر سے اس خار زار سے نکل کر ایمان اور اعتقاد کو استوار کیا اور خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ بہت سے کتابوں کے مصنف ہیں۔ سچ، صدق اور صدق جدید کی ادارت کی ہے۔ مطالعہ نے غور و فکر کی عادت ڈالی اور کثرت مطالعہ نے انواع علوم وادب سے آشنا کیا۔ زندگی بھر کی تحریری مشق نے انہیں صاحب اسلوب انشاء پرداز بنا دیا۔ اپنی عمر کے ۷۷ '۷۵ ویں برس میں انہوں نے کتاب زندگی کے اوراق کا دوبارہ مطالعہ اپنی یادداشت کے بھروسے پر کیا اور ان واقعات کو جو ان کی شخصیت کی صورت گری کی بنیاد تھے اور ان کے ذریعہ ان کے مزاج کو سمجھنے میں مدد مل سکتی تھی اس طرح یکجا کردیا ہے کہ ان کی خوبیاں اور خامیاں سب آشکار ہو گئی ہیں۔ ذات کی اہمیت جتانے کے لئے نہ تو مبالغہ سے کام لیا ہے اور نہ غیر ضروری طور پر زور بیان صرف کیا ہے۔

جہاں تک ان کے سوانحی واقعات کا تعلق ہے ہوش سنبھالنے سے لے کر پختہ عمر کو پہنچے

تک کے واقعات جن کو وہ اہم سمجھتے تھے تاریخی تسلسل میں پیش کر دیے ہیں۔

بچپن کے واقعات' طالب علمی کے ادوار' عہد شباب کی دلچسپیاں اور بڑھاپے کی ذمہ داریاں نہایت خوبی سے بیان کی ہیں۔ اپنے مخصوص طرز تحریر سے ان سب میں جان ڈال دی ہے۔ رسم بسم اللہ جزئیات کے ساتھ تفصیل سے بیان کی ہے اس سلسلے میں جو رسمیں اور باتیں اب خواب وخیال ہو چکی ہیں پوری وضاحت سے لکھ دی ہیں تاکہ تاریخ ثقافت سے دلچسپی رکھنے والے اس سے استفادہ کر سکیں۔ تعلیم کے مدارج جس طرح طے کئے انہیں بھی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے اور جگہ جگہ ایسے جملے لکھ گئے ہیں جن میں اختصار کے باوجود بھرپور جامعیت ہے۔ مثلاً علی گڑھ کے طالب علموں کی نفسیات اور کالج سے لگاؤ کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"علی گڑھ لڑکوں کا جی لگ جانے کے لئے مشہور ہے۔ لڑکے اس کے پیچھے وطن تک کو بھول جاتے ہیں۔" (۵۰)

عہد شباب میں دل لگانا' اس دور کی بے قراریاں اور بے تابیاں بیان کرتے ہوئے بھی وہ حسن اظہار کے جوہر دکھاتے ہیں اور پاکیزگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جو مشرقی روایات اور ان کی شخصیت کا حصہ رہے ہیں۔

انہوں نے اپنے کارناموں کی فہرست بھی مرتب کر دی ہے۔ وہ ایک اچھے مترجم تھے' صاحب نظر مفکر اور مصنف تھے' سوانح نگاری پر عبور رکھتے تھے اور بے باک صحافی تھے۔ ان حوالوں سے انہوں نے اپنے کارناموں کی تفصیل دی ہے جو ان کی شخصیت کی ہمہ جہتی کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن عملی زندگی کے ضمن میں انہوں نے اس دور کو نامعلوم وجوہ سے نظرانداز کر دیا جو حیدر آباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کے تحت قائم دارالترجمہ سے منسلک رہنے سے متعلق ہے۔

اپنی خوبیوں کے ساتھ اپنی خامیوں کو نظرانداز نہیں کیا اور ان کا ذکر بھی فراخ دلی سے کیا ہے۔ اپنے آپ کو اکل کھرا' ضدی' **مغلوب الغضب** کہنے اور ثابت کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ اسی طرح اپنی ناکامیوں اور نفسیاتی کمزوریوں کو بھی کھل کر پیش کیا ہے۔ علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں فلاسوفیکل سوسائٹی میں تقریر کرنی پڑی تھی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

"موضوع تھا حیات بعد الموت' ولیم جیمس کے کتابچے **Immortality** کو خوب پڑھ کر تیار ہو کر گیا تھا مگر تقریر پھیکی سی رہی' کچھ زیادہ نہ چل سکا۔" (۵۱)

عہد شباب میں کہیں دل لگانے کے بعد خیال ہوا کہ اس شہر میں رہیں جہاں ان کی محبوب نظر رہتی تھیں۔ اسی خیال سے سلسلۂ تعلیم ختم کرنے کے لئے بہانے تراشے' ایک بہانہ یہ ملا کہ جس



بینک میں راجہ صاحب محمود آباد نے ان کے تعلیمی اخراجات کے لئے رقم جمع کی تھی وہ ڈوب گیا تھا اور بھی بہانے تھے جن کی تفصیل ان کی نفسیاتی کیفیت کی نشان دہی کرتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ لکھنؤ سے یہ جدید دلچسپی اب میرے لکھنؤ سے باہر کہیں قدم رکھنے کی راہ میں خود ایک سنگ گراں بن گئی!

لکھنؤ سے باہر جی لگنے کی اب صورت ہی نہ تھی او گھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ مل گیا طبیعت کو عذر قوی اس بینک کے دیوالیہ ہو جانے سے ہاتھ آگیا کہ اب باہر رہنے کا خرچ کہاں سے نکل سکتا ہے۔ سلسلۂ تعلیم چھوڑ چھاڑ کر دہلی سے لکھنؤ آگیا اور دل کو یوں سمجھا لیا کہ جو علم و منزلت ایم اے پاس کر کے حاصل ہوتی وہی میں برس دو برس میں فلسفیانہ مضامین لکھ لکھ کر گھر بیٹھے حاصل کر لوں۔"

"نفس کتنا بڑا حیلہ ساز اور بہانہ باز واقع ہوا ہے کیسی کیسی صورتیں گڑھ لیتا اور کیا کیا امکانات فرض کر لیتا ہے" (۵۲)

اپنی کمزوریوں کے سلسلے میں الحاد ان کا سب سے بڑا اور اہم اعتراف ہے اس کا سلسلہ ۱۹۰۹ء میں شروع ہوا تقریباً" دس سال قائم رہا۔ اس کے بعد انہیں "حق" اور روحانیت کی روشنی نظر آئی اور مادیت' لاادریت اور تشکیک کی جو سربفلک عمارت برسوں کی تعمیر کی ہوئی تھی وہ زمین پر آرہی۔ مولانا شبلی کی سیرۃ النبی' مثنوی مولانا روم' فرید الدین عطار کی منطق الطیر' جامی کی نفحات الانس جیسی کتابوں کے علاوہ اکبر الہ آبادی' مولانا محمد علی اور فرنگی محل کے بعض علماء سے رہنمائی حاصل کی اور مولانا اشرف علی تھانوی نے ان کے ایمان کو مستحکم کیا۔

ان کی تصانیف و تالیفات کثیر تعداد میں ہیں ان کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

اپنی آپ بیتی لکھنے کے ضمن میں خصوصیت سے یہ اہتمام رکھا کہ وہ تمام باتیں جو اب متروکات میں شامل ہو چکی ہیں اور زمانہ ماضی کا حصہ بن چکی ہیں تفصیل سے بیان کی ہیں۔ اس خصوص میں زمیندار گھرانوں کا رہن سہن' ان کے معمولات اور مشاغل کے علاوہ غلاموں کنیزوں اور لونڈیوں کو رکھنے کا رواج' ان پر کئے جانے والے مظالم اور زیادتیوں کا احوال بھی ملتا ہے۔ ان کی مکروہات اور خلاف انسانی اعمال میں نادانستہ مولانا کا اپنا کردار رہا ہے جب تک ان کے قبیح ہونے کا احساس نہ ہوا وہ شریک ظلم رہے لیکن آخر میں اپنے ان اعمال پر عفو طلب بھی ہوئے۔

بعض ایسے امور کی تفصیل نہیں ہے جو اس دور میں عام موضوع بحث رہے۔ ان میں "ماجد

ابوالکلام ادبی معرکہ" اور ان کا عقد ثانی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے انہوں نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ

"مرحوم (آزاد) سے میری جو مخالفت تھی وہ صرف الہلال کے شروع زمانہ کی تھی ۱۲ء، ۱۳ء اور ۱۸ء میں تو وہ ختم ہو چکی تھی۔" (۵۳)

اس مخالفت کی وجہ ذاتی اور شخصی نہ تھی بلکہ زبان اور اصطلاحات کے بارے میں اختلاف تھا جس نے شکر رنجی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اجمالاً اس بحث کے ذکر سے قارئین کو ہر دو صاحبان علم کے نکات نظر سے واقفیت کا موقع فراہم ہوتا۔ دوسری شادی کے بارے میں انہوں نے اپنے آپ کو بری الزمہ قرار دیتے ہوئے یکطرفہ صورت حال پیش کی ہے۔ حالانکہ ان کی اہلیہ محترمہ کے خطوط سے دوسرا رخ سامنے آتا ہے اور وہ مولانا کی شخصیت کے بارے میں خوشگوار تاثر نہیں چھوڑتا۔

مولانا عبدالماجد کے طرز تحریر نے آپ بیتی کو بے حد دلچسپ بنا دیا ہے اور جہاں واردات کے ساتھ فکر کا عنصر بھی شامل کر دیا ہے اس میں لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ کم عمری میں تھیٹر دیکھنے کا اتفاق ہوا تو واقعہ کے حوالے سے اپنا اور بزرگوں کا محاسبہ کرتے ہوئے لکھا کہ

"سب یہی سمجھے کہ چھ برس کے معصوم بچے نے اگر ایک دفعہ ایک معصوم سا تماشا دیکھ لیا تو اس میں قباحت ہی کیا ہوئی؟ نادان والدین اور مربیّ خدا معلوم کتنے معصوموں کو اپنی نادانی اور کوتاہی سے اس غفلت بلکہ معصیت کے غار میں اپنے ہاتھوں دھکیلتے رہتے ہیں۔ والد مرحوم خود، بھائی صاحب مرحوم دونوں "ناچ" کو برا ہی سمجھنے والوں میں تھے اور کبھی ناچ مجرے کی محفل میں میرے جانے کے ہرگز روادار نہ تھے لیکن ڈراما اور تھیٹر کی بلا تو "صاحب" کی لائی ہوئی چیز تھی اور "انتساب دانایان فرنگ" کی جانب رکھتی تھی اس کے عیب کا عیب ہونا ہم مشرقیوں کی نظر میں اور وہ بھی انیسویں صدی کے اخیر میں رہ ہی کیا گیا تھا! فسق و معصیت کے کریمہ چہرے پر جب غازہ فیشن اور کلچر کا مل دیا ہے تو اسکی بدنمائی اور زشت روئی پر نظر ہی کس کی پڑتی ہے۔" (۵۴)

انسان کے دعوے عشق کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک ماہر نفسیات کے انداز میں بڑے پتے کی بات بتاتے ہیں کہ

"انسان زبانی دعوے عشق و محبت کے جو کچھ بھی کر ڈالے حقیقت میں وہ سب سے بڑا عاشق خود اپنے نفس کا ہوتا ہے۔" (۵۵)



"اس نوع کے تبصروں سے اس لئے مفر ممکن نہ تھا کہ وہ زندگی کے اس مرحلہ میں تھے جہاں لکھتے ہوئے اظہار حقیقت کے ساتھ قاری کے لئے اپنے فکر و ذہن کے وہ زاویے بھی پیش کرنا چاہتے تھے جو رہنما اصول بن سکتے ہیں ان میں ناصح کی خشکی نہیں بلکہ انشاء پردازی کی لطافت ہے۔"

چند امور کے لئے ذہنی تحفظات رکھنے کے باوجود مولانا عبدالماجد نے سوانح نگاری کا حق خوبی سے ادا کیا ہے۔ ان کی زندگی کے واقعات کے پس منظر مذہبی، تہذیبی، معاشرتی اقدار کے بھی واضح نقوش موجود ہیں جو شخص اور زمانہ دونوں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

### زرگزشت : جی اے اصغر : کراچی : مئی ۱۹۷۹ء

جی اے اصغر کراچی کے مشہور ماہر معالج امراض دماغی و نفسیاتی ہیں۔ ان کا تعلق ایک پسماندہ دیہات سے تھا۔ ان کے والد چند جماعتیں پاس پٹواری تھے۔ بچپن ہی سے انہیں جو ذہنی تربیت دی گئی وہ ایک اچھے اور کامیاب انسان بننے میں مددگار رہی۔ وہ چھ سال کی عمر میں زمینداری کے چھوٹے موٹے کام کرنے لگے تھے۔ پلنگ بننا، ٹوکری بننا، جال بننا، ہنڈیا پکانا، بڑھئی کا کام، درزی کا کام جان گئے تھے۔ اس تربیت سے ان میں محنت، لگن اور خود اعتمادی کے جوہر پیدا ہوئے۔ جن کے سہارے عزم ہمت کے ساتھ انہوں نے جدید طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ معمولی میڈیکل افسر سے عملی زندگی کا آغاز کیا توجہ اور انہماک کی بناء پر دماغی اور نفسیاتی امراض کے ماہر بن کر اپنا ایک بہت بڑا ہسپتال قائم کر لیا ہے۔ انہوں نے آپ بیتی محض اس لئے لکھی ہے کہ آئندہ نسل کے نوجوانوں کے جذبات کو ابھاریں جن کے دل میں تعلیم حاصل کرنے کی امنگیں ہیں اور ترقی کا جذبہ ہے، ان نوجوانوں کے لئے یہ تحریر شاید مشعل راہ ثابت ہو۔ واقعات کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے مصنف نے نہایت نامساعد حالات میں جو راہ متعین کی تھی اپنے عزم ارادے، حوصلے اور خود اعتمادی سے اس پر گامزن رہے اور منزل پالی ہے۔ اس بامقصد سرگزشت کا انداز تحریر بھی متاثر کن ہے حالانکہ وہ مستقل لکھنے والے نہیں ہیں۔

### یادوں کا جشن : کنور مہندر سنگھ بیدی سحر : کراچی : ۱۹۸۳ء

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اردو کے مشہور اور مقبول شاعر ہیں اس حیثیت سے انہوں نے دنیا دیکھی ہے وہ بھارت میں اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے ہیں اور انہیں ہر طرح کے لوگوں سے ملنے، ان کے حالات جاننے اور نفسیات کا مطالعہ کرنے کے وسیع مواقع حاصل رہے۔ ان کی

کتاب "یادوں کا جشن" آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ اسکے ابتدائی اوراق میں انہوں نے نہایت تفصیل سے اپنے اجداد کے حالات لکھے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ بابا گورونانک کی براہ راست سترہویں پشت میں ہیں اور بابا صاحب کو رام چندر جی کی نسل قرار دیا ہے جو یقیناً ایک انکشاف ہے۔ اپنے بزرگوں میں دادا سردار بھیم سنگھ جی' والد' بابا ہروت سنگھ بیدی کا تعارف بھی کروایا ہے۔ ان کے ذاتی اوصاف' انسانی ہمدردی' بے تعصبانہ ذہنیت کو جس طرح بیان کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں یہ صفات ورثے میں ملے ہیں۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر آئی سی ایس کا امتحان پاس کرنے کے واقعات بھی درج ہیں۔ بسلسلۂ ملازمت جن عہدوں پر مامور رہے اور جن مقامات پر متعین رہے ان کے بارے میں محض ذات کی حد تک معلومات فراہم نہیں کی ہیں بلکہ ماحول اور معاشرہ کے کوائف کی تفصیل کو بھی اہمیت دی ہے۔ کتاب کے ابواب ۲' ۳' ۴' ان کے حالات زندگی اور اوصاف وسیرت سے متعلق ہیں ۵' ۶ کا تعلق شاعری اور مشاعروں سے ہے۔ ساتویں باب میں چند برگزیدہ شخصیتوں سے اپنے تعلقات اور مراسم کا ذکر کیا ہے۔ اس میں عنوان کی رعایت کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ بخشی غلام محمد کن اوصاف کی بناء پر "برگزیدہ" قرار دیئے گئے ہیں' ناقابل فہم ہے۔ آٹھواں باب "چند عجیب وغریب شخصیتوں" کے بارے میں ہے جبکہ نویں باب میں بہت سے "دلچسپ واقعات" تحریر کئے ہیں۔ دسویں باب میں "ادبی لطیفے" ہیں۔ اس طرح "یادوں کا جشن" بیک وقت آپ بیتی بھی ہے۔ جگ بیتی بھی اور مجموعی طور پر ہر قسم کی یادداشتوں کا ریکارڈ ہے۔

سحر مشرقی تہذیبی روایات سے واقف ہی نہیں اس پر سختی سے کاربند رہنے کے عادی بھی ہیں۔ اس کی حمایت میں دانستہ یا نادانستہ طور پر ان کے خیالات جابجا مل جاتے ہیں۔ ان کے اوصاف میں دوست نوازی بھی شامل ہے۔ اس لئے کسی دوست کی کوئی خامی یا کمزوری نہیں گنوائی ہے۔ سب کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے اور جہاں "سخن گسترانہ بات" آگئی ہے وہاں نام کے انکشاف سے گریز کیا ہے۔ ان کی تحریر خوشگوار متانت کی حامل ہے۔ اپنے اسلوب سے انہوں نے بیان کردہ واقعات میں جان ڈال دی ہے۔ خود نوشتوں میں بہت کم ایسی ہیں جو معلومات افزا اور بامقصد ہونے کے ساتھ دلچسپی کا بھی غالب عنصر رکھتی ہوں "یادوں کا جشن" انہیں میں سے ایک ہے۔

### کاروان زندگی : ابوالحسن ندوی : کراچی : ۱۹۸۳ء

سید ابوالحسن ندوی علم وادب اور سوانح کے اس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں جو علامہ شبلی



کے زیر اثر قائم ہوا۔ اس دبستان کے لکھنے والوں نے زندگی کے نجی پہلو کو نظرانداز کرتے ہوئے علمی اور عملی کارناموں کے انکشاف کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ یہی حال سید ابوالحسن ندوی کی خود نوشت "کاروان زندگی" کا ہے (۵۶)

کتاب سترہ ابواب پر مشتمل ہے جبکہ ابتدائی پانچ ابواب میں خاندان' وطن' ماحول' عہد طفلی کے اہم نقوش واثرات' لکھنؤ کے قیام' تحریک خلافت کے اثرات' والد کی وفات' عربی تعلیم کی ابتدا' اردو زبان وادب کا مطالعہ' ندوۃ العلماء سے باضابطہ تعلق اور تعلیم وتدریس کے دس سال بیان ہوئے ہیں۔ اس میں بھی نجی زندگی کے حوالے برائے نام ہیں۔ دیگر ابواب میں ان خدمات کا ذکر کیا گیا ہے جو ندوۃ العلماء کی تعلیمی اور تدریسی شعبوں میں انجام دیں اور حج کے دو سفر' مصر اور مشرق وسطیٰ کے دورے' دمشق یونیورسٹی میں دیئے گئے خطبات' رنگون اور کویت کے سفر' اہم سیاسی واقعات کے تجزیئے جیسے موضوعات پر محیط ہیں۔ یقیناً یہ صاحب کتاب کی یادداشتوں کا گرانمایہ ذخیرہ ہے جو معلومات افزا ہونے کے ساتھ ان کی خدمات اور کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان سے ان کی اسلام' علوم اور عربی سے محبت اور رغبت آشکار ہوتی ہے۔ ایک اچھے ادیب کی طرح انہوں نے سلاست اور سلامت روی کے ساتھ ان تمام یادداشتوں کو قلمبند کردیا ہے اور کہیں مبالغہ یا خودستائی کے عناصر کو غالب نہیں ہونے دیا۔ لیکن ایک اچھی اور کامیاب سوانح عمری میں زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہونے کی جو خصوصیت ہونی چاہئے وہ اس میں بھی نہیں ہے۔

### گردراہ : ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری : کراچی : جنوری ۱۹۸۴ء

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اردو اور ہندی کے ادیب ہونے کے علاوہ شعبۂ تعلیم سے بھی وابستہ رہے ہیں اور ترقی پسند ادب کی تحریک کے اہم رکن شمار ہوتے ہیں۔ کے کے کھلر نے اپنی کتاب "فیض احمد فیض" میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا منشور انہیں سے منسوب کیا ہے جسے قدرے ترمیم کے ساتھ انجمن نے منظور کیا تھا۔ وہ صاحب علم بھی ہیں اور جہاں گرد بھی!

انہوں نے ایک زمانہ کو دیکھا اور نوع نوع کی شخصیات سے ملاقاتیں کیں۔ ایک تاریخ سیاست وثقافت وادب تو انہیں کتابوں سے حاصل ہوئی اور ایک مشاہدہ اور تجربے سے! اس لئے ان کی آپ بیتی متنوع ہونے کے ساتھ معلوماتی بھی ہے۔ برصغیر کے گوشے گوشے کا حال اس میں شامل ہے آزادی سے قبل رائے پور' کلکتہ' علی گڑھ' حیدر آباد (دکن)' لکھنؤ' دہلی اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے مختلف علاقے ان کی جولان گاہ رہے۔ ان کے علاوہ بھی ممالک غیر

خصوصاً" امریکہ، یورپ اور ایران کے ایسے دورے کئے جنہیں مطالعاتی دورے ہی کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی آپ بیتی کی اشاعت کی ابتدا رسالہ "افکار" کراچی میں بالاقساط کی تھی جس کی افادیت ودلچسپی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

مصنف نے پہلے باب میں "زندگی کے ابتدائی سال" میں خاندان اور نجی حالات قلمبند کئے ہیں اور اس کے بعد باقی ۱۹ ابواب میں کہیں بھی خاندانی یا نجی زندگی کو داخل نہیں ہونے دیا اور جو کچھ لکھا وہ اپنی ذات کے حوالے سے تجربات اور مشاہدات پر منحصر ہے۔ ان تمام ابواب میں سیاسی، ادبی، لسانی، ثقافتی اور معاشرتی امور بھی زیر بحث لائے ہیں لیکن کتاب کی سب سے نمایاں خصوصیت واقعات پر شخصیات کو ترجیح دینا ہے۔ جہاں کہیں کسی کا ذکر آیا ہے وہاں مکمل وضاحت کے ساتھ سیرت وکردار نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ جن شخصیات کے مختصر یا طویل خاکے درج کئے ہیں ان میں ہمایوں مرزا، مولانا ابوالکلام آزاد، چراغ حسن حسرت، پنڈت چترویدی، مجاز، جگر، پروفیسر حبیب، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ذاکر حسین، جواہر لال نہرو، علامہ اقبال، ڈاکٹر ن۔ م۔ راشد، سعادت حسن منٹو وغیرہ ہم کے خاکے شامل ہیں لیکن مولوی عبدالحق کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ ایک جامع اور مبسوط مطالعہ ہے۔ تیسرے باب میں دوران قیام علی گڑھ کی جو یادداشتیں تحریر کی ہیں ان میں قدرے خودستائی کا پہلو نمایاں ہے۔ انہوں نے ثابت کرنا چاہا ہے کہ اسرارالحق مجاز کو روایتی بے جان شاعری سے ہٹا کر حقیقت پسندی اور نظم نگاری کی جانب متوجہ کرنے کے محرک وہی تھے اور اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ مجاز نے ان کی صحبت اور ساغر کی دعوت پر مے نوشی شروع کی جو اس طرح ان کی جان سے لپٹی کہ پیچھا چھڑانا ممکن نہ رہا۔ اس باب کے بعض مندرجات باعث اختلاف بھی ہیں۔ انہوں نے صفحہ ۸۷ پر لکھا ہے کہ "سالانہ مشاعرہ کے موقع پر جگر جب علی گڑھ آتے تو صدیقی صاحب (پروفیسر رشید احمد صدیقی) کو ان کی خاطر منظور ہوتی اور بازار سے ایک آدھ بوتل منگوا دیتے۔ تاکہ جگر تشنہ کامی کے بہانے مشاعرے سے غائب نہ ہو جائیں۔ ایک بار انہوں نے بوتل اس تاکید کے ساتھ میرے سپرد کی کہ جگر صاحب کو اتنی دینا کہ سرور ہو نشہ نہ ہونے پائے۔" اس نوع کی کوئی بات صدیقی صاحب یا جگر کو جاننے والوں میں کسی اور نے بیان نہیں کی اور جو حضرات صدیقی صاحب کے مرتبے اور ان کے مزاج سے واقف ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اپنے مزاج کے خلاف وہ کسی بات کو بھی تسلیم کرنے اور کسی کو رعایت دینے کے روادار نہیں تھے۔ وہ شغل مے



نوشی کو کبھی پسند نہیں کرتے تھے۔ شاگردوں اور طالب علموں کو محبت اور خلوص کے باوجود ایک فاصلے پر رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں اس اظہار خیال کو کون باور کر سکتا ہے کہ وہ کسی طالب علم کے ذریعہ جگر کے لئے شراب منگواتے تھے یا ساقی گری کا فرض اسے سونپ سکتے تھے۔ جگر کے لئے صدیقی صاحب ایک بزرگ کا مرتبہ رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ تو اصغر کے ملنے والوں میں تھے۔ جس طرح اصغر کے سامنے جگر کو دم مارنے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ وہی حال صدیقی صاحب کے سامنے تھا۔ ایسے میں ان سے توقع کرنا کہ وہ جگر کے لئے شراب کا بندوبست کرتے ناقابل یقین ہے۔ اس بارے میں جلیل قدوائی نے بھی اس رائے کا اظہار اپنی کتاب "تجربے اور تجزیے" میں کیا ہے۔ اسی باب میں صفحہ ۸۰ پر اختر حسین رائے پوری نے تحریر کیا ہے کہ "سر راس مسعود نے انہیں (نواب نصیر حسین خان خیال) علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا صدر بنانے کا فیصلہ کیا ہی تھا کہ ۱۹۳۲ء میں یک بیک نواب خیال کا انتقال ہو گیا۔ جلیل قدوائی نے "شعلۂ مستعجل" میں نواب خیال کے خطوط شامل کئے ہیں جو اس زمانہ کے لکھے ہوئے ہیں جن میں وہ رامپور میں ملازمت کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے سر راس مسعود سے سعی وسفارش کے خواستگار نظر آتے ہیں۔ لیکن علی گڑھ میں صدر شعبۂ اردو کی پیشکش کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ صفحات ۸۱ تا ۸۳ پر "جواہر لال نہرو علی گڑھ کیسے آئے" بھی افسانہ طرازی سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ اختر حسین رائے پوری نے لکھا ہے کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو کو چوری چھپے علی گڑھ لانا چاہتے تھے۔ انہیں راضی کرنے کے بعد اپنے ہم راز پروفیسر حبیب اور ٹھاکر لکھن سنگھ کو اس کی اطلاع دی اور بات راس مسعود وائس چانسلر تک پہنچ گئی۔ گویا رازداروں نے قبل از وقت بھانڈا پھوڑ دیا اور راس مسعود خود اسٹیشن آ کر پنڈت جی کو اس طرح اپنے ساتھ لے گئے کہ گویا انہوں نے مدعو کیا تھا لیکن اسٹریچی ہال میں ان کی تقریر کے بعد اختر حسین انہیں لے اڑے کہ راس مسعود کو پتا بھی نہ چلا۔ پنڈت جی نہ ہوئے کوئی سوئی ہو گئے جو مجمع سے بھگا لئے جائیں کسی کو خبر نہ ہو۔ یہ بات مصنف کے شایان شان تو تھی کہ کھڑکی اور دریچے پھاند کر نکل جاتے لیکن پنڈت جی کسی اسکول یا کالج کے کم عمر طالب علم نہ تھے جو اس طرح ان کا ساتھ دیتے۔ برخلاف اس کے راس مسعود کے خطوط مشمولہ شعلۂ مستعجل سے معلوم ہوتا ہے راس مسعود ہی نے انہیں بلوایا تھا اور ان کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ اس واقعہ کی صداقت پر شبہ ہونے کے ساتھ مصنف کے انداز بیان پر بھی اعتراض کی گنجائش ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "علی گڑھ یونیورسٹی پر حکومت کا کنٹرول تھا" اس سلسلے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس یونیورسٹی پر کب حکومت کا کنٹرول نہ رہا۔ کیا

آزادی کے بعد بھی برصغیر پاک وہند کی تمام یونیورسٹیوں بشمول جامعہ اسلامیہ دہلی حکومت کے کنٹرول سے باہر ہیں۔ ترقی پسندی کے زعم میں لوگوں نے ہر اس ادارہ اور تنظیم پر طعن کرنا ضروری سمجھا ہے جس سے کسی نہ کسی طرح "مسلم" کا لفظ منسلک رہا۔ اس لئے علی گڑھ یونیورسٹی جو دراصل مسلم یونیورسٹی تھی کس طرح اس قہر سے بچ سکتی تھی۔ اس ضمنی سرخی کے تحت بیان ختم کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ

"جواہر لال نہرو کی علی گڑھ آمد کا خمیازہ سر راس مسعود کو اس طرح بھگتنا پڑا کہ ۱۹۳۵ء میں جب ان کے عہدے کی معیاد ختم ہوئی اور دوبارہ ختم ہوئی اور دوبارہ انتخاب کے امیدوار ہوئے تو حکومت ہند نے ان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور انتخاب ہار کر وہ وزیر تعلیم کے عہدے پر بھوپال چلے گئے" (۵۷)

امر واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں سر راس مسعود وائس چانسلری کے امیدوار تھے ہی نہیں۔ اس وقت کے آنے سے قبل ہی رجسٹرار کے عہدے پر تقرر کے لئے ان کے اور حکومت وقت کے درمیان سخت اختلاف ہو گیا تھا۔ چنانچہ اپنی وائس چانسلری کی مدت ختم ہونے سے قبل ۱۹۳۴ء میں وہ مستعفی ہو کر علی گڑھ سے چلے گئے تھے۔ ممکن ہے ان واقعات کی صحت پر اعتراض کے جواب میں کہا جائے کہ طویل مدت کے بعد یادداشت نے ساتھ نہیں دیا۔ لیکن اس استدلال کو اس لئے قبول نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخی واقعات کو بیان کرتے ہوئے ان کی صحت کے لئے مشاورت کر لینی ضروری تھی۔ قیاس پر مبنی تحریر کا حصہ بنانا کوئی خوشگوار عمل نہیں ہے۔

چوتھا باب حیدر آباد میں قیام کے بارے میں ہے جس کا بڑا حصہ مولوی عبدالحق کے ذکر خیر پر مبنی ہے۔ غنیمت یہ ہے کہ دوسرے ترقی پسندوں کی طرح حیدر آباد کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کی بادشاہت کے حوالے سے اسے مطعون کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اس باب میں مولوی عبدالحق کے بھائی ضیاء الحق کا تعارف کروایا ہے جو یقیناً "معلومات افزا ہے۔ مصنف نے اس بات کا بھی دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے حیدر آباد دکن کے دوران قیام میں ادیبوں اور شاعروں کا ایک حلقہ بنایا تھا جس نے بعد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی صورت اختیار کی۔ اس بارے میں سجاد ظہیر کی کتاب "روشنائی" میں کوئی ذکر نہیں حالانکہ انہوں نے انجمن کی تنظیمی کوششوں کا تفصیل سے حال بیان کیا ہے۔ مرزا ظفر الحسن "عمر گزشتہ کی کتاب" میں اس کی صریح تردید کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ

"کبھی کبھار کسی نشست میں شامل ہو گئے ہوں تو اور بات ہے ورنہ اس تحریک و تنظیم بلکہ



حلقے سے انہیں کوئی نسبت یا تعلق نہ تھا" (۵۸)

اسی باب میں گاندھی جی کی افتراء پردازی کا ذکر ہے جو ہندی اردو اختلاف کی صورت میں ظاہر ہو کر ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں پر آخری ضرب ثابت ہوا۔ ۱۹۳۴ء میں جب کہ ہندو مسلم مفاہمت کے کے دروازے بند ہوتے جا رہے تھے گاندھی نے کٹر ہندو فرقہ پرستوں کے ورغلانے پر ساہتیہ پرشد کا جلسہ کر کے ہندی اردو جھگڑے کی ابتدا کی اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مصنف نے انصاف پر مبنی فیصلہ پر پہنچ کر اس کا برملا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اس طرح ہندی پرشد کے جلسے میں ہندی کے طرف داروں کی بڑی تعداد جمع ہو گئی اور پس پردہ طے پایا کہ اسی وقت طے کرا لیا جائے کہ قومی زبان ہندی اتھوا ہندوستانی ہوگی۔ یہ تجویز کانگریس کے اس فیصلے کے منافی تھی کہ قومی زبان ہندوستانی ہوگی۔ جس سے مراد شمالی ہند کی بول چال کی وہ زبان ہے جو ہندی یا اردو میں لکھی جاتی ہے" (۵۹)

اس جلسے کے بعد ہی بابائے اردو نے گاندھی اور ہندی کے خلاف محاذ بنایا جو تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ گرد راہ میں اس تاریخی واقعہ کا پس منظر اجاگر کیا گیا ہے اور مصنف نے اپنا تاثراتی رد عمل بھی بیان کیا ہے۔

پانچواں باب قیام یورپ کے بارے میں ہے۔ وہ پی ایچ ڈی کرنے کے لئے پیرس گئے تھے۔ ان کی تحقیق کا موضوع تھا "قدیم ہند کی زندگی سنسکرت ادب کے آئینے میں" اپنی علمی سرگرمیوں کے علاوہ انہوں پیرس کے دوران قیام کے عام حالات اور سیاسی کوائف بھی بیان کئے ہیں۔ اس باب کی خصوصیت خالدہ ادیب خانم سے ملاقات اور ان کے خیالات کی ترجمانی کی وجہ سے بڑھ گئی ہے۔ موصوفہ ترکی نژاد ہونے کے باوجود عالم اسلام کی فلاح کے لئے انقلابی نظریات رکھتی تھیں اور انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا تھا کہ نسل، زبان اور زمین کے رشتے سے قومیت بن سکتی ہے تو مذہب کے اشتراک سے بھی ممکن ہے۔ دوران قیام پیرس جنگ عظیم دوم کا آغاز ہوا۔ اس کی وجہ سے ذہنی اذیت اور مادی مشکلات کو جو دور شروع ہوا اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

چھٹے باب میں فرانس سے واپسی کے بعد کے حالات ہیں جن میں امرتسر کالج میں ملازمت اور پھر مرکزی محکمہ تعلیم سے وابستگی اور کارگزاری کا سرسری جائزہ پیش کرنے کے علاوہ اس وقت کی عام سماجی حالت اور ادب میں پیدا ہونے والے جدید رجحانات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ خصوصیت سے ن م راشد کی آزاد نظم کے حوالے سے ان کے اور اپنے موقف کی وضاحت کی ہے لیکن یہاں بھی ان کی "انا پسندی" غالب ہے۔ راشد کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے کہ گویا آزاد

نظم میں وہ ان کے مشوروں اور ہدایتوں کے اس طرح پابند تھے جیسے کوئی شاگرد ہوتا ہے۔

ساتویں باب میں قیام پاکستان اور اس کے بعد رونما ہونے والے جانکاہ واقعات کے حوالے سے اپنے پاکستان آنے کی روداد بیان کی ہے۔

آٹھویں باب میں یونیسکو کی ملازمت، نویں باب میں افریقہ میں دو سال، دسواں ایران میں چار سال، گیارھواں فلسطین میں چند ہفتے، بارھویں میں اسپین کی جھلکیاں، تیرھویں میں اطالوی تاریخ و فن کے نقوش، چودھویں میں امریکہ کے بارے میں چند تاثرات، پندرھویں میں جاپان کی دل آویزی، سولھویں میں چند ممالک کی بھولی بسری یادیں درج ہیں۔ اس سوانح میں ذات کے حالات نے ضمنی اور ثانوی صورت اختیار کرلی ہے "گرد عالم" ہر ہر صفحہ پر طاری ہے۔ اگر واقعات کی صحت کے بارے میں زیادہ محتاط رویہ ہوتا اور اپنی ذات کو ابھارنے کی سعی نہ کی گئی ہوتی تو اچھا تھا۔ بہ حیثیت مجموعی گرد راہ بے حد معلومات افزاء ہے۔

## مٹی کا دیا : مرزا ادیب : لاہور : اپریل ۱۹۸۴ء

مرزا ادیب صاحب طرز افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ ستر برس زمانہ کے سرد گرم سہنے کے بعد انہوں نے اپنے روز مرہ تجربات، واقعات اور مشاہدات کو اس طرح قلم بند کیا ہے کہ "مٹی کا دیا" آپ بیتی ہونے کے باوجود تسلسل کے ساتھ بیان کی جانے والی سوانح عمری کی ذیل میں نہیں آتی۔ اسے ایسی کہانیوں کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے جو ان کے اطراف پھیلی رہیں اور وہ خود ان کے ایک کردار بنے رہے۔ اسے ماضی کو یاد کرتے ہوئے وہ ایسا تاثر چھوڑتے ہیں کہ گویا انہیں ماضی سے بے حد محبت ہے وہ صبر آزما حالات سے گزرنے کے باوجود اس سے رشتہ توڑتے ہیں اور نہ اس پر آنسو بہاتے ہیں۔ انہوں نے خود اعلان کیا ہے کہ وہ رجائی فطرت رکھتے ہیں اسی نے ہمیشہ انہیں سہارا دیا اور وہ خوشگوار اور المناک واقعات کو لفظی پیکر عطا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ کتاب ۷۲ سرخیوں میں منقسم ہے اور واضح طور پر اس کے دو حصے ہیں ابتدائی ۳۴ حصوں کا تعلق ان کی سوانح سے ہے۔ ان میں اپنے حالات بیان کرنے کے علاوہ والد، امی، خاندان، گاؤں وغیرہ کی مکمل تفصیل پیش کی ہے۔ پرائمری سے لیکر کالج تک تعلیم، ملازمتوں کی تفصیل، شاعری کا شوق، ادب سے لگاؤ، افسانہ نگاری کے مدارج ہر ایک کیفیت کو بیانیہ انداز میں نہیں بلکہ افسانوی طرز میں لکھا ہے ہر حصہ اپنی جگہ ایک مکمل اکائی ہے اور ظاہرہ طور پر کسی بھی تعلق نہ تو ما قبل کی اکائی ہے اور نہ مابعد کی اکائی سے! انہوں نے زندگی کو افسانہ بنا دیا ہے۔ شگفتہ اسلوب میں واقعات بیان کرتے ہوئے کئی باتوں پر خاص توجہ دی ہے ایک تو جزئیات



نگاری ہے، دوسرے ہر واقعہ کے حوالہ سے کیفیات کا اظہار ہے۔ یہ ایک فرد کی داستان حیات بھی ہے اور ایک عہد کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ بھی۔ مصنف نے ذات کے حوالے سے ہر طرح کی مرقع کشی کی ہے افسانہ نگاری پر کامل قدرت نے آپ بیتی میں بے پناہ دلکشی اور جاذبیت پیدا کردی ہے۔

خود نوشت کا دوسرا بڑا حصہ ۳۴ خاکوں پر مبنی ہے۔ یہ سب ادیبوں اور شاعروں کے خاکے ہیں جن میں سے چند کو انہوں نے دور سے دیکھا جیسے علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، آغا حشر کاشمیری وغیرہ اور باقی ایسے اشخاص ہیں جن سے باہم کسی نہ کسی انداز میں دیرپا ربط ضبط رہا۔ خاکہ نگاری کے لوازمات کے طور پر جس طرح خوبیوں اور خامیوں کا احاطہ کرتے ہوئے شخصیت کی مکمل صورت گری کرنی چاہئے تھی وہ کیفیت ان میں موجود نہیں ہے بلکہ اپنی یادداشتوں کے حوالے سے ان کا تذکرہ کیا ہے اور بات کو محدود واقعات سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ مصنف کی صلح جو فطرت نے عیب جوئی سے گریز کرکے ہر ایک کی خوبیوں کو واضح کرنے کے لئے واقعات بیان کئے ہیں بلکہ ان کے بارے میں اپنے خوشگوار تاثر کا اظہار بھی کیا ہے۔ ان میں سب سے جاندار خاکہ عبدالکریم الفت المعروف شورش کاشمیری کا ہے جو ان کے اس دور کو پیش کرتا ہے جبکہ وہ شہرت کی بلندیوں تک نہیں پہنچے تھے یعنی اس میں عبدالکریم الفت اپنی تمام شرارتوں، محبتوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہیں لیکن شورش کاشمیری نہیں ہیں۔ مصنف کی احتیاط پسندی نے ان خاکوں میں پوری طرح رنگ نہیں بھرا ہے قاری میں تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے۔ انہیں آپ بیتی کا حصہ سمجھ کر پڑھا جائے تو وہ مصنف کے تعلقات کے پھیلاؤ اور ان کی نوعیت کے غماز ضرور معلوم ہوتے ہیں۔

## سلسلۂ روز و شب : منظور الٰہی : ۱۹۸۴ء : کراچی

سلسلۂ روز و شب منظور الٰہی کی خود نوشت ہے لیکن جامع سوانح عمری نہیں۔ انھوں نے زندگی کے اہم واقعات کو جو ان کی یادداشت میں محفوظ رہے۔ تاریخی ترتیب میں بیان ضرور کیا ہے اس میں نہ تو تسلسل زمانی ہے اور نہ باہم ربط۔ سوانحی حالات کے بیان میں سنین کی بے حد اہمیت ہوتی ہے ان یادداشتوں میں اس کا بھی خیال نہیں رکھا گیا یادوں میں محفوظ جن واقعات کا ذکر کیا ہے ان میں جزئیات نگاری سے کام لیا ہے اور جس شخص کا ذکر آیا ہے اس کے تعارف کے ساتھ شخصی خاکہ کے طور پر اوصاف کو بھی بیان کیا ہے۔

شخصی واقعات کے ساتھ تہذیبی اور فکری روایات کو بھی موضوع بنایا ہے جن کی تاریخی

اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اپنے طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"گرمیوں کی دوپہر میں گپتا ہائی اسکول کے سامنے سے گزر رہا تھا پیاس محسوس ہوئی تو میں نے اسکول کی ٹک شاپ سے پانی مانگا تو حلوائی نے ترکی ٹوپی دیکھ کر لیمونیڈ دیتے ہوئے کہا بابو جی! کل سے آپ کا یہ گلاس ہوگا۔ اس روز احساس کے نازک آبگینے ٹوٹ گئے۔ برسوں بعد یہ بات سن کر ایک دوست نے کہا "حلوائی کی اس حرکت نے تمہارے دل میں پاکستان کا بیج بو دیا تھا" (۶۰)

زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات احساس اور فکر پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ واقعہ اسی بات کی دلیل ہے۔ مصنف جس ماحول میں گزرا وہ حسن تہذیب کا نمونہ تھا۔ خودنوشت میں ایسے واقعات اور اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے جن سے انسانی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ موجودہ دور انتشار میں ان سے بصیرت حاصل کی جا سکتی ہے اپنے اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید نیاز احمد ترمذی اور استاد سید محمد کاظم کا ذکر ان کے کردار کی بلندی کے حوالہ سے کیا ہے اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ ہندو طالب علم نے اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سید محمد کاظم سے رہنمائی چاہی انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ دہلی جائیں چار سال تکلیف میں گزاریں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کریں طالب علم نے مشورہ پر عمل کیا۔ برسوں بعد مصنف اس ہندو طالب علم سے ملنے دہلی گئے تو انہوں نے دیکھا کہ اس کے گھر میں ایک نمایاں جگہ پر استاد محترم کی تصویر آویزاں تھی معلوم ہوا کہ اس تصویر پر روز تازہ پھولوں کے ہار چڑھائے جاتے تھے۔ واقعہ بظاہر معمولی ہے لیکن اس سے استاد کی عظمت اور طالب علم کی احسان شناسی اور انسانی قدروں کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے ایسے معمولی واقعات سے مصنف نے آج کی بدلتی ہوئی قدروں میں ان کی اہمیت اجاگر کی ہے اس دور کے لوگوں کی عظمتوں کے نقش کتاب میں باربار نظر آتے ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ

"عید الفطر کے موقع پر ایک دوست نے ابا سے پوچھا عید کی مبارکباد دینے کے لئے آپ ڈپٹی صاحب کے ہاں نہیں گئے۔ ابا نے کہا شیخ صاحب مجھ سے بڑے ہیں۔ انہیں میرے ہاں آنا چاہئے تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اگلے روز سفید قمیض اور ملیشیا کی پتلون پہنے گھٹے ہوئے جسم کے ایک سرخ و سفید صاحب سائیکل کی گھنٹی بجاتے ہوئے آ رہے ہیں۔ آتے ہی جانماز مانگی۔ نماز عصر ادا کرنے کے بعد کہا ابا سے کہو نور محمد آیا ہے۔ یہ تھے ہمارے نئے ڈپٹی کمشنر خان بہادر نور محمد او۔ بی۔ ای۔ (۶۱)



تقسیم کے زمانے کے المناک واقعات سے بھی مصنف کو گزرنا پڑا تھا۔ وہ آگ اور خون کا دریا عبور کرکے پاکستان آئے یہاں سول سروس میں ملازمت اختیار کی ایوب خان اور نواب کالا باغ کو قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے سر آغا خان سے قربت رہی ان تمام یادداشتوں کے ذریعہ تمام تاریخی واقعات کا تجزیہ 'قیام پاکستان کے محرکات' پاکستانی سیاست کی بوالعجبی 'غرض اپنے دور کے تمام اہم حالات اور واقعات کو بیان کرتے ہوئے موضوعات کی کینوس کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا ہے کہ مصنف کی ذات کی اہمیت ثانوی ہو گئی ہے۔ یہ آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی بن گئی ہے اس میں مصنف کی حاشیہ آرائی ان کی فکر' نقطہ نظر اور رجحان مستزاد ہیں۔ ان کی بے قرار روح پاکستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے تڑپتی ہے اور وہ مایوسی کا اظہار کرنے کے بجائے ان باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں اصلاح کی ضرورت ہے چنانچہ لکھا ہے کہ

"آج پاکستان میں جنگ کے کئی محاذ ہیں۔ نظریہ پاکستان کی جنگ' اندرونی انتشار اور سرحدی یلغار کے خلاف جنگ' ضمیر کی آزادی کی جنگ' قلم اور قانون کی عصمت کا بچاؤ' اخلاقی اقدار کی گرتی ہوئی دیوار کا دفاع' معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں کا مداوا" (۶۲)

خودنوشت میں مصنف نے ماضی اور حال کے اچھے اور برے حالات کو' تہذیبی قدروں کی بلندی اور پستی کو ایک حساس انسان کی طرح دیکھا اور ان کے حسن اور بدصورتی پر سے پردہ اٹھایا ہے۔

ہر واقعہ اور حالت کو چابکدستی سے بیان کرتے ہوئے جزئیات پر نظر رکھی ہے لیکن طول بیان سے اجتناب کیا ہے تجربوں کے تنوع اور تحریر کے حسن و روانی سے خودنوشت میں ادبی تخلیقی شان پیدا ہو گئی ہے مصنف نے ایسے ہی واقعات کا انتخاب کیا جو قاری کی فکر و احساس کو جگا سکیں۔

## ناسخ کی خودنوشت : مرتبہ عبدالسبحان : کلکتہ : ۱۹۸۶ء

اردو ادب شاعری کے حوالہ سے عبدالغفور نساخ کا نام جانا پہچانا ہے انہیں اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کے معروف مراکز سے دور بنگال کی سرزمین میں شمع شاعری روشن کی اور نہ صرف اردو زبان کی وسعتوں کا احساس جگا دیا بلکہ شاعری میں طرح نو کی بنیاد ڈالی۔ ایک شاعری حیثیت سے ان کا مرتبہ بلند ہے تو میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام پر اعتراضات کی وجہ سے ان کی شخصیت متنازع بھی ہے۔ پھر بھی اردو شاعری کی کوئی مستند تاریخ ان کے ذکر سے خالی نہیں۔ صدر الحق نے ان کی حیات و شاعری پر تحقیقی کام کرکے

ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی نساخ کی خودنوشت کا ذکر تو بارہا آیا اس کا تعارف مغیث الحسن نے رسالہ نگار لکھنؤ کے ذریعہ ۱۹۵۹ء میں کروایا تھا اب اصل مخطوطہ کی ترتیب و تدوین کا کام ڈاکٹر عبدالسبحان نے انجام دیا ہے جو زبان اور ادبیات فارسی کے استاد ہیں اور مولانا آزاد کالج کلکتہ سے منسلک ہیں اس کی اشاعت برصغیر کے قدیم ترین ادارہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے کی ہے یہ ان کی جانب سے اولین اردو اشاعت ہے اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ اس سلسلہ کو آگے بڑھایا جائے گا۔ نہایت خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ چھپنے والی یہ کتاب نساخ کے حوالے سے ہی اہم نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے خاندان کے حالات بیان کئے ہیں بلکہ عمومی حیثیت سے اس کی افادیت غیر معمولی ہے۔

یوں بھی اردو شاعروں اور ادیبوں میں خودنوشت کی روایت عام نہیں رہی ہے اور جو تحریر ملتی ہیں وہ خود مرکزیت کا شکار ہوگئی ہیں لکھنے والے ذات کے حصار سے باہر نہیں آئے نساخ نے اپنی خودنوشت میں التزام رکھا ہے کہ جہاں اپنے حال احوال سے واقف کروایا وہاں زیادہ توجہ ماحول' اس کے حالات' خصوصیت اور روایت پر دی ہے۔ اس طرح ایک دور دراز سرزمین کی جغرافیائی' سماجی' ادبی اور تاریخی پس منظر کو سمجھنے کا موقع فراہم ہوا ہے۔

خودنوشت کے ابتدائی ۳۰۔۳۵ صفحات میں خاندانی پس منظر' اہل خاندان کا تعارف' اپنی تعلیمی اور بعض دیگر مشاغل کا ذکر کیا ہے ان میں مشاغل کے علاوہ باقی امور سرسری ہیں۔ اس لئے ایک نوع کی تشنگی باقی رہتی ہے ان کے مشاغل متنوع تھے شاعر تو وہ تھے ہی اس کے علاوہ وہ خط ناخن کی مشق' علم جفر' نجوم' رمل اور عملیات کا سیکھنا' شطرنج میں مہارت حاصل کرنا' اہل حال سے عقیدت رکھنا' اور ایسی ہی باتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس بات کا ذکر کردیا ہے کہ ان کی عدالت میں پیش ہونے والے اکثر مقدمات کا فیصلہ وہ جفر اور رمل کے ذریعہ کیا کرتے تھے۔ ان تمام واقعات کے بیان میں خودستائی کے شکار رہے ہیں۔

نساخ نے کمپنی کے تحت محرری سے ملازمت کی ابتدا کی۔ مشہور مستشرق ای۔ بی کاول کو فارسی اور اردو پڑھائی بعد میں ڈپٹی مجسٹریٹ بنے اور برطانوی حکومت کے دوران اعلیٰ عہدوں تک ترقی کی اپنے ابتدائی دور حیات کا تذکرہ کرنے کے بعد جب وہ ملازمت کا بیان شروع کرتے ہیں تو اس کا سلسلہ آخر تک جاری رہتا ہے اور خاندان پس منظر میں چلا جاتا ہے انہوں نے ہر اس جگہ کا تفصیلی حال بیان کیا ہے جہاں ان کا بہ سلسلہ ملازمت قیام رہا اس طرح راجا پور' بریسال' راجشاہی' ہوڑہ' مرشد آباد' بانکا (بھاگلپور) چھپرا (ضلع سارن' مونگیر' سلٹ مانک گنج'



ڈھاکہ بیربھوم' ہوگلی' مدنی پور کے جغرافیائی اور سماجی حالات کو پیش کرتے ہوئے وہاں کے خاص خاص لوگوں کا تعارف کرواتے جاتے ہیں ان تمام باتوں کی وجہ سے خودنوشت سوانح کی خصوصیات باقی نہیں رہتیں اور کتاب کا بڑا حصہ یادداشتوں کی ذیل میں آجاتا ہے۔

نساخ جہاں بھی ہوں ماحول کا مشاہدہ گہری نظر سے کرتے اس لئے کوئی خوبی یا عیب ان کی نظر سے بچ نہ سکی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں انسانی کرداروں کے مطالعہ کا بھی شوق تھا کتاب میں تین سو سے زائد اشخاص کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر کی سماجی حیثیت کے ساتھ ان کی نفسیات پر بھی روشنی ڈالی ہے اس طرح خودنوشت میں جگہ جگہ مختصر خاکہ مل جاتے ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور بعض صورتوں میں سبق آموز بھی۔ اجتماعی رویئے کے بارے میں ان کے قائم کردہ اپنے نظریات ہیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں وہ کس حد تک حق بجانب ہیں۔ مثلاً "ڈھاکہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ڈھاکہ میں عورت و مرد دونوں میں تماش بینی اور شراب کا بہت چرچا ہے اور بیشتر مسلمان موش ہیں اور شراب پینے میں مطلق عیب نہیں" (۶۳)

"ڈھاکہ میں طلاق بالاختیار کا بڑا رواج ہے یعنی عورتوں کے ہاتھ طلاق ہے اور اگرچہ شرعاً" جائز ہے لیکن بعض محل وقوع پر اس سے بڑے فساد اٹھتے ہیں۔ یہ رواج سلہٹ میں بھی ہے مگر کم ہے اور سلہٹ والے ڈھاکہ والوں کے معتقد ہیں۔ میں نے دہلی سے سلہٹ تک اور کہیں یہ بات دیکھی نہیں۔" (۶۴)

بریسال کے بارے میں ان کا تاثر ہے کہ

"وہاں جعل کی بڑی کثرت ہے" (۶۵)

"ایک ایک ملک کے آدمیوں کو ایک ایک طرح کا شوق ہوتا ہے بریسال کے لوگوں کو اول شوق مقدمہ بازی کا ہے" (۶۶)

نساخ نے دہلی اور لکھنؤ کا سفر بھی کیا تھا۔ ان مقامات کے لوگوں کے بارے میں رائے قائم کی

"یہاں (لکھنؤ) کے اکثر لوگ زبانی محبت بہت دکھاتے ہیں لیکن دل میں کچھ نہیں ہے" (۶۷)

"یہاں کے لوگ عموماً" اچھے ہیں دل و زبان ایک ہے" (۶۸)

خارجی حالات بیان کرنے کے رجحان کا فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے ۱۸۵۷ء کی رستخیز اور ۱۸۶۴ء کے ہلاکت خیز طوفان کا حال بھی تحریر کردیا ہے ان تحریروں کی بڑی تاریخی اہمیت ہے ان

کی عدالت میں جو مقدمات پیش ہوتے رہے ان میں سے اکثر کی کارروائی تفصیل سے بیان کی ہے ان کا مقصد اپنے فیصلے کو صائب ثابت کرنا رہا یہ بات خالصتاً "خودستائی کے جذبہ کے تحت آتی ہے۔

جس دنیا سے ان کا تعلق رہا اس کے حالات تفصیل سے بیان کرنے کے باوجود وہ ذاتی زندگی پرسے پردہ نہیں اٹھاتے اپنی گھریلو زندگی اور بیوی بچوں کے ذکر سے گریز کرتے ہیں جہاں بھی ان کا بیان ہے بالکل سرسری ہے اپنی محبوب نظر شاگرد مشتری کا ذکر ایک محفل کے ضمن میں سرسری کیا ہے اسے احتیاط کہیئے یا دانستہ روگردانی۔ بہرحال کتاب دلچسپ اور معلومات افزا ہونے کے باوجود پوری طرح خودنوشت سوانح کے ضمن میں نہیں آتی۔

خودنوشت نساخ کے اپنے قلم سے لکھی گئی ہے اس کے لکھے جانے کی اطلاع انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام ارمغان میں (۱۸۸۶ء) میں دی تھی۔ لیکن وہ اسے ممکن نہ کر سکے۔ مخطوطہ غیر مکمل حالت میں ہے اور ناقص ہے۔ کیوں کہ آخری جملہ مکمل نہیں ہوا ہے اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کچھ صفحات ضائع ہوگئے ہیں متن میں کئی مقامات پر اشعار درج کرنے تھے جو انہوں نے حوالہ دے کر جگہ چھوڑ دی۔ لائق مرتب نے اسے مکمل کیا ہے موجودہ مخطوطہ میں آخری حوالہ ان کے بڑے بھائی نواب عبداللطیف کے بھوپال میں وزیر مقرر ہونے کا ہے یہ (۱۸۸۶ء) کی بات ہے گویا مخطوطہ اس سنہ تک رہنمائی کر سکتا ہے۔ مرتب نے مخطوطہ کے کئی صفحات کا عکس بھی شامل کتاب کیا ہے جس سے نساخ کی عبارت نویسی واضح ہوتی ہے۔

اگر زبان کے اعتبار سے خودنوشت کا مطالعہ کیا جائے تو اردو دان اکثر جگہ چونک جائیں گے کیوں کہ ان کی عبارت مروجہ محاورہ اور روز مرہ کے مطابق نہیں ہے اسے مشکل ہی سے بنگال کا اپنا رنگ کہا جا سکتا ہے اس ضمن میں عبارت کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

"جی میں آیا کہ صدر دیوانی سیرا "جاؤں" (۶۹)

"اس میں شب برأت کے روز میں مولوی فدا علی صاحب سے ملنے کو گیا اور ان کے کمرے میں بیٹھا اس میں دیکھا کہ ولان میں شطرنج ہوتی ہے میں بھی وہاں گیا اس میں مولوی وحید صاحب نامی ایک شخص باشندہ بہار نے نواب امیر علی خان بہادر سے میری شطرنج کی تعریف کی" (۷۰)

"اس سے قبل ازیں ایک بار مدرسہ کے چند احباب نے ہم لوگوں کو شطرنج کھیلنے کے لئے جبر کیا" (۷۱)

"اڑیسہ کا رہنے والا ایک جاہل شخص حسن خان جنی کہہ کے مشہور تھا" (۷۲)



"اس روز کچھری جانے کے آگے میں مولوی دلیل الدین خان بہادر ڈپوٹی مجسٹریٹ و ڈپوٹی کلکٹر بریسال سے جو ان دنوں مخاطب باحترام جنگ ہیں اور صوبہ اورنگ آباد ملک دکھن میں سے ہیں ملنے کو گیا" (۷۳)

"باقی سو روپے روزانہ خرچ کے لئے بکس میں رکھ دیئے اور صندوق میں بند کرنے کے آگے مجھ کو نیند آگئی" (۷۴)

"امتحان دینے کو جانے کے آگے میرے پاس سے ہوتے جائے" (۷۵)

"اس وقت میں پھر از سر نو سے اچھی طرح تجویز کروں گا" (۷۶)

"وہ وہاں پڑے کراحتی تھی اس میں ایک ماہی گیر نے دریا سے جاتے وقت اس کو پہچانا اور اس کے گھر لا کر بھیج دیا" (۷۷)

"اگر اپنے بیٹے کو دیکھنے چاہو تو چلے آؤ" (۷۸)

نساخ نے لفظ "نہیں" ہر جگہ جملے میں بالکل آخر میں استعمال کیا ہے جیسے

"شاہ نوری صاحب نے مجھ سے آپ سے آپ کا تعارف کیا نہیں" (۷۹)

"آگے اس کے یہاں کبھی ایسا واقعہ ہوا نہیں" (۸۰)

"میں نے دہلی سے سلہٹ تک اور کہیں ایسی بات دیکھی نہیں" (۸۱)

نساخ کی طرز تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے داستان گو تھے اسی خصوصیت نے خودنوشت کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے۔

## رو میں ہے رخش عمر : عبدالسلام خورشید : لاہور : ۱۹۸۶ء

عبدالسلام خورشید نے اپنی آپ بیتی میں اپنی ذات کو اہمیت دینے کے بجائے اپنے دور حیات کے سیاسی، معاشی، معاشرتی حالات و واقعات کو زیادہ اہمیت دی ہے یہ تاریخ نہیں ہے بلکہ ذات کے حوالے سے اپنے عصر کے اہم پہلوؤں کا جائزہ ہے۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانہ میں اس طبقے کی سیاسی جدوجہد میں شرکت کی بعض ادوار میں سیاسی اور اجتماعی زندگی میں عملی حصہ لیا ان سب کے احوال جزوی تفصیلات کے ساتھ شامل کی ہیں آپ بیتی تاریخ ترتیب میں نہیں ہے بلکہ ہر باب ایک موضوع کے لئے مختص کر دیا ہے اور اس پر سیر حاصل معلومات فراہم کی ہیں اپنے بیان کو معتبر اور مستند بنانے کے لئے بعض کتابوں کے طویل اقتباسات، پمفلٹوں کا مکمل متن اور تقاریر بھی شامل کر دی ہیں ان میں سے بعض نہایت اہم گمشدہ کڑیاں ہیں مثلاً عبدالستار نیازی نے کسی زمانہ میں "خلافت پاکستان" کی تحریک شروع کی تھی اس تحریک

کے اغراض مقاصد اور اس کی جدوجہد کی مکمل تاریخ درج کردی ہے ترقی پسند تحریک اور اس سے متعلق افراد کے درمیان پیدا ہونے والے نظریاتی اختلافات پر بھی مکمل روشنی ڈالی ہے تحریک پاکستان کے بارے میں ان کی اپنی جو معلومات تھیں اور اس تحریک میں ان کا جو رول رہا اس کا حال بھی موجود ہے۔ وہ باب خصوصیت سے دلچسپ ہے جس میں انہوں نے ہالینڈ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کی تفصیل دی ہے اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ علم دوست ممالک کی جامعات تحقیق کا کام کرنے والوں کے ساتھ تعاون اور ہمت افزائی کے لئے کس طرح تمام قواعد و ضوابط کو پس پشت ڈال دیتی ہیں وہ قاعدوں پر کام اور حوصلوں کی قدر کرتے ہیں اس میں چار سفرنامے "دیار فرنگ میں" "آگ پھول اور رقص" "جب تہران نور و سرور میں غرق تھا" "سنگاپور سے ٹوکیو تک" بھی شامل ہے ظاہر ہے جہاں ان میں سے ہر ایک جداگانہ مضمون ہے وہیں مصنف کے ذاتی تجربے کا حصہ بھی ہے۔ واقعات کی تفصیلات' متذکرہ افراد کے کردار' زمانہ کی تاریخ اور ہر امر مصنف کے دوٹوک خیالات کے ساتھ سلجھے ہوئے انداز بیان سے متنوع اور کامیاب تحریری کاوش بن گئی ہے اپنے رنگ اور کینوس کے اعتبار سے یہ ایک انفرادی نوعیت کی آپ بیتی ہے۔

### میری زندگی فسانہ : صادق الخیری : کراچی : طبع دوم : ۱۹۸۶ء

علامہ راشد کی اولاد کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس نے علم و ادب' زبان اور فصاحت بیانی کی آغوش میں آنکھیں کھولیں۔ اپنے بزرگوں کے سائے اور دہلی کے ماحول پر پروان چڑھ کر وہ فخر خاندان ہی نہیں بلکہ دہلی مرحوم کی تہذیب و شائستگی کی منہ بولتی تصویر بن گئی ہے صادق الخیری علامہ کے چھوٹے صاحبزادے' پیار و محبت میں پلے لیکن اپنی ایک الگ دنیا آباد کرنے کے باوجود اپنا رشتہ ادب اور تہذیب سے باقی رکھا۔ صادق الخیری ملازم پیشہ رہے پھر بھی ان کا ذوق و شوق پروان چڑھتا رہا۔ زندگی کے اس حصے میں جب زبان پر عبور اور بیان پر قدرت حاصل ہو جائے تک گزری یادوں کی خوشگوار یادوں کو اسلوب کے سانچے میں ڈھالنا فن کاری بن جاتا ہے۔

صادق الخیری نے افسانہ نگاری بھی کی اور ناول نگاری بھی' ان فنوں کی باریکیوں سے وہ خوب واقف تھے اس لئے جب آپ بیتی لکھی تو واقعات کا عام سا تسلسل باقی نہیں رہا بلکہ اس نے ناول کی صورت اختیار کرلی۔ اس میں زندگی کے تمام تجربات کے ساتھ رنگا رنگ محسوسات اور زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جو دلنشینی کا عجیب کیف لئے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی کی سہانی



داستان میں ان کے گھرانے اور دہلی کی معاشرت کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔

یہ ایک مسلسل ور مربوط عام سی آپ بیتی نہیں ہے مصنف نے اس داستان کے روایتی انداز میں تحریر کرنے کی کوشش کی ہے یہ چار حصوں پر مشتمل ہے ہر حصہ ایک شرارہ قرار دیا گیا۔ پہلا شرارہ "قصہ گو" کے عنوان سے ہے جس میں مصنف نے اپنا' اپنے بزرگوں کا اور دیگر افراد خاندان کا تعارف کروایا ہے شرارہ دوم "میرے دل صد چاک پر" طالب علمی کے آغاز سے کالج کے مدارج طے کرنے اور اس دوران اپنی والدہ کی رحلت کے بیان پر منحصر ہے۔ شرارہ سوم ذاتی ادبی کاوشوں اور اس دور کی ادبی تاریخ کا خاکہ ہے شرارہ چہارم ملازمتوں کا حال تقسیم ہند تک کا حال ہے بظاہر یہ سب بے جوڑ کڑیاں دکھائی دیتی ہیں مصنف نے بڑی فن کاری سے انہیں باہم مربوط کیا ہے جہاں حالات زندگی' افتاد طبع' زندگی کے تجربات' حقائق کی تلخیاں اور شیرینیاں جمع کردی ہیں وہیں جس موضوع کو چھیڑا اس کی تفصیل بیان کر کے تاریخ مرتب کردی ہے موجودہ صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائیوں کی ادب و صحافت کے حوالے سے بے حد معلومات افزا باتیں لکھی ہیں اس طرح جن شخصیات کا ذکر آیا ہے ان کی مکمل تصویر یعنی لفظی خاکہ بھی مرتب کردیا ہے آپ بیتی کے حوالے سے صادق الخیری نے کئی فن آزمائے ہیں اور کسی میں تشنگی کا احساس نہیں پیدا ہونے دیا۔ ایک اہم خوبی اس میں دلی کی ٹکسالی' کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان ہے۔ جگہ جگہ دہلی کے مخصوص محاورے استعمال کر کے لطف بیان کو دوبالا کردیا ہے اس کا جس انداز سے بھی جائزہ لیں اسے مکمل ہی پائیں گے۔ بلاشبہ یہ ایک عمدہ آپ بیتی ہے۔

### شہاب نامہ : قدرت اللہ شہاب : (آپ بیتی/ جگ بیتی)
### لاہور : ۱۹۸۷ء

قدرت اللہ شہاب کا نام ایک بااثر بیوروکریٹ اور صاحب طرز افسانہ نگار کے لحاظ سے بہت مشہور رہا ہے وہ کشمیر کے ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی ذاتی صلاحیتوں اور کوششوں سے ملک کی انتظامی مشینری کے اہم عہدوں پر مامور ہوئے۔ شہاب نے اپنے آپ بیتی کی ابتدا اس وقت سے کی ہے جب وہ اکبر اسلامیہ ہائی اسکول جموں میں چوتھی جماعت کے طالب علم تھے۔ اس کو بھی تاریخی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ اپنے خاندان کے پس منظر' پیدائش کے سال' ابتدائی عمر کے واقعات سے گریز کر کے جموں میں پلیگ کے پھیلنے کے سانحہ سے یادوں کو شروع کیا ہے خاندان کے حوالہ سے ماں کا ذکر تفصیل سے آیا ہے لیکن وہ بھی اس طرح کہ "ماں جی" کے عنوان سے ان کا جو افسانہ مقبول ہوچکا تھا شامل کرلیا ہے نجی واقعات سے

ممکنہ حد تک گریز کر کے دیگر نوعیت کے تجربات کو قلمبند کرنے کی دانستہ کوشش کا احساس ملتا ہے۔ طالب علمی کے زمانہ کے چند واقعات کے سوا زیادہ واقعات ان کی ملازمت کے تجربات پر منحصر ہیں اور اس لئے پیش کئے گئے ہیں کہ ان کے خلاف پروپگنڈے کے مہم کی جو گرد اڑی تھی اسے مٹا کر اپنی شخصیت کو صاف ستھرا بنا کر پیش کر سکیں ایک وقت وہ بھی تھا کہ ابوالاثر حفیظ جالندھری نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ

جب کہیں انقلاب ہوتا ہے　　　قدرت اللہ شہاب ہوتا ہے

یا سید محمد جعفری نے اظہار خیال کیا تھا

یہ سوال و جواب کیا کہنا　　　صدر عالی جناب کیا کہنا
کیا سکھایا ہے پڑھایا ہے　　　قدرت اللہ شہاب کیا کہنا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بارے میں جو باتیں مشہور تھیں وہ ان کے اثرات زائل کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد سے شہاب نامہ مرتب کیا چنانچہ تمہید کے طور پر جو مضمون شامل ہے اس کا عنوان بھی "اقبال جرم" رکھا اور ابن انشاء کو S.H.O قرار دے کر F.I.R درج کروائی جس میں اپنی برات کے ساتھ کردار کی بلندی اور مضبوطی کا اظہار کیا ہے حاصل کلام یہ ہے جتنی باتیں ان سے منسوب رہیں ان کی ذمہ داری انہوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔ چاہے یہ گورنر جنرل غلام محمد کے دور کی ہوں یا صدر ایوب خان کے عہد کی۔ یہاں تک اپنے نیک اعمال اور کردار کی وجہ سے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد یحیٰی خان سے ٹکر لینے کا حال بھی بیان کردیا ہے ان میں سچائی کیا ہے وقت ثابت کرے گا ابھی لوگ باقی ہیں جو ان کے بیانات کی تائید یا تردید کرسکتے ہیں۔

ان تمام واقعات میں یقیناً وہ واقعہ حیران کن اور قابل تحسین ہے جس کے ذریعہ ان کے اسرائیل جانے' وہاں پڑھائی جانے والی کتابوں کو حاصل کر کے دنیا کے سامنے پیش کرنے کا حال بیان ہوا ہے۔

کتاب کا ایک حصہ 'فوق الفطرت واقعات پر منحصر ہے ایک ویران مکان میں قیام جہاں ان کے ارادہ کرتے ہی بجلی کا سوئچ آف ہو جانا' سگریٹ سلگانا چاہتے اور سگریٹ کا دور جا گرنا' پتھروں کی بارش ہوتی' ڈرنگ روم کے دروازہ پر شائستہ اور معطر دستک ہوتی' سہگل کے گائے ہوئے ریکارڈ میں سے خوفناک آوازیں بلند ہوتیں اور اس سب کے باوجود مصنف کا پریشان ہو کر ویران مکان کو نہ چھوڑنا اور مہینوں اس کرب کو جھیلنا عام حالات میں قابل یقین نہیں۔ اس



طرح آخری حصہ میں ان دیکھی ہستی سے پراسرار ذریعہ سے خط و کتابت جن کا نام انہوں نے Young Man Ninety قرار دیا ہے ایسی طلسماتی فضا پیدا کر کے بیان کی گئی ہے کہ قاری یقینی و بے یقینی کے درمیان ششدر رہ جاتا ہے شہاب چونکہ صاحب طرز ادیب اور اچھے افسانہ نگار بھی تھے اس لئے عام واقعات ہوں یا محیرالعقول حالات' اس انداز میں بیان کر جاتے ہیں کہ ان کی حقیقت کے بارے میں شبہ ہونے کے باوجود دل ان پر یقین کرنے کو چاہتا ہے اسلوب نگارش نے شہاب نامہ کو محض آپ بیتی باقی نہیں رہنے دیا واقعات کے افسانوی رنگ میں یہ اسلوب تخلیقی کارنامہ بن گیا ہے۔

کتاب عمر کے آخری دور میں لکھی گئی۔ ایسی وقت خدا ہر ایک کو یاد آتا ہے شہاب کا مزاج یوں بھی مذہب اور تصوف کی طرف مائل تھا اس لئے ایک حصہ کو ان خیالات کے لئے بھی وقف رکھا ہے جہاں طریقت سلوک کے حوالے سے بعض اہم باتوں کے بعد دعاؤں کی ایک طویل فہرست بھی درج کردی ہے۔ اس حصہ کا تعلق آپ بیتی سے تو نہیں ہے لیکن پڑھنے والا اس کے ذریعہ مصنف کی سیرت میں جھانکنے میں ضرور کامیاب ہوتا ہے۔

شہاب نامے میں مصنف نے جہاں بھی پریذیڈنٹ ہاؤس اور رائٹرز گلڈ کا تذکرہ کیا ہے اس حصے پر معروف کالم نگار اور شاعر محترم جمیل الدین عالی سخت معترض ہیں اور (راقم الحروف سے) ان کا یہ کہنا ہے کہ شہاب صاحب نے شہاب نامے میں اکثر ایسے موقعوں پر غلط بیانی کی ہے جہاں صدر ہاؤس یا گلڈ کے بارے میں بات کی ہے۔ اور میں جلد بہت سی غلطیوں کی نشاندہی کروں گا (یہ نشاندہی تا حال نہیں ہوئی ہے اور راقم الحروف نے اپنی تجزیاتی رائے کا اظہار کردیا ہے۔)

## حیات مستعار : جلیل قدوائی : کراچی : ۱۹۸۷ء

جلیل قدوائی اردو کے بزرگ ادیبوں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں ان کی ادبی زندگی تین چوتھائی صدی کی طویل مدت پر محیط ہے۔

ان کا پہلا مضمون ۱۹۱۹ء میں اس زمانے کے مشہور رسالہ "صوفی" میں شائع ہوا۔ انہوں نے ادب کے بدلتے ہوئے تیوروں' زمانہ کی نیرنگیوں' قدیم اور جدید تہذیبوں کی جولانیوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ چونکہ فطرت نے زبردست قوت یادداشت ودیعت کی ہے اس سے عمر کے اس حصے میں جہاں لوگ نسیان کے مریض ہو جاتے ہیں انہوں نے پورے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے اپنی آپ بیتی "حیات مستعار" تحریر کی اس میں پیدائش کے وقت (۱۹۰۳ء) سے ۱۹۲۴ء تک

حالات انتہائی تفصیل سے درج کئے ہیں جس میں ان کی بچپن کی شرارتوں' گھر کے ماحول' بھائیوں کے سلوک کے علاوہ ان کی تعلیمی حالت کا ذکر موجود ہے اپنے احول کے علاوہ انہوں نے اس دور کے ادیبوں' شاعروں اور ادبی رسائل کا بھی تفصیلی احوال درج کیا ہے حیات مستعار کی اہم خصوصت یہ ہے کہ آپ بیتی ہونے کے ساتھ جگ بیتی بھی ہے اس میں اس زمانہ کی معاشرت' شہروں کا حال اور اشخاص کے کردار کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کیا گیا ہے رسوم و رواج' مذہبی و ثقافتی پہلوؤں کی عمدہ تصویر کشی کی ہے گویا کتاب کیا ہے موجودہ صدی کے ربع اول کے اودھ کا بھرپور مرقع ہے۔

## یاد عہد رفتہ : ڈاکٹر عبادت بریلوی : لاہور : ۱۹۸۸ء

"یاد عہد رفتہ" سولہ ابواب پر مشتمل ضخیم آپ بیتی دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی' مصنف نے صرف اپنے حالات زندگی لکھنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس کے کینوس کو اتنا وسیع کردیا ہے کہ کتاب ان کے عہد کی سماجی' معاشرتی' سیاسی' ادبی' ذہنی تاریخ بن گئی ہے چنانچہ لکھنے سے قبل انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ

"میں اپنے بارے میں کم اپنے زمانے اور ماحول کے بارے میں زیادہ لکھوں گا تاکہ جو کچھ میں نے گزشتہ نصف صدی میں دیکھا ہے جو حالات مجھے نظر آئے ہیں جو واقعات میری آنکھوں کے سامنے سے گزرے ہیں جن بزرگوں اور دوستوں سے میں نے اثر قبول کیا ہے ان سب کی ان گنت تصویروں کا ایک مرقع تیار ہو جائے"۔(۸۲)

مصنف اپنے ارادے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ مصنف نے اپنی زندگی کے تمام ادوار کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے تاریخی اور سماجی حالات کے بارے میں مصنف کے تاثرات مکمل طور پر عیاں ہوگئے ہیں۔ جہاں جس کا ذکر کیا ہے معلوم حقیقتوں کے کسی عنصر کو فراموش نہیں کیا۔ ابتدا میں خاندان کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اپنی ددھیال اور ننھیال کے تمام بزرگوں کے اوصاف' عادات' مشاغل کی جامع تصویر کشی کی ہے ان کے زمانے کے دیہاتی ماحول اس کی بلندیوں اور پستیوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کے سامنے ماحول کی مکمل تصویر کشی ہو جاتی ہے۔ اپنی تعلیمی مصروفیات' مختلف ملازمتوں کے حصول کی کوشش ان میں ناکامی' ان ناکامیوں کی وجہ بیان کرتے ہوئے اس ذہنیت کی مذمت کی ہے جہاں ضرورت مند کی اعلیٰ قابلیت کم تر درجہ کی ملازمت میں مانع ہوگئی تھی عربک اسکول کی ملازمت کا احوال اسی طرح تحریر کیا ہے ان چند سالوں کی تاریخ مرتب کردی ہے جب وہ اس سے منسلک رہے۔ ۱۹۴۷ء کے دہلی کے



فسادات کے دوران مسلمانوں کی تباہی و بربادی' ہمایوں کے مقبرے میں پناہ گزینی ایسے واقعات ہیں جن پر بار بار لکھا گیا ہے مصنف نے بھی تاریخ کے اس سیاہ ترین دور میں وحشت' خوف و خطر کے عالم میں کچھ دن گزارے جو تفصیلات انہوں نے فراہم کی ہیں وہ حقیقت پر مبنی اور دل دہلا دینے والی ہیں ایک ادیب کے قلم نے تاثر کی ایسی فضا پیدا کی ہے جس سے کوئی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پاکستان میں آمد' اورینٹل کالج کی ملازمت پھر لندن روانگی وہاں انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اینڈ افریقین اسٹڈیز سے منسلک رہنے کے دوران کے واقعات جامعیت کے مظہر ہیں۔ زندگی کے تجربات کے دوران ان کا سابقہ سیکڑوں اچھے اور برے افراد سے ہوا۔ ان کی واضح تصویر بغیر کسی جانبداری یا تعصب کے پیش کی ہے۔

فرد کی زندگی کے پس منظر میں مکمل ماحول کی ادیبانہ موثر انداز میں پیش کش کے لحاظ سے یہ منفرد اور قابل تحسین کوشش ہے۔ سوانح عمریاں اس طرح نہیں لکھنا چاہئے کہ صرف فرد کے حالات بیان ہوں کیونکہ فرد ایک خاندان اور معاشرہ کا حصہ ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت ان کی اثرات کو قبول کرتی ہے اور ان پر اثر انداز بھی ہوتی ہے اس لئے جب تک یہ پس منظر جامع نہ ہو تصویر واضح نہیں ہو سکتی۔ مصنف نے اس تکنیک کو کامیابی سے برتا ہے وہ جزئیات نگاری برائے جزئیات نگاری نہیں کرتے بلکہ ان جزئیات کا اپنی ذات سے رشتہ باقی رکھتے ہیں۔ یہی اس کی نمایاں خوبی ہے۔ سوانح نگاری کی مذکورہ تکنیک کے اعتبار سے اس سے زیادہ کامیاب سوانح عمری اردو میں کوئی دوسری نہیں ملے گی۔

## میری زندگی کے ۷۵ سال : اعجاز الحق قدوسی : کراچی : ۱۹۸۸ء

اعجاز الحق قدوسی علم و ادب کے خاموش کارکن تھے۔ انہوں نے سہارن پور کے ایک چھوٹے سے قصبہ انبہٹہ میں آنکھیں کھولیں۔ انہوں نے حفظ قرآن اور فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کر کے جہد حیات میں آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ اس سعی و کاوش کی داستان ان کی کتاب "میری زندگی کے ۷۵ سال" ہے۔ برصغیر کے معاشرہ میں غریب اور نچلے طبقے کے افراد کو زندگی کے جن نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے اس کا عکس اس آپ بیتی میں موجود ہے۔ یہ ایک شخص کی نہیں ایک طبقہ کی کہانی ہے۔ حصول علم کے لئے بھی انہیں شہر شہر کی خاک چھاننی پڑی۔ انبہٹہ مدرسہ مجددیہ سرہند' مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور' مدرسہ دینیات حیدر آباد دکن میں انہوں نے تحصیل علم کی پیاس بجھائی۔ کسب معاش کے سلسلے میں بھی انہیں گھاٹیوں سے گزرنا پڑا۔ نابھ میں پندرہ روپیہ ماہانہ کی ملازمت سے ابتدا کی۔ علمی و ادبی کاموں میں بار بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ معاشی

جدوجہد کا سلسلہ ریاست حیدر آباد سے کراچی تک جاری رہا۔

مصنف نے آپ بیتی بیان کرنے میں سنجیدگی اور حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔ اپنی مفلسی، بدحالی اور دردر کی ٹھوکروں کا ذکر احوال واقعی کے طور پر کیا ہے۔ اس میں نہ تو کسمپرسی کو شان امتیازی کے طور پر پیش کیا اور نہ اسے وجہ انفعال بتایا ہے۔ سنجیدی اور حقیقت نگاری سے ہی مصنف کی شخصیت کا وقار قائم ہوا ہے۔ ان کے تعلقات معاصر علماء، ادباء اور شعراء سے بھی رہے۔ جن کی تعداد ایک صد سے زائد ہے۔ ہر ایک کا الگ الگ تعارف بھی کروایا ہے۔ ان سے مراسم کی نوعیت بھی بتائی ہے اور دلچسپ اہم واقعات بیان کئے ہیں۔ اس تفصیل سے مصنف کی دلچسپیوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے اور ان شخصیات کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان شخصیات سے متعلق یادداشتیں ان کی سوانح و سیرت کے ضمن میں مددگار ہو سکتی ہیں۔ موجودہ دور کے نوجوان جو بے مقصد زندگی گزارتے ہیں ان کی رہنمائی کے لئے یہ اور ایسی ہی جدوجہد سے معمور آپ بیتیاں سود مند ثابت ہو سکتی ہیں۔

## میرے ساتھی، میرے غازی، میرے شہید : نصرت جہاں سلیم
## اسلام آباد : ۱۹۹۰ء

اردو میں خواتین کے قلم سے نکلی ہوئی آپ بیتیاں برائے نام ہیں۔ جو ہیں وہ بھی کسی ادیبہ کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔؟ اس لئے ان میں فن کی خوبیوں کی موجودگی اور طرز بیان کی دلکشی دکھائی دیتی ہے۔ نصرت جہاں سلیم ایسی خاتون ہیں جن کا ادب سے کوئی تعلق نہ رہا۔ وہ فوج میں طب کے پیشے سے منسلک رہی ہیں۔ وہ پہلی خاتون ہیں جنہیں ان کی خدمات پر پہلا تمغۂ قائد اعظم اور پھر تمغۂ امتیاز (ملٹری) دیا گیا اور وہ انتھک محنت، لگن اور احساس ذمہ داری سے ترقی کرتی ہوئی بریگیڈیئر کے عہدے تک پہنچیں۔ "میرے ساتھی، میرے غازی، میرے شہید" ان کے طویل تجربات کا فنکارانہ اظہار ہے۔

یہ ایک مشرقی خاتون کی چونکا دینے والی کہانی ہے جس نے والدین کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد عزم و حوصلہ کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا۔ میدان عمل میں قدم رکھا۔ استقامت سے فرائض انجام دیئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھی انسانی زندگیوں کے تحفظ کے محاذ پر ڈٹی رہیں۔ خودنوشت مصنفہ کی ذات کے بارے میں بھی ہے اور ان کی ذات کے حوالے سے بھی۔ انہوں نے دو بڑی جنگیں دیکھیں جو قوم اور ملک کی بقا کے لئے لڑی گئی تھیں۔ ان میں مصنفہ کو اپنے فوجی بھائیوں کے کارناموں سے روشناس ہونے کا موقع ملا جن میں شہید بھی تھے



اور غازی بھی۔ کتاب میں جنگوں کے دل ہلا دینے والے واقعات ہیں۔ جو قاری کے دل میں خوف یا دہشت نہیں پیدا کرتے بلکہ فوجیوں کی عزائم کی روشنی میں وہ ہمت اور جاں فروشانہ عزم کی روداد یں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ سب واقعات اپنے پیشے کے حوالے سے بیان کئے ہیں۔ جس سے اس پیشہ کی عظمت اور اہمیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ بقول جنرل خالد محمود عارف

"میرے ساتھی، میرے شہید، بریگیڈیئر نصرت سلیم کی اپنی کتھا کہانی کا نام ہے۔ اس داستان میں مسرتوں کی ناپائداری، حسرتوں کی دل آزاری، مصائب کی نابکار گردوں کی عیاری اور انسان کی ناداری کے ایک آبشار کی روداد ہے۔ جن میں آنسوؤں اور کرب و خوشی کے نغمات کی آمیزش ہے۔ مجموعی طور پر اس میں اندوہ کا رنگ غالب ہے۔ مصنف نے جذبات، احساسات اور مشاہدات کو آسان پیرائے میں بیان کرکے ادب، زندگی اور تاریخ کی قابل قدر خدمت کی ہے" (۸۳)

"میرے ساتھی، میرے غازی، میرے شہید" ایک آئینہ ہے جس میں مصنفہ کے عکس کے ساتھ سیکڑوں بہادر انسانوں کے خوبصورت چہرے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک فرد کی آپ بیتی ہے اور دو جنگوں کی تاریخ۔ دونوں پہلو مہارت اور چابکدستی سے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ مصنفہ نے اپنی ذہانت سے چھوٹے چھوٹے واقعات اور نکات کو بھی اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کی اہمیت واضح ہو گئی ہے۔ یہ سب عام آدمیوں کو جینے کا سلیقہ سیکھنے کے لئے مد ہو سکتے ہیں۔"

کتاب فرد کی انفرادی زندگی سے شروع ہو کر قوم کی شجاعت کو اپنے جلو میں لئے بہتر مستقبل کی آرزو پر ختم ہوئی ہے۔

مصنفہ کا رجحان تعمیری ہے وہ اپنے انفرادی تجربات اور آزمائش کے لمحوں میں قوم اور افواج کے عزم کو آشکار کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

## رسیدی ٹکٹ : امرتا پریتم۔ (آپ بیتی) : لاہور : س ن (آزادی کے بعد)

رسیدی ٹکٹ امرتا پریتم کی خودنوشت ہے اور اپنے انداز کے لحاظ سے منفرد ہے۔ یہ واقعاتی سوانح نہیں بلکہ تاثراتی سوانح ہے۔ امرتا ایک شاعرہ بھی ہے اور افسانہ نگار بھی۔ وہ بنیادی طور پر اپنے آپ کو ایک فنکار تصور کرتی ہے اور اسی لئے اپنے آپ کو کئی حصوں میں منقسم تصور کرتی ہیں۔ ان کی ایک ذات عورت ہے اور ایک فنکار، ان کے درمیان مفاہمانہ رشتہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہوتے۔ رسیدی ٹکٹ میں غالب عنصر فنکار امرتا کی روداد کا ہے۔ عورت کی جھلک کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ امرتا نے دنیا دیکھی ہے۔ زندگی کے نشیب

وفراز سے گزری ہے۔ ہر تجربہ کے ساتھ ایک اثر لئے بھرپور انداز میں کام کیا ہے اور اسے بے کم وکاست درج کردیا ہے۔ چاہے وہ والدین کا رویہ ہو۔ مذہب کا تصور ہو۔ مردوں کا عاشقانہ رویہ ہو۔ خود اس کی اپنی ساحر سے محبت ہو۔ ملکی سیاست ہو۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات ہوں ہر ایک نے احساس کے تاروں کو چھیڑا ہے۔ دل نے انہیں ایک عام عورت نہیں بلکہ مضبوط اعصاب اور مضبوط دل ودماغ کی عورت اور فنکارہ کے لحاظ سے اثر قبول کیا اور ان پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ اس میں نمایاں بات یہ ہے کہ نہ تو اپنے احساس پر فخر کا اظہار ہے کہ نہ جذبوں کے اندر دفن ہوجانے کی کیفیت ہے۔ اسلوب، مواد اور اظہار کے زاویوں کے اعتبار سے رسیدی ٹکٹ کو اپنی نوعیت کی واحد کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔ امرتا پریتم گورمکھی کی لکھنے والی ہیں۔ ان کی تحریر پر اس کے نمایاں اثرات ہیں۔ الفاظ کے استعمال میں احتیاط نہیں برتی گئی اور بلا امتیاز گورمکھی، پنجابی، ہندی کے ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اردو داں طبقے کے لئے اجنبی ہیں۔ مثلاً "سادھی، بھنگ کرنا، شراب، سپ رشی، سینٹرے وغیرہ یہی حال جملوں کا ہے جیسے

"تم خدا کا نام تو لو، شاید اس کے دل میں مر پڑ جائے، وہ بچوں کا کہنا نہیں موڑتا۔" (۸۴)

"آخری جملات بھی چھنک جائیں تو قلعہ میں کوئی ورنہ فاصلہ رہ جاتا ہے۔" (۸۵)

"پاس آکر بھی ایک فاصلہ پر کھڑا میں بھی پیچھے سے اس کی جانب دیکھ چھوڑتی، وہ مسکرا کر میری طرف دیکھ چھوڑتا۔" (۸۶)

"بعد میں اس کا بڑا توڑا مروڑا ذکر بھی پڑھا۔" (۸۷)

رسیدی ٹکٹ الفاظ اور عبادت کی چند کوتاہیوں کے سوا مجموعی طور پر ایک تخلیقی کارنامہ ہے۔



# باب پنجم (ب)

## آپ بیتی (بیانیہ) دوسروں کے قلم سے

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

## آزاد کی کہانی، آزاد کی زبانی : بہ روایت عبدالرزاق ملیح آبادی : دہلی : اپریل ۱۹۵۸ء

یہ عجیب اتفاق ہے۔ کہ مولانا ابوالکلام آزاد ایک سیاسی رہنماء، صاحب طرز انشاء پرداز، مشہور صحافی، ایک فرقہ کے اہم رہنما ہونے کی بناء پر بے انتہا شہرت کے مالک رہے لیکن ان کی زندگی میں ان کی مبسوط سوانح حیات نہیں لکھی گئی انہوں نے "تذکرہ" کے نام سے جو کتاب دوران نظربندی تحریر کی اس کا مقصد خاندان کے اکابرین اور خود اپنے حالات بیان کرنا تھا۔ وہ بزرگوں کے کوائف لکھنے میں تو کسی حد تک کامیاب رہے۔ لیکن وفور خیالات میں اسے خاندان کا تذکرہ نہیں رہنے دیا بلکہ تاریخ عزیمت کا شاہکار بنا دیا۔ اس کی شان نزول یہ ہے کہ ۱۹۲۱ء میں مولانا جن دیگر سیاسی قیدیوں کے ساتھ جیل میں بند تھے۔ ان میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی بھی شامل تھے۔ وہیں ان کا باہم تعارف ہوا۔ مولانا ملیح آبادی مصر رہے کہ وہ "تذکرہ" کی دوسری جلد مکمل کریں۔ جس میں ان کے اپنے حالات و کوائف ہوں۔ وہ ٹالتے رہے آخر یہ طے ہوا کہ وہ ضروری باتیں بیان کرتے جائیں گے۔ مولانا ملیح آبادی ضروری حصے نوٹ کرتے جائیں۔ نہ بیان میں ربط ہوتا اور نہ نوٹس مکمل ہوتے ۳۷ سال بعد انہیں مرتب کر کے شائع کیا گیا۔ طویل عرصہ کی وجہ سے بیشتر یادداشتیں ذہن سے محو ہو گئیں۔ تحریری نوٹس رہنمائی سے قاصر رہے۔ مولانا انتقال فرما چکے تھے۔ ان سے ابہام و اشکال رفع کرنے کی صورت باقی نہ تھی۔ اس طرح جو سوانحی حالات پیدائش سے ۱۹۲۱ء تک کے فراہم ہو سکے تھے اس کتاب میں موجود ہیں۔ اس کا بڑا حصہ صداقت پر مبنی ہے کہیں کہیں مؤلف کی یادداشت نے سہو کی ہے ان کی دیگر شواہد کی روشنی میں اصلاح کی جا سکتی ہے۔ بیان کا انداز واحد متکلم کا ہے۔ گویا ساری روداد مولانا کے الفاظ میں قلمبند کی گئی ہے۔ یہ "آپ بیتی" ہے جسے صاحب سوانح نے خود نہیں لکھا اور وہ ان کی زندگی میں بھی شائع نہیں ہوئی۔

کتاب کے پہلے حصے کو مولانا آزاد کے بزرگوں کے حالات کے لئے وقف رکھا گیا ہے۔ بیان کا آغاز عہد اکبر کے بزرگ شیخ جمال الدین سے کیا ہے۔ جن کا شمار اپنے وقت کے مشاہیر علماء اور اصحاب سلوک و طریقت میں تھا۔ انہوں اکبر اعظم کی دین سے روگردانی پر دیگر علماء کی طرح اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے بیٹے شیخ محمد عہد جہانگیر میں گزرے ہیں۔ جن کا تزک جہانگیری میں دو جگہ احترام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس خاندان کے بزرگوں میں قاضی

سراج الدین' مولانا منور الدین' شیخ محمد ہادی' مولانا خیرالدین۔ سب صاحبان علم وصاحبان قلم تھے۔ ان کی زندگیاں اسلام کی خدمت گزاری کے لئے وقف رہیں انہوں نے ہمیشہ سلسلہ رشد وہدایت جاری رکھا۔ اس ماحول میں آنکھ کھولنے والے محی الدین ابوالکلام آزاد انہیں کے رنگ میں زندگی گزارتے رہے۔

ان کی پیدائش مکہ میں ہوئی۔ رسم تسمیہ خوانی کے چند برس بعد ان کے والد کلکتہ چلے آئے۔ جہاں مولانا نے کم عمری میں تکمیل تعلیم کی۔ والد نے اپنے انداز زندگی سے تربیت کی۔ والد پابندی اوقات کے سختی سے پابند تھے۔ ان کی نشست وبرخواست' اکل وشراب' ملاقات وصحبت تحریر وتقریر ہر ایک کے اوقات مقرر تھے۔ صبح خیزی ان کی عادت تھی۔ نماز صبح گاہی کے وہ پابند تھے۔ رات کو تہجد ضرور ادا کرتے' دوپہر میں قیلولہ کے عادی تھے۔ حسن سلوک ان کا خاصہ تھا۔ مریدوں میں چھوٹے بڑے کا لحاظ امارات کی بناء پر نہیں کرتے تھے۔ کسی کی تعظیم محض اس لئے نہیں کی کہ وہ رئیس ہے۔ حق گوئی ان کا شیوہ تھا۔ تقریر موثر کرتے تھے۔ غرور نام کو نہ تھا۔ دریا دلی اور نفاست پسندی فطرت کے حصے تھے۔ یہ تمام خصوصیات مولانا آزاد کو وراثت اور تربیت میں ملی تھیں۔ انہوں نے والد کے روش سے ایک معاملہ میں اختلاف کیا۔ وہ تھا سلسلہ پیری مریدی کا' والد نے اپنے بڑے بیٹے غلام یاسین آہ کی نوجوانی میں وفات کے بعد چاہا کہ مولانا آزاد ان کی جگہ سنبھالیں وہ کسی قیمت پر راضی نہ ہوئے۔ حد یہ ہے کہ بیعت لینے کا سلسلہ بھی ختم کردیا۔ مولانا آزاد کی فطرت آزاد تھی۔ وہ کسی کے پابند ہو کر زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔ پڑھنے لکھنے کا انہیں بے حد شوق تھا۔ غیر معمولی حافظہ پایا تھا۔ برسوں قبل پڑھی ہوئی بات انہیں اس طرح یاد رہتی جیسے کل ہی پڑھی ہو۔ گیارہ' بارہ سال کی عمر میں شاعری اور مضمون نگاری شروع کی۔ اسی شوق کی بناء پر اخبار نویسی کا خیال آیا۔ سب سے پہلے گلدستہ "نیرنگ عالم" نکالا۔ یہ اب ناپید ہے اور ابھی تک تحقیق نہ ہو سکی کہ کب نکلا اور کتنے شمارے شائع ہوئے۔ مولانا ملیح آبادی نے اس کا ذکر صفحہ ۳۴۳ پر کیا ہے۔ انہوں نے براہ راست مولانا آزاد سے اس کی اشاعت کی اطلاع پائی پھر بھی زمانہ اشاعت کے بارے میں استفسار کرکے اس خلا کو پورا نہیں کیا ان کے گھر میں بولی جانے والی زبان عربی تھی اردو میں استعداد اپنی محنت اور بہن آبرو بیگم کی رہنمائی سے حاصل کی۔ چنانچہ شاعری ہو یا مضمون نگاری کم عمری میں ان کی شہرت ہو چکی تھی۔ کلکتہ کے مختلف اخبارات میں کام کرنے کے علاوہ لسان صدق جاری کیا۔ امرتسر کے اخبار "وکیل" سے منسلک رہے اور بالآخر الہلال جاری کرکے صحافت کی دنیا میں نقش دوام چھوڑے۔



سیاست میں دلچسپی دوسری دہائی کے ابتدائی سالوں میں پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کی سیاسی بیداری لئے اپنا سارا زور بیان صرف کردیا۔ عدم تعاون کی تحریک کے سلسلہ میں کانگریس سے وابستہ ہوئے اور وفاداری بشرط استواری کا ثبوت دیا۔

مولانا ملیح آبادی نے اس کتاب میں نہایت قیمتی معلومات فراہم کی ہیں۔ انہوں نے مولانا آزاد کے علاوہ ان کے والد مولانا خیرالدین' ان کے بھائی غلام یاسین آہ' بہنوں آرزو بیگم اور آبرو بیگم کا تعارف بھی کروایا ہے خصوصاً" مولانا خیرالدین کے حالات تفصیل سے تحریر کئے ہیں جو سو سے زاید صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ غلام یاسین آہ کی علمی وادبی خدمات کا بھی بھرپور جائزہ لیا ہے۔ مولانا ملیح آبادی نے صفحات ۲۷۶' ۲۷۷ پر انکشاف کیا ہے کہ مولانا آزاد نے مضمون نگاری کے ابتدائی دور میں انگریزی سے ایک رسالہ کا ترجمہ کیا تھا جو نظام شمسی سے متعلق تھا اس ادق کام کی تکمیل کے باوجود اسے شائع نہیں کروایا جاسکا کیونکہ اس کی تفہیم کے لئے جن خاکوں اور نقشوں کی ضرورت تھی اردو رسائل میں ان کی طباعت کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا اس لئے نصف کے قریب ترجمہ ہوا تھا کہ طبیعت اچاٹ ہو گئی شفقت رضوی نے اس بارے میں لکھا ہے کہ

"اس معاملہ میں مولانا ملیح آبادی سے سہو ہوا ہے کیونکہ جس مضمون کا ذکر کیا گیا ہے اس موضوع پر غلام یسین آہ کا یک جامع مضمون مع خاکوں اور شکلوں کے خدنگ نظر لکھنؤ کی چار اشاعتوں میں (اواخر ۱۹۰۲ تا اوائل ۱۹۰۳ء) قسط وار چھپا تھا۔" (۸۸)

"کتاب میں مولانا آزاد کی ابتدائی تحریروں کا جامع ذکر ہے۔ جن میں سے اب اکثر ناپید ہیں۔ نہایت قیمتی معلومات کے باوجود اس کتاب کی بڑی خامی یہ ہے کہ سنین کی اہمیت کو اکثر جگہ نظر انداز کردیا گیا ہے۔ اول تو سنہ لکھے ہی نہیں اور لکھے بھی ہیں تو "شاید" کے اضافے نے انہیں سند کے درجے سے گرا دیا ہے۔ مولانا ملیح آبادی صاحب طرز ادیب ہیں۔ اسلامی تاریخ پر ان کی گہری نظر رہی ہے۔ اس کتاب کو علمی شان کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ کہیں کہیں حسن عقیدت کی کرشمہ سازی کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ زبان صاف' شگفتہ اور رواں ہے۔ بیان میں تازگی اور جاذبیت ہے۔

ہماری آزادی : روایت ابوالکلام آزاد : تحریر ہمایوں کبیر : ترجمہ محمد مجیب : ہندوستان : فروری ۱۹۶۱ء

"آزاد کی کہانی' آزاد کی زبانی" کی طرح "ہماری آزادی" بھی آپ بیتی کے ضمن میں آتی

ہے۔ حالانکہ صاحب سوانح نے تحریر نہیں کیا اور نہ ان کی زندگی میں شائع ہوئی۔ "ہماری آزادی" کی مزید برآں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مولانا آزاد نے مطالب اردو میں بیان کئے۔ ہمایوں کبیر نے انہیں انگریزی میں ادا کیا اور مولانا کے انتقال کے بعد شائع کیا۔ پروفیسر محمد مجیب نے اس کا ترجمہ کیا۔ ترجمہ کی ہوئی سوانح عمریاں' آپ بیتیاں ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہیں۔ لیکن چند ایک اہم کتابوں کو نظر نہیں کیا جا سکتا کہ ان تراجم کے قارئین کی تعداد بہت زیادہ رہی ہے اور عام طور پر جو حوالے دیئے جاتے ہیں وہ تراجم سے ہی ہوتے ہیں۔

ہمایوں کبیر کی توضیحات کے مطابق ان کے اصرار پر مولانا آزاد آپ بیتی کا ایک منصوبہ تیار کر چکے تھے۔ اس کے مطابق پہلی جلد میں ابتدا سے ۱۹۳۵ء تک دوسری جلد میں ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء اور تیسری میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کے حالات ہوتے۔ معمولی خصوصیت حاصل رہی پہلی اور تیسری جلد کے بارے میں مولانا کے انتقال کی وجہ سے کوئی کام نہیں ہوا صرف دوسری جلد مرتب ہو سکی اس کتاب کو غیر معمولی حیثیت حاصل رہی یہ بہت زیادہ پڑھی گئی۔ اس پر موافقانہ اور مخالفانہ مباحث بہت زیادہ ہوئے۔ اس کی تائید اور اس کی رد میں کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ایک بڑا گروہ ایسا بھی سامنے آیا ہے جس نے مدلل انداز میں اصرار کیا کہ یہ مولانا کی بیان کردہ حکایت ہی نہیں ہے چونکہ اس کے مطالب اور ہمایوں کبیر کی دوسری کتاب "Muslim Politics and Other Eassays" میں بڑی یکسانیت ہے اس لئے یا تو انڈیا ونز فریڈم' اس کتاب کا دوسرا نقش ہے یا وہ کتاب اس کا چربہ ہے۔

اس کتاب میں ہندوستان کی تاریخ ۱۹۳۵ء سے آزادی کے بعد تک محفوظ کر دی گئی ہے۔ باوجود اس کے کہ بعض بیان کردہ واقعات کی صحت و صداقت کو چیلنج کیا گیا ہے کیونکہ مولانا کے معاصرین نے جو کتب تاریخ و سوانح لکھی ہیں۔ ان سے مطابقت نہیں ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مستقبل کا کوئی مورخ اس سے استفادہ کئے بغیر جدوجہد آزادی مرتب کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پروفیسر محمد مجیب کا ترجمہ زبان و بیان کے اعتبار سے کسی سقم کا حامل نہیں لیکن جہاں تک طرز بیان کا تعلق ہے دنیا جانتی ہے کہ مولانا کے قلم میں سحر انگیزی اور متاثر کن جو صفات تھیں وہ ترجمہ میں پیدا نہیں ہو سکیں۔ مولانا کے حوالے سے اس کتاب کو پڑھنے والے الہلال' تذکرہ اور غبار خاطر کے طرز خاص کو نہ پا کر لطف و انبساط کے احساس محرومی کے شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں نجی زندگی کو کاملاً" نظر انداز کیا گیا ہے۔ سوائے سیاست



کے کسی پہلو پر روشنی نہیں ڈالی گی ہے۔ یہ بھی خصوصیت مدِ نظر رکھی گئی کہ نظریاتی مخالفین کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا گیا صرف واقعات بیان کرنے اور ان کے حوالے سے اپنے تاثرات قلبند کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ البتہ اپنے ہم نوا لوگوں اور نظریاتی ہم سفروں کی غلطیوں کی نشاندہی اور ان پر سخت تنقید سے گریز نہیں کیا گیا۔

**تصوف اور تعمیر سیرت : مرتبہ عاصم نعمانی : لاہور : اکتوبر ۱۹۷۲ء**

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ علیہ نے مختلف اوقات میں اپنے حالات زندگی اور نظریات قلبند کئے تھے۔ عاصم نعمانی نے انہیں تحریروں کی مدد سے سوانحی خاکہ مرتب کرنے اور تعمیر سیرت کے بارے میں ان کے خیالات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب انہیں دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں خود نوشت حالات زندگی ہیں جس میں مولانا نے خاندان' پیدائش' بچپن' تعلیم و تربیت' صحافت اور مشغلہ تصنیف و تالیف پر اجمالی نظر ڈالی ہے۔ یہ مکمل آپ بیتی نہیں ہے۔ ابتدائی ادوار حیات کی حد تک کچھ معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔ بعد کے ادوار خصوصاً" سیاسی مصروفیات اور نظریات کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ باب دوم سے تعمیر سیرت کے بارے میں ان کے چیدہ چیدہ خیالات سے آگاہی ضرور ہو جاتی ہے۔ یہ باب بھی محدود موضوع تک رہنمائی کرتا ہے۔ چونکہ مرتب کا مقصد بھی محدود موضوع کو پیش کرنا تھا۔ اس لئے اس حد تک کامیابی ضرور ہوئی ہے بہ حیثیت مجموعی سوانحی حالات کے بارے میں تشنگی کا احساس قاری کو شدت سے ہوتا ہے۔

**آپ بیتی : رشید احمد صدیقی : مرتبہ سید معین الرحمان : لاہور ۱۹۷۴ء**

کتاب کے مرتب ڈاکٹر سید معین الرحمان نے اعتراف کیا ہے کہ

"زیر نظر آپ بیتی رشید صاحب کی مختلف' منتشر اور متفرق تحریروں کی مدد سے مرتب کی گئی ہے۔ عبارت' نفس مضمون اور اس کا نثر و اعلان سب کا سب رشید صاحب کے قلم کا نتیجہ ہے۔ اس میں کہیں "بوئے غیر" نہیں آئے گی" (۸۹)

گویا یہ بھی ان "آپ بیتیوں" میں شامل ہے جسے مصنف نے سوانح حالات بیان کرنے کے لئے تحریر نہیں کیا۔ مختلف موضوعات پر تحریر کرتے ہوئے رشید صاحب نے اپنے حالات ضمناً" بیان کر دیئے۔ یہ مرتب کی کاوش ہے کہ انہوں نے ترتیب زمانی کا اندازہ کرتے ہوئے اسے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں مرتب نے ماخذات کا حوالہ دیا ہے جن میں کتابیں بھی شامل ہیں اور مضامین بھی۔ واقعات کا سلسلہ بچپن سے شروع ہوا ہے۔ لیکن سنین موجود نہیں۔

مرتب نے رشید صاحب سے معلوم کر کے حاشیے میں ہر واقعہ کا سن تحریر کر دیا ہوتا تو آپ بیتی کی افادیت میں اضافہ ہوتا۔ ایک ہی زمانہ کا احوال اس طرح مرتب ہوا ہے کہ کئی کئی ماخذ سے مدد لینی پڑی۔ چونکہ تمام تحریریں "آپ بیتی" کی صنف کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر وجود میں نہیں لائی گئیں اس لئے جہاں اندازِ بیان سے داستان طرازی کا قیاس ہوتا ہے وہاں واقعات میں بھی رنگ آمیزی کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر رشید صاحب کے حالات' ان کی شخصیت' ان کے کردار' ان کی پسند کو سمجھنے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ سوانحی تقاضوں کو کسی حد تک پورا کرنے کے ساتھ اس کا اندازِ بیان اتنا دل آویز ہے کہ قاری ایک ایک جملے کے حسن اور معنویت میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

## سرسید کی کہانی' ان کی اپنی زبانی : مرتبہ ضیاء الدین لاہوری : کراچی : ۱۹۸۲ء

ضیاء الدین لاہوری نے سرسید احمد خان کی تحریروں کے اقتباسات کے ذریعے ان کی آپ بیتی مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے مضامین' تقاریر اور خطوط کے علاوہ "حیات جاوید" مؤلفہ مولانا حالی سے بھی استفادہ کیا۔ اس کتاب میں بیشتر حالات خود سرسید کی زبانی بیان ہوئے ہیں۔ ان کی مدد سے بھی حیات سرسید کا واضح خاکہ مرتب ہو گیا ہے اور ہر دور کے حالات سامنے آ گئے ہیں۔ کتاب مرتب کرتے ہوئے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ مؤلف نے ربط مضمون کے لئے چند الفاظ اپنی طرف سے بڑھا دیئے ہیں۔ اور کوشش کی ہے کہ اصل مفہوم سرسید کے الفاظ میں ہی ادا ہو۔ بچپن' عالم شباب' بزرگوں کا تذکرہ' عادات و خصائل' تصانیف' واقعات ۱۸۵۷ء' انگریزی حکومت کا قیام' تعلیمی سرگرمیاں' مخالفت' علمی لطائف اور دیگر لطائف اور دیگر امور کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ اسے "حیات جاوید کی تلخیص کہا جا سکتا ہے"

پیش لفظ میں مرتب نے آپ بیتی مرتب کرنے کے مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ

"نئی نسل کو ان چند گوشوں سے آگاہ کیا جائے جو ہماری قومی و ملی زندگی پر براہ راست اثر انداز ہوئے اور جنہیں آج تک ایک منصوبے کے تحت ان سے پوشیدہ رکھا جا رہا ہے"(۹۰)

اس زمانے میں جب کہ تمام مضامین سرسید مرتب ہو کر کئی جلدوں میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ تمام خطوط اور تقاریر کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ استدلال بے معنی معلوم ہوتا ہے کہ



ان کے افکار کے چند گوشے ایک منصوبے کے تحت نئی نسل سے پوشیدہ رکھے جا رہے ہیں۔ مرتب کا بیان غیر حقیقت پسندانہ مفروضہ پر مبنی ہے۔ رہا مسئلہ توضیح' تشریح اور تاویل کا تو دنیا کی کوئی شخصیت یا افکار و نظریات اختلافات سے مبرا نہیں' اختصار پسند نوجوانوں کے استفادہ کے لئے یہ ایک کامیاب کوشش کہی جا سکتی ہے۔

## آتش چنار : شیخ محمد عبداللہ : تحریر محمد یوسف ٹینگ : ۱۹۸۵ء

سرورق پر صراحت کے اعتبار سے "آتش چنار" کو شیخ محمد عبداللہ کی "خودنوشت سوانح عمری" قرار دیا گیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی آپ بیتی نہیں ہے جسے صاحب سوانح نے نہیں لکھا ہے۔ "آزاد کی کہانی' آزاد کی زبانی" (تحریر عبدالرزاق ملیح آبادی) اور "انڈیا ونز فریڈم" (India WinsFreedam) انگریزی' تحریر ہمایوں کبیر اردو ترجمہ پروفیسر محمد مجیب کو بھی آپ بیتیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کتابوں کی مشترکہ خصوصیت یہی نہیں کہ ان آپ بیتیوں کو صاحب سوانح نے نہیں لکھا بلکہ یہ خصوصیت بھی ہے کہ صاحب سوانح کے انتقال کے بعد شائع ہوئیں۔ لکھنے والوں کی نیت پر شبہ کئے بغیر بھی ان کے تمام مندرجات کو شک و شبہ سے بالاتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایسے میں واقعات اور آراء کی صداقت کے بارے میں کس کو مدعی کیا جائے اور کس سے منصفی چاہی جائے؟

آتش چنار ایسے شخص کے سیاسی کارناموں کی داستان ہے جو کبھی کشمیری عوام کا غیر متنازع رہنما اور کشمیر کے عوام کے دلوں کی دھڑکن تھا۔ لیکن آج وہی عوام ان کے "آثار و باقیات" کے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں وہ گزرے ہوئے عمل سے بڑی سچائی ہے۔ کتاب میں "مدارج کار" کا ذکر ہے اور آج کی صورت حال حقیقی انجام' اور فیصلہ' اسے ذہن میں رکھ کر پڑھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب میں صداقتیں کم اور حاشیہ آرائیاں زیادہ ہیں۔

۱۹۴۷ء سے قبل شیخ محمد عبداللہ نے کشمیری عوام کو ظلم و جبر کے شکنجوں سے آزاد کرانے کی جراٴت مندانہ تحریک جاری رکھی اور "شیر کشمیر" بھی کہلائے اس کے بعد کے حالات پر پردے پڑے رہے۔ شیخ محمد عبداللہ نے اپنی عظمت منوانے کے لئے جو داستان حیات قلمبند کروائی۔ اس سے ان کی تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے آ گیا۔ شیر کی ذات جس قدر عزم محکم اور مضبوط عمل کی حامل ہوتی ہے۔ شیر کشمیر "آتش چنار" میں ان سے عاری دکھائی دیتا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے ایسے شخص کی تصویر نظر آتی ہے جس نے نہ تو تاریخ سے سبق حاصل کیا اور نہ اپنے ذاتی تجربوں

سے کچھ حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ عقل مند وہ ہے جو ایک سوراخ سے دوسری بار ڈسا نہیں جاتا۔ شیخ محمد عبداللہ کا حال عقلمند انسان سے قطعی مختلف ہے۔ انہیں لذت آزار بار بار اسی سوراخ کی طرف لے جاتی رہی جس سے وہ ڈسے جاتے رہے۔ زہر کے اثرات محسوس کرنے اور ان کا اظہار کرنے کے باوجود "کون ہوتا ہے حریف مے مرد فگن عشق" کی صدا لگا کر "ھل من مزید" کا تقاضا کرتے رہے۔ ڈسے جانے کے بعد زہر سے کچھ عرصہ تڑپتے اور پھر ان کی "آتش شوق" مشتعل ہو جاتی۔

شیخ محمد عبداللہ کے بیان کے مطابق ریاست کے حکمرانوں کے خلاف ان کی جدوجہد کا آغاز ۱۹۳۱ء میں مسلم کانفرنس کے پرچم تلے ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی ملاقات جواہر لال نہرو سے ہوئی۔ اس کے بعد ہی مسلم کانفرنس کو ختم کر کے انہوں نے نیشنل کانفرنس کی بنیا ڈالی۔ اس کا اعتراف انہوں نے کھلے الفاظ میں نہیں کیا ہے۔ لیکن سلسلۂ بیان اسی صورت حال کا غماز ہے کہ اس تبدیلی کے پس پردہ آدرشوں اور اصولوں کے بجائے جواہر لال کی سیاست کام کر رہی تھی۔ بعد کے تمام واقعات ثابت کرتے ہیں کہ آدرش اور اصول کا انہوں نے کہیں لحاظ نہیں کیا اور جواہر لال کے اشارے پر چلتے رہے۔ وہ کشمیر کو مہاراجہ ہری سنگھ کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ان کے خلاف "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک شروع کی۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جب دیسی ریاستوں کے مستقبل کا سوال پیدا ہوا اور مہاراجہ ہری سنگھ نے بھارت سے الحاق کی درخواست کی تو کشمیر کے عوام کی مرضی حاصل کئے بغیر انہوں اسی مہاراجہ کی درخواست پر صاد کر دیا جس سے وہ کہہ رہے تھے کہ کشمیر چھوڑ دو "عوام کا مستقبل عوام کے ہاتھ میں ہونا چاہئے" کے اصول کو ماننے والے شیخ عبداللہ نے کشمیر کے سوا کروڑ انسانوں کو بغیر قیمت مہاراجہ کی مرضی کے مطابق نہرو اور بھارتی حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس اعتراف کے باوجود وہ آدرش اور اصول کی بات کرتے ہیں تو ان کی دوہری شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ اپنے آدرشوں کی عظمت کا سہارا لیتے ہوئے وہ بھول گئے کہ عوام کی مرضی ان سے کہیں زیادہ بلند اور مقدس تھی۔ الحاق کی یہ کوشش اقتدار حاصل کرنے کی ایک سعی تھی جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ ان کے وزارت عظمیٰ کے زمانے میں اقوام متحدہ میں استصواب رائے کے اصول کو مان لینے کے بعد بھی جواہر لال نہرو نے انہیں مشورہ دیا کہ

"میں آئین ساز اسمبلی کا اجلاس بلا کر ہندوستان کے ساتھ الحاق کرا دوں" (۹۱)

تو جواہر لال کی اصول پسندی طشت ازبام ہو گئی۔ اس کے باوجود شیخ عبداللہ انہیں برصغیر



کے تمام رہنماؤں سے زیادہ اصول پسند اور عظیم تر سمجھتے رہے۔ حالانکہ جواہر لال کے مطالبہ پر وہ سوچنے لگے تھے کہ

"ان کی اخلاقی عظمت کا جوہر اس چہرے کی تاریخ ساز جھریوں کے کس خوبصورت گرداب میں کھو گیا" (۹۲)

پھر بھی ان کی وفاداری بشرط استواری میں فرق نہیں آیا۔ ان کے دور حکومت میں نہرو، پٹیل اور مہاراجہ کے کارندے جموں کے ہنڈوں میں اسلحہ تقسیم کرتے رہے۔ مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلتے رہے۔ ان کے مکانات کو مسمار کرتے رہے، عورتوں کی عصمتوں کو لوٹتے رہے، ان کی روداد شیخ عبداللہ نے صفحات ۴۳۴ تا ۴۴۰، ۵۰۵ تا ۵۱۹ اور ۵۳۵ تا ۵۶۷ پر پوری تفصیل سے بیان کی ہے۔ ان کی ذمہ داری بھارتی حکومت اور نہرو پر بھی ڈالی ہے۔ لیکن ان کے سیکولرازم کے ایمان اور نہرو سے وفاداری کے جذبے میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ یہاں تک انہیں سازش کی ذریعہ وزارت اعلیٰ کے منصب سے برطرف کر کے پابند سلاسل کر دیا۔ اتنے سارے تجربات کے بعد ایک عام آدمی بھی بھارت کے سیکولرازم اور نہرو کی کشمیر دوستی کی حقیقت جان جاتا لیکن افتاد کے زمانے میں وہ انہیں برا کہتے رہے اور اقتدار کی جھلک نظر آتے ہی ان کے دامن سے لپٹ گئے۔ کشمیر کے حالات بخشی غلام محمد اور نہرو کے اختیار سے باہر ہو گئے تو نہرو کو ایک بار پھر شیخ عبداللہ کی یاد آئی۔ انہیں طلب کر کے نہرو نے کہا

"ہمیں ماضی کو بھول کر کشمیر میں نئے دور کا آغاز کرنا چاہئے" (۹۳)

اور شیخ عبداللہ کے لئے

"پرانی تلخیاں گلدستہ طاق نسیاں بن گئیں" (۹۴)

عوام کے مصائب، شہیدوں کے لہو اور بہو بیٹیوں کی بے حرمتی کی تلخیوں کو گلدستہ بنا کر طاق میں سجانے کا حوصلہ شیخ عبداللہ کا ہی ہو سکتا ہے۔ کسی عوام دوست اور باضمیر انسان میں یہ حوصلہ کہاں سے آئے گا؟ یہی داستان ظلم بعد میں اندرا گاندھی نے ۱۹۷۵ء میں دہرائی اور کچھ عرصہ گزرنے پر شیخ عبداللہ کو طلب کر کے کہا

"شیخ صاحب جو کچھ بھی ہوا ہے اس کو بھول جانے کی ضرورت ہے ہم پھر ایک نیا باب شروع کرنا چاہتے ہیں۔" (۹۵)

سوراخ بھی وہی تھا افعی کا زہر بھی وہی تھا اور شیخ عبداللہ بھی وہی تھے۔ اندرا نے بھول جانے کو کہا اور شیخ عبداللہ سب کچھ بھول کر راج گدی پر براجمان ہو گئے۔ انہیں اقرار ہے کہ

"مہاتما گاندھی جیسے اصول پسند عارف کا یہ چیلا (نہرو) بیک وقت قدیم ہند کے مشہور سیاست کار چانکیہ کا بے حد پرستار بھی تھا اور اس کی کتاب ارتھ شاستر جس میں اس نے ریاست کی فریب کاری کے گر بیان کئے ہیں جواہر لال کے اپنے اعتراف کے مطابق اس کے سرہانے پر رکھی تھی اور جواہر لال نے میکاؤلی طرز کی سیاست کاری کشمیر میں ہمارے ساتھ بھی برتی" (۹۶)

اس کے باوجود ان کی وفاداری میں فرق نہیں آیا اور وہ نہرو اور بھارتی حکومت ہی کو کشمیری عوام کا نجات دہندہ اور ان کی فلاح و بہبود کا ذریعہ سمجھتے رہے۔

شیخ عبداللہ کے بیان کردہ ان واقعات سے قاری ان کی شخصیت کے بارے میں جو رائے قائم کرتا ہے ان کے اجزاء لازما" یہ ہوں گے۔

(۱) وہ ایک کمزور شخصیت کے مالک تھے اور ان میں تجربات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت بالکل نہ تھی۔

(۲) جن آدرشوں اور اصولوں کا وہ سہارا لیتے رہے ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان کا منشاء حصول اقتدار تھا۔ چاہے وہ شہیدوں کے لہو اور بہو بیٹیوں کی عصمتوں کی قیمت ادا کر کے ہی کیوں نہ ملے۔

(۳) وہ اپنی کمزور شخصیت کے لئے ایک پناہ گاہ کی تلاش میں تھے جواہر لال کی صورت میں انہیں یہ پناہ گاہ میسر آگئی۔ ان کی ملکی اور بین الاقوامی شہرت سے متاثر ہو کر وہ ان کی پناہ میں چلے گئے تاکہ ان کے وسیلے سے اپنی حیثیت بھی بنا سکیں۔

(۴) انہوں نے اپنی چھوٹی شخصیت کو بڑا بنانے کے لئے اپنی دانست میں کبھی جواہر لال کو معاف کردیا اور کبھی اندرا گاندھی کو! حالانکہ معاف کرنا اسکی بڑائی ہے جو ظلم کا بدلہ لینے کی طاقت رکھنے کے باوجود معاف کردے۔ شیخ عبداللہ اس طاقت سے عاری تھے۔

(۵) وہ ساری دنیا کو دھوکہ دینا چاہتے تھے لیکن ان میں دھوکہ دینے کی صلاحیت بھی موجود نہ تھی۔ آدرشوں اور اصولوں کا بار بار ذکر کر کے انہوں نے جو دھوکہ دینا چاہا اس میں قطعی کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ ذی فہم جانتے ہیں آدرش کی جڑیں فرد کی ذات میں نہیں ہوتیں بلکہ عوام کی روحوں میں ہوتی ہیں۔ انہوں نے ان آدرشوں کی توثیق عوام سے کروائی اور نہ کبھی انہیں اعتماد میں لیا۔

خود نوشتہ سوانح عمریوں میں سب سے کمزور اور ناکام "آتش چنار" ہے اس میں جرم کی



صفائی کے بجائے احساس جرم کی کیفیت ملتی ہے جبکہ صاحب سوانح میں اقرار جرم کا حوصلہ بھی نہیں۔

شیخ عبداللہ کی شخصیت کے اور بھی کئی کمزور پہلو اس میں نظر آتے ہیں۔ وہ ایک احتجاجی سیاست دان تھے۔ لیکن موئے مبارک کی چوری کے معاملے میں ان کی زبان پر تالے پڑے رہے اور انہوں نے کبھی مطالبہ نہیں کیا کہ چوروں کو منظر عام پر لایا جائے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک یہ مذموم معمانہی ہوئی ہے اور لوگ انہیں کو شریک جرم قرار دیتے ہیں۔

ان کا جذبہ خود ستائی حد سے تجاوز کیا ہوا ہے۔ کتاب میں درجنوں ہم عصروں کا ذکر ہے۔ لیکن کسی کا ذکر خیر نہیں خصوصا" قائد اعظم کو جہاں بھی یاد کیا ہے کیچڑ ضرور اچھالی ہے۔ ان پر ایسے الزامات لگائے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان کے ایسے اقوال پیش کئے ہیں جو کبھی ان کی زبان سے ادا نہیں ہوئے اور ان الزامات و اقوال کے لئے کوئی مستند ماخذ کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ انہوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ

"قائد اعظم سرد مہری اور عدم التفات سے کانگریس کے دھارے سے پہلے تو الگ ہو گئے اور پھر اس کے سب سے بڑے مخالف بن گئے" (۹۷)

اتنا بڑا جھوٹ تو قائد اعظم کے بدترین دشمن نے بھی نہیں کہا۔ اسے تاریخ مسخ کرنے کی کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ قائد کی سیاست اصولوں پر مبنی رہی۔ ذاتی جاہ و جلالت کے وہ کبھی خواہاں نہیں رہے۔ کانگریس کے عہدے اور کانگریس کے مراعات ان کے پیش نظر نہ تھے۔ کانگریس نے ان کے ہندو مسلم اتحاد کے مشن کو ناکام بنایا تھا۔ کانگریس نے مسلمانوں کے حقوق کے لئے تحفظات دینے سے انکار کیا تھا۔ کانگریس ہمیشہ مسلم دشمنی پر کمربستہ رہی۔ اسکی یہ دشمنی شیخ عبداللہ کے دور وزارت عظمیٰ میں بھی کھل کر سامنے آگئی تھی۔ اس کا انہوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔ قائد اعظم نے ذاتی وجوہ سے نہیں اصولوں اور آدرشوں میں اختلاف کی وجہ سے کانگریس کو چھوڑا تھا۔ ان کا یہ ظرف نہیں تھا کہ کانگریس سے وفاداری کی خاطر وہ مسلمانوں کو قربان کردیتے۔

"آتش چنار" اگر واقعی شیخ عبداللہ کی املا (Dictate) کروائی ہوئی کتاب ہے تو کہنا پڑتا ہے ایک بڑے نام نے اپنی چھوٹی اور کمزور شخصیت کو بے نقاب کرلیا ہے۔

داستان حیات: سید میر قاسم: مرتبہ عبدالرحمان کوندو: دلی : مئی ۱۹۸۵ء

عبدالرحمان کوندو نے کشمیر کے سیاسی رہنما سید میر قاسم کی سوانح حیات مرتب کرنے کے

لئے ان کے بیانات ٹیپ کئے اور انہیں "داستان حیات" کے نام سے شائع کیا ہے۔ مرتب کے بیان کے مطابق یہ صاحب سوانح کی "زبانی روداد" ہے جسے تحریر کرنے کا قرض انہوں نے ادا کیا سیاسی رہنماؤں کی آپ بیتیوں کی طرح اس کی نوعیت بھی سوانحی نہیں بلکہ سیاسی واقعات کا بیان اور کہیں کہیں ان کا تجزیہ کرنے پر منحصر ہے۔ کتاب کے ابتدائی ۸۰ صفحات میں خاندانی پس منظر، شجرۂ نسب' اسلاف میں سید ولی اللہ شاہ' سید شاہ محمد سعد اللہ' سید شاہ محمد دولت' سید شاہ محمد واصل' سید شاہ محمد عارف کے علمی مرتبہ کا فخریہ ذکر اور اپنے وطن کے بعض مشاہیر کا تعارف بھی شامل ہے۔ اس میں اکثر غیر متعلق باتیں بھی آگئی ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال کا دورۂ کشمیر (۹۸)

طالب علمی کے زمانے سے سیاسیات سے دلچسپی اور فعال کردار ادا کرنے کی خواہش کے واقعات بیان کرنے کے بعد تعلیم' پیشہ ورانہ اور نجی زندگی پر کوئی توجہ دیئے بغیر کشمیر کے سیاسی واقعات کے حوالے سے مواد اکٹھا کردیا ہے۔ آخر میں چند صفحات "ازدواجی زندگی' اولاد واعزہ" کے بارے میں ہیں۔ کتاب کو سوانحی آپ بیتی کے بجائے سیاسی تاریخ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی ایسے ذہن کی نمائندگی کرتا ہے جو حقائق کو قبول کرنے' رویوں کو تبدیل کرنے اور تجربات کے ساتھ نظریات کو قائم کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ نیشنل ازم کے سحر میں گرفتار' صداقتوں سے روگرداں' آخر میں اپنی شکست کا اعتراف اندرا گاندھی کے نام خط میں ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"ہماری پارٹی مذہبی' لسانی' نسلی اور تہذیبی اقلیتوں کی نظر میں اپنا اعتبار کھو چکی ہے۔ حالات کی یہ روش کوئی خوش آئند نہیں کیونکہ ماضی میں یہ طبقے کانگریس کو اپنی آرزوؤں اور امیدوں کی علامت تصور کرتے تھے۔ کانگریس آئی کے مسلمہ اصولوں جیسے سوشلزم' سیکولرازم اور جمہوریت کے بارے میں صالح اعلانات محنت کش عوام کے وسیع حلقوں میں اپنے معانی کھو چکے ہیں اور ان کی نظر میں ان کی وقعت کھوکھلے نعروں کے سوا کچھ بھی نہیں۔" (۹۹)

پوری زندگی جس کے سائے میں مصنف نے بسر کی عمر کے آخری حصے میں اسی سے مایوس ہو کر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اس عمل سے صاحب سوانح کی خام خیالی اور ناپختہ ذہن کی ترجمانی ہو جاتی ہے۔ جس نے کسی بھی تجربے سے فائدہ نہیں اٹھایا اور آخر میں سپرانداز ہو گیا۔

تاریخی دستاویز کے طور پر اقوام متحدہ میں میر قاسم کی تقریر اور اندرا گاندھی کے نام ان کے خطوط بھی شامل ہیں۔ تقریر میں پاکستان پر الزام تراشیوں کے سوا کچھ نہیں۔ عہد' پاس عہد کا ہلکا



سا بھی حوالہ موجود نہیں' اس طرح یہ کتاب نہ سوانح عمری کے معیار پر پوری اترتی ہے اور نہ ایسے سیاسی کردار کو پیش کرتی ہے جس سے قاری بصیرت حاصل کرسکے۔

### آزادی کی کہانی' میری زبانی : سردار عبدالرب نشتر : مرتبہ آغا مسعود حسین : کراچی : سنہ ندار (آزادی کے بعد)

جنگ آزادی کے بے باک مسلم رہنما سردار عبدالرب نشتر نے اپنے دور حیات کے بعض گوشوں پر سے پردہ اٹھایا تھا جو ان کے بیانات اور انٹرویوز کی شکل میں بکھرا ہوا تھا۔ آغا مسعود حسین نے "آزادی کی کہانی' میری زبانی' کے نام اسے انہیں اس طرح مرتب کیا ہے کہ ان کے بیان کی لفظی خوبیاں اور خامیاں من وعن باقی رکھی ہیں۔ یہ گفتگو کی زبان میں غیر مربوط واقعات کا مجموعہ ہے۔ اسے جامع سوانح کے ضمن میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ پہلا باب خاندانی حالات' پیدائش اور تعلیم سے متعلق ہے جو صرف ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب سے سیاسی مصروفیات اور جدوجہد کا آغاز ہوگیا ہے۔ جہاں تک صوبہ سرحد کی سیاسی فضا اور اس کے نشیب و فراز کا تعلق ہے انہیں تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے چوں کہ سردار نشتر کا تعلق خلافت تحریک کانگریس اور مسلم لیگ سے مختلف ادوار میں رہا ہے۔ اس لئے ایسی بہت سی باتیں منظر عام پر پہلی بار آئی ہیں جن سے عام لوگ واقف نہیں تھے۔ مثلاً کانگریس کو سرحدی علاقہ میں اپنی مقبولیت کا بہت زعم تھا اس کی حقیقت کے بارے میں انکشاف کیا گیا کہ

"ہمارے صوبے کے لوگ خلافت سے زیادہ آشنا تھے اور کانگریس کمیٹی کا کام بھی زیادہ تر خلافت کمیٹی کرتی تھی۔ کانگریس کمیٹی کا نام بہت مشہور نہیں تھا۔ کارکن دونوں کے ایک تھے۔ حکومت کی ہر مخالفانہ تحریک کو ہمارے ہاں کے لوگ تحریک خلافت کہتے تھے۔" (۱۰۰)

مولانا آزاد کی سیاسی فکر کو نشتر کے اس بیان کے حوالے سے جانچا جا سکتا ہے۔

"مولانا آزاد نے مجھ سے بڑی رازداری میں کہا کہ اگر ہندو کھدر پہن کر اور کانگریسی بن کر ہندوؤں کی طرف داری کرسکتے ہیں تو تم بھی کانگریس کے اندر رہ کر مسلمانوں کی طرف داری کر سکتے ہو۔ ابوالکلام آزاد کا یہ جملہ سن کر میں مسکرایا اور ان سے دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ میں منافقت نہیں کر سکتا کہ بظاہر ایک غیر فرقہ ورانہ جماعت میں شامل ہونے کے بعد فرقہ ورانہ پالیسی پر عمل کروں" (۱۰۱)

مولانا آزاد کہنے لگے کہ

"اگر ہم کانگریس سے علیحدہ ہو گئے تو وہ کھلم کھلا ہندو سبھا بن جائے گی۔ میں نے کہا یہ خفیہ ہندو سبھا کھلم کھلا ہندو سبھا سے زیادہ خطرناک ہے۔" (۱۰۲)

اس نوعیت کے متعدد انکشاف ہیں چونکہ یہ ایک سنجیدہ مزاج، حقائق پسند اور شریف آدمی کی زبان سے ادا ہوئے ہیں جن کی سلامت روی اور حق گوئی کے سب ہی قائل ہیں اسلئے پس پردہ سیاست کاری کے بعض گھناؤنے پہلو قاری کے لئے تعجب کے ساتھ آگہی کا سبب بنتے ہیں۔

کتاب سوانحی نقطۂ نظر سے کامیاب نہیں لیکن سیاسی وقائع نگاری اور تجزیے کے اعتبار سے یقیناً لائق مطالعہ ہے۔

آزادی کے بعد اس قسم کی (بیانیہ) آپ بیتیوں کو رواج ملا لیکن ایسی آپ بیتیاں تحقیقی نقطۂ نظر سے ہمیشہ شکوک وشبہات کی زد میں رہتی ہیں اور انہیں تحریر کرنے والے کو انتہائی محتاط رویہ اختیار کرتے ہوئے مستند حوالوں سے بھی کام لینا پڑتا ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داری بیانیہ آپ بیتی تحریر کرنے والے پر عائد ہوتی ہے۔



# باب پنجم

## مصادر و ماخذات


۱۔ یاد ایام از احمد سعید چھتاری : کراچی : ۱۹۴۹ء : صفحہ ۱۹

۲۔ نقش حیات از حسین احمد مدنی : الجمعیۃ پریس : دہلی : ۱۹۵۶ : صفحہ ۱۸

۳۔ نقش حیات' حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۲

۴۔ نقش حیات' حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۲

۵۔ سرگزشت' از عبدالمجید سالک : لاہور : ۱۹۵۴ء : صفحہ ۲۱

۶۔ سرگزشت' دیباچہ از چراغ حسن حسرت : ص ۱۲

۷۔ سرگزشت' دیباچہ از چراغ حسن حسرت : ص ۱۲

۸۔ مشاہدات از ہوش بلگرامی : حیدر آباد دکن : ۱۹۵۵ء : صفحہ ۳

۹۔ مشاہدات از ہوش بلگرامی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۲۷

۱۰۔ شاد کی کہانی' شاد کی زبانی : شائع کردہ مسلم عظیم آبادی : پٹنہ : ۱۹۵۸ء : صفحہ ۳

۱۱۔ شاد کی کہانی' شاد کی زبانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۸۳

۱۲۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی از محمد ایوب خاں : آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان: ۱۹۶۵ : صفحہ ۶۷

۱۳۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲

۱۴۔ سرگزشت سید ذوالفقار علی بخاری : کراچی : ۱۹۶۶ء : صفحہ ۲

۱۵۔ سرگزشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱

۱۶۔ سرگزشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲

۱۷۔ شاہراہ پاکستان : چودھری خلیق الزماں : انجمن اسلامیہ پاکستان : کراچی : ۱۹۶۷ء : صفحہ ۱۱۱

۱۸۔ مزدور سے منسٹر : عابد علی : بمبئی ۱۹۶۸ء : صفحہ ۴۰۴

۱۹۔ نامۂ اعمال : سر محمد یامین : کراچی : ۱۹۷۰ء : صفحہ ۷۹

۲۰۔ تفصیلات اور دستاویزات کے عکسی نقول کے لئے ملاحظہ ہو شفقت رضوی کا مضمون "مولانا

ظفر علی خان اور ریاست حیدر آباد" مشمولہ سہ ماہی "اقبال" : بزم اقبال : لاہور صفحات ۱۳۸ تا ۱۵۲

۲۱۔ سہ ماہی اقبال' لاہور : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۵۰' ۱۵۱

۲۲ چشم دید : فیروز خان نون : فیروز سنز : لاہور ۱۹۷۳ء : صفحہ ۱۸

۲۳۔ چشم دید : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۲

۲۴۔ چشم دید : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵

۲۵۔ کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں : خواجہ غلام السیدین : جمال پرنٹنگ پریس : دہلی ۱۹۷۴ء : صفحہ ۳۱

۲۶۔ کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۲

۲۷۔ کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۵

۲۸۔ یادوں کی برات : جوش ملیح آبادی : مکتبہ شعروادب : لاہور : ۱۹۷۵ء : صفحہ ۱۳

۲۹۔ یادوں کی برات : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۹۴

۳۰۔ یادوں کی برات : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۳۳

۳۱۔ یادوں کی برات : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۹۴

۳۲۔ یادوں کی برات : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۳

۳۳۔ یادوں کی برات : حوالہ مذکورہ صفحات ۱۹۱ تا ۱۹۳

۳۴۔ بیرونی مشاہر ادب حیدر آباد میں از ڈاکٹر داؤد اشرف : مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۸۴ء

۳۵۔ بیرونی مشاہر ادب حیدر آباد میں : حوالہ مذکورہ : صفحات ۱۲۴ تا ۱۲۷

۳۶۔ یادوں کی برات : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۲۹

۳۷۔ یادوں کی برات : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۲۸

۳۸۔ اخبار الجمعیتہ دہلی ۱۳ نومبر ۱۹۲۸ء خصوصی شمارہ' نظام کے دورۂ دہلی کے موقع پر

۳۹۔ یادوں کی برات : حوالہ مذکورہ ص ۲۴۹

۴۰۔ یادوں کی برات : حوالہ مذکورہ : صفحات ۳۸۳ تا ۵۶۴

۴۱۔ یادوں کی برات : حوالہ مذکورہ : صفحات ۵۶۳ تا ۶۳۲



۴۲۔ یادوں کی برات : حوالہ مذکورہ : صفحات ۶۳۴ تا ۷۴۴

۴۳۔ اپنی تلاش میں : کلیم الدین احمد : پٹنہ : ۱۹۷۵ : صفحہ ۱

۴۴۔ اپنی تلاش میں : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳

۴۵۔ زرگزشت : مشتاق احمد یوسفی : مکتبہ دانیال : ۱۹۷۶' : صفحہ ۹

۴۶۔ زرگزشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۳

۴۷۔ زرگزشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۳

۴۸۔ زرگزشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۴

۴۹۔ زرگزشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۵

۵۰۔ آپ بیتی : عبدالماجد دریابادی : لکھنؤ : ۱۹۷۸ء : صفحہ ۱۳۵

۵۱۔ آپ بیتی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۳۶

۵۲۔ آپ بیتی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۸۴

۵۳۔ آپ بیتی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۷۵

۵۴۔ آپ بیتی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۷۷

۵۵۔ آپ بیتی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۸۹

۵۶۔ کاروان زندگی : از سید ابوالحسن علی ندوی : مجلس نشریات اسلام : کراچی : ۱۹۸۳ء

۵۷۔ گردراہ : از اختر حسین رائے پوری : مکتبۂ صبا : کراچی : ۱۹۸۴ : صفحہ ۸۳

۵۸۔ عمر گزشتہ کی کتاب : از مرزا اظفر الحسن : کراچی : صفحہ ۱۰۵

۵۹۔ گردرا : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۴

۶۰۔ سلسلۂ شب روز : از منظور الٰہی : غالب پبلشرز : لاہور : ۱۹۸۴ء : صفحہ ۲۲

۶۱۔ سلسلۂ روز و شب : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۵

۶۲۔ سلسلۂ روز و شب : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۷۱

۶۳۔ نساخ کی خود نوشت مرتبہ عبدالسبحان : ایشیا ٹک سوسائٹی : بنگال : ۱۹۸۶ء صفحہ ۱۶۵

۶۴۔ نساخ کی خود نوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۷۸

۶۵۔ نساخ کی خود نوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۰

۶۶۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۴۳
۶۷۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۹۷
۶۸۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۹۵
۶۹۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۴
۷۰۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۲
۷۱۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۶
۷۲۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۴۰
۷۳۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۴۹
۷۴۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۵
۷۵۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۸
۷۶۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۱۴
۷۷۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۳۹
۷۸۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۳۹
۷۹۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۵۹
۸۰۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۵۴
۸۱۔ ناسخ کی خودنوشت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۷۸
۸۲۔ یادِ عہدِ رفتہ : عبادت بریلوی : ادارۂ ادب و تنقید : لاہور : ۱۹۸۸ء : صفحہ ۷
۸۳۔ میرے ساتھی، میرے غازی، میرے شہید : از نصرت جہاں سلیم : ماڈرن بک ڈپو
اسلام آباد : ۱۹۹۰ء
۸۴۔ رسیدی ٹکٹ : امرتا پریتم : لاہور : س ن (آزادی کے بعد) : صفحہ ۱۸
۸۵۔ رسیدی ٹکٹ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۵
۸۶۔ رسیدی ٹکٹ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۰
۸۷۔ رسیدی ٹکٹ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۷
۸۸۔ ایک علمی خاندان : شفقت رضوی : ادارہ تحقیقات و تحریکات ملی : کراچی
۱۹۹۰ء : صفحہ ۱۳۶
۸۹۔ آپ بیتی، رشید احمد صدیقی : مرتبہ سید معین الرحمٰن : سنگ میل پبلی کیشنز



لاہور : ۱۹۷۴ء : صفحہ ۱۵
۹۰۔ سرسید کی کہانی، ان کی اپنی زبانی : مرتبہ ضیاء الدین لاہوری : ادارہ تصنیف و تالیف
: کراچی : ۱۹۸۲ء : صفحہ ۹
۹۱۔ آتش چنار : تحریر محمد یوسف ٹینگ، چودھری اکیڈمی : لاہور : ۱۹۸۵ء : صفحہ ۵۴۵
۹۲۔ آتش چنار : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۴۵
۹۳۔ آتش چنار : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۷۵۵
۹۴۔ آتش چنار : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۷۵۵
۹۵۔ آتش چنار : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۸۳۶
۹۶۔ آتش چنار : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۵۱
۹۷۔ آتش چنار : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۴۰
۹۸۔ داستان حیات : تحریر عبدالرحمان کوندو : ادارہ ادبیات : دہلی : ۱۹۸۵ء
صفحہ ۴۸
۹۹۔ داستان حیات : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۴۱
۱۰۰۔ آزادی کی کہانی، میری زبانی : سردار عبدالرب نشتر : کراچی : س ن : صفحہ ۴۲
۱۰۱۔ آزادی کی کہانی، میری زبانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۰
۱۰۲۔ آزادی کی کہانی، میری زبانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۶

# باب ششم

## شخصی مرقعے / خاکے

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

## تمہید

ادب میں شخصی مرقع نگاری کی روایت زیادہ قدیم نہیں۔ اس کی جھلکیاں چند ادبی تذکروں میں ضرور ملتی ہیں۔ "آب حیات" (مصنف محمد حسین آزاد) اس کی نمایاں مثال ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کامیاب شخصیت نگاری کے ذریعہ اس صنف ادب کی خدمت ہی نہیں کی بلکہ اس روایت کی بنیادیں استوار کیں اور ترقی پسند ادیبوں نے اسے کامیابی سے فن کی بلندیوں تک پہنچایا۔

ناول اور افسانہ میں ایک خیالی پیکر کی کردار نگاری ہوتی ہے وہی صورت شخصیت نگاری کی ہے فرق یہ ہے کہ اس میں موضوع خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہوتا ہے اس اعتبار سے کردار نگاری کی نسبت مرقع نگاری کو نہایت مشکل ذریعہ اظہار خیال قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس صنف میں موضوع کی مکمل شخصیت کا عکس نہیں ہوتا بلکہ نمایاں خصوصیات کی جھلکیاں ہوتی ہیں اور وہ بھی لکھنے والے کے نقطۂ نظر سے! اس میں صفات اور خصوصیات کو بیان نہیں کیا جاتا بلکہ واقعات اور نفسیاتی کیفیات کے ذریعہ ان کی نمائندگی کی جاتی ہے اگر مرقع نگار اپنے الفاظ میں اچھائیوں اور برائیوں کا ذکر کردیتا ہے تو اسے کامیاب شخصیت نگاری نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان صفات کو ایک جیتے جاگتے انسان کی متحرک شخصیت کے عکس کے طور پر پیش کرنا ہی حقیقی فن کاری ہے۔

سوانح عمریوں میں بھی مرقع نگاری ایک جزو کے طور پر شامل ہوتی ہے اور اس کے بغیر سوانح نگاری کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ موجودہ دور کی تیز رفتار زندگی میں لمحات فرصت کی کمی نے تخلیقی ادب میں ان اصناف سے اجتناب پر مجبور کردیا ہے جن کے لئے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے اس لئے آزادی کے بعد سوانح نگاری کی نسبت شخصیت نگاری کا رواج عام ہوا۔

مرقع نگاری کے اپنے فنی لوازمات ہیں۔ تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والے ادیبوں نے ان لوازمات کی پاسداری کے ساتھ اس فن کو رنگا رنگ بنادیا ہے اس باب میں آزادی کے بعد مرقع نگاری کے جو اہم اور نمائندہ نمونے سامنے آئے ہیں ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

○

# باب ششم (الف)

## شخصی مرقعے / خاکے

## ایک مصنف' ایک شخصیت (انفرادی)

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

## مخدوم محی الدین (نئے ادب کے معمار) : سردار جعفری :

## بمبئی : ۱۹۴۸ء

ترقی پسند مصنفین کے عروج کے زمانے میں باہم تعارف کے سلسلے میں جو مختصر کتابی سلسلہ شروع ہوا تھا اس کی ایک کڑی "نئے ادب کے معمار' مخدوم محی الدین" ہے۔ اس کے مصنف سردار جعفری کا مخدوم محی الدین سے شخصی ربط ضبط کم رہا ہے۔ اس لئے ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں سے وہ واقف نہ ہو سکے۔ انہوں نے چند ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے جن کے دوران مخدوم کے بارے میں وہ سرسری طور پر واقف ہو سکے۔ ان کی شخصیت اور شاعری کے علاوہ بعض غیر متعلق باتیں لکھ کر تصنیف کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کی صاحب سیرت سے بھی ملاقات ۱۹۴۰ء میں ہوئی تھی۔ ان دنوں سردار جعفری بنارس جیل میں مقید تھے اور مجاز مخدوم کو ان سے ملانے کے لئے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پہلی نظر میں مخدوم کے جو ظاہری نقش ونگار دیکھے وہ ان کے ذہن میں نقش ہو گئے اس کے بارے میں لکھا ہے۔

"مخدوم کی بڑی بڑی چمکدار آنکھیں مسلسل مسکراتی رہیں۔ اس کی نظروں میں عقاب کی آنکھوں کی تیزی تھی۔ آبنوسی چہرہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے تراش دیا ہو۔ اس کے پورے چہرے پر سنگ تراش کی چھینی کے نشانات تھے۔ رخساروں کی ہڈیوں کا ہلکا سا ابھار' بلند پیشانی' زوردار ٹھوڑی' بھینچے ہوئے ہونٹ' ایک پختہ کار اور سخت اصولی آدمی کی شخصیت ظاہر کر رہے تھے۔ اس کی آواز میں عزم اور خود اعتمادی تھی۔ صرف دو چیزیں مخدوم کی شخصیت میں لچک اور لطافت پیدا کر رہی تھیں۔ ایک اس کا تبسم جس سے بھینچے ہوئے ہونٹوں ہی پر نہیں بلکہ سخت لیکن چمک دار دانتوں پر بھی نرمی دوڑ جاتی تھی اور دوسری اس کی تیز نظروں میں گھلی ہوئی محبت جو معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس کی آنکھوں کے گلابی ڈوروں سے ٹپک پڑے گی۔"(۱)

اس سراپا کے ساتھ سردار جعفری نے مخدوم کی شخصیت کے اہم ترین پہلو کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ ان کی ہر ایک کے ساتھ بھرپور محبت کرنے کا تھا۔ مخدوم کی حاضر جوابی ضرب المثل رہی ہے۔ وہ فقرے چست کرنے اور اپنے پر چست کئے گئے فقرے کا فوری جواب دینے کے عادی تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں جب سردار جعفری نے کہا۔

"تم پر عثمانیہ یونیورسٹی کی پوری چھاپ ہے اور رگوں میں کہیں سے حبشی خون آگیا ہے۔"

تو مخدوم نے فوری جواب دیا۔

"میری جد امجد بلال حبشی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے صحابی تھے۔" (۲)

سردار جعفری نے مخدوم کے اس دور کا بھی ذکر کیا ہے جب وہ حد سے زیادہ لاابالی تھے اور پھر ٹریڈ یونین کی تحریک میں شامل ہو کر سنجیدہ' مختتی اور ذمہ دار لیڈر بن گئے تھے۔ مصنف نے مخدوم کی آفاقی قدروں کی پاسداری کے حوالے سے وہ واقعہ بھی تحریر کیا ہے جب وہ بھرے مشاعرے میں ایک معروف و مقبول شاعر کو کلام سنانے سے انھوں نے منع کردیا تھا جو شراب کے نشے میں مدہوش تھے۔

اس امر کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا گیا ہے کہ مخدوم کی زندگی میں ایک اصول سختی سے کار فرما رہا۔

"عوام کا احترام کرو' وہی تخلیق کا سرچشمہ ہیں' ظالم' صاحب اقتدار اور حکمران طبقوں نے انھیں علم' ادب' تہذیب اور تمدن کی برکتوں سے محروم کردیا ہے۔" (۳)

اپنی ذات کے حوالے سے مخدوم نے سردار جعفری کے سامنے اس راز کا بھی انکشاف کیا کہ

"جب کوئی تخلیقی کام کرتا ہوں تو بالکل تنہائی چاہتا ہوں اس وقت میں اپنی محبوبہ کے وجود کو بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ لیکن بچے میری تنہائی میں کبھی مخل نہیں ہوتے وہ ہر وقت میرے پاس آسکتے ہیں۔" (۴)

اس طرح شعر گوئی کے حوالے سے سردار جعفری کے اعتراضات اور مخدوم کے جوابات واضح کرتے ہیں کہ ان کی اپنی الگ الگ سوچ تھی' الگ انداز تھا۔ وہ عام شاعروں کی طرح بلند آہنگ الفاظ اور لہجے میں شعر نہیں کہہ سکتے۔ یہ ان کے مزاج کے خلاف ہے یہ ان کی کمزوری ہے تو ایک سچے فنکار کی خوبی ظاہر ہو جاتی ہے۔

سردار جعفری کی کتاب میں خاکہ مختصر ہے اور اس وقت لکھا گیا جب کہ مخدوم نے عوامی زندگی کا نصف سفر بھی طے نہیں کیا تھا۔ اس لئے اس میں جامع شخصیت کی عکاسی نہیں ملتی۔ ابتدائی دور کے سنہرے نقوش ضرور ہیں۔

### اقبال کامل : عبدالسلام ندوی : اعظم گڑھ (انڈیا) : ۱۹۴۸ء

علامہ اقبال کی شہرت اور مقبولیت کے باوجود ان کے انتقال کے ایک عشرہ بعد تک کوئی قابل ذکر تصنیف منظر عام پر نہیں آئی جو ان کے سوانحی کوائف اور شخصیت کے مطالعہ پر مبنی ہو حالانکہ ان کے بارے میں وسیع معلومات اخبارات و رسائل میں موجود تھیں۔ اس کمی کو



عبدالسلام ندوی نے "اقبال کامل" کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی۔ ان کے سامنے صاحب سوانح کی تین نمایاں حیثیتیں تھیں۔ شاعر اقبال' فلسفی اقبال' مسلمان اقبال' ان کے خیال میں ان میں مقدم حیثیت شاعر اقبال کی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس کو نمایاں کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی۔ اسطرح یہ علامہ کی جامع سوانح نہیں بن سکی بلکہ ایک حصے کا احاطہ کرسکی۔ اس میں انہیں واقعات کو بیان کیا گیا ہے جن سے علامہ کے شاعرانہ احساسات اور فنکارانہ خصوصیات اجاگر ہو سکتے تھے۔ ان میں بیان کردہ استغنا' انا' بے نیازی' خودداری کے اوصاف صرف شاعر کی ذات تک محدود نہیں کئے جا سکتے بلکہ ان میں مسلمانوں کی شان کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ جاوید اقبال کے مضمون کے اقتباس سے ان کی پدرانہ شفقت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس لئے باوجود نقطہ نظر محدود ہونے کے صاحب سیرت کے اوصاف کی ہمہ گیری نے ایک بڑے آدمی کی تصویر پیش کی ہے۔ کتاب کا قابل لحاظ حصہ ان کی شاعرانہ عظمت کے تجزیہ پر مبنی ہے یہ گویا ان کے کلام کے ذریعہ ذہن کا مطالعہ ہے۔

"اقبال کامل" علامہ کی شاعرانہ خصوصیات کو سمجھنے میں جس قدر ممد ہے شخصیت کے خاص پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے اسی قدر معاون ہے۔ اسے اصطلاحی معنوں میں سوانح نہیں کہا جا سکتا البتہ شخصیت شناسی کے لئے خاکہ ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔

### منٹو : ابو سعید قریشی : لاہور : ۱۹۵۵ء

سعادت حسن منٹو الجھی ہوئی نفسیاتی کیفیات کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت کے بارے میں لکھنے کا حق وہی ادا کر سکتا ہے جسے ان سے خاص قرب حاصل رہا ہو اور کتاب کے مصنف ابو سعید قریشی کو یہ مواقع حاصل رہے۔ انہوں نے اپنی پہلی ملاقات سے آخری ملاقات تک منٹو کو کئی رنگوں اور حالتوں میں دیکھا تھا اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز' خاندانی حالات' بچپن کے واقعات سے واقف ہو کر ان کا تجزیہ کیا اور جن نتائج تک پہنچے اسے پوری ایمانداری کے ساتھ قلمبند کردیا ہے۔

منٹو کا المیہ یہ تھا کہ وہ زندگی کے ہر دور میں ناکامیوں' محرومیوں اور نامرادیوں کا شکار رہے۔ جس محبت اور التفات کی انہیں ضرورت تھی کبھی نہ مل سکی۔ اس سے دل میں جو اضطرابی کیفیت پیدا ہوئی اس کا عکس ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔

منٹو کی نجی اور ازدواجی زندگی کے حالات سے بھی مصنف واقف ہیں اور اس پر اظہار اطمینان بھی کرتے ہیں کہ ان کے اور ان کی اہلیہ کے درمیان مکمل ہم آہنگی تھی۔ جس کی وجہ

سے گھریلو زندگی پُرسکون اور پر امن رہی۔ وہ گھریلو معاملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ کام کاج کرنے سے انہیں کبھی عار نہیں رہا۔ اضطرابی کیفیت کو دبانے اور ذہنی سکون حاصل کرنے کے لئے وہ مے نوشی کے عادی ہو گئے تھے۔ اسی عالم میں وہ بازاری عورتوں کے پاس بھی جاتے تھے۔

مصنف نے جہاں منٹو کی شخصیت کے حسن کو ظاہر کیا ہے وہاں ان کے عیوب کی پردہ پوشی بھی نہیں کی اور کھلے انداز میں ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ مصنف کی منٹو سے قربت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے بہت سی ایسی باتیں بھی معلوم کرلیں جو عام لوگوں کے لئے حیران کن تھیں۔ منٹو جیسے ادیب نے بعض بہت غیر اخلاقی حرکتیں بھی کیں مگر اس کی مجبوریوں کے عذاب پر کسی نے توجہ نہیں دی اور اسے قابل نفرت سمجھا۔ مصنف نے مجبوری کے اس عذاب کو بڑی چابک دستی سے بیان کر کے منٹو کے لئے قاری کے دل میں ہمدردی کے جذبے کو بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جس کے پس منظر میں ہم منٹو کو کبھی انتہائی مایوس و نامراد اور کبھی بے چین و بے قرار دیکھتے ہیں منٹو کے اس خاکے میں ہمیں اس کے بچپن کے حالات' گھر والوں اور والدین کی عدم توجہی اس کے اخلاق' عادات و اطوار' مایوسی و مجبوری اور ایسے بہت سے حالات کا بھی پتا چلتا ہے۔ منٹو کی تحریروں پر بھی اظہار خیال ہونے کے باوجود کہیں کہیں مواد کی کمی اور تشنگی کا احساس ہوتا ہے پھر بھی منٹو پر منٹو جیسے بے باک انداز میں لکھنے والے کی ضرورت تھی جسے ابو سعید قریشی نے بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ جس کے سبب منٹو کی زندگی کے بعض نفسیاتی پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کا بھی موقع ملتا ہے۔

مصنف منٹو کی دوستی میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ ان کی شخصیت نگاری کرتے ہوئے ان کا سا بے باکانہ انداز تحریر بھی اختیار کرلیا۔ بلاشبہ "منٹو شناسی" کے بارے میں یہ قابل قدر تصنیف ہے۔

**منٹو' میرا دوست : محمد اسد اللہ : کراچی : ۱۹۵۵ء**

محمد اسد اللہ کے سعادت حسن منٹو سے قریبی گہرے تعلقات رہے ہیں۔ اردو کے اس اہم افسانہ نگار کی زندگی کے تمام گوشوں کے مطالعہ کے انہیں مواقع حاصل ہوئے ہیں اور ان باتوں سے ان کی اندرونی پسند' ناپسند اور پچھلی زندگی سے بھی روشناسی حاصل کی ہے۔ اس بنیاد پر اپنی تمام تر معلومات کو اپنی کتاب "منٹو' میرا دوست" میں پیش کردیا ہے۔ کتاب اگرچہ مختصر ہے منٹو کو سمجھنے میں بے حد مددگار ہے۔ انہوں نے منٹو کا مطالعہ بحیثیت انسان بھی کیا ہے اور بحیثیت افسانہ نگار بھی۔ ان کے فن اور فکر پر ان کی زندگی کا جو سایہ رہا اس کی بھی وضاحت کی ہے۔ وہ



ایک زود نویس افسانہ نگار تھے۔ پلاٹ مرتب کئے اور ذہن میں کرداروں کا تعین کئے بغیر وہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے اور افسانہ مکمل ہو جاتا۔ فطرتاً" وہ نہایت من چلے' بے باک' مستقل مزاج بلکہ ضدی تھے۔ ان کے افسانوں "بو" اور "دھواں" پر جو مقدمے چلے اس نے ان کے مزاج میں ضد پیدا کردی اور وہ اسی نوعیت کے افسانے لکھنے لگے اگر "نیا قانون" اور "شغو" پر مقدمے قائم ہوتے تو شاید وہ اس نوع کے بے شمار افسانے تخلیق کرجاتے۔ ان کے مشاغل میں مطالعہ' غور و فکر اور شراب شامل تھے۔ ان کے درمیان توازن برقرار نہ رکھنے کی وجہ سے ان کی ذات میں کمزوریاں پیدا ہوئیں۔ یہاں تک کہ شراب میں وہ غرق ہو گئے۔ ایک زمانہ ایسا بھی گزار کہ وہ صرف شراب کے حصول کی خاطر افسانہ لکھتے اسی غیر متوازن حالت نے انہیں شکی بنادیا اور مزاج میں تلون پیدا کردیا تھا بھول جانے کی ان میں عجیب و غریب عادت تھی۔ کبھی تو قریب کی چیزوں' واقعات اور دوستوں کو بھول جاتے اور کبھی برسوں پہلے گزری باتیں پوری تفصیل کے ساتھ یاد رہتیں۔ شراب کے بعد دوست ان کی کمزوری تھے۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا جن کے ساتھ وہ پورے اخلاق اور بے تکلفی سے زندگی گزارتے۔ ان کے بارے میں کسی قسم کا امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ ان کے حلقۂ احباب کا تذکرہ بھی محمد اسد اللہ نے کیا ہے اور بہت سے معروف اور غیر معروف لوگوں سے ان کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے ان سب کے کرداروں اور رویوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے جن لوگوں نے منٹو کو قریب سے دیکھا ہے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ محمد اسد اللہ نے منٹو کو ان کی تمام خوبیوں' خامیوں کے ساتھ اسی طرح پیش کیا ہے کہ وہ محبت کئے جانے کے قابل بن گئے ہیں۔

**مجید لاہوری : شفیع عقیل : کراچی : ۱۹۵۸ء**

شفیع عقیل نے "ایک بات" کے عنوان سے اپنی تصنیف کی نوعیت کو واضح کیا ہے' لکھتے ہیں۔

"یہ کتاب نہ تو باقاعدہ سوانح نگاری ہے اور نہ باضابطہ تنقید' سوانح نگاری میرا منصب نہیں۔ تنقید سے میں نے قصداً" گریز کیا ہے اور کہیں کہیں تنقید یا سوانح نگاری کا رنگ آگیا ہے تو یہ ناگزیر تھا۔ دراصل یہ چند یادیں ہیں۔ یہ ایک تصویر ہے جو صحیح رنگوں اور اصلی خطوط کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کردی ہے اور میں نے ان رنگوں اور خطوط میں مجید لاہوری کی تصویر واضح کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔"(۵)

مجید لاہوری معروف صحافی اور اپنی ذات میں انجمن تھے۔ رسالہ "نمک دان" کی شہرت ان

کی شہرت تھی۔ شفیع عقیل اور مجید لاہوری کی رفاقت طویل عرصے تک قائم رہی۔ اس حوالے سے انہوں نے مجید لاہوری کی ظاہری وباطنی کیفیات اور عادات واطوار کا بھی بغور مطالعہ کیا ہے اور اسے ضبط تحریر میں لائے ہیں۔ طرز تحریر سادہ اور رواں ہے اور مجید لاہوری کی شخصیت کے نقوش کو واضح کرتی ہے۔

**روزگار فقیر : فقیر سید وحید الدین : کراچی - جلد اول ۱۹۶۳ء - جلد دوم ۱۹۶۴ء**

علامہ اقبال کی زندگی کے تمام گوشوں کی تلاش کے سلسلے میں جن لوگوں نے ذاتی معلومات فراہم کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے ان میں فقیر سید وحید الدین کا نام بھی معتبر مانا جاتا ہے۔ علامہ ان کے والد فقیر نجم الدین سے ربط خاص رکھتے تھے اور اکثر ایسی باتیں جن کو منکشف کرنا ضروری خیال نہ کرتے تھے ان سے بھی فقیر نجم الدین کو واقف کروا دیتے تھے انہیں کے ساتھ فقیر وحید الدین ۱۹۲۶ء میں علامہ کے حضور میں پیش ہوئے اس وقت ان کی عمر ۱۴' ۱۵ سال تھی۔ ظاہر ہے اس عمر میں علامہ کے مقام کو سمجھنا اور ان کی سیرت کے پہلوؤں سے مکمل آگاہی حاصل کرنا ممکن نہ تھا اس لئے وہ صرف عقیدت اور تحیّر سے دوچار رہے۔ یہ کیفیات جب ایک بار پیدا ہو گئیں تو پھر زندگی بھر قائم رہیں۔ علامہ کے وقت آخر تک انہیں حضوری کا شرف حاصل رہا۔ اس دوران ان کے مشاہدے میں جو باتیں آئیں انہیں بے کم وکاست اس کتاب میں درج کر دیا ہے۔ جلد اول میں سوا سو سے زائد واقعات مندرج ہیں جو علامہ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان واقعات کو نہ تو تاریخی ترتیب میں بیان کیا گیا ہے اور نہ موضوعات کے تحت بلکہ جیسا کہ فیض احمد فیض کے لکھے ہوئے تعارف میں کہا گیا۔

"اس کی نوعیت ایک سیاح کی ڈائری کی سی ہے جو کبھی کسی دلکش وادی میں سے گزرا ہو اور کئی برس بعد فرصت کے اوقات میں اس حسین سفر کی بسری ہوئی یادوں کو شیرازہ بند کرنا چاہے۔ کسی دلفریب صبح کی ایک جھلک، کسی دلکش شام کا ایک منظر، ہوا میں اڑتا ہوا ایک خزاں رسیدہ پتا یا جنگل میں سر جوڑے ہوئے ہزاروں تناور درخت، گھاس میں جگمگاتا ہوا شبنم کا اکلوتا موتی یا شفق میں ڈوبی کوئی وسیع اور خاردار جھیل، چھوٹی اور بڑی باتیں اس نے بلا کم وکاست لکھ دیا ہے۔" (۶)

اس کتاب کا بنیادی موضوع اقبال، بحیثیت شاعر یا فلسفی نہیں، اقبال بحیثیت انسان ہے۔ اس میں قرآن کے رموز، عشق رسول، شاعری کی افادیت، شعر کہنے کی کیفیت، محفل احباب میں



کبھی خاموشی اور کبھی بذلہ سنجی، گھریلو ماحول، اولاد سے محبت، قوم کی فکر، جلوسوں میں شمولیت اور شعر خوانی، غرض ایک انسان کی حیثیت سے علامہ کی جو مصروفیات تھیں اور زندگی کے بارے میں ان کا جو رویہ تھا ان تمام کا عکس اس میں موجود ہے چونکہ معاملات کا وسیلہ مؤلف کی ذات ہے یا وہ معتبر ذرائع جنہیں علامہ سے قرب حاصل تھا۔ اس لئے ان میں صداقت کی مکمل جھلک موجود ہے۔ حسن عقیدت نے ان میں خاص رنگ بھر دیا ہے۔

پہلی جلد دو حصوں پر مشتمل ہے نقش اول میں افتتاحیہ، تعارف، تبصرہ اور شرف حضوری ہیں۔ اصل موضوع کے بارے میں معلومات نقش ثانی میں ملتی ہیں جس کی مشمولات (۱) واقعات ومشاہدات اور ملفوظات (۲) خاندانی حالات (۳) تصانیف کی مقبولیت (۴) سیرت اقبال کی چند جھلکیاں (۵) تاریخ پیدائش (۶) غلطی ہائے مضامین مت پوچھ - صحت واقعات (۷) حیات اقبال کی اہم یادداشتیں (۸) اصل حالات وفات (۹) مزار کی تعمیر، مصنف نے سوانح سے متعلق چند امور مثلاً خاندان کے حالات اور تاریخ پیدائش وغیرہ کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ آخری موضوعات کا تعلق بھی سوانح سے ہے لیکن یہ محدود صفحات پر کسی خاص ترتیب کے بغیر درج کر دیئے ہیں۔ اصل موضوع یعنی علامہ کی شخصیت اور ان کی سیرت کو اجاگر کرنے کے لئے کتاب کا بڑا حصہ وقف رکھا ہے۔ انہیں پڑھ کر علامہ کی ذات کے ساتھ شناسائی اور قربت کا جو احساس پیدا ہوتا ہے وہی اس کتاب کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اگر واقعات کو اس طرح انتشار کا شکار نہ ہونے دیا جاتا اور انہیں شخصیت وسیرت کے پہلوؤں کے ضمن میں مربوط کر کے لکھا جاتا تو اس کی افادیت میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

جلد دوم ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ اس میں کم وبیش اسی نوعیت کے واقعات ہیں جو جلد اول میں بیان ہوئے۔ انہیں "واقعات وملفوظات" کی سرخی کے تحت یکجا کیا گیا ہے۔ جس کا ایک حصہ مرحوم ممتاز حسن اور علامہ کے تعلقات کے متعلق ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں شیخ اعجاز احمد کے حالات زندگی اور علامہ سے ان کے خصوصی تعلق کا ذکر کرتے ہوئے ان کے حوالہ سے علامہ کی خانگی زندگی کے بارے میں لکھی گئی وہ تمام معلومات بھی دی گئی ہیں جو زیادہ تفصیل کے ساتھ اور مبسوط انداز میں ان کی تالیف "مظلوم اقبال" میں موجود ہیں۔ تیسرے حصے میں علامہ کا وہ کلام شامل ہے جو ان کے کسی مطبوعہ مجموعہ میں نہیں۔ چوتھا باب علامہ کی نایاب تصاویر کا دلکش مرقع ہے جو ۷۰ تصاویر شامل کتاب کی گئی ہیں ان میں سے اکثر کی نوعیت تاریخی ہے۔ جلد دوم کے ابتدائی دو ابواب علامہ کی شخصیت اور سیرت سے متعلق ہیں اور جلد اول کے تسلسل

میں ہیں۔ ان میں اہم اور کار آمد معلومات ہیں۔

فقیر سید وحید الدین نے ان دونوں کتابوں کے ذریعے عقیدت کا نذرانہ غائبانہ طور پر علامہ کے حضور پیش کیا ہے۔ بعض جگہ یہ عقیدت حد سے بھی تجاوز ہوتی نظر آتی ہے۔ بعض واقعات اور تاویلات کے ذریعہ علامہ کے فوق البشر ہونے کا بھی تاثر ملتا ہے۔ دلچسپ انداز بیان اور زبان کی سادگی ان جلدوں کے وصف خاص ہیں۔

## کردار قائداعظم : منشی عبدالرحمان خان : لاہور : ۱۹۷۶ء

مؤلف نے اپنے شوق مطالعہ، ذوق تحریر اور قائداعظم سے حسن عقیدت کی بناء پر یہ کتاب مرتب کی ہے جس میں سوانحی حوالے تو موجود ہیں لیکن یہ مکمل سوانح عمری کی بجائے کردار شناسی کی ایک کوشش ہے۔ مؤلف نے تقریباً "۷۰ کتابوں، رسالوں اور اخبارات سے استفادہ کیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر معتبر اور مستند ہیں۔ ان میں قائد کی شخصیت، سیرت اور سیاسی عمل کے بارے میں جو کچھ تحریر ہوا ان کو بعد غور و فکر سلیقہ وار جمع کردیا ہے۔ کتاب چھ ابواب اور بے شمار ذیلی سرخیوں پر مشتمل ہے پہلا باب "حسن آغاز" بچپن کے حالات و واقعات کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ تعلیم اور بیرسٹری کے زمانے کے کوائف بھی بیان ہوئے ہیں۔ طلب علم کے بارے میں ان کے نظریات اور سیاست کے اصول کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ دوسرے باب "موانعات و مشکلات" میں اس سیاسی فضا کا خاکہ ملتا ہے جو مسلم دشمنی پر منحصر تھا۔ ان نامساعد حالات میں بھی قائد کی ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دیگر نوعیت کی سیاسی سرگرمیوں کو بھی بیان کیا ہے۔ تیسرا باب قائد کے کردار اور سیرت سے متعلق ہے۔ اس میں ان کی معاشرتی زندگی، عادات و اطوار، معمولات، اخلاق و کردار، جادو بیانی، حاضر جوابی، رقیق القلبی، لطف و مزاح اور حب الوطنی کے بارے میں مؤلف نے اپنے وسیع مطالعہ کا نچوڑ درج کردیا ہے کتاب کا یہی حصہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ چوتھے باب میں کانگریس، ہندو قیادت اور انگریز حکمرانوں سے نبرد آزمائی کی تفصیل درج ہے۔ پانچواں باب قیام پاکستان کے بعد کئے جانے والے تعمیری اقدامات سے متعلق ہے اور چھٹا باب مذہب و عقیدت، وقت سفر آخر کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔

بہ حیثیت مجموعی یہ نہ تو تاریخ ہے نہ سوانح اور نہ سیرت نگاری بلکہ ان تینوں کی ملی جلی صورت ہے۔ ان تینوں موضوعات کے حوالے سے مؤلف کو جو مواد حاصل ہوا اسے حسن ترتیب سے یکجا کردیا ہے اور اپنی تجزیاتی کوشش سے جو نتائج اخذ کئے ہیں انہیں پُر زور الفاظ میں



پیش کردیا ہے۔ مؤلف کے قلم میں استدلال کے ذریعہ قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کا ملکہ موجود ہے اور انہوں نے اس کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ موضوعاتی نقطہ نظر سے برصغیر کی سیاسی تاریخ اس میں قائد کا فعال کردار اور ان کی سیرت و شخصیت کے مطالعہ کے خواہشمندوں کو اس سے اچھی خاصی رہنمائی مل سکتی ہے۔

مؤلف نے دیانت داری کا ثبوت اس طرح دیا ہے کہ جن ماخذات سے استفادہ کیا ان کے مکمل حوالے درج کردیئے ہیں اور حوالے کے بغیر کسی امر کو بیان کر کے اس کی تحقیق کا سہرا اپنے سر نہیں باندھا ہے۔

## اقبال کی صحبت میں : ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی : لاہور : نومبر ۱۹۷۷ء

علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں جو کتابیں نیشنل کمیٹی برائے تقریبات نے مرتب کیں اور مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیں ان میں ایک اہم تالیف "اقبال کی صحبت میں" ہے۔ نام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالباً" یہ ان تاثرات پر مبنی ہوگی جو مؤلف نے علامہ کی صحبت سے فیضیاب ہونے سے قائم کئے لیکن حقیقت میں یہ علامہ کی مکمل شخصیت کی آئینہ دار اور کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اس میں مؤلف نے ان تمام گوشوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے جن کے بارے میں اختلاف رہا ہے مثلاً اجداد کا حال، والد کے کوائف، تاریخ پیدائش وغیرہ ان تمام امور پر سیر حاصل بحث کر کے دلائل کے ذریعہ نتائج مرتب کئے ہیں جن سے قاری کی تسلی ہو جاتی ہے مؤلف نے اپنی تحقیق کے ذریعہ معلومات میں اضافے کم کئے ہیں البتہ سابقہ مستند معلومات کو اپنے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر یکجا کرنے اور سلیقہ سے ترتیب دینے میں کامیاب ہوئے ہیں جن سے مؤلف نے استفادہ کیا ہے ان میں خصوصیت سے عطیہ فیضی کی تحریریں نکولاس پی اگنیڈر Nicolos P.Aghnider انجمن حمایت اسلام کی رپورٹیں، ملک راج آنند، فاسٹر، ڈکنسن، ترکی کے دانشور حسین دانش کے تبصرے شامل ہیں۔ سوانحی حالات کے علاوہ علامہ کی تصانیف کے پس منظر اور ان پر تنقیدی جائزے کا اضافہ کر کے تالیف کو زیادہ وقیع بنایا گیا ہے ان کی شاعری کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ وہ اچھے تاریخ گو شاعر تھے اکثر تاریخیں قرآن کے فقرات سے نکالی ہیں۔ مشاہیر عالم جن سے علامہ کے تعلقات رہے جن سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں ایک خوشگوار اور اچھوتا پہلو ہے جو معلومات افزا بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اسکے ضمن میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان سے علامہ کی سیرت کے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو جہاں نعت سننے سے دلچسپی تھی وہیں وہ دلنواز موسیقی کی

محفلوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ فلسفہ و حکمت، فقہ و قرآن پر عالمانہ گفتگو کے ساتھ فقرہ بازی اور لطیفہ بازی کے جوہر لطیف کے بھی حامل تھے۔ مؤلف نے حسن عقیدت کے باوجود اس کا واضح عکس ظاہر نہیں ہونے دیا۔ یہ کتاب اقبالیات اور شخصیت شناسی میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

مجلس کی دیگر مطبوعات کی طرح اس میں بھی چار نوعیت کے اشارے شامل ہیں۔ اشخاص، مقامات و ادارے، کتب، اخبارات و رسائل، مضامین، منظومات کے ہیں جن کی مدد سے شامل جزئیات تک بآسانی رسائی ہو سکتی ہے۔

### منٹو، میرا دشمن : اوپندر ناتھ اشک : الہ آباد : ۱۹۷۹ء

اوپندر ناتھ اشک اردو اور ہندی کے صاحب طرز افسانہ نگار اور ادیب ہیں انہوں نے جس انداز میں منٹو کی شخصیت کا جائزہ لیا اسے ایک مضمون کی صورت میں شائع کیا یہ طویل مضمون رسالہ نقوش میں ۱۹۵۵ء میں دو اقساط میں اس طرح چھپا کہ بعض حصے حذف کر دیئے گئے تھے۔ پہلا حصہ منظر عام پر آنے سے پہلا ردّ عمل یہ ہوا کہ لوگ اس کو منٹو کا دشمن سمجھنے لگے اور اسکے مضمون کا یہ مقصد لیا گیا کہ وہ منٹو کی شخصیت کو عام نگاہوں سے گرانا چاہتے تھے۔ اس ضمن کو اوپندر ناتھ اشک نے اپنے اہتمام میں "منٹو، میرا دشمن" کے نام سے شائع کیا مکمل مضمون کو ایک ساتھ پڑھنے سے ان کا نقطۂ نظر واضح ہو کر سامنے آتا ہے اشک اور منٹو معاصر لکھنے والے تھے، آل انڈیا ریڈیو دہلی اور فلمی دنیا بمبئی میں ان کا ساتھ رہا دونوں میں دوستی اور ذہنی یگانگت کے باوجود نفسیاتی کھنچاؤ رہا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وجوہ منٹو کی حد سے بڑھی ہوئی انا، اپنے آپ کو عظیم ترین افسانہ نگار سمجھنا اور فطری ضد تھے۔ اشک ان کے مداح ہونے کے ناتے ان کے فن کی قدر کرتے اور بعض افسانوں کو اردو ادب کا اعلیٰ ترین سرمایہ سمجھنے کے باوجود منٹو کی ان خصوصیات کی وجہ سے ان سے ٹکرا گئے اس میں بظاہر اشک کو کامیابی ہوئی۔ وہ منٹو کو ایک ایسے کھلاڑی کے طور پر پیش کرتے ہیں جو کھیل میں جانبداری کا قائل ہے وہ جب تک دوسرے کی پٹائی کرتا ہے خوش ہوتا ہے اور فخر سے سربلند رکھتا ہے لیکن جب پٹ جانے کا موقع آتا ہے تو راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے انہوں نے اسی وقت فرار اختیار کی جب اشک کے مقابلہ میں انہیں شکست کا احساس ہوا وہ بمبئی چلے گئے اور خود اشک کو دعوت دے کر وہاں بلوایا فلمی دنیا میں دونوں ساتھ کام کرتے رہے، منٹو کا رویہ مربیانہ اور سرپرستانہ تھا۔ اشک نے برداشت نہیں کیا اور ایک بار پھر انہیں شکست دینے کی ٹھانی تو وہ



پاکستان چلے گئے یہاں تک تو رقابت اور نفسیاتی جنگ کا حال ہے لیکن جب منٹو پر برا وقت پڑا تو اس کے حوالے سے اشک نے اپنے غمناک تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

معاصرانہ چشمک کوئی نئی بات نہیں ہر دور کے شاعروں اور ادیبوں کے درمیان یہ سلسلہ جاری رہا ہے اس کا تجزیہ دوسروں نے کیا ہے کہ کون حق بجانب تھا اور کون نہیں! کس کو شکست ہوئی اور کس نے شکست دی۔ یہ تحریر اس اعتبار سے منفرد ہے کہ ایک فریق نے معرکہ کا حال بیان کیا ہے اگر نقطۂ نظر پیش کرنے اور حالات کا جائزہ میں یک رخی کا الزام لگایا جائے تو بے جا نہیں۔ دنیا میں کون ہوگا جو اپنے موقف کو درست قرار نہ دے اور دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے مخالف کے لئے نیک جذبات کا اظہار نہ کرے اگر فریق ثانی کے طور پر منٹو نے بھی اس بارے میں اظہار خیال کیا ہوتا تو موازنہ اور فیصلہ میں سہولت ہوتی۔

کتاب میں منٹو کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے بلکہ تحریر کو ذاتی تجربات تک محدود رکھا گیا ہے اس لئے اسے شخصیت نگاری یا خاکہ نگاری کا جامع نمونہ نہیں کہا جا سکتا۔ اشک چونکہ صاحب قلم ہیں اس لئے اپنی وکالت کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

### پطرس، ایک مطالعہ : کرنل غلام سرور : راولپنڈی : ۱۹۸۱ء

احمد شاہ بخاری پطرس کی حیات، شخصیت اور ان کے تمام علمی، ادبی اور علمی کارناموں کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی جامعیت کے احساس کے ساتھ کرنل غلام سرور نے یہ کتاب مرتب کی ہے اس میں ان کی مختصر سوانح عمری ہے سیرت اور کردار کا حال ہے۔ ملازمتوں کی تفصیل ہے بحیثیت مزاح نگار، مترجم، ماہر تعلیم، انشاء پرداز، دیباچہ نویس، خطوط نویس، شاعر، ماہر نشریات اور اقوام متحدہ میں نمائندہ ان کی شخصیت اور کارناموں کو مؤثر اور دل آویز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

پطرس اپنی ذات میں انجمن تھے۔ انہوں نے ادب و انشاء، طنز و مزاح اور تنقید عالیہ کے میدانوں میں نام کمایا۔ وہ بلند پایہ عالم، صاحب طرز ادیب، عہد ساز استاد اور سخت گیر منتظم تھے تو حلقہ یاراں میں ہم جلیس، بذلہ سنج، فقرہ باز، بے فکرے بھی تھے۔ ایسی ہمہ جہت شخصیت کے بارے میں وہی لکھنے کا حق ادا کر سکتا ہے۔ جس نے ان کو ہر شعبہ میں قریب سے دیکھا ہو کرنل غلام سرور کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے اس لئے ان کی شخصیت کی صورت گری میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

یوں تو تصنیف متعدد موضوعات پر ہے لیکن غالب عنصر سیرت کے بارے میں ہے مصنف نے

شخصی معلومات کے علاوہ پطرس کے ہم نشینوں' دوستوں اور واقف کاروں کے بیانات کو شامل کر کے ان کی سیرت کے ہر ہر پہلو کو واضح کیا ہے ان تمام بیانات کی روشنی میں جو شخصیت سامنے آتی ہے وہ انگریزی میں کمال پیدا کرنے کے باوجود انگریز زدہ نہ تھی۔ (۷) وہ پورے "صاحب بہادر" دکھائی دیتے تھے ان کی وضع قطع' ان کا لباس' ان کے اٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے' کھانے پینے' باتیں کرنے میں یورپین انداز جھلکتے تھے لیکن ان کی انگریزیت ان کی مشرقیت کے تابع نظر آتی تھی۔ ان کی مشرقی مزاجی کو دیکھنا ہو تو انہیں گھر کی چار دیواری میں دیکھئے۔ (۸) تحریر اور تقریر میں پھلجھڑیاں چھوڑتے تھے۔ سنجیدہ اور گمبھیر مسائل کو بھی آسان بنا کر پیش کرتے تھے مصنف نے اس صفت پر بھی زور دیا ہے کہ وہ بظاہر غیر سنجیدہ ہونے کے باوجود کام کے دھنی تھے کام شروع کرنے سے قبل منصوبہ بندی' مزاحمتوں کے امکانات اور ان سے نمٹنے کا جائزہ لیتے اور جب ہر طرح سے مطمئن ہو جاتے تو تیز رفتاری سے منصوبے کو مکمل کرتے اس حوالہ سے مصنف نے لکھا ہے کہ

"انہوں نے بے چین طبیعت پائی تھی۔ ان کا دماغ اکے جسم اور ان کا جسم ان کے دماغ سے زیادہ تیز کام کرتا تھا۔" (۹)

انہیں اپنی قوت فیصلہ پر اعتماد تھا اس کے باوجود دوسروں سے مشورہ لینے کو کسر شان نہیں سمجھتے تھے اور ہر مشورے کا فراغ دلی سے جائزہ لے کر قبول یا مسترد کرتے تھے۔

مصنف نے ان کی تقاریر' مباحثوں اور نجی گفتگو کے حوالے سے ان کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کی مثالیں پیش کی ہیں جو ان کی روز مرہ زندگی میں نظر آتی ہیں وہی ان کی تحریروں کی شان ہیں۔ مصنف نے بھی ان الفاظ میں ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

"پطرس کی دنیا محدود نہ تھی۔ ان کا مزاج مشرقی' ذہن مغربی اور طرز فکر عالمگیر تھا۔" (۱۰)

یوں تو اس کتاب میں پطرس کی ادبی خدمات کا جائزہ بھی شامل ہے اور ان کی تحریروں کا انتخاب بھی لیکن کتاب کا جاندار حصہ وہ ہے جس میں مشاہدہ' دوسروں کے بیانات اور پطرس کی تحریروں سے شخصیت کے خدوخال' رنگ اور روپ تلاش کئے ہیں انہیں کمال فن کاری سے کاغذ پر بکھیر دیا ہے دلچسپ شخصیت اور دلنشین انداز بیان نے مل کر دو آتشہ کا کیف پیدا کر دیا ہے۔ اتنی جاندار اور جامع خاکہ نگاری کے کم نمونے اردو ادب میں ملیں گے۔ اس لئے سید ضمیر جعفری کو اعتراف کرنا پڑا کہ "پطرس کی اتنی مربوط کہانی' اس کی ہمہ جہت شخصیت کی اتنی قد آور تصویر..... ایک ہی فریم میں..... شاید اس سے پہلے نہ دیکھنے میں آئی ہو۔" (۱۱)



## بابائے اردو کی کہانی' ان کے معتمد کی زبانی : بشیر احمد قریشی ہاپوڑی
## کراچی : ۱۹۸۳ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ہمہ گیر شخصیت کے متعدد پہلو ہنوز تحقیق طلب ہیں۔ ان کی نجی زندگی پردۂ اخفا میں ہے۔ بشیر احمد قریشی ہاپوڑی ۱۴ برس کی عمر میں ان کے ہاں ملازم ہوئے اور آخری دم تک گھریلو معاملات میں معتمد خاص بنے رہے۔ چونکہ ۱۳ برس وہ بابائے اردو کے ساتھ شب و روز رہے اس لئے وہی ان کے خانگی حالات سے بخوبی واقف ہو سکتے ہیں۔ بشیر احمد قریشی نے "بابائے اردو کی کہانی' ان کے معتمد کی زبانی" لکھ کر اہم انکشافات کئے ہیں اس کتاب کے بارے میں افسر امروہوی کی رائے ہے کہ

"ابھی تک ایسی کوئی تصنیف شائع نہیں ہوئی تھی جو ان کے ذاتی مشاغل اور پرائیویٹ مصروفیات' بے تکلف دوستوں کی ملاقاتوں اور ان کے رجحان طبع اور افتاد مزاج' عادات خصائل کا احاطہ کرتی ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کمی ان کے سب سے قدیم معتمد خادم بشیر احمد صاحب نے جو چودہ سال کی عمر سے آخر تک سائے کی طرح ان کے ساتھ رہے۔ اپنا پورا حق ادا کر دیا ہے۔" (۱۲)

مصنف کا مقصد شخصیت نگاری کے فن کے تقاضوں کو مد نظر رکھ کر اپنے خیالات کو پیش کرنا نہیں رہا۔ انہوں نے کتاب کو یادداشتوں کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ روز اول سے روز آخر تک کی جتنی باتیں ان کی یادوں میں محفوظ رہیں انہیں قرطاس ابیض پر منتقل کر دیا ہے۔ یہ ایسی یادداشتیں ہیں جن کو پڑھ کر بابائے اردو کی گھریلو زندگی ہی نہیں بلکہ ان کے اوصاف اور خصائل سامنے آجاتے ہیں ان کی نفاست پسندی' کام کی لگن' مناظر فطرت کے حسن سے لگاؤ' جانوروں سے محبت' انسان دوستی اور درگزر کی صفات کی تائید میں متعدد واقعات دائرہ تحریر میں لائے ہیں جہاں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ ایک بار ناشتہ کے لئے نہاری تیار کرنے کی فرمائش بشیر احمد قریشی پوری نہ کر سکے اور وقت گزر جانے کے بعد تک سوتے رہے تو اس حکم عدولی پر بابائے اردو بے قابو ہو گئے۔ حد سے بڑھ کر سزا دی۔ نکل جانے کا حکم دیا۔ واپسی کی رقم جیب میں ڈال دی لیکن مصنف نے ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ اپنا کام کرتے رہے اور بابائے اردو نے خاموشی سے درگزر بھی کر دیا۔ ان سے کوئی صفائی بھی نہیں مانگی۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بابائے اردو اعلیٰ ظرف تھے۔ وقتی طور پر حد سے زیادہ غصہ بھی ظاہر کرتے اور بعد میں غلطی کو بغیر معذرت کے معاف بھی

کر دیتے۔

مصنف کی ذات سے بابائے اردو کا خاص تعلق اس بناء پر بھی تھا کہ وہ اچھے کھانوں کے رسیا تھے اور یہ اچھے کھانے پکانے میں ماہر بابائے اردو انہیں سیر اور سفر میں ہمراہ رکھتے تھے۔ اس حوالے سے مصنف نے ان مقامات کا ذکر اور وہاں کی مصروفیات کا حال بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کے ہاں ریاست حیدر آباد کے امراء' عمائدین' ادیب' شاعر' جامعہ کے طالب علم سب ہی آیا کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ان کا رویہّ یکساں ہی رہتا تھا۔ نہ وہ کسی کے آگے جھکتے اور نہ کسی کو جھکانے کی کوشش کرتے۔ کم تر درجہ کے لوگوں کا خاص خیال رکھتے۔ ملازمین کی ضروریات کو پورا کرتے' طالب علموں کی رہنمائی اور مدد سے کبھی گریز نہیں کرتے۔ ان کے ہر کام میں نفاست کا پہلو ہوتا چمن بندی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ غرض کہ گھر کے ماحول کی ہر چھوٹی اور بڑی اہم اور غیر اہم بات کا اس کتاب میں ذکر حسب موقع موجود ہے۔

یہ اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہے۔ جس طرح باسول نے جانسن کی رفاقت کا حق ادا کیا تھا اور اس کے حالات قلمبند کئے تھے اسی طرح بشیر احمد قریشی نے بھی حق رفاقت اور حق تحریر ادا کیا ہے۔

تصنیف ہر تصنع اور لفظی شعبدہ بازی سے خالی ہے۔ مصنف کا رجحان اپنے ہیرو کی اس تصویر کو لفظوں میں بیان کرنے کا ہے جو ان کے دل پر نقش ہے۔ مصنف کے مزاج اور تحریر کی سادگی نے ان کا ساتھ دیا ہے اور بابائے اردو کے صحیح خدوخال محفوظ ہو گئے ہیں۔

**اقبال درون خانہ : خالد نظیر صوفی : لاہور : طبع اول : ۱۹۳۹ء طبع دوم ۱۹۸۳ء**

علامہ اقبال کی زندگی اور شخصیت پر بے شمار کتابیں اس طرح لکھی گئی ہیں کہ مصنفین نے اپنے پیشروؤں کی تحریروں سے اخذ و استفادہ کیا اور اس میں دو ایک واقعات یا روایات کا اضافہ کر دیا ہے۔ ایسی کتابیں برائے نام ہیں جو تحقیق کی جانفشانیوں کی حامل ہوں اور تمام تر تازہ مستند معلومات کی حامل ہوں۔ ایسی معدودے چند کاوشوں میں "اقبال درون خانہ" بھی ہے۔ اس کے مصنف علامہ کے خاندان کے فرد ہیں ان کی والدہ مرحومہ وسیمہ مبارک علامہ کی حقیقی بھتیجی تھیں۔ جنہیں علامہ نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ بچپن سے شادی تک وہ علامہ کے ساتھ رہیں۔ علامہ کو ان سے جو محبت تھی اس کی بناء پر وہ بیشتر وقت ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ بچپن کی دھندلی یادوں کے علاوہ زمانہ شعور کی یادداشتوں کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا۔ انہیں کے



صاحبزادہ' خالد نظیر صوفی نے قبل اس کے کہ یہ یادداشتیں ان کی والدہ کے ذہن سے اتر جاتیں انہیں جمع کرنے کی کوشش کی۔ محترمہ وسیمہ مبارک کے علاوہ بھی خاندان کے دیگر بزرگ حضرات سے جنہیں علامہ کے حالات کا علم تھا صوفی صاحب مستفیض ہوئے۔ اس لئے حالات و واقعات کی بہت سی فراموش کردہ کڑیوں کو دریافت کر لیا ہے۔ ان سے علامہ کی نجی زندگی پر سے پردے ہٹ گئے ہیں ان کی سیرت و کردار کے نقش کتاب کے آئینے میں واضح طور سے نظر آنے لگے ہیں۔ جن بزرگوں سے حالات معلوم کئے ہیں ان سب کے رویہّ اور لب و لہجہ میں کہیں بھی ان کی اپنی "انا" نظر نہیں آتی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعات علامہ کی سیرت کو پیش کرنے کے لئے بیان کئے گئے ہیں اپنی ذات کی نمائش کے لئے نہیں۔

کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان "سرور رفتہ" ہے اسی میں علامہ کے گھریلو حالات اور عادات و خصائل بیان ہوئے ہیں۔ ان میں زیادہ تر کی راوی وسیمہ مبارک ہیں۔ مؤلف نے ان بیانات کا تجزیہ کر کے علامہ کے کردار کے پہلوؤں کی نشاندہی بھی کر دی۔ دوسرے باب "دانائے راز" میں گھریلو زندگی کے روز مرہ واقعات میں چند کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے باب "حیات جاوید" میں خاندان کے افراد محترمہ وسیمہ مبارک' مؤلف کے والد نظیر صوفی' مؤلف کی خالہ (عنایت خالہ) علامہ کی ہمشیرہ (محترمہ کرم بی بی) مؤلف کے ماموں (مختار) کے وہ خواب درج کئے ہیں جو ان خواتین و حضرات نے علامہ کی وفات کے بعد دیکھے۔ ان میں انہوں نے علامہ کو ملکی حالات کے پس منظر میں مختلف کیفیات میں دیکھا۔ گویا بعد وفات بھی ان کا روحانی تعلق اس ملک سے باقی رہا اور یہاں وقوع پذیر ہونے والے ہر واقعہ پر ان کی روح تڑپ جاتی تھی۔ اگلے باب "نوادر" میں علامہ کی طالب علمی کے زمانے کی نصابی کتابوں پر لکھی گئی عبارتوں کا حال بیان ہوا ہے یہ سب کتابیں برسوں گزر جانے کے باوجود بھی محفوظ تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب محترمہ فاطمہ جناح کی نذر کی گئی تھی "اقبال منزل" کے زیرعنوان اس مکان کے بارے میں جملہ تفصیلات اکٹھا کر دی گئی ہیں جس میں علامہ کی ولادت ہوئی اور مختلف دور میں اس مکان کے کتنے حصے رہے اور کب کب ان میں اضافے ہوتے رہے اس کی بھی وضاحت موجود ہے۔ اپنی تحقیق کی روشنی میں مؤلف نے ثابت کیا ہے کہ ذکر اقبال میں مولانا سالک نے جس کمرہ کو علامہ کی جائے ولادت بتایا ہے غلط ہے کیونکہ وہ کمرہ مکان کے اس حصے میں واقع ہے جو ۱۸۹۲ء کے بعد خرید ا گیا ضمناً "۱۹۴۴ء میں قائد اعظم اور ۱۹۵۲ء میں محترمہ فاطمہ جناح کی تشریف آوری کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ "بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی" کے زیر

ان کی شخصیت اور تخلیقی کارناموں کو اس قدر توجہ نہیں دی جن کے وہ مستحق تھے۔ نظیر صدیقی عرصہ دراز تک سابق مشرقی پاکستان میں ان کے ساتھ رہے۔ انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع حاصل رہا۔ ان کی شخصیت کے جو روپ انکے سامنے آئے انہیں نہایت خوبی اور غیر جانبداری سے بیان کردیا ہے۔ کتاب میں شامل مضامین میں خصوصیت سے ابتدائی چند مضامین' مختصر حالات زندگی' قلمی تصویر اور شادانی کی بدیہہ گوئی ان کی ذاتی خصوصیات' صفات اور صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر لکھے گئے۔ نظیر صدیقی کے بیان کے مطابق یہ مضامین اس وقت لکھے گئے جب ان کے اور شادانی کے درمیان خوشگوار تعلقات تھے۔ لیکن بعد میں ان کے درمیان اختلاف اتنے بڑھے کہ تعلقات منقطع ہوگئے۔ یہ نظیر صدیقی کی انصاف پسندی ہے کہ انہوں نے باوجود اس کے مضامین میں ردوبدل ضروری نہیں سمجھا کیونکہ ذاتی معاملات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو شخصیت کی خوبیوں یا خامیوں میں کسی کمی بیشی کا امکان نہیں ہوتا۔ وہ اگر چاہتے تو ذم کے پہلو تلاش کر کے مضامین میں اضافہ کرسکتے تھے۔ انہوں نے شخصی سطح سے بلند ہو کر شادانی کی قلمی تصویر حقیقت پسندانہ پیش کی ہے۔ ان کی تحریر کے مطابق شادانی ایک خوش اخلاق' خوش گفتار اور مجلس آراء انسان تھے وہ ہر کسی سے گھل مل جانے کے قائل تو نہ تھے لیکن بہت سے معاملات میں حتی المقدور دوسروں کے کام آتے تھے۔ وہ تکلف کے قائل نہ تھے لیکن بے تکلفی میں حد ادب کے قائل ضرور تھے۔ انہیں ہنسنے ہنسانے سے دلچسپی تھی لیکن سنجیدگی اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ان کے معمول تھے۔ دوسروں کی اہمیت تسلیم کرتے تھے لیکن اپنی اہمیت تسلیم کرانے کے درپے نہیں ہوتے تھے۔ اردو اور فارسی میں تحریر اور تقریر کے دھنی تھے۔ لوگ خصوصاً طلبہ ان کے پاس طیش اور غصہ کے عالم میں آتے۔ ان کی باتیں سن کر سر جھکاتے اور خاموشی سے چلے جاتے۔ وہ خود مشتعل نہیں ہوتے تھے مگر مشتعل لوگوں کو ٹھنڈا کرنے کے فن سے واقف تھے۔ فن شاعری پر انہیں کامل عبور حاصل تھا۔ جس بحر اور جس زمین میں کہا جائے وہ فی البدیہہ شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ ایک مضمون کو سو رنگ میں باندھنے میں ماہر تھے شعر گوئی ان کے لئے ایک میکانکی عمل تھا اور وہ اس پر کامل عبور رکھتے تھے۔ ان تمام صفات اور خصوصیات کی وضاحت واقعات کے حوالے سے کی ہے۔ نظیر صدیقی نے اپنے ممدوح کی شخصیت کا ہر پہلو سے جائزہ لیا ہے اور ان کی وضاحت و پیش کش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔



عنوان شامل باب میں ان روایات کی تکذیب کی ہے جو علامہ سے منسوب اور ان کی سیرت کے داغ شمار ہوتے ہیں جیسے ان کی شراب نوشی' تعیش پسندی' طوائف کا قتل' عطیہ فیضی سے معاشقہ وغیرہ اور ان کے بارے میں علامہ سے تقرب رکھنے والے تمام بزرگوں سے آراء لی گئیں۔ ان سب نے روایات کے من گھڑت ہونے پر صاد کیا ہے۔ مؤلف نے ایک باب علامہ کی تاریخ پیدائش کی دریافت حال کے لئے مختص کردیا ہے ان کا ماخذ سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کا پیدائش و اموات کا رجسٹر ہے۔ اس کے اندراجات کا تجزیہ کر کے علامہ اور ان کے بھائی اور بہنوں کی تاریخ پیدائش کا تعین کیا ہے اور اس ریکارڈ کو مستند ماخذ قرار دیتے ہوئے تاریخ پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء بتائی لیکن بعد کے کئی محققین نے اسے مسترد کردیا ہے ان کے خیال میں درجہ استناد اس تحریر کو حاصل ہے جو علامہ نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے ابتدائیہ میں درج کیا ہے۔ علامہ کی تحریر کردہ تاریخ ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ (مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء) ہے اسی کو جاوید اقبال نے بھی درست قرار دیا ہے اور حکومت پاکستان نے بھی اس کے صحیح ہونے کو تسلیم کیا ہے۔

آخری باب "انکشاف حقیقت" میں ڈاکٹر عبدالقیوم ملک اور محترمہ حجاب امتیاز علی تاج کی یادداشتیں بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے انکشاف کیا ہے کہ علامہ کی زندگی کے آخری لمحات میں صرف وہ اور علی بخش ان کے پاس تھے۔ تیسرا کوئی نہ تھا اس طرح انہوں نے متعدد حضرات کے بیانات اور ان کی بیان کردہ روایات کو جھٹلایا ہے جو علامہ کے آخری وقت ان کے قریب ہونے کے دعوے دار تھے۔ محترمہ حجاب کو کم سنی میں علامہ سے شرف نیاز حاصل ہوا تھا اس وقت کی دھندلی یادوں کو تازہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو بچوں سے بے پناہ محبت تھی اور وہ انہیں قوم کا گراں قدر سرمایہ سمجھ کر ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔

خالد نظیر صوفی نے اپنے نانا کی سیرت مرتب کرتے ہوئے محنت' جستجو اور جانکاہی سے کام لیا ہے جہاں سے بھی مستند حالات کی فراہمی کا امکان تھا حاصل کی ہیں۔ دوسروں کے بیانات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہیں بھی حسن عقیدت سے کام نہیں لیا ہے گراں بہا معلومات' سنجیدہ عبارت اور بامقصد تحریر نے کتاب کو وقیع بنادیا ہے۔ مقام شکر ہے کہ برصغیر کے مسلمان زعماء اور اردو فارسی کے شاعروں میں ایک ہستی تو ایسی ہے جس کی زندگی کے شب و روز سے آگاہی کے لئے کدو کاوش کا ایسا سلسلہ جاری ہے۔

**ڈاکٹر عندلیب شادانی' ایک مطالعہ : نظیر صدیقی : کراچی : ۱۹۸۵ء**

ڈاکٹر عندلیب شادانی اردو کے شاعر' محقق اور بلند پایہ نثر نگار تھے۔ ارباب علم و فن نے

**اردو کا ادیب اعظم، مولانا عبدالماجد دریابادی : مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری : کراچی : فروری : ۱۹۸۶ء**

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی ہم عصر بھی تھے اور اشتراک ذوق بھی رکھتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے درمیان اختلافات بھی رہے۔ دونوں کی دنیا الگ الگ تھی۔ اسباب ایسے رہے کہ لگاؤ کی بجائے لاگ کے امکانات زیادہ تھے اور ایک زمانہ میں جب کہ ترجمہ اصطلاحات کے حوالے سے دونوں بزرگوں کے مابین تحریری معرکہ آرائی رہی جو لاگ کی چنگاری اڑتی دکھائی دی جو وقت کے ساتھ بجھ گئی اور باہم احترام کا رشتہ قائم ہو گیا۔ مولانا دریابادی نے "صدق جدید" میں ایسی بہت سی تحریریں چھوڑی ہیں جو مولانا آزاد سے متعلق ہیں اور ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کن خوبیوں کے مالک تھے ڈاکٹر ابو سلمان نے ان تمام تحریروں کو یکجا کر کے اردو کا ادیب اعظم کے نام سے شائع کیا ہے۔ اگرچہ کتاب کے نام کو مندرجات سے صرف اس حد تک مناسبت ہے کہ مولانا دریابادی کے ایک مضمون کا عنوان یہی ہے لیکن دیگر مضامین اور شذرات کا تعلق ان کی ادبیات کے علاوہ بعض اہم پہلوؤں سے ہے۔ اور زیادہ تر مضامین ان کی شخصیت کے بارے میں ہیں۔ ایک تو مولانا آزاد کی شخصیت کا حسن دوسرے مولانا دریابادی کا حسن بیان، ان میں سے بعض مضامین کو ادب عالیہ کے زمرہ میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مولانا آزاد کی نج کی محفلوں میں "ہے زباں میری ابر گہربار" کا نمونہ تھے تو عالم جوش و خروش میں "ہے قلم میرا تیغ جوہر دار" کی مثال۔ ہر دو حالتوں میں "قلم یا زبان قابو سے باہر نہیں" نطق و نفس پر ہمیشہ جیسے پہرے لگا رکھے ہوں۔ مخالفین کے جلسوں کو مخاطب کرتے نہ کہیں تکفیر نہ تفسیق، نہ تعرض نہ تشنیع، نہ تضحیک نہ سفیع، شروع سے آخر تک بس تفہیم، تذکیر تشریح، تقریر، دلائل و حقائق کے رنگ میں رنگی ہوئی معقولیت اور سلامت روی کے پھولوں سے گندھی ہوئی (۱۳) ان کے مجموعہ کمالات ہی کے حوالے سے ان کی نگارشات کی دل آویزی، دینی معلومات کی فراوانی، تفسیر و حدیث، فقہ و کلام پر عبور کے ساتھ فرنگی فلسفہ و عقلیات سے واقف، شرافت نفس، خود فنائی کا تجزیہ، حقیقت پسندانہ انداز میں کیا ہے۔ اگرچہ شخصیت کے پہلو ان مضامین میں بکھرے پڑے ہیں۔ وہ مربوط نہیں، مرتب نہیں لیکن اس تشنگی کو مٹانے کے لئے کافی ہیں جسے ماہر ابوالکلامیات مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہر مضمون، مختصر سے مختصر شذرہ بھی سیرت کے کسی نہ کسی پہلو کی عظمت کے اعتراف میں ہے۔ حق یہ ہے کہ بڑے



آدمی کی کہانی بڑے آدمی کی زبانی ہی بصیرت افروز ثابت ہوتی ہے۔

**مولانا شبلی نعمانی، ایک مطالعہ : مفتون احمد : کراچی : ۱۹۸۶ء**

مفتون احمد نے جو خانوادۂ شبلی سے تعلق رکھتے ہیں مولانا کے حالات اور خدمات کے تعارف کے لئے جو مضامین لکھے وہ "مولانا شبلی نعمانی، ایک مطالعہ" میں شامل ہیں۔ ان میں جو مضامین "علی گڑھ سے پہلے اور بعد، شخصیت کی جھلکیاں، سیاسی رجحانات، مولانا شبلی کے خیالات کی اہمیت کے زیر عنوان لکھے گئے ہیں مولانا کی شخصیت اور ان کے انداز فکر کے گہرے مطالعہ پر منحصر ہیں۔ خاندانی لگاؤ کے باوجود مصنف نے بے لاگ تبصرے کئے ہیں۔ مولانا کے رویے میں قدیم اور جدید کشمکش تھی اسے بڑی خوبی، صراحت اور غیر جانبداری سے پیش کیا ہے۔ مصنف کی تحریر صاف، سادہ اور رواں ہے۔ وہ ہر موقع پر اختصار سے کام لیتے ہیں اس کے باوجود تشنگی باقی نہیں رہنے دیتے۔ ان کی تحریریں مقصدی ہیں۔ علمی اور معروضی شان کی حامل ہیں۔ "شبلی فہمی" کے ضمن میں یقیناً" انہوں نے اضافہ کیا ہے۔

**عروج اقبال : ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی : لاہور : ۱۹۸۷ء**

کسی شخصیت کے فن اور سیرت کے درمیان رابطہ کو سمجھے بغیر نہ تو شخصیت شناسی کا حق ادا ہو سکتا ہے اور نہ فن کے مرتبہ کا تعین ممکن ہے۔ یہ ایک عالمانہ طرز مطالعہ ہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے عروج اقبال میں یہی طرز اختیار کیا ہے۔ ان کا حقیقی موضوع اقبال کی شخصیت اور فکر و فن کا ارتقا (۱۸۷۷ء تا ۱۹۰۸ء) ہے۔ زمانہ کے محدود اور مختصر ہونے کے باوجود اس پر اتنی سیر حاصل بحث کی گئی کہ تین ابواب ۴۳۲ صفحات پر محیط ہیں۔

ابتدا میں مصنف نے اقبال کی شخصیت اور سیرت کی بنیادی تشکیل کے محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے اجداد، خاندان کے ماحول اور دیگر امور کی تفصیل دی ہے۔ اس میں بہت سے نامعلوم گوشے منظر عام پر آئے ہیں۔ دوسرے باب میں ان خارجی اثرات کا ذکر کیا ہے جن کی بناء پر اقبال کی شخصیت کی ارتقائی منازل کی بھرپور تفصیل پیش کی ہے اور آخری باب میں ان کے انقلابی تبدیلیوں کے محرکات کی وضاحت کرتے ہوئے فنی عروج اور تکمیل ذات کی نشاندہی کی ہے۔

"عروج اقبال" مطالعہ اقبال کے ضمن میں ایک طرز نو کی نمائندہ تصنیف ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شخصیت کی تکمیل کے مراحل کے ساتھ ساتھ فن بھی عروج حاصل کرتا جاتا ہے۔ اس طرح فن اور شخصیت کو ایک دوسرے سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ متعینہ

زمانہ کی حد تک تصنیف جامع ہے لیکن حقیقی صورت حال کی وضاحت کے لئے اس کے بعد تیس سال کا جائزہ بھی اسی طرح لیا جانا چاہئے۔

## یادوں کے چراغ : میاں عبدالعزیز : کراچی : ۱۹۸۸ء

مولانا کرم الٰہی نسبتاً کم معروف سماجی کارکن تھے۔ انہوں نے اصلاح معاشرہ کی تحریک کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنالیا تھا اور اسی میں شب و روز مصروف رہتے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر نے "سرگزشت مجاہدین" کی چوتھی جلد میں ان کا ذکر کیا ہے اور حالات زندگی مختصراً تحریر کئے ہیں۔ مصنف صاحب سوانح کے صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے والد کی عقیدت کی بناء پر نہیں بلکہ ان کے کارناموں کے پیش نظر ان کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے "یادوں کے چراغ" تصنیف کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

"اس سرگزشت سے میرا مقصد مرحوم کی تعریف وتوصیف کرنا نہیں بلکہ آپ کے مقصد حیات کو ابھارنا ہے۔ لفظوں کی سجاوٹ اور بناوٹ سے نہیں بلکہ آپ کے عمل کی روشنی میں۔" (۱۴)

مصنف کو اکثر سوانح نگاروں سے شکایت ہے کہ اس فن کو عقیدت واحترام سے متاثر کرتے ہیں۔ وہ "نفس مضمون کو عقیدت کی بناء پر القاب اور آداب کی نذر کردیتے ہیں اور اصل مقصد گنوا بیٹھتے ہیں۔" (۱۵)

مصنف نے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے والد کی سرگزشت نہایت سیدھے الفاظ میں تحریر کی ہے تاکہ اصل مقصد پورا ہو اور ان کے طرز عمل اور طرز زندگی سے دنیا روشنی حاصل کرسکے۔

میاں کرم الٰہی کا تعلق ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ کے ایک گاؤں قادر والا سے تھا۔ ابتدائی تعلیم فتح گڑھ میں اور اعلیٰ تعلیم اورنٹیل کالج میں پائی۔ تحصیل علم سے فارغ ہوئے تو فیروز پور گورنمنٹ ہائی اسکول میں بطور عربی معلم ملازم ہوگئے۔ مختلف اسکولوں میں پڑھانے کے بعد ۱۹۳۲ء میں ریٹائرڈ ہوگئے۔

وہ ملازمت محض ذریعہ معاش کی خاطر نہ کرتے تھے بلکہ ان کا بڑا مقصد عربی زبان کی تعلیم کو عام کرنا تھا جس سے قرآن وحدیث کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ انہیں قرآن پڑھنے پڑھانے، سمجھنے سمجھانے کا خاص شوق تھا۔ وہ قرآن کے معنوں میں تدبر اور تعقل پر زور دیتے تھے۔ نماز کے سختی سے پابند تھے۔ تہجد اور اشراق بھی بالعموم پڑھتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے اوصاف میں رزق



حلال پر گزارہ کرنے، کارخیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے، اسلام اور جہاد کی تبلیغ کرنے، ہر انسان سے حسن سلوک، شاگردوں کی تربیت پر خصوصی توجہ دینا بیان کئے گئے ہیں۔

یہ تصنیف اس اعتبار سے اہم ہے کہ انسان کی بزرگی اور عظمت صرف مشاہیر کا حصہ نہیں۔ کم معروف لوگ بھی اعلیٰ صفات سے مزین ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے جن مقاصد کا تعین کرتے ہیں انہیں شہرت اور صلہ کی پروا کئے بغیر بھی خلوص نیت اور محنت سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے سیکڑوں گمنام انسان گزرے ہوں گے جو کردار اور اوصاف کے لحاظ سے نمونہ تھے لیکن ہماری کتابیں ان کے اذکار سے خالی ہیں۔ یہ روش المیہ بھی ہے اور لمحۂ فکریہ بھی مصنف نے اس طرح میاں کرم الٰہی کا تعارف کروایا ہے جس طرح مولوی عبدالحق نے نورخان کا کروایا تھا۔

میاں عبدالعزیز اہل علم ہیں اہل قلم نہیں۔ ان کے پیش نظر الفاظ کے ذریعے شخصیت کی تعمیر نہیں بلکہ انہوں نے واقعات کے ذریعہ سیدھے سادے انداز میں شخصیت کے اوصاف کو اجاگر کیا ہے۔ کتاب بہت سی خوبیوں کی حامل ہے مگر اس کی ایک بات کھٹکتی ہے۔ اکثر مواقع پر واقعات یا آراء دیتے ہوئے کسی نام کا حوالہ شامل نہیں ہے "ایک بزرگ نے کہا" "ایک واقف کار کا کہنا ہے" جیسے انداز بیان سے صداقت میں شبہ پیدا ہونے کی گنجائش رہ جاتی ہے۔

## علامہ سید سلیمان ندوی کی شان جامعیت : قاضی عبدالحنان : کراچی جون ۱۹۹۰ء

قاضی عبدالحنان کی کتاب کے نام سے ہی اس حسن عقیدت کا اظہار ہوتا ہے جس سے مصنف سرشار ہے۔ انہوں نے علامہ مرحوم کی سوانح عمری "انوار سلیمانی" کے نام سے بھی تصنیف کی تھی جو سوا چھ سو سے زائد صفحات پر محیط تھی۔ اس کی ضخامت اور علم وادب سے عدم دلچسپی کی وجہ سے شائع نہ ہو سکی۔ اس لئے نسبتاً کم ضخیم کتاب مرتب کی ہے جس میں "انوار سلیمانی کے آخری باب کو بڑھا اور پھیلا کر اس کا نچوڑ اور لب لباب بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔" (۱۶)

کتاب کے ابتدائی چند صفحات میں "سوانحی جھلکیاں" مرتب کی ہیں۔ دیگر حصے ان کے فضائل وسیرت کے بارے میں ہیں۔ اس میں غالب رجحان علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرت، اوصاف، کردار اور خصوصیات کو اجاگر کرنے کا ہے۔ ان کے حسن خطابت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"ان کی تقریر کا غبارہ تالیوں کی گونج، نعروں کے زور اور احسنت و مرحبا کے شور کے سہارے بلند نہیں ہوتا تھا۔ اس کی قوت محرکہ ان کا حسن استدلال اور سوز دروں ہوتا تھا۔ ان کے خطبات کا زیر و بم سامعین کے موڈ کے مد و جزر کے تابع نہ ہوتا تھا بلکہ اس کے پیچھے "کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق" کا اصول کار فرما ہوتا تھا چونکہ وہ عوامی مقرر نہ تھے۔ اس لئے وہ عام تقریری حربے، ادعا، تحکم، الفاظ کے بے جا تال و سر، جسم کی اداکارانہ اچھل کود، گلے کی بے ضرورت چیخ و پکار اور سوقیانہ ظرافت کے بل بوتے پر اپنی تقریر کی عمارت تعمیر کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ ان کا بھروسا دلائل کے استحکام، گفتگو کے ربط و تسلسل، اپنے موقف کی صحت، اپنی علمیت و تاریخیت، سخن ہائے دل نواز اور سوز حرارت ایمانی پر ہوتا تھا۔" (۱۷)

اس طرح ممدوح کے دیگر اوصاف و خصوصیات کو زور بیان کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ ان اوصاف میں ان کے "بہت بلند پایہ عالم دین بلکہ شمس بازغہ علم" ہونے، ایک مثالی شخصیت ساز، بے مثل ادارہ ساز، ادیب شہیر، عربی کے ادیب، شاعر اور مقرر، بے مثل سیرت نگار، مورخ عظیم، جہاں دیدہ جغرافیہ دان، دلکش سیاحت نگار، بلند پایہ مقدمہ نگار، محقق دوران، نقاد زمان، لاجواب صحافی ہونے کے دعوؤں کو دیگر اہل علم کی آراء کی تائید کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ یوں اقتباسات اور حوالوں کی بھرمار ہو گئی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی ہمہ جہت شخصیت کو سمجھنے میں یقیناً "یہ کتاب کار آمد ہو سکتی ہے لیکن یہ زیادہ کار آمد اور لائق توجہ ہوتی اگر اس کے متن میں حد سے بڑھے ہوئے جوش عقیدت کی آمیزش نہ ہوتی۔ ان باتوں کو سنجیدہ، باوقار اور علمی انداز میں پیش کیا جاتا تو یقیناً" زیادہ لوگ اس کی جانب متوجہ ہوتے۔

○



# باب ششم (ب)

## شخصی مرقعے / خاکے

## ایک مصنف کئی شخصیات (اجتماعی)

## ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

### دیدوشنید : رئیس احمد جعفری : کراچی : ۱۹۴۸ء

"دیدوشنید" رئیس احمد جعفری کے تحریر کردہ خاکوں کا مجموعہ ہے رئیس احمد جعفری علم وادب وصحافت کے بے تکان راہی ہیں۔ انہوں نے سترہ اٹھارہ برس کے سن میں "سیرت محمد علی" جیسی کامیاب تصنیف کے ذریعہ اپنا تعارف کروایا اور زندگی کی آخری سانس تک (وفات اکتوبر ۱۹۶۸ء) تحریر کی مشقت کو اپنا شیوہ بنائے رکھا۔ ان کی تحریریں متنوع ہیں۔ سوانح نگاری، شخصیت نگاری، افسانہ نگاری، تراجم اور اقبالیات جیسے موضوعات پر لکھا اور اپنے فکر ونظر کا لوہا منوایا۔ زیر نظر کتاب "دیدوشنید" میں ایک سو آٹھ حضرات کے خاکے ہیں جن سے انہیں ربط ضبط رہا۔ ان خاکوں کی بنیادی حقیقت کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ

"زندگی میں، میں نے بہت سے بڑے اور قابل ذکر آدمیوں کو دیکھا اور پرکھا، یہ کتاب اس پرکھ اور نظارہ کی ہے کہ لوگ اسے عناد پر محمول کریں گے یا شگفتگی پر، لوگ جو چاہیں کہیں اور سمجھیں میں نے وہی کہا اور لکھا ہے جسے سچ سمجھا ہے، سچ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ خوشگوار ہو، کبھی کبھی اس میں کڑواہٹ بھی آجاتی ہے ممکن ہے میرا سچ کہیں خوشگوار ہو، کہیں تلخ میں نے اس کی پوری کوشش کی ہے کہ وہ سچ کی حدود کے باہر نہ نکلے۔" (۱۸)

جن شخصیات پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے ان میں بہت نامور حضرات بھی ہیں اور کم معروف بھی ان کے بارے میں مصنف کو لکھنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ان کی سیرت و شخصیت میں کوئی نمایاں خصوصیت وصفت موجود تھی۔ شخصیات کو پندرہ طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے طبقے میں مجاہدین صف شکن، دوسرے میں علمائے کرام، تیسرے میں صوفیائے عظام، چوتھے میں رہنمایان ملت، پانچویں میں کانگریس کے عبد و معبود، چھٹے میں کیمونسٹ رہنما، ساتویں میں ارباب آئین و قانون، آٹھویں میں ماہرین تعلیمات، نویں میں اصحاب ادب، دسویں میں شعرائے عصر، گیارہویں میں حکمائے حاذق، بارہویں میں ممالک غیر کے سفیر، تیرہویں میں امرائے ذی وقار، چودھویں میں کھلنڈرے اور پندرہویں میں دختران ملت شامل ہیں۔

رئیس احمد جعفری نے خاکہ نگاری کی بنیادی شرائط کو پیش نظر رکھا، صداقت نگاری اور صاف بیانی ان کے قلم کے جوہر ہیں وہ سراپا نگاری میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور بات کو طول دینے کے بجائے اختصار سے کام لیتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو جامعیت سے پیش کرنے کا سلیقہ جانتے ہیں شگفتہ بیانی بھی ان کے اسلوب کا حصہ ہے ان تمام عناصر کے یکجا ہو جانے سے خاکے

معلومات افزا، مؤثر اور دلنشین ہو گئے ہیں دراصل ان خاکوں کے ذریعے وہ اعلیٰ انسانی اقدار اور
فضائل دین وفن پیش کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

علامہ شبلی کے بارے میں لکھا ہے کہ

"وہ عربی میں نہایت فصاحت وبلاغت اور روانی سے تقریر کرتے تھے سامعین کی بڑی تعداد
عربی سے ناواقف ہونے کے باوجود سحرزدہ ہو جاتی اور جب مولانا عبدالرحمان گرامی تقریر کا اردو
ترجمہ کرتے تو وہ تقریر نہیں رہتی مئے دو آتشہ بن جاتی جس کے نشے سے غلاموں کے سر میں
آزادی کا سودا پیدا ہو جاتا تھا ایک سحر حلال تھا جس کے اثر سے مردوں میں زندگی کی تڑپ اور
حرارت پیدا ہو جاتی تھی اس وقت تو نہیں کہیں بعد میں اندازہ ہوا کہ

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

اقبال نے نطق اعرابی سے کیا مراد لیا تھا۔(۱۷)

ان چند جملوں میں شخصیت کا وصف، خطابت کی خوبی، نفس مضمون کی اہمیت، اقبال کی تشریح
اور بیان کی مقصدیت سب ہی کچھ سمو دیئے گئے ہیں۔

خالدہ ادیب خانم جدید ترکی کی نمائندہ روشن خیال خاتون کی حیثیت سے متعارف تھیں جو
پردہ کا قطعی لحاظ نہ کرتی تھیں اور نہ اس کو لازمی ضرورت سمجھتی تھیں قدامت پسند ذہن ان سے
بدظن تھے اس پس منظر میں ان کی حقیقی تصویر یوں سامنے آتی ہے۔

"آج آنکھوں کے سامنے جو ترک عورت تھی وہ بے شک ہندوستان کے رواجی پردے کی
پابند نہ تھی لیکن مذاہب کو بھی ٹٹول چکی ہے اور تلاش وتحقیق کے بعد وہ اسلام کو دنیا کا بہترین
مذہب سمجھتی ہے۔ اپنے اسلام پر، اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرتی ہے۔ وہ اس لئے مسلمان نہیں
ہے کہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی تھی وہ اس لئے مسلمان ہے کہ اس کا یہ یقین واعتماد
ہے کہ اگر کوئی مذہب قبول کیا جا سکتا ہے تو وہ اسلام کے سوا کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کی یہ
باتیں سن کر ان تاثرات سے واقف ہو کر دل خوش ہوا، پہلے سے جو ایک بدگمانی پیدا ہو گئی تھی وہ
دور ہو گئی۔"(۲۰)

رئیس احمد جعفری خصوصیات انسانی میں مزاح کے پہلو بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ اپنے ندوۃ
العلماء کے استاد مولوی حیدر حسن خان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"مولوی صاحب کے لئے سب سے زیادہ وقت آزما کام اردو میں کچھ لکھنا تھا۔ اتالیق تھے۔



ہر روز لکھنے سے انہیں لکھنے کا کام رہنے لگا، ہر درخواست انہی کے توسط سے جاتی اور اس پر
انہیں رائے لکھنی پڑتی اردو رسم الخط میں مولوی صاحب یائے معروف ومجہول کا فرق نہیں
کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم نے بخار کی وجہ سے ایک روز کی درخواست دی وہ طالب
علم کا دل بھی رکھنا چاہتے تھے اور جھوٹ بولنا بھی انہیں منظور نہ تھا۔ درخواست دہندہ کو بخار
نہیں تھا۔ مولوی صاحب نے درخواست پر تحریر کیا۔

"یہ کہتے ہیں کہ انہیں بخار ہے لہٰذا ایک روز کی رخصت دی جائے۔"(۲۱)

شخصیات کے عیوب کو اجاگر کرنے کے لئے بلیغ اشارے اور کبھی کبھی ملیح طنز سے کام لیتے
ہیں تو عبارت میں جان پڑ جاتی ہے اور ابلاغ کا حق ادا ہوتا ہے جوش ملیح آبادی کے تعارف میں
لکھتے ہیں کہ

"ایک زاہد متقی شخص جس طرح شیطان سے بدکتا ہے اسی طرح وہ خدا سے بدکتے ہیں۔ ہٹلر
کو جتنی نفرت یہودیوں سے تھی اتنی ہی نفرت انہیں مذہب سے ہے۔"

"نازک دماغ بہت ہیں۔ مشاعرے میں سب سے پیچھے آتے ہیں اور سب سے پہلے جاتے
ہیں۔ لیکن آتے ضرور ہیں۔ جس طرح واعظ اور قوال، وعظ اور قوالی سے پہلے اپنی شرح طے کر
کے پیشگی وصول کر لیتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی شریک مشاعرہ ہونے سے پہلے اپنے مطالبات وصول
کر لیتے ہیں۔ تشریف آوری کے شرائط میں منتظمین مشاعرہ سے یہ مطالبہ کرتے ہوئے بھی نہیں
چوکتے کہ مصارف آمد ورفت اور فیس کے علاوہ شراب کا خرچ بھی آپ کے ذمہ ہے۔ غنیمت ہے
کہ شراب کے ساتھ ساقی گلفام کا مطالبہ نہیں کرتے۔"(۲۲)

خاکوں میں مصنف نے پسند یا ناپسند کا معیار اسلامی اور اخلاقی قدروں کو قرار دیا ہے اور
اس کے لحاظ سے ان کی خوبی یا خرابی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور ذاتی تعصب کا اظہار
کہیں نہیں کیا ہے وہ مسلم لیگ کے حامی تھے اس کے باوجود کانگریسی اور کمیونسٹ رہنماؤں کے
خاکے جن سے وہ کم یا زیادہ واقف تھے اس رعایت سے لکھے اور اس مخالفت کو کام میں لائے بغیر
لکھے جو نظریاتی بنیادوں پر تھی انہوں نے صاف گوئی سے کام لیا اور بعض رہنما جیسے کنور اشرف
اور سجاد ظہیر کا ذکر کرتے ہوئے ان کی اصول پسندی اور نظریہ سے وابستگی کے خلوص کی وجہ سے
ان کو لائق توصیف بھی قرار دیا ہے۔ چند واقعات ایسے بھی بیان کئے ہیں جو شخصی تجربے پر منحصر
نہیں وہاں ان سے چوک بھی ہو گئی ہے مثلاً مولانا عبدالماجد دریابادی کا بازو پر نام کھدوانے کی
اصلیت خود مولانا کے "معاصرین" میں بیان کردہ حقیقت سے مطابق نہیں رکھتی اگرچہ بیشتر

خاکے شخصی معلومات، مشاہدہ اور تجزیے کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں ان میں طوالت کے لحاظ سے توازن نہیں ہے وہ مولانا حیدر حسن خان پر تیس صفحات (۳۲ تا ۶۳) وقف رکھتے ہیں تو مولانا حسرت موہانی کا ذکر صرف ایک واقعہ کے حوالے سے کرتے ہیں۔

رئیس احمد جعفری صحافی ہونے کے باوجود اچھے ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ ان کی تمام تحریوں میں (چاہے ان کی نوعیت کچھ بھی ہو) ادبی شان نمایاں ہے۔ جملوں کی نفاست اور بھرپور مقصدیت ان کی تحریروں میں جان ڈال دیتی ہیں۔

ان کے ادبی ذہن اور ادبی شان اس بات سے بھی عیاں ہوتی ہے کہ شخصیت کے نام کو عنوان قرار دے کر اس کے ذیل میں ایسا فقرہ لکھ دیا ہے جو حاصل کلام ہے مثلاً

مولانا ابو اعلیٰ مودودی "آغاز میں ہم کیا تھے انجام میں ہم کیا ہیں۔" (صفحہ ۵۶)

مولانا ابوالکلام آزاد "بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری" (صفحہ ۵۱)

خالدہ ادیب خانم "آبروئے ملت اسلام" (صفحہ ۴۳)

مولانا سید سلیمان ندوی "مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں" (صفحہ ۹۵)

خواجہ کمال الدین "اک ولی پوشیدہ کافر کھلا" (صفحہ ۱۳۰)

سجاد ظہیر "قانون باغبانی صحرا نوشتہ ام" (صفحہ ۲۱۸)

خاکے ہمہ گیر تنوع کے ساتھ رقم ہوئے ہیں ان میں شخصیات کے مزاج، میلان، نظریوں، رویوں کا ذکر ان کی ذاتی خوبیوں کا احوال، ذاتی تجربے اور مشاہدہ کی روشنی میں بے لاگ طور پر بیان کیا گیا ہے اور پوری ادبی شان کے ساتھ کہ پڑھنے والے کی معلومات میں اضافہ بھی ہو اور اسے لطف و انبساط بھی حاصل ہو۔

## گنجے فرشتے : سعادت حسن منٹو : لاہور : ۱۹۳۹ء

"گنجے فرشتے" منٹو کے منفرد انداز کے شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ مصنف نے افسانہ نگاری کی حیثیت سے اپنے فن کو تسلیم کروانے کے ساتھ ساتھ خاکہ نگاری میں گہرے مطالعہ، بے باک اظہار خیال اور تحریر کے نوکیلے پن کی وجہ سے بھی شہرت حاصل کی ہے۔ اس کتاب میں بارہ خاکے ہیں جو قائداعظم، آغا حشر، اختر شیرانی، باری علیگ، عصمت چغتائی، شیام، پری چہرہ نسیم، نرگس، ڈیسائی اور بابو راؤ پٹیل کے خدوخال پیش کرتے ہیں۔ قائداعظم کے بارے میں "میرا صاحب" کے زیر عنوان جو خاکہ ہے اس میں شامل حقائق ان کے شوفر محمد حنیف آزاد کے بیان



کئے ہوئے ہیں۔ ان میں منٹو نے اپنا رنگ بھر دیا ہے جو حقیقت سے قریب تر ہے۔ منٹو کے بعض حاصل کردہ نتائج مختصراً" بیان ہوئے ہیں۔ اس میں بھی شخصیت کا بھرپور عکس نظر آتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ قائداعظم بہت دبلے پتلے اور بظاہر نحیف و نزار تھے۔ ان کی جسمانی کمزوری ان کی قوت ارادی میں اضافہ کا باعث بنی۔ مصنف نے اس راز کو پالیا اور اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"اگر غور کیا جائے تو جسم کی لاغری کا یہ احساس ہی ان کی مضبوط اور پُر وجاہت زندگی کی سب سے بڑی قوت تھی۔ ان کے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور بولنے سوچنے میں یہ قوت ہر وقت کارفرما رہتی۔" (۲۳)

قائداعظم کی بعض دیگر صفات کا انکشاف ان کے سوانح اور سیرت نگاروں نے نہیں کیا ہے۔ یہ اوصاف آزاد کے ذریعہ منٹو کو معلوم ہوئے۔ انہوں نے تجزیہ کر کے اپنے تاثر کو فنکاری کے ساتھ تحریر کیا۔ مثلاً

"ان کا آقا (آزاد کا آقا) طاقت پسند تھا جس طرح علامہ اقبال کو بلند قامت چیزیں پسند تھیں اسی طرح قائداعظم کو تومند چیزیں مرغوب تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے ملازمین کا انتخاب کرتے وقت وہ جسمانی صحت اور طاقت سب سے پہلے دیکھتے تھے۔" (۲۴)

"انہیں افراد کا نسلی اور علاقائی تشخص پسند تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ تہذیبی اقدار سے گریز کریں۔

اس لئے پٹھان چوکیدار کو حکم تھا کہ وہ ہمیشہ اپنا قومی لباس پہنا کرے۔" (۲۵)

قائداعظم کے سوانح نگاروں نے ان کے حالات زندگی سیاسی تناظر میں بیان کئے ہیں۔ ان میں برائے نام خانگی زندگی اور گھریلو معاملات کا ذکر ہے۔ منٹو نے بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"قائداعظم کی گھریلو زندگی کا صحیح نقشہ مستور ہے اور ہمیشہ مستور رہے گا۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے لیکن ہونے نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ بیوی تھی وہ مدت ہوئی ان سے جدا ہو چکی تھی۔ لڑکی تھی اس نے ان کی مرضی کے خلاف ایک پارسی لڑکے سے شادی کر لی تھی۔" (۲۶)

قائداعظم کے ظاہری رنگ و روپ کو بھی منٹو نے موضوع بنایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کے دل کی کیفیت ان کے چہرے پر نمایاں ہو جاتی تھی۔ اسے چہرے کی لطافت کہئے یا احساس کی شدت!

منٹو کا کہنا ہے کہ

"ان کا چہرہ اس قدر لطیف تھا کہ معمولی سے معمولی واقعہ بھی اس پر اتار چڑھاؤ پیدا کر دیتا تھا جو دوسروں کو فوراً" نظر آجاتا تھا۔ ماتھے پر ہلکی سی شکن ایک خوفناک خط کی صورت اختیار کر جاتی تھی۔" (۲۷)

آغا حشر کا خاکہ اپنی ملاقاتوں اور ان کے پس منظر میں دیگر معلومات کی مدد سے لکھا گیا ہے۔ مصنف کی ان سے ملاقاتیں اس وقت ہوئی تھیں جب وہ نوعمر تھا۔ اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو چکا تھا اور وہ اپنے ماحول کو سمجھنے اور مستقبل کے لئے راہیں متعین کرنے کی فکر میں تھے۔ اس کا سابقہ آغا حشر سے پڑا۔ انہوں نے اندازہ کر لیا کہ بڑے لوگ مزاجاً" عجوبہ ہوتے ہیں اور ان کی حرکتیں ناقابل فہم! تضادات کی نیرنگی آغا حشر سے اکتسابی دکھائی دیتی ہے۔ منٹو نے لکھا ہے کہ آغا حشر ڈراما نگار ہوتے ہوئے بھی مذہب سے بے پناہ رغبت رکھتے تھے۔ انہیں عیسائی اور دیگر مذاہب کے مبلغوں سے مناظرے کرنے' اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے جنوں کے ساتھ مے نوشی سے بھی شغف تھا۔ اس حوالے سے ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ مولانا آزاد ایک مجمع میں مناظرہ کر رہے تھے۔ وہ کچھ دب رہے تھے کہ آغا حشر پہنچ گئے انہوں نے کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اور وہ زوردار مناظرہ کیا کہ حلق خشک ہو گیا۔ وہاں سے نکلے تو مولانا سے تشنگی کا اظہار کیا دونوں ایک بیت الخلا میں گھس گئے بوتل کھولی اور پیاس بجھائی۔

بڑھاپے میں آغا حشر کے عشق کا بھی انکشاف کیا ہے۔ وہ بھی ایسی عورت سے جس کو منٹو حسینوں کے زمرے میں شریک کرنے پر آمادہ نہیں۔

آغا حشر کی نمائش پسندی کے حوالے سے بھی واقعات لکھے ہیں کہ وہ بات بے بات جیب سے نوٹوں کے بنڈل نکالتے اور خرچ کئے بغیر رکھ لیتے تھے۔

اختر شیرانی کو جذباتی نوعیت کے رومانی شاعر کے روپ میں پیش کیا ہے۔ منٹو ان کی شخصیت کے رچاؤ سے متاثر تھے۔ اس خاکہ میں جذباتی انداز بیان غالب ہے۔

جدید شاعری میں ابہام کے سب سے بڑے حامی میراجی کا مطالعہ دلچسپ ہے۔ اس میں ان کی قابلیت کے اعتراف کے ساتھ شخصیت میں الجھاؤ کی نشاندہی کی ہے۔ منٹو کے کہنے کے مطابق

"اس کے وجود میں ایک ناقابل بیان زہر پھیل گیا تھا جو ایک نکتے سے شروع ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس طور پر کہ اس کا ہر نقطہ اس کا نقطۂ آغاز ہے اور وہی نقطۂ انجام یہی وجہ ہے کہ اس کا ابہام نوکیلا نہیں تھا اس کا رخ موت کی طرف تھا نہ زندگی کی طرف' رجائیت کی طرف تھا نہ قنوطیت کی طرف۔" (۲۸)



میراجی کے ساتھ ہمیشہ تین گولے ہوتے تھے انہیں منٹو نے حسن' عشق اور موت کی تثلیث کی علامتیں قرار دیا ہے کیونکہ انہیں عناصر ثلاثہ سے میراجی کی شخصیت عبارت تھی۔

ان شخصی خاکوں میں خصوصیت سے باری علیگ کا خاکہ طویل اور جاندار ہے طویل عرصہ کی رفاقت پر مبنی دقیق مشاہدات' شگفتہ انداز بیان اور طنز نے اس کا رنگ چوکھا کر دیا ہے۔ باری مرحوم سے انسیت کا اظہار تنقید' طعن اور طنز کے ذریعہ ظاہر کیا ہے۔ بظاہر یہ رویّہ باری سے اختلاف کا ہے لیکن اصل میں حالات کی ستم گری کو اجاگر کرنے' ان کے لئے جذبۂ محبت اور ہمدردی کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ لعن طعن اور طنزیاری پر نہیں زمانہ پر ہیں۔ باری کا خاکہ اس دور کے نوجوانوں کی عمومی کیفیات کا نمونہ ہے اسی حوالے سے ان کے یہ ریمارک کتنے بامعنی ہو گئے ہیں۔

"باری صاحب خیالی پلاؤ پکانے کے معاملے میں اول درجے کے بکاول تھے۔ ایسے ایسے لذیذ پلاؤ اور بریانیاں تیار کرتے تھے کہ ان کا ذائقہ دیر تک دوسروں کے دل و دماغ سے محو نہیں ہوتا تھا۔" (۲۹)

"اقبال کی خودی کا فلسفہ ان کو اس قدر پسند آگیا تھا کہ اس کو اپنا اوڑھنا' بچھونا بنا لیا مگر سردیوں میں معلوم ہوا کہ کام نہیں دے سکتا۔" (۳۰)

باری اس دور کے نوجوانوں کی طرح عینیت پسندی کا شکار تھے۔ ان کی آئیڈیل ازم ہی ان کا سرمایہ تھی جس کے لئے عمل کی نہ ان میں ہمت تھی اور نہ وسائل! اس لئے وہ

"بڑی بڑی سرخ بغاوتوں کے نیلے نقشے تیار کرتے تھے اور پٹاخے کی آواز سن کر زرد ہو جاتے تھے۔" (۳۱)

باری صاحب مزاجاً" صلح کے حامی تھے ایسے لوگ انقلاب کی باتیں تو کر سکتے ہیں انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔ منٹو نے اس کیفیت کو بزدلی سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی صلح کل پالیسی یا بزدلی کے حوالے سے بھی دو اہم باتوں کا ذکر آیا ہے۔ ایک ان کی شادی سے متعلق ہے۔ ان کو ایک لڑکی سے محبت تھی لیکن ماں باپ نے کسی اور سے ان کا رشتہ پکا کر دیا تھا۔ والدین نے شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی تھی۔ جب تاریخ نزدیک ہوئی تو وہ غائب ہو گئے۔ دلہن نے ایک بڑا معرکہ کا خط لکھا اور دھمکی دی کہ اگر انہوں نے شادی نہ کی تو وہ ان کے پیٹ میں چھری بھونک دے گی باری صاحب ڈر گئے اور شادی کر لی۔ (۳۲)

باری "ظالم سماج" کے خلاف کیا جارحانہ اقدام کرتے جب کہ وہ دل کے عارضہ میں مبتلا تھے اور علاج مصالحت آمیز کرتے تھے۔ ان میں مرض کے خلاف جارحانہ رجحان کبھی پیدا نہیں ہوا۔

منٹو نے ان کی مصلحت پسندی کو چور دروازے سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کاروبار حیات کے لئے جو بھی منصوبہ بناتے اس میں فرار کے لئے ایک چور دروازہ ضرور رکھتے تھے۔

اسی طرح منٹو کو عصمت چغتائی سے بھی قرب حاصل رہا۔ دونوں معاصر ایک ہی مرتبہ اور ایک ہی انداز کے افسانہ نگار ہوتے ہوئے باہم ایک دوسرے کے معترف بھی تھے اور ناقد بھی۔ منٹو نے ہر دو کیفیات کا جائزہ لیا ہے۔ کبھی عصمت کی برتری مان لی ہے اور کبھی لفظی بحث میں جیت کر اپنی سرخروئی پر خوش ہوتے نظر آئے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے بھی ان کی شخصیت کے چند پہلوؤں کا ذکر کیا ہے اور ذاتی مشاہدہ بھی اس میں شامل کر دیا ہے۔ جہاں ان دونوں کے درمیان ہونے والی نوک جھونک کا ذکر ہے۔ بہت دلچسپ ہو گیا ہے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ

"عصمت کا قلم اور ان کی زبان دونوں تیز ہیں۔"

"عصمت پر لکھنے کے دورے پڑتے ہیں۔ نہ لکھے تو مہینوں گزر جاتے ہیں جب وہ دورہ پڑے تو سیکڑوں صفحے اس کے قلم کے نیچے سے نکل جاتے ہیں۔ کھانے پینے، نہانے دھونے کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ ہر وقت چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی اپنے ٹیڑھے میڑھے اعراب اور املا سے بے نیاز خط میں کاغذوں پر اپنے خیالات منتقل کرتی رہتی ہے۔" (۳۳)

مجموعے کے دیگر خاکے بمبئی کی فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے ہیں۔ برصغیر کی تقسیم سے قبل کے زمانہ میں منٹو فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ انہوں نے وہاں کی چمک دمک بھی دیکھی اور خراب پہلوؤں کا بھی مطالعہ کیا یہی رنگین اور بے رنگی ان خاکوں میں موجود ہے۔ وہ برائی کو زیادہ اجاگر کرنے کے قائل رہے ہیں۔ اسی لئے ان پر ان الزامات کی بوچھاڑ بھی رہی۔ ان کی مخصوص بے باکانہ تحریر کے نمونے ان خاکوں میں ملتے ہیں۔ پری چہرہ نسیم کے ظاہر حسن اور حقیقی روپ کو بھی واضح کیا ہے اور ان کے اوصاف کی عام روش کے برخلاف ان کی گھریلو زندگی کی سادگی اور مذہب پرستی کو بھی نمایاں کیا ہے۔

ان تمام خاکوں میں جن شخصیات کو موضوع بنایا ہے ان کے معلوم اوصاف کے علاوہ اور بہت سے نامعلوم اوصاف اور پہلوؤں سے واقفیت ہوتی ہے۔ منٹو کا قلم ایک فنکار کی طرح تمام



جزئیات کے ساتھ ان تصویروں کو تیار کرتا اور رنگ بھرتا نظر آتا ہے۔ اگر تحریر میں خوبی ہے تو شخصیت کے حوالے سے ہے اور پھوہڑ جیسا انداز ہے تو وہ بھی شخصیت کا مظہر ہے۔ اسی لئے "اختتامیہ" میں انہوں نے لکھا ہے کہ

"میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں، کوئی شیمپو نہیں، کوئی گھونگھرو پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی۔ اس کے منہ سے گالیوں کے بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔ میرا جی کی ضلالت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا ہوں کہ وہ بر خود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے۔ اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے ان کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔" (۳۴)

اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر خاکہ میں منٹو خود چھپا بیٹھا ہے یہ کتاب ایک آئینہ خانہ ہے جس میں منٹو کی اپنی شخصیت کی بہت سی جھلکیاں محفوظ ہو گئی ہیں۔

**چند ہم عصر : مولوی عبدالحق : (پہلا پاکستانی ایڈیشن) : کراچی : ۱۹۵۰ء**

اردو میں شخصیت نگاری یا خاکہ نگاری فرحت اللہ بیگ کے بعد مولوی عبدالحق اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کی مرہون منت رہی۔ مولوی صاحب کو عام طور پر ایک عالم، محقق اور نقاد سمجھا جاتا ہے یہ ایسی سنگلاخ زمینیں ہیں کہ ان کے عبور کرنے والے سے قلم کاری کے ایسے شاہکار کی توقع عام طور پر نہیں کی جاتی جو مقبولیت عام حاصل کر سکے۔ مولوی صاحب نے خاکہ نگاری میں عالمانہ سطح سے اظہار خیال نہیں کیا ہے بلکہ عام انسانی سطح پر ان شخصیات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ان کے خاکے ساکت و جامد مصوری نہیں بلکہ چلتی پھرتی، جیتی جاگتی اور بولتی چالتی تصویریں ہیں۔ انہوں نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا ان میں سرسید، حالی، مولوی چراغ علی اور سید محمود سے لے کر حسرت، اقبال اور عبدالرحمان بجنوری تک اشخاص ہی شامل نہیں ہیں بلکہ ان کے پس منظر میں پورے ایک صدی کی انسانی اور تہذیبی تاریخ بھی ہے۔

مولوی صاحب نے کسی شخصیت کو نہ تو مدح کے لئے موضوع بنایا ہے اور نہ ہی اظہار تنفر کے لئے ان کی خامیوں پر نظر رکھی ہے۔ انہوں نے انسانی نقطہ نظر سے انسانوں کو دیکھا ہے اور ان کو تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ موثر فن کارانہ اسلوب تحریر میں پیش کیا ہے کہ شخصیت شناسی اور تعارف کا حق ادا ہوا۔ ان میں ایسی عظیم ہستیاں بھی ہیں جو تاریخ کا حصہ ہیں اور ایسے گم نام لوگ بھی جو اپنی کسی نہ کسی خوبی کی وجہ سے یاد رکھنے کے قابل ہیں خاکہ نگاری کا

مقصد شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کو پیش کرنا ہوتا ہے اور ایسے پہلو کسی شخص میں بھی ہو سکتے ہیں جو دوسروں کے لئے رہنمائی کا وسیلہ بن سکے جہاں سرسید کی مقصدیت، حالی کی سادگی، اقبال کی درویشی، حسرت کی قلندری، رہنما قوتیں ہیں اسی طرح نام دیومالی کی فرض شناسی اور نور خان کی بے باکی بھی اہمیت رکھتی ہے جہاں ہم معروف مینارہ نور سے راہ حیات میں اجالا کر سکتے ہیں وہیں بظاہر جو دیئے کی طرح ہیں وہ بھی راہوں کی تاریکی کو دور کر سکتے ہیں اس نوع کے خاکے لکھ کر مولوی صاحب نے ثابت کردیا ہے کہ سچائی، نیکی، حسن کسی طبقہ کی میراث نہیں۔ قابل تحسین خوبیاں نچلے طبقے والوں میں بھی پورے حسن کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ یہ ان کی انسانی دوستی کا زاویہ ہے مولوی صاحب کا انداز تحریر انتہائی سادہ اور دلنشین ہے۔ اپنی تحریر کی گراں باری کو دور کرنے کے لئے وہ شگوفے بھی کھلاتے جاتے ہیں ایک عام انسان کی حیثیت سے مشاہدات اور تجربات ان خاکوں کے اجزائے ترکیبی ہیں تو وہیں ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے وہ درون بینی سے کام لیتے ہوئے احساسات وجذبات کی بھی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں اس طرح شخصیت کا ظاہر وباطن پوری طرح سامنے آجاتا ہے اور شخصیت ہمارے ماحول کا حصہ بن جاتی ہے یہی خاکہ نگاری کا کمال ہے اور اس کمال کی منزل پر مولوی صاحب نظر آتے ہیں۔

**یادرفتگان : مولانا سید سلیمان ندوی : کراچی : جنوری ۱۹۵۵ء**

"یادرفتگان" مولانا سید سلیمان ندوی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو رسالہ معارف اعظم میں "وفیات" کے طور پر ۱۹۱۶ء سے ۱۹۵۳ء تک شائع ہوئے۔ یہ ایسے ۱۳۵ حضرات کا ماتم ہے جو زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ میں یگانہ تھے اور مصنف سے شخصی ربط ضبط بھی رکھتے تھے ہر مضمون کا ایک حصہ مصنف کے جذبات حزن وملال کا آئینہ دار ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی ایک خصوصیت سوانحی خاکہ کی ہے اور دوسری شخصیت نگاری کی۔ جس پر بھی قلم اٹھایا ہے اس کے اوصاف اور کردار کے واضح نقوش پیش کئے ہیں۔ ان کے فنی اور علمی کمالات اور کارناموں کی نسبت شخصی محاسن پر زیادہ زور دیا ہے چونکہ مصنف شرافت اور مروت کے پیکر اور حسن خلق اور نیک نیتی کا مجموعہ تھے اس لئے انہوں نے شخصیات کے عیبوں کی جستجو نہیں کی یا کم کی ہے۔ مشرقی تہذیب کے مطابق مرنے والوں کو اچھے الفاظ میں یاد کرنا چاہئے اور مصنف اس روایت پر کاربند رہے ہیں اور شخصیت کے خدوخال اور کردار کے محاسن کے ذکر پر ہی اکتفا کیا ہے۔ اپنے دوست مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی شخصیت کے بارے میں لکھا ہے۔

"ارشاد وہدایت، وعظ ونصیحت، درس وتدریس، تلاش ومطالعہ، تحریر وتالیف، ان کے



روزانہ مشاغل تھے۔ ان دینی وعلمی مناقب کے ساتھ دین وملت کی راہ میں ان کا جاں فروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاق ہم رنگ شہداء تھا۔ ذاتی اخلاق، جودوسخا، تواضع وانکسار، علم کی عزت، صداقت، حق گوئی۔ ان کے اوصاف گرانمایہ تھے۔ وہ بے کسوں کے ملجا، مسافروں کے ماویٰ اور تنگ دستوں کے دستگیر تھے۔ عبادت گزار، شب زندہ دار اور حق کے طلب گار تھے۔" (۳۵)

بہادر یار جنگ کے کردار کے محاسن بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ہر پہلو سے ان کو جانچنے اور پرکھنے کا موقع ہاتھ آیا اور ہر پہلو سے محبوب ہی نظر آئے۔ ارادے کے پکے، بات کے دھنی، مخلص، وفادار، خدا ترس، عاشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مجاہد اسلام، بہادر مسلمان سپاہی اور ہر معنی میں سپاہی، بہادر پٹھان اور بہادر مسلمان۔" (۳۶)

ان شخصیات میں واقعی یہ محاسن موجود تھے۔ مصنف کے حسن نظر اور حسن بیان نے ان میں جان ڈال دی۔ مصنف دبستان شبلی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس دبستان کا وصف خاص یہی تھا کہ کارناموں اور خوبیوں کو اس طرح اجاگر کیا جائے کہ وہ آئندہ نسلوں کے لئے مثال ثابت ہوں۔ مصنف نے سوانح نگاری اور شخصیت نگاری دونوں میں اس رجحان کی احسن طریقہ سے پابندی کی ہے۔

**صاحب : محمد طفیل : لاہور : ۱۹۵۵ء**

محمد طفیل معروف رسالہ نقوش کے مالک ومدیر رہے ہیں۔ اس رسالہ نے خاص شماروں کی ایک نئی روایت کو رائج کیا اور نہایت وقیع خصوصی شمارے شائع کرکے تاریخ ادب میں اپنا مقام بنالیا ہے۔ ان کے شخصی اور گہرے تعلقات برصغیر پاک وہند کے تمام لکھنے والوں سے رہے۔ ان کی شخصیت یا خاکہ نگاری کی ابتدا مارچ ۱۹۵۳ء میں ہوئی جب مخالف قادیانی تحریک کے سلسلے میں احتجاج نے وہ صورت اختیار کی کہ لاہور میں مارشل لا کے دور میں کرفیو لگا تو انہوں نے وقت کا جائز استعمال کرنے کے لئے خاکے لکھنے کی طرف توجہ کی اور دیکھتے ہی دیکھتے مدیر شہیر سے ادیب بن گئے۔ "صاحب" ان کے شخصی مرقعوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، شوکت تھانوی، جگر مراد آبادی، سید عابد علی عابد، فراق گورکھپوری اور احسان دانش کا تعارف کروایا گیا ہے۔ ابتدائی نوعیت کی کوشش ہونے کے باوجود ان کے قلم نے اعجاز دکھایا ہے اور ہر شخصیت کو اعلیٰ رنگ میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کیونکہ ان نامور شخصیت سے ان کی گہرے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات تھے۔ دوسروں کی نسبت محمد طفیل کو بحیثیت مدیر نقوش بھی ان ادیبوں کی تخلیقات سے ہٹ کر ان کی شخصیتوں کے پیکر میں جھانکنے کا زیادہ موقع

ملا۔ انہوں نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ بڑی سے بڑی شخصیت ان پر حاوی نہ ہونے پائے اور وہ کسی سے مرعوب ہوئے یا کسی کی کمزوریوں سے متنفر ہوئے بغیر ایک غیر جانبدار شخص کی حیثیت سے ان کے اوصاف کو پرکھا ہے اور بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ وہ بڑی قابل احترام شخصیتوں کو اتنی بلندی پر نہیں لے جاتے جہاں ان کی ذات کے نقوش ابھرنے ہی نہ پائیں اور نہ کسی کو اس قدر مطعون کرتے ہیں کہ اس کے چہرے پر سیاہی چھانے لگے۔ وہ انسان کو انسان کے روپ میں دیکھتے اور جانچتے ہیں۔ نازک مقامات پر طنز و طعن سے کام لینے کی بجائے مزاح سے اس کو پُر لطف بنا دیتے ہیں ویسے تمام مرقعوں میں مزاح کا غالب انداز ہے۔ جیسے احمد ندیم قاسمی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ انہیں خفا ہونا آتا ہی نہیں۔ خفگی کے موقع پر یہ بڑے اوپرے اوپرے معلوم ہوتے ہیں اور اس وقت ان کی حالت بڑی عجیب ہوتی ہے جیسے کہہ رہے ہیں کہ "اب میں خفا تو ہو گیا لیکن اسے نبھاؤں کیسے۔" (۳۷)

اور شوکت تھانوی کے بارے میں کہتے ہیں۔

"آپ فرسٹ کلاس قسم کے بزدل ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ مزاح نگار ہیں۔ اگر اپنا دل مضبوط ہوتا تو لوگوں کو رلانے پر بھی قادر ہوتے اور پھر شوکت تھانوی نہ ہوتے علامہ راشد الخیری ہوتے۔" (۳۸)

"منٹو صاحب میں ذاتی طور پر بڑی خوبیاں ہیں لیکن شراب نے ان میں کئی کمزوریاں پیدا کر دی ہیں۔ پہلے مجھے ان پر غصہ آتا تھا اب ترس آتا ہے۔ میں تو ان کے فن پر ان کی تمام کمزوریوں کو نثار کر سکتا ہوں۔" (۳۹)

محمد طفیل نے خوبیوں کو واشگاف الفاظ میں اور کمزوریوں کو پُر مزاح اشاروں میں بیان کر کے اپنی شرافت نفس کا ثبوت دیا ہے اور اردو میں شخصیت نگاری کی ایک محتاط اور متوازن روش کو رواج دینے کی کوشش کی ہے۔

اس مجموعہ کا پہلا مضمون منٹو کے متعلق ہے اس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں منٹو اپنی زندگی کی تمام ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ چلتے پھرتے سامنے آتے ہیں۔ ان کی وہی بہکی بہکی باتیں، وہی سرشاریاں، وہی لغزیدہ قدم، وہی انداز بیان اور وہی بلند بانگ دعوے۔ مضمون پڑھتے جائیں تو معلوم ہو منٹو ساتھ ہیں۔ سامنے بیٹھے ہیں۔ دوسرے حصے میں منٹو کی جانب سے خط ہے جس میں ان کی طرز تحریر کا کامیاب تجربہ موجود ہے۔



احمد ندیم قاسمی کے تعارف میں لکھا ہے کہ "اگر یہ چارپائی پر بیٹھے ہوئے تکیے سے ٹیک بھی لگا رکھی ہو اور ایک دم اکڑوں بیٹھ جائیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ افسانہ لکھنے والے ہیں۔ اس وقت یہ سگریٹ پر سگریٹ پئیں گے۔ خوبصورت سا کاغذ لیں گے، پنسل کو باریک بنائیں گے اور مہین مہین خط میں افسانہ شروع کر دیں گے۔ آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے البتہ شعر کہنے کے لئے تنہائی چاہتے ہیں اس لئے کہ انہیں ہلکا ہلکا گنگنانا ہوتا ہے چونکہ یہ اپنے ترنم کا مرتبہ جانتے ہیں۔ اس لئے اس خداداد دین کا حال سب پر آشکار کرنا نہیں چاہتے۔"

جگر کے خاکے میں خاص بات یہ ہے کہ ان کے انداز بیان کی صحیح صحیح نقل کی ہے ویسے ہی الفاظ، وہی ترکیبیں، وہی بندشیں، اس کے ہر حصے میں جگر اپنی اصلی شخصیت کے ساتھ متحرک نظر آتے ہیں۔

فراق والا مضمون شخصیاتی بھی ہے اور دستاویزی بھی۔ اس میں فراق کے چند اہم خطوط دے کر ان کی شخصیت کو خوبی سے ملا دیا ہے۔ ان خطوط اور محمد طفیل کی حاشیہ آرائیوں نے فراق کو پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔

سید عابد علی عابد کے بارے میں بڑی حقیقت نگاری کا ثبوت دیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"مجھے ان سے شکایت رہی ہے کہ اتنی ٹھوس علمی شخصیت ہونے کے باوجود انہوں نے کوئی قابل ذکر ادبی کام نہیں کیا یہ فضیلت، صرف ان میں ہی نہیں ہے بلکہ یہاں کی کئی اور بڑی بڑی شخصیتوں میں تھی اور ہے اگر میں اس سلسلے میں ڈاکٹر تاثیر (بعض زندہ کرم فرماؤں کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے) کا نام لوں تو میرے کرم فرما مجھے معاف کریں۔

شوکت تھانوی جس مزاح کے لئے مشہور ہیں ان کا خاکہ بھی اسی انداز میں لکھا گیا ہے۔ جیسے

"میں بھی کوئی آٹھ دس مشاعروں میں ان کا کلام سن چکا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ سوائے دو ایک مشاعروں کے باقی سب میں بڑے پیمانے پر ہوٹ ہوئے۔"

"ان کی طبیعت کی ایک اچھائی یہ ہے کہ بیٹھے بٹھائے ناراض ہو جاتے ہیں۔ نہ ناراض ہونے کا پلان بناتے ہیں۔ نہ کوئی اسکیم نہ ہی دوسروں کو یہ موقع دیتے ہیں کہ بے چارے موافقت میں کچھ کہہ سکیں۔"

آخری مضمون احسان دانش پر ہے اور بہت ہی کامیاب مصوری ہے۔ صاحب خاکہ اپنی تمام سادگیوں اور تمام پرکاریوں کے ساتھ اس مضمون میں سمٹ آئے ہیں۔ ایک ایک بیان کردہ

واقعہ بھرپور تاثر چھوڑتا اور احسان دانش کی شخصیت کو اجاگر کرتا ہے۔

## یاران کہن : عبدالمجید سالک : لاہور : دسمبر ۱۹۵۵ء

صاحب طرز ادیب اور کامیاب صحافی عبدالمجید سالک کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ اس میں بیس حضرات کے بارے میں مضامین ہیں جن کو مکمل خاکہ تو نہیں کہہ سکتے البتہ ان سے مصنف کے روابط اور تعلقات کی یادداشت کہہ سکتے ہیں۔ کسی کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کی صفات کو گنوانا خاکہ نگاری نہیں۔ گنوائے بغیر واقعات سے ثابت کرنا خاکہ نگاری ہے۔ مثلاً مولانا محمد علی کے بارے میں لکھتے ہیں

"محمد علی انگریزی کے شیوا بیان انشاء پرداز' اردو کے زود نویس اور دونوں زبانوں کے فصیح البیان خطیب تھے۔ ان کی جرأت ایمانی اور غیرت ملی مثال نہ رکھتی تھی۔" (۴۰)

"خدا کی نافرمانی کر کے بندوں کی فرمانبرداری نہیں ہو سکتی اور ان کی پوری زندگی اس اعلان کی عملی تصدیق تھی۔" (۴۱)

"مولانا بے انتہا محبت و شفیق بزرگ تھے اور اپنے نیازمندوں سے دلی محبت کرتے تھے۔" (۴۲)

"خدا پرستی' غیرت دینی' محبت اسلامی' روح ایثار' بہادری و بے باکی کی خوبیاں دونوں بھائیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر موجود تھیں۔ مولانا شوکت علی اپنی محبت پرور' بے تکلف اور پرخلوص طبیعت کی وجہ سے قومی کارکنوں' رضاکاروں اور عوام کے نزدیک اپنے بھائی سے کسی قدر زیادہ ہی محبوب تھے۔" (۴۳)

مولانا شوکت علی کے اوصاف ظاہری و باطنی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان میں تنظیم کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ ان کی ذات لطیفوں کا مخزن تھی۔ وہ آدمی نہیں انجن تھے۔ چندہ وصول کرنے کے ہتھکنڈوں سے خوب واقف تھے۔ ظاہری طور پر گویا گوشت پوست کے پہاڑ تھے۔

علامہ اقبال کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو متعارف کروایا ہے جن سے لوگ واقف نہیں۔ اگر علامہ کی شائع شدہ نظم کوئی رسالہ نقل کر لیتا تو اسے بغیر اجازت چھاپنے پر قانونی نوٹس دے دیا کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ "نظموں کے ترنم سے پڑھنے کا شعار سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب ہی نے اختیار کیا تھا۔ (۴۴)

علامہ اس بات کے قائل تھے کہ

"اصول فقہ کو زمانہ حال کی جیورس پروڈنس کے انداز پر از سر نو مدون کیا جائے۔" (۴۵)



اسی نوعیت کے کارآمد انکشافات مولانا ابوالکلام آزاد' سید ممتاز علی' مولانا ظفر علی خان' مولانا حسرت موہانی' خواجہ حسن نظامی وغیرہ کے بارے میں ہیں۔

## گنجینۂ گوہر : شاہد احمد دہلوی : کراچی : ۱۹۶۲ء

شاہد احمد دہلی کے معزز اور معروف خاندان سے تعلق رکھنے کے علاوہ ساقی کے مدیر' صاحب طرز ادیب اور سنجیدہ مزاج انسان ہونے کی وجہ سے ۱۹۴۶ء تک دہلی کے تمام حلقوں میں بالخصوص مقبول رہے ویسے ان کے تعلقات اردو کے تمام ادیبوں' شاعروں اور برصغیر کے مشاہیر کے ساتھ رہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے واقف کاروں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان میں دہلی کے علاوہ لاہور' حیدر آباد اور دیگر ثقافتی مراکز کے بزرگ شامل تھے۔ ان سے شاہد احمد کے تعلقات کی نوعیت اتنی قریبی تھی کہ ان کی شخصیت اور سیرت کو سمجھنے اور پیش کرنے میں ممد رہی۔ جب انہوں نے خاکے نگاری کے منصوبے پر عمل درآمد کرنا چاہا اور فہرست تیار کی جن کے بارے میں وہ وثوق سے لکھ سکتے تھے تو ان حضرات کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی۔ انہیں ان سب کے بارے میں لکھنے کے لئے وقت اور شائع کرنے کے لئے وسائل کی ضرورت تھی جو حاصل نہ تھے۔ پھر بھی انہوں نے درجنوں حضرات کے خاکے تیار کئے جو ساقی کی زینت بنے اور انہیں جمیل جالبی نے کئی جلدوں پر مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ گنجینۂ گوہر اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اس میں شامل ۱۷ خاکوں میں ابتدائی چند خاکے ان کے بزرگوں یا ان سے قبل کی نسل سے متعلق ہیں۔ ان میں مولوی نذیر احمد دہلوی' میر ناصر علی' استاد بے خود دہلوی' خواجہ حسن نظامی' بشیر الدین احمد اور مولانا عنایت اللہ شامل ہیں۔ ان میں نذیر احمد اور میر ناصر علی کے حوالے سے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ شخصی تجربے یا مشاہدے پر مبنی نہیں بلکہ دوسروں سے حاصل کردہ معلومات پر منحصر ہیں۔ یہ ایسے سوانحی کوائف اور سیرت کے پہلو ہیں جن کو یکجا کر کے ان کی تصویروں کو مکمل کیا ہے۔ دیگر حضرات میں سب ان کے معاصرین ہیں جن سے برابری کی سطح پر عرصہ دراز تک ان کے روابط رہے اور ان کی شخصیت کو سمجھنے اور پرکھنے کے انہیں لاتعداد مواقع حاصل رہے۔ ان خاکوں کی دو نمایاں خصوصیات ہیں ایک صاحب خاکہ کی شخصیت اور سیرت کو پیش کرتے ہوئے وہ کسی جانبداری سے کام نہیں لیتے۔ جس فراخ دلی ان کی اچھائیوں اور خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں اسی غیر جانبداری سے وہ ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ انسانی کمزوریوں کے ذکر سے منٹو' جگر' جوش اور میراجی کے خاکے خالی نہیں اور واقعہ یہ ہے کہ کوئی انسان نہ تو تمام تر خوبیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور نہ یکسر خامیوں کا مجموعہ!

انسان کی سیرت ان کے اجتماع ضدین سے ہی مرتب ہوتی ہے کہیں خیر غالب ہوتا ہے اور کہیں شر، شخصیت میں جو تناسب ہوتا ہے اسی کو خاکے میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے اور شاہد احمد اس خصوص میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ دوسری خوبی ان کا طرز نگارش ہے وہ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے تھے۔ اردو ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ دہلی کے روز مرہ محاورے پر انہیں کامل دسترس تھی۔ اگرچہ وہ زبان دانی کا دانستہ مظاہرہ نہیں کرنا چاہتے لیکن ان کی تحریر میں دہلوی زبان کے چٹخارے خود بخود داخل ہو جاتے اور مزہ دے جاتے ہیں۔ موضوع اور واقعہ کی مناسبت سے طرز تحریر تبدیل کرتے جاتے ہیں جس سے تصویر کا رنگ چوکھا ہوتا جاتا ہے۔

آخر میں ان کا اپنے بارے میں لکھا ہوا سوانحی خاکہ بھی شامل ہے جو ان کے بارے میں کام کرنے والوں کو بنیادی، اہم اور مستند معلومات فراہم کرتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مقدمے میں کتاب کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

## چہرے : شورش کاشمیری : کراچی : جنوری ۱۹۶۵ء

شورش کاشمیری ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے دور کے ہر بڑے پاکستانی اور ہندوستانی کو قریب سے دیکھا اور قریب سے پڑھا ہے۔ ان میں رہنما بھی تھے، علماء بھی، ادباء بھی، مدیر اور وزیر بھی، صحافی اور شاعر بھی۔ ایک دنیا ان کی نظروں کے سامنے رہی ان میں سے چند چہروں کا تعارف اس طریقہ سے کروایا جیسے انہیں دیکھا، پایا اور سمجھا۔ ان میں ایک حصہ "رہنما و علماء" کا دوسرا "وزارتی" تیسرا "خواتین" چوتھا "صحافتی و ادبی" پانچواں "شاعروں" اور چھٹا "دوستوں" کے چہروں پر مشتمل ہے۔ پروفیسر محمد سرور نے "پیش لفظ" میں اس حقیقت کا اظہار کر دیا ہے کہ

"شورش صاحب غیر جانبدار اور معروضی بہت کم ہوتے ہیں۔ یہ "چہرے" دراصل ان شخصیتوں کے متعلق شورش صاحب کے ذاتی تاثرات ہیں اور بس۔ ان میں آپ حقیقت واقعی کو زیادہ تلاش نہ کریں۔" (۴۶)

ایک صاحب علم کا تبصرہ اپنی کتاب میں شامل کر کے گویا شورش نے ان کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ اس لئے ان چہروں کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مصنف کے اپنے تعلقات ہی ان کی پسند اور ناپسند کے معیار ہیں۔ پہلا چہرہ قائداعظم کا ہے جس میں ان کے خدوخال کا اندازہ نہیں ہوتا۔ صرف تاثراتی تعارف ہے وہ بھی بے حد مختصر!

صدر ایوب کے بارے میں رقم طراز ہیں



"ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عام سیاست دانوں کی طرح بات چھپا کے نہیں رکھتے جو دل میں ہوتا ہے توپ کے گولے کی طرح داغ دیتے ہیں۔ اکل کھرے، مخیث انسان، ردیف و قافیہ ملانا نہیں جانتے لیکن طبیعت کسی موضوع پر پابند نہیں۔ طویل مشاہدہ، عمیق تجربہ اور گہرا مطالعہ ان کی ذکاوت پر دال ہے۔ محاورہ ہے چو مکھی لڑنا لیکن آج کل وہ ہشت مکھی لڑ رہے ہیں۔ جب تک فوج میں تھے ان کے سینے پر ملک کے بازوئے شمشیر زن کا تمغہ آویزاں تھا۔ اب چھ برس سے صدارت کا تمغہ بھی لٹک رہا ہے لیکن اس لٹک کے ساتھ کھٹک بھی ہے۔" (۴۷)

اس خاکہ میں ایوب خان کی شخصیت کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ ابوالکلام آزاد ان کے آئیڈیل تھے۔ ان کے مختصر سے خاکہ میں نہایت محتاط الفاظ میں اس طرح تصویر کشی کی ہے۔

"قامت میانہ، جون اکہرا، رنگ سرخ و سپید، آنکھیں اس عمر میں بھی آہواں صحرا دیکھ لیں تو چوکڑی بھول جائیں، نجیب الطرفین، ذات سید، پیشہ وزارت، انا کا مجسمہ، بے نیازی کی تصویر، انجمن آرائیوں سے محترز، خلوت آرائیوں کا شیدائی، خطابت میں یگانہ، صحافت میں منفرد، سیاست میں یکتا، عالم متبحر، زبردست مجتہد، حسن چہرہ میں ہویا آواز میں اس کی دل پذیری پر جی جان سے فدا۔" (۴۸)

"ابوالکلام، ابوالکلام نہ ہوتے تو تاج محل ہوتے، اور اگر تاج محل انسانی پیکر میں ڈھل جائے تو وہ ہرگز ہرگز ابوالکلام نہیں ہو سکتا۔" (۴۹)

یہی حال تمام چہروں کا ہے۔ مصنف نے اپنے تاثرات کے علاوہ کسی نوع کے بیان کو اہمیت نہیں دی ہے اور یہ تاثر کیوں قائم کیا ہے اس کے لئے واقعاتی شہادت بالکل نہیں ہے۔ تمام چہرے انشاء پردازی اور زور بیان کے بہترین نمونے ہیں لیکن شخصیت نگاری کے پیمانے پر پورے نہیں اترتے۔

## ہم نفسان رفتہ : رشید احمد صدیقی : (۱۹۶۶ء) پاکستانی ایڈیشن : لاہور : ۱۹۷۱ء

رشید احمد صدیقی صاحب طرز ادیب ہیں۔ ان کی ذات میں افسانہ گو، شخصیت شناس اور فلسفی سمائے ہوئے تھے۔ ان کی تحریروں میں یہ تینوں حیثیتیں بیک وقت ہیں۔ انہوں نے شخصیت نگاری کے فن کو امتیاز بخشا ہے۔ ان کا شمار خاکہ نگاری کے معماروں میں ہوتا ہے۔ ان کے خاکوں پر مبنی مجموعے "گنج ہائے گراں مایہ" (۱۹۴۷ء) "ہم نفسان رفتہ" (۱۹۶۶ء) میں شائع ہوئے۔

ان کے علاوہ "آشفتہ بیانی میری" "شیخ نیازی" اور "مضامین رشید" میں بھی خاکہ نگاری کے نمونے موجود ہیں۔

خاکہ نگاری میں رشید صاحب کی کامیابی کا راز شخصیتوں کا انتخاب ہے۔ انہوں نے ایسی شخصیات کو موضوع بنایا ہے جن میں کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ہو جس کی بناء پر ان سے تعلق خاطر پیدا ہو گیا ہو۔ وہ شخصیت کی تعمیر کے لئے ایک ماحول تیار کرتے ہیں اور اس میں اس طرح رنگ بھرتے ہیں کہ قاری کھو جاتا ہے۔ ان کا قلم قاری کو مسحور کر لیتا ہے۔ وہ ہر کردار کے منفرد پہلوؤں کو کبھی لطف لے کر، کبھی رنج و غم کے ساتھ اجاگر کرتے ہیں، وہ اپنے اسلوب سے مصائب کو وہ صورت دیتے ہیں جو کاغذ پر زندہ انسان کی طرح قاری سے متعارف ہوتے ہیں۔

اردو ادب میں رشید صاحب پہلے خاکہ نگار ہیں جنہوں نے ادب کے شائقین کو اس فن کی دلکشی کا احساس دلایا۔ ان کی خاکہ نگاری تخلیقی عمل رکھتی ہے۔ ان کی تحریر زیر لب مسکراہٹ کی دعوت دیتی ہے۔ لیکن وہ حزنیہ انداز میں آنکھوں کو نم کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں "کندن" کے مرنے پر لکھتے ہیں۔

"کندن مر گیا اور گھنٹے بجتے رہے۔ کندن کالج کا گھنٹہ بجاتا تھا۔ معلوم نہیں کب سے 'کم و بیش ۳۰، ۳۵ سال سے' اتنے دنوں سے' اس پابندی سے کہ اس طرف خیال کا جانا بھی بند ہو گیا تھا کہ وہ مر جائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آجائے گا۔ طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا۔ اس نے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدت ملازمت ختم کی۔ گھنٹے کی آواز روز مرہ اوقات میں ایسی گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے اندر سے آ رہی ہو۔" (۵۰)

رشید صاحب نے مولوی عبدالحق کی طرح معروف ہستیوں کے ساتھ کندن جیسے غیر معروف کو موضوع بنا کر اس فرض شناسی کے حوالے سے زندہ جاوید بنا دیا ہے، اس طرح ایوب انصاری ہوں یا اصغر سیل ان کے قلم کے ذریعے سب متعارف شخصیات اہم بن گئی ہیں۔ بلاشبہ رشید احمد صدیقی اس عہد کے کامیاب خاکہ نگار ہیں۔

**آپ : محمد طفیل : لاہور : ۱۹۶۷ء**

محمد طفیل کی شخصیت و خاکہ نگاری کی ضمن میں یہ تیسری کوشش ہے اس میں صرف چار خاکے نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی، اختر اورینوی اور کرشن چندر کے ہیں۔ ان میں سے کسی سے بھی ان کی طویل رفاقت نہیں رہی جس کی بناء پر وہ قابل اطمینان طریقہ سے عہدہ برآنہ ہو سکے جب کہ کرشن چندر اور اختر اورینوی پر انہوں نے دوسروں کے مطالبے پر قلم اٹھایا اس میں جس حد تک واقفیت کی صداقت ہے وہیں کچھ زور بیان زیب داستان کے لئے بھی ہے۔ انہیں پڑھتے ہوئے ان کا اعتراف پیش نظر رہنا چاہئے کہ



"سچی بات تو یہ ہے کہ نہ دل مطمئن اور نہ دماغ، اس لئے کہ ہر مضمون مجھ سے زبردستی لکھوایا گیا جنہیں میں نے محض دوستوں کو بہلانے کی خاطر لکھ ڈالا۔ یوں مجھ سے کسی بھی طرح ان مضامین کی تخلیق کا جرم ثابت نہیں ہوتا۔" (۵۱)

باوجود اس کے انہوں نے اپنے مخصوص انداز سے روگردانی نہیں کی۔ جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے اپنے علم اور مطالعہ کے لحاظ سے انہیں خوب پیش کیا ہے خوبیوں کے ساتھ خامیوں کی طرف بھی اس طرح اشارے کیے ہیں کہ ناگوار نہیں ہوتے مثلاً "نیاز کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"ہر نام کے پردے میں نیاز صاحب ہی ہوں گے اس لئے کہ بی جمالو والا کام یہ خوب جانتے ہیں۔" (۵۲)

"میرے ایک دوست ہیں انہوں نے نیاز صاحب کے بارے میں کہا تھا کہ یہ بڑے خود غرض ہیں، یہ بات تخن گسترانہ نہ سہی، یکسر غلط بھی نہیں ویسے خود غرض تو ہر آدمی ہوتا ہے۔" (۵۳)

نیاز اپنے مذہب مخالفانہ خیالات کے لئے بڑے بدنام رہے لیکن محمد طفیل کی نظر میں بڑے مذہبی آدمی تھے۔

"جہاں تک میرا خیال ہے نیاز صاحب اندر سے بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ انہوں نے اب تک مذہب کے بارے میں جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا ہے اس میں صرف جھوٹی مذہبیت کو جھنجوڑا ہے۔ اپنے ہوتے خدائی فوجداروں کے مذہبی پندار کو آئینہ دکھایا۔" (۵۴)

جوش کا خاکہ سب سے زیادہ فنکارانہ ہے۔ ان کی طفلی، مذہب دشمنی، شراب نوشی، عشق بازی، شاہد احمد دہلوی سے جھگڑا، دولت سے دلچسپی کے باوجود بے نیازی کا رویّہ، ان کے خد و خال ہر پہلو سے واضح ہیں۔ اس طرح کرشن چندر کی شخصیت کے حسن کا بیان ہے اور ان کی افسانہ نگاری کی بلندی و پستی کا محاسبہ بھی۔

**دہلی کی یادگار ہستیاں : امداد صابری : دہلی : ۱۹۷۲ء**

امداد صابری کے سینے میں دہلی کی پوری تاریخ محفوظ تھی۔ کچھ روایات بزرگوں سے سنی

تھیں کچھ حکایات کتابوں میں پڑھی تھیں کچھ باتیں آنکھوں دیکھی تھیں اسی طرح سارے احوال انہوں نے جمع کر کے یہ کتاب لکھی۔ اندرونی سرورق پر اس کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں لکھا۔

"اس میں دہلی کے پہلوانوں، پھنکیتوں، بانکوں، بنوٹ، پنجہ کلائی کے فنکاروں، خوشنویسی کے استادوں، دستکاری کے کارخانہ داروں، مفسروں، واعظوں، مصوروں، صحافیوں، ادیبوں، دہلی کے معلموں و شعراء اور معزز شخصیتوں کے حالات درج ہیں۔

تمام مضامین خاکہ نگاری کے ضمن میں نہیں آتے بلکہ دہلی میں ہونے والے محیر العقول واقعات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ تقریباً "پچاس حضرات کے مختصر خاکے تحریر کئے ہیں۔ ان میں کسی اصول یا ضابطہ یا لوازمات کا لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ ہر صاحب خاکہ کے بارے میں جس قدر معلومات فراہم ہو سکیں درج کر دی ہیں۔ کہیں سوانحی اشارے بھی ہیں۔ کہیں چند واقعات پر اکتفا کیا ہے اور کہیں خاکہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ جہاں وہ خاکہ نگاری پر متوجہ ہوتے ہیں وہاں کردار اور سیرت کے مختلف گوشوں کو عیاں کیا ہے۔ مجموعی طور پر اسے تاریخی اور تہذیبی ریکارڈ ہی کہا جا سکتا ہے۔

**تذکرۂ معاصرین : مالک رام : دہلی : جلد اول : ۱۹۷۲ء : جلد دوم : ۱۹۷۶ء**

مالک رام اردو کے بزرگ ادیب ہیں۔ اپنی طویل زندگی کے دوران بے شمار ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دیگر مشاہیر سے متعارف رہے۔ جن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ان کی گہری نظر رہی۔ انہوں نے جن احباب کا ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء کے دوران انتقال ہوا تھا ان کے احوال جلد اول میں اور جنہوں نے ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء میں رحلت پائی ان کے حالات جلد دوم میں قلم بند کئے ہیں۔ ہر ایک کے بارے میں مختصر مضمون تحریر کیا ہے۔ اگر حالات زندگی معلوم ہوئے ہیں تو درج کر دیئے گے۔ شعراء کے خصوصیات کلام پر اجمالی نظر ڈالی ہے اور نمونہ کلام پیش کیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی نہ تو یہ سوانح نگاری کے ضمن میں آتے ہیں اور شوکت سبزواری، عادل رشید، ممتاز شیریں جیسے لوگ بھی شامل ہیں جو شاعر نہ تھے۔ یہ اجمالی حالات مستقبل کے تاریخ نویسوں اور سوانح نگاروں کا بنیادی معلومات ضرور فراہم کر سکتے ہیں۔

**میرا شہر، میرے لوگ : طیب انصاری : حیدر آباد دکن : مارچ ۱۹۷۴ء**

طیب انصاری کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے۔ وہیں تعلیم حاصل کی اور وہاں کی ادبی



و ثقافتی روایات کو قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے شخصی تعلقات شاعروں، ادیبوں سے قریبی رہے ہیں۔ چنانچہ کتاب میں جن لوگوں کے سوانحی اور شخصی خاکے ہیں ان میں سوائے مسعود حسین خان کے سب اسی سرزمین سے پیدائشی تعلق رکھتے ہیں۔ مسعود حسین خان کو غالباً "حق شاگردی ادا کرنے کے لئے جگہ دی گئی ہے جب کہ ان کا تعلق اس شہر سے صرف بسلسلہ ملازمت رہا۔ محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین کے بڑے بھائی ہونے کے علاوہ ترقی پسند تحریک کے اہم ستون رہے ہیں۔ ان کی تنظیمی صلاحیتیں اور وقتی غیظ و غضب کو کردار کا حصہ بتایا ہے۔ ایم نرسنگ راؤ ایڈیٹر رعیت کو ان کی صحافیانہ خدمات، علم دوستی اور تعصب سے بالاتر ذہنیت کی وجہ سے قابل ذکر جانا ہے۔ اشفاق حسین کا تعارف ان کتابوں "مقام اقبال" اور "اختر کی ڈائری" کے حوالے سے کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ حسن الدین احمد، مبارز الدین رفعت، عاقل علی خان، شبلی یزدانی، احسن علی مرزا، عبد القادر جیلانی، احمد مکی، زینت ساجدہ، شیخ محمد، وقار خلیل، بانو طاہرہ سید، اعجاز قریشی، عابد انصاری، آمنہ ابوالحسن، چاند انصاری، محمود خاور اور خود مصنف کے مختصر حالات زندگی کے ساتھ ان کی شخصیت کے کسی نمایاں پہلو کو واقعاتی حوالوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ان سب کی نوعیت محض تعارفی ہے۔

**کتابی چہرے : سید ضمیر جعفری : راولپنڈی : ۱۹۷۶ء**

سید ضمیر جعفری نے اپنے دور کی ایسی ممتاز شخصیات کے خاکے "کتابی چہرے" کے نام سے لکھے ہیں جن سے ان کا "ذاتی طور پر نیاز مندانہ، برادرانہ یا دوستانہ تعلق رہا۔ اس لئے ان مضامین میں ایک سرور رفیقانہ کی روشنائی ابھری ابھری نظر آئے۔" مصنف نظم اور نثر میں شگفتہ بیانی کی وجہ سے معروف ہیں۔ ان کا مزاح دل خوش کن ہونے کے ساتھ دعوت فکر بھی دیتا ہے۔ انہوں نے برسوں کی شناسائی کے بعد شخصیت پر قلم اٹھایا ہے۔ اپنے گہرے مشاہدے اور طویل رفاقت سے جو تاثرات قائم کئے، انہیں قلمی خاکے کے طور پر مرتب کر دیا ہے۔ شخصیات، واقعات اور اوصاف سب حقیقی ہیں۔ ان میں رنگ آمیزی مصنف کی فنکاری کی مرہون منت ہے۔ شوخی تحریر کا اندازہ اس بات سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ ہر خاکہ کا عنوان شخصیت کا نام قرار دینے کی بجائے ان کے وصف خاص کی طرف اشارہ کرتا ہے جیسے سنگاپور کا میجر (چراغ حسن حسرت) لاہور کا قطب مینار (مولانا صلاح الدین) چیونٹی اور پہاڑ (ابوالاثر جالندھری) پوٹھوہار کا بابائے اردو (عبد العزیز فطرت) اردو ادب کا منگلا ڈیم (احمد ندیم قاسمی) اردو کا کوہ کن (احسان دانش) آواز دوست کی چند لہریں (مختار مسعود) اردو ادب کا جنرل رومیل (کرنل محمد

خان) اردو شاعری کی خاتون اول (ادا جعفری) عدم کا وجود (سید عبدالحمید عدم) اردو شاعری کا عقاب اعظم (عبدالعزیز خالد) اردو ادب کی دختر صحرا (جمیلہ ہاشمی) ادب میں لال قلعوں کا معمار (محمد طفیل) ادب کا حجرہ شاہ مقیم (عزیز ملک) طلسم مندری والی کتاب (صدیق سالک) کتابوں کی شہزادی کتاب (پروین سید فنا)۔

چراغ حسن حسرت کا قلمی خاکہ ان کے انتقال کے فوری بعد جون ۱۹۵۵ء میں لکھا گیا۔ دیرینہ بزرگ ساتھی کی وفات کے غم کو سہارتے ہوئے بھی اس میں شوخی بیان در آئی ہے چند جملوں میں پیکر تراشی ماہرانہ طور پر کی ہے مولانا صلاح الدین کے بارے میں لکھا ہے۔

"مولانا کی ذات میں محبوبیت اور دلنوازی کے بہت سے اوصاف جمع ہو گئے تھے ان میں ایک خوبی ان کی وسیع انسانی ہمدردی تھی۔ شہد سے زیادہ میٹھے، پھول سے زیادہ نرم، ہمہ شائستگی، پیکر خلق، آدمی ان کے سامنے بیٹھ کر اپنے آپ کو انسانی عظمت کے حضور بیٹھا محسوس کرتا تھا۔ وہ جتنے بڑے ادیب تھے اس سے زیادہ بڑے انسان تھے۔"

"میں نے انہیں کسی کی برائی کرتے نہیں دیکھا وہ اپنی جگہ ایک چٹان تھے مگر کسی کو فروتر نہ سمجھتے تھے۔ ان کا کوئی حلقہ نہ تھا۔ وہ سب کے تھے۔ اپنے ادبی نظریات کے بارے میں ان کے ذہن میں کوئی دھند نہ تھی مگر اپنے ادبی عقائد کو وہ سماجی تعلقات پر قطعاً "اثر انداز نہیں ہونے دیتے تھے۔" (۵۵)

ابوالاثر حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام لکھنے کے علاوہ ایک "چیونٹی نامہ" بھی تحریر کیا تھا اسی کی مناسب سے ان کے خاکے کا عنوان "چیونٹی اور پہاڑ" رکھا گیا۔ ان کے اوصاف کو دلچسپ انداز طرز میں یوں بیان کیا ہے

"سوائے شاعری کے ان کی کوئی چیز آسان نہیں رہ گئی۔ بازار میں ان کے ہمراہ سودا سلف خرید کر دیکھئے ایک روپیہ کی چیز پر پانچ روپیہ کی فاعلاتن فعلات کرتے ہیں۔ سبزی والے کے کھارے ٹماٹر اس طرح چھانٹتے جیسے انتخاب کلام داغ کرتے ہیں۔ گوشت کی عمدگی اور تازگی کے مسئلہ پر قصابوں سے اس شد و مد کی بحث کرتے ہیں کہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ آپ اب تک کسی قصاب کے ہاتھوں قتل نہیں ہو چکے۔" (۵۶)

"شاعری کے علاوہ پیدل چلنا اور ہانڈی ریندنا ان کے محبوب مشاغل ہیں، نہ دوسروں کا شعر آسانی سے پسند کرتے ہیں اور نہ دوسروں کی ہانڈی، گھر میں اپنا کمرہ، اپنی ہانڈی الگ رکھتے ہیں۔ ان کا کمرہ دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ



آگ ہے ہانڈی ہے چولہا ہے دھواں ہے زندگی

صوفے، کرسیاں اور میز ملاقاتیوں کے لئے رکھے ہیں۔ ملاقاتی نہ ہوں تو ان پر کتابیں بیٹھتی ہیں۔ خود فرش پر نشست رکھتے ہیں۔ سونا بھی فرش پر پسند کرتے ہیں۔ تین طرف کتابیں، بیاضیں، خطوط، کاغذات اور چوتھی طرف چولہا، کھانے پینے کے برتن، چٹنی، اچار، چورن، معجون مرکب وغیرہ۔" (۵۷)

عبدالعزیز فطرت کے مزاج کی سادگی اور شرافت کا ذکر بھی پُر مزاح انداز میں کیا ہے انہوں نے ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد لکڑی کے تختے کرایہ پر دینے کی دکان کھولی تھی۔ اس کاروبار کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"تختے چل بھی نکلے تھے مگر اتنی دور چلے گئے کہ تھوڑے ہی دنوں میں دکان کا تختہ ہو گیا۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ گاہک عموماً "واقف کار تھے جن سے کرایہ کا تقاضا کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ کسی بات کا تقاضا کرنا فطرت کے تقاضائے فطرت کے خلاف تھا۔ وہ عمر بھر جدوجہد کرتے رہے مگر تقاضا کبھی نہ کر سکے۔" (۵۸)

اسی طرح احمد ندیم قاسمی کو متعارف کروایا ہے، لکھتے ہیں

"شہرت پھیل جانے کے باوجود وضع قطع وہی تھی جو ہونی چاہیے تھی گاؤں کا ٹھیٹھ نوجوان، جیسے اپنی کسی نظم یا افسانے میں سے ابھی ابھی نکلا ہو۔ لباس سادہ مگر ستھرا، خلوص، سچائی اور انکسار کا پیکر، میٹھا میٹھا دھیمہ سا لہجہ، ٹھہر ٹھہر کر سوچ سوچ کر گویا کوئی لفظ ادا کرنے سے قبل اس کی ذمہ داری قبول کر رہے ہوں چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ، آنکھوں میں غیر معمولی چمک جو مروّت، ہمدردی اور خوش خیالی کے جذبے اور افق پار کسی چیز کی تلاش کی کاوش سے پیدا ہوتی ہے رخسار پر زخم کا وہ نشان بھی جو ندیم کی شخصیت کا "قومی نشان" ہے۔" (۵۹)

ہر خاکہ مصنف کے مزاج کی شگفتگی اور تحریر کی شوخی کا مظہر ہے لیکن انہوں نے مزاح کی خاطر شخصیت کو مسخ نہیں کیا ہے۔ ان کے اوصاف اور کردار کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے سنجیدہ سے موضوع میں مزاح کی چاشنی شامل کر دی ہے۔ شخصیت نگاری کے فن کو نبھانا اور طرز تحریر کو ازابتدا تا انتہا باقی رکھنا مصنف کا دونوں پر کامل عبور رکھنے کی دلیل ہے۔

### ندیم نامہ : مرتب محمد طفیل، بشیر موجد : لاہور : ۱۹۷۶ء

احمد ندیم قاسمی اردو کے جانے پہچانے شاعر، افسانہ نگار اور صحافی ہیں۔ ان کی شخصیت اور

ادبی خدمات کے تذکرہ کے لئے جس کتاب کی ضرورت تھی محمد طفیل مدیر نقوش اور بشیر موجد نے اپنے مساعی سے اسے پورا کیا ہے۔ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ شخصیت کے بارے میں ہے اور دوسرے حصے میں شاعری' افسانہ نگاری اور مزاح نویسی پر تبصرے اور آراء ہیں۔ تیسرا حصہ کلام' افسانوی اور فکاہی کالموں کا انتخاب ہے حالانکہ فریقین نے جب ایک اہم کام کی طرف توجہ کی تھی تو احمد ندیم قاسمی کی سوانح مختصر ہی سہی شامل کر دی ہوتی تاکہ مستقبل کے مورخ کو رہنمائی حاصل ہو سکتی۔ کتاب میں شخصیت کے حوالے سے ۹ مضامین شامل ہیں جن میں ان کے بھائی "پیرزادہ" نے بچپن کے واقعات اور ملازمتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں زیادہ زور اپنی شفقت اور ندیم کی "ملازمت بیزاری" پر دیا گیا ہے۔ ان کی صاحبزادی ناہید ندیم نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ندیم کی نجی زندگی' گھر والوں کے ساتھ برتاؤ اور عام ذہنی روش کا حال ملتا ہے۔ ساتھ ہی شفیق باپ کی شفقتوں کا سایہ اور بیٹی کی سعادت مندی کا عنصر بھی موجود ہے۔ ہاجرہ مسرور کے مضمون میں ان تمام باتوں کا اعادہ ہے جو "پیرزادہ" نے بیان کی ہیں۔ اگر یہ مضامین کسی رسالے میں مختلف اوقات میں شائع ہوتے تو گراں نہیں گزرتے جب کہ ایک ہی کتاب میں واقعات اور مطالب کی تکرار قاری کو ناگوار گزرتی ہے۔ احمد شفیع' ضمیر جعفری' ادا جعفری' مرزا ادیب نے حق دوستی ادا کرنے کا فرض نبھایا ہے۔ خالد اختر کا مضمون سب میں بہتر مواد پیش کرتا ہے۔ جس میں گہرے نفسیاتی مطالعہ کی رمق ملتی ہے جس نے ندیم کی شخصیت کو ٹٹولنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن موصوف نے انگریزی زبان کے بے شمار الفاظ استعمال کرکے یا تو اپنی ذہنی مرعوبیت کا اظہار کیا ہے یا قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ حد یہ کہ کسی کو "ورجن" کہنے کا حق وہ خود استعمال نہیں کرنا چاہتے یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو سامرسٹ ماہم کے حوالے سے! ایں چہ بو العجبی ست!!

ندیم قاسمی کی ہمہ جہت ادبی صلاحیتوں اور ان کی دل لبھا لینے والی شخصیت کے حوالے سے کتاب مقصد کو ادا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ زیادہ تر مضامین کا لب ولہجہ "تقریظ" اور "ستائش" کا ہے ندیم نے یہ منزلیں بہت پہلے طے کر لی ہیں۔ اب ان کے بارے میں ٹھوس اور مفید با مقصد' خیال افروز تحریروں کی ضرورت ہے جو "ندیم شناسی" کے لئے ممد ثابت ہوں۔

## چند یادیں : خواجہ جمیل احمد : کراچی : ۱۹۷۷ء

خواجہ جمیل احمد نے ایسے اشخاص کے خاکے لوح دماغ سے قرطاس پر منتقل کر دیے ہیں جنوں نے ان کے دل ودماغ کو متاثر کیا اور جن کو انہوں نے قریب یا دور سے دیکھا ہے ان



(۵۴) شخصیات میں چند ہی ہیں جن سے انہیں اتنا قرب حاصل رہا ہو کہ ان کی سیرت کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کر سکیں۔ ان میں سے اکثر سے ان کی ایک یا دو ملاقاتیں ہوئی تھیں اور بعض سے تو ملاقات ہوئی بھی نہیں۔ بہرحال ان کی معلومات کے جو بھی ذرائع ہوں انہوں نے ان تمام کو دیانت داری سے پیش کر دیا ہے۔ اگرچہ ان کی صداقت شک وشبہ سے بالاتر نہیں' انہوں نے لکھا ہے کہ

"۱۹۱۱ء میں طرابلس کی جنگ کے دوران اطالوی حملہ آوروں کے خلاف مضامین لکھنے کے جرم میں مولانا حسرت موہانی کے پریس سے ضمانت طلب کی گئی تھی۔" (۶۰)

اس بیان میں سن بھی درست نہیں ہے۔ ضمانت طلبی ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔ بیان کردہ وجہ بھی درست نہیں ہے۔ خاکہ نگاری معلومات کے ذریعے وہ مضامین ہیں جو وقتاً "فوقتاً" شائع ہوتے رہے۔ انہیں کم از کم ریکارڈ درست رکھنے کے لئے تحریر سے قبل تحقیق سے بھی کام لینا چاہیے تھا۔

مضامین کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ سیاسی خاکوں پر مشتمل ہے ان میں برصغیر کی سیاست شخصیات کے علاوہ کرنل معمر قذافی کو بھی شامل کیا ہے ان کے بارے میں معلومات کا ذریعہ بالواسطہ ہی ہو سکتا ہے۔ دوسرے حصے میں شعراء' ادباء' مفکرین' معلمین اور فنکار ہیں۔ تیسرا حصہ "خصوصی خاکے" چوتھا "مزاحیہ خاکے" پانچواں "دیگر خاکے" پر مشتمل ہے۔

روایات اور بالواسطہ معلومات کے علاوہ اختصار کی وجہ سے خاکہ نگاری کا حق ادا نہیں ہو سکا۔

## وفیات ماجدی : عبدالماجد دریا بادی : لکھنؤ : ۱۹۷۸ء

اردو ادبی صحافت میں جانے پہچانے حضرات کی وفات پر اس طرح کے مضامین لکھنا کہ ان پر شخصیت نگاری کا اطلاق بھی ہو سکے ایک اچھی روایت رہی جس کی جانب پہلے پہل مولانا سید سلیمان ندوی نے توجہ کی "وفیات" کے تحت ان کے ۵۰ سے زائد مضامین "معارف" اعظم گڑھ میں شائع ہوئے۔ عبدالماجد دریا بادی بھی اس رسالہ سے منسلک رہے اور اس میں ایسے ہی مواقع پر خاکے تحریر کئے جنکا سلسلہ "صدق جدید" میں بھی جاری رہا۔ اس کتاب میں باسٹھ خاکے یا مضامین ہیں۔ ان میں کردار نگاری' سراپا نگاری اور محاکات موجود ہیں۔ "معاصرین" کا جو شگفتہ انداز ہے وہ اس میں موجود نہیں۔ موقع کی مناسبت سے اسلوب حزنیہ ہے۔

مولانا حسرت موہانی کی وفات پر جو شذرہ لکھا وہ ان کی سیرت کا جامع خاکہ ہے لکھتے ہیں

"سیاست میں اپنی ذات سے خود ایک انجمن' ایک ادارہ' ایک پارٹی تھے۔ شروع میں اپنے کو منسوب تلک اسکول سے کرتے تھے اور اب ایک عرصہ سے اپنے کو کمیونسٹ کہنے لگے تھے لیکن حقیقتاً" وہ مقلد کسی کے بھی نہ تھے۔ مجتہد اگر نہیں تو منفرد ضرور تھے۔ کانگریس میں جب تک رہے ساتھیوں سے لڑتے بھڑتے اور آزادی کامل کا علم بلند کئے رہے۔ تحریک خلافت میں رہے تو اسی شیردلی کے ساتھ اور مسلم لیگ میں جب کام کیا تو حد یہ کہ قائداعظم جناح صاحب کی شخصیت سے بھی نہ دبے۔

مذہبی اتنے کہ کسی میٹنگ' کسی جلسہ میں ہوں' ادھر نماز کا وقت آیا' ادھر وہ میلی کچیلی شیروانی اتاری اور اسی کو جائے نماز بنا کر کمرے میں' برآمدے میں' جہاں بھی جگہ مل جائے نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے۔" (الف ۶۰)

گزرے ہوئے لوگوں کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھنا ہوں تو "وفیات ماجدی" میں ملیں گی۔

## معاصرین : عبدالماجد دریا بادی : کلکتہ : ۱۹۷۸ء

عبدالماجد دریا بادی کی شخصیت نگاری کی ابتدا ۱۹۲۱ء میں ہوئی جب کہ انہوں نے "مہدی حسن" کے عنوان سے پہلا خاکہ لکھا جو مہدالافادی کی وفات پر ہمدم لکھنؤ میں شائع ہوا اور ۱۹۲۳ء میں "افادات مہدی" کے اختتامیہ کے طور پر شامل کیا گیا۔ انہوں نے باقاعدہ اس صنف میں لکھنا ۱۹۷۰ء کے بعد شروع کیا اور ۱۹۷۳ء سے صدق جدید میں شائع کرنے لگے۔ شائع شدہ وہ خاکے اس کتاب میں شامل ہیں۔ انہوں نے ان تمام معاصرین اور شخصیات کی سچی تصویریں کھینچ دی ہیں۔ ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں' حسرتوں اور نارسائیوں' امیدوں اور خوشیوں کی داستان کو دلچسپ انداز میں قلمبند کیا ہے۔ یہ تمام شخصیات ایک عہد میں گزری ہیں۔ اس لئے اس عہد کے سیاسی' سماجی' تہذیبی اور فکری احوال کا ذکر بھی ضروری تھا لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کو خاکہ پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ کہیں کہیں خاکہ میں محاکمہ بھی ہے لیکن اس قدر مختصر ہے کہ خاکہ کی ہیئت کو متاثر نہیں کرتا۔ ان کی صداقت پسندی نے خوبیاں بھی پیش کی ہیں اور لحاظ یا مروت سے برائیوں کے اظہار میں بھی کوتاہی نہیں کی ہے۔ مثلاً خواجہ حسن نظامی کے کردار کو توصیفی انداز میں پیش کرتے ہوئے یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ

"ایک دوسرے حسن نظامی بھی تھے۔ دینی شخصیتوں کی توہین کرتے' اہل سنت کی دل آزاری کی پروانہ کرتے اور مجاہد امت اور پیشوائے ملت محمد علی (مرحوم) کو دکھ پہنچانے میں ناگفتہ حدود



تک پہنچ جاتے ان دونوں حسن نظامی کا معاملہ بس اللہ ہی کے حوالے کرتا ہوں۔" (۶۱)

وہ اپنے مرشد مولانا حسین احمد مدنی سے زیادہ مولانا اشرف علی تھانوی کا احترام کرتے تھے اس کے باوجود یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ

"حضرت تھانوی کی نشرالطیب بھی بجائے ایک مرتبہ رکھتی ہے لیکن علمی' تاریخی' تحقیقی معیار سے سیرت النبی ﷺ اور نشرالطیب میں جو فرق ہے اسے کیسے مٹایا جا سکتا ہے۔" (۶۲)

یہ خاکے شگفتہ ہیں اور علمیت کی گرانباری ان میں نہیں ہے۔ ان خاکوں میں سراپا نگاری' کردار نگاری کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ عبدالماجد دریا بادی نے صداقت اور حقیقت نگاری کی مثال قائم کردی ہے۔ اپنے مخالفین کی اچھائیوں کو بھی نمایاں کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ اس ضمن میں مولانا مودودی اور نیاز فتح پوری کے خاکے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

انشاءپردازی کے ہنر اور شخصیت نگاری کے فن کے اعلیٰ ترین نمونے "معاصرین" میں ملتے ہیں۔

## بزم رفتگان : سید صباح الدین عبدالرحمان : دہلی : نومبر ۱۹۸۱ء

سید صباح الدین اپنی علمی بلندی اور تحریری صلاحیتوں کے ساتھ شبلی اسکول کی نمائندہ شخصیت ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی' مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی علمی روایت کو انہوں نے ہی آگے بڑھایا ہے۔ ان بزرگوں نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے ان کے اوصاف حمیدہ' دینی خدمات' فکر و نظر کی اہمیت کو مدنظر رکھا اور انہیں باتوں کو آنے والی نسلوں کے لئے راہ ہدایت بنانے کے لئے سپرد قلم کیا ہے۔ ان سب کی تحریروں میں صرف زور بیان سے بات منوانے کا جذبہ نہیں ہے۔ وہ صداقتوں کی طاقتوں کو جوش بیان سے زیادہ اہمیت دیتے رہے۔ ان کی شایان شان عقیدت تو ہے لیکن اندھی تقلید کے لئے نہیں بلکہ کارناموں کے اعتراف کے طور پر' اس دبستان کی نمائندگی کرتے ہوئے سید صباح الدین عبدالرحمان نے بے شمار مضامین لکھے جو مقبول بھی ہوئے اور مستند بھی گردانے گئے۔

"یاد رفتگان" میں مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی' چودھری عنایت اللہ دہلوی' مولانا سید سلیمان ندوی' مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالسلام کے مختصر سوانح ان کے اوصاف اور دینی و علمی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک عالم کسی بھی عالم کا غیر متعصبانہ مطالعہ جس طرح کرسکتا ہے وہی صورت ان مضامین کی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے ان سے بہتر مطالعہ

کا حق اور کون ادا کر سکتا ہے جو تعلق مولانا شبلی اور مولانا سلیمان ندوی کے درمیان رہا ایسا تعلق مولانا سلیمان ندوی اور سید صباح الدین کے درمیان بھی تھا۔ ان میں ہر استاد اپنے اپنے شاگرد کو وہ سب کچھ دے دیا جو ان کے قلب وذہن وروح میں تھا۔ سید صباح الدین نے اس کتاب میں اپنے استاد کے بارے میں چھ مضامین شامل کئے ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون مختصر ہونے کے باوجود ان کی جامع سوانح عمری ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے ہر دور زندگی اور اس کی مصروفیات اور کارناموں کو پیش کر کے انہوں نے آئندہ لکھنے والوں کے لئے بنیاد فراہم کر دی ہے۔ "استاذی المحترم" کی رحلت پر ہم پر کیا گزری۔ خالصتاً "تاثراتی ہے ان کے علاوہ بھی جو مضامین ہیں ان میں عقیدت کے واضح نقش ہیں۔ وہ کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ

"میرے یہ مضامین تاثراتی رنگ کے ہیں جن سے مجھ کو عقیدت اور محبت رہی۔ انہی پر مضامین لکھنا پسند کیا۔ اگر میں کسی کو ناپسند کرتا تو اس پر مضامین لکھنا پسند کیوں کرتا؟ پھر ظاہر ہے کہ میرے ان مضامین میں صرف عقیدت ومحبت ہی کے لالہ وگل ہوں گے۔" (۶۳)

مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی کے حالات زندگی بہت مختصر ہیں یہ انہیں معلومات تک محدود ہیں جو مضمون نگار کے علم میں تھے۔ وہ شخصیت' اوصاف اور کردار پر بھی روشنی ڈال سکتے تھے لیکن ایسا نہیں کیا ہے۔

دہلی کے ایک سو سے زائد کتابوں کے مصنف مولوی ذکاء اللہ کے فرزند مولوی عنایت اللہ کے حالات ان کی قابلیت' تصنیفی صلاحیت اور ترجمہ کرنے میں مہارت کا حال بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ مولوی ذکاء اللہ اور مولوی عنایت اللہ کی صلاحیتوں کے سرسید بھی معترف تھے لیکن زمانہ نے ان دونوں بزرگوں کو بھلا رکھا ہے۔ سید صباح الدین نے ان کے ہر نقش کو تازہ کیا ہے۔ خراج عقیدت کے وہ سب پھول ان کی خدمت میں پیش کئے ہیں جن کے وہ مستحق تھے۔

مولوی عبدالسلام ندوی کے بارے میں جو مضمون ہے وہ سوانحی کوائف سے یکسر خالی اور ان کی شخصیت کے مطالعہ پر منحصر ہے۔ ان میں ان تمام خوبیوں کی موجودگی کی نشاندہی کی ہے جو ان کے استاد مولانا شبلی اور ان کے ہم عصر مولانا سلیمان ندوی میں موجود تھیں۔ مولوی عبدالسلام ندوی کا موازنہ ان سے خوب کیا ہے لکھتے ہیں۔

"حضرت سید صاحب اور مولوی عبدالسلام ندوی اس ادارے کے افق پر علمی حیثیت سے مہ وماہ بن کر چمکے۔ دونوں علامہ شبلی کے علمی جلال اور ادبی جمال کے مظہر تھے۔ لیکن اس علمی اشتراک و یکجہتی کے باوجود دونوں میں بڑا فرق رہا۔ ایک صرف علم کے لئے تھا دوسرے کے لئے



خود علم تھا۔ ایک کے یہاں غیر معمولی محنت وریاضت تھی دوسرے کے ہاں جو کچھ تھا قدرت کا عطیہ تھا۔ ایک کے سامنے علمی دنیا جھکتی رہی دوسرا علمی دنیا سے منہ موڑتا رہا۔ ایک نے اپنے رہنے سہنے' اٹھنے بیٹھنے اور ملنے جلنے میں اپنے علم کے وقار کو قائم کر رکھا تھا' دوسرا ہر چیز سے بے نیاز' مستغنی اور اپنی دنیا بالکل الگ بنا کر مست وسرشار رہا۔" (۶۴)

اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانی کے بارے میں واقعات وتاثرات بھی مولانا سلیمان ندوی کے حوالے سے ہی دیئے ہیں۔ ان دونوں یگانہ روزگار حضرات کے درمیان جو رشتہ مودت قائم تھا اس کے دلنشین واقعات روح پرور ہیں۔ مولانا مناظر احسن کا سوانحی خاکہ ان کی شخصیت کے مطالعہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ سید صباح الدین لکھنے کے دوران وفور جذبات سے دل کو قابو میں رکھنے کے قابل ہی نہ تھے یہ جوہر خالصتاً "مشرقی مزاج کی ترجمانی کرتا ہے۔

### آسمان کیسے کیسے : صادق الخیری : کراچی : اکتوبر ۱۹۸۱ء

"آسمان کیسے کیسے" اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ مصنف کو معروف لوگوں بالخصوص ادیبوں' شاعروں کے آٹوگراف لینے کا شوق تھا۔ انہوں نے ادیبوں' شاعروں' اہل بینش اور دیار غیر کے لوگوں کے آٹوگراف لئے۔ اس کتاب میں ان کے عکس بھی ہیں اور جس پس منظر میں یہ آٹوگراف لکھے گئے ان کے بیان کے علاوہ آٹوگراف دینے والوں کی شخصیت اور ان سے ملاقات کی تفصیل' نیز اس دور کے تمدن اور معاصرین کی جھلکیاں ہیں چونکہ خاکہ نگاری مصنف کا مقصد اصلی نہیں تھا اس لئے ملاقاتوں کا حال اور اس کے تاثر پر زیادہ لکھا گیا ہے۔ خاکہ برائے نام ہے۔ اکثر مقامات پر اپنی ذات کے حوالے سے ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں جو بے حد بے جوڑ معلوم ہوتی ہے۔

### محفل : حسن الدین احمد : حیدر آباد دکن : فروری ۱۹۸۲ء

"محفل" میں حسن الدین احمد نے ۲۹ شخصیات کے مختصر سوانحی حالات اور ان کی ذات کے حوالے سے کچھ واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ان کی شخصیات میں زیادہ تر کا تعلق ریاست حیدر آباد سے رہا ہے۔ مصنف نے اپنی تحریر کے ذریعہ نہ تو سوانح نگاری کا حق ادا کیا ہے اور نہ سیرت نگاری کا۔ یہ مضامین ان کی معلومات کا اظہار کرتی ہیں جو کسی فنی مقصد کو پیش نظر رکھے بغیر لکھے گئے۔ ان میں سے اکثر باتیں ایسی ہیں جو ضبط تحریر میں آکر لوگوں کے علم کا موجب بن چکی تھیں

اور بعض باتیں حقائق پر مبنی ہیں اکثر اہل قلم کی طرح مصنف نے بھی نظم "واکرنامہ" کو مولانا ظفر علی خان کی جودت طبع کا نتیجہ قرار دیا ہے جو غلط ہے۔ خود مولانا نے یہ نظم تحریر کرنے سے انکار کیا ہے "دیش بندھو" (مجیب الرحمان) کے بارے میں ان کے خیالات میں ابہام ہے۔ ایک طرف تو وہ بنگلہ دیش کا نجات دہندہ شمار کرتے ہیں اور دوسری طرف ان کے قتل کو مکافات عمل نہیں بلکہ حکم قتل وقدر قرار دیتے ہیں۔ البتہ سرجیت سنگھ لانبہ پر مضمون لکھ کر انہوں نے اچھا اقدام کیا ہے۔ لانبہ اردو کے پرستار' اقبالیات کے ماہر' اسلام کا گہرا مطالعہ کرنے والے فرد اور مذاہب کا تقابلی جائزہ لینے کے حوالے سے منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان پر بہت کچھ لکھا جانا چاہئے کہ ان کی شخصیت کے جائز تعارف کا حق ادا ہو سکے۔ یہ مضمون بھی تشنہ ہے لیکن ایک فرض کی ادائیگی کا احساس دلاتا ہے۔ کم وبیش ہر مضمون کے مطالعہ کے بعد تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

**کیا قافلہ جاتا ہے : نصراللہ خان : کراچی : ۱۹۸۴ء**

نصراللہ خان معروف صحافی ہیں جنہوں نے صحافت کی تربیت مولانا ظفر علی خان سے حاصل کی۔ پاکستان کے بڑے قومی اخبارات سے بحیثیت کالم نگار منسلک رہے ہیں۔ ان کے کالم سنجیدہ بھی ہوتے ہیں لیکن ان کی شہرت فکاہیہ تحریروں کی بناء پر ہے۔

نصراللہ خان نے "کیا قافلہ جاتا ہے" میں ۴۰ مشاہیر علماء' ادباء' شعراء' سیاست دانوں اور ماہر فنون کو موضوع بنایا ہے۔ مضامین کی نوعیت شخصی خاکوں کے ساتھ ساتھ دیگر معلومات اور یادداشتوں کی ہے۔ کہیں مختصر سوانحی اشارے ہیں' کہیں دوسروں کے حوالے سے بیانات رقم کئے ہیں۔ زیادہ تر باتیں ذاتی مشاہدے اور مطالعہ پر منحصر ہیں۔ ہر ایک شخصیت کے ایک سے زائد پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ مولانا عبدالعزیز میمن کی فضیلت' علمی تجربے اور عربی زبان دانی بتائی ہے اور انہیں ادب عربی کی انسائیکلوپیڈیا قرار دیتے ہوئے متعدد حوالے دیئے ہیں۔

مولانا سید عطاء اللہ شاہ کا خاکہ ان کے پرجوش لاثانی خطیب' بے باک انگریز دشمن' ذاتی طور پر نہایت مفلس مگر قناعت پسند انسان کی تصویر پیش کرتا ہے۔

مولوی عبدالحق کام کے دھنی' خود کام کرنے والے اور ٹیم بنا کر کام لینے والے' ماہر تعلیم' اردو دوست' کلاسیکی موسیقی کے شیدائی' معصوم شرارتوں سے بھرپور شخصیت بن کر سامنے آتے ہیں۔



سب سے دلچسپ خاکہ مولانا عبدالسلام نیازی کا ہے۔ ویسے بھی مولانا کی شخصیت دلچسپ تھی۔ مصنف نے ان کی تصویر میں جان دار رنگ بھرے ہیں۔ ان کا حلیہ یہ تھا کہ سر گھٹا ہوا' چار ابرو کا صفایا' اگر سر پر چوٹی ہوتی اور دھوتی باندھتے تو متھرا کے پانڈے معلوم ہوتے۔ پان کی سرخی باچھوں سے بہہ کر ٹھوڑی تک آجاتی۔ ململ کا کرتا جس پر کتھے چونے کے داغ دھبے' چست پاجامہ' آواز کراری' بہت بڑے عالم' اللہ والے اور صوفی تھے۔ سارے ہندوستان پر ان کی علمیت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ شکل وصورت اور حلیہ سے ان کی ذات کی گہرائی کا پتا نہ چلتا تھا۔ گالیاں دینے میں ماہر تھے۔ ان کی گالیاں بھی فصاحت وبلاغت کا انداز لئے ہوئے ہوتی تھیں۔ عالموں میں عالم' رندوں میں رند' طوائفوں کا گانا سننے کا شوق' بذلہ سنجی اور فقرہ بازی میں اپنی مثال آپ' ایسی متنوع شخصیت کو کامل خدوخال کے ساتھ پیش کیا ہے۔

خاکہ نگاری کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ شخصیت کے ایک یا ایک سے زائد ایسے پہلوؤں کو چابک دستی سے احاطہ تحریر میں لایا جائے کہ وہ شخصیت کی شناخت بن جائے۔ نصراللہ خان کے گہرے مشاہدہ اور وسیع معلومات نے خاکہ نگاری کے مقصد کو کماحقہ طور پر حاصل کیا ہے۔ ان کا انداز بیان اور انداز نظر دوسروں سے مختلف اور پرکشش ہے۔

خاکہ نگار نے جہاں معروف لوگوں کے خاکے لکھے ہیں وہاں چند غیر معروف شخصیات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ظاہر ہے کہ قابل لحاظ اوصاف بڑے اور معروف لوگوں ہی میں نہیں ہوتے۔ گمنام لوگ بھی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ انہیں موضوع بنانا انسان دوستی اور حقیقت شناسی کے زمرے میں آتا ہے۔

نصراللہ کی طرز تحریر میں انفرادی شان ہے۔ وہ لفظوں سے کھیلتے ہیں اور ان کی معنویت میں بھی اضافہ کرتے جاتے ہیں۔ شوخی طبع اس پر مستزاد ہے۔

**یادِ رفتگان (جلد اول) : ماہر القادری : مرتبہ طالب ہاشمی : کراچی : ۱۹۸۴ء**

ماہر القادری ایک دور میں نہایت مقبول شاعر تھے۔ غیر منقسم ہندوستان کے ہر بڑے مشاعرے میں انہیں بہ اصرار بلایا جاتا تھا۔ ان کے اشعار کی خوبصورتی اور ان کے ترنم کی دلنوازی ہی ان کی مقبولیت کے اسباب تھے۔ مشاعروں میں شرکت کی خاطر انہیں اقصائے ہند شہر شہر کی خاک چھاننی پڑی۔ ویسے بھی ان کا شوق سیاحت انہیں ایک جگہ ٹک کر نہ رہنے دیتا تھا۔ ان مشغلوں کے دوران انہیں ہزاروں معروف اور غیر معروف لوگوں سے ملاقات کے مواقع

حاصل رہے۔ خصوصاً "ان حضرات سے جو مذہب، علم، ادب اور شاعری کے حوالے سے ممتاز تھے۔ ماہرالقادری خود بھی مجلسی آدمی تھے۔ احباب اور شناساؤں کے ہجوم سے کبھی نہ گھبراتے۔ شوق گفتار اور شوق سماعت کی بناء پر ان کی محفلیں طویل ہوتی تھیں۔ جن میں ہر نوع کے موضوعات پر کھلے دل سے تبادلہ خیال ہوتا اور اختلاف رائے بحث کے ذریعہ دور نہ ہونے کے باوجود ان کے تعلقات کی استواری میں فرق نہ آیا تھا۔ ماہرالقادری انسان دوست بھی تھے۔ علم دوست بھی۔ ان کی ملاقاتیں جن حضرات سے ہوئیں ان کی شخصیت و کردار کے نقوش اور ان کے خیالات کے اثرات کو ذہن و قلب میں محفوظ رکھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان کے نقوش اور اثرات کے مدہم ہونے سے قبل ہی انہیں قرطاس پر منتقل کر دیا جاتا لیکن ماہر نے دانستہ یا نادانستہ طور پر اس ذمہ داری کو ان کی رحلت تک اٹھائے رکھا۔ جانی پہچانی ہر شخصیت کے انتقال پر "یاد رفتگان" کے زیر عنوان مضامین کا ایک سلسلہ ان کے رسالہ "فاران" کراچی میں ۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۸ء تک جاری رہا۔ تیس سال کے طویل عرصے میں انہوں نے ایسے مضامین بکثرت لکھے جن کو ماہرالقادری کے انتقال کے بعد حسب صراحت دیباچہ طالب ہاشمی نے مرتب و شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ زیر نظر جلد اول ہے جو ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئے۔ اس میں ان لوگوں کے خاکے ہیں جن کے اسمائے گرامی حروف تہجی الف سے فا تک سے شروع ہوتے ہیں۔ خاکے تعداد میں ۹۶ ہیں جبکہ جلد تقریباً "چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ماہر نے خاکے لکھنے میں ممکنہ اختصار سے کام لیا ہے اور خاکوں کے مرتب نے کانٹ چھانٹ کر مختصر کر دیا ہے۔ جو انہیں نہیں کرنا چاہئے تھا۔ جن شخصیات پر لکھا گیا تھا ان میں کثیر تعداد شاعروں اور ادیبوں کی ہے۔ صرف چند عالم یا سیاست دان شامل ہیں۔

جن مشاہیر اور بزرگوں کے خاکے انہوں نے لکھے ہیں ان سب سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے اور ان کے بارے میں جس قدر معلومات انہیں حاصل تھیں ان کے ذکر پر اکتفا کیا ہے اور اگر کہیں سنی سنائی بیان بھی کی ہے تو اس کا حوالہ دے کر خود بری الذمہ ہو گئے۔ ایسی احتیاط سنین کے حوالوں میں کی ہے۔ ان خاکوں میں اکتا دینے والی یکسانیت نہیں ہے بلکہ شخصیت اور اس کے ساتھ تعلقات کے لحاظ سے رویہ اختیار کیا ہے۔

شخصیت کا تعارف کرواتے ہوئے کبھی سراپا کا ذکر کرتے ہیں، کبھی خاندانی حالات کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ صفات علمی و ذاتی کے بیان میں بھی بخل سے کام نہیں لیتے اور کبھی کبھار سیاسی، تاریخی یا سماجی پس منظر کا حوالہ بھی دے جاتے ہیں۔ ان خصوصیات کی وجہ سے قاری سے مکمل



شخصیت کا تعارف نہ ہوتا ہو لیکن نمایاں باتیں ضرور معلوم ہو جاتی ہیں۔

سید آل رضا کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سید آل رضا مرحوم کے نقش و نگار، رنگ و روپ اور قد و قامت میں دلکشی پائی جاتی ہے۔ ان کے جسم پر لباس پھبتا ہے۔ ان کی نشست و برخاست نستعلیق اور رہن سہن شریفانہ تھا۔ لب و لہجہ میں نرمی اور شائستگی۔"(۶۵)

مولانا سید ابن حسن جارچوی کی ظاہری شخصیت یوں پیش کی ہے کہ

"رنگ سپید اور کھلتا ہوا تھا، ناک نقشہ دبیز مگر متناسب، جوانی میں خوبرو رہے ہوں گے۔ کم و بیش دس سال سے اسی حالت میں گزارے کہ مفلوج قویٰ کے ساتھ چلنا پھرنا دوبھر تھا۔"(۶۶)

اور سلام مچھلی شہری سے تعارف کا حال بیان کرتے ہوئے ان کی کیفیت لکھی ہے کہ

"فٹ پاتھ پر سلام مچھلی شہری سے تعارف ہوا۔ اس وقت ان کی عمر بیس برس کی ہو گی۔ پیروں میں ٹوٹے ہوئے چپل، لٹ لٹ کا ملگجا پاجامہ، دیکھنے میں کم رو مگر آنکھوں میں ذہانت جھلکتی تھی۔ پھر پانچ سال کے بعد ان کو بہتر لباس میں دیکھا۔ ۱۹۶۰ء میں ماہنامہ کی سلور جوبلی منائی گئی تھی۔ میں مدارس کے مشاعرے سے فارغ ہو کر بمبئی آیا۔ "جشن شاعر" کے مشاعرے میں سلام مچھلی شہری نظر آئے۔ اب تو رنگ ہی کچھ اور تھا۔ ان کا چھریرا بدن گھٹیلا ہو گیا تھا۔ جسم پر قیمتی سوٹ پھبتا تھا۔ شراب کے نشے میں دھت ان کے پڑھنے کی باری آئی تو مائیک پر آکر تقریر کر ڈالی جو زبان حال سے کہہ رہی تھی۔

"یارو مجھے معاف کرو میں نشے میں ہوں۔"(۶۷)

سلام مچھلی شہری کے یہ چند روپ اس خوبی سے بیان کئے گئے ہیں کہ اس کے بعد شخصیت پر تبصرہ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اس چابک دستی نے کچھ نہ کہہ کر سب کچھ کہہ دینے کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

جہاں ان کی یادداشت نے ساتھ دیا ہے وہاں خاندانی پس منظر اور متعلقہ تاریخی معلومات پیش کر کے ان خاکوں میں رنگ بھرا اور اس کی افادیت میں اضافہ کیا ہے اور اس پس منظر میں شخصیت کے خدوخال کی تکمیل کی ہے۔ اگرچہ فنی نقطہ نظر سے اس کی ضرورت نہ تھی۔

شاہد احمد دہلوی کے بارے میں لکھا ہے

"ان کے دادا ڈپٹی نذیر احمد ریاست حیدر آباد دکن میں صوبے دار تھے اور اخراجات کے معاملے میں بڑے محتاط اور جزرس، انہوں نے بہت کچھ دولت چھوڑی ان کے بعد ان کے

اکلوتے بیٹے اور شاہد مرحوم کے والد بشیر الدین احمد برسوں حیدر آباد میں اول تعلقدار (کلکٹر) رہے۔ دو پشتوں کا اندوختہ اور ہزاروں کی سکنی جائداد ورثہ میں ملی۔ شاہد صاحب نے دہلی میں بڑی بے فکری کی زندگی گزاری۔ مکانوں کا اتنا کرایہ مل جاتا کہ اخراجات کے لئے کافی تھا۔ یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگریاں رکھنے کے باوجود ان کا خیال تک ملازمت کی طرف نہیں گیا۔ آزادورہ کر زبان وادب کی خدمت انجام دی۔ کتنے ہی مشہور ادیب، افسانہ نگار اور اہل قلم ہیں جن کو رسالہ ساقی نے چمکایا اور اسی افق سے ان کی شہرت کا آفتاب طلوع ہوا۔" (۶۸)

سید آل رضا کے خاندانی حالات پر تو انہوں نے تین صفحات پر محیط نوٹ لکھا ہے۔

شخصیت کا تعارف کرواتے اور اس کا خاکہ پیش کرتے ہوئے وہ غیر جانبدارانہ تبصرے سے گریز نہیں کرتے۔ اس انداز سے خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے ہیں کہ ان کی رغبت اور مغائرت عیاں ہو جاتی ہے۔ ہر دو معاملوں میں وہ کسی لاگ لپیٹ سے کام نہیں لیتے۔ وہ فراغ دلی سے ذاتی، علمی اور شاعرانہ خصوصیات پیش کرتے ہوئے "معاصرانہ رشک و حسد" سے کام نہیں لیتے جیسے

**ابر گنوری :-** "علم عروض سے بڑا شغف تھا۔ ان کی بیاضوں میں ہر غزل پر بحر کا نام "رمل مثمن مجنون مقصود، متقارب مثمن سالم، منسرح مثمن سطوی مکسوف ضرور لکھا رہتا تھا۔ اس فن میں انہوں نے تبحر پیدا کیا اور پاک و ہند کے چند چوٹی کے اساتذہ عروض میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ہندوستان کے ہر صوبے میں ان کے شاگرد تھے۔ یوں سمجھئے کہ اصلاح سخن کا ایک ڈیپارٹمنٹ انہوں نے قائم کر رکھا تھا۔" (۶۹)

**شاد عارفی :-** "نظم اور غزل میں کوئی شک نہیں اپنا منفرد آہنگ پیدا کیا، ان کی بعض نظموں میں گردوپیش اور گھریلو ماحول کی بڑی سلیقہ کے ساتھ عکاسی کی گئی۔ ان کی شاعری روایتی نہیں بلکہ ان کے حالات وواردات کی بہت کچھ ترجمان معلوم ہوتی ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دلی جذبات کی آگ جوں کی توں شعر کے قالب میں ڈھل گئی ہے" (۷۰)

**سیماب اکبر آبادی :-** "نظم ونثر کی چھوٹی بڑی کم وبیش ایک سو کتابیں یادگار چھوڑیں۔ شعر بھی خوب لکھتے تھے۔ مشاعروں کے صدارتی خطبے پڑھنے کی چیز ہیں۔ سیماب کی ذات اپنی جگہ شعروسخن کی ایک یونیورسٹی ہے۔ داغ کے بعد اتنے شاگرد شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہوئے ہوں۔ اردو زبان کے وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے "ادارۂ تصنیف و اصلاح" قائم کیا۔ جہاں



اجرت پر ناول، کتابیں، نظمیں، غزلیں، سہرے لکھے جاتے تھے۔ پر گوئی اور زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ نثر کی طرح کاغذ پر شعر لکھتے جاتے۔ دس بارہ منٹ میں ایک غزل کہہ لیتے تھے۔ ان کا دماغ کثرت شعر گوئی کے سبب شعر سازی کی مشین بن گیا تھا۔ ایک بار رسالہ شاعر سارے کا سارا منظوم شائع کیا۔ یہاں تک کہ اشتہارات بھی نظم میں چھاپے گئے" (۷۱)

**سید ابن حسن جارچوی :-** "کئی برس سے وہ مفلوج ہیں، دوسرے لوگ سہارا دے کر اسٹیج پر پہنچا رہے ہیں سیاسی اور مذہبی جلسوں میں دھواں دھار تقریر کرتے، تقریر کرتے ہوئے ان پر برقی لہر دوڑ جاتی! گرجدار آواز، تقریر میں تسلسل، انداز بیان دلنشین، تھوڑے تھوڑے وقفے سے کچھ ظریفانہ چٹکلے بھی ان کی تقریر کے دوران سامعین کو زیر لب تبسم، خندہ نشاط اور قہقہوں سے لطف اندوز ہوتے دیکھا گیا مگر گدگدیوں کے بعد جب وہ چٹکیاں لیتے تو مجمع ایکا ایکی سنجیدہ ہو جاتا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے مولانا جارچوی کے سوز دل کی گرمی اور آتش کدہ جان کی لپیٹ سننے والوں کے دل ودماغ تک پہنچ گئی ہے۔" (۷۲)

ماہر کو سجاد ظہیر اور آغا شورش کاشمیری سے نظریاتی اختلاف تھا۔ انہوں نے اس کا حال کھل کر لکھا ہے لیکن محض اس وجہ سے انہیں معتوب کرنے یا ان پر لعن وطعن کرنے سے گریز کیا ہے ان کا متوازن انداز تحریر ذاتی اختلافات کی بناء پر اوصاف کی ستائش سے گریزاں نہیں رہا۔

ان خاکوں میں دو باتیں یقیناً ناگواری کا باعث ہوئی ہیں، ایک موقع بے موقع "میں" کا حال بیان کیا ہے۔ دوسرے غیر متعلق باتوں کی تفصیل میں جانا۔ شاد عارفی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان سے ۱۹۴۳ء میں رامپور میں ملاقات ہوئی چونکہ ذکر رامپور کا آگیا اس لئے ایک مشاعرہ کا تفصیلی حال بیان کرنے لگے جس میں شاد عارفی موجود بھی نہیں تھے البتہ پس پردہ ہر ہائی نس بیگم نواب رامپور تھیں۔ جنہوں نے ماہر کی غزل سننے کے بعد کسی کے ذریعہ فرمائش بھجوائی کہ اسے تحریر کر دینا۔ ایسے متعدد حوالے ملیں گے جو ان کے جذبۂ خود ستائش کے غماز ہیں۔

انداز تحریر جہاں سنجیدہ اور باوقار ہے وہیں حسب موقع جملہ بازی اور شاعرانہ اسلوب بھی اختیار کیا ہے۔

خاکہ نگاری میں اختصار پسندی ضروری ہوتی ہے۔ اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ غیر ضروری اور غیر متعلق باتوں کی شمولیت کی وجہ سے موضوع اور شخصیت سے انصاف نہیں کیا جا سکا۔ البتہ انہیں مرحومین کی یاد میں لکھے گئے مضامین کو تفصیلی تعزیت ناموں کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

ان کے ذریعہ ایک حقیقت ضرور سامنے آتی ہے کہ ماہرالقادری جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اچھے نثر نگار بھی تھے۔

### پرانے چراغ (حصہ اول و دوم) : سید ابوالحسن علی ندوی : کراچی : ۱۹۸۴ء

سید ابوالحسن علی ندوی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ان کی معاصر شخصیات کے بارے میں ہیں لیکن ان کی وفات کے بعد ان کی یادوں کو تازہ کرنے اور ان کی خوشبو سے زمانہ کو محفوظ کرنے کے لئے منصۂ شہود پر آئے۔ ان میں مشاہیر علماء اور مصنفین بھی ہیں' صاحب علم اساتذہ بھی ہیں' مذہب و تصوف کے مستحکم ستون شیوخ بھی۔ ان میں سے بعض مشہور اور معروف بھی ہیں جیسے مولانا سید سلیمان ندوی' مولوی سید مناظر احسن گیلانی' مولانا سید حسین احمد مدنی' مولانا اشرف تھانوی' شیخ الحدیث مولانا خلیل عرب' مولانا مسعود عالم ندوی' جگر مراد آبادی' ڈاکٹر سید محمود' مولانا محمد علی جوہر' مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ اور ان ہی کے ساتھ چند غیر معروف ہستیاں مثلاً" سید صدیق حسن آئی سی ایس' سید محمد خلیل' حکیم سید حسن مثنیٰ' مولانا شاہ حلیم عطاء جو اس بزم میں شریک ہیں۔ جلد اول میں ۱۸ اور جلد دوم میں ۲ حضرات اور ایک خاتون کے بارے میں مضامین ہے۔ ان کی نوعیت سوانح عمریوں کی ہے اور نہ یہ خاکہ نگاری کے فن پر پورے اترتے ہیں۔ مصنف نے خود انہیں معاصر شخصیتوں' بزرگوں' استادوں' دوستوں' عزیزوں سے متعلق تعارفی مضامین' تاثرات' مشاہدات و واقعات اور معلومات کا دلچسپ مجموعہ قرار دیا ہے۔ ان مضامین میں ہر قسم کی معلومات جو مصنف کی یادداشت میں محفوظ تھیں بیان کر دی گئی ہیں اور جن کے ساتھ مراسلت رہی انکے خطوط بھی درج کر دیئے ہیں۔ باوجود اس کے کہ یہ سوانح نگاری یا مرقع نگاری کے ضمن میں بلحاظ فن نہیں آتے۔ ان کے بارے میں اہم مواد ان میں موجود ہے۔

### بزم خوش نفساں : شاہد احمد دہلوی : کراچی : ۱۹۸۴ء

شاہد احمد دہلوی کے لکھے ہوئے ان ۳۶ خاکوں کا مجموعہ ہے جو رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ انہیں جمیل جالبی نے ادب نوازی اور دوستی کا حق ادا کرنے کے لئے یکجا کیا ہے جو اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ پہلا مجموعہ "گنجینۂ گوہر" ۱۹۶۲ء میں شائع ہو چکا تھا۔ اس مجموعہ کے مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ان حضرات کے خاکے شامل ہیں جو تحریر کے وقت زندہ تھے اور دوسرے حصے میں ۱۳ حضرات کے خاکے ہیں جو ان کے انتقال کے بعد "وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں" کے زیر عنوان تحریر کئے گئے تھے۔ ان میں سوائے دو ایک حضرات سب مشہور اور معروف شخصیات ہیں جن کے خاکے دیگر اہل قلم حضرات نے بھی تحریر کئے ہیں۔ باوجود



اس کے شاہد کی معلومات اور ان کے طرز تحریر نے ان خاکوں کو اس قدر جاندار بنا دیا ہے کہ پڑھنے والوں کو ایک نوع کی تازگی محسوس ہوتی ہے اور دوسروں کے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں مولوی عبدالحق کے بارے میں ان کا مضمون شخصیت سے زیادہ ان کے کارناموں کا احاطہ کرتا ہے اور غالباً" اس نقطۂ نظر سے لکھا گیا کہ اردو دان طبقہ اپنے اس محسن کی جانکاہیوں کو فراموش نہ کرے۔ درمیان میں جگہ جگہ ان کی سیرت کے ایسے نکات بھی بیان کر دیئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی سیرت کا شخص یہ خدمات انجام دے سکتا تھا۔ مولانا عبدالسلام نیازی اہل علم کے لئے محترم اور معزز شخص رہے ہیں لیکن عام لوگ ان سے کم واقف ہیں۔ ان کی سیرت کے تمام پہلوؤں کو پہلی بار احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے اگرچہ جوش نے "یادوں کی برات" میں بھی ان کا خاکہ لکھا ہے جو مولانا کی شخصیت کو اجاگر کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس کی حیثیت معمولی سے تعارف سے زیادہ نہیں۔ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ مولانا گالیاں دینے میں فصاحت سے کام لیتے تھے ان کا ذوق علمی و ادبی کے حوالے سے شاہد احمد نے بہت سے گوشوں سے پردہ اٹھا کر شخصیت کے مکمل خدوخال پیش کئے ہیں۔ مجموعہ میں شامل خاکوں کی نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ صاحب خاکہ کی کمزوریوں کو نظر انداز نہیں کیا ہے اور جہاں تنقید کی ضرورت محسوس ہوتی وہاں قلم پر کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے۔ شوکت تھانوی کے بارے میں دلچسپ' تفصیلی معلومات فراہم کرنے کے ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"شوکت تھانوی کا کمزور پہلو ان کی شاعری تھی۔ وہ ساری عمر شعر کہتے رہے آسی کی انہوں نے شاگردی بھی اختیار کی۔ مشاعروں میں اپنا کلام سنایا کرتے تھے ۲۵ سال ہوئے انہوں نے اپنے منتخب کلام کا مجموعہ "گہرستان" کے نام سے شائع کیا تھا مگر شاعری حیثیت سے انہیں کوئی نمود حاصل نہیں ہوئی۔ شعر کلام موزوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے "یہ اور بھی بہت" شوکت کے کلام میں نہیں تھا"(۷۳)

ان خاکوں کی نمایاں خصوصیت شاہد احمد کا اسلوب ہے۔ ان کی نثر کو پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ بات کسی طرح کرنی چاہئے کہ شگفتگی بھی باقی رہے بات بھی پوری ہو جائے اور ابتذال یا ناگواری کی صورت پیدا نہ ہو۔

### گنجینۂ گوہر کھلا : صادق الخیری : کراچی : ۱۹۸۵ء

صادق الخیری کا علمی و ادبی خاندان سے تعلق ہے۔ جس کی زبان دانی اور علمی بصیرت کی

شہرت گزشتہ تین چوتھائی صدی سے مسلم رہی ہے۔ اس خاندان کے متعدد افراد نے اردو ادب و صحافت کی خدمت کرتے ہوئے زندگیاں گزار دیں اور ان کے روابط ہم عصر ادیبوں اور شاعروں سے نہایت قریبی رہے۔ صادق الخیری خاندانی روایات کے حامل رہے۔ وہ انشاء پرداز' افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے معتبر شخصیت ہیں۔ ان کے شخصی روابط پاکستان اور ہندوستان کے بے شمار مشاہیر علم و ادب سے رہے ہیں اور ان میں ہر ایک کا قریبی مطالعہ کرنے کا موقع انہیں ملا ہے زیر نظر کتاب میں ۴۷ شخصیات کا تعارف ہے۔ جن میں زیادہ تعداد شاعروں اور ادیبوں کی ہے۔ جہاں تک اس کتاب میں شامل مضامین کا تعلق ہے انہیں شخصیت نگاری یا سیر نگاری کے ضمن میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ شخصیات کا محض تعارف کروایا گیا ہے اور ان کی ذاتی صفات کے حوالے سے سرسری طور پر ایک آدھ بات کہہ دی گئی ہے۔ جو مصنف کی رائے ہوسکتی ہے اس کے ثبوت کے لئے کسی استدلال یا شہادت سے کام نہیں لیا گیا۔

اس کتاب کی دو اہم بنیادی خصوصیات ہیں۔ پہلی یہ کہ ہر شخصیت کے بارے میں مصنف نے اپنے ذاتی تجربے کی بناء پر جو رائے قائم کی ہے بلا کم و کاست بیان کردی ہے اس لئے ان مضامین کو "تعارف و تاثرات" کا حامل کہا جاسکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض حضرات کے بارے میں ان کی قائم کی ہوئی رائے درست ہے۔ لیکن تمام کے بارے میں ان کی رائے کو تسلیم کرلینا ضروری نہیں۔ جن لوگوں سے ان کے خوشگوار تعلقات رہے فطری طور پر ان کے لئے اچھی رائے دی گئی ہے اور جن سے کسی نہ کسی وجہ سے دل میں میل آگیا ہے ان کے خلاف لکھتے ہوئے تلخی نمایاں ہوگئی ہے۔ اس خصوص میں اس مضمون کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جو احمد ندیم قاسمی کے بارے میں ہے۔ واقعات اور نتائج درست ہونے کے باوجود تحریر عصبیت کا شکار ہوگئی ہے۔

دوسری نمایاں خصوصیت وہ خطوط ہیں جو ان حضرات نے مصنف کو لکھے اور غالباً "کتاب مرتب بھی اسی لئے کی گئی کہ انہیں منظر عام پر لایا جائے اور انہیں کی خاطر تعارف و تاثر تحریر کیا ہے۔ بعض حضرات کے صرف دو ایک رسمی خطوط شامل ہیں جن کی کوئی اہمیت نہیں۔ انہیں شخصیت کی یادگار کے طور پر جگہ دی گئی ہے چند حضرات کے خطوط یقیناً" اہم ہیں۔ اس اعتبار سے بھی کہ ان کی تعداد زیادہ ہے اور یہ اس اعتبار سے بھی کہ وہ خاصے طویل اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں چونکہ لکھنے والوں کو گمان بھی نہ تھا کہ مصنف انہیں کسی وقت شائع کریں گے اس لئے بے تکلفی سے اور ذہنی تحفظ کے بغیر بہت سی باتیں لکھی دی ہیں ان سے مراسلہ نگار اور مصنف



کے تعلقات کی نوعیت کا پتا بھی چلتا ہے اور مراسلہ نگار کی شخصیت و فکر کے دو پہلو بھی سامنے آگئے ہیں جو عام حالت میں ممکن نہیں تھے۔ اسی حوالے سے اخلاق احمد' زبیر احمد رضوی' شان الحق حقی' شاہد احمد دہلوی' عبدالرحمان چغتائی کے خطوط کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو معلومات اور طرز بیان کی بناء پر قابل مطالعہ ہیں۔

## اوکھے لوگ : ممتاز مفتی : لاہور : ۱۹۸۶ء

ممتاز مفتی ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی وسیع ہے وہ کتابوں کا ہی مطالعہ نہیں کرتے بلکہ انسانوں کا بھی کرتے ہیں۔ ان کے انسانی مطالعہ کے شواہد ان کی شخصیت نگاری میں ملتے ہیں "اوکھے لوگ" ایسے ہی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ ہر خاکے کا عنوان شخصیت کے نمایاں وصف کا ترجمان ہے۔ جیسے پتی بھگت (بانو قدسیہ) جتا بجھتا (ابن انشاء) غنڈہ (احمد بشیر) داستان گو (اشفاق احمد) پیاز کا چھلکا (فکر تونسوی) دوشیزہ اور شیر (محمد طفیل) پاکیزہ (ادا جعفری) معمار (ذوالفقار احمد تابش) کٹھو گھوڑا (سجاد حیدر) باندی (ماں) میلہ گھومنی (پروین عاطف) لوک تماشا (عکسی مفتی) پراسرار (قدرت اللہ شہاب)

کسی بھی شخص کو سمجھنا آسان نہیں۔ اس کے بہت سے روپ ہوتے ہیں۔ اس میں متعدد تضادات ہوتے ہیں۔ ادیب کو ماہر نفسیات ہونے کے ساتھ ساتھ مشاہدے اور معلومات کے وسیع مواقع حاصل ہوں اور پھر جو تاثر وہ قبول کرے اسے ایمانداری سے پیش کرے۔ چاہے وہ شخصیت کے لئے قابل قبول ہو یا نہ ہو۔ انداز بیان کی لطافت بھی خاکے میں جان ڈال دیتی ہے۔ ممتاز مفتی ان تمام لوازمات سے لیس ہو کر اس میدان میں اترتے ہیں۔ اسی لئے ان کا "مفروضہ ہے کہ شاید ان مضامین کو پڑھ کر ان کی تحریروں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ یہی اس کتاب کا جواز یا بہانہ ہے" (۷۴)

جن شخصیات کو انہوں نے موضوع بنایا ہے وہ ادیب' شاعر یا فنکار ہیں۔

انہیں بانو قدسیہ کی ذات میں دو صفات اہم نظر آئیں۔ ایک صفت ان کی "پتی بھگت" ہونا ہے۔ اسی حوالے سے انہوں نے لکھا ہے۔

"قدسی کی شخصیت کا جزو اعظم پتی بھگتی ہے" (۷۵)

"قدسی میاں کے پسند ناپسند بدلنے کی کوشش نہیں کرتی۔ الٹا اپنی پسند یا ناپسند کو میاں کی پسند ناپسند کے مطابق ڈھال لیتی ہے" (۷۶)

دوسری اہم صفت ان کا متنوع اور تیز رفتار عمل ہے جیسے

"آپ دیکھیں گے کہ ابھی وہ ادھر چھوٹے بیٹے کو کپڑے پہنا رہی تھی' اب بیٹھی جیا گرا فیکل میگزین کا مطالعہ کر رہی ہے۔ ہائیں وہ تو باورچی خانے میں شلغم کا اچار تیار کرنے لگی۔ لو وہ تو برآمدے میں سلائی مشین پر بیٹھی محمد شاہ رنگیلے گنگنا رہی ہے۔ ابھی وہ صحن میں سلاد کے بوٹے ٹھیک کر رہی تھی۔ اب بریگیڈیئر اشتیاق سے آرمی ڈرل کے اسٹائل پر بحث کرنے لگی۔ ابھی ڈرائنگ روم میں بنی بچی گڑیا نما خواتین کی بے مقصد' مہمل باتوں پر گھاگ دنیا دار کی طرح یوں قہقہے لگا رہی تھی جیسے واقعی محظوظ ہو رہی ہو اور لو وہ تو چادر کی بکل مارے پر ان پتی کے حضور میں مودبانہ کھڑی پڑوس سے جا کر ملنے کی آگیا لے رہی ہے" (۷۷)

یہ شخصیت کا بیان نہیں۔ اس کی جیتی جاگتی' چلتی پھرتی تصویریں ہیں ممتاز مفتی ایک ادیب نہیں مصور دکھائی دیتے ہیں۔ عام مصور رنگوں سے تصویر بناتا ہے۔ یہ لفظوں سے بناتے ہیں۔

بانو قدسیہ کے شوہر اشفاق احمد کو وہ "توجہ طلبی کی ماری ہوئی ایک طوائف" کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ جو بظاہر ہنستے بولتے اور چہل کرتے ہیں لیکن اندرونی طور پر وہ سکون پسند ہیں۔ اسی لئے ممتاز مفتی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ

"بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ رنگین اور منفرد باتوں کا جال بن کر مجمع لگانے والا درحقیقت گونگا ہے۔ اس کی شخصیت دکھ اور چپ کے تانے بانے سے بنی ہے۔ اس کی بزم آرائی اور زعفران زاری شخصیت کے ان بنیادی عناصر سے فرار کی سعی ہے۔" (۷۸)

یہ تضاد نہیں شخصیت کے دو رخ یا دو موڑ ہیں۔ اشفاق احمد کے بارے میں ان کا یہ کہنا درست ہے کہ

"اشفاق احمد ایک پرفیکٹ ہے وہ جو کام بھی کرتا ہے اس کے اندر دھنس جاتا ہے۔ اس قدر اندر دھنس جاتا ہے کہ لت پت ہوئے بغیر باہر نہیں نکلتا" (۷۹)

اسی طرح ابن انشاء بھی ایک پہلو دار شخصیت کے مالک تھے جس میں ایک پہلو دوسرے سے متضاد معلوم ہوتا ہے۔ ممتاز مفتی نے ان کے ایک پہلو کو جلنے اور دوسرے کو بجھنے سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں بجھے رہنے کی صفت غالب تھی۔ کھویا کھویا' ماحول سے بے خبر اور بے نیاز اور کبھی کبھی تو اپنی ذات کے لئے بھی بے گانہ اس بارے میں ممتاز مفتی کا قلم حقیقت نگاری اور شخصیت شناسی کا دامن پکڑے یوں چلتا ہے۔

"ابن انشاء کی شخصیت جلتے بجھتے مٹی کے دیئے کی مصداق تھی۔ بجھ جاتا تو گھپ اندھیرا چھا جاتا' جلتا تو بھور سماں بندھ جاتا۔ بنیادی طور پر وہ گھپ اندھیرا تھا چہرہ ڈھلک جاتا' حسیات



ساکت ہو جاتیں۔ بے تعلقی اور اکتاہٹ کے ڈھیر لگ جاتے۔ ایک بے نام دھند لکا چھا جاتا اور اس دھندلکے میں ایک فرد کھویا کھویا دکھی' اکیلا' گونگا' جلتا تو چہرہ مسکراہٹ سے منور ہو جاتا۔ اس مسکراہٹ میں مسرت کم' خلوص زیادہ' چھچھا خلوص' بے بسی بھرا" (۸۰)

یہ بیان واقعی نہیں تمثیلی ہے اور اس طرز نگارش پر ممتاز مفتی کو بھرپور عبور حاصل ہے۔ انہوں نے ابن انشاء کی ایک خصوصیت ایسی بھی بتائی ہے جسے ماحول اور زمانہ سے بے تعلقی ہی نہیں۔ بیزاری بھی کہا جا سکتا ہے گویا

"بڑی سے بڑی بات بھی انشاء کو جذباتی نہیں کر سکتی تھی۔ آپ اسے قتل کی لرزہ خیز داستان سنائیں۔ ابتدا میں وہ شوق سے سنتا تھا پھر سوئچ آف کر کے بیٹھ جاتا۔ بظاہر ہاں کرتا تھا اس لحاظ سے وہ ایک کچھوے کی مصداق تھا۔ ہر چند ساعت کے بعد وہ اپنے خول میں دبک جانے پر مجبور" (۸۱)

انشاء کی ازدواجی زندگی کی بعض الناکیوں نے ان میں عشق کے جذبے کو محتاط کر دیا تھا۔ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود ایک شادی شدہ عورت کے عشق میں مبتلا رہے لیکن اس طرح کہ وہ ایک قدم آگے بڑھتی تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ جاتے۔ اسی حوالے سے ممتاز مفتی کے مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ

"انشاء کی شخصیت کی طرح اس کا عشق بھی منفرد تھا۔ عام طور پر بڑے عاشق واپسی کی کشتیاں جلا دیتے ہیں تاکہ میدان میں پیٹھ دکھانے کا خطرہ نہ رہے۔ انشاء نے آگے بڑھنے کی کشتیوں کو بھی آگ لگا دی تھی تاکہ کہیں کامیابی کی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ کہیں بیراگ کو چھوڑ کر محبوب کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ کہیں وصال کی قیامت نہ ٹوٹ پڑے" (۸۲)

مصنف کا یہ انکشاف حیران کن ہے کہ انشاء جان بوجھ کر عشق کے نام پر لٹتے رہے۔ وہ مطمئن تھے کہ یہ سودا بھی خسارہ کا نہیں کیونکہ اس عشق نے کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو انہیں شاعر بنا دیا تھا۔

ادا جعفری اور ان کے شوہر نورالحسن جعفری کی خوشگوار زندگی کے راز کو بھی مصنف نے پایا ہے اور وہ اس کا انکشاف اس طرح کرتے ہیں کہ

"اس میں جو بھینے لگے ہیں وہ ہم آہنگ نہیں تھے۔ ایک گول تھا دوسرا چوکور' میاں مکمل طور پر ایکسٹروواٹ تھے بیوی کٹّتا" انٹروواٹ۔ میاں خارجی علوم سے آراستہ' بیوی کے پاس ناروں کی رم جھم کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس شادی کی کامیابی کے لئے ادا کے پاس ایک چیز تھی۔

مدہم محبت کی مسلسل لرزش۔ جعفری کی نسبی اور خاندانی شرافت نے اس شادی کو کامیاب بنایا۔" (۸۳)

احمد بشیر مصنف کی نظر میں یوں "مفنذہ" ہے کہ نیک نیتی اور ہمدردی کے جذبات کے باوجود ان میں عجز نہیں ہے۔ ان کی خود اعتمادی خود پرستی کی حدوں کو چھوتی ہے اور وہ اعتدال کے قائل نہیں ہیں۔

ممتاز مفتی کے تحریر کردہ تمام شخصی خاکوں میں عام رجحان کے مطابق صرف ملاقاتوں اور باتوں کا ذکر نہیں ہے۔ یہ سطحیت سے ہٹ کر واقعی شخصیت شناسی کے درجہ کو پہنچے ہوئے ہیں۔ ان میں شخصیت کے ظاہر بھی ہیں اور باطن بھی۔ ظاہری مطالعہ زیادہ مشکل نہیں لیکن باطن میں جھانکنا اور ذات میں چھپی کیفیات کی خبر لانا بہت دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔ اس سے ایسا ہی ادیب کامیابی سے گزر سکتا ہے جس کا شخصیت سے دیرینہ تعلق رہا ہو۔ اسے مختلف اوقات میں مختلف انداز میں دیکھنے کا موقع ملا ہو اور صاحب نظر بھی ہو۔ جو زیادہ سے زیادہ گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ممتاز مفتی اس فنکارانہ صفات سے مالا مال ہیں اس کی شہادت ہر خاکے میں موجود ہے۔ دوسری اہم صفت ممتاز مفتی کا طرز بیان ہے۔ نہایت شوخ اور شگفتہ کہیں کہیں مزاح کا رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور کم سے کم لفظوں میں بڑی سے بڑی وسیع اور گہری باتیں کہہ جاتے ہیں۔

## یاران رفتہ : سید یوسف بخاری دہلوی : کراچی : ۱۹۸۷ء

سید یوسف بخاری دہلی کی اردوئے معلی کی آخری چند یادگاروں میں سے ایک ہیں۔ تہذیب' ثقافت' ذہن' رویّہ اور زبان کے لحاظ سے ان کی شخصیت اور تحریر پر دہلوی پن غالب رہا۔ یاران رفتہ مولوی عبدالحق' داستان گو میر باقر علی' میر ناصر علی دہلوی' شمس العلماء مولانا عبدالرحمان' سر راس مسعود' قاری عبدالحسین' سید ہاشمی فرید آبادی کے بارے میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کو نہ تو سوانح عمری قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ وہ فن کے اعتبار سے شخصی خاکے' مرقعے یا سیرت کہلا سکتے ہیں۔ یوسف بخاری نے بزرگوں کے بارے میں اپنی تمام یادداشتوں اور معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ اس کے لئے نہ تو سوانح کے لوازمات کا خیال رکھا اور نہ خاکہ نگاری کی ضرورتوں کو پورا کیا۔ معلومات کے لحاظ سے ان کی اہمیت ضرور ہے۔ میر باقر علی' میر ناصر علی' مولانا فضل الرحمان اور قاری عباس حسین جیسی شخصیات کے بارے میں تفصیلاً" کبھی نہیں لکھا



گیا۔ یوسف بخاری نے ان پر قلم اٹھا کر ان کے ناموں کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میر باقر علی جیسے ماہر' نابغۂ روزگار داستان گو سے اردو دان طبقہ کی روگردانی کا یہ حال ہے کہ ان کی جو داستانیں طبع بھی ہوئیں ان کے وجود کا پتا نہیں اب ان کے ناموں سے بھی کوئی واقف نہیں۔ یوسف بخاری نے ان کی چند داستانوں کے حصے بھی درج کر دیئے ہیں۔ ادبی شخصیات کے حوالے سے یہ معلوماتی کتاب ہے۔ اسے یادوں کی بازگشت کے علاوہ کچھ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

## انجمن : فقیر سید وحید الدین : لاہور : ۱۹۸۸ء

فقیر سید وحید الدین کی کتاب "انجمن" افراد کے حوالے سے ان کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں "شخصیات" کے عنوان سے ۲۴ معروف حضرات کا ذکر ہے جس میں ان سے ملاقاتوں اور ان کے بارے میں اپنے تاثرات کو پیش کیا ہے اور "تاثرات" کے عنوان سے ۱۲ واقعات کو مختلف افراد کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔ مصنف نے خود اعتراض کیا ہے کہ

"میں نہ تو ماہر نفسیات ہوں اور نہ کردار نگاری کا مدعی بلکہ جو کچھ دیکھا ہے یا محسوس کیا ہے اسے جوں کا توں کاغذ پر منتقل کر دیا ہے۔"

"یہ کتاب بعض ناقابل فراموش کرداروں کا عکس جمیل اور بھری یادداشتوں کی بیاض سادہ و رنگین ہے۔" (۸۳)

ان میں یقیناً" ناقابل فراموش کردار ہیں اور چند ایسے ہیں جن کے نام سیاسی یا ادبی تاریخوں میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے ہیں۔ جیسے مولانا حالی' علامہ اقبال' مولانا ظفر علی خان' میاں فضل حسین' سر محمد شفیع' مولانا صلاح الدین' قائداعظم' میاں افتخار الدین' چودھری ظفراللہ خان' فیض' حکیم احمد شجاع' مولانا حالی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ انہیں اپنے والد سے معلوم ہوا تھا کیونکہ جس زمانہ کے واقعات بیان کئے گئے ہیں اس وقت مصنف کی عمر ڈیڑھ' دو سال سے زیادہ نہ تھی۔ البتہ دیگر شخصیات کا ان کا ربط ضبط رہا۔ بعض سے برائے نام اور بعض سے بہت قریبی' جس طرح سرسری ذکر ان کا ہے جن سے برائے نام تعلق رہا۔ اسی طرح قریبی تعلق رکھنے والوں کا ذکر بھی سرسری ہی ہے۔ ایک دو تجربوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے ان سے کسی خاص انسانی شرف و خصوصیت پر روشنی تو پڑتی ہے لیکن سیرت نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس کتاب میں شامل شخصیات پر بہ جہتی مطالعہ کرنے والوں کو رہنمائی ضرور مل سکتی ہے۔

# باب ششم (ج)

خاکے / شخصی مرقعے

کئی مصنف، ایک شخصیت (اجتماعی)

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

## حسرت کی یاد میں : مرتبہ عبداللہ ولی بخش قادری : الہ آباد : ۱۹۵۲ء

مولانا حسرت موہانی کے حالات زندگی ان کی زندگی میں عارف ہنسوی (حالات حسرت مطبوعہ ۱۳۲۷ھ) اور عبدالشکور (حسرت موہانی مطبوعہ ۱۹۴۶ء) نے تحریر کیے تھے۔ مولانا کے انتقال کے بعد کتاب "حسرت کی یاد میں" شائع ہوئی جس میں حالات زندگی، سیرت و کردار، ادبی خدمات وغیرہ کے بارے میں ۱۲ مضامین اور متعدد نظمیں و قطعات تاریخ وفات شامل ہیں۔ سید افقر موہانی نے مولانا کے سوانحی حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضمون فن کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ سرسری طور پر چند امور کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں متعدد اغلاط بھی ہیں۔ مولانا کا سال ولادت ۱۸۷۵ء لکھا گیا ہے۔(۸۴) جو متنازع ہے۔ بی اے پاس کرنے کا سال ۱۸۹۶ء (۸۵) بتایا ہے جو درست نہیں۔ مولانا حسرت نے ۱۹۰۳ء میں بی اے کیا تھا۔ مضمون نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ "حکومت نے ان کو ججی کے عہدے کی طرف رغبت دلائی" (۸۶) اس کی صداقت پر بھی شبہ ہے۔ مولانا نے قانون کی کوئی سند نہیں لی تھی اس لئے ان کو جج کے عہدے کی طرف رغبت دلانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بلا تحقیق اس نوعیت کی تحریر قاری کی رہنمائی کی بجائے اسے الجھن میں ڈال دیتی ہیں "حالات حسرت" (مؤلفہ عارف ہنسوی) اور حسرت موہانی (مؤلفہ عبدالشکور) پہلے شائع ہو چکی تھیں۔ واقعات اور سنین کے سلسلے میں ان سے مدد لی جا سکتی تھی اور اختلافات کی صورت میں شواہد و استدلال سے کام لینا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ البتہ مولانا حسرت کی سیرت ان کے شخصی فضائل اور مکارم اخلاق کو احسن طریقہ سے پیش کیا ہے۔ افقر موہانی کا مضمون سوانح عمری کے اعتبار سے کمزور لیکن سیرت نگاری کے لحاظ سے کامیاب کوشش ہے۔

کتاب میں عادل رشید کا مضمون بھی شامل ہے جس میں انہوں نے مولانا سے دو ملاقاتوں کا حال بیان کرتے ہوئے ان کے اوصاف حمیدہ اور رجحانات کے بارے میں قائم کردہ اپنی رائے پیش کی ہے۔ عادل رشید نے مولانا حسرت موہانی کو "ایک عظیم شاعر، ایک سلجھے ہوئے نقاد، ایک مخلص لیڈر، ایک اچھے دوست اور ایک شفیق بزرگ" قرار دیا ہے۔

نجم الدین شکیب کا مضمون مولانا کے سیاسی معتقدات کے حوالے سے اپنی رائے اور فیصلے پر استقامت سے قائم رہنے کی صفت کا ترجمان ہے۔ نہرو رپورٹ پر غور کرنے اور رپورٹ مرتب کرنے والی کمیٹی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے لکھنؤ میں تمام سیاسی نمائندوں کی جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کے بارے میں نجم الدین شکیب کا بیان ہے کہ وہ بھی مولانا کے ہمراہ شریک ہوئے

تھے۔ اس کانفرنس میں مولانا نے نہرو رپورٹ کی ایک ایک شق کی مخالفت کی تھی۔ چند خود پسند لیڈر مولانا کا مذاق اڑاتے رہے لیکن وہ کسی کو خاطر لائے بغیر صاف گوئی اور بے باکی سے اپنے خیالات پیش کرتے رہے۔ اس واقعہ سے مضمون نگار نے مولانا کے اس وصف کو اجاگر کیا ہے کہ وہ کسی سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے۔ اپنے خیالات پیش کرنے میں وہ کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ سامعین کے ردِ عمل کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

کتاب کے دیگر مضامین میں مولانا حسرت موہانی کی شاعری کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ان کے لہجے کی توانائی' مضامین کی تازگی' حسن کے لئے شیفتگی' عشق میں سرفرازی رسوائی کا حال بیان ہوا ہے۔ مولانا حسرت کی سیرت کے چند پہلوؤں کی پیش کش کی حد تک مضامین اہم ہیں۔

**ڈاکٹر زور : محمد بن عمر : حیدر آباد دکن : ۱۹۵۵ء**

ڈاکٹر زور ایک شخص ہی نہیں۔ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے بے شمار کتابوں اور مضامین کے مصنف' ادارہ ادبیات اردو کے بانی معتمد' ماہنامہ "سب رس" کے نگران' ہزاروں طلبہ میں ذوق علمی و ادبی پروان چڑھانے والے کی حیثیت سے ہمیشہ قابل احترام رہیں گے۔ ان کے قائم کردہ ادارہ ادبیات اردو کی سلور جوبلی کے موقع پر ۱۹۵۵ء میں محمد بن عمر نے انہیں خراج تحسین پیش کرنے کے لئے اہل علم سے مضامین لکھوا کر اسے کتابی صورت دی۔ اس کتاب میں ۱۷ مضامین ہیں اور آٹھ شعراء نے منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے مرتب نے بغیر کسی مناسب منصوبے کے مضامین تحریر کروائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی نوع کی معلومات کم و بیش ہر مضمون میں موجود ہیں۔ ان میں اکبر الدین صدیقی' صاحبزادہ میکش اور حفیظ قتیل کے مضامین اتنے جامع ہیں کہ ان کے بعد کسی تحریر کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اکبر الدین صدیقی کے مضمون کا ایک حصہ ڈاکٹر زور کے خاندانی حالات زندگی' ان کے سوانحی واقعات' کردار اور تصانیف کا احاطہ کرتا ہے۔ مضمون اگرچہ مختصر ہے' معلومات کا خزانہ ہے۔ یہ اکبر الدین صدیقی کا خاص وصف ہے کہ وہ الفاظ کا زیاں نہیں کرتے اور مختصر عبارت میں وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جو دوسرے کئی صفحوں میں بھی بیان نہیں کرسکتے۔ میکش نے ڈاکٹر زور کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ ان کی تحریر میں مدحت کی بجائے حقیقت پسندی ہے لیکن ان کا کہنا بھی بعید از فہم ہے کہ ممدوح کی ذات میں کوئی خامی اور برائی موجود نہیں۔ کسی بھی انسان کے بارے میں اس نوع کا اظہار شک و شبہ سے بالاتر نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے میکش کی طرح ڈاکٹر زور کی شخصیت اور کردار کے تعارف میں مضمون لکھا ہے وہ ایسی باتیں ضرور لکھ گئے ہیں جو ان کی ذات کے منفی پہلو کی



عکاسی کرتی ہے جیسے

"سچ تو یہ ہے کہ ان کی نظر لیاقت اور صلاحیت پر نہیں ہوتی جس قدر کہ وہ تیزی و طراری کو پسند فرماتے" (۸۷)

"میں نے ان میں ایک عجیب بات دیکھی وہ ہمیشہ کام کو دیکھتے ہیں کام کی کوتاہیوں کو نہیں دیکھتے" (۸۸)

ڈاکٹر قتیل کا مضمون شگفتہ انداز بیان رکھتا ہے اس میں حقائق بھی ہیں اور ہلکی پھلکی چوٹیں بھی۔ وہ ڈاکٹر زور کی صلاحیتوں کے معترف بھی ہیں اور ان کی کمزوریوں کے نکتہ چیں بھی۔ حالانکہ وہ سیرت نگار نہیں ہیں۔ محقق اور معلم ہیں۔ صاحب ذوق کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ ہر فن میں اپنے ان مٹ نقوش چھوڑ جائے۔ کتاب میں یہی تین مضامین قابل قدر ہیں اور آئندہ بھی زور کے بارے میں انہیں کے حوالے سے لکھا جائے گا۔

**مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں (جلد اول و دوم) : محمد یوسف بھٹہ : لاہور : ۱۹۵۵ء**

سیاسی اختلاف رکھنے والے بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اسلام کے سچے خادم تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی خدمت اسلام کے لئے وقف کردی تھی۔ ان کے اثر سے لادینی تعلیمی ماحول اور مستشرقین کی کتابوں کے مطالعہ سے اسلام سے دل برداشتہ ہونے والے صراط مستقیم کی طرف لوٹ آئے۔ محمد یوسف بھٹہ نے مولانا مودودی کا مطالعہ ہر اعتبار سے کیا ہے۔ ان کی شخصیت پر چھائی "قائدیت' مذہبی قائدیت' سیاسی قائدیت' معاشی قائدیت" (۸۹) بھی ان کے پیش نظر رہی لیکن شخصیت شناسی کے لئے یہ ظاہری اجزاء قرار پاتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے شناخت کے لئے خویش' خویشتن آدمی اپنی نظر میں کیا ہے۔ "شعور دیگر" دوسروں کی نگاہ میں کیا ہے۔ "شعور ذات حق" اللہ کی بارگاہ میں کیا مقام رکھتا ہے۔ (۹۰) کو بھی مدنظر رکھا ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں "اپنی نظر میں" کے زیر عنوان وہ تمام تحریریں اور اقتباسات ہیں جو مولانا مودودی کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک خاص ترتیب میں پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں معنوی اور منطقی ربط کے علاوہ زمانی تسلسل بھی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب سوانح اپنی زندگی کے ایام و سنین میں کس حیثیت اور کس رفتار سے آگے بڑھے ہیں اور وہ اس سفر میں کن

مراحل سے گزرے ہیں جس سے ان کی ذہنی پرداخت کے مدراج اور افکار و تصورات کی نشو و نما اور ارتقا کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

ابتدا میں "خود نوشت" کا وہ حصہ ہے جو ۱۹۳۲ء میں لکھا گیا۔ اس میں مولانا نے اس وقت تک کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اعتبار کا درجہ رکھتا ہے۔ مولانا کی شائع شدہ تحریروں کے اقتباس ان کے کردار اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں "دوسروں کی نظر میں" کے عنوان سے وہ مضامین اور مقالات درج ہیں جو مولانا کے موافقین اور مخالفین دونوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کتاب سوانحی حالات کے لحاظ سے غیر مکمل ہے۔ البتہ صاحب سوانح کے افکار کو سمجھنے میں بڑی حد تک اور ان کی شخصیت سے واقف ہونے کی حد تک کسی قدر معاون ہو سکتی ہے۔

## یادگار امجد : مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی : حیدر آباد دکن : ۱۹۶۱ء

اردو کے سب سے بڑے رباعی گو شاعر امجد حیدر آبادی کے چہلم کے موقع پر ان کے عقیدت مند محمد اکبرالدین صدیقی نے "یادگار امجد" کے نام سے ایسا مجموعہ مرتب کرکے شائع کیا تھا جس میں بعض مضامین مختلف مواقعوں پر پڑھے گئے اور بعض خاص اسی مجموعہ کے لئے لکھے گئے تھے۔ لکھنے والوں میں وہ حضرات شامل ہیں جن کا حضرت امجد سے قریبی تعلق رہا۔ ان میں نصیرالدین ہاشمی، مناظر احسن گیلانی، جوش ملیح آبادی، پروفیسر سید محمد، حضرت امجد کے معالج اور دوست ڈاکٹر عبدالصمد کے علاوہ خود مرتب شامل ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی نے ان کا سوانحی خاکہ لکھا ہے جس میں ان کی تصنیف "جمال امجد" سے استفادہ کرکے ابتدائی حالات کا ذکر کیا ہے اور خود اپنی معلومات بھی پیش کی ہیں۔ دیگر اہل علم نے اپنے اپنے مشاہدے اور تجربے کی بناء پر ان کے کردار کی لفظی تصویر کشی کی ہے۔ ان تمام مضامین کے پڑھنے کے بعد حضرت امجد کی زندگی کے نشیب و فراز، ابتدائی ایام کی سختیاں، تعلیم کی دشواریاں، موسیٰ ندی کی طغیانی (۱۹۰۸ء) میں ماں، بیوی اور بیٹی کا بہہ جانا، معمولی ملازمت سے ابتدا کرکے معزز عہدے تک ترقی کرنا، دوسری شادی جمال النساء بیگم سلمٰی سے کرنا جن کو مذہب اور تصوف سے بے حد لگاؤ تھا۔ حضرت امجد کی ذات میں چھپے ہوئے صوفی کو انہوں نے ہی تلاش کیا تھا اور جمال ہم نشینی کی وجہ سے وہ روحانی ترقی کرتے ہوئے کشف و کرامات کی منزل تک پہنچے تھے۔ ان تمام باتوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کرتے ہوئے ان کے کردار کے نمایاں پہلوؤں کو بھی پیش کیا ہے کہ وہ خوددار تھے۔ کبھی



کسی کا احسان اٹھانا گوارا نہیں کیا۔ ان میں خاکساری اور فروتنی بھی تھی۔ جس غریبی میں زندگی کی ابتدا کی تھی اس کی روش اور عادتوں کو کبھی ترک نہیں کیا۔ جب کافی معقول تنخواہ ملنے لگی تب بھی اسی طرح گزارتے اور آمدنی کا بڑا حصہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے۔ نام و نمود کی ان میں ذرا بھی خواہش نہ تھی۔ فقیر منش اور صوفی تھے۔ خاص خاص لوگوں کو مرید بھی بنایا۔ وہ صوفی ہونے کے باوجود کاروبار حیات میں ہمہ تن مصروف رہے اور بھرپور دنیاوی زندگی بھی گزاری۔ ان کی ذات کی خوبیوں میں انسانی عظمت کی واضح نشانیاں نظر آتی ہیں۔ ان کی بزرگی اور شرافت کے جوش بھی مداح تھے۔ اکبرالدین صدیقی اور ڈاکٹر عبدالصمد نے ان کی زندگی کے آخری لمحات کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس سے امجد کے قلب مطمئنہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ تمام تحریریں عقیدت مندوں کی ہونے کے باوجود مبالغہ آمیز تعریفوں اور لفظی ستائشوں سے مبرا ہیں۔

یہ کتاب ابتدائی نوعیت کی ہے جو بنیادی مواد فراہم کرتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت امجد کی بزرگی اور شاعری پر پی ایچ ڈی کے درجہ پر جامع تحقیقی کام ہو۔

## مولانا ابوالکلام آزاد، ایک شخصیت، ایک مطالعہ : مرتبہ ڈاکٹر سلمان شاہجہاں پوری : لاہور : ۱۹۶۷ء

مولانا ابوالکلام آزاد پر لکھے گئے مضامین بے شمار ہیں۔ ان میں معلومات افزا اور بصیرت افروز مضامین کی بھی کمی نہیں ہے۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری نے جو "ابوکلامیات" کے ماہر سمجھے جاتے ہیں عام قاری کے لئے ایسی کتاب مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جو ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر سکے۔ اس سلسلے میں یقیناً "انہیں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اور "خوب" سے "خوب تر" کی تلاش کے لئے عرق ریزی کرنی پڑی ہوگی۔ اس محنت کا حاصل یہ کتاب ہے جس میں مولانا آزاد کو "ایک نادر روزگار شخصیت" "امام عشق و جنون" "داعی دعوت و عزیمت" "زبردست عالم اور فلسفی" "صاحب طرز انشاء پرداز" "بانی عظمت صحافت" "خطیب بے بدل" "طرز قدیم کے شاعر" اور "انقلاب پسند" غرض ہر روپ میں پیش کیا ہے۔ مضامین لکھنے والوں میں ایسے مستند و معتبر نام ہیں کہ وہی تحقیق، تجزیے، اظہار اور تفہیم کے استاد مانے جاتے ہیں۔ جیسے مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ریاض الرحمان شیروانی، سید صباح الدین عبدالرحمان، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی وغیرہ۔ مولانا آزاد کے بارے میں اس نوع کی جو کتابیں مرتب ہوتی رہی ہیں۔ ان میں اسے ممتاز مقام حاصل ہے۔ اہم

موضوعات پر سیر حاصل خیالات موجود ہیں۔ ایک ہی بات کی کسی دوسرے مضمون میں تکرار نہیں ہے۔ اس طرح کی مرتبہ کتب میں جب ایک پہلو پر متعدد مضامین ضخامت بڑھانے یا ہر مضمون نگار کو خوش کرنے کے لئے شامل کرلئے جاتے ہیں تو خیالات کی تکرار ضرور ہوتی ہے جو قاری کے ذہن پر گراں گزرتی ہے۔ کتاب اس خامی سے مبرا ہے۔ مرتب نے اس معاملہ میں بھی دیانت داری کا ثبوت دیا ہے کہ اگر مضمون کہیں سے ماخوذ ہے تو اس کا حوالہ ضرور دے دیا ہے۔ مذکورہ کتاب ابوالکلام آزاد کے ضمن میں مفید معلومات مہیا کرنے کا سبب ہے۔

**خیابان مسعود : جلیل قدوائی (مرتب) : کراچی : ۱۹۷۰ء**

سرسید احمد خان کی خدمات تو ناقابل فراموش تھیں ہی' ان کے بیٹے جسٹس محمود اور ہونہار پوتے سر راس مسعود نے اپنی غیر معمولی قابلیت' ذہانت' ظرافت' قومی درد اور ایثار کے ذریعہ وہ نقش چھوڑے ہیں کہ یہ خاندان جگمگاتے ستاروں کا جھرمٹ دکھائی دینے لگا ہے۔ کراچی میں قائم راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی کے زیر اہتمام جلیل قدوائی نے سر راس مسعود کی شخصیت' ان کے کردار اور ان کے تعلیمی کارناموں پر مضامین جمع کرکے "خیابان مسعود" کے نام سے شائع کیے ہیں۔ اس میں علامہ اقبال' بابائے اردو' سید ہاشمی فرید آبادی' غلام یزدانی' ہارون خان شیروانی' غلام السیدین اور تحسین سروری جیسے معروف لکھنے والوں کے علاوہ بھی کئی حضرات نے نثر اور نظم میں راس مسعود کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بابائے اردو کے ان کے نام پانچ خطوط بھی شامل ہیں جو ان کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالنے کے علاوہ اس وقت کے بعض حالات اور معاملات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ سید ہاشمی فرید آبادی نے انہیں تہذیب وشرافت کا نادر نمونہ قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ راس مسعود انتہائی ذکی الحس تھے۔ فنون لطیفہ خصوصاً شاعری کے سچے دلدادہ تھے۔ اگرچہ خود کبھی شاعری نہیں کی۔ کمال ذہانت اور حافظہ کی غیر معمولی قوت کے ساتھ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ ان کی فیاضی' خیر' ہمدردی' آشنا پرستی' دوست نوازی نے انہیں مقبول بنا دیا تھا۔ حسن ظاہری' جامہ زیبی' خوش گفتاری اور بذلہ سنجی میں وہ اپنا جواب آپ تھے۔ غلام یزدانی نے ذکر کیا ہے کہ ان میں سرسید اور سید محمود کی تمام خوبیوں کا اجتماع تھا۔ تعلیم سے انہیں خاص لگاؤ تھا اور اس کی اشاعت کی سعی کرتے رہتے تھے۔ شعراء کی انہوں نے اس طرح سرپرستی کی کہ بدایوں' حیدر آباد اور بھوپال کے اساتذہ سخن کے کلام کی اشاعت میں مدد اور سعی کی۔ طبیعت میں حد درجہ نفاست پسندی تھی۔ اس وجہ سے فنون لطیفہ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے علمی تجربہ' خاندانی شرافت اور ذاتی وجاہت کے ساتھ دیگر



اوصاف نے انہیں باوقار بنا دیا تھا۔ ہارون شیروانی نے اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدہ کے بنیاد پر بعض دلچسپ واقعات تحریر کیے ہیں جو راس مسعود کی زندہ دلی کی شہادت کہلائے جاسکتے ہیں۔ تحسین سروری نے اپنے ذاتی کتب خانے میں موجود حیدر آباد دکن کے رسائل واخبارات کی مدد سے راس مسعود کی تعلیمی خدمات اور حیدر آباد میں ان کی مقبولیت کا دلکش مرقع پیش کیا ہے۔

کتاب کے ایک حصے میں راس مسعود کی بعض اہم تحریریں محفوظ کردی گئی ہیں تیسرے حصے میں ان کے بارے میں لکھے ہوئے انگریزی مضامین ہیں۔ ان کے وقیع ہونے کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ لکھنے والوں میں مولانا محمد علی' پروفیسر اے بی اے حلیم بھی شامل ہیں۔ راس مسعود کی شخصیت کے ذکر کے ساتھ اس کتاب کا حوالہ لازم ہے۔

**سید رئیس احمد جعفری : مرتبہ آفتاب رئیس احمد جعفری : کراچی : ۱۹۷۰ء**

مشہور صحافی' سیاسی کارکن اور ادیب سید رئیس احمد جعفری کے بارے میں برصغیر کے نامور اہل علم اور اہل قلم حضرات کے مضامین ان کے صاحبزادے آفتاب جعفری نے یکجا کرکے مرتب کیے ہیں۔ اس میں رئیس احمد جعفری کی خودنوشت کے دو ابواب بھی شامل ہیں۔ مالک رام نے ان کی مختصر لیکن جامع سوانح عمری تحریر کی ہے۔ ان کی شخصیت وکردار کے حوالے سے ڈاکٹر سید قریشی' عقیل احمد جعفری' مجید نظامی اور حکیم عبدالقوی دریا بادی کی نگارشات معلومات افزا ہیں اور فکر وفن کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ' حکیم محمد سعید' ابن انشاء' عبداللہ چغتائی اور رفیق خاور نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے علاوہ بعض واقف کاروں کے تاثرات' اخبارات اور اہل علم کے تعزیتی پیغامات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ان تمام مضامین میں معلومات' خیالات' تاثرات کا تنوع بھی ہے اور انفرادی طور پر لکھنے والے نے ان کی شخصیت وکردار کو جس طرح سمجھا ہے اس کا اظہار بھی ہے۔ سید رئیس احمد جعفری کے سوانح اور سیرت کے بارے میں اتنا مواد پیش کیا گیا ہے کہ کتاب کے مطالعہ کے بعد احساس ہوتا ہے کہ وہ قاری کی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ ان کے تعارف کے سلسلے میں ایک اہم تالیف ہے۔

**امیر خسرو' احوال و آثار : مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن انصاری : دہلی : ۱۹۷۵ء**

حضرت امیر خسرو کے بارے میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے ان مضامین میں علامہ شبلی نعمانی اور ڈاکٹر وحید مرزا کے مضامین سوانح وشخصیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی ۲۱ مضامین ان کی تصانیف اور ان کی خصوصیات کے بارے میں ہیں۔ شبلی نعمانی کا مضمون مفصل نہیں ہے۔

اختصار کے ساتھ زندگی کے نمایاں پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ اوصاف اور خصوصیات بھی اسی طرح سے بیان ہوئی ہیں جن میں شاعرانہ کمالات' موسیقی سے دلچسپی' فقر و تصوف کا ذکر ہے۔ یہی کیفیت ڈاکٹر وحید مرزا کے مضمون کی ہے۔ البتہ امیر خسرو کی ایک تصنیف پر جداگانہ مضمون شامل ہیں۔ جن میں ہر پہلو سے خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

**عبدالرحمان چغتائی (فنکار)' شخصیت اور فن : مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا : ۱۹۸۰ء**

ڈاکٹر وزیر آغا نے مشہور و معروف مصور عبدالرحمان چغتائی کے تعارف کے طور پر یہ مجموعہ مرتب کیا ہے۔ جس کے ابتدائی ۱۸ مضامین ملک اور بیرون ملک کے ان مداحوں اور مصوری کے نقادوں کے شامل ہیں جو مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔ اس میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کی ۲۱ جولائی ۱۹۲۸ء کی تحریر بھی شامل ہے اور ڈاکٹر جیمز کزن' مادام نمارتا تالبوٹ رائس' ہیزل گرے کے علاوہ دیگر قدر شناسوں کی آراء بھی شامل ہیں۔ سوانح عمری کے لحاظ سے عبدالرحمان چغتائی کے برادر خورد ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا مضمون اہم ہے۔ ظاہر ہے وہ اپنے بھائی کی زندگی کے واقعات سے دوسروں کی نسبت زیادہ واقف ہوں گے لیکن اس کے باوجود انہوں نے نہ تو صاحب سوانح کی تاریخ پیدائش' خاندانی روایات کے مطابق تحریر کی اور نہ اسکول ریکارڈ کے حوالے سے! صرف اتنا لکھا ہے

"میں لاہور میں ۲۳ نومبر ۱۸۹۶ء کو محلہ چابک سواراں میں پیدا ہوا تھا میری یہی تاریخ پیدائش میرے میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں درج ہے اور یہی صحیح ہے۔ ہماری والدہ مرحومہ (متوفی ۱۹۱۵ء) کہا کرتی تھیں کہ عبدالرحمن تجھ سے تقریباً "سوا دو سال بڑا ہے۔" (۹۱)

مصنف نے خاندان کا شجرہ بھی شامل کیا اور "عبدالرحمن بن کریم بخش بن رحیم بخش" کا سلسلہ عہد شاہ جہاں کے مشہور معمار' احمد معمار کے خاندان سے جتایا ہے۔ جو "معمار تاج محل" کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ صاحب سوانح کے بچپن کے واقعات سے باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ عبدالرحمن چغتائی انتہائی لاابالی اور سیمابی کیفیت کے حامل تھے۔ انہوں نے میو اسکول لاہور میں ڈرائنگ ماسٹر کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا لیکن مزاج کے تلون کی وجہ سے اسے جاری نہ رکھ سکے وہ کلکتہ گئے وہاں ٹیگور طرز مصوری کے نمونے دیکھے اور وہاں سے آئے تو خود اعتمادی کے ساتھ اپنے انفرادی طرز کا تصور لے کر آئے۔ ان کی شہرت کا آغاز (۱۹۱۶ء کے بعد) "ماڈرن ریویو" کلکتہ میں ان کی تصویروں کی اشاعت سے ہوا۔

عبدالرحمن چغتائی نے فن مصوری کے اسلامی ورثے سے گہرے اثرات قبول کئے تھے اور



پنجاب کے ماحول میں جو روایات حسن اور مغل مصوری کی جو فضا موجود تھی اس سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ مصوری کے مغربی نقطۂ نگاہ سے انحراف اس کی شخصیت کا حصہ بن چکا تھا اور حتی الامکان کسی جاندار کی تصویر نہیں بناتا تھا۔" (۹۲)

عبدالرحمن چغتائی کی تصویروں میں ان کی فکر اور شخصیت گھلے ملے ہیں۔ ایک نقاد کی حیثیت سے مصنف نے ان باتوں کی وضاحت کی ہے اور مصور جن کامیابی کے مرحلوں سے گزرا ہے ان کے حوالے سے ایک ایک شاہکار کی نوعیت اور فنی خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ تفریحی مشاغل میں بھی ادراک فن کی منزلوں سے گزرتے تھے۔

مصنف نے عبدالرحمن چغتائی کے فنی مشاغل کی تفصیل میں ایسی باتیں بھی تحریر کی ہیں جو عام طور پر معلوم نہیں تھیں۔ وہ اپنی تصویروں کے لئے خاص طور پر اپنی مرضی کا کاغذ یورپ کے کارخانوں میں تیار کروا کر منگواتے تھے۔ زیادہ تر ونسر اینڈ نیوٹن لندن کے بنے ہوئے برش استعمال کرتے وہ سونا بھی ضرورت کے مطابق تصاویر میں لگاتے تھے جس طرح قدیم فن کار لگاتے تھے۔" (۹۳)

مصوری کے کارناموں کے ضمن میں مرقع چغتائی کی تیاری کے تمام مراحل تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

"چغتائی کے سفر یورپ' راولپنڈی میں تعمیر مکان' رائل اکیڈمی آف آرٹ میں شمولیت' فلم بنانے کی سعی ناکام' افسانہ نویسی وغیرہ کے مکمل کوائف موجود ہیں۔ عبدالرحمن چغتائی بحیثیت مصور کے اس مضمون کے ذریعے پوری طرح متعارف ہو جاتے ہیں لیکن ان کی نجی زندگی اور غیر فنکارانہ مشاغل کا حال معلوم نہیں ہوتا۔

**جگن ناتھ آزاد' ایک مطالعہ : مرتبہ محمد ایوب واقف : نئی دہلی : ۱۹۸۰ء**

محمد ایوب واقف نے اردو کے معروف شاعر جگن ناتھ آزاد کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کے لئے "آزاد' ایک مطالعہ" مرتب کی ہے اور اس کو کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ شخصیت' دوسرا شاعری' تیسرا نثر نگاری' چوتھا اقبالیات اور پانچواں انٹرویوز کے بارے میں ہے۔ جہاں تک شاعرانہ خصوصیات اور آزاد کی اقبال پرستی اور اقبال فہمی کا تعلق ہے مضامین کا معیار بلند ہے لیکن شخصیت کے حوالے سے جو مضامین شامل کئے گئے ہیں ان میں رام لعل کے مضمون کے علاوہ کسی نے بھی موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے بلکہ شاعری اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ رام لعل نے واضح کیا ہے کہ آزاد ایک خوش

کہ، خوش طبع، فقرہ باز اور دلچسپ انسان ہیں۔ ان کی فقرہ بازی سے اچھے اچھے پناہ مانگتے ہیں۔ آزاد کی ذات میں جو سوز و گداز ہے اس کے حوالے سے سب کا خیال ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد رونما ہونے والے اندوہناک واقعات نے ان پر گہرا اثر چھوڑا ہے اور اپنی پیدائشی سرزمین کو چھوڑنے کا ملال ان پر ہمیشہ طاری رہتا ہے۔ وہ اقبال کی عظمت کے اس شدت سے قائل ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کا کوئی ذی علم ان کے مقابلے کا نہیں ہے۔ پاکستانیوں کی طرح وہ اقبال کو تصور پاکستان کا خالق ہی نہیں سمجھتے اور ہندوستان کی طرح صرف قوم پرست شاعر نہیں مانتے بلکہ ان کی شاعری کی آفاقی انسانی قدریں ہی ان کی نظر میں اہم ہیں۔ کتاب کے ذریعہ آزاد کے بارے میں ایک نقش قائم ہوتا ہے لیکن یہ گہرا اور دیرپا نہیں جیسا کہ ہونا چاہیے تھا۔

**ڈاکٹر عبدالمعید اور پاکستانی لائبریرین شپ : مرتبہ نسیم فاطمہ، رئیس احمد صمدانی : کراچی : ۱۹۸۱ء**

پاکستان میں علم کتب خانہ (لائبریری سائنس) کے بانی اور معمار ڈاکٹر عبدالمعید سمجھے جاتے ہیں۔ لائبریری سائنس کے حوالہ سے ان کی مہارت اور خدمات کا احاطہ ان ۱۸ مضامین میں کیا گیا ہے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ لکھنے والوں میں ان کے واقف کار، احباب، شریک کار اور شاگرد شامل ہیں۔ زیادہ توجہ ڈاکٹر معید کی خدمات کو دی گئی ہے۔ ساتھ ہی ان کی کام سے لگن دوسروں کی بے لاگ رہنمائی، مطبوعات اور مخطوطات کے حصول اور حفاظت سے دلچسپی، ملنساری، خاکساری اور انتھک محنت کی صفات کا بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان مضامین کے ذریعے موصوف کی سیرت اور کردار کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ کتاب میں ان کا کوئی شخصی خاکہ شامل نہیں ہے جو اس کی بڑی خامی ہے۔

**حسرت موہانی : مرتبہ ثریا حسین : علی گڑھ : ۱۹۸۲ء**

اسی نوعیت کی ایک اور کتاب ثریا حسین نے مرتب کی ہے۔ اوائل ۱۹۸۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حسرت سیمینار ہوا تھا۔ اس میں پڑھے گئے مقالات کا یہ مجموعہ ہے۔ اس میں شامل ۱۰ مضامین میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جو ان کے سوانحی حالات اور اوصاف و کردار سے متعلق ہو۔ سارے مضامین ان کی شاعری اور سیاست کے حوالے سے ہیں۔

عتیق صدیقی نے مولانا کے "مشاہدات زنداں" کو "حسرت موہانی، قید فرنگ میں" کے عنوان سے مرتب کیا ہے اور اسی کے ساتھ ایسے مضامین بھی شامل کر دیئے ہیں جو ان کی سیاسی



زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔ مولانا کی ابتدائی زندگی اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے زمانہ طالب علمی کے حالات کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان معلومات کی روشنی میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی اٹھان کس طرح ہوئی اور ان کی افتاد طبع پر کون سے عناصر اثر انداز ہوئے۔ آخر الذکر مضمون کے سلسلے میں سجاد حیدر یلدرم کے مضمون سے خصوصیات کے ساتھ استفادہ کیا ہے جو دسمبر ۱۹۰۸ء میں "خافی خان" کے فرضی نام سے زمانہ میں شائع ہوا تھا۔

"عملی سیاسی زندگی کا آغاز" کے زیر عنوان جو مضمون تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں اردوئے معلی میں شائع ہونے والے مولانا کے مضامین کے حوالے سے کام لیا ہے۔ ان کے ذریعہ ایک مستند تجزیہ مرتب کیا ہے جو مولانا کے اس زمانہ کی ذہنی افتاد اور سیاسی معتقدات کو واضح کرتا ہے۔ وہ شدت سے آزادی پسند تھے۔ ان کا رویۂ انتہا پسندانہ تھا اس لئے لوکمانیہ تلک کے گرم دل میں شامل رہے لیکن جب کانگریس کے نرم دل کی مخالفت انتہا کو پہنچ گئی تو وہ بھی تلک کے ساتھ کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔ "مشاہدات زنداں" کے بعد "حسرت کی سیاسی زندگی کے آخری پچیس سال" کے عنوان سے ایک مضمون شامل ہے۔ اس میں ۱۹۲۱ء کے احمد آباد اجتماعات، مولانا کی قرار داد متعلق کامل آزادی اور ان کی تقریروں کے ذریعے مکمل صورت حال پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس (منعقدہ ۱۹۲۵ء) کے خطبۂ استقبالیہ کو من و عن نقل کر دیا ہے۔ عنوان کے حوالے سے مضمون غیر مکمل ہے لیکن چند اہم تاریخی واقعات کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے بارے میں وافر معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کے ذریعہ مولانا کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آ گئے ہیں۔ جیسے آزادی کے لئے عزم اور استقبال، کسی سے مرعوب نہ ہونا، حق گوئی اور بے باکی، سیاسی اور ادبی اجتماعات میں بغیر کسی کی پسند کا لحاظ کئے اپنے دل کی بات کہہ دینے کا حوصلہ۔

**حسرت موہانی : بہار اکیڈمی : پٹنہ : ۱۹۸۲ء**

بہار اردو اکادمی نے ۲۱، ۲۲ نومبر ۱۹۸۱ء کو حسرت موہانی سیمینار منعقد کیا تھا۔ اس میں پڑھے گئے مضامین کتابی صورت میں (۱۹۸۲ء) میں شائع ہوئے جس کو شخصیت اور سیاست، صحافت اور شاعری کے عنوانات کے تحت رکھا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا مضمون "حسرت کی کہانی ان کے ایک دوست کی زبانی" ان اقتباسات پر مشتمل ہے جو موصوف کی کتاب "کار جہاں دراز ہے" میں شامل تھے۔ اس کا بڑا حصہ مولانا کی ایم اے کالج کی طالب علمی کے زمانے سے متعلق ہے۔ مولانا پر جو پہلا مضمون زمانہ کانپور (دسمبر ۱۹۰۸ء) میں "خافی خان" کے قلمی نام سے شائع ہوا تھا

اس کے مشمولات اور انداز بیان اس مضمون سے بہت ملتے جلتے ہیں ممکن ہے قرۃ العین حیدر نے اسی سے استفادہ کیا ہو۔ اس میں مولانا کی اس شوخی' شرافت اور لاابالی پن کا ذکر ہے جو طالب علموں کا خاصہ ہوتا ہے اسی کے ساتھ تعلیم' علم اور ادب سے ان کی جو دلچسپی ابتدا سے ہی تھی اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مولانا کی زندگی کے ایک خاص دور اور اس وقت کی شخصی خصوصیات کے لحاظ سے یہ ایک اچھا مضمون ہے۔ حکیم غبار بھٹی نے مولانا سے اپنی چند ملاقاتوں کا حال اپنے مضمون میں بیان کیا ہے جس میں مولانا کی شخصیت پر مسلمانوں کے دور اولیٰ کی شخصیات کے اثر کو واضح کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کے مذہبی معتقدات' اعراس میں شرکت سے رغبت' سماع سے دلچسپی' اولیائے کرام سے حد درجہ عقیدت کا حال لکھ کر ان کی زندگی کے اس خاص پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ بعض غیر مصدقہ اور ناقابل یقین واقعات بیان کر کے مولانا کے فقر و فاقہ کی کیفیت بھی لکھی ہے۔ مضمون نگار نے کرشن بلدیو شرما کو ایک مستند راوی تسلیم کرتے ہوئے ان کی بیان کردہ روایت کو دہرایا ہے کہ

"ایک مرتبہ کانپور کے ایک سوداگر چوب جو حسرت کے نیاز مند تھے ان سے ملنے گئے تو دیکھا کہ مولانا کچھ تحریر فرما رہے ہیں۔ (غالباً "شرح دیوان غالب لکھ رہے تھے)" (۹۴)

مضمون نگار کو علم نہیں کہ مولانا نے ۱۹۲۰ء کے بعد کانپور کی سکونت اختیار کی تھی اور شرح دیوان غالب ۱۹۰۵ء میں شائع ہو چکی تھی۔ سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بلدیو شرما نے لکھا ہے کہ مولانا لکھ بھی رہے تھے اور کچھ کھا بھی رہے تھے جو پردہ کے پیچھے تھا۔ سوداگر چوب کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ

"آج تیسرا فاقہ ہے شکر ہے سوکھی روٹی میسر آگئی' بڑی تسکین ہو گئی۔" (۹۵)

بظاہر واقعہ متاثر کن ہے لیکن اس میں حقیقت نظر نہیں آتی۔ مولانا کا تیسرا فاقہ تھا ایسا ممکن ہے اسی کے بعد "سوکھی روٹی" میسر آگئی' کہاں سے؟ اگر گھر میں "سوکھی روٹی" موجود تھی تو فاقہ کیوں کیا؟ اور اگر کہیں اور سے آئی تو کیا دینے والے نے "سوکھی روٹی" ہی دی؟

عطا کاکوی نے مولانا کی سیاسی زندگی اجمالاً" پیش کی ہے اس میں واقعات اور سنین کی تحقیق کا فقدان ہے۔ اس کے ضمن میں لکھا ہے "ابھی کالج میں ہی تھے کہ انڈین نیشنل کانگریس کی طرف طبیعت کا میلان ہوا۔" (۹۶)

"گاندھی جی کی سودیشی تحریک کے وہ دل سے حامی تھے۔" (۹۷)

"ڈاکٹر انصاری جو کانگریس کے بھی پریذیڈنٹ رہ چکے تھے ان سے بھی کچھ ان بن ہو گئی۔" (۹۸)



بحوالہ بالا اور اسی قسم کی بے سروپا باتوں سے مضمون بھرا پڑا ہے۔ کالج کے زمانے میں مولانا کانگریس کی طرف مائل تھے۔ اس کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ ڈاکٹر انصاری سے ناراضگی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔ جس سے مضمون نگار لاعلم ہے۔ یہ ناراضگی مسلم یونیورسٹی کے قیام کی شرائط کے سلسلے میں ہوئی۔ مولانا یونیورسٹی کو حکومت کے اثر و رسوخ سے آزاد رکھنے کے حامی تھے۔ حکومت اس پر راضی نہیں تھی۔ جب وہ دوسری بار گرفتار ہوئے۔ مولانا آزاد رانچی اور مولانا محمد علی چھندواڑہ میں نظر بند ہوئے تو مظہر الحق اور ڈاکٹر انصاری نے فاؤنڈیشن کمیٹی کے دیگر اراکین پر دباؤ ڈال کر حکومت کی شرائط پر یونیورسٹی قبول کرلی تھی۔ ان دونوں کے اقدام پر مولانا سخت ناراض ہوئے اور اس کا اظہار اشعار میں بھی کیا ہے۔ سودیشی تحریک مولانا نے ۱۹۰۷ء میں شروع کی تھی۔ علی گڑھ کے علاقے رسل گنج میں سودیشی دستور ۱۹۱۳ء میں قائم ہوا۔

غلام سرور نے اپنے مضمون میں مولانا کی آزادی کے لئے تڑپ اور جدوجہد کا ذکر کیا ہے اس کی نوعیت بھی سرسری ہے۔ ۱۹۲۱ء کے احمد آباد سیاسی اجتماعات کے حوالے سے مولانا کی پیش کردہ قرارداد کا ذکر تو کیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرارداد کی حقیقی نوعیت سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ان کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ کانگریس کے اجلاس میں اس قرارداد کے حوالے سے "انہیں ایک ووٹ بھی نہیں ملا۔" (۹۹) بالفورڈ نے لکھا ہے کہ

"حسرت موہانی کی تائید کرنے والوں میں آندھرا کے تمام ڈیلی گیٹ' بنگال کے تمام ڈیلی گیٹ' صوبہ متوسط کے تمام ڈیلی گیٹ' یوپی کے تین ڈیلی گیٹ' بمبئی کے چند ڈیلی گیٹ اور تمام سکھ ڈیلی گیٹ سوائے ایک کے حامی تھے۔" (۱۰۰)

"حسرت بھی کسمپرسی اور تنگ دستی کے عالم میں ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی پہلی اہلیہ بھی روایت برقرار رکھتے ہوئے اسی عالم میں ۱۹۲۵ء میں قضا کر گئیں۔" (۱۰۱)

مولانا کی پہلی اہلیہ نشاط النساء بیگم کا انتقال ۱۹۲۵ء میں نہیں' ۱۸ اپریل ۱۹۳۷ء میں ہوا تھا۔ علی گڑھ کالج کے بارے میں مضمون نگار کے خیالات خود ساختہ اور تاریخی حقیقت سے عاری ہیں۔ حیرت اس بات پر نہیں کہ لوگ جو جی میں آئے لکھ جاتے ہیں حیرت اس بات پر ہے کہ ایسی بے سروپا باتوں کو سیمینار میں سنا بھی جاتا ہے اور انہیں کتابوں میں شامل کر کے غلط فہمی کو وسعت بھی دی جاتی ہے۔

کلام حیدری نے مولانا کی صحافتی زندگی کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا کے

رسالہ اردوئے معلی کا ذکر کرتے ہوئے ۱۹۰۸ء میں اس میں ایک مضمون شائع کرنے کی پاداش میں مولانا کو سزائے قید ہونے کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں تبصرہ کیا ہے

علی گڑھ میں "اردوئے معلی" ایک اتنا سا بھی حلقہ نہ بنا سکا جو حسرت کے قیام زندان کے زمانہ میں اس رسالہ کو زندہ رکھ سکتا۔" (۱۰۲)

جو شخص اس وقت کے عام حالات اور بالخصوص علی گڑھ کی انتظامیہ کے جبر و استبداد سے ناواقف ہے وہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ مضمون نگار نے یہ نہیں بتایا کہ اس دور میں یا اس کے چند سال بعد تک کے زمانے میں کتنے اخبارات اور رسائل سیاسی عتاب کا شکار ہوئے اور ایڈیٹر کی غیر موجودگی میں انہیں کس کس نے شائع کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ مضمون نگار کا یہ تبصرہ بے معنی ہے کہ "اردوئے معلی میں اس آنچ کی کیوں کمی تھی جس نے حسرت کو اپنے وقت کا بڑا انقلابی، نڈر اور بے باک وطن پرست اور آزادی کا علمبردار بنایا۔ حسرت اپنی شخصیت کی حرارت اردوئے معلی کو نہ دے سکے۔" (۱۰۳)

جو اس شخص اس وقت کے عام حالات اور بالخصوص علی گڑھ کی انتظامیہ کے جبر و استبداد سے ناواقف ہے وہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ مضمون نگار نے یہ نہیں بتایا کہ اس دور میں یا اس کے چند سال بعد تک کے زمانے میں کتنے اخبارات اور رسائل سیاسی عتاب کا شکار ہوئے اور ایڈیٹر کی غیر موجودگی میں انہیں کس کس نے شائع کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ مضمون نگار کا یہ تبصرہ بے معنی ہے کہ "اردوئے معلی میں اس آنچ کی کیوں کمی تھی جس نے حسرت کو اپنے وقت کا بڑا انقلابی، نڈر اور بے باک وطن پرست اور آزادی کا علمبردار بنایا۔ حسرت اپنی شخصیت کی حرارت اردوئے معلی کو نہ دے سکے۔" (۱۰۳)

مضمون نگار نے اپنی عدم واقفیت کا الزام مولانا کے سر لگا دیا ہے' ان کا اخذ کردہ یہ نتیجہ غلط ہے کہ اردوئے معلی میں وہ حرارت موجود نہ تھی جو مولانا کی شخصیت میں تھی۔ اگر حقیقت وہ ہوتی جو مضمون نگار نے بیان کی ہے تو ۱۹۰۸ء میں ایک بے ضرر سے مضمون شائع کرنے کے جرم میں انہیں سزا نہ ہوتی۔ کالج کے طلباء پر ان سے ملاقات پر پابندی عائد نہیں کی جاتی۔ مضمون نگار اس حقیقت سے بھی ناواقف ہیں کہ اردوئے معلی میں شائع ہونے والے بعض مضامین کا ترجمہ انگریزی اخبارات میں شائع ہوا کرتا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مولانا برکت اللہ بھوپالی جو جنگ آزادی کے بہت بڑے مجاہد تھے ۱۹۰۵ء میں امریکہ میں مقیم تھے اور انہوں نے انگریزی اخبار میں مضمون کا ترجمہ پڑھ کر مولانا کو تحسین سے بھرا خط لکھا تھا اور بعد میں خود بھی مضامین



لکھ کر بھیجنے لگے تھے جس رسالہ کے اثرات امریکہ تک پہنچے ہوں اس کے بارے میں یہ اطلاع فراہم کرنا کہ اس کا کوئی حلقہ اثر نہیں تھا اور اس میں کوئی حرارت نہیں تھی۔ محض ناواقفیت کا اظہار ہے۔ اردوئے معلی کے تیسرے دور کے بارے میں لکھا ہے کہ

"حسرت نے اسے پھر ۱۹۲۵ء سے نکالا اور یہ ۱۹۳۲ء کے مارچ تک نکلتا رہا۔" (۱۰۴)

اردوئے معلی کا آخری شمارہ مارچ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ مضمون نگار کا یہ بیان بے سروپا ہے کہ

"رسالہ پر حسرت کی توجہ کا یہ عالم تھا کہ اردوئے معلی کے کسی شمارے کی فہرست مضامین اس شمارے میں شائع کردہ مضامین کے مطابق نہ ہو سکی۔" (۱۰۵)

ایسا ایک دو بار ضرور ہوا ہے۔ غالباً" مضمون نگار کی معلومات ان دو ایک شماروں تک محدود ہے بر سبیل تذکرہ یہ بھی لکھا ہے کہ

"لیگ میں شامل ہوئے تو مسلمانوں کے حقوق اور پاکستان کے لئے جناح سے لڑ پڑے۔" (۱۰۶)

ہم نے تاریخ مسلم لیگ کا ایک ایک واقعہ مختلف حوالوں سے پڑھا ہے۔ مضمون نگار کی تحقیق کی توثیق کسی سے نہ ہو سکی۔

"۷۷ سال کی عمر میں حسرت موہانی نے انتقال کیا۔ یہ ۱۹۵۲ء تھا۔" (۱۰۷)

جس مضمون نگار کو بنیادی معلومات حاصل کرنے کا شعور نہ ہو وہی مولانا کا سال وفات ۱۹۵۲ء قرار دے سکتا ہے۔ مولانا نے ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو رحلت فرمائی تھی۔ مضمون نگار نے مولانا کی صحافتی زندگی پر قلم اٹھایا ہے لیکن "تذکرۃ الشعراء" اور اخبار "مستقل" کا ذکر نہیں کیا۔

کلام حیدری کی نسبت شہباز حسین اور رضوان احمد نے مولانا کی صحافتی زندگی پر بہتر طور پر روشنی ڈالی ہے۔

## محمد نقوش : مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمان : ملتان : ۱۹۸۳ء

محمد طفیل نے رسالہ نقوش لاہور کے اتنے شاندار اور یادگار شمارے شائع کئے تھے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے نقوش کی شہرت و مقبولیت کی بناء پر اس کے مدیر کی ذات کو اس میں مدغم کرکے انہیں محمد نقوش کا نام دے دیا تھا اس نام نے مقبولیت عام حاصل کی۔ اس لئے محمد طفیل کے لکھے گئے خاکوں کو کتابی صورت میں مرتب کرتے ہوئے ڈاکٹر سید معین الرحمان نے اس کا نام ہی محمد نقوش تجویز کر دیا ہے۔

کتاب "عرض مرتب" کے علاوہ داد و تحسین 'صدارتی خطبات' 'شخصیت' 'نقوش' 'روائیداد (آپ بیتی غیر) خاکہ نگاری' چند تبصرے' چند تقریریں' چند خطوط' حاصل حیات' رسول نمبر کی ذیلی سرخیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں شخصیت کے باب میں محمد طفیل کے خاکے ہیں جو ایسے معروف صاحب اسلوب ادیبوں کے تحریر کردہ ہیں جو مدیر نقوش سے کماحقہ' واقف تھے۔ حفیظ جالندھری اور کرشن چندر نے محض طرز تحریر سے مضامین میں جان پیدا کی ہے اور خاکہ نگاری یا شخصیت نگاری کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے یوں تو "طفیل صاحب' چند تاثرات" کا عنوان قائم کیا ہے۔ حقیقت میں ان کا مضمون مدیر نقوش کی اس ابتدائی زندگی سے متعلق ہے جب وہ ایک خطاط تھے۔ کتابوں کے ناشر بنے اور پھر احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کی ادارت میں نقوش کا اجراء کیا۔ لیکن ترقی پسند ادب کا اٹھتا ہوا طوفان قانون کے حکم سے تھم گیا تو نقوش کی بقا کے لئے محمد طفیل نے خود ادارت سنبھال لی۔ زندگی بھر ان کا کردار مصالحانہ' صلح جویانہ اور نرم اور بامقصد رہا۔ یہی ان کی شخصیت کے اوصاف تھے۔ خاکہ نگار نے واقعات کے ذریعہ ان کی خاموشی' سنجیدگی اور کام میں انہماک کی صفات کو پوری طرح ابھارا ہے اور باوجود اختلاف کے ان کے رویہ کی تعریف کی ہے۔ کتاب کا کامیاب ترین مضمون لطیف الزمان خان کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی غالباً" یہ وجہ ہے کہ دیگر خاکہ نگاروں کے تعلقات محدود نوعیت کے تھے جس کی بناء پر وہ محمد طفیل کے چند مخصوص پہلوؤں کا مطالعہ کر سکتے تھے جبکہ لطیف الزمان خان ان کے خلوت وجلوت کے ساتھی' ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے آشنا' درون خانہ کے حالات سے واقف' کاروباری اور ادبی زندگی کے احوال سے واقف کار تھے۔ اپنے طویل مضمون میں انہوں نے محمد طفیل کی شخصیت کی مکمل تصویر کشی کی ہے جس میں ان کی طبیعت کی نرمی وملائمت' کم آمیزی' زود حسی' سخت کوشی' ادب نوازی اور ادیب نوازی کی خوبیاں پوری طرح اجاگر ہوئی ہیں۔ انہوں نے محمد طفیل کے ساتھ کسی جانبداری کا مظاہرہ نہیں کیا اس محبت کے باوجود جو ان کو صاحب تذکرہ سے تھی ہلکے پھلکے انداز میں مزاح کا موضوع بھی بنایا ہے۔ بالخصوص محمد طفیل کا ادب سے تعلق نہ رکھنے والی خواتین سے دامن بچانے کے لئے عجیب وغریب حرکتیں کرنا اور معمول کے کام کو ٹال کر روپوش ہو جانا اس طرح بیان ہوا ہے کہ قاری کو لطیف مزاح کا پورا لطف حاصل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ محمد طفیل کا یہ رویہ ان کی اخلاقی قدروں کی غمازی اور تربیت کی عکاسی کرتا ہے لیکن فی زمانہ عام رویہ سے مختلف ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا مضمون "قد آور بونا" بھی اسی باب میں شامل کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس میں ان کی شخصیت سے زیادہ ان کی خاکہ نگاری سے بحث کی گئی ہے۔



اسے پچھلے باب یعنی "خاکہ نگاری" میں شامل ہونا چاہئے تھا۔ ممتاز مفتی' ڈاکٹر محمد حسن' صادق حسین' انتظار حسین اور فارغ بخاری کے لکھے ہوئے خاکے میں وہی تمام اوصاف اپنے اپنے تجربے اور مشاہدہ کی بناء پر بیان ہوئے ہیں جن کا حال نسبتاً" وضاحت اور طوالت سے لطیف الزمان خان نے لکھا ہے۔ ان تمام خاکوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان حضرات کے لکھے ہوئے ہیں جو اس فن سے واقف ہیں۔ انہوں نے کہیں بھی صاحب تذکرہ کے مقابلے میں اپنی ذات کو ابھارنے اور نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ خاکوں کو متوازن رکھا ہے نہ تو وہ سراسر مدح ہیں اور نہ قدح! ان میں قربتوں اور محبتوں کی مہک کے ساتھ حق طفیل شناسی ادا کیا گیا ہے۔ مرتب نے ترتیب میں ذہنی بصیرت سے کام لیا ہے جو قابل داد ہے۔

### ساغر نظامی : مرتبہ ضامن علی خان : نئی دہلی : ۱۹۸۵ء

ساغر نظامی کے سوانحی خاکوں' ان کے روز مرہ اخلاق و کردار اور شاعری و تصانیف کے بارے میں ۳۰ مضامین کے اس مجموعے کو ضامن علی خان نے مرتب کیا ہے۔ مرتب اور مالک رام نے ساغر کی مختصر سوانح عمریاں لکھیں ہیں۔ ان دونوں مضامین میں مواد کی تکرار ہے۔ مناسب ہوتا کہ ان میں سے کسی ایک کو شامل کیا جاتا۔ ساغر کی تحریروں کے حوالے کی بنیاد پر ان کے سوانح نگار متفق ہیں کہ ان کی تاریخ پیدائش ۲۱ دسمبر ۱۹۰۵ء ہے۔ مالک رام نے اس امر کا بھی اظہار کیا ہے کہ ساغر نے ایک جگہ اپنے پردادا کا نام سردار شہباز خان لکھا ہے اور دوسری جگہ نواب عبدالرحمن خان والی جھجر کو اپنا پردادا بتایا ہے۔ ان کے والد کا نام احمد یار خان تھا۔ مالک رام نے متعدد کتب کے حوالے ثابت کیا ہے کہ عبدالرحمن خان کے کسی بیٹے کا نام احمد یار خان نہیں تھا۔ سردار شہباز خان کے حوالے سے ساغر کا دعویٰ ہے کہ وہ عبدالرحمن خان کی فوج کے سپہ سالار تھے اور انہیں عبدالرحمن کے ساتھ پھانسی دیدی گئی تھے۔ مالک رام کی تحقیق کے مطابق غلط اور بے بنیاد ہے۔ ساغر نے نویں جماعت میں رہنے کے دوران ترک تعلیم کیا۔ اس کی وجہ ۱۳-۱۴ سال کی عمر میں ان کے بیدار سیاسی شعور اور کانگریس کی تحریک ترک موالات کو بتاتے تھے۔ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ہے۔ دادا کے تذکرہ کی طرح یہ بات بھی بے بنیاد معلوم ہوتی ہے اور محض ستائش کے لئے لکھی گئی ہے۔ مالک رام نے ان کی ادبی' صحافتی اور عملی زندگی کی تمام تفصیلات درج کردی ہیں۔ شاعری میں سیماب اکبر آبادی کی شاگردی اور رسالہ "پیمانہ" کے شریک مدیر کی حیثیت سے ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ اردو مرکز سے منسلک ہو کر وہ لاہور آئے جہاں سیماب سے اختلاف ہونے شروع ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں دہلی سے "پیمانہ" جاری کیا۔

۱۹۲۸ء میں "علی گڑھ پنچ" ۱۹۳۰ء میں ہفتہ وار "استقلال" ۱۹۳۴ء میں ماہنامہ "ایشیا" جاری کئے۔ ان تمام رسائل واخبارات کی کامیابی کی نوید بے معنی سی نظر آتی ہے جب ان کی مدت اشاعت پر خیال کیا جاتا ہے۔ کامیاب رسائل یوں مہینوں میں آغوش فنا میں نہیں چلے جاتے۔ ۱۹۴۳ء میں ان کے فلمی دنیا سے منسلک ہونے پر خوشحالی کا دور شروع ہوا۔ شواہد کے ذریعہ یہ جتایا گیا کہ وہاں سے ان کی بے دخلی جوش کی سازش کا نتیجہ تھی۔ ان کے سوانح نگاروں نے ان کی ازدواجی زندگی، اولاد اور گھریلو ماحول کو کامیابی سے پیش کیا ہے ان کے ذاتی اوصاف کے بارے میں ضامن علی شاہ نے لکھا ہے کہ۔

"وہ صفائی اور رکھ رکھاؤ کے دلدادہ تھے۔ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ بہت شوق سے پہنتے تھے۔ "زندگی کو زندگی کی طرح برتا تھا۔" (۱۰۸)

جن شاعروں نے شاعر کے سماجی وقار کو بلند کیا ان میں وہ بھی شامل تھے۔ دیدہ زیبی کے علاوہ گھر کی سجاوٹ کا بھی شوق تھا۔ شیر کی کھال، ہرن کے سینگ، ان کے گھر کی آرائش کے سامان تھے۔ تنویر احمد علوی نے ان کا سراپا بیان کیا ہے۔

"چمکدار پیشانی، اس پر گھنگریالے بال، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، روشن چہرہ، کھلتا ہوا گندمی رنگ، مسکراتے ہوئے لب، نکلتا ہوا متناسب و موزوں قد، چھریرا بدن، خوبصورت، پُروقار اور روشن، بے حد زیب تن، شگفتہ سخن، علی گڑھ کٹ کی شیروانی، چوڑی دار پاجامے اور وضع دار پشاوری چپل یا پھر تیز سیاہ رنگ چمکتا شوز، ٹوپی کا انداز بھی عام لوگوں سے بمراتب مختلف۔" (الف ۱۰۸)

سوانحی کوائف کے بارے میں طویل اور تفصیلی مضمون بیگم ساغر نظامی (ذکیہ نیر) نے لکھا ہے جو ذاتی معلومات پر مبنی ہونے کی وجہ سے پُر مغز اور معلومات افزا ہے۔ خلیق انجم نے "جوبنام ساغر" کے زیر عنوان ان معاصر شعراء کے روابط و تعلقات کا ذکر کیا ہے اور جوش کے ۵۶ خطوط بنام ساغر شامل کئے ہیں۔ اس مضمون میں اور ان خطوط سے ان دونوں کے تعلقات کے نشیب وفراز کا پتا ہی نہیں چلتا بلکہ ان کے کردار اور ذہنی افتاد کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

بر سبیل تذکرہ بھارتی اہل قلم کے اس رجحان کا ذکر کردینا بھی ضروری ہے کہ انھوں نے یہ شعار بنا رکھا ہے کہ جا و بے جا مسلم لیگ، مسلم قومیت، دو قومی نظریے اور تحریک پاکستان کو تنقید کا نشانہ بنائیں۔ ممکن ہے وہاں کی سیاست میں اظہار حب الوطنی کے لئے ان آراء کی کوئی اہمیت ہو لیکن اول تو یہ آراء بے بنیاد اور گمراہ کن ہیں اور دوسرے تاریخ کو مسخ کرنے کے



مترادف ہیں۔ بیگم ساغر نے بے موقع اظہار خیال کیا ہے کہ

"۳۰، ۳۲ء کے بعد ماحول میں ایک مصنوعی اور عارضی گرمی ہوئی۔ مسلم لیگ نے اردو کے مسئلے کو Exploit کرنا شروع کیا۔ بعض شہروں میں کتاب گھر کھلے بعض شہروں سے رسالے جاری ہوئے پھر بھی یہ آثار کوئی ایسے مثبت آثار نہ تھے جنہیں کسی مخصوص تبدیلی سے تعبیر کیا جاتا بلکہ یہ ایک خطرناک کروٹ تھی اسی وقت سے اردو کو مسلمانوں کی زبان کہا گیا اور یہ پہلے پہلے خود مسلم لیگ نے کہا اور عوام سے کہلوایا شور و غوغا بہت ہوا۔ مگر اردو کے لئے کوئی مثبت کام نہ ہوسکا۔" (۱۰۹)

ان میں سے ایک بات بھی حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ مسلم لیگ نے نہ تو کتاب گھر قائم کئے اور رسالے نکالے نہ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا۔ ان دعوؤں کی تائید میں مضمون نگار نے ایک بھی شہادت پیش نہیں کی ہے۔ اگر کسی کتاب گھر میں مسلم لیگ کی حمایت میں لکھا ہوا اردو لٹریچر بکتا تھا تو اس کو کسی مہم کا حصہ قرار دینا غلط ہے۔ اگر کوئی رسالہ نکلتا اور وہ مسلم لیگ کا حمایتی تھا بھی تو بھی لیگ پر اس کی ذمہ داری نہیں ڈالی جاسکتی۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان باور کرانے کی مہم مسلم لیگ نے کبھی شروع کی اور نہ اس سلسلے میں قائدین کی ایک بھی تحریر یا تقریر پیش کی جاسکتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دینے کی مہم ۱۸۵۷ء سے قبل ہی انگریزوں اور ہندوؤں نے شروع کردی تھی۔ گاندھی نے "مشرف بہ سنسکرت ہندی" کو قومی زبان قرار دینے کی جو کھلی سازش کی تھی اور جسے وہ "ہندوستانی اتھوا ہندی اردو" کہتے تھے اس کے خلاف بابائے اردو مولوی عبدالحق نے آواز اٹھائی تھی۔ اسی بحث کے دوران تمام ہندو اخبارات نے اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا جبکہ بابائے اردو اور انجمن ترقی اردو اس کو قومی زبان قرار دینے کے حق میں تھے۔ مسلم لیگ اور انجمن ترقی اردو جداگانہ ادارے تھے لیکن اس مسئلہ پر اتفاق رکھتے تھے۔ انہوں نے اردو کو مسلمانوں کی زبان کبھی نہیں کہا۔ بلکہ سے غیر منقسم ہندوستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہونے کی بناء پر قومی زبان قرار دینے کی مہم چلائی۔

ساغر کے ستائش گروں نے تضاد بیانی کے عجیب کرتب دکھائے ہیں۔ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ تحریک ترک موالات میں انھوں نے تعلیم کا سلسلہ ختم کیا اور کانگریس سے وابستہ ہوکر "قومی دھارے" میں شریک ہوگئے ساتھ ہی ادعا کیا جاتا ہے کہ "ساغر نے اردو زبان اور تحریک آزادی کی خدمت بڑی جانفشانی اور پامردی کے ساتھ انجام دی۔ خاص کر ایسی صورت

میں کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان کے قومی جذبات سے ناخوش تھی۔ ان کے دوست اور مربی' راجہ' مہاراجہ' نواب اور جاگیردار بھی ان سے صاف کہتے تھے کہ

"آپ کی خدمت کے لئے ہم حاضر ہیں۔ مگر جانتے ہیں کہ آپ ہماری جڑ کاٹ رہے ہیں۔"

(۱۱۰)

اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی بیان کی جاتی ہے کہ (ادبی مرکز کا) چھاپہ خانہ جو اصل میں مولانا مظہر الحق (ڈاکٹر سید محمود کے خسر) کا تھا۔ جو مسز اوما نہرو کے مکان میں رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر سید محمود نے مولانا مظہر الحق کی منظوری سے اسے ساغر کے حوالے کر دیا۔ "بادۂ مشرق" اسی مطبع میں چھپا تھا۔ اس مجموعے کی اشاعت میں سالار جنگ سر نواب یوسف علی خان بہادر (حیدر آباد) نے مالی امداد دی تھی۔" (۱۱۱)

حقائق اپنی جگہ پر لائق تحسین ہیں کہ ساغر ایک اچھے انسان تھے' خوش گو اور خوش گلو شاعر تھے۔ زبان اور فن پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ سیاست میں ان کے اپنے نظریات تھے ان پر وہ پُرخلوص طریقے سے زندگی بھر قائم رہے۔ انہوں نے کانگریس کو برِ صغیر کا نجات دہندہ سمجھا اور اسی کے دامن کو تھامے رکھا۔ ان حقیقتوں کو بیان کرنے کے لئے اس حاشیہ آرائی کی ضرورت نہ تھی جو بات کو واضح کرنے کے بجائے اس کے بارے میں شکوک پیدا کردے۔ سوانح نگاری' سیرت نگاری اور ادب جس حقیقت پسندی کے متقاضی ہیں اس نوع کی ذہنی تحفظات کے ساتھ حاشیہ آرائی اسے پورا نہیں کرتی۔

اسی کتاب کے حوالے سے ایک اور المیہ کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے۔ ساغر اردو کے بڑے اور اچھے شاعر تھے۔ اس زبان کی انہوں نے خدمت کی اور اسی زبان نے ان کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن اردو بولنے والوں کا یہ رویہ عام ہے کہ وہ زبان اور تہذیب کی علمبرداری کا دعویٰ تو کرتے ہیں۔ چاردانگ عالم میں اس کے چرچے ہوتے ہیں لیکن درونِ خانہ مصلحتیں آڑے آجاتی ہیں۔ ساغر کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ بھی مصلحت کے شکار ہو گئے۔

(ان کی اولاد میں) سب ہی انگلش ماحول میں پڑھے ہیں۔ ساغر صاحب کو اس کا ہمیشہ افسوس رہا کہ اولاد نے اردو کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ (۱۱۲)

ہم جیسے ساغر کے پرستاروں کو ہمیشہ افسوس رہے گا کہ اردو کے معاملے میں انہوں نے اولاد کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔



**عبداللطیف اعظمی : مرتبین انور صدیقی' شمیم حنفی' مشیر الحق' مظفر حنفی' عبدالحق خان' محمد انس' شاہد علی خان' خالد محمود : دہلی : ۱۹۸۵ء**

عبداللطیف اعظمی تصنیف و تحقیق کے حوالے سے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کی ایک درجن سے زائد کتابیں مختلف النوع موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں بشمول "دانائے راز' اقبال" ۵ کتابوں پر انہیں ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ وہ طویل عرصہ جامعہ ملیہ دہلی کے غیر تدریسی عملے میں شامل رہے۔ پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے علماء کے پرسنل سیکریٹری کے طور پر کام کرتے ہوئے ان کے قرب کا اعزاز انہیں حاصل رہا۔ وہ خود بھی صاحب ذوق' بالغ نظر اور انتہائی تندہی سے کام کرنے کے عادی ہیں۔ علماء کی صحبت نے ان کے علمی' ادبی اور تحقیقی ذوق کو جلا بخشی ہے۔ موصوف کی خدمت پر خراج تحسین پیش کرنے کے لئے مکتبہ جامعہ کے شاہد علی خان اور جامعہ ملیہ کے ساتھیوں نے ۷ جنوری ۱۹۸۵ء کو ایک جشن کا اہتمام کیا۔ اس جشن میں جو مضامین پڑھے گئے وہی اس کتاب میں شامل ہیں۔ مرتبین کے مضامین کے علاوہ مسعود حسین' ضیاء الحسن فاروقی' عبداللہ ولی بخش' محمد معظم حیران پوری' محمد یوسف پاپا' بیگم لطیف کی نگارشات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ عبداللطیف اعظمی نے اس جشن کی مخالفت کی تھی لیکن بعد اس شرط پر راضی ہوئے کہ اظہار خیال تعریفی' توصیفی اور سنجیدہ نہیں ہوگا بلکہ ہلکے پھلکے اور مزاحیہ انداز میں خیالات پیش کئے جائیں تاکہ خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی آسانی سے ہو سکے۔ گو کہ خاکہ نگاروں نے اس طرز خاص کو اپنانے کی کوشش کی ہے لیکن اس پل صراط سے بآسانی گزر جانا آسان نہیں۔ اسی لئے زیادہ تر تحریر کی نوعیت اس کے برخلاف ہے۔ جہاں جہاں شگفتگی کے پھول کھلے ہیں اس کی خوش نمائی اور سحر کاری کی داد دینی پڑتی ہے۔ ہر مضمون ایک گلزار ہے جس کا ہر پھول ایک خاکہ ہے جو اعظمی کی بحث کرنے کی عادت' ان کے اعتراضات کرنے کی صفت' تواریخ Dates کی صحت کی جانب غیر معمولی توجہ' ادبی محفلوں' سیمیناروں اور مذاکرات میں شرکت کا ولولہ' کام کرنے کی لگن' سخت سے سخت تنقید' شخصیت شناسی کا احساس پیدا کرتے ہوئے پُرلطف اور معنی خیز جملوں سے لطف اندوز کرتا ہے۔ کتاب میں شامل خاکے' شخصیت نگاری اور سیرت نگاری کا جوہر رکھنے کے ساتھ اسلوب کے لحاظ سے منفرد تجربے ہیں۔

**ہمارے کنور صاحب : مرتبہ کے ایل نارنگ ساقی : دہلی : ۱۹۸۶ء**

کنور مہندر سنگھ بیدی صرف اردو والوں کی محبوب شخصیت نہیں تھے بلکہ بھارت میں مختلف

اہم انتظامی عہدوں پر مامور رہنے کے بعد عام بیورو کریٹ کی جیسی بھی شہرت ہوتی ہے اس کے بالکل برخلاف تھے۔ کے ایل نارنگ ساقی نے انہیں خراج تحسین پیش کرنے اور ان کو تمام خدو خال کے ساتھ اردو کے عام قاری سے روشناس کروانے کے لئے یہ کتاب مرتب کی جس میں تین درجن شاعر' ادیبوں اور واقف کاروں کے مضامین شامل کئے جو کسی نہ کسی حیثیت سے بیدی سے واقف اور ان کے مداح تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے نہایت اچھے الفاظ میں ان کے اوصاف کو بیان کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ ان کی رواداری ہر شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ وہ خود سکھ تھے لیکن انہوں نے مسلمانوں' ہندوؤں اور سکھوں سے کبھی امتیازی سلوک نہیں کیا۔ وہ ۱۹۴۷ء میں دہلی میں سٹی مجسٹریٹ تھے اس ہنگاموں سے معمور دور میں جبکہ وہاں کے تمام مسلمانوں کی جانوں پر بنی ہوئی تھی وہ ان کے لئے سب سے بڑا سہارا تھے۔ انسان سے محبت کرنا اور بے غرضی سے ہر ایک کی حاجت روائی کرنا ان کے ضمیر کا حصہ تھے اور وہ ان کاموں میں تھکن محسوس نہیں کرتے تھے۔ ترقی پذیر ممالک میں بھی صاحب اقتدار عوام کی دسترس سے باہر رہنے کو اپنا حقیقی مسلک سمجھتے ہیں۔ اس طبقہ کے ایک رکن ہوتے ہوئے بھی وہ رات اور دن عام لوگوں کے مسائل صبر و تحمل سے سنتے اور انہیں حل کرنے کے لئے وقف تھے۔ اس سلسلے میں وہ سرکاری طریق کار کو بالائے طاق رکھ کر اپنے طور پر جو کچھ کر سکتے تھے اس سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ عفو و درگزر کرنا بھی ان کی فطرت کے حصہ تھے۔ غصہ اور خفگی ہمیشہ لحاتی رہے۔ شاعروں اور ادیبوں میں تو وہ مقبول تھے ہی' علی گڑھ اور کراچی کے مشاعروں میں بھی انہوں نے جو طرز اختیار کیا اس کی وجہ سے سب کے دل جیت لئے۔ شراب پینے کے باوجود وہ بہکتے نہ تھے۔ دوسروں کے خلاف یاوہ گوئی سے پرہیز کرتے تھے۔ غرض کہ وہ اس دور میں اپنی مثال آپ تھے۔ تمام لکھنے والوں نے ان کے تمام اوصاف کو واقعاتی شہادتوں کے ذریعہ اپنے اپنے تجربوں کی بناء پر انسانیت کی کسوٹی پر پرکھا اور تاثرات قلمبند کئے ہیں۔ شخصیت نگاری کے فن کو اکثر لکھنے والوں نے ملحوظ رکھا ہے۔ واقعات کے ذریعہ ان کے نقوش ابھارے ہیں اور اوصاف کی نشاندہی کا فرض قاری کے ذمہ رکھا ہے۔ ان میں کامیاب خاکے رام لعل' مجتبیٰ حسین' جوگندر پال' خواجہ حسن نظامی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان اہل قلم نے جس طرح ان کی شخصیت کی عکاسی کی ہے اس کے بعد قاری کے لئے بیدی اجنبی باقی نہیں رہتے۔ دیگر لکھنے والوں کے ہاں انہیں کے بیان کردہ حقائق کی بازگشت ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بیدی کے یادوں کے مجموعے "یادوں کے جشن" پر سطحی نوعیت کا تبصرہ کیا ہے گویا اس کتاب میں جھانک کر بیدی کو



دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

رام لعل نے بیدی کے بارے میں لکھا ہے کہ

"آپ دوسروں کو خوش تو کر سکتے ہیں بیک وقت ہر ایک تو نہیں مگر وہ بیک وقت ہر ایک کو خوش کرنے کا بہت بڑا فن جانتے ہیں۔ چاہے ان میں خود غرض' رذیل اور انتہائی طور پر کمینے شامل ہوں۔ وہ ان کے چہرے دیکھتے ہیں۔ ان کی آنکھیں دیکھتے ہیں۔ ان کی زبان پر آئے یا درخواستوں میں لکھے ہوئے الفاظ کے پیچھے دلوں کی دھڑکن سن لیتے ہیں۔ کسی سے انکار کرنا جیسے ان کے مذہب کے ہی خلاف ہے۔" (۱۱۳)

جگن ناتھ آزاد نے ان کی مسلمانوں کے ساتھ روادارانہ سلوک کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"انسان کی صحیح پرکھ اس وقت ہوتی ہے جب اس کے امتحان کا وقت آتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد یا سیکولرزم اور سوشلزم کے موضوع پر نظمیں کہنا اور مشاعروں میں جا کر یہ نظمیں سنانا اور بات ہے اور امتحان ہو تو ان نظریات پر ثابت قدم رہنا دوسری۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ہم شاعروں کی برادری ہی کے ایک فرد اور اس امتحان سے دوچار بھی ہو چکے ہیں اور اس امتحان میں پڑنے کے بعد اس طرح کامیاب ہوئے کہ ہندوستان کے تمام شاعر اور ادیب اس بات پر انتہائی فخر کے ساتھ سر اونچا کر سکتے ہیں کہ ہماری برادری کے ایک فرد نے اپنا فرض انتہائی کامیابی کے ساتھ ادا کیا ہے جسے فرض انسانیت کہا جاتا ہے۔" (۱۱۴)

بیدی کی محفل آرائی' خوش مزاجی اور وقفہ بازی کا ذکر کرتے ہوئے اردو کے مشہور مزاح نگار نے خراج تحسین یوں پیش کیا ہے۔

"وہ سچ مچ مجلسی آدمی ہیں۔ وہ محفل میں ہوں تو کیا مجال کے کوئی اور جان محفل بن جائے ان کی باتیں' حاضر جوابی' بذلہ سنجی' شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی سے عبارت ہوتی ہیں۔ محفل کی نبض ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جس طرح کے لوگ ہوں اور جس طرح کا موقع ہو اس کے مطابق ایسی نپی تلی بات کرتے ہیں کہ سب کو بھا جائے۔ محفل میں دس بارہ آدمی ہوں یا تیس پینتیس ہزار آدمی کنور صاحب سب کا مزاج جانتے ہیں۔" (۱۱۵)

گوپی چند نارنگ کی رائے ہے کہ

"شاید زندگی کا سب سے بڑا ہنر زندگی کرنا ہے اور بیدی صاحب اس میں یکتائے روزگار ہیں۔ وہ ہر سطح پر زندگی کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ رندوں میں رند' پارساؤں میں پارسا' شاعروں

میں شاعر' ادیبوں میں ادیب' رہبروں میں رہبر' امیروں میں امیر' صوفیوں میں صوفی' بذلہ بازوں میں بذلہ باز' اردو میں شاید ہی کوئی ایسا کثیرالاشغال اور کثیرالاطراف آدمی دوسرا ہو مزید برآں صدق وصفا اور مہرو اخلاق کا پیکر' دوسروں کی خدمت کرنے' ان کے کام آنے والا' شفیق اور دردمند' مشرق صلح کل میں یقین رکھنے' ہندو' مسلم' سکھ' عیسائی' میں فرق نہ کرنے والا' ایسا انسان رواداری جس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ انسانیت کا پرستار' ادیب' ادیب گر' ادب نواز' ادب شناس۔" (۱۱۶)

واقعہ یہ ہے کہ شخصیت جاندار ہو تو لکھنے والے کی تحریروں میں بھی جان پڑجاتی ہے۔ انہیں شخصیت کو ابھارنے کے لئے نہ تو حاشیہ آرائی کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ مبالغہ آرائی سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہی صورت ان تمام خاکوں کی ہے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔

**مولانا ابوالکلام آزاد : شخصیت اور کارنامے : مرتبہ خلیق انجم : ۱۹۸۶ء**

مولانا آزاد کے حالات زندگی' ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر ۳۶ مضامین کا ایسا مجموعہ خلیق انجم نے مرتب کیا جس کو ہر اعتبار سے جامع بنانے کی کوشش کی گئی ہے' سوانح سیرت وشخصیت' سیاست' مذہب' ادبی نثر' صحافت' شاعری کے حوالے سے ہر موضوع پر متعدد مضامین ایسے اہل قلم سے لکھوائے گئے جو "ابوالکلامیت" کے سلسلہ میں اہمیت کے حامل ہیں۔ خلیق انجم نے مولانا کے سوانح مرتب کئے ہیں جس میں ان کے اجداد بالخصوص والد (مولانا خیرالدین" کے بارے میں بھی تفصیل درج کی ہے اور ان کی تصانیف کی سرورق کے عکس بھی شامل کئے ہیں۔ مولانا آزاد کے بڑے بھائی ابوالنصر غلام یاسین آہ دہلوی' آرزو بیگم اور آبرو بیگم کے حالات' ان کی علمی' ادبی' سماجی خدمات کا بھی احاطہ کیا ہے۔ آرزو بیگم کا سال پیدائش ۱۸۸۴ء بتایا ہے اور آبرو بیگم کو مولانا سے ۴ سال بڑی لکھا گیا ہے۔ اس طرح گویا دونوں بہنیں ایک ہی سال یعنی ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئیں۔ حالانکہ مولانا کا یہ فرمانا ہے کہ ان کی عمروں اور ہماری عمروں میں دو دو سال کا تفاوت ہے۔" (۱۱۷)

مولانا ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے تھے اس طرح آہ دہلوی کا ۱۸۸۶ء میں آبرو بیگم کا ۱۸۸۴ء اور آرزو بیگم کا ۱۸۸۲ء میں پیدا ہونا قرار پاتا ہے۔ خلیق انجم کو بھی اپنے بیان کی غلطی کا احساس ہوا اور دوسرے ایڈیشن میں انہوں نے اس کی تصحیح کردی۔ مولانا کے سوانحی حالات کے لئے "تذکرہ" آزادی کی کہانی آزاد کی زبانی" "ہماری آزادی" "غبار خاطر" اور "آثار ابوالکلام" سے استفادہ کیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کے بعد مولانا آزاد انجمن ترقی اردو کے



سکریٹری بھی رہے تھے چونکہ مرتب کا تعلق بھی اسی انجمن سے ہے اور انجمن ہی نے کتاب شائع کی ہے۔ اس لئے اس حوالے سے نسبتاً" زیادہ تفصیل درج کی گئی ہے اور یہ ایسا باب ہے جو واقعی تشنہ تھا۔ مولانا کی زندگی کی آخری تقریر بھی ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کو انجمن کے پلیٹ فارم سے ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے ہندی کی دستوری اہمیت تسلیم کرتے ہوئے اردو کو بھی اس کا جائز مقام دینے کی اپیل کی تھی۔ سرسید کے بارے میں مولانا کے بدلتے ہوئے خیالات کا حال بھی بیان کیا ہے لیکن ان پر کسی نے بحث یا محاکمہ نہیں کیا۔ ان کے افکار ورجحان کا احوال بھی اسی نوعیت کا ہے۔ سیاست کے باب کو بھی تاریخی تناظر میں واضح کیا ہے اور بعض نازک پہلوؤں مثلاً "ترک موالات کے ضمن میں علی گڑھ پر یلغار کے ذکر سے گریز کیا ہے۔ خلیق انجم کا طویل مضمون تعارف یا وقائع نگاری کی حیثیت رکھتا ہے جس میں تبصرے' تنقید' تجزیے اور تاثر کو کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ اس نوع کی تحریر تاریخ کا احوال تو ہو سکتی ہیں مطالعہ' حیات وسیرت نہیں۔

پروفیسر حکم چند نیر نے مولانا کی شخصیت کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ

"مولانا آزاد کا خاندان مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ دو تین سو برس سے درس وتدریس' وعظ وہدایت' سلوک ومعرفت' خیروبرکت اور شرف وشرافت کی روایت تسلسل اور تواتر کے ساتھ چلی آرہی تھی۔" (۱۱۹)

"مولانا آزاد کے خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ تھا جس میں دنیوی جاہ ومنزلت' عزت وعظمت' امتیاز وافتخار سب کچھ حاصل تھا لیکن انہیں اس کاروبار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔" (۱۲۰)

"انہوں نے صحافت کو بھی کلاسکس کے درجے کی چیز بنا دیا تھا۔" (۱۲۱)

مقالہ نگار نے مولانا کو علی گڑھ کا سخت مخالف بتایا ہے اور ساتھ ہی لکھا ہے کہ

"مولانا آزاد کی بات نہیں جن لوگوں کو علی گڑھ تحریک کی سیاست سے اختلاف تھا انہیں علی گڑھ کو چھوڑنا پڑا۔ مولانا محمد علی' شوکت علی' ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ کئی اصحاب کے نام لئے جاسکتے ہیں۔" (۱۲۲)

یہ بیان انتہائی اہم ہے۔ ایک ذمہ دار قلم نے لکھا ہے لیکن قطعی غیر واضح ہے "علی گڑھ چھوڑنا پڑا" سے ان کا جو بھی مافی الضمیر ہو نا قابل فہم ہے۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی نے تو علی گڑھ تکمیل تعلیم کے بعد چھوڑا تھا۔

گلزار زتشی دہلوی نے شخصیت ربط وتعلق کی بناء پر جو تاثرات قائم کئے تھے اپنے مضمون

میں بیان کئے ہیں۔ اپنی تحریر میں کہیں کہیں ابوالکلام کی نثر کی پیروی بھی کی ہے۔ جیسے

"بیٹھتے تو کوہ علم، کھڑے ہوتے تو کوہ وقار، بولتے تو کوہ جلال فصاحت، مقرر جادو بیان، خطیب گلفشاں طلاقت، شعلہ نوا کے ابوالکلام وابوالبیان، فن تقریر میں حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری، نواب بہادر یار جنگ، بلبل ہند شریمتی سروجنی نائیڈر اور رادھا کرشن کے مثنے بلکہ نعم البدل، نجی گفتگو میں کم گو، نرم لہجہ، سبک رو اور خود آگاہ، خواص میں کھلی کتاب، عوام میں کہیں گل لالہ، کہیں گلاب، کہیں چھوئی موئی کا پودا۔" (۴۳)

مقالہ نگار نے جوش عقیدت میں سارا زور بیان صرف کر دیا ہے۔ پرشکوہ الفاظ کے جلو میں کہیں کہیں حقائق کی جھلکیاں بھی پیش کردی ہیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین نے مرزا سعید بیگ کے حوالے سے مولانا کے روز مرہ رویہ اور خاص طور پر انڈیا ونز فریڈم کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ مرزا سعید بیگ دس سال مولانا کے سیکریٹری رہے تھے۔ اس لئے ان کی معلومات شخصی تجربات ومشاہدات پر مبنی کہی جاسکتی ہیں۔ مولانا آزاد خود عالم تھے اور اہل علم کے قدردان بھی تھے۔ اسی بناء پر ان کا قریبی تعلق صدر یار جنگ حبیب الرحمان خان شیروانی سے رہا جن کے نام غبار خاطر کے خطوط لکھے گئے تھے۔ ریاض الرحمان شیروانی نے ان بزرگوں کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے جس سے ان کی شخصیت کے عالمانہ جوہر سامنے آئے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کی بھی ملاقات ۱۹۰۵ء میں ہوئی اور رشتہ مودت زندگی بھر قائم رہا۔ اسی کی تفصیل مضمون میں موجود ہے لیکن ۱۹۲۰ء میں جب مولانا آزاد نے علی گڑھ پر یلغار کی اور اسے بچانے کے لئے صدر یار جنگ کی جو تقریر کی اور اس کا سخت اخباری جواب مولانا نے دیا۔ اس کے حوالے سے دانستہ گریز کرکے تاریخی حقائق سے چشم پوشی بھی کی گئی ہے۔ مذہبی خیالات کے بارے میں صباح الدین عبدالرحمان نے ایک معلومات افزا مضمون تحریر کیا ہے۔ احمد سعید ملیح آبادی نے مولانا آزاد کے "چند اہم مسودات" پر اظہار خیال کرکے نئی معلومات پیش کی ہیں۔ صحافت اور شاعری کے حوالے سے جو مضامین ہیں ان میں تاریخی جائزے پیش کئے گئے ہیں۔

### سید سلیمان ندوی : مرتبہ خلیق انجم : دہلی : ۱۹۸۶ء

۱۹۸۴ء میں علامہ سید سلیمان ندوی کا جشن صد سالہ منایا گیا تھا تو انجمن ترقی اردو ہند نے بھی مارچ ۱۹۸۵ء میں دو روزہ سیمینار منعقد کیا تھا۔ اس میں پڑھے گئے مقالات کو انجمن کے معتمد خلیق انجم نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ بیشتر مضامین سید صاحب کی علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی خدمات کے حوالے سے لکھے گئے ہیں جو معلومات کے لحاظ سے کار آمد ہیں۔ خلیق انجم نے سید



صاحب کا مختصر سا سوانحی خاکہ مرتب کیا ہے اور اس کوشش میں اجمال کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ مالک رام نے سید صاحب کو جامع صفات شخصیت قرار دے کر ان کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کی نوعیت بھی سرسری ہے۔ سوانح وشخصیت سے قطع نظر ان کے علمی کارناموں پر جو مضامین ہیں بلاشبہ وقیع ہیں۔

### مولانا ابوالکلام آزاد' ایک مطالعہ : مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری : کراچی : ۱۹۸۶ء

مولانا آزاد کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر متعدد کتب پاکستان اور بھارت میں شائع ہوچکی ہیں۔ اس کا سلسلہ معینہ تاریخ سے قبل ہی ہوگیا تھا۔ پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں میں زیر نظر کتاب جو دو درجن مضامین پر مشتمل ہے اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں مولانا کی شخصیت، ان کے اخلاق وسیرت کے خصائل، فکروعمل کے مختلف پہلوؤں کے تعارف میں ان حضرات کی نگارشات شامل ہیں جن کے بارے میں مرتب کا دعویٰ ہے کہ وہ مولانا سے قریبی تعلق رکھتے تھے یا جنہوں نے مولانا کی شخصیت، ان کے علوم ومعارف اور ان کی خدمات کو اپنے مطالعہ، تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ مولانا کی شخصیت، کردار، اوصاف کے بارے میں ہمایوں کبیر، ڈاکٹر ریاض الرحمان شیروانی اور خواجہ غلام السیدین کے مضامین شامل ہیں۔ جن میں نئی معلومات یا نئے خیالات کا فقدان ہے۔ البتہ سارا زور بیان صرف کرکے مدح وستائش کی گئی ہے۔ شخصیت نگاری کی بنیادی شرط جذبات عقیدت سے مبرا ہوکر حقیقت پسندی سے کام لینا ہوتا ہے۔ وہ ان مضامین میں موجود نہیں۔ مالک رام نے اپنے مضمون میں مولانا کی صحافیانہ زندگی کا خاکہ اجمالاً "درج کیا ہے جو یقیناً" معلومات افزا ہے۔ نیاز فتح پوری نے مولانا کی صحافتی انداز بالخصوص الہلال کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور دیگر اخبارات سے موازنہ کرکے اس نتیجہ پر پہنچے کہ

"مشرق میں البتہ بعض عربی رسائل واخبارات کا لب ولہجہ خطیبانہ ہوتا ہے۔ لیکن ان میں وہ تنوع نہیں پایا جاتا جو الہلال میں نظر آتا ہے۔ خود ہندوستان میں البتہ زمیندار ایک بلند بانگ اخبار تھا لیکن اس میں الہلال کی سی گہرائی، سنجیدگی اور علمی وزن کا فقدان تھا۔ مسلم لیگ کے لب ولہجہ میں بے شک ایک قطعیت تھی لیکن اس کا خطاب صرف عوام سے تھا۔ عوام ہی کی زبان میں اور کوئی دوسری خصوصیت اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس لئے مولانا آزاد کی

صحافت کے متعلق بھی ڈاکٹر طہٰ حسین کی زبان میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی صحافت خود ان کی صحافت تھی جسے انہوں نے خود ایجاد کیا اور خود انہیں کے ساتھ ختم ہوگئی۔" (۴۳)

اختر علی تلہری نے مولانا کی مفسرانہ حیثیت بیان کی ہے کہ ان کے بیان کردہ قرآنی مفاہیم کے تفکر و تعقل پر یونانی افکار و نظریات کا غلبہ ہے اور نہ ان کا انداز مدرسانہ و معلمانہ ہے۔ وہ اصل مطالب تک پہنچنے کے لئے جدید سائنس اور فلسفہ کا سہارا بھی نہیں لیتے۔ قرآن کو قرآن کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے بیان کی وضاحت میں انہوں نے ترجمان القرآن کے اقتباسات اور اپنے دلائل سے کام لیا ہے۔ مولانا کی سیاسی زندگی سے عبدالسلام قدوائی اور ریاض الرحمان شیروانی نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت کے دو اہم پہلوان کے طرز خطابت اور طرز تحریر تھی۔ ان پر جداگانہ ابواب قائم کرکے مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ ان تمام مضامین میں شان حسن عقیدت کی فراوانی ہے۔

**یادگار ایوب قادری : مرتبہ شمس الدین حنفی رثناء الحق صدیقی**
**کراچی : ۱۹۸۶ء**

ڈاکٹر ایوب قادری معروف محقق، مصنف اور ادیب کے انتقال کے بعد ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر "یادگار ایوب قادری" مرتب کی گئی اس میں کم و بیش پچاس اہل علم نے اپنی نگارشات، نظم و نثر کے ذریعہ ان کی علمیت، تاریخ پر گہری نظر، تحقیق کے ذوق، ادیبانہ شان، حالات زندگی اور اوصاف ذاتی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرتبین نے یہ اہتمام تو کیا کہ زیادہ سے زیادہ اہل قلم کی شمولیت ہوسکے لیکن بجائے اس کے کہ ہر ایک کو ایک موضوع دے کر لکھوایا جاتا ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شمس بدایونی، سید محفوظ علی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ثناء الحق صدیقی کے مضامین یکسانیت کے شکار ہوگئے۔ ان میں حالات زندگی اور علمی و ادبی خدمات کی تکرار ہے۔ مقابلتاً "معین الدین عقیل کا مضمون جامع ہے۔ مجموعہ میں شامل مضامین سے ایوب قادری مرحوم کا سوانحی خاکہ مرتب ہوجاتا ہے اور ان کی سیرت اور کارناموں کا تعارف بھی ہوجاتا ہے۔ ان کی شرافت، عجز و انکسار، کتابوں سے رغبت، مسائل پر سنجیدگی سے غور و فکر، اپنے کام سے کام رکھنا اور غیر متعلق افراد اور امور سے پہلو بچانا ان کے اوصاف کو واضح کیا گیا ہے۔ ابتدا میں راقم الحروف (حسن وقار گل) کا تحریر کردہ سوانحی خاکہ اور ان سے لیا ہوا ان کی زندگی کا آخری انٹرویو بھی شامل ہے جس سے ان کی افتاد فکر، علم و ادب کے بارے میں ان کے رجحانات کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ایوب قادری نے دو ٹوک انداز



میں مسائل پر اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔ بالخصوص ادب میں فحش نگاری کے بارے میں ان کے خیالات، اسلامی نقطہ نظر اور مشرق کے معاشرتی روایات کے عین مطابق ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں یہی رائے دی جاسکتی ہے کہ ایک اچھے انسان، علم و ادب کے عاشق کی یاد تازہ رکھنے کے لئے کچھ نہ ہونے کے مقابلے میں یہی غنیمت ہے۔

**مطالعۂ سلیمانی : مسعود الرحمان خان ندوی و محمد حسان خان**
**بھوپال : جون ۱۹۸۶ء**

علامہ سید سلیمان ندوی کو خراج تحسین پیش کرنے، ان کی شخصیت اور کارناموں کا احاطہ کرنے کے لئے جو تقریبات ان کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے زیر اہتمام ۴ تا ۶ ستمبر ۱۹۸۵ء منعقد کی گئیں اور اس میں مقالات پڑھے گئے۔ انہیں کتابی صورت میں مسعود الرحمان ندوی اور محمد حسان خان نے مرتب کیا۔ ان تقریبات کے سلسلے میں ۵۰ مقالات تحریر کئے گئے تھے۔ زیر نظر کتاب میں ان سے ۴۷ جگہ پاسکے ہیں۔ انہیں رہنما خطبات و مقالات، علوم و فنون سلیمانی پر نظر، تاریخ نگاری، تحقیق و تنقید، لسانیات، تہذیب و تمدن، ادب و شاعری، صحافت، طب، تصانیف سلیمانی کا تعارف، سیاسی سید صباح الدین عبدالرحمان کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں سید صاحب کا سوانحی خاکہ بھی شامل ہے اور سال بہ سال کی علمی، ادبی، سیاسی خدمات کا مختصر جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ ان کا یہ انکشاف چونکا دینے والا ہے کہ

"صرف رسالہ "معارف" میں سید صاحب کے جو مضامین شائع ہوئے وہ ۱۹ سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ انہوں نے زندگی کے ۳۳ برس دار المصنفین اعظم گڑھ میں گزارے اور اپنے استاد کے تخیل دار المصنفین کو ان کی محبت کے سرور اور اپنے شوق کے تازہ نیاز بلکہ خون جگر سے علم کا قرطبہ، فن کا الحمراء اور فضل کا بیت الحکمۃ بنا دیا۔ یہاں انہوں نے ۳۲ سال رہ کر اس طرح زندگی گزاری کہ دیکھنے والے کہتے رہے کہ ان کی امیدیں قلیل لیکن مقاصد جلیل ہیں۔ دار المصنفین کے در و دیوار سے اب بھی ان ہی کے تب و تاب جاودانہ کی آواز بلند ہوتی ہے۔ یہاں کی محنت شاقہ سے ان کا جسم کبوتر کا تن نازک بن گیا تھا لیکن ان کا علمی جگر شاہین کا جگر بنتا چلا گیا۔" (۴۴)

سید صاحب کو قرآن مجید سے عشق تھا۔ علمی، ادبی، مذہبی، ملی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے جس کے صلے کی انہوں نے کبھی پروانہ کی اور نہ اس انتھک محنت سے اکتائے۔ دار المصنفین کے علاوہ ندوۃ العلماء سے بھی متعلق رہے۔ انجمن ترقی اردو، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی' ہندوستانی اکیڈمی' کل ہند تاریخی کانفرنس' خلافت کانفرنس' مسلم لیگ سب ان کے دائرۂ کار میں شامل تھے۔ ایسی فعال اور متحرک شخصیتیں بہت کم نظر آتی ہیں۔

(رہنما مقالہ) میں خلیق احمد نظامی نے بھی ان کی شخصیت اور کارناموں کا جائزہ لیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ان کی ذات مجسم علم تھی ایسا علم جو عقل و خرد کا امین اور عفت قلب و نگاہ کا پاسبان ہو۔ انہوں نے اپنا علمی سفر اس منزل سے شروع کیا جہاں مولانا شبلی نے اپنا رخت کھولا تھا۔ وہ استاد کی ہدایت کے مطابق آستانہ نبوت پر بیٹھے اور اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز و محور ہمیشہ ذات نبی کریم کو بنایا اور کوشش کی کہ خود بھی اسوۂ حسنہ پر کاربند رہیں۔

سید صاحب کا احاطہ علم اور دائرہ معلومات بہت وسیع تھا وہ ایک زندہ دائرۃ المعارف تھے کسی موضوع کے بارے میں برسوں معلومات جمع کرتے' اس کے ہر پہلو پر غور و خوض کرتے اور جب معلومات کے حتمی یقین اور اخذ شدہ نتائج کے صحیح ہونے کا یقین ہو جاتا تو انہیں ضبط تحریر میں لاتے۔

عبداللطیف اعظمی نے اپنے مضمون میں خصوصیت سے ان کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے ان کی نظر میں سید صاحب ایک دلنواز مقرر تھے اپنی دھیمی آواز اور پُرسکون لہجے میں جو کچھ کہتے ان کی پُروقار شخصیت کی طرح دلوں میں گھر کر جاتا ان کی باتوں اور خیالات میں گہرائی اور عالمانہ شان تھی جو دلوں کو موہ لیتی تھی جیسا ان کا دلنواز چہرہ تھا ویسی ہی ان کی دلکش سیرت اور بے داغ کردار تھا۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا وہ ہر محفل ہر صحبت اور ہر جلسہ میں یک رنگی کے ساتھ ظاہر ہوتے وہی کہتے جو ان کے دل میں ہوتا چاہے کسی کو پسند آئے یا نہ آئے' وہ خلوص' محبت اور صدق و صفا کے پیکر تھے۔ کسی شخصیت کی سیرت اس کے نجی خطوط کے ذریعہ نمایاں ہوتی ہے۔ اس لئے عبداللطیف اعظمی نے بریدہ فرنگ' مکاتب سید سلیمان ندوی' مکتوبات سلیمانی کا تجزیاتی مطالعہ کر کے ان کے ذریعہ سید صاحب کے کردار اور سیرت کو بیان کیا ہے۔

سید حسین نے بھی سید صاحب کی سیرت کا غائر مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے ان کے بیان پر حسن عقیدت کا رنگ زیادہ ہی نمایاں ہو گیا ہے جس کا اظہار ان کے ہر جملہ سے ہوتا ہے مثلاً

"وہ سرتاپا سیرت شریف کا مرقع بن گئے تھے۔" (۱۳۵)

"سید صاحب کا تبسم ایسا تھا کہ جس طرح حضور صلعم کا تبسم۔" (۱۳۶)

"آپ کا اپنوں اور غیروں سے میل جول' بول چال' اخلاق' مطالعہ' زندگی کے سب پہلوؤں پر سیرت نبوی کا پرتو نظر آتا ہے۔" (۱۳۷)



سید حسین نے ان کے صبر و تحمل' متانت و سنجیدگی' بردباری اور درگذر کے اوصاف کی بھی تعریف کی ہے۔

یہ ضخیم کتاب شاہ معین الدین ندوی کی تصنیف حیات سلیمان کے ساتھ مل کر ایسی جامع معلومات کی حامل بن جاتی ہے کہ سید صاحب کے احوال زندگی' کردار' اوصاف اور تمام علمی و عملی کارناموں کا احاطہ کر لیتی ہے۔ ان کی موجودگی میں "ذات سلیمان" کو جاننے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔

## نیاز فتح پوری' شخصیت اور فکر و فن : مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری : ۱۹۸۶ء

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مرتبہ کتاب چار حصوں پر منقسم ہے۔ ایک حصہ سوانح اور شخصیت سے متعلق ہے۔ دوسرا افکار و ادبیت سے' تیسرا فکر و فن کی نوعیت سے اور چوتھا **منتخبات نیاز** سے۔

جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے پہلے حصے کے ۱۰ مضامین اس سے متعلق ہیں۔ افکار و ادبیت کے حصے میں احتشام حسین کا جو مضمون بعنوان "نیاز فتح پوری' چند تاثرات" ہے۔ وہ بھی شخصیت کے حصے میں ہونا چاہئے تھا۔ اس طرح گیارہ مضامین لکھنے والوں میں بلند پایہ اور صاحب شہرت ادیب شامل ہیں۔ ان سب کے مطالعہ کے باوجود بھی نیاز کی تصویر پڑھنے والے کے ذہن میں واضح نہیں ہوتی۔ جوش کا مضمون غالباً "ان کے بڑے نام کی وجہ سے شامل کیا گیا ہے۔ اس سے نیاز کی شرافت اور اس کے برخلاف جوش اور ان کے ساتھیوں کی ذہنیت پر روشنی تو پڑتی ہے لیکن ایک واقعہ مخصوص پہلو کی وضاحت تو کر سکتا ہے کردار کی تکمیل نہیں کرتا۔ فراق گورکھ پوری کے تاثرات مرتب کے نام خطوط کی صورت میں ہیں جو بار بار کے تقاضوں کا نتیجہ ہیں اس لئے اس میں وہ آزاد ذہنی رو کا فقدان ہے جو کسی شخصیت کی پیشکش کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ البتہ "مدح" اور کہیں کہیں "مدلل مدح" کی صورت ہے۔ ملا واحدی کا مضمون "نیاز اور دلی" زندگی کے ایک مختصر دور کے بارے میں ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے نیاز کے مذہب پر بہتر انداز میں روشنی ڈال کر ان کے بارے میں پائی جانے والی الجھن کو دور کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ مولانا ابوالخیر مودودی' ڈاکٹر احسن فاروقی اور پروفیسر آل احمد سرور کے مضامین ان کی شخصیت کے اوصاف اور کردار پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان سے مجموعی طور پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ نیاز انفرادیت کے قائل تھے۔ علم کی جولانگاہ میں انہوں نے کوئی تخصیص روا نہیں رکھی۔ فنکاری اور انشاء پردازی ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ اس کے زور پر انہوں نے کبھی

فلسفہ کی طرف توجہ دی۔ کبھی مذہب کی طرف، کبھی ادب ان کا موضوع رہا اور رومان پسندی کے پھول کھلائے تو کبھی جنسیات کی علمی اور فطری قطروں کو پیش کیا۔ تنقید میں وہ اپنی ذاتی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ لیکن ہر مکتب فکر کی سرپرستی کرنا بھی جانتے تھے۔ اردو غزل کے خلاف کلیم الدین احمد کا مضمون شائع کرنے والا ایڈیٹر کئی غزل گو شعراء پر نگار کے خاص نمبر نکالنے کا بھی مرتکب ہوا۔

سوانح عمری کی پیش کش کے حوالے سے کتاب تشنگی کا شکار ہے۔ البتہ شخصیت اور کردار کے بارے میں کسی حد تک کامیاب سعی ہے۔ دیگر ابواب کا تعلق ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لئے ان کے بارے میں کسی رائے کا اظہار غیر ضروری ہے۔

**تذکرۂ سید مودودی، مرتبین : خلیل احمد حامدی، نعیم صدیقی، جمیل احمد رانا، سلیم منصور خالد : لاہور : اپریل۱۹۸۶ء**

تذکرہ سید مودودی کے حصہ اول میں شامل مضامین "مولانا مودودی اور ان کے اسلاف از افضل الٰہی قریشی، مولانا مودودی ہمہ پہلو شخصیت (از منظور الحسن صدیقی) مولانا مودودی اور معارف اعظم گڑھ (از سفیر اختر) مولانا مودودی کی صحافتی زندگی (ایچ بی خان) سوانحی خاکوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے سوانحی تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ صرف جزوی حالات کا پتا چلتا ہے۔ دوسرے حصے انعکاسات میں تاثرات ہیں البتہ باب سوم حقیقی معنوں میں شخصیت شناسی میں مدد دیتا ہے۔ ان میں بھی زیادہ تر لکھنے والوں نے اپنی ضروری اور غیر ضروری یادداشتوں کو بیان کیا ہے۔ ان کے پیش نظر نہ تو خاکہ نگاری رہی اور کوئی خاص مقصد۔

چوتھے حصے میں مکاتیب اور مولانا کی ڈائری کے اوراق ہیں جنہیں "تبرکات" کا درجہ تو دیا جاسکتا ہے۔ ان کے سوانحی حالات اور شخصیت پر ان سے کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

**دہلی والے : مرتب ڈاکٹر صلاح الدین : اردو اکادمی : دہلی : جلد اول، ۱۹۸۶ء : جلد دوم، فروری ۱۹۸۸ء**

اردو اکادمی دہلی نے مارچ ۱۹۸۵ء میں ایک سیمینار منعقد کیا تھا جس میں "دلی والوں" کے ۳۴ خاکے پیش کئے گئے تھے۔ یہ بے انتہا پسند کئے گئے تو اکادمی نے مارچ ۱۹۸۶ء میں اسی نوعیت کا دوسرا سیمینار منعقد کیا اس میں ۳۶ خاکے پڑھے گئے ہر سیمینار کے خاکے ایک جلد میں مرتب کئے گئے ہیں۔ ان میں بعض معروف اور بعض غیر معروف شخصیات شامل ہیں۔



ظہیر احمد صدیقی نے مولانا ابوالکلام آزاد کا خاکہ تحریر کیا ہے۔ انہوں نے اپنی ذات کے حوالے سے مولانا کا تعارف کروایا ہے۔ اس ضمن میں جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ بھی مولانا کے بارے میں اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا باقی جو کچھ ہے کتابی علم ہے یا مولانا کی تحریروں اور تقریروں کے اقتباسات ہیں۔ خاکہ نگاری وہیں کامیاب ہوتی ہے جہاں لکھنے والے کا "صاحب خاکہ" سے قریبی ربط ضبط رہا ہو۔ یہاں تک کہ وہ افعال و اعمال کا مشاہدہ نہ کرتا ہو بلکہ اس کے اندرون کا کھوج لگانے کے مواقع سے بھی بہرہ انداز ہو سکے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو وسعت مطالعہ سے وہ نظر پیدا کی جائے کہ شخصیت کو Visulize کیا جا سکے۔ مولانا آزاد کا "خاکہ" ان کے سرسری ذکر کے سوا کچھ نہیں۔ یہی حال مولوی بشیر الدین احمد کے خاکے (تحریر محمد اسلم دہلوی) کا ہے۔ اس میں شخصیت کی جھلکیاں کم اور مورخانہ کارنامے زیادہ ہیں۔

البتہ اخلاق حسین دہلوی نے بغیر کسی تعلق کا اظہار کئے اپنی معلومات کی بنیاد پر حکیم اجمل خان کی کامیاب پیکر تراشی کی ہے۔ ان کے سراپا، وضع قطع، عادات اطوار، لباس کے علاوہ زندگی کے ان گوشوں کا حال بیان کیا ہے جن میں حکیم اجمل خان نے زندگی بسر کی۔ ان کی قومی، ملی، ملکی، علمی مشاغل تحریک آزادی سے وابستگی، ممتاز رہنماؤں کی مہمان داری کا اجمالی ذکر ہے۔ فن طب سے لگاؤ، اس میدان میں تحقیقی کارناموں اور فن کو وسعت دینے کے لئے ان کی مساعی بھی بیان کی ہیں۔ حکیم صاحب کی انسان دوستی کے حوالے سے یہ بیان کہ

"دہلی میں جب بھی وبا پھیلتی، اموات کی کثرت ہوتی اور گھر کے گھر بے چراغ ہوتے نظر آتے تو وہ مجوزہ نسخے کی بہت سی پڑیاں بندھواتے، اپنی گاڑی میں رکھواتے، گھر گھر جاتے مریضوں کو دیکھتے اور انہیں دے آتے۔"

"وہ دہلی میں کسی مریض کو اس کے گھر دیکھنے جاتے تو نذرانہ قبول نہ فرماتے۔" (۱۳۴)

اس مختصر سے خاکہ سے حکیم اجمل خان کی مکمل تصویر قاری کی نظروں سے گزرتی اور اسے متاثر کرتی ہے۔ البتہ اخلاق حسین دہلوی کا یہ بیان کہ "انہیں گولی کا نشانہ بنایا گیا" درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ نواب رامپور کے ملازم خاص پیارے خان کے حوالے سے جو روایت انقلاب بمبئی (۱۵ تا ۲۲ مئی ۱۹۸۸ء) میں شائع ہوئی ہے اس میں وہ اپنی شخصی معلومات کی بناء پر سازش کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہیں کہ کس طرح نواب رامپور نے ڈاکٹر ہنٹر کے ذریعہ انہیں زود اثر زہر دیا تھا۔ اس تحقیق طلب امر سے قطع نظر خاکہ جامع ہے۔

خواجہ احمد فاروقی کے لکھے ہوئے خاکے "اندرا گاندھی" پر مصلحت کا غبار اور مرعوبیت کی

شان موجود ہے۔ انہوں نے اندرا گاندھی کا امیج بنانے اور مسلم دوستی اور اردو دوستی کے قصے بھی بیان کئے ہیں جبکہ تاریخ اس کے برخلاف ہے۔

مرتب نے اعتراف کیا ہے کہ "خاکہ نگاری کو محض مدح یا صرف عقیدت مندی سے بھی گریز کرنا چاہئے" یعنی خاکہ مدلل مداحی کا فن بھی نہیں ہے۔" (۳۵)

اس کے باوجود متذکرہ خاکے کے علاوہ بعض دیگر خاکے بھی اسی کے ضمن میں آجاتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان ۸۰ خاکوں میں زیادہ تر کامیاب خاکے ہیں۔ مولانا احمد سعید کا خاکہ "تحریر انیس دہلوی" خواجہ حسن نظامی کا خاکہ (تحریر نثار احمد فاروقی) وغیرہ دہلی سے وابستہ بزرگوں کی یاد تازہ کرنے کے سلسلے میں مستحسن مساعی ہیں۔ ابھی کئی بزرگوں پر لکھنے کی گنجائش باقی ہے۔ اس خلا کو پُر کرنا ضروری ہے۔

**شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی : مرتبہ ڈاکٹر رشید الوحیدی : دہلی : ۱۹۸۸ء**

مولانا حسین احمد مدنی کی ذات علم و عمل، شریعت و طریقت کی جامع اور سلف صالحین کی یادگار تھی۔ ان کے علمی و دینی کمالات اور سیاسی و قومی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ درس و تدریس کی طرح ان کے رشد و ہدایت کا فیض بھی جاری رہا۔ انہوں نے مسلمانوں کی دینی اور سیاسی رہنمائی کے لئے زندگی وقف کردی تھی۔ ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں اور متنوع و گوناگوں خدمات کے اعتراف اور ان کی تشہیر کے لئے جمعیت العلمائے ہند نے مارچ ۱۹۸۸ء میں ایک سیمینار منعقد کیا تھا۔ زیر نظر کتاب اس سیمینار میں پیش کردہ مقالات اور ان مقالات پر مشتمل ہے جو سیمینار کے لئے لکھے گئے تھے لیکن کسی وجہ سے پڑھے نہیں گئے تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مقالہ مولانا مدنی کی سیرت کو سمجھنے کے لئے بڑا ممد ہے کیونکہ مقالہ نگار کا ان سے عرصہ دراز تک شخصی تعلق رہا تھا اور انہیں بے حد قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ دیگر لکھنے والوں میں بھی ممتاز اصحاب علم و قلم شامل ہیں۔ ان مقالات سے مولانا مدنی کی سیرت و شخصیت، حالات و کمالات اور مجاہدانہ و سرفروشانہ زندگی کے تمام پہلو سامنے آگئے ہیں۔ کتاب کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس نوع کی مرتبہ کتابوں میں جو عام خامیاں ہوتی ہیں وہ اس میں بھی موجود ہیں۔ بعض امور کی تکرار متعدد مقالات میں ملتی ہے۔ جس سے کتاب کی ضخامت تو بڑھ جاتی ہے لیکن افادیت کم ہوجاتی ہے۔ مقالات کو موضوعات کے لحاظ سے عنوانات کے تحت



بھی تقسیم نہیں کیا گیا ہے۔ اس لئے پڑھنے والے کی خاطر خواہ رہنمائی بھی نہیں ہوتی۔ اگر اسے تنقیح و اضافہ کے ساتھ موضوعاتی حصوں میں پیش کیا جاتا تو قاری کے لئے مفید کتاب بن جاتی اور ممدوح کی سیرت کے تمام پہلو ترتیب کے ساتھ سامنے آجاتے۔ وہی سیرت نگاری کا مقصد ہوتا ہے جو بحالت موجود خاطر خواہ طور پر پورا نہیں ہوا ہے۔

**احتشام حسین، ایک مطالعہ : اخلاق اثر : بھوپال : ۱۹۸۹ء**

اردو کے مشہور ترقی پسند نقاد احتشام حسین کی ممتاز شخصیت اور ان کے ادبی و تنقیدی کارناموں کے پیش نظر ان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کم ہے۔ ڈاکٹر اخلاق اثر کی کتاب اس کمی کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ مصنف بھی سنجیدہ اہل قلم، محقق اور نقاد کے طور پر معروف ہیں جو کم لکھنے کے باوجود اپنی ہر تحریر کا ایک وزن رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب میں پروفیسر احتشام حسین کی شخصیت اور ان کے کارناموں کے بعض ایسے پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا ہے جن پر یا تو کم لکھا ہے یا بالکل نہیں لکھا گیا یا ان کے بارے میں بعض غلط فہمیاں رہیں۔

کتاب چھ مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلے مضمون میں "مدھیہ پردیش کے بعض اہل قلم کے نام احتشام صاحب کے مکاتیب" کا تجزیاتی مطالعہ کرکے ان کی شخصیت کے نقوش اور زندگی کے بعض پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ ان مکاتیب میں جو متنوع علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی موضوعات زیر بحث آئے ہیں ان سے احتشام صاحب افکار و خیالات سے بھی واقفیت ہوتی ہے اور ان کے عہد اور ہم عصروں کے بارے میں بھی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اسی طرح آخری و مضامین بھی مدھیہ پردیش کے تعلق سے ان کی تاثراتی تحریروں اور بحث و گفتگو کرکے ان کے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے ساتھ ان کی شخصیت و سیرت کو بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اپنے انداز کی یہ مختصر لیکن اہم کتاب ہے جس میں تحریر کے ذریعہ صاحب تحریر کے مطالعہ کی کوشش کی گئی ہے۔

ایک مضمون احتشام صاحب کی مقدمہ نگاری سے متعلق ہے۔ احتشام صاحب پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ انسان دوستی، مروت اور اخلاق سے مجبور ہوکر مقدمہ نگاری کرتے اور حقائق سے گریز کرتے، مبالغہ کو کام لاتے تھے۔ اخلاق اثر نے ان کی اس کمزوری سے انکار کرتے ہوئے بحث کے ذریعہ مقدمہ نگاری کو مزاج کے اعتدال کا تقاضا ہی قرار دیا ہے۔

**حسن علی آفندی : مرتبہ شاہد حسین خان : کراچی : ۱۹۸۹ء**

سرزمین سندھ کے حوالے سے حسن علی آفندی کی شخصیت عظیم اور معروف ہے انہیں بجا

طور پر سندھ کا سرسید کہا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے کے سلسلے میں سرسید نے وسیع بنیادوں پر کام کیا تھا۔ حسن علی آفندی کا دائرہ سندھ تک محدود رہا۔ وہ عزم و ہمت کے پیکر تھے۔ معمولی حیثیت سے ترقی کرکے وہ مرتبہ حاصل کیا کہ تاریخ کا حصہ بن گئے۔ انہوں نے بے سروسامانی کے عالم میں اس مدرسے کی بنیاد رکھی جس میں قائداعظم محمد علی جناح کو بھی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ انہیں کی مساعی سے سندھ میں تعلیم کے چرچے عام ہوئے۔ ان کی یاد کو تازہ کرنے اور ان کی خدمات کو تفصیل سے پیش کرتے ہوئے خراج تحسین ادا کرنے کے لئے شاہد علی خان نے یہ کتاب مرتب کی۔ جس میں ڈاکٹر یاسین' عبدالمجید سندھی' ڈاکٹر میمن عبدالغفور سندھی' سید مصطفیٰ علی بریلوی' حسن علی اے رحمان' ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری' پروفیسر رحمت فرخ آبادی' نثار حسن علی کی ایسی نگارشات شامل ہیں جو آفندی مرحوم کے سوانحی کوائف' ان کے شخصی کردار اور کارناموں کا احاطہ کرتی ہیں۔ سندھ کے ایک عظیم سپوت کو اردو داں طبقے سے متعارف کرانے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔

**ابوالکلام آزاد' ایک ہمہ گیر شخصیت : مرتبہ رشید الدین خان : دہلی : ۱۹۸۹ء**

۱۹۸۸ء میں مولانا آزاد کے سوویں یوم پیدائش پر مضامین اور کتابوں کا سیلاب امڈ آیا۔ انہیں میں یہ بھی شامل ہے۔ اس میں مولانا کے سوانحی واقعات' شخصیت اور کردار کے بارے میں لکھے گئے مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔ زیادہ تر ایسے مضامین ہیں جو سیمینار میں پڑھے گئے یا رسائل میں شائع ہوئے انہیں محفوظ کرنے کے لئے کتابی صورت دی گئی۔ مضامین کو موضوعات کے لحاظ سے (۱) ذہن و فکر (۲) تفسیر و تفہیم (۳) صحافت و ادارت (۴) انشاء و اسلوب (۵) سیاست و قیادت میں تقسیم کیا گیا ہے۔ "مقدمہ" مرتب نے لکھا ہے۔ جس میں سوانح کے بعض اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ انہوں نے نہایت فخر کے ساتھ بتلایا ہے کہ

"۱۳ دسمبر ۱۹۲۰ء کو مولانا کے ایماء پر گاندھی نے کلکتہ میں جامع مسجد کے احاطے میں مدرسہ اسلامیہ کا افتتاح کیا۔" (۱۲۸)

اس میں فخر کا پہلو مولانا کے لئے نکلتا ہے' گاندھی کے لئے یا مدرسہ اسلامیہ کے لئے' سمجھ سے بالاتر ہے۔ انہوں نے روایتی انداز میں سرسید کا نام لئے بغیر جدید تعلیم کی مخالفت کی ہے۔ یہ بات قابل گرفت ہے کہ ہندوستان کے رہنماؤں کے کردار کو اجاگر کرنے کے لئے قائداعظم محمد



علی جناح اور نظریۂ پاکستان پر لعن طعن کی گئی ہے۔ سچائی اور تاریخی حقیقتوں کو فراموش کرکے ذہنی تحفظات ہی نہیں بلکہ تعصبات کے ذریعہ اپنے نظریہ اور خیال کو استدلال کے زور پر نہیں بلکہ الفاظ کے زور پر منوانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مرتب کا یہ کہنا کہ

"مولانا نے قدیم گھرانے اور روایتی ماحول میں آنکھیں کھولیں جبکہ جناح صاحب کی تعلیم و تربیت ایسے گھرانے میں ہوئی جو ان پابندیوں سے آزاد تھا مگر دونوں کے سیاسی ارتقاع کے راستے کہاں سے کہاں لے گئے۔ آزاد کا قدم مخصوص سے عام کی طرف بڑھا' محدود سے عالمگیری کی طرف' فرقہ اور ملت سے قوم اور انسانیت کی طرف' مذہبی احساس کے تابع سیاسی شعور سے سیکولر' روشن خیال' جمہوری شعور کی طرف' جناح صاحب کے سفر کی سمت اس کے بالکل مختلف اور برعکس تھی۔" (۱۲۹)

اسی بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نے صداقتوں سے سبق لینا چھوڑ دیا تھا۔ ان کی وفاداری گاندھی اور کانگریس سے تھی جس نے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی طرف سے آنکھیں پھیر لی تھیں لیکن انڈیا ونز فریڈم میں کہیں کہیں اس کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ جناح صاحب میں سوچنے سمجھنے' حالات کا تجزیہ کرنے اور اپنی راہ آپ متعین کرنے کا شعور موجود تھا اور انہوں نے ایسا کرکے تاریخ کو اپنی رائے کے مطابق سمت مقرر کرنے پر مجبور کیا۔ ان کی وفاداری جماعت سے بالاتر تھی وہ صرف اس قوم کے وفادار تھے جس سے وفا کرنے پر کانگریس یا اس کا کوئی حامی تیار نہ تھا۔ اکثریت کی ذہنیت کی جھلکیاں جدوجہد آزادی کے دوران کبھی کبھی نظر آتی تھیں جن کو جناح صاحب نے دیکھا ہی نہیں' ان کا نوٹس بھی لیا۔ اس رویہ کی وجہ سے "ہندو مسلم اتحاد کے سفیر" کو صرف اپنی قوم کا رہنما بننا پڑا۔ مرتب نے اکثریت کی ذہنیت کا تجزیہ صفحات ۳۵' ۳۶ پر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

"قوم پرست ہندوؤں کا تعلق اکثریت کے فرقے سے تھا۔ اس لئے یہ عین ممکن تھا کہ وہ بہ یک وقت فرقہ پرست بھی ہوں اور قوم پرست بھی کیونکہ اکثریت کی فرقہ پرستی کو ہمیشہ ہی ابتدائی قوم پرستی پر محمول کیا جا سکتا تھا۔"

دراصل اسی منافقانہ سیاست کا اعتراف ہے جس نے جناح صاحب کے رشتے اپنی قوم کے سوا باقی سب سے توڑ دیئے تھے۔ مرتب نے لکھا ہے کہ سیاست کے ابتدائی دور میں مولانا کے جو اصول تھے ان میں یہ بھی شامل تھے کہ

"خلافت تحریک دراصل ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد ہے۔" (۱۳۰)

"انگریزی حکومت سے عدم تعاون اور انگریزی مال کا بائیکاٹ مسلمانوں کے لئے سیاسی طور پر ضروری نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ بھی ہے اور یہ فریضہ قرآنی آیات پر مبنی ہے۔" (۱۳۱)

لیکن نہ تو مقالہ نگار نے اور نہ ان کے ممدوح نے کبھی ان قرآنی آیات کا حوالہ دیا جس کے تحت یہ امر جائز ہو کہ تحریک چلائی جائے تو ہندو یونیورسٹی کو ذرہ برابر متاثر نہ ہونے دیا جائے اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی اینٹ بجانے کے لئے یلغار کی جائے اور اس کی تباہی کے لئے "کیمپ جامعہ" قائم کی جائے، سارا مقالہ عقیدت کے بوجھ تلے اوہام کی تخلیق ہے اور جہاں عقیدت کی گرفت کمزور ہوئی وہاں اعتراف کرنا پڑا کہ

"مولانا کی دل آویز شخصیت میں بھی خود اپنے تضاد موجود تھے۔" (۱۳۲)

مقالہ نگار نے درست لکھا ہے کہ وہ بڑے دانشور تھے، علم و فضل میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ اسلامی دینیات، عربی فارسی ادب، علم کلام، قدیم فلسفہ اور مابعد الطبیعیات پر حاوی تھے۔ انہوں نے یورپی ادب اور بعض فلسفیانہ اور سائنسی مباحث کی جانب بھی توجہ کی لیکن ان کا یہ لکھنا درست نہیں کہ

"وہ عوام کے ساتھ تھے مگر عوامی سطح پر کبھی نہ اترے۔" (۱۳۳)

اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ

"وہ مسلم عوام کے جذبات اور نظریات کو سمجھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اپنے جذبات اور نظریات ان پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے عوام سے کچھ نہیں سیکھا وہ صرف سکھانا جانتے تھے۔"

ان کی شخصیت کا تضاد اس وقت زیادہ نمایاں ہوتا ہے جب مقالہ نگار یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو قوم نہیں مانتے تھے لیکن ظ۔ انصاری "۲۷ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں کلکتہ میں تاریخی خطبہ" کا حوالہ دیتے ہوئے (ص ۷۹) بتاتے ہیں کہ وہ پان اسلام ازم کے قائل تھے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس کی دعوت دیتے تھے۔

کتاب کا ایک مقالہ "مولانا ابوالکلام کا ذہنی سفر" ہے جو ظ۔ انصاری کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس میں تعقل کا فقدان، سطحی جذباتیت کی فراوانی ہے۔ محمد ضیاء الدین نے اپنے مقالہ میں "مولانا آزاد اور علی گڑھ" میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ایک دور وہ تھا جب مولانا، سرسید کی فکر و دانش اور قوت عمل کے مداح تھے اور پھر ایک دور وہ آیا کہ انہیں کو انگریزوں کا کاسہ لیس کہنے لگے۔ مفکرین اور دانشور سرسید پر انگریز پرستی کا الزام لگاتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ



مسلمانوں میں نہ تو قومی شعور تھا اور نہ معاشی خوش حالی کہ وہ علی گڑھ کالج چلا سکتے۔ اگر ایسے میں ایک اہم مقصد کے لئے انگریزوں کی مالی اعانت حاصل کی گئی تو کیا برا ہے۔ جہاں تک سیاست سے مسلمانوں کے دور رہنے کی تلقین کا تعلق ہے معترضین فراموش کر دیتے ہیں کہ اس وقت کے تقاضے کیا تھے اور ان میں ترجیحات کا تعین کس طرح کیا جاتا تھا۔ اولین مقصد معاشی وسائل کی فراہمی، دوسرا مقصد حصول تعلیم، تیسرا مقصد تعلیم کے ذریعہ ذہن کی جلا اور اس کے بعد کہیں نوبت آتی سیاست میں حصہ لینے کی۔ وہ پرانے اعتراضات جو ایک بار اٹھائے گئے انہیں کی تکرار کر کے نہ تو مولانا نے کوئی خدمت کی اور نہ ان کے اذکار کا اعادہ کر کے مداحین نے مولانا کی کوئی خدمت کی۔

مولانا کی صحافتی زندگی کے بارے میں احمد سعید ملیح آبادی کا مقالہ معلومات افزا ہے۔ مجموعی طور پر تمام مضامین پر ستائش کا رنگ غالب ہے۔ انہیں "مدلل مداحی" بھی نہیں کہا جا سکتا۔

تمام مضامین ذہنی تحفظات اور تعصبات کے حامل ہیں اور بے دلیل مداحی سے کام لیا گیا ہے۔ اس نوع کی بے سروپا تحریروں میں مولانا آزاد کا امیج بننے کی بجائے بگڑنے کا احتمال ہے لیکن غالبا "بھارت کے مسلمان اکثریت سے اپنی وفاداری ظاہر کرنے کی مجبوری کے شکار ہیں" اس لئے اس قسم کی تحریروں کا سہارا لیتے ہیں۔

# باب ششم

## مصادر وماخذات


۱۔غلام محی الدین(نئے ادب کے معمار) : کتب پبلشرز : بمبئی : ۱۹۳۸ء : صفحہ ۱۲

۲۔مخدوم محی الدین' حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۳

۳۔مخدوم محی الدین' حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۹

۴۔مخدوم محی الدین' حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۰

۵۔مجید لاہوری : شفیع عقیل : مکتبہ ماحول : کراچی : ۱۹۵۸ء : صفحہ ۱۰

۶۔روزگار فقیر : سید وحید الدین : کراچی : ۱۹۶۳ء : صفحہ ۱۵

۷۔پطرس' ایک مطالعہ : کرنل غلام سرور : مطبوعات حرمت : راولپنڈی : ۱۹۸۱ء صفحہ ۷

۸۔پطرس' ایک مطالعہ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۸

۹۔پطرس' ایک مطالعہ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۸

۱۰۔پطرس' ایک مطالعہ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۴

۱۱۔پطرس' ایک مطالعہ فلیپ

۱۲۔بابائے اردو کی کہانی' ان کے معتمد کی زبانی : بشیر احمد قریشی ہاپوڑی : فیروم انٹرپرائز : کراچی : صفحہ ۳

۱۳۔اردو کا ادیب اعظم : مولانا عبدالماجد دریا بادی : ادارہ تصنیف ثانیت : پاکستان : کراچی : ۱۹۸۶ء : صفحہ ۲۳

۱۴۔یادوں کے چراغ : میاں عبدالعزیز : عباز کا ٹرسٹ : کراچی : ۱۹۸۸ء : صفحہ ۱۱

۱۵۔یادوں کے چراغ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۱

۱۶۔علامہ سید سلمان ندوی کی شان جامعیت : قاضی سید عبدالنان : الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ : کراچی : ۱۹۹۰ء : صفحہ ۱۳

۱۷۔علامہ سید سلمان ندوی کی شان جامعیت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۶

۱۸۔دید وشنید : رئیس احمد جعفری : کراچی : صفحہ ۳۳

۱۹۔دیدوشنید : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۹

۲۰۔دیدوشنید : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۴۴

۲۱۔دیدوشنید : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۸۵

۲۲۔دیدوشنید : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۹۹

۲۳۔گنجے فرشتے : منٹو : مکتبۂ جدید : لاہور : ۱۹۵۲ء : صفحہ ۲۳

۲۴۔گنجے فرشتے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۲

۲۵۔گنجے فرشتے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۲

۲۶۔گنجے فرشتے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۲

۲۷۔گنجے فرشتے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۷

۲۸۔گنجے فرشتے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۸۸

۲۹۔گنجے فرشتے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۱۳

۳۰۔گنجے فرشتے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۱۴

۳۱۔گنجے فرشتے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۱۰

۳۲۔گنجے فرشتے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱

۳۳۔گنجے فرشتے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۵۴

۳۴۔گنجے فرشتے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۴۸

۳۵۔یادرفتگاں : سید سلیمان ندوی : مکتبۃ الشرق : کراچی : ۱۹۵۵ء : صفحہ ۵۸

۳۶۔یادرفتگاں : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۳۴

۳۷۔صاحب : محمد طفیل : ادارۂ فروغ ادب : لاہور : ۱۹۵۵ء : صفحہ ۷۰

۳۸۔صاحب : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۹۳

۳۹۔صاحب : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۲

۴۰۔یاران کہن : عبدالمجید سالک : مطبوعات چٹان : لاہور : دسمبر ۱۹۵۵ء : صفحہ ۱۲

۴۱۔یاران کہن : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۲

۴۲۔یاران کہن : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۷

۴۳۔یاران کہن : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۹

۴۴۔یاران کہن : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۴



۴۵۔یاران کہن : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۵

۴۶۔چہرے : شورش کاشمیری : مطبوعات چٹان : جنوری ۱۹۲۶ء : صفحہ ۱۸

۴۷۔چہرے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۱

۴۸۔چہرے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۴۰

۴۹۔چہرے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۴۱

۵۰۔ہم نفسان رفتہ : رشید احمد صدیقی : لاہور : ۱۹۲۶ء : صفحہ ۱۵۴

۵۱۔آپ : محمد طفیل : ادارۂ فروغ اردو : لاہور : ۱۹۶۷ء : تمہید

۵۲۔آپ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۷

۵۳۔آپ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۹

۵۴۔آپ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۲

۵۵۔کتابی چہرے : سید ضمیر جعفری : نیرنگ خیال پبلی کیشنز : راولپنڈی : ۱۹۷۶ء : صفحہ ۳۶

۵۶۔کتابی چہرے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۴۰

۵۷۔کتابی چہرے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۴۵

۵۸۔کتابی چہرے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۴۹

۵۹۔کتابی چہرے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۶۷

۶۰۔چند یادیں : خواجہ جمیل احمد : کراچی : ۱۹۷۷ء : صفحہ ۱۹

۶۱الف۔ وفیات ماجدی : عبدالماجد دریا بادی : لکھنؤ : ۱۹۷۸ء : صفحہ ۱۳۰

۶۱۔معاصرین : عبدالماجد دریا بادی اکیڈمی : لکھنؤ : ۱۹۷۸ء : صفحہ ۹۷

۶۲۔معاصرین : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۴

۶۳۔بزم رفتگان : سید صباح الدین عبدالرحمٰن : مکتبۂ جامعہ دہلی : نومبر ۱۹۸۱ء : صفحہ ۸۷

۶۴۔بزم رفتگان : حوالہ مذکورہ : صفحات ۳۲۶، ۳۲۷

۶۵۔یادرفتگان : ماہرالقادری مرتبہ طالب ہاشمی : کراچی : ۱۹۸۳ء : صفحات ۳۰

۶۶۔یادرفتگان : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۴

۶۷۔یادرفتگان : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۷

۶۸۔یادِ رفتگان : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۹۸

۶۹۔یادِ رفتگان : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۴

۷۰۔یادِ رفتگان : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۰۲

۷۱۔یادِ رفتگان : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۹۳، ۲۹۴

۷۲۔یادِ رفتگان : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۴۹

۷۳۔بزمِ خوش نفساں : شاہد احمد دہلوی : مکتبہ اسلوب : کراچی : ۱۹۸۴ء : صفحہ ۶۷

۷۴۔اوکھے لوگ : ممتاز مفتی : یونیورسل بکس : لاہور : ۱۹۸۶ء : صفحہ ۱۰

۷۵۔اوکھے لوگ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۲

۷۶۔اوکھے لوگ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۴

۷۷۔اوکھے لوگ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۶

۷۸۔اوکھے لوگ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۸۵

۷۹۔اوکھے لوگ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۹۳

۸۰۔اوکھے لوگ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۱

۸۱۔اوکھے لوگ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۵

۸۲۔اوکھے لوگ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۵

۸۳۔اوکھے لوگ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۳۰

۸۳۔(الف) انجمن : سید یوسف بخاری دہلوی : کراچی : ۱۹۸۷ء : صفحہ

۸۴۔حسرت کی یاد میں عبداللہ ولی بخش : ادارۂ تصنیف و تالیف : مجیدیہ اسلامیہ کالج : الہ آباد : ۱۹۵۴ء : صفحہ ۲۳

۸۵۔حسرت کی یاد میں : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۴

۸۶۔حسرت کی یاد میں : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۵

۸۷۔ڈاکٹر زور : محمد بن عمر : ادارۂ ادبیات اردو : حیدر آباد دکن : ۱۹۵۵ء : صفحہ ۱۳۶

۸۸۔ڈاکٹر زور : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۴۷

۸۹۔مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں : محمد یوسف بھٹہ : ادارۂ معارف : اسلامی، لاہور : نومبر ۱۹۵۵ء : صفحہ ۱۱





۹۰۔مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۲

۹۱۔عبدالرحمان چغتائی : شخصیت اور فن : مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا : مجلس ترقی ادب : لاہور : ۱۹۸۰ء : صفحہ ۱۰۰

۹۲۔عبدالرحمان چغتائی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۰۷

۹۳۔عبدالرحمان چغتائی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۷۱

۹۴۔حسرت موہانی : شائع کردہ بہار اکیڈمی : پٹنہ : ۱۹۸۲ء : صفحہ ۱۹

۹۵۔حسرت موہانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۹، ۲۰

۹۶۔حسرت موہانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۰

۹۷۔حسرت موہانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۲

۹۸۔حسرت موہانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۳

۹۹۔حسرت موہانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۴۱

۱۰۰۔ Histories Of Khilafat and non-coperation Moments (بالفورڈ) Page 48 :

۱۰۱۔حسرت موہانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۴۲

۱۰۲۔حسرت موہانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۲

۱۰۳۔حسرت موہانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۲-۵۳

۱۰۴۔حسرت موہانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۳

۱۰۵۔حسرت موہانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۵

۱۰۶۔حسرت موہانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۵

۱۰۷۔حسرت موہانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۵۵

۱۰۸۔ساغر نظامی : مرتبہ ضامن علی خان : ساغر میموریل اکیڈمی : نئی دہلی ۱۹۸۹ء

۱۰۸۔(الف) ساغر نظامی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۱۳

۱۰۹۔ساغر نظامی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۰۹

۱۱۰۔ساغر نظامی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۴۳

۱۱۱۔ساغر نظامی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۷۶

۱۱۲۔ساغر نظامی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۶

۱۱۳۔ہمارے کنور صاحب : مرتبہ کے ایل نارنگ : دہلی : ۱۹۸۶ء : صفحہ ۳۰

۱۱۴۔ہمارے کنور صاحب : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۹
۱۱۵۔ہمارے کنور صاحب : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۶۹
۱۱۶۔ہمارے کنور صاحب : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۶۷۹
۱۱۷۔آزاد کی کہانی' آزاد کی زبانی : مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی : دہلی : ۱۹۵۸ء : صفحہ ۳۰۳
۱۱۸۔مولانا ابوالکلام آزاد' شخصیت اور کارنامے : مرتبہ خلیق انجم : انجمن ترقیٔ اردو : دہلی : ۱۹۸۶ء : صفحہ ۱۳۸
۱۱۹۔مولانا ابوالکلام : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۳۹
۱۲۰۔مولانا ابوالکلام : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۵۳
۱۲۱۔مولانا ابوالکلام : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۵۱
۱۲۲۔مولانا ابوالکلام : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۴۳
۱۲۳۔مولانا ابوالکلام : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۸۰'۸۱
۱۲۴۔مولانا ابوالکلام آزاد' ایک مطالعہ : مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری : کراچی : ۱۹۸۶
۱۲۵۔مطالعۂ سلیمانی : مرتبہ مسعود الرحمٰن خان ندوی اور محمد حسان خان : دارالعلوم تاج المساجد : بھوپال : جون ۱۹۸۶ء : صفحہ
۱۲۶۔مطالعۂ سلیمانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۴۴
۱۲۷۔مطالعۂ سلیمانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۴۴
۱۲۸۔مطالعۂ سلیمانی : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۴۴
۱۲۹۔ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت : مرتبہ رشید الدین خان : ترقی اردو بیورو : دہلی : دسمبر ۱۹۸۶ء : صفحہ ۳۸
۱۳۰۔ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۰
۱۳۱۔ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۰
۱۳۲۔ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۰
۱۳۳۔ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۸
۱۳۴۔ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۸



۱۳۵۔دلی والے : مرتبہ ڈاکٹر صلاح الدین : اردو اکیڈمی : دہلی : جلد اول ۱۹۸۶ء : جلد دوم ۱۹۸۸ء : صفحہ ۴۲
۱۳۶۔دلی والے : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۲۴

# باب ہفتم

## اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد

### تجزیاتی مطالعہ

### فنی و تنقیدی جائزہ

## سوانح نگاری کے موضوع

اگست ۱۹۴۷ء میں برصغیر جنوبی ایشیا کی تقسیم اور دو آزاد مملکتوں کے قیام کے بعد امن وامان کی جو صورت حال پیدا ہوئی اس سے ادیبوں شاعروں، دانشوروں اور حساس انسان دوستوں کو زبردست ذہنی دھچکا لگا۔ کئی برس افراتفری کے عالم میں گزرے۔ علمی وادبی سوتے وقتی طور پر منجمد ہوگئے۔ جو تخلیقی ادب منظر عام پر آیا وہ حالات کے ردعمل کے طور پر تھا فن سوانح نگاری کی طرف توجہ اس وقت تک نہیں دی گئی جب تک حالات معمول پر نہ آگئے اور سوچنے سمجھنے اور لکھنے کے لئے ماحول سازگار نہ ہوگیا۔

نگاہ حقیقت بین سے دیکھا جائے تو تاریخ کے ہنگامہ پرور دور سے گزرنے اور منزل پر پہنچنے کے بعد ماضی کا جائزہ لینا اور اس سے سبق حاصل کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت تھی۔ اس کے برخلاف یہ ہوا کہ نیا دور نئے تقاضے لے کر آیا۔ زندگی کی رفتار تیز تر ہوتی گئی۔ معاشی اور سیاسی مصائب میں اضافہ ہوا، جدید ذرائع ابلاغ اپنا اثر قائم کرتے گئے۔ ان سے تخلیق کار ہم آہنگ ہوتے گئے لیکن سوانح نگاری کے لئے جو وسیع میدان ہموار ہوا تھا اس میں جوہر دکھانے کی بھرپور کوشش نہیں ہوئی۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ کامیابیوں کے بعد اس کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونے کے ساتھ ان مشاہیر کی یاد تازہ رکھی جاتی جن کے قدموں کے نشان ماضی کی شاہراہ پر مٹے بھی نہ تھے۔ ان کے سائے پرنور ماضی قریب سے تاریخ قدیم کی تاریکیوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں تاریخ ساز سیاست دان بھی تھے جنہوں نے سابقہ تجربوں سے سبق سیکھا، مستقبل کی راہیں متعین کیں، قوم کے نصب العین کا تعین کیا عزم وہمت سے آگے بڑھنے اور منزل تک پہنچنے کے راستوں کی نشاندہی کی۔ معاشرہ میں اصلاح کی تحریکیں شروع کیں۔ مذہب کے نام پر جاری رسم ورواج کے خلاف آواز اٹھائی خصوصا احیائے اسلام کی تحریکوں نے راہ پائی۔ جدید علوم کو مذہب سے متصادم کرنے کے بجائے ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی سعی کی۔ اسلاف کے چھوڑے ہوئے علمی خزانوں اور سائنسی دریافتوں کی بازیافت کی مہم سر کی۔ قدیم اور جدید علوم میں موجود تسلسل کی نشاندہی کی۔ زبان اور ادب کی خدمت اور ترقی کے لئے ہمہ جہت کاوشیں کیں۔ فورٹ ولیم کالج کی نثری تحریک، دہلی کالج کی علمی تحریک، انجمن پنجاب کی جدید نظم کی تحریک، شاعری کے ذریعہ احیائے اسلام کی اقبال کی تحریک، رومانی تحریک اور پھر حقیقت پسندی اور انقلابی رجحان کی ترقی پسند تحریک۔ ان سب نے اپنے اپنے میدان عمل میں اپنے اپنے انداز میں زبان کو وسعت دی اس کے علمی خزانوں میں گرانقدر اضافہ کیا اور ادب میں قابل رشک

تنوع پیدا کیا۔ ان کے توسط سے ایسی شخصیات منظر عام پر آئیں جن کے فکر و فن اور عمل کو تاریخ کا حصہ قرار دیا جاتا ہے جہاں ان کے کارناموں کی بازگشت سنائی دیتی ہے وہیں ان کے کوائف سے آگاہی اور سیرت کی خوبیوں سے واقفیت بھی ضروری ہے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سوانح نگاری کے لئے موضوعات کی کوئی کمی نہیں ہے بلکہ اکثر اقوام کی نسبت ہم زیادہ مالا مال ہیں۔ اسلاف کے حالات زندگی ہمارے لئے رہنما قوت ہیں ان کے اذکار سے ہمیں کسب نور کرنا چاہئے اس کی ہدایت قرآن شریف نے بھی دی ہے۔ قصص الانبیاء اور اقوام کے اعمال اس لئے بیان کئے گئے کہ ان سے نصیحت حاصل کی جائے اس بات کا ارشاد اس آیت میں بھی کیا گیا ہے جو حضرت یوسف کے احوال کے ساتھ آئی ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۔ (پ۱۳ ر ۶ آیت ۱۱۱)

(بے شک ان واقعات کے ترتیب وار بیان میں عقل مندوں کے لئے عبرت کا سامان ہے)

اس آیت نے وضاحت کردی ہے کہ اذکار کا مقصد عبرت و موعظت ہے تاکہ اخلاف اچھے اسلاف کے نقش قدم پر چلیں اور برے اسلاف کی خامیوں کا اعادہ نہ کریں۔ سوانح عمریاں انہیں دو نکات نظر کو ملحوظ رکھ کر لکھی جاتی ہیں۔ زیادہ تر سوانح نگاری اول الذکر مقصد کی پابند ہیں۔

سوانح نگاری کے لئے ان ہی کو موضوع بنایا جاتا ہے جن کے ساتھ روحانی، ذہنی یا قلبی لگاؤ ہوتا ہے۔ ان کے بغیر قلم اٹھانا اور انصاف کا حق ادا کرنا ممکن نہیں۔ ہر بڑی شخصیت میں کوئی نہ کوئی عظیم قدر ضرور موجود ہوتی ہے۔ جو سوانح نگار کو متاثر کرتی ہے اور وہ جیسے جیسے شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے آشنا ہوتا جاتا ہے اس کے پورے خدوخال اپنے حسن و قبح کے ساتھ واضح ہوتے جاتے ہیں اور وہ اسے اپنے سے قریب تر محسوس کرنے لگتا ہے یہی کیفیت اسے سوانح نگاری پر مائل کرتی ہے اس بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا بھی یہی خیال ہے کہ

"سوانح نگاری کی مہم محض علمی قابلیت کے سہارے سر نہیں کی جاتی یہ وہ فن ہے جس کی تکمیل کے لئے صرف محنت اور محض علمی قابلیت کافی نہیں اس کے لئے جذبۂ ہمدردی اور انس و محبت کی ضرورت ہے" (۱)

یہی وجہ ہے کہ وہ سوانح عمریاں جو شخصی تعلق اور ذاتی معلومات کی بناء پر لکھی گئی ہیں جزئیات کی حد تک مکمل اور صداقت سے معمور ہیں۔ علامہ اقبال کے سوانح و سیرت نگاروں میں مولانا عبدالمجید سالک (۲) فقیر سید وحید الدین (۳) ڈاکٹر جاوید اقبال (۴) خالد نظیر صوفی (۵) اور



ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی (۶) کی تصانیف ان کے لگاؤ اور قلبی رغبت کی خوشبو کے ساتھ معلومات کی حد تک سند کا درجہ رکھتی ہیں۔

دیگر سوانح عمریوں میں یادگار حالی (۷) آثار ابوالکلام آزاد (۸) حیات اجمل (۹) حکیم الامت، نقوش و تاثرات (۱۰) سوانح عمری خواجہ حسن نظامی (۱۱) حیات امجد (۱۲) تذکرۂ جگر (۱۳) حیات سلمان (۱۴) علامہ سید سلیمان ندوی (۱۵) مولانا ابوالکلام آزاد (۱۶) بھی اس ذیل میں آتی ہیں۔

شخصی حوالہ سے لگاؤ یا رغبت بڑھ کر عقیدت و ارادت کے درجہ تک بھی پہنچ جاتے ہیں لیکن اس کا اظہار سوانح عمری میں نہیں ہونا چاہئے۔ صالحہ عابد حسین نے حالی کی سوانح عمری (یادگار حالی) لکھی لیکن اس لئے نہیں کہ وہ ان کے خاندان کی ایک بزرگ ہستی تھے بلکہ خاندانی رشتے کے علاوہ بھی حالی کی شخصیت میں ایسے اوصاف موجود تھے جو لگاؤ پیدا کرنے کا باعث بنے چنانچہ انہوں نے تصنیف کے محرکات کے بارے میں لکھا ہے کہ

"میری عقیدت ان کے خاندانی رشتے کی وجہ سے نہیں اس عظیم الشان خدمت کی وجہ سے ہے جو انہوں نے اردو ادب، اردو شاعری، اردو زبان کی انجام دی، دوسرا سبب میری عقیدت کا حالی کی لاثانی سیرت ہے" (۱۷)

یہ ضروری نہیں ہے کہ شخصی ارتباط ہی لگاؤ کا باعث ہو ہر دور کی شخصیات اپنے کارناموں اور اوصاف و فضائل کی وجہ سے دل میں گھر کر سکتی اور سوانح نگاری پر مائل کر سکتی ہیں ہماری زبان میں ایسی ہی سوانح عمریوں کی کثرت ہے اس نوعیت کی سوانح نگاری کے لئے تحقیق کی جانکاہیوں سے گزر کر صداقت پر مبنی حالات کی تلاش جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل ہے اس کے باوجود ہمارے اکثر عالی حوصلہ مصنف اس آزمائش سے بھی سرخرو ہو کر نکلے ہیں جس کی مثال میں درجنوں تصانیف پیش کی جا سکتی ہیں ان میں امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی (۱۸) امام رازی (۱۹) سید احمد شہید (۲۰) صدیق اکبر (۲۱) شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ (۲۲) سیرت سید احمد شہید (۲۳) سید امیر علی (۲۴) حسرت موہانی، حیات اور کارنامے (۲۵) سید شاہ امین الدین اعلیٰ (۲۶) اللہ کی تلوار (۲۷) امیر خسرو دہلوی (۲۸) مولوی عبدالحق، حیات اور کارنامے (۲۹) بہادر شاہ ظفر (۳۰) نیاز فتح پوری (۳۱) قابل ذکر ہیں۔

سوانح نگاری کے لئے موضوع کا انتخاب لگاؤ کے سوا ذوق تحقیق پر بھی منحصر ہے۔ صاحبان علم ماضی کا مطالعہ کرتے ہوئے اس وقت تشنگی محسوس کرتے ہیں جب حقائق کی کڑیاں باہم مربوط

نہیں ہوتیں۔ اس کی کو پورا کرنے کے لئے وہ ذوق تحقیق کو کام لاتے ہوئے گم شدہ کڑیاں باز یافت کرتے ہیں جن سے سوانح عمری مکمل ہو جاتی ہے۔ یہ کام مخصوص ذہنی افتاد کے ذریعہ ہی ممکن ہوتا ہے۔ گزشتہ ایک صدی کے دوران اس رجحان میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ وہ بنیادیں جو دبستان شبلی نے رکھی تھیں وقت کے ساتھ استوار ہوتی گئیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے محققین نے سابقہ ادوار کی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرکے صداقت شعاری اور جزئیات نگاری پر توجہ دی ہے اس کی وجہ سے یہ فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے اور معیار کے اعتبار سے دنیا کی کسی زبان کی سوانح عمریوں کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے ماضی بعید اور ماضی قریب کی اکثر شخصیات کی سوانح عمریاں لکھی جا چکی ہیں اور حقائق کی بازیافت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔

یہ ضروری نہیں کہ لگاؤ اور ذوق کو دو مختلف رجحان ہی سمجھا جائے۔ یہ دونوں محرکات بیک وقت بھی کار فرما ہو سکتے ہیں۔ تحقیقی نوعیت کی سوانح عمریوں کے رجحان کو جامعاتی مقالوں سے تقویت ملی ہے ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی، کی سطح پر جو مقالے لکھے گئے ہیں وہ سوانح نگاری کی ضرورتوں کو کسی حد تک پورا کرتے ہیں۔

ان مقالوں میں دو نمایاں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ کسی ہمہ جہت شخصیت پر بھرپور اور جامع تحقیقی کام کسی ایک شعبۂ تدریس میں نہیں ہوتا بلکہ ہر شعبہ مقالہ کو ایسے مضمون (Subject) تک محدود رکھتا ہے جس سے شخصیت بٹ جاتی ہے اور بیک وقت شخصیت اپنی جامعیت کے ساتھ سامنے نہیں آتی۔ جامعاتی مقالوں کی دوسری نمایاں خصوصیت خدمات، کارناموں، نظریات اور رجحانات کو سوانح عمری سے زیادہ اہمیت دینا ہے۔ ان مقالوں کی ابتدا میں سوانحی حالات پر ایک باب شامل ضرور ہوتا ہے۔ دیگر ابواب میں نظریات اور کارناموں کو حالات زندگی سے ربط دیئے بغیر بیان کیا جاتا ہے جس سے مقالے کئی اکائیوں میں بٹ جاتے ہیں اور سوانح عمری کے ساتھ جو تصور شخصیت اور کارناموں کی اکائی کا ہے باقی نہیں رہتا۔ اس نوعیت کی تصانیف کا رجحان عام ہوتا جا رہا ہے جس نے مستقل اور جامع سوانح عمری کے فن کی اہمیت کو گھٹا دیا ہے اور مختصر سوانح عمری کی ایک نئی صنف کا اضافہ کیا ہے۔

سوانح نگاری کے لئے رغبت کے بعض نئے محرکات بھی سامنے آئے ہیں۔ اب یہ رسم عام ہو چلی ہے کہ رفتگان کی یاد تازہ کرنے کے لئے جشن یا تقاریب منعقد کی جانے لگی ہیں۔ سابق میں حضرت امیر خسرو کا سات سو سالہ جشن، غالب کی صد سالہ برسی، علامہ اقبال، قائد اعظم، مولانا آزاد کے صد سالہ یوم پیدائش بڑے اہتمام سے منائے گئے۔ اس تازہ روایت کے سلسلے



میں شخصیت، کے حوالے سے جو اہم تحقیقی اور تصنیفی کام ہوا اس میں سوانح عمریاں بھی شامل ہیں جن کو مرتب کرنے کے لئے تلاش و جستجو میں حد درجہ کام لیا گیا ہے اس رسم سے ایسے اہل علم بھی متوجہ و مائل (Inspire) ہوئے جو نہ محقق تھے اور نہ سوانح نگار، اس خصوص میں پروفیسر ممتاز حسین کا نام لیا جا سکتا ہے جن کا تنقید کے حوالہ سے بڑا مرتبہ ہے۔ حضرت امیر خسرو کے سات سو سالہ جشن منانے کے عزم نے انہیں متوجہ و مائل (Inspire) کیا۔ موضوع سے انہیں لگاؤ پہلے سے ہی تھا۔ ماقبل کے سوانح نگاروں کے کام سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ اسی لئے انہوں نے حضرت امیر خسرو کی سوانح عمری مرتب کرنے کے لئے سخت تحقیقی مرحلے طے کئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی تصنیف "امیر خسرو دہلوی" (مطبوعہ ۱۹۷۰ء) میں جو طرز تحقیق و استدلال اپنایا گیا ہے وہ اردو کی چند سوانح عمریوں ہی میں نظر آئے گا۔ اسی طرح علامہ اقبال اور قائد اعظم کے صد سالہ یوم پیدائش پر ان کی زندگی کے ہر ہر پہلو کے بارے میں معلومات حاصل کرکے مستقل اور جامع سوانح عمریاں مرتب کی گئیں۔ تحقیقی و تصنیفی ذوق کو مہمیز کرنے کے لئے یہ تازہ روایت نہایت صحت مندانہ ہے لیکن ساتھ ہی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ غالب کی صد سالہ تقاریب کے سلسلہ میں ان کے فن پر تو بیسیوں کتابیں اور سیکڑوں مضامین شائع ہوئے لیکن جامع اور مستقل سوانح عمری نہیں لکھی گئی۔

جہاں تک علمی، ادبی شخصیات کا تعلق ہے پاک و ہند میں اردو کے سوانح نگار ذہنی تحفظات یا عصبیت کے بغیر ان کے سوانحی حالات اور کارناموں کو روشناس کرانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن سیاسی، تاریخی اور مذہبی شخصیات کے حوالہ سے ان کی سرگرمیاں ماند پڑتی نظر آتی ہیں۔ چند تاریخی مشاہیر ایسے ہیں جو اہل ہند کے لئے ہیرو کا درجہ رکھتے ہیں لیکن اہل پاکستان کی رائے ان کے برخلاف ہے اسی طرح جو مشاہیر پاکستان کے لئے قابل تعظیم ہیں انہیں اہل ہند پسند نہیں کرتے۔ اس بارے میں اکبر اور عالمگیر جیسے شہنشاہوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ تاریخی اسناد کے ساتھ مسلمان مؤرخوں نے ان کی جس عظمت اور خیر سگالی کا انکشاف کیا ہے غیر مسلم مؤرخ چند خود ساختہ روایات کے بل بوتے پر ان کو تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیتے ہیں۔ ایک طرف حد سے بڑھتی ہوئی رغبت ہے تو دوسری جانب حد سے سوا نفرت و مخاصمت، حالانکہ تاریخ اور سوانح کو اس طرح قبول کرنا چاہئے جیسی وہ ہیں۔ انہیں اس طرح بنانے کی کوشش کرنا جیسا وہ چاہتے ہیں انصاف کے مغائر ہے اس رویہ میں قصور برصغیر میں رہنے والی اقوام کا بھی ہے اور ان فتنہ پردازوں کا بھی جو سمندر پار سے آکر

اس آگ کو بھڑکانے کا باعث بنے۔ پچھلی ایک صدی کے دوران نفرت کے شعلوں نے تاریخی اور سیاسی شخصیات کو اپنی لپیٹ میں اس طرح لے لیا ہے کہ جس فراخ دلی سے غیر اقوام کے علمی و ادبی شخصیات کے لئے جذبات تحسین پیش کئے جاتے ہیں اس فراخ دلی کا مظاہرہ اپنوں کے لئے نہیں کیا جاتا۔ تعصبات کے اس دور میں بھی سوامی لکشمی مہاراج نے عرب کا چاند (۳۲) جیسی کتاب لکھی اور سعید احمد مارہروی نے "امرائے ہنود" (۳۳)' خواجہ حسن نظامی نے "کرشن جیون" (۳۴) اور گاندھی نامہ (۳۵)' ابوالاعلیٰ مودودی نے "حالات زندگی مدن موہن مالویہ" (۳۶)' ڈاکٹر سید حفیظ نے "گوتم" (۳۷) لکھیں۔ سید محمد عبدالسلام نے "مادھوجی سندھیا" (۳۷)' رحیم دہلوی نے "جواہرلال کی کہانی" (۳۸) ترجمہ کرکے شائع کیں لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جہاں ملکوں کا بٹوارہ ہوگیا ہے وہاں شخصیات بھی تقسیم ہوگئی ہیں۔ جدوجہد آزادی کے صف اول کے مسلم رہنماؤں کے بارے میں اہل ہند نے سکوت اختیار کرلیا ہے اور غیر مسلم رہنماؤں کے بارے میں یہی رویّہ اہل پاکستان کا ہے۔

سوانح نگاری کے موضوعات کے ضمن میں یہی المیہ نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر پیشرو و مشاہیر کے ساتھ جو ذہنی رشتے ہونے چاہئیں وہ باقی نہیں رہے۔ یہ انتہائی افسوس ناک حقیقت ہے۔ یہ تاریخ اور سوانح سے غفلت نہیں بلکہ ان اقدار' اصولوں اور عظمتوں سے فرار ہے جو ہمارے لئے رہنما قوت ثابت ہوسکتے ہیں۔ اسی لئے آج کا دور ذہنی انتشار اور معاشرتی بحران کا شکار ہے۔

پاکستان میں بھارت کے غیر مسلم رہنماؤں کی اور بھارت میں پاکستانی زعماء کی سوانح عمریاں نہ لکھی جانے کی وجہ عصبیت قرار دی جاتی ہے۔ ہم اسے محتاط انداز میں لگاؤ اور رغبت موجود نہ ہونا کہیں گے۔

لیکن جس شدومد' کامل تحقیق اور دلنشین انداز میں اپنے اپنے رہنماؤں اور زعماء کو نئی نسل سے متعارف کروانے کی کوششیں ہونی چاہئے تھیں نہیں کی گئی ہیں۔ ہر دو ملکوں میں چند شخصیات کو منتخب کرلیا گیا ہے ان کے سوا کسی کی جانب توجہ کو غیر ضروری گردانا جانے لگا ہے۔

## سوانح نگاری کا مواد

شخصیت سے روحانی' ذہنی یا جذباتی لگاؤ سوانح نگاری کے لئے محرک ہوتا ہے اور وہ معلوم کے علاوہ نامعلوم حقائق کی دریافت اور بازیافت کی کوشش شروع کرتا ہے۔ سوانح نگاری میں عام رویّہ یہ رہا ہے کہ کسی شخصیت کے بارے میں سابق میں جو کتابیں تحریر ہوئیں۔ ان سب کو



پیش نظر رکھ کر ترتیب نو کے ساتھ پیش کردیا جاتا ہے۔ اس سے تصنیف کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس طریق عمل سے نہ تو شخصیت کی خدمت ہوتی ہے اور نہ فن کی! اردو کا سوانحی ادب اس نوع کی تحریروں سے بھرا پڑا ہے۔ سوانح نگاری کا حق اسی وقت ادا کیا جاسکتا ہے جب معلوم حقائق کے سوا حالات اور واقعات کے پیچھے گوشوں کو تلاش کرکے اس اس طرح پیش کیا جائے کہ شخصیت کی تعبیر نو ہو اور کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے اور واقعات و کوائف کے ساتھ ساتھ نفسیاتی کیفیات' کردار اور فکر و عمل کو سمجھنے میں مدد ملے۔ اردو میں جامع قاموس الکتب' قاموس الرجال' ماخذات' کتابیات اور اشاریوں کا رواج عام نہیں ہے جو محقق کی رہنمائی کرسکیں اس لئے تحقیق کے ذریعہ سوانح عمری مرتب کرنا ایک نہایت مشکل اور صبر آزما مرحلہ ہے جسے کان کنی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ سوانح نگار ماخذات کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ان کے حصول کے بعد ان کا باہم تقابل اور موازنہ کرتا ہے۔ ان میں اتفاق رائے کی صورت میں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا لیکن واقعہ یا رائے میں اختلاف ہو تو اس الجھن کو دور کرنے کے لئے صرف روایت پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ تمام شواہد اور اسناد کو جمع کرکے ان کی تنقیح کرتا اور وسیع تناظر میں صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ ماخذات کی تلاش کے سلسلہ میں اس صورت حال کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے جو کان کنی کے ابتدائی مراحل میں پیش آتی ہے جس طرح تجزیاتی مطالعہ سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی زمین میں پیٹرول یا سونا موجود ہے وہاں کھدائی میں وقت اور سرمایہ ضائع کرنے کے بعد اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ وہاں کچھ نہیں۔ اسی طرح بعض ضخیم کتابوں کو ماخذ خیال کرکے مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی کار آمد بات نہیں ہے۔

زندگی کے ہر شعبہ کے قدماء کی سوانح عمریاں مرتب کرنا اس لئے بھی دشوار ہوتا ہے کہ وہ خود یا ان کے معاصرین نے آثار اور شواہد نہیں چھوڑے ہیں یا اگر چھوڑے ہیں تو ناکافی ہیں۔ اردو میں شاعروں کے بے شمار تذکرے موجود ہیں۔ لیکن وہ سوانح نگاری کی خاطر خواہ رہنمائی نہیں کرسکتے کیونکہ وہ سوانح نگاری کے نقطہ نظر سے لکھے ہی نہیں گئے جو آثار موجود ہیں وہ ناکافی ہیں ان میں "ذکر میر" کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ میر کی خودنوشت سوانح عمری ہے لیکن فنی اعتبار سے غیر مکمل ہے اس لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہیں کہ شخصیت جتنی قدیم ہوگی اس کے حالات زندگی کی تفصیلات سے آگاہی اتنی ہی دشوار ہوگی۔ زندہ شخصیت یا ماضی قریب کی شخصیت کے بارے میں معلومات کی فراہمی اس کی نسبت سے کہیں آسان ہوتی ہے۔ بلاشبہ اس بارے میں دو آراء ہوسکتی ہیں۔ ایک خیال وہ ہے جو مالک رام نے پیش کیا ہے۔

"کسی رفیع الشان چیز کی عظمت و جلال کا صحیح و مکمل ادراک اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس سے کافی دور پیچھے ہٹ کر اس کا نظارہ نہ کریں۔ اہرام مصر کے ہیبت ناک حجم اور حسن کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ انہیں کافی فاصلے سے دیکھیں۔ اگر آپ عین ان کے قریب یا سائے میں کھڑے ہو کر انہیں دیکھیں گے تو اس سے محروم رہیں گے۔ تاریخی واقعات اور بڑی شخصیتوں پر بھی یہی کلیہ صادق آتا ہے۔" (۴۰)

مالک رام کے بیان میں شخصیت سے دوری زمانی و مکانی دونوں اعتبار سے ہے۔

ہمارے خیال میں شخصیت یا کردار نگاری کے حوالے سے مالک رام کا نظریہ کسی حد تک درست ہے لیکن سوانح نگاری یا تاریخ نگاری کے لئے مناسب نہیں۔ اگر واقعات اور کوائف سے اس لئے چشم پوشی کر لی جائے کہ یہ کام پچاس یا سو سال بعد ہونا چاہئے تو اس وقت تک اس کے تمام شواہد مٹ چکے ہوں گے۔

اکثر بڑی شخصیات دو متضاد آراء کی شکار رہی ہیں۔ ان کی سوانح عمریاں مرتب کرنے کے لئے ان آراء کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اختلافات اور تنازعات کی گرمی جب تیز ہو اسی وقت غیر جانبدار مبصر انہیں یکجا کر کے ماہر لوہار کی طرح درایت کے ہتھوڑے کی ضرب سے انہیں کوئی ایک شکل دے سکے گا۔ عموماً "اختلافات واقف کاروں کے سینوں میں محفوظ رہتے ہیں ان کی زندگی میں وقتاً "فوقتاً" ان کا زبانی اظہار ہوتا ہے اور وہ شاذ و نادر ہی اس کے تحریری شواہد چھوڑ جاتے ہیں۔ مستقبل کا سوانح نگار جب متنازع شخصیت کو موضوع بناتا ہے تو دونوں پہلو یا تو اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکے ہوتے ہیں یا ان کا عکس دھندلا چکا ہوتا ہے ایسے میں وہ سوانح نگاری کا حق ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے ایسی ہی صورت حال بابائے اردو کے بارے میں تحقیق کے مرحلہ پر پیش آئی تھی۔ اس کے بارے میں جمیل الدین عالی نے انکشاف کیا ہے۔

"بابائے اردو مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد ہم نے چاہا کہ ان کے احوال و آثار پر کوئی پی ایچ ڈی کے لئے کام کرے۔ ۱۹۶۲ء جیسے زمانہ میں پانچ سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ دینا بھی طے کر لیا۔ ایک طالب علم نے ہمارے صداقت نامے کے ساتھ جامعہ کراچی میں درخواست بھی گزار دی مگر ارباب بست و کشاد نے مطلوبہ مقالہ پر کام کرنے کی اجازت نہ دی۔ سبب غیر رسمی طور پر یہ بتایا گیا کہ مولوی صاحب کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے۔ ان کے بارے میں متنازع آراء تازہ ہیں۔ ابھی کوئی محقق یہ کام بے تعصبی کے ساتھ پورا نہیں کر سکے گا۔ ذرا ملاحظہ کیجئے مولوی صاحب جیسی شخصیت اور یہ عذر۔" (۴۱)



باشعور اقوام وہی ہیں جنہیں تاریخ نویسی سے شغف رہا۔ وہ ہر گزرے ہوئے واقعہ کو اس لئے محفوظ کرتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کے لئے بصیرت کا کام کریں۔ برصغیر کی اقوام میں یہ اعزاز خصوصیت سے مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ان کی تاریخ دور اولیٰ سے ہی نہیں بلکہ دور جاہلیت سے بھی محفوظ ہے۔ اس میں مذہبی اور سیاسی شخصیات کے حوالہ سے کہا جا سکتا ہے کہ اکثر صورتوں میں روایت کا غلبہ رہا ہے۔ اور شخصیات کو اپنے معتقدات اور رجحانات کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی بھی کی گئی ہے۔ اس کا اندازہ ایک دقیق نظر رکھنے والے محقق سید ابوالحسن علی ندوی نے کیا اور اس کے بارے میں لکھا ہے کہ

"انسانیت کے کتنے ایسے رہنماء اصلاحی تحریکات کے علمبردار، ملکوں اور قوموں کے محسن و معمار اور علم و حکمت میں مجددانہ و مجتہدانہ شان رکھنے والے باکمال گزرے ہیں جن کے کمالات و خصوصیات سے دنیا عرصہ تک بے خبر رہی اور ان کے نام تاریخ کے ملبے کے نیچے صدیوں دبے رہے۔ چند مبالغہ آمیز داستانیں ان کے بارے میں علم و آگہی کا سرمایہ اور "سدرۃ المنتہیٰ" ہوتا ہے اور اسی چوکھٹے میں ان کی شخصیت کو محصور کر دیا جاتا ہے۔ بسا اوقات چند ضمنی طور پر پیش آنے والے حوادث اور کچھ سیاسی مصالح و اختلافات من و انصاف پر اجارہ داری قائم کر لیتے ہیں اور ان کے گرد اپنے جذبات و تصورات کا حصار قائم کر دیتے ہیں۔" (۴۲)

مذہبی شخصیات کی سوانح عمریوں میں روایت کی پاسداری اس طرح کی جاتی ہے کہ روزمرہ زندگی کے انسانی افعال کے بجائے محیر العقول اور فوق الفطرت اعمال پر زور دیا جاتا ہے۔

حقیقی سوانح نگاری یہی ہے کہ ان بھول بھلیوں میں صداقت شعاری اور درایت کے ذریعہ حقائق کا کھوج لگایا جائے خداوند تعالیٰ نے بھی سورۃ الحجرات (۶) میں حکم دیا ہے کہ "اے ایمان والو، تمہارے پاس اگر کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو۔" علمائے سلف نے روایات کو جانچنے اور پرکھنے کے اصول و ضوابط معین کئے ہیں دور جدید کا سوانح نگار اپنی تحقیق میں ان سے رہنمائی حاصل کرتا ہے اور ساتھ ہی مغرب کے سائنسی اور معروضی طریقۂ فکر پر عمل کر کے سوانح نگاری کا حق ادا کرتا ہے۔ اسی لئے بعض اعلیٰ پائے کی تصانیف صرف سوانح عمریاں ہی نہیں بلکہ کتاب المباحث بھی ہوتی ہیں۔

ماخذات کے بارے میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے "صدیق اکبر" (تصنیف ۱۹۵۷ء) میں اس موضوع کو بھی اٹھایا ہے کہ کسی قدیم کتاب کی اصل کے بارے میں جو روایات مشہور ہیں وہ درست بھی ہیں یا نہیں؟ انہوں نے سیرت صدیق کے حوالے سے واقدی کی کتاب "الردہ"

کا ذکر کیا ہے۔ کتب خانہ شرقیہ بانکی پور ا پٹنہ میں جو عام طور پر خدا بخش لائبریری کے نام سے معروف ہے ایک نسخہ محفوظ ہے جسے واقدی کی الردہ کا واحد نسخہ قرار دیا جاتا ہے۔ انہوں نے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے اور اس نسخہ کی عبارت نقل کرتے ہوئے اس سے نتائج اخذ کئے ہیں کہ

"اس کتاب میں واقدی کا تعلق مؤلف ہونے کی حیثیت سے ہرگز نہیں بلکہ اس کا مؤلف جس شخص کو قرار دیا جاسکتا ہے وہ دراصل ابو محمد احمد بن اعثم الکوفی ہے جس نے واقدی اور دوسرے معتقدین کی روایات کو اس کتاب میں جمع کردیا ہے اور اپنے روایتی سلسلوں کو یکجا کتاب میں درج کردیا ہے۔" (۴۳)

ایک عالم مصنف ہی اس دقت نظر سے ماخذ کو جانچ سکتا اور فیصلہ کرسکتا ہے۔ مولانا سعید احمد نے "صدیق اکبر" میں متعدد قدیم تصانیف بالخصوص معتبر احادیث کو رہنما بنا کر اس کی تکمیل کی ہے اور خصوصیت سے متنازع امور پر بحث کی ہے وہ دونوں مرحلوں 'ماخذات کی تلاش' ان کی جانچ اور مباحث کے ذریعہ اشکال رفع کرنے میں نہایت کامیابی سے گزرے ہیں سوانح نگاری میں پیشرووں کی اندھی تقلید کے برخلاف نئی اور وسیع بنیادوں پر تصنیف کے یہ بڑے جان لیوا مرحلے ہوتے ہیں۔ تبحر علمی' وسیع النظری اور متوازن قوت فیصلہ سے ہی سوانح نگاری کے اہم فرض کو نبھایا جاسکتا ہے جس کا مولانا نے خاطر خواہ ثبوت دیا ہے۔

حضرت علی کی سوانح عمری "المرتضٰی" کی تکمیل میں بھی سید ابوالحسن علی ندوی کو گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ ان کے کہنے کے مطابق

"مجھے اسلامیات کے کتابی ذخیروں میں ایک شدید کمی کا احساس پیدا ہوا اور یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ حضرت سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہ کی مکمل سوانح حیات جو (بقدر امکان) ان کے اہم و مرکزی حقائق و کمالات پر روشنی ڈالتی ہو موجود نہیں ہے۔"

"ایک ایسی اولوالعزم' نادر روزگار' عبقری شخصیت پر قلم اٹھانا آسان نہیں جس کی اصل شخصیت افراط و تفریط اور اختلافات کے پردوں کے پیچھے پوشیدہ ہو اور جس کو ہر فریق نے اپنی عینک سے اپنے افکار و نظریات اور روایتی عقائد کے آئینے میں دیکھا ہو یہاں تک کہ پوری زندگی چند متضاد خیالات و تصورات کا مجموعہ بن گئی ہو اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نام تو ایک ہے مگر شخصیتیں متعدد بلکہ متضاد ہیں اور اصل شخصیت اور اس کی "عبقریت" اب بھی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔" (۴۴)



مولانا ابوالحسن علی ندوی نے حضرت سیدنا علی کی جامع اور مستند سوانح عمری موجود نہ ہونے کا جو گلہ کیا ہے وہ صرف اردو زبان سے مختص نہیں۔ ان کے وسیع مطالعہ کے بموجب دیگر مشرقی زبانوں میں بھی اس کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ وہ مصری ادیب و فاضل عباس محمود العقاد کی "عبقرۃ الامام" کو ایسی واحد کتاب قرار دیتے ہیں جس سے خاطر خواہ رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ "المرتضٰی" جس محنت اور توجہ سے لکھی گئی ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جاسکتا ہے کہ مصنف نے ڈیڑھ سو سے زائد عربی' ایک درجن سے زائد انگریزی اور تقریباً "اسی سے زائد اردو کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور ان سب کے حوالے بالالتزام درج کئے ہیں۔ اتنے وسیع مطالعہ پر مبنی کسی تصنیف کی معلومات اور مباحث کی اہمیت سے انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ یہی کیفیت "چودہ ستارے" (۴۵) کی ہے۔ اس کے مصنف نے قرآن' زبور' توریت' انجیل' تفاسیر' قرآن کے علاوہ پانچ سو عربی کتابوں اور دو درجن دیگر تصانیف کے حوالوں کے ساتھ چہاردہ معصومین کے سوانحی حالات اور ان کی عظمت کے آثار تحقیق کے ذریعہ مرتب کئے ہیں۔

مولانا غلام رسول مہر اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سید احمد شہید (۴۶) کی سوانح عمریاں بھی تحقیق کے پیمانے پر پوری اترتی ہیں۔ مولانا مہر نے برسوں کی عرق ریزی اور جانفشانی سے اپنی تصنیف کے لئے معلومات اکٹھی کیں۔ اس کے لئے انہوں نے پاک و ہند کے کتب خانوں میں محفوظ ذخیرہ کے علاوہ نجی ملکیت میں جو دستاویزات اور قلمی مواد موجود تھا اسے حاصل کیا۔ انہیں ایک ہی غیر مطبوعہ تصانیف کے متعدد نسخوں کا علم ہوا تو ان کا تقابلی مطالعہ بھی کیا۔ بعض نئے ماخذات ان کے علم میں نہ آسکے ان کی مدد سے مولانا ابوالحسن علی ندوی نے سوانح عمری کے بعض گوشے مکمل کئے۔

مولانا ندوی کی مدت تحقیق ۲۰'۲۲ سالوں پر محیط ہے۔ اتنے طویل عرصہ تک ایک ہی موضوع پر مواد اکٹھا کرنے کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملیں گی۔ ان دونوں سوانح نگاروں نے سید صاحب شہید کی ایسی سوانح عمریاں تصنیف کیں کہ ان میں اضافہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

غیر مطبوعہ ماخذات کی تلاش نہایت مشکل اور صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ ایسے مخطوطات صاحب سوانح کے خاندان یا مریدوں کے پاس محفوظ رہتے ہیں۔ وہ انہیں متاع عزیز جانتے ہوئے یہ اہتمام روا رکھتے ہیں کہ کسی کے کانوں میں ان کی بھنک بھی نہ پڑے۔ مالی جائداد کی طرح ان کی حفاظت کرتے اور غیروں کو دکھانے کے روادار بھی نہیں ہوتے۔ اس سلوک نے تحقیق کی راہیں مسدود کردی ہیں۔ اس کے باوجود چند مشکل پسند محققین نے اس مرحلے کو بھی طے کرلیا ہے ان

میں ڈاکٹر حسینی شاہد کا نام خصوصیت سے اہم ہے۔ انہوں نے شاہ امین الدین اعلیٰ (۴۷) کے حالات زندگی، متصوفانہ افکار، مذہبی رجحانات اور خدمات کو پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے موضوع بنایا۔ شاہ امین الدین اعلیٰ دکن کے صوفی بزرگ تھے اور انہوں نے دکھنی کے ابتدائی زمانہ میں اس زبان میں رسالے تحریر کئے تھے۔ ان کی شخصیت ایک صوفی باصفا اور دکھنی کے قدیم ترین مصنف کی حیثیت سے اہم ہے۔ حسینی شاہد کی تحقیقی کاوش سے قبل ان کے بارے میں معلومات محدود بھی تھیں اور غیر مصدقہ بھی۔ صوفیائے کرام کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود ان سے منسوب روایات تو عام ہیں لیکن صحیح حالات پردۂ اخفا میں ہیں۔ حسینی شاہد نے ان کے آثار، احوال، ملفوظات اور تصانیف کی تلاش میں گاؤں میں قائم خانقاہوں کا سفر کیا۔ ان کے خانوادے اور پیرووں کے ہاں محفوظ مخطوطات سے بمشکل استفادہ کی راہ نکالی۔ ایک سے زائد نسخوں کا تقابلی مطالعہ کیا۔ محقق موصوف نے عالم بے سرو سامانی میں ان مراحل کو طے کر کے صحیح اور مستند معلومات حاصل کیں۔ وہ تفصیلی حالات زندگی کی فراہمی میں پوری طرح کامیاب تو نہیں ہوئے لیکن ان کے عہد کا تعین کرنے، ان کے خیالات کا کھوج لگانے اور اس دور کی زبان کے نقوش دریافت کر کے لسانی تجزیہ کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے۔

تاریخی شخصیات کی سوانح عمریاں مرتب کرنا نسبتاً" آسان ہے کیونکہ اہم واقعات قدیم تواریخ میں محفوظ ہیں۔ ان سے عملی زندگی کے بارے میں روشنی ملتی ہے لیکن نجی زندگی زیادہ تر تاریکی میں رہتی ہے جو تاریخی واقعات قلمبند ہوئے ہیں ان میں بھی صداقت کے ساتھ ساتھ روایات وخیل ہیں۔ اس نوع کی سوانح عمریوں میں بھی گوناگوں مشکلات درپیش ہوتی ہیں جیسے واقعات کو صداقت کی کسوٹی پر پرکھنا، صحیح سنین کا تعین کرنا، واقعات کی جزئیات تلاش کرنا، زندگی کا جو پہلو نظرانداز ہوا ہے اس کے بارے میں امام ابوحنیفہ کی فقہی عظمت مسلمہ ہے۔ اسی شعبہ میں ان کے کارناموں سے ایک دنیا واقف ہی نہیں ان پر کاربند بھی ہے۔ ان کا تاریخ میں ایک سیاسی کردار بھی رہا ہے جس سے کم لوگ واقف ہیں۔ امام صاحب نے اپنے دور میں سیاست اور امور سلطنت میں عملاً" حصہ نہیں لیا یہاں تک کہ مسند افتاء پر باوجود شدت اصرار متمکن ہونے سے انکار کر دیا لیکن ان کے پیش نظر اس دور کے تمام سیاسی حالات تھے۔ انہوں نے خصوصیت سے حکومت اور معاشرے کی خامیوں اور کمزوریوں کو تلاش کر کے انہیں دور کرنے کے لئے مستقبل کا جامع منصوبہ مرتب کیا۔ نوجوانوں کی تربیت کا ایسا انتظام کیا کہ وہ عالم باعمل بن کر آئندہ حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکیں۔ ان کی سیاسی بصیرت اور منصوبہ سازی کا



نتیجہ تھا کہ خلافت عباسیہ کے آغاز کے وقت کئی سو افراد پر مشتمل جمعیت تیار ہو چکی تھی۔ خلافت عباسیہ کے نظم و نسق، ترقی کے امکانات اور امن و امان کی بحالی میں حکمرانوں کی کامیابی انہیں تربیت یافتہ افراد کی مرہون منت ہیں۔ علامہ مناظر احسن گیلانی نے اس پہلو کو اپنی تصنیف "حضرت امام حنیفہ کی سیاسی زندگی" میں نہایت مفصل طریقہ سے آشکار کیا ہے اس سے امام صاحب کی زندگی کا ایک اہم پہلو سامنے آگیا ہے۔

اردو میں زیادہ تر ایسی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں جن کے ماخذ روایتی (Convetional) نوعیت کے ہیں۔ اب غیر روایتی (Unconventional) ماخذات اور ذرائع کی جانب بھی توجہ دی جانے لگی ہے جن سے بہتر اور کامیاب سوانح عمریوں کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ صاحب سوانح کے حوالے سے غیر روایتی ماخذات اور ذرائع کی نوعیت بدلتی جا رہی ہے۔

میجر جنرل آغا ابراہیم اکرم نے لشکر اسلام کے مشہور سپہ سالار حضرت خالد بن ولیدؓ کے حالات زندگی "اللہ کی تلوار، خالد بن ولید" (۴۸) میں تحریر کئے ہیں اس کتاب میں عام حالات معلوم کرنے کے لئے پاک و ہند کے کتب خانوں کے علاوہ یورپ، لندن، عراق، شام، اردن، لبنان جا کر وہاں ماخذات سے استفادہ کیا۔ اس روایتی انداز کی تحقیق کے ساتھ چونکہ مصنف خود ماہر فوجی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جنگ میں کامیابی کا انحصار حکمت عملی اور منصوبہ بندی پر ہوتا ہے اسی لئے انہوں نے ان جنگی میدانوں کے تفصیلی معائنے کئے جہاں خالد بن ولیدؓ نے دشمنان اسلام سے معرکہ آرائی کی تھی۔ وہاں کے جغرافیائی حالات معلوم کئے اور کتابوں کے مواد اور جغرافیائی حالات کو مدِ نظر رکھ کر اس حکمت عملی کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے جو صاحب سوانح نے اختیار کی تھی۔ مشرق وسطیٰ کے سفر کے بعد وہ ایسے ۲۹ نقشے تیار کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو ان معرکہ آرائیوں کو سمجھنے میں ممد ہیں۔ جن جزئیات تک عام سوانح نگاری کی نظر نہیں پہنچ سکتی تھی مصنف نے فوجی نقطۂ نظر سے انہیں دریافت اور تحریر کیا ہے۔ ان کا یہ طریقِ عمل غیر روایتی اور لائق تحسین ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح کی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہ ہیں جو ان کے تاریخی سفر، فتوحات اور قیام پاکستان کی کامیابی کی روداد بن کر رہ گئی ہیں۔ ان میں سوانحی عنصر پر تاریخ غالب ہے۔ چند تصانیف ایسی بھی ہیں جو غیر روایتی انداز تحقیق کی وجہ سے جامعیت سے قریب تر ہیں۔ ان میں خصوصیت سے رضوان احمد کی کاوش "قائداعظم، ابتدائی تیس سال" (۴۹) کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ قائد کی سیاسی زندگی تو ایک کھلی کتاب ہے۔ ان کے

سیاست میں آنے سے قبل کے واقعات کی تحقیق کا حق رضوان احمد نے ادا کیا ہے اور یہ کارنامہ بھی غیر روایتی طریق کار سے انجام پایا ہے۔ محقق نے سندھ کے مختلف علاقوں میں مقیم ان بزرگوں کا پتہ چلایا جن سے قائد کے بزرگوں سے کسی نہ کسی نوعیت کے تعلقات تھے اور ہر ایک سے جس قدر معلومات حاصل ہوئیں ان کی دوسرے ذرائع سے توثیق کر کے قلم بند کیا ہے۔ بزرگوں کے وفات پا جانے کی صورت میں ان کی خاندان کے دیگر افراد سے رجوع کیا ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح، محترمہ شیرین بائی تو قائد کی بہنیں تھیں ان کے علاوہ قائد کی ننھیالی رشتہ دار محترمہ زلیخا سید، قائد کے پھوپھا جمال کے برادر حقیقی کے پوتے اکبر علی بھنبھا، جناح پونجا کے دوست نور محمد لالن کے پوتے عاشق علی لالن محقق کے لئے معلومات کا ذریعہ بنے۔ اس مرحلے کو طے کرنے کے لئے مصنف کو کئی مقامات کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ محترمہ زلیخا سید نے انہیں قائد کی ننھیال کا شجرہ فراہم کیا اور محمد علی گھانچی والجی نے ددھیال کا۔ اس طرح قائد کے خاندانی حالات اور ابتدائی دور حیات معلوم کرنے میں کامیابی ہوئی۔ انہوں نے سندھ مدرسہ العلوم کے رجسٹروں میں قائد کے داخلے اور مدرسہ چھوڑنے کے اندراجات بھی تلاش کر لئے ان کے عکسی نقول سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی دیگر دستاویزات برآمد کر کے ۱۹۰۶ء تک کے واقعات مرتب کر دیئے ہیں۔ یہ سب کچھ محقق نے اس ذہنی وابستگی کی بناء پر کیا جو انہیں قائد اور تحریک پاکستان سے تھی۔ اسی لگاؤ نے ان میں سوانحی حالات کے انکشاف کے لئے غیر روایتی ذرائع کی صعوبتیں اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔

قائداعظم کے سوانحی حالات کے بارے میں جی الانہ نے اسی نہج پر کام کیا ہے۔ انہوں نے رضوان احمد کی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے بعض امور سے اختلاف بھی کیا ہے۔ ان کی معلومات کے ذرائع بھی شخصی ہیں۔ بھال جی بھائی پیر جی پنیلی والا، ان کی بیوی موتی بائی فاطمہ بائی گانجی والی اور کریم قاسم کے بیانات کا اضافہ بھی کیا ہے۔ جی الانہ کی تصنیف انگریزی میں ہے۔ اس کا ترجمہ اردو سوانح عمریوں کے سرمایہ میں گران قدر اضافہ ہے۔

قائداعظم کی سوانح عمریوں کی طرح علامہ اقبال کے بارے میں بھی ذوق تحقیق اپنی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ علامہ کی شخصیت ایک ہے لیکن ان کے حال، احوال اور سیرت و کردار کو دریافت کرنے اور پیش کرنے کے طریقے جدا جدا ہیں۔ ان میں سے چند تحقیقی نوعیت کی کاوشیں ہیں، چند ذاتی مشاہدات و تجربات پر منحصر ہیں اور چند تاثراتی ہیں۔ کسی نے پوری زندگی کا احاطہ کیا ہے اور کسی نے خاص پہلو تک معلومات کو محدود رکھا ہے۔ ان میں سے بیشتر نے اپنے متعینہ مقصد



سے انصاف کیا ہے۔ "اقبال کامل" (مطبوعہ ۱۹۳۸ء)(۵۰) میں عبدالسلام ندوی نے کلام کی روشنی میں شخصیت کا کھوج لگانے کی سعی کی ہے۔ "ذکر اقبال" (مطبوعہ ۱۹۵۵ء) (۵۱) میں عبدالمجید سالک نے شخصی مشاہدات کو اہمیت دی ہے اور ایسی چھوٹی جزئیات کا انکشاف کیا ہے جو علامہ سے قربت خاص رکھنے والے کے لئے ہی ممکن تھا۔ "روزگار فقیر" (مطبوعہ ۱۹۶۳ء) (۵۲) کا بڑا حصہ فقیر سید وحید الدین کی شخصی معلومات اور علامہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات کی شہادتوں پر مبنی ہے۔ ان دونوں تصانیف میں سوانح نگاری سے زیادہ شخصیت نگاری کا عنصر غالب ہے۔ "اقبال درون خانہ" (مطبوعہ ۱۹۶۹ء) (۵۳) میں علامہ کے محب خاص خالد نظیر صوفی نے نجی زندگی کو موضوع بنایا ہے جس میں روزمرہ کے معمولات، مشاغل، مصروفیات پر خاص توجہ دی ہے۔ یہ بھی مصنف کی ذاتی معلومات کی حامل ہیں اور جزوی سوانح نگاری کا فرض ادا کرتے ہوئے اہم پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی کتاب "اقبال کی صحبت میں" (مطبوعہ ۱۹۷۷ء) (۵۴) کو بھی اسی نوع کی ذاتی معلومات پر مبنی تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے۔

ان کاوشوں نے سوانح نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے اور شخصی معلومات کی اہمیت کو واضح کیا ہے جن مصنفین کا سطور بالا میں ذکر ہوا ہے وہ سب معتبر روای ہیں اور ان میں کسی کی نیت پر شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے ان کی پیش کردہ مواد کو معتبر اور مستند تسلیم کرنا پڑے گا۔ برصغیر کی کم شخصیات ہیں جن کے بارے میں اس نوع کا تصنیفی کام ہوا ہے۔ اس نئی روایت کے شروع کرنے والوں نے اردو سوانح نگاری کے باب میں راہیں کھول دی ہیں جنہیں کھلا رہنا چاہئے۔

موجودہ صدی میں تحریری ذرائع ابلاغ کی اہمیت سے انکار تو نہیں کیا جاتا لیکن ان سے استفادہ کا رجحان پیدا نہیں ہوا ہے۔ اخبارات اور رسائل میں سوانح عمریوں کے حوالے سے گراں قدر معلومات شائع ہوتی رہی ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کے مکمل فائل محفوظ نہیں یا محقق کی دسترس میں نہیں۔ بہت کم سوانح نگاروں نے ان مخفی خزانوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ علامہ اقبال کے واقعات زندگی کے حوالے سے محمد حمزہ فاروقی نے "حیات اقبال کے چند مخفی گوشے" (مطبوعہ ۱۹۸۸ء)(۵۵) کے نام سے جو کتاب مرتب کی ہے وہ اخبار "انقلاب" لاہور میں شائع ہونے والی خبروں، اداریوں، مضامین وغیرہ پر مشتمل ہے جس میں اہم اور غیر اہم ہر نوع کی معلومات شامل ہیں۔

علامہ اقبال کی سوانح عمریوں میں سب سے ممتاز "زندہ رود" (۵۶) ہے۔ جس میں علامہ کے

لائق اور فاضل صاحبزادے جاوید اقبال نے ایک فرزند کا نہیں بلکہ محقق اور سوانح نگار کا فرض ادا کرتے ہوئے دقت نظر سے کام لیا ہے۔ ان کے پیش نظر وہ تمام مواد موجود رہا جو ۱۹۷۹ء تک طبع ہو چکا تھا۔ اس میں کتب کے علاوہ مضامین اور اشخاص کے بیانات بھی شامل ہیں۔ جاوید اقبال نے حقائق کی دریافت اور ان کا مطبوعہ مواد سے موازنہ کرکے زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے واقعہ پر حرف آخر کے طور پر اپنی رائے دی ہے۔ اس "ہمہ جوئی" میں انہوں نے بعض ایسے مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا ہے جن کا براہ راست حیات اقبال سے تعلق نہیں بنتا۔ اسی وجہ سے بعض پر وہ اکتا دینے والی طوالت کے شکار بھی ہو گئے ہیں۔ مثلاً "علامہ کے اجداد کے بارے میں بیان کیا ہے کہ ان کی گوت سپرو تھی لیکن سپرو کی اصل کیا ہے اور کن حالات میں ان کے بزرگوں نے کشمیر سے ترک وطن کیا اور کن اثرات کے تحت اسلام قبول کیا۔ اس کی وہ تحقیق نہ کر سکے۔ لیکن انہوں نے یہ ضرور کیا ہے کہ ان لاینحل امور کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا انہیں یکجا کرکے ان میں پائے جانے والے اختلافات کی نشاندہی کر دی ہے۔ ایک انصاف پسند مصنف کی حیثیت سے جن امور کے بارے میں وہ رائے قائم نہ کر سکے اس کا اعتراف بھی کر دیا ہے۔ عام طور پر مصنفین ایسا نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ غلط یا صحیح رائے قائم کرنے اور اس پر اصرار کرنے کا حق انہیں حاصل ہے۔ جاوید اقبال نے اپنے عجز سے اپنی بڑائی تسلیم کروالی ہے۔ "زندہ رود" کو معلومات' ان کی جزئیات اور واقعات میں اختلاف اور ان کے تجزیے پر مبنی تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے تحقیق سوانح نگاری میں جاوید اقبال نے ایک وکیل اور ایک جج کی طرح قدم قدم پر ماخذات کے حوالہ سے مباحث شروع کئے ہیں۔ رد و قدح بحث و تمحیص اور جرح کے ذریعہ ان پر صداقت یا استرداد کی مہریں لگائی ہیں۔ مواد پر اتنی گہری نظر ڈال کر تصنیف کا حق ادا کرنا اردو سوانح نگاری میں ایک روشن مثال ہے۔ ممکن ہے ان کے بعض نکات سے اختلاف کیا جائے لیکن ان کی مشقت' دیدہ ریزی اور ذوق تحقیق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ "زندہ رود" سنجیدہ مزاج قاری کے لئے ایک عمدہ کاوش ہے جبکہ سطحی مطالعہ کرنے والوں کے لئے اس میں شاید کوئی جاذبیت نظر نہ آئے۔

اردو کے سوانح نگاروں نے صاحب سوانح کے بارے میں معلومات کے حصول کا ذریعہ خود صاحب سوانح کی تحریروں کو ہی بنایا ہے۔ خصوصاً "ادیبوں اور شاعروں کے حالات زندگی کا کھوج ان کی تحریروں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مثنویوں' قطعات میں ان کی ذات کے حوالے سے کوئی نہ کوئی اہم بات نادانستہ طور پر ظاہر ہو جاتی ہے جو صاحب نظر محقق کے کام آتی ہے۔ نثر



نگاروں کے مضامین میں بھی ذاتی اشارے مل جاتے ہیں لیکن زیادہ اہم خطوط ہیں۔ انہیں تحریر کرتے ہوئے کم گمان کیا جاتا ہے کہ وہ کبھی منظر عام پر بھی آئیں گے اس لئے جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ صداقت پر مبنی اور ہر نوع کے تصنع سے آزاد ہوتا ہے۔ اب مشاہیر کے خطوط کی اہمیت کو تسلیم کیا جا چکا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ خطوط حاصل کرکے منظر عام پر لائے جائیں۔ ان کی حیثیت "تبرکات" کی ہی نہیں ہے بلکہ وہ حالات زندگی کے مخفی گوشوں کے اظہار' ذہن کے حصار میں محفوظ خیالات اور شخصیت کے ان دیکھے پہلوؤں کے انکشافات کے سبب بن رہے ہیں خطوط کی مدد سے سوانح نگاری کی ابتدا غلام رسول مہر نے "غالب" (۵۷) سے کی چنانچہ عبدالمجید سالک نے اس طرز کی "ایجاد" کا سہرا انہیں کے سر باندھا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا

"مہر صاحب نے سوانح عمری کی ایک تیسری قسم ایجاد کی ہے کہ صاحب سوانح کے کلام نظم و نثر اور اس کی نجی تحریروں سے ان کے حالات زندگی فراہم کئے ہیں جن کی صداقت سے کوئی دوسرا تو در کنار خود صاحب سوانح بھی انکار نہیں کر سکتا۔" (۵۸)

قاضی عبدالغفار نے "آثار ابوالکلام آزاد" (۵۹) میں اسی طریقے کو اپنایا ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ "نقش اول" صاحب سوانح کے سیاسی و علمی مشاغل کی روداد ہے جو ان کی اپنی تحریروں کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد کی تصانیف "تذکرہ" اور "غبار خاطر" سے خاطر خواہ مدد لی گئی ہے۔ ان ماخذ کے حوالے درج کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ صاحب سوانح کے بیانات کو مصنف نے اپنا کر اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ "آثار ابوالکلام" "آزاد" ایک اچھا اور کامیاب تجربہ ہے لیکن مصنف نے ماخذات کی حد بندی کرکے معلومات کے دائرے کو محدود کر دیا ہے۔ اسی کتاب کے "نقش ثانی" میں صاحب سوانح کی شخصیت کو موضوع بنا کر کردار' مزاج' احساس اور جذبوں کے ذریعہ ان کے باطن میں جھانکنے کا فرض ادا کیا ہے۔ یہ حصہ بھی تحریروں تک محدود ہونے کی بناء پر تشنگی کا شکار رہا۔ اگر دیگر معروف ماخذات کا بھی سہارا لیا جاتا تو سوانح عمری اور شخصیت کی تکمیل بہتر طور پر ہو سکتی تھی۔

ہنس راج رہبر نے پریم چند کے افسانوں میں ان کی زندگی کی جھلکیوں کو تلاش کیا ہے۔ (۶۰) پریم چند جدید اردو افسانہ کے بانی تھے۔ ان کے افسانوں کو نمائندہ حیثیت حاصل رہی اور وہی اس فن کی آبرو ہونے کے علاوہ دوسروں کی ترجمانی کرنے کے بجائے انہوں نے اپنے ذاتی حالات کو موضوع بنایا ہے۔ ہنس راج نے سوانح نگاری کا یہ نیا تجربہ کیا کہ جو واقعات شیورانی دیوی یا دیگر ذرائع سے معلوم ہوئے یا مصنف کی اپنی تحقیق کا نتیجہ تھے۔ ان کی مطابقت افسانوں

میں بیان کردہ واقعات سے کی ہے۔ اس عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان افسانوں میں پریم چند کُلی یا جزوی طور پر خود موجود ہیں۔ اور اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ سچا فن کار وہی ہے جو زندگی کے تجربوں کو اپنے انداز میں زمانہ کو لوٹا دیتا ہے۔ ہنس راج کی تصنیف میں سوانح عمری اور افسانوں کی خصوصیات ساتھ ساتھ بیان ہوئی ہیں۔

سعادت یار خاں رنگین کی سوانح عمری (۶۱) مرتب کرنے کے لئے ڈاکٹر صابر علی خان نے تذکروں اور ما قبل کی تحریروں پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ کلام رنگین کی داخلی شہادتوں کو زیادہ معتبر خیال کرتے ہوئے ان کی تصانیف اردو' فارسی کے دیباچوں' دیوان' مثنویوں' منظومات' قطعات تاریخ' منظوم مکتوبات سے معلومات حاصل کی ہیں۔ مصنف کو ان ہی کی تحریروں کی مدد سے خاندانی حالات' بہن بھائیوں کے نام' بچپن کے احوال' تعلیم و تربیت کی تفصیلات' مشاغل سیرو تفریح' شادی بیاہ' آل اولاد' احباب اور متعلقین کا علم ہوا ہے۔ عام حالات کے علاوہ نظروں سے چھپے رہنے والے واقعات کے بارے میں واقفیت حاصل ہوتی ہے جن کو اشعار میں تو بیان کیا جا سکتا ہے لیکن نثر میں لکھے جائیں تو معیوب سمجھا جائے مثلاً" رنگین کے طوائفوں سے تعلقات کا حال' ان کے کلام سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ وہ یار باش' خوش طبع اور سیرو تفریح کے رسیا ہونے کے ساتھ سپاہیانہ شان بھی رکھتے تھے۔ فنون حرب و ضرب سے خوب واقف تھے۔ ان کی شاعری اور لغت نویسی غماز ہے کہ وہ کثیر اللسان تھے۔ اردو' فارسی' عربی' پنجابی' برج پوربی زبانوں پر کامل قدرت رکھتے تھے۔

اسی طریق تحقیق پر کلب علی خاں فائق رامپوری نے کاربند رہ کر مومن کی سوانح عمری مرتب کی ہے۔ انہوں نے مومن کی غزلوں' مثنویوں اور فارسی خطوط سے ان کے سوانحی حالات' ذہنی رجحانات' مذہبی معتقدات کا پتا چلایا ہے خصوصاً" مومن کے معاشقوں اور مذہبی خیالات کی تمام گتھیاں ان کے کلام کی وجہ سے سلجھ جاتی ہیں۔

پروفیسر ممتاز حسین نے امیر خسرو (۶۲) کے حالات زندگی زیادہ تر ان کی تصانیف سے اخذ کئے ہیں اور دیگر ماخذات سے ان کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ امیر خسرو کی چھوڑی ہوئی شہادتوں کو مستند تسلیم کرتے ہوئے متعدد روایات کو مسترد کر دیا ہے۔

اردو کے قدیم شاعروں اور ادیبوں نے بھی خود نوشت سوانح عمریاں تحریر نہیں کی ہیں۔ اگر کی بھی ہیں تو فارسی میں اس خصوص میں "ذکر میر" اور "دیباچہ منتخب دیوانہا" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ میر تقی میر نے ذکر میر میں اور منتخب دیوانہا کے دیباچہ میں سراج اورنگ آبادی نے اپنے



اپنے حالات زندگی فارسی میں لکھے ہیں۔ موجودہ دور کی افتاد طبع فارسی سے عدم رغبت کی غماز ہے اس لئے ان کے اصل متن سے کماحقہ' استفادہ کا امکان نہیں۔ یہ دونوں خود نوشت مختصر بھی ہیں اور غیر مکمل بھی۔ انہیں بنیاد بنا کر مزید تحقیق کے ذریعہ جامع سوانح عمریاں مرتب کرنے کا فرض بالترتیب نثار احمد فاروقی (۶۳) اور شفقت رضوی (۶۴) نے ادا کیا ہے۔ البتہ نساخ کی خود نوشت سوانح عمری اردو میں ہے۔ نساخ سرزمین بنگال کے شاعر تھے اس سرزمین نے اردو کی نشوونما اور ترقی میں جو اہم کردار ادا کیا ہے اس کا اعتراف تا حال نہیں کیا گیا اس سے اس سرزمین کے اہم شاعروں اور ادیبوں سے اردو دان طبقہ واقف نہ ہو سکا۔ قیام پاکستان کے بعد اس خطۂ ارضی کی اہمیت بڑھ گئی اور وہاں کی شعری و ادبی روایات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی تو نساخ جیسے بلند پایہ اور منفرد انداز کے شاعر کے حالات زندگی کی تحقیق کا فرض صدر الحق نے انجام دیا۔ وہی نساخ کی خود نوشت کو متعارف کروانے میں کامیاب ہوئے (۶۵) جو مدتوں سے ایشیا تک سوسائٹی (بنگال) میں موجود تھی۔ اس کا واحد قلمی نسخہ ناقص ہے جو معلومات اس میں درج ہیں وہ سوانحی ضرورتوں اور فنی تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں۔ ان کی نوعیت یادداشتوں کی ہے جو مستند ہیں اور سوانح نگار کو بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ عبادت بریلوی نے لندن اور فرانس کے کتب خانوں میں مخزونہ قدیم مخطوطات میں حیدر بخش حیدری کی لکھی ہوئی مختصر کہانیاں اور ان کا مرتبہ دیوان دریافت کئے اب تک حیدر بخش حیدری کے بارے میں جو کچھ لکھا جاتا تھا قیاس پر مبنی تھا۔ ان دو مخطوطات خصوصاً" دیوان میں بکثرت سوانحی اشارے موجود ہیں۔ ان سے رہنمائی حاصل کر کے عبادت بریلوی نے حیدری کی سوانح عمری مرتب کرنے کی سعی کی ہے جو اگرچہ مکمل نہیں ہے لیکن جس حد تک معلومات کی فراہمی ممکن ہو سکی مستند ضرور ہے۔

غالب کے بکثرت خطوط برآمد ہوئے ہیں۔ ان میں اکثر و بیشتر مواقع پر غالب نے اپنے اجداد' خاندان اور اپنی نجی زندگی کی تفصیلات لکھی ہیں۔ انہیں کی مدد سے حفیظ عباسی نے "کہانی میری' زبانی میری" (مطبوعہ ۱۹۶۷ء) (۶۶) شفیع الدین نیر نے "غالب کی کہانی" (مطبوعہ ۱۹۶۸ء) (۶۷)' نثار احمد فاروقی نے "غالب کی آپ بیتی" (مطبوعہ ۱۹۶۹ء) (۶۸)' اختر صدیقی نے "غالب اپنے آئینہ میں" (مطبوعہ ۱۹۷۰ء) (۶۹) اس طرح مرتب کی ہیں کہ وہ غالب کی خود نوشت سوانح عمریاں بن گئی ہیں ان کے علاوہ جس مصنف نے بھی غالب پر قلم اٹھایا ہے ان خطوط سے ضرور استفادہ کیا ہے۔

سوانح نگار کا صاحب سوانح سے ربط ضبط رہا ہو۔ طویل عرصہ تک قربت اور تبادلۂ خیالات

کے مواقع حاصل رہے ہوں اور اس کے دل میں واقعات و حالات معلوم کرنے کا تجسس بھی رہا ہو تو سوانح نگاری کے لئے بے حد مد ثابت ہوتا ہے جو تعلق جانسن سے باسول کا رہا ایسی مثالیں شاذ و نادر ملیں گی۔ اردو میں چند سوانح عمریاں ایسی بھی ہیں جو شخصی معلومات کی بناء پر تحریر کی گئیں ان میں عبدالماجد دریا بادی کی "حکیم الامت' نقوش و تاثرات" (مطبوعہ ۱۹۵۲ء) (۷۰) کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی کی "ذکر آزاد" (مطبوعہ ۱۹۶۰ء) (۷۱) محمود علی خاں جامعی کی "تذکرۂ جگر" (مطبوعہ ۱۹۷۱ء) (۷۲) محمد جمال اشرف کی "حیات امجد" (مطبوعہ ۱۹۷۱ء) (۷۳) کا بھی اسی کی ذیل میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ شاہ معین الدین ندوی "حیات سلیمان" میں جزوی طور پر اس طریق پر کاربند رہے ہیں۔ ان سب کی معلومات کا قابل لحاظ حصہ شخصی تعلق کا رہین منت ہے۔ صالحہ عابد حسین تو الطاف حسین حالی سے معلومات اخذ کرنے کے مواقع حاصل نہیں ہوئے لیکن خاندان کے وہ تمام افراد جن کا حالی سے رات دن ربط ضبط رہا ان کی معلومات کے ذریعے بنے۔ ان کی حیثیت بھی براہ راست حاصل ہونے والے مواد سے کم استناد کی حامل نہیں ہیں۔ ان حوالوں سے کہا جا سکتا ہے کہ شخصی تعلق کی بناء پر حاصل معلومات کے سہارے جو تصنیف تکمیل پاتی ہے وہ سوانح عمری کی نسبت شخصیت نگاری میں زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔

کامیاب سوانح نگاری کے لئے تحقیق کے عمل سے گزرنے کے لئے بڑے صبر و ضبط و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقی محقق وہی ہے جو اپنی پہلی ہی تحریر کو حرف آخر نہیں گردانتا بلکہ ہر دم معلومات کی فراہمی میں کوشاں رہتا ہے اور وہ ابتدائی خام مواد کو شائع بھی کروا دیتا ہے تو اپنی تحقیقی کاوشوں کی راہیں بند نہیں کر دیتا بلکہ خود اپنی جستجو اور دوسروں کی نشاندہی پر معلومات میں اضافہ ہی کرتا رہتا ہے۔ ادیب اور محقق اپنے ذہن کے دریچوں کو وا رکھتا ہے جب اس کی خامیوں' کمزوریوں اور غلطیوں کی طرف متوجہ کروایا جاتا ہے تو انا کا مسئلہ بنا کر اپنی رائے پر سختی سے قائم نہیں رہتا بلکہ اس میں شواہد کی روشنی میں ترمیم کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ اپنی کاوشوں اور دوسروں کی رہنمائی سے ہی تحقیق کا کام آگے بڑھتا ہے یہ عمل کسی مرحلے پر بھی جامد نہیں ہوتا۔ تحقیق ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ اس بارے میں غالب کے سوانحی حالات کے حوالہ سے مالک رام کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ "ذکر غالب" مالک رام کا مختصر سا رسالہ تھا جو چھوٹی تقطیع کے ۱۰۴ صفحات پر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ مالک رام نے اس کے پرانے ایڈیشن میں ترمیم و اضافہ کے عمل کو جاری رکھا۔ ۱۹۷۶ء میں جو ایڈیشن شائع ہوا اس کی ضخامت ۲۷۹ صفحات ہے۔ یہی حال ان کی دوسری تصنیف "تلامذۂ غالب" کا ہے جو پہلے انجمن ترقی اردو کے رسالہ "اردو ادب" میں بالاقساط چھپا۔ ۱۹۵۸ء میں جالندھر سے کتابی صورت میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس کے بعد بھی تقریباً پچیس برس مالک رام اس موضوع پر کام کرتے رہے اور غالب کے شاگردوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر کے ۱۹۸۴ء میں جو ایڈیشن شائع کیا وہ ۵۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلی اور اس اشاعت میں بڑا فرق ہے۔ انہوں نے اغلاط کی تصحیح کی ہے۔ شعراء کے حالات زندگی میں اضافے کئے ہیں۔ چند شعراء کو تلامذہ غالب کی فہرست سے خارج کیا ہے اور جدید تحقیق کی روشنی میں چند نئے شاگردوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔



اکثر مصنفین اپنی سوانحی تصانیف کی مقبولیت کے سہارے ان کے نئے نئے ایڈیشن شائع کرتے ہیں لیکن ان میں کوئی اضافہ نہیں کرتے تحقیق کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے اور گویا اپنے علم کے جامد ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ ادبی بد دیانتی ہے کہ اغلاط کی نشاندہی کے باوجود اگلے ایڈیشن میں ترمیم نہ کی جائے یا اغلاط کا مبنی بر حقیقت نہ ہونا ثابت نہ کیا جائے۔

موجودہ دور میں صاحب سوانح کے حالات و واقعات زندگی کو مرتب کر لینا ہی کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ بھی اہم اور لازمی تصور کیا جاتا ہے کہ صاحب سوانح کی ذات کے اندر کا بھی کھوج لگایا جائے۔ اس کے جذبات و احساسات' افکار و خیالات اور باطنی کیفیات تک رسائی حاصل کی جائے اس کے لئے ایک ماہر نفسیات کی طرح صاحب سوانح کے عمل اور واقعات پر رد عمل کی شہادتیں جمع کر کے ان کا تجزیہ کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس جانب خاطر خواہ توجہ دینے کا رجحان پیدا نہیں ہوا ہے۔ حکیم الامت' نقوش و تاثرات" اور "آثار ابوالکلام آزاد" میں خصوصیت سے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسی مثالیں سوانحی کتب میں کم ہیں جبکہ خاکہ نگاری میں اس کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔

فرد محض اپنی زندگی نہیں گزارتا وہ ایک معاشرہ میں سانس لیتا ہے اس لئے بہت کچھ معاشرے سے حاصل کرتا اور کچھ معاشرے کو دیتا ہے۔ ماں' باپ' بہن' بھائی' اساتذہ' گھریلو ماحول' معاشرہ کی عمومی روایات' فرد کی شخصیت کی صورت گری میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ فرد کا مطالعہ اس کے ماحول کے تناظر میں کیا جائے۔ سوانح نگاری کے لئے معلومات کی فراہمی کے ساتھ ان کے بارے میں بھی مواد کا جمع کرنا لازمی ہوتا ہے۔ واقعات زندگی کو ان سے مربوط کر کے پیش کرنے سے ہی سوانح نگاری کا حق ادا ہوتا ہے۔ اس جانب اردو کے سوانح نگاروں نے توجہ ضرور کی ہے لیکن جس گہرائی اور گیرائی کے ساتھ کام لیا جانا چاہئے اس کا حق شاذ و نادر ہی ادا ہوا ہے۔ جامعاتی مقالوں میں یہ ایک روایت بن چکی ہے

کہ ایک باب علمی' ادبی' معاشرتی یا سیاسی پس منظر کے لئے وقف رکھا جاتا ہے۔ یہ سوانح عمری سے جداگانہ ایک باب بن جاتا ہے اور سوانحی واقعات بیان کرتے ہوئے ان سے ربط دینے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

سوانح نگار بیک وقت بطور محقق واقعات زندگی یکجا کرتا ہے۔ ماہر سماجیات و نفسیات بن کرماحول اور حالات کے تناظر میں صاحب سوانح کے کردار' رجحان' جذبات' احساسات کو سمجھتا ہے اور اس کی شخصیت پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا پتا چلا کر وہ خام مال تیار کرتا ہے جو تحریر کے لئے ضروری ہے ہمارے بیشتر سوانح نگاروں نے اس فرض کو سمجھا اور نبھایا ہے۔ تحقیق کے دوران صاحب سوانح کی خوبیوں اور کارناموں کے ساتھ اس کی خامیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ منصف مزاج سوانح نگار انہیں نظر انداز نہیں کرتا بلکہ اپنی فراہم کردہ معلومات کا لازمی جزو قرار دے کر ان کے تذکرے کو سوانح کا حصہ بنا کر سوانح نگاری کا حق ادا کرتا ہے۔

## سوانح نگاری کا اسلوب

کسی شخصیت سے ذہنی یا جذباتی لگاؤ کے بناء پر سوانح نگار اس کے حالات زندگی تلاش و جستجو سے فراہم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس خام مواد کی ترتیب و تشکیل کا نازک اور پیچیدہ مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔ اس مرحلہ پر سوانح نگار اپنی فکر و دانش' ضبط و احتیاط کے ساتھ فنی لوازمات کا خیال رکھتے ہوئے جس تحریری عمل سے گزرتا ہے اس کے لئے علمی قابلیت کافی نہیں ہوتی۔ وہ واقعات کو تاریخی ترتیب میں پیش کر کے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ کام ایک سوانح نگار کا نہیں مورخ کا ہوتا ہے۔ سوانح نگار ایک تحقیقی عمل سے گزرتا ہے وہ ایک شخصیت کی تعمیر نو کرتا ہے۔ اس کے لئے سوانح نگار کا صاحب نظر ہونا ضروری ہے تاکہ وہ واقعات میں انسانیت کی عظیم قدروں کو تلاش کر کے ان کی باز آفرینی کا قرض ادا کر سکے۔ اس کو ہیرہ تراشنے کے عمل سے تشبیہ دی جا سکتی ہے یہ فن کاری بذات خود ایک مقصد بھی ہے اور دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ بھی! دوسرا مقصد پڑھنے والوں کے لئے بصیرت فراہم کرنا ہوتا ہے اس لئے حالی نے لکھا ہے کہ

"بیوگرافی ان بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنھوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں اور جو انسان کی آئندہ نسلوں کے لئے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے ہیں خصوصاً "جو قومیں علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزلی کے درجہ کو پہنچ جاتی ہیں ان کے لئے بیوگرافی ایک تازیانہ ہے جو ان کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے" (۴۷)



اس طرح سوانح نگاری کے یہ مقاصد متعین کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ موضوع کی خارجی زندگی کی پیشکش اور داخلی شخصیت کی دریافت
۲۔ ہر نوع کے کارناموں کو اجاگر کرنا
۳۔ شخصیت اور سیرت کو اس طرح بیان کرنا کہ ان سے بصیرت حاصل ہو

ان مقاصد کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب حاصل شدہ معلومات استناد کی کسوٹی پر پوری اترتی ہوں۔ آزادی سے قبل لکھی جانے والی سوانح عمریوں کا مواد اس بناء پر شک و شبہ سے بالا تر سمجھا جاتا تھا کہ لکھنے والوں کی صداقت پسندی مسلمہ ہوتی تھی۔ اس لئے ان کی تحریروں پر تعرض یا تنقید سے گریز کیا جاتا۔ وقت کے ساتھ قدریں بدلتی جاتی ہیں آج نقاد لکھنے والوں کو اہمیت نہیں دیتے جو کچھ لکھا گیا اس کی سچائی کو جانچتے ہیں۔ اس لئے یہ فن کا تقاضا بن گیا ہے جو واقعہ بھی بیان کیا جائے اس کی سند ضرور پیش کی جائے۔ چنانچہ آزادی کے بعد کے سوانح نگار ہر ایسے واقعہ کے لئے جس کی صداقت پر شبہ کرنے کی گنجائش موجود ہو ذریعہ معلومات کا حوالہ ضرور دیتے ہیں اس سے جہاں ان کے بیان میں وزن پیدا ہوتا ہے وہیں اس کی سچائی کی ذمہ داری' ذریعہ یا ماخذ پر عائد ہو جاتی ہے پہلے شائع شدہ مواد کو مستند باور کیا جاتا تھا۔ شخصی معلومات کو حرف آخر کا درجہ دیا جاتا لیکن جیسے جیسے ذوق تحقیق میں ترقی ہو رہی ہے انہیں بھی جانچا جا رہا ہے۔ نظیر صوفی کو علامہ اقبال سے خاص قرب حاصل تھا۔ ان کی بیشتر معلومات کو درست تسلیم کیا جاتا ہے ان کے فرزند خالد نظیر صوفی نے ان سے حاصل شدہ معلومات پر مبنی "اقبال درون خانہ" تصنیف کی جس میں انہوں نے میونسپلٹی سیالکوٹ کے رجسٹر پیدائش و اموات کے حوالہ سے علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء لکھی ہے۔ شیخ اعجاز احمد نے "مظلوم اقبال" اور جاوید اقبال نے "زندہ رود" میں دلائل و شواہد کے ساتھ اس کو مسترد کر دیا ہے۔ جدید اصول تحقیق و سوانح نگاری میں استناد کو بے حد اہمیت دی جاتی ہے۔ اس بات کا رضوان احمد نے اپنی تصنیف "قائد اعظم' ابتدائی تیس سال" میں خصوصیت سے خیال رکھا ہے۔ قائد اعظم کی زندگی کے ابتدائی ایام کے بارے میں ان کے خاندان کے افراد اور خاندان کو جاننے والوں سے براہ راست معلومات حاصل کی ہیں اور ہر بات کے لئے حوالہ دیا ہے کہ کس ذریعہ سے معلوم ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ عدالتی کارروائی' اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں اور سندھ مدرسہ کے رجسٹر داخلہ کے اندراجات پر ہی انحصار نہیں کیا بلکہ ان کا عکس شائع کر کے صداقتوں کو ناقابل تردید قرار دے دیا ہے۔ جہاں تحقیق اور احتیاط کا یہ عالم ہے وہاں اس کے برخلاف بھی

تصانیف منظر عام پر آئی ہیں جس کی وجہ سے معلومات چاہے کتنی ہی صحیح کیوں نہ بیان کی گئی ہوں شک و شبہ سے بالا تر نہیں ہوتیں۔ اس کتاب کی مثال میں اشتیاق اظہر کی تصنیف "سید الاحرار" کو پیش کیا جا سکتا ہے ساڑھے چار سو صفحات سے زائد کی اس کتاب کا ایک تہائی حصہ حوالوں پر مشتمل ہے۔ مصنف کی بے احتیاطی کا یہ عالم ہے کہ کسی حوالہ کے ساتھ اصل ماخذ کا حوالہ موجود نہیں ہے اسی لئے کتاب "سید الاحرار" معلومات کا ذخیرہ ہونے کے باوجود اعتبار سے ساقط ہے۔ جہاں تحقیق اور سوانح نگاری کے اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے ایسی مستند تصانیف شائع ہوئی ہیں جن کا شمار ادب عالیہ میں کیا جا سکتا ہے وہاں اصولوں کی پابندی نہ کرنے کے باعث تصنیف کے معیار کم تر درجے کی سوانح عمریوں کی بھی کمی نہیں۔

اصول تحقیق اور سوانح نگاری میں یہ بھی شامل ہے کہ جب کسی شخصیت پر قلم اٹھایا جائے تو ما قبل شائع شدہ مواد لازما "پیش نظر رہے۔ اپنی حاصل کردہ معلومات اور قائم کردہ نظریہ کو پیش کرتے ہوئے سابقہ شائع مواد سے اتفاق یا اختلاف کی وجوہ ضرور بیان کی جائیں۔ ایسے اہل علم جو سنجیدگی سے علم و ادب کی خدمت کرتے ہیں اس کا لحاظ ضرور رکھتے ہیں علامہ شبلی نعمانی، مولانا سید سلمان ندوی سے لے کر شیخ محمد اکرام اور سید ابوالحسن علی ندوی تک نے اس کا لحاظ رکھا ہے لیکن غیر محتاط رویہ اختیار کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ مولانا حسرت موہانی کی زندگی میں ان کے بارے میں شائع ہونے والے اہم ماخذات یہ ہیں۔

۱۔ حالات حسرت از عارف ہنسوی، شائع کردہ انجمن اعانت نظر بندان اسلام دہلی ۱۳۲۷ھ

۲۔ (ترجمہ و تعارف از رحم علی الہاشمی) شائع شدہ ۱۹۲۲ء

English translation Of Selected Poems Of

Moulana Syed Fazalul - Hasan Hasrat Mohani

۳۔ تذکرہ "اوراق گل" مرتبہ ضمیر احمد قریشی۔ رامپور ۱۹۴۴ء

۴۔ حسرت موہانی از عبدالشکور۔ آگرہ ۱۹۴۶ء

پہلے تین ماخذات میں حسرت موہانی کا سال ولادت ۱۲۹۸ھ بتایا گیا ہے۔ چوتھے ماخذ میں ۱۲۹۵ھ بیان کیا ہے اس اختلاف کی صورت میں مصنف پر ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے بیان کی صداقت ثابت کرنے اور ما قبل بیان کئے گئے سال کو مسترد کرنے کی وجوہ بیان کرتے لیکن انہوں نے ایسا نہ کرکے اپنی تصنیف کی قدر و قیمت کم کر دی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کتاب میں (صفحہ ۱۰۶) پر لکھتے ہیں کہ "حسرت موہانی کی عمر تقریبا" ۶۵ سال کی ہے" حالانکہ ان کے بیان کردہ سنہ کے



اعتبار سے عمر ۶۷ سال ہونی چاہئے۔

یہی رویہ پاک و ہند کے معروف محققین اور مورخین نے بھی اپنایا ہے اور عارف ہنسوی، رحم الہاشمی اور ضمیر احمد قریشی کے بیان کردہ سال پیدائش کو بالوجوہ مسترد کئے بغیر ۱۸۷۵ء کو سال ولادت قرار دیا ہے۔ ان صاحبان علم میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر سید اعجاز حسین اور پروفیسر احتشام حسین شامل ہیں۔ جن کی تصانیف و تالیفات کو پاک و ہند کی جامعات کے نصاب میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس متنازع مسئلہ کو احمر لاری نے اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالہ میں حل کرنے کے لئے ایک معتبر راوی سے استفادہ کیا ہے ور ۱۸۸۱ء کو حسرت کا سال پیدائش قرار دیا ہے۔ اس امر میں ان کے مباحث معروضی اور قابل اطمینان ہیں سوانح نگاری کے تقاضوں کے مطابق ان کی پہنچ (Aproch) درست ہے اس کے بعد بھی یہ ستم ظریفی سامنے آئی ہے کہ ڈاکٹر ثریا حسین نے علی گڑھ میں منعقد "حسرت موہانی سیمینار" میں بغیر حوالے کے اگست ۱۸۸۱ء کا تعین کیا ہے۔

سوانح نگاری معلومات کی بنیاد پر ہی وقیع نہیں ہوتی کیونکہ شائع ہونے والی ہر تحریر کو اعتبار کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ آزادی کے بعد خصوصی طور پر یہ صحت مند رجحان پروان چڑھا ہے کہ معلومات کی پیشکش کے ساتھ اس کے معتبر ہونے کی شہادت بھی درج کی جائے۔ دور زیر نظر میں جہاں نہایت وقیع سوانح عمریاں ملتی ہیں وہیں دفع الوقتی میں تحریر کی گئی سوانح عمریوں کی بھی کمی نہیں رہی۔

سوانح نگار صرف واقعات زندگی اور کارنامے یکجا نہیں کرتے بلکہ ان کی جزئیات اور تفاصیل پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ واقعات کا بیان کرنا تصویر بنانے کے مترادف ہے تو جزئیات اور تفصیلات ان میں رنگ بھرنے کا فرض ادا کرتے ہیں۔ اس جانب جتنی زیادہ توجہ کی جاتی ہے اس کی مناسبت سے شخصیت کے خدوخال واضح اور قاری کے لئے جاذب نظر اور دلنشیں بن جاتے ہیں۔ ممکن ہے قدیم زمانہ کی شخصیات کے بارے میں اس نوع کی معلومات کا حصول ممکن نہ ہو لیکن قریبی زمانہ کے اشخاص کے بارے میں ان کا حاصل کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ غالب کے بارے میں تحقیق ان حدوں تک پہنچ چکی ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہا۔ اس خصوص میں شیخ محمد اکرام اور مالک رام کی کاوشیں قابل قدر ہیں۔ قائد اعظم اور علامہ اقبال کے سوانحی واقعات کے ضمن میں یہ سہولت حاصل رہی کہ ان کے عہد کے اخبارات اور رسائل میں روز مرہ کی مصروفیات محفوظ ہیں اور ان سے ذاتی واقفیت رکھنے والے زندہ ہیں یا

انہوں نے لائق اعتبار معلومات پر مبنی تحریریں چھوڑی ہیں۔

سوانحی تفصیلات اور واقعات کے جزئیات کے ساتھ زندگی کے کسی پہلو کو دانستہ نظرانداز کرنا بھی سوانح نگاری کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہوتا۔ سوانح نگاروں کا عام رویہ زندگی کے منفی یا قابل اعتراض پہلوؤں سے چشم پوشی کا رہا ہے۔ اس بارے میں استدلال کیا جاتا ہے کہ مشرقی آداب و روایات میں بزرگوں کی خطا پکڑنا خود خطا سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان اس کو اس لئے ناجائز سمجھتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر نے تلقین فرمائی ہے کہ

خدایا ہماری بھی خطا پوشی فرما اور ہمارے ان بزرگوں کی بھی جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ گزر گئے"

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ۔ (پ۲۸، رکوع ۴، آیت ۱۰)

خدا ہمارے عیوب اور خطاؤں کو چھپاتا ہے تو ہمیں بھی دوسروں خصوصاً" بزرگوں کی خطاؤں اور عیوب کے ظاہر کرنے سے گریز کرنا چاہئے لیکن مغربی تعلیم کے زیر اثر انہیں نظر انداز کرنا فن سوانح نگاری اور شخصیت نگاری کے مغائر سمجھا جاتا ہے۔ اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ منفی پہلو کے مناسب اور معقول انداز میں بیان کرنے سے قاری کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کوئی فرد خیر مجسم یا شر مکمل نہیں ہوتا۔ فطرت انسانی کے یہ بنیادی اجزاء ہیں۔ ان میں غالب خیر ہو تو شخصیت قابل احترام بن جاتی ہیں۔ چھوٹی اور معمولی خامیوں کو فطرت انسانی قرار دے کر نظرانداز کیا جاسکتا ہے اور اگر دانستہ طور پر کسی منفی پہلو کے بیان سے اجتناب برتا جائے تو قاری کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف اوصاف حمیدہ کے اظہار کے لئے یکطرفہ اور جانبدارانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے والی سوانح عمریوں کے لئے حالی نے کریٹکل بیاگرافی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ علامہ شبلی بھی اس طریق کار کے حامی تھے۔ وہ ان لوگوں کے مخالف تھے جو کسی کے معائب دکھانے کو تنگ نظری سمجھتے تھے۔ علامہ شبلی کے اس رجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ

"ان کا (شبلی کا) تو خیال تھا کہ صحابہ کرامؓ کی زندگیاں بیان کرتے وقت بھی اس اصول پر عمل کیا جائے۔ وہ نواب مولوی حبیب الرحمن خان شیروانی کو جو صحابہ کے حالات پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "صحابہ کے حالات سے بڑھ کر کوئی چیز ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتی لیکن ہر پہلو کو لیجئے اور ان پہلوؤں کو صاف دکھلایئے جن سے آج کل کے مولوی قصداً" چشم پوشی کرتے ہیں" (۷۶)



ایسے میں عیب کی صراحت بھی متنازع ہو سکتی ہے۔ ایک فعل کسی کے لئے معیوب ہو سکتا ہے تو دوسرا اسے عیب نہ سمجھے یہ امر مسلمہ اور انسانی نفسیات کے مطابق ہے کہ جس بات کو چھپانے کی کوشش کی جائے گی اس پر ردعمل شدید ہوگا۔ اردو میں سوانح نگاری کے حوالہ سے "یادگار شبلی" کا ذکر کیا جاسکتا ہے مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد محترم کے سوانحی حالات مرتب کرتے ہوئے عطیہ فیضی سے ان کے جذباتی اور رومانی لگاؤ کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا جبکہ ان کے خطوط اور اشعار میں ان کی شہادتیں موجود ہیں۔ ذوق جمال کی تسکین یا کسی کو مرکز فکر و نظر بنانا عیب نہیں لیکن یہ بات شبلی سے متعلق تھی جو علامہ بھی تھے اور سلیمان ندوی کے استاد بھی' اسی لئے مشرقی تہذیب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے اس پر روشنی ڈالنے سے گریز کیا۔ اس کا شدید ردعمل "شبلی کی حیات معاشقہ" (۷۷) اور "شبلی کی رنگین زندگی" (۷۸) کی صورت میں سامنے آیا اگر سید سلیمان ندوی نے اس موضوع کو انسانی فطرت کا تقاضا قرار دے کر بیان کردیا ہوتا تو اتنا شدید ردعمل بھی نہ ہوتا۔

صاحب سوانح کی خوبیوں اور کمزوریوں کے بارے میں لکھنے والے کا کیا رویہ ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس حوالہ سے لکھا ہے کہ

"سوانح نگاری کی مہم علمی قابلیت کے سہارے سر نہیں کی جاسکتی یہ وہ فن ہے جس کی تکمیل کے لئے صرف محنت اور علمی قابلیت کافی نہیں اس کے لئے جذبہ ہمدردی اور انس و محبت کی ضرورت ہے جو ہیرو کی کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود اس کی عظمت اور شرف و فضیلت کو دیکھ سکے" (۷۹)

لیکن ابھی صداقت شعاری عام نہیں ہوئی ہے۔ شخصیات کی عظمتوں کے اعتراف میں لوگ اتنے جانبدار ہو گئے ہیں کہ اپنے ہیرو کی ذات سے متعلق ایسی سچائی سننے کے روادار نہیں جو ان کے خیال پیکر کو دھندلا دے۔ اس بارے میں شیخ محمد اکرم نے بطور مثال لکھا ہے

"سوانح نگاری کے متعلق قوم کے نقطہ نظر میں جو تبدیلی ہو گئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ العزیز کے تذکرہ نگار تو ان کی نسبت لکھ دیتے ہیں کہ وہ حصول زمین کی خاطر سلطان شمس الدین التمش سے ملنے اجمیر سے دہلی آئے اور حضرت خواجہ کی شان میں کمی نہیں ہوتی۔ لیکن اقبال کا کوئی ایسا خط شائع ہو جاتا ہے جس میں حیدر آباد ہائی کورٹ کی ججی کے متعلق ایک خفیف سا اشارہ ہے تو ان کے مداح بے قرار ہو جاتے ہیں" (۸۰)

سوانح عمری میں شخصیت کے مکمل خدوخال بھی ہونے چاہئیں۔ اس سے مراد سراپا نگاری ہی نہیں ہے بلکہ خارجی عمل کے ساتھ ساتھ داخلی عمل تک پہنچنے کی کوشش بھی کرنا چاہئے۔ انسانی عمل کے پس منظر میں فکر اور جذبہ دونوں ہوتے ہیں اس لئے ہر عمل کی توضیح کے لئے ان نکات کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔ فکر یا جذبہ مجرد نہیں ہوتے وہ ماحول اور اس کی صورت حال کی تائید یا ردعمل کے طور پر پیدا ہوتے ہیں علامہ اقبال کی فلسفیانہ فکر خیالی سوچ نہیں ہے یہ مسلمانوں کی کئی صدیوں کی بدحالی اور ان کے مسلسل تنزل کا لازمی نتیجہ ہے۔ ایک طرف مسلمانوں نے مغرب کا اثر قبول کرکے مادیت کو ترجیح دینے شروع کردی تھی دوسری طرف وہ مذہب اور روحانی اقدار کی جانب سے غافل ہوچکے تھے جو ان کی دنیاوی اور دینی زندگی کی حقیقی بنیادیں سمجھی جاتی ہیں۔ علامہ کی فکر ان حالات کا ردعمل تھا بالخصوص مغربی تہذیب اور طرز فکر کو وہ مسلمانوں کے لئے ہی نہیں تمام اقوام عالم کے لئے مضرت رساں سمجھتے تھے۔ اپنی فکر میں قوت پیدا کرنے کے لئے انہوں نے مشرقی فلسفہ تصوف اور شاعری کا گہرا مطالعہ کیا جس نے ان کی فکر کو جلا دینے میں مدد کی۔ اس پورے پس منظر کے بغیر ان کی زندگی کو سمجھنا ممکن ہی نہیں۔ عبدالسلام ندوی نے "ذکر اقبال" میں شاعر کو ان کے کلام کے تناظر میں سمجھانے کی جو کوشش کی وہی درست طرز عمل ہے۔ اسی طرح قائداعظم کی شخصیت اور ان کے کارنامے ان سیاسی واقعات کے بغیر ناقابل فہم ہیں جن سے وہ دوچار ہوئے۔ وہ شخصیت جسے ایک زمانے میں "اتحاد کا سفیر" قرار دیا گیا تھا۔ سیاسی حالات دیکھنے اور اکثریتی قوم کی غیر روادارانہ اور غیر منصفانہ رویہ کو تین دہائیوں سے زیادہ عرصہ تک آزمانے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں مفاہمت کے امکانات قطعی نہیں ہیں فرقہ وارانہ فسادات، نہرو کمیٹی رپورٹ اور آخر کابینہ مشن پلان کو کانگریس کی منظوری کے بعد صدر کانگریس کی جانب سے لایعنی تاویلات، فرقہ وارانہ ذہنیت کے واضح ثبوت تھے جس نے ان کے اقوام ہند کے اتحاد کے خواب کو پارہ پارہ کردیا تھا۔ اس پس منظر کے بغیر قائداعظم کی زندگی کے ادوار کو نہ تو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ بیان کیا جاسکتا ہے۔ قائداعظم کی انا پسندی اور تنہائی پسندی ان کی خانگی زندگی کے واقعات اور حالات کے لازمی نتیجے تھے۔ ان خصوصیات نے اس غلط فہمی کو جنم دیا ہے کہ وہ مغرور اور خود پسند تھے۔ حالانکہ صورت حال اس سے مختلف تھی۔ ان کے سوانح نگاروں نے سیاسی کارناموں پر زیادہ توجہ دی ہے اور سوانح عمری کو تاریخ بنادیا ہے ان کی سوانح عمریوں میں کارناموں کا اعتراف، عقیدت اور احترام کے جذبات چھائے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی پر ہمدردانہ نظر ڈالنے کی کوشش



کبھی نہیں کی گئی۔ ایک نئے نقطۂ نظر سے ان کی شخصیت کی صورت گری ضروری ہے چند حضرات نے جو قائداعظم سے قریب تر تھے ان کے شب و روز کے احوال سے خوب واقف تھے اپنی یادداشتوں کو تحریر میں لانے کا فرض ادا کیا ہے لیکن سوانح نگاروں نے ان سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سوانح نگاروں کو غیر جانبدار ہونا چاہئے۔ اس خصوص میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے؟ سوانح نگاری انس، لگاؤ، محبت اور عقیدت کی بناء پر ہوتی ہے اس میں غیر جانبداری کی ایک مفروضہ سے زیادہ اہمیت نہیں۔ اصولی شرط یہ ہوسکتی ہے کہ جانبدار ہونے کے باوجود جانبدارانہ رویۂ اختیار نہ کرے اور اپنے انس، لگاؤ محبت اور عقیدت کا برملا اظہار نہ کرے۔ سوانح نگار کا یہ رویۂ زیادہ سے زیادہ ہمدردانہ ہونا چاہئے۔ اس سے تحریر میں توازن قائم رکھا جاسکتا ہے۔ خوبیوں کے بیان کے لئے مبالغہ سے گریز اور طرز تحریر پر بربنائے عقیدت و احترام الفاظ کی گرانباری فن کے مغائر ہے تو خامیوں اور غلطیوں کی جانب سے اجتناب برتنا یا ان کا سختی سے تعرض کرنا بھی غیر ضروری ہے۔ ہر دو صورتوں میں اعتدال اور توازن سے سوانح عمری میں حسن اور جاذبیت کے عناصر پیدا کئے جاسکتے ہیں اردو کی سوانح عمریوں میں تعرض تنقید سے شاید ہی کام لیا گیا ہے لیکن ایسی تصانیف کی کمی نہیں جن کو "کتاب المناقب" کہا جائے۔ یہاں تک کہ طرز تحریر میں احترام کی افراط کا یہ عالم ہے کہ صاحب سوانح کے ذکر کے ساتھ "حضرت قبلہ ۔۔۔ رحمتہ اللہ علیہ" یا ایسے ہی زائد از ضرورت الفاظ کی تکرار کی جاتی ہے ارادت کی فراوانی مصنف کے قلب کو تسکین پہنچا سکتی ہے قاری کو متاثر نہیں کرسکتی صحابہ، آئمہ، بزرگان دین کی سوانح عمریوں میں عمومیت سے اظہار عقیدت کا پرتو نظر آتا ہے۔ "معراج روحانی" (مصنفہ احمد عثمانی) (۸۱) "مولانا سید سلمان ندوی کی شان جامعیت" (قاضی عبدالحنان) (۸۲) اس طرز کی نمایاں مثالیں ہیں۔

اسی طرح بعض ایسی سوانح عمریاں بھی لکھی گئی ہیں جو عقیدت کے بجائے جذبات سے معمور ہوتی ہیں۔ جس طرح عقیدت مصنف کو جانبدار بنادیتی ہے جذبات میں بھی یک رخی کا عمل دخل ہوتا ہے۔ عقیدت راہ صداقت سے بھٹکنے نہیں دیتی جبکہ جذباتیت میں صداقت کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ مصنف نے ارادہ ہی کرلیا ہو کہ وہ ہر سیاہ کو سفید بنا کر پیش کرے گا اس سے نفس مضمون کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے اور جذباتی طرز تحریر قاری کی ناپسندیدگی کی آخری حدوں کو چھونے لگتا ہے۔ ایسی تصانیف صاحب سوانح کی تعبیر نہیں کرتیں

بلکہ مصنف کے ذہن اور جذبے کی ترجمان بن جاتی ہیں جو پڑھنے والے کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ قاری موضوع کے بارے میں جاننا چاہتا ہے مصنف کے جذبات کے بارے میں نہیں۔ ایسی سوانح عمریوں کو اس فن کے زمرے میں شامل کرنا بھی زیادتی ہے ممکن ہے یہ انداز سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے اختیار کیا جاتا ہو جو کم تر ذہنی سطح رکھنے والوں کو متاثر کر سکتا ہے لیکن صاحب علم، سنجیدہ مزاج، اور فن سے واقف کار کی نظر میں وہ بالکل بے وقعت ہوتی ہے اس کی مثال میں "ذوالفقار علی بھٹو" (مصنفہ توصیف چغتائی ۱۹۷۳ء) اور "ذوالفقار علی بھٹو۔ بچپن سے تختہ دار تک" (مصنفہ سلمان تاثیر ۱۸۸۸ء) پیش کی جا سکتی ہے۔

## آپ بیتی

سوانح عمری کی ایک شکل خود نوشت یا آپ بیتی بھی ہے اس میں جن کے حالات زندگی ہوتے ہیں انہیں کے قلم سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ "ہمیں کوزہ وہمیں کوزہ گرو ہمیں گل کوزہ" کے مصداق ہے۔

خود نوشت ذات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ شاعری بالخصوص غزل میں اظہار ذات چیدہ چیدہ ہوتا ہے تو خود نوشت میں جامع اور تسلسل کے ساتھ، خود نوشت کے کئی طریقے رائج رہے ہیں جیسے خطوط روزنامچے، سفرنامے، رپورتاژ، یادداشتیں، ان میں ذات کے حوالے سے چند پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ سوانح عمری کے منتشر اجزاء ہوتے ہیں ان کی مدد سے حالات زندگی مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ ذات کی مکمل ترجمانی تو خود نوشت سوانح عمری سے ہی ممکن ہے۔ جو ذہنی تحفظات کے بغیر قلمبند کی گئی ہو۔ خود نوشت کی اہمیت عام سوانح عمری سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ سوانح نگار خارجی واقعات اور معاملات کو تحقیق کے ذریعہ معلوم کرتا ہے اور انہیں کے ذریعہ صاحب سوانح کی ذات کے اندرون کا سراغ لگاتا ہے۔ سوانح عمری میں پیش کردہ خارجی اور داخلی دنیا لکھنے والے کے فنی تجربے ہوتے ہیں جبکہ خود نوشت میں ان کی حیثیت ذاتی تجربوں کی ہوتی ہے۔ اس میں مصنف جزئیات کے ساتھ واقعات کی تصویر کشی واضح طور پر کرتا ہے اور نہاں خانہ ذات کے پردے بھی اٹھا دیتا ہے جس میں اس کی خوشیوں کی شمعیں بھی جلتی ہیں۔ ناکامیوں اور محرومیوں کے باعث اٹھنے والی آہوں کا دھواں بھی نظر آجاتا ہے۔ فکر کی بلندیاں بھی دکھائی دیتی ہیں اور جذبات کی گتھیاں بھی کھلتی نظر آتی ہیں۔ خود نوشت کی حیثیت ایک طرح سے عیسائی مذہب میں رائج "اعترافات" (Confession) کی ہوتی ہے یا اس بیان کی سی جو ایک نفسیاتی مریض اپنے معالج کے سامنے دے رہا ہو کیونکہ اس کے دائرے میں گفتنی کے ساتھ ناگفتنی بھی



شامل ہو جاتی ہیں اور جن تک عام سوانح نگار کی پہنچ نہیں ہو سکتی۔ اس میں لکھنے والا خود گل کوزہ اور خود کوزہ گر ہوتا ہے اسی لئے مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ

"نفس معلومات صحیحہ کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو آپ بیتی کو ہر دوسرے ذخیرہ تاریخ اور ابنائے عبرت پر ترجیح حاصل ہے" (۸۳)

خود نوشت اتنی سچی ہونی چاہئے کہ اگر اس کا موازنہ کاتبین کے محفوظ نامۂ اعمال سے کیا جائے تو سر مو فرق نہ نکلے لیکن ہمیشہ یہ سوال باقی رہے گا کہ کیا ہر خود نوشت کا مصنف صداقت شعاری کے اس معیار پر پورا اترتا ہے۔

ایسے ہی شک وشبہ کا اظہار گیان چند نے بھی ظاہر کیا ہے۔ مولانا مہر لکھتے ہیں۔

"جب بات اپنی ذات کی ہو تو غیر جانبداری معلوم! یہاں تو جانب داری ہی جانب داری ہے خود نوشت نگار اشخاص وواقعات کے جن بیانات کو مکمل سچ کے طور پر پیش کرتا ہے کون جانے کوئی دانائے راز انہیں کو نیم صداقت یا اس سے بھی پرے، حقیقت کو مسخ کرنے کی کوشش قرار دے اس لئے بعض حضرات کی سوانح سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کی نظر میں وہ ہمیشہ صحیح موقف پر تھے دوسرے لوگ غلطی پر تھے" (۸۴)

خود نوشت مصنف کی ذات کے حوالے سے ہوتی ہے وہ اسٹیج پر موجود ایسا کردار ہوتا ہے کہ روشنی اسی پر پڑتی ہے لیکن انسان ایک معاشرہ کا فرد ہونے کے اعتبار سے امور دنیاوی میں دوسروں کا محتاج بھی ہوتا ہے اور دوسروں کا معاون بھی، اس لئے وہ ذات حوالے سے ماحول کے افراد کے اوصاف اور کردار کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اس کی داستان حیات میں ایسے سیکڑوں معاون اور ضمنی کردار آتے ہیں جن کا ذکر وہ اپنی آپ بیتی میں کرتا ہے جس صداقت شعاری کا مظاہرہ اسے اپنے بارے میں کرنا چاہئے ویسا ہی انصاف پسندانہ رویّہ دوسروں کے لئے بھی اختیار کرنا ضروری ہے۔ اسی لئے سر رضا علی نے بیان کیا ہے کہ

"مغربی ممالک میں سوانح حیات لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ بیتی کے ساتھ ساتھ جگ بیتی بھی بیان کی جاتی ہے دنیا میں واقعات کا سلسلہ بسا اوقات ایسا مربوط ہوتا ہے کہ اپنی کہانی اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے جب دوسروں کے حالات بھی درج کئے جائیں۔ میں نے اسی طریقہ پر عمل کیا ہے اس سلسلہ میں اور متعلقہ واقعات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے" (۸۵)

ماحول اور دیگر افراد کے بارے میں حقیقت پسندی کا ثبوت دینا کافی ہے بقول آل احمد سرور

"محرومیوں اور ناکامیوں کی داستان بیان کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالے نہ اپنے آپ کو

خلاصہ کائنات سمجھ کر ہر شخص اور ہر واقعہ پر ہمالہ کی بلندی سے تنقید کرے' نہ اپنا کوئی بت بنا کر پیش کرے تاکہ لوگ اس کی پرستش کریں اور نہ واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے کسی نظریے کے شکنجے میں جکڑے۔ نہ دم بہ دم بدلتی ہوئی تضاد رنگا رنگ حیرت انگیز جلوہ ہائے نو بہ نو سے معمور زندگی کو کسی اشتہار بازی کی سرخیوں سے آلودہ کرے" (۸۶)

آپ بیتی یا خود نوشت لکھنا ہر ایک کے لئے ممکن نہیں یہ تلوار کی دھار پر چلنے والے عمل کے مترادف ہے۔ کیونکہ اس میں اپنی خوبیوں' اچھائیوں' کامرانیوں کی حکایت بیان نہیں کی جاتی بلکہ ناکامیوں' غلطیوں اور کمزوریوں کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔ اگر لکھنے والے میں جرأت کا اظہار نہ ہو تو "پوری سچائی" بیان نہیں کر پائے گا اور "نصف سچائی" غلط بیانی سے زیادہ خطرناک اور مضرت رساں ہوتی ہے۔ اسی لئے سر رضا علی نے تلقین کی ہے کہ

"ہر شخص کو اپنی کہانی لکھتے وقت دو باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ ایک یہ کہ سچے واقعات پورے طور پر بیان کر دیئے جائیں۔ اخفائے حق نہ کیا جائے نہ کوئی بات ادھوری چھوڑی جائے۔ دنیا میں وہ سچی بات بڑی مخدوش ہوتی ہے جو آدھی ظاہر کی جائے اور آدھی چھوڑ دی جائے"

"دوسری بات یہ ہے کہ مشہور انگریزی مثل کو کہ خواہش تخیل کی ماں ہے اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دے اگر خواہش نے تخیل پر غلبہ حاصل کر لیا اور لکھنے والے نے واقعات کی صورت مسخ کرنا شروع کر دی تو آپ بیتی سچا نامۂ اعمال ہونے کے بجائے افسانہ ناول بن جائے گی۔" (۸۷)

آپ بیتی یا خود نوشت لکھنا ان کا کام ہے جن کا ذہن صاف ہو کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں اگر واضح اور جامع منصوبہ بندی نہ ہو تو تحریر آپ بیتی نہ رہے یادداشتوں کا مجموعہ یا ذہن کی رو کے نقش بن کر رہ جائے۔ اس کی مثال مولانا ابوالکلام آزاد کا "تذکرہ" ہے ان کا مقصد آپ بیتی لکھنے کا تھا لیکن وہ پیچ در پیچ واقعات میں الجھ کر رہ گئے اور قاری سوچتا رہا جاتا ہے کہ آخر اس سرگزشت کا مرکزی کردار اور بنیادی موضوع کون ہے۔ سر رضا علی نے "اعمال نامہ" منصوبہ بندی کے ساتھ لکھا۔ ان کی پاس بہت سی یادداشتیں اور روزنامچے موجود تھے انہیں کے سہارے آپ بیتی کو مکمل کیا ہے۔ اس لئے ان کے بیان کئے ہوئے واقعات کی صحت پر اعتراضات وارد نہیں ہوئے۔

آپ بیتی لکھنا ان کا کام ہے جن کی زندگی کے تجربات نو بہ نو ہوں۔ ان تجربوں سے ملک' قوم'



معاشرہ یا انسانی رویوں کا حال معلوم ہوتا ہو جو پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ کریں اور ان کو بصیرت کی روشنی فراہم کریں۔ بڑے آدمیوں کی آپ بیتیاں ان کی اپنی داستان ہونے کے ساتھ ساتھ قوم کی داستان ہوتی ہیں۔ آزادی سے قبل گاندھی جی کی "تلاش حق" اور جواہر لال نہرو کی "میری کہانی" کے چرچے اسی باعث تھے کہ وہ سیاسی افق پر جگمگاتے ستاروں کی طرح تھے جو اپنے نظریات کے تحت کاروان آزادی کی رہنمائی کر رہے تھے۔ آزادی کے بعد مولانا حسین احمد مدنی (نقش حیات ۱۹۵۲ء) (۸۸) ظفر حسین ایبک (آپ بیتی ۱۹۶۰ء) (۸۹)' مولانا ابوالکلام آزاد (ہماری آزادی' انڈیا ونز فریڈم کا ترجمہ ۶۱ء) (۹۰)' فیلڈ مارشل محمد ایوب خان (جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی! ۱۹۶۵ء) (۹۱)' چودھری خلیق الزماں (شاہراہ پاکستان! ۱۹۶۷ء) (۹۲)' عابد علی (مزدور سے منسٹر ۱۹۶۸ء) (۹۳)' سر محمد یامین خان (نامہ اعمال! ۱۹۷۰ء) (۹۴)' عبد السلام خورشید (رو میں ہے رخش عمر ۱۹۸۶ء) (۹۵) نے اپنی اپنی آپ بیتیوں کے ذریعہ سیاسی جدوجہد کا تاریخی ریکارڈ مرتب کیا ہے ان میں نکات نظر کا فرق ہے۔ تاریخ کے طالب علم تقابلی مطالعہ اور تجزیے کے ذریعہ بآسانی صورت حال کا ادراک کر سکتے ہیں۔ یہ سیاسی اور تاریخی مقاصد کے تحت ہی تصنیف کی گئی تھیں اس لئے زندگی کے دیگر پہلوؤں پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی خصوصاً "نجی حالات کو قطعاً" نظر انداز کر دیا ہے۔ شاہراہ پاکستان کو یہ خصوصیات حاصل ہے کہ اس میں اہم تاریخی دستاویزات کے عکس موجود ہیں ان میں بعض براہ راست مصنف سے متعلق ہیں لیکن زیادہ تعداد تحریک پاکستان سے متعلق دستاویزات کی ہے جو مصنف کے علم میں تھے یا ان کی تحویل میں تھے۔ پاکستان کے حصول کی جدوجہد مرتب کرنے کے سلسلہ میں اس آپ بیتی کو اہم ماخذ قرار دیا جاتا ہے فن سے دوری کے باوجود اس کے تاریخی ریکارڈ کی وجہ سے اس کی اہمیت مسلمہ ہے۔ سر محمد یامین خاں نے "نامۂ اعمال" کو تاریخی روزنامچہ بنا دیا ہے ہر سال کو سرخی قرار دے کر اس کے تحت یادداشتیں تحریر کی ہیں۔ اس سے سرکاری حلقوں اور حکومت کے دفاتر کے اندرونی حالات' واقعات اور طریق کار کا پتا چلتا ہے۔ یہ تمام "آپ بیتیاں' ذات کے بارے میں کم لیکن ذات کے حوالے سے زیادہ معلومات فراہم کرتی ہیں۔

آپ بیتی لکھنے کا ایک مقصد "عرفان ذات" کے ساتھ ساتھ "انکشافات ذات" بھی ہوتا ہے۔ گویا مصنف آئینہ سامنے رکھ کر اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور اپنی شخصیت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی فلم بار بار دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو پہچاننے اور سمجھنے کا فرض ادا کرتا ہے۔ جس طرح وہ خود کو پہچان پاتا ہے اسی طرح پیش کرتا ہے چنانچہ خواجہ حسن

نظامی نے لکھا ہے۔

میں نے جب کبھی اپنی زندگی کا روزنامچہ لکھا تو محسوس ہوا کہ گویا اپنی ہستی کے عرفان کا بہی کھاتہ لکھ رہا ہوں کیونکہ جب اس کو دیکھتا ہوں آمد و خرچ کا حساب یاد آتا ہے۔ بس یہ "آپ بیتی" یہ خودنوشت بھی مجھ کو آگے چل کر زندگی کا حساب بتائے گی۔ ناظرین کچھ ہی سمجھیں میں نے تو یہ کتاب لکھ کر عرفان ذات کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔" (۹۶)

"عرفان ذات" کے پس منظر میں سبق آموز واقعات اور تجربات کا لامتناہی سلسلہ ضرور ہوتا ہے ان کی نوعیت پر آپ بیتی منحصر ہوتی ہے۔ یہ فرد کے تجربے ہوتے ہیں جنہیں فرد ہی سے منسوب نہ سمجھا جائے بلکہ انہیں انسانی تجربے خیال کر کے ان سے استفادہ کیا جائے۔ خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی ۷۵ برس پرانی سہی۔ وہ عام آدمی کے لئے انتھک محنت کا درس رکھتی ہے۔ جس میں ایک عام آدمی نے اپنی جانفشانی' مشقت' ذہنی اور روحانی لگن سے معاشرہ کے انتہائی پست درجہ سے ترقی کر کے ایک معتبر اور معزز مقام حاصل کیا۔ درگاہ سلطان الاولیاء کی چوکھٹ پر جوتوں کی حفاظت کرنے والا' اپنی تصانیف کی گٹھڑی کو سر پر لاد کر گلی گلی فروخت کرنے والا' بازار کے چراغوں کی روشنی میں مطالعہ کر کے علم حاصل کرنے والا' ان تمام ناداریوں اور نامساعد حالات کے باوجود دنیاوی اور دینوی اعتبار سے بلند مقام حاصل کر لیتا ہے تو قاری کا دل محنت کی عظمت کا قائل ہو کر اسی ولولہ اور حوصلہ کو کام میں لانے پر مائل ہوتا ہے۔ سات دہائیاں گزر جانے کے بعد چاہے حسن نظامی کی "آپ بیتی" کی روشنائی کتنی ہی خشک ہو چکی ہو اس کی روشنی ماند نہیں پڑی ہے۔ یہ کیفیت آزادی کے بعد کی آپ بیتی "جہاں دانش" (۹۷) کی ہے۔ احسان دانش کے ماحول اور حالات وہی ہیں جن سے حسن نظامی دوچار ہوئے۔ عزم' ہمت' حوصلہ اور ولولہ وہی ہے۔ ایک مزدور' ایک مالی' ایک بے سروسامان انسان کارزار حیات میں سارے زمانہ سے لڑتا ہوا اپنا راستہ بناتا نظر آتا ہے۔ اس نے روکھی سوکھی کھائی' وہ تنگ و تاریک کوٹھری میں رہا۔ اس نے دانش گاہ پنجاب کی تعمیر کے لئے پتھر اینٹ اور گارہ ڈھویا۔ ان سب کا حال "جہاں دانش" میں بیان کر دیا۔ داد دینی پڑتی ہے مصنف کے جرأت اظہار کی کہ انہیں بیان کرتے ہوئے اسے قطعی شرمندگی نہیں ہوئی اور نہ انہوں نے اپنے درجات کی بلندی پر فخر کیا اور نہ اپنے کارناموں کے لئے توصیفی الفاظ یا ستائشی لہجہ استعمال کیا۔ پستی اور بلندی' نشیب و فراز کو زندگی کے حقائق کے طور پر قبول کیا۔ یہ ان کے "عرفان ذات" کا فیض تھا کہ اپنی قوتوں کو مجتمع رکھ کر حوصلے کے ساتھ تمام مرحلے طے کئے "جہان دانش" حوصلوں کو بڑھانے والی طاقت ہے اور "پدرم سلطان



بود" کے سحر میں گرفتاروں کے لئے تازیانہ! آزادی کے بعد لکھی جانے والی بامقصد آپ بیتیوں میں اسے ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

آپ بیتی کی دلچسپی اور افادیت کا انحصار مصنف کے متنوع تجربات پر ہوتا ہے اور اگر مصنف بیدار مغز ہے جو ذات کے علاوہ اس ماحول سے پوری طرح واقف ہے جس میں اس نے زندگی کی ساعتیں گزاری ہیں تو آپ بیتی میں جان پڑ جاتی ہے۔ لیکن ہر دو کے درمیان توازن ہونا چاہئے۔ عبادت بریلوی نے "یاد عہد رفتہ" (۹۸) میں یہ توازن باقی نہیں رکھا ہے خصوصاً "ابتدائی حصہ میں ماحول کا ذکر جس تفصیل سے ہے اس کے مقابلہ میں ان کی ذات کے احوال بہت کم ہیں۔ اس حصے میں دیہی زندگی' وہاں کے مظاہر قدرت' لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی خصوصیات بیان کرنے پر زیادہ توجہ مبذول رکھی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک دور کی معاشرت اور عام حالت کو انہوں نے محفوظ کر لیا ہے سماجیات اور تاریخ کے مطالعہ میں ان سے مدد مل سکتی ہے لیکن عدم توازن کی وجہ سے خودنوشت کا فن متاثر بھی ہوا ہے۔ انہوں اعتراف بھی کیا ہے کہ

"میں اپنے بارے میں کم' اپنے زمانہ اور ماحول کے بارے میں زیادہ لکھوں گا تاکہ جو کچھ میں نے گزشتہ نصف صدی میں دیکھا ہے' جو حالات مجھے نظر آئے ہیں' جو واقعات میری آنکھوں کے سامنے سے گزرے ہیں' جن بزرگوں اور دوستوں سے میں نے اثر قبول کیا ہے ان سب کی ان گنت تصویروں کا ایک مرقع تیار ہو جائے۔" (۹۹)

یہ صورت حال ایسی ہی ہے جیسی سیاست دانوں کی آپ بیتیوں کی ہے۔ ان کے ہاں سیاست عمومی کا عنصر غالب ہے تو "یاد عہد رفتہ" میں ماحول کا ذکر زیادہ ہے۔

عموماً "آپ بیتی اس زمانہ میں لکھی جاتی ہے جب فرد کار جہاں سے فارغ ہو چکا ہو' اس نے زمانہ کے شیریں اور تلخ حقائق کا سامنا کیا ہو۔ اس کے تجربوں کی نوعیت متنوع اور کثیر ہو۔ گویا اس نے جو کچھ زمانہ سے پایا آپ بیتی کے ذریعہ اسے زمانہ کو لوٹا دینے کا آرزومند ہو۔ حقیقت میں یہی وقت مناسب بھی ہوتا ہے لیکن وہ حضرات جو اعلیٰ ذمہ دار عہدوں پر کارگزار رہے ہوں اور ان کی شخصیت اور کارنامے متنازع رہے ہوں تو ان کی خودنوشت پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ آپ بیتی سے زیادہ "بیان صفائی بجواب فرد جرم ہے" اکثر آپ بیتیاں اسی ضمن میں آتی ہیں۔ خصوصیت سے فیلڈ مارشل ایوب خان کی "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" اور قدرت اللہ شہاب کی "شہاب نامہ" (۱۰۰)۔ متوخرالذکر نے "ابتدائیہ" کا عنوان "اقبال جرم" رکھ کر

گویا اس کا اقرار بھی کرلیا ہے ان پر جو الزامات ان کے برسرکار رہنے کے دوران ان پر لگائے جاتے تھے وہ ابن انشاء کی جانب سے ایف آئی آر کے طور پر درج کرکے ان کی جواب دہی کی جو سعی کی گئی ہے وہ خود احساس جرم کی آئینہ دار ہے۔ اس احساس کو دبانے اور قاری پر اثر انداز ہونے کے لئے اپنی خوبیوں کے بیان کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم کیا ہے۔ احوال واقعی کا مقربین خاص کو پتا ہوگا لیکن عام قاری کا ذہن ان کی آپ بیتی کو "بیان صفائی" ہی سمجھتا ہے اور عدالتوں میں پیش کردہ بیان صفائی کس قدر سچائی پر مبنی ہوتا ہے اس کا حال سب کو معلوم ہے۔

شباب نامہ کی ایک خصوصیت احساس تفاخر بھی ہے۔ مصنف نے جس قدر خوبیاں بیان کی ہیں ان کے مقابلہ میں کمزوری ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتی جو منفی نوعیت کی باتیں ان سے منسوب تھیں وہ سب انہوں نے صدر ایوب کی طرف منتقل کرکے خود کو بری الذمہ قرار دے دیا ہے۔ دیگر آپ بیتیوں کی طرح اس میں بھی زائد از ضرورت عنصر احساس تفاخر (Superflucial Element) موجود ہے جو دعاؤں، تعویزوں اور اسی نوعیت کی روحانی رہنمائی سے متعلق ہے۔ وہ اسے اپنے معتقدات کا حصہ قرار دیتے تو اور بات تھی لیکن انہوں نے کتاب کے آخر میں انہیں "ہر مرض کے تیر بہدف علاج" کے طور پر شامل کردیا ہے۔

آپ بیتی میں توازن اور جرات اظہار کی ضرورت ہوتی ہے مصنف تفاخر سے پرہیز کرے۔ واقعہ کو واقعہ کے طور پر بیان کرے۔ فیصلہ کرنے کا حق مصنف کو نہیں قاری کو ہوتا ہے جو سچا نقاد ہوتا ہے۔ وہی آپ بیتیاں دلچسپ اور کامیاب ہوتی ہیں جن میں "سچ اور صرف سچ ہوتا ہے، سچ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔" سچائی ہی توازن قائم کرتی ہے بشرطیکہ وہ مکمل ہے۔ آدھی سچائی جھوٹ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ مصلحت پسندی اور ذات کی خامیوں کی پردہ پوشی کا جذبہ سچائی پر مائل بھی کرتا ہے تو وہ حد سے تجاوز نہیں کرپاتی۔ اردو کی چند آپ بیتیوں کے سوا سب میں صورت حال موجود ہے۔ اس طرح آپ بیتی جو "انکشاف ذات" کے عمل کا نام ہے مقصد سے ہم آہنگ نہیں ہوپاتی۔

ذات کے حوالے سے بہت سی باتیں گفتنی اور بہت سے ناقابل گفتنی ہوتی ہیں۔ ناقابل گفتنی کو گفتنی کے دائرہ میں رکھ کر بیان کرنا مصنف کا کمال فن ہوتا ہے۔ احسان دانش نے اپنے عشق کی داستان چھیڑی۔ شمی سے جسمانی قربت کا ذکر بھی کیا اور اس دائرہ میں رہ کر کیا جہاں ان کے قلم پر حرف آیا اور نہ قاری کے ذہن پر بار گراں ثابت ہوا۔ معاملات عشق کا بیان معیوب نہیں۔ عیب کی حد وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں معیار اخلاق معاشرہ کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔



جوش ملیح آبادی کی تعریف اس حوالے سے کی جاتی ہے کہ ان میں سب سے زیادہ جرأت اظہار تھی۔ انہوں نے اپنے کسی عیب کو نہیں چھپایا۔ ان باتوں کے بیان پر اعتراض کی گنجائش نہیں۔ اعتراض ہے تو اس انداز بیان پر جو انہوں نے اختیار کیا اور اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا کہ ادب کو دائرہ ادب میں ہونا چاہئے اسے کوک شاستر نہیں بنادینا چاہئے۔

اس صدی میں جوش کے مقابل ذخیرۂ الفاظ اور زور بیان پر قدرت رکھنے والا اور کوئی نہیں گزرا۔ جس طرح وہ شاعری میں الفاظ کے آبشار سے کام لیتے ہیں ویسے ہی نثر میں بھی جوہر دکھاتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو جوش نے دبستان لکھنؤ کی نثر کی یاد کو تازہ کردیا ہے (جس کا تتمہ رجب علی بیگ سرور کی داستان فسانہ عجائب کو سمجھا جاتا تھا) کمال فن کے اظہار کا اعتراف کرتے ہوئے افسوس اس بات کا ہے کہ اس ہنر سے جو فائدہ اٹھانا چاہئے تھا جوش اس سے محروم رہے اور اپنی آپ بیتی میں زور بیان کے سہارے ایسے لچر اور بے ہودہ واقعات بھی شامل کرلئے جن کی نہ صرف صداقت مشکوک ہے بلکہ وہ اخلاق سے بھی گرے ہوئے ہیں۔ "یادوں کی برات" (۱۰۱) کی خامیوں میں یہ سب سے نمایاں خامی ہے۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں اس کی کچھ اقدار ہیں جو صدیوں کی باہمی افہام تفہیم سے قائم ہوئی ہیں۔ ان پر اخلاقیات اور مذہب کے غالب اثرات ہیں۔ اگر یہ اقدار وقت کے ساتھ قائم اور جاری نہیں رہ سکتے تو ان کے خلاف آواز اٹھانے اور بغاوت کرنے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے بشرطیکہ وہ اپنے موقف کی حمایت میں مضبوط دلائل رکھتا ہو۔ آج کے صاحب نظر قاری کا تو کیا ذکر۔ نوجوان لڑکا بھی مضبوط اور قابل قبول استدلال کے بغیر کسی بات کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ ایسے میں اگر جوش ملیح آبادی بوالہوسی کو عشق اور مردانگی قرار دیں اور شرافت کو نامردی گردانیں تو ان کے دعوے نہ تو معاشرتی اقدار سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں اور نہ اقدار سے بغاوت کی صورت میں ان کی تحریر میں وہ دلائل ہیں جو کسی بھی ذہنی سطح کے قاری کو مطمئن کرسکیں۔ اگر جوش یورپ یا امریکہ میں ہوتے اور وہاں کی موجودہ معاشرتی بے راہ روی کے ہنگامہ میں یادوں کی برات پیش کرتے تو اسے جرأت اظہار کا شاہکار قرار دیا جاسکتا تھا۔ ہمارا معاشرہ اخلاقیات کی گراوٹ کی اس سطح تک نہیں پہنچا ہے جو ان کی تحریر پر داد و ستائش کا اظہار کرے۔

یادوں کی بارات کی دیگر خصوصیات میں عدم توازن اور احساس برتری بھی ہیں۔ جوش نے اپنے آپ کو معاشرہ کی عام سطح سے بلند، پرغرور اور منفرد بنا کر پیش کیا ہے جبکہ وہ عام آدمی کی ذہنی سطح سے بھی پست باتیں دائرہ تحریر میں لائے ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں خصوصاً "فقیر محمد خاں گویا کے

سحر سے اپنے آپ کو کبھی بھی آزاد نہ کر سکے۔ ان کے مقابلہ میں ان کی اپنی کوئی اہمیت اور حیثیت نہ تھی اس لئے بجائے اس کے کہ عملاً "خود کو ان کے برابر اونچا کرنے کی کوشش کرتے یادوں کی برات میں انہیں اپنی نچلی سطح تک کھینچ لانے کی سعی کی ہے۔ یہ حقائق سے چشم پوشی کی مثال ہی نہیں ہے بلکہ حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے جس کی اجازت سوانح نگاری کا فن نہیں دیتا۔

یادوں کی بارات اس حوالے سے بھی ناکام آپ بیتی ہے کہ اس میں "سچ" کی کہیں کہیں جھلکیاں ہیں باقی سب مصنف کے خواب ہیں۔ جن میں سچائی کی رمق تک موجود نہیں۔ انہوں نے مقدمہ میں اپنی فطرت کے عناصر علم طلبی' انسان دوستی اور عشق قرار دیئے ہیں ان میں کسی کے بارے میں شہادت کتاب کے کسی حصہ میں موجود نہیں۔ جو واقعات بیان کئے وہ سچائی سے کتنے دور ہیں اس بارے میں ان کے ابواب "قومی تحریک سے وابستگی" اور "حیدر آباد کے اخراج" پیش کئے جاسکتے ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ "قومی تحریک سے وابستگی" میں جو لکھا گیا وہ سب غلط ہے اور ریاست حیدر آباد کے سرکاری ریکارڈ کی اشاعت کے بعد ان کے تمام بیانات کی نفی ہو جاتی ہے جن کا ذکر حیدر آباد سے اخراج کے باب میں ہوا ہے گویا یادوں کی برات میں "مکمل سچ" تو کجا "آدھا سچ" بھی نہیں۔ ساری عمارت غلط بیانی کی بنیادوں پر تعمیر کی گئی ہے اس سے حقائق' توازن' اظہار جرأت کے ان لوازمات سے عاری ہے جو آپ بیتی کے اہم تقاضے ہوتے ہیں البتہ "عرفان ذات" کی حد تک وہ کامیاب رہے یادوں کی برات کو خود نوشت سوانح عمری کسی اعتبار سے بھی قرار نہیں دیا جا سکتا البتہ اسے ایسے ذہنی مریض کا بیان قرار دے سکتے ہیں جو ماہر نفسیات کے لئے قلمبند کیا گیا ہو تاکہ وہ مرض کی تشخیص کر سکے۔

تفاخر کا جذبہ کس میں نہیں ہوتا۔ اگر خود نوشت میں ذات پر فخر کے مقامات آجائیں تو ان سے گریز بھی ضروری نہیں۔ فخر کا اظہار ہو لیکن احتیاط کے ساتھ! یادوں کی دنیا (یوسف حسین خان ۱۹۶۷ء) مزدور سے منسٹر (عابد علی ۱۹۶۸ء) نامۂ اعمال (سر محمد امین خان ۱۹۷۰ء) تحدیث نعمت (محمد ظفر اللہ خان ۱۹۷۱ء) اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ محمد ظفر اللہ خان کو جن باتوں پر فخر تھا ان میں ماں سے محبت' اپنی روحانی صلاحیتیں' قادیانی مذہب سے وابستگی' عالمی سیاست پر گہری نظر شامل ہیں۔ ان سب کو سنجیدہ اور باوقار انداز میں اس طرح تحریر کیا ہے کہ بعض امور سے اختلاف کے باوجود ان کی جرأت اظہار پر شدید جذباتی رد عمل نہیں ہوتا خصوصاً "قادیانیت سے وابستگی ایک نازک مسئلہ ہے جو انہیں بھی جذباتی بنا سکتا تھا اور قاری کے جذبات کو بھی ابھار سکتا تھا۔ ایک مسلمہ ادیب نہ ہونے کے باوجود ظفر اللہ خان نے اس سلامت روی' حق شناسی



اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے جو اس فن کے شایان شان ہے۔

سوانح عمریوں کی طرح بعض آپ بیتیاں ایسی بھی ہیں جن کو جزوی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ زندگی کے کسی ایک پہلو یا دور تک ان کو محدود رکھا گیا ہے۔ چوہدری خلیق الزماں کی آپ بیتی "شاہراہ پاکستان" اور حسین احمد مدنی کی "نقش حیات" ظفر حسن ایبک کی "آپ بیتی" عابد علی کی "مزدور سے منسٹر تک" اور سر محمد یامین خان کی "نامۂ اعمال" بڑی حد تک سیاسی وقائع نگاری ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی نے "زرگزشت" کو اپنی بینکاری کی روداد بنا دیا ہے۔ ذوالفقار علی بخاری کی "سرگزشت" کا بڑا غالب حصہ آواز کی دنیا (ریڈیو) کے حوالے سے ہے۔ ان تمام میں زندگی کے دیگر پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے یا ان کے لئے اجمالی اور سرسری رویہ اختیار کیا گیا ہے۔

آپ بیتی کی معروف قسم خود نوشت کا جائزہ سطور ماقبل میں لیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی کئی صورتوں میں اس کو مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو کے دور وسطیٰ کے شاعروں میں غالب ایسی ہستی ہیں جنہوں نے بکثرت خطوط لکھے اور ان کی خوش نصیبی کہ وہ محفوظ بھی رہے۔ ان خطوط میں جابجا انہوں نے اپنے اجداد' اپنے احوال' نجی زندگی' بیماری' شادمانی اور غم کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ سب حوالے ان کی سوانح عمری مرتب کرنے کے سلسلہ میں بنیادی ماخذ قرار پاتے ہیں چنانچہ مالک رام نے ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ خطوط کی اہمیت اور افادیت کے مدنظر لوگوں نے ان کے اقتباسات کو اس طرح مرتب کیا کہ وہ غالب کی خود نوشت بن گئے ہیں۔ حفیظ عباسی نے "کہانی میری' زبانی میری" (مطبوعہ ۱۹۶۸ء) شفیع الدین نیر نے "غالب کی کہانی" (مطبوعہ ۱۹۶۸ء) نثار احمد فاروقی نے "غالب کی آپ بیتی" (مطبوعہ ۱۹۶۹ء) اختر صدیقی نے "غالب اپنے آئینے میں" (مطبوعہ ۱۹۷۰ء) اسی نہج پر مرتب کی ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے مضامین میں بھی سوانحی اشارے موجود ہیں۔ عاصم نعمانی نے انہیں "تصوف اور تعمیر سیرت" (مطبوعہ ۱۹۷۲ء) (۱۰۲) میں اس طرح ترتیب دیا ہے کہ وہ بھی آپ بیتی بن گئے ہیں۔ ڈاکٹر سید معین الرحمان نے "آپ بیتی رشید احمد صدیقی" (مطبوعہ ۱۹۷۴ء) (۱۰۳) آغا مسعود حسن نے سردار عبدالرب نشتر کی آپ بیتی "آزادی کی کہانی میری زبانی" (س ـ ن) ضیاء الدین لاہوری نے "سرسید کی کہانی' ان کی اپنی زبانی" (مطبوعہ ۱۹۸۲ء) (۱۰۴) اسی نہج پر مرتب کی ہیں چونکہ معلومات براہ راست صاحب سوانح کی تحریروں سے اخذ کی گئی ہیں اس لئے ان کی اہمیت ویسی ہی ہے جو خود نوشت کی ہوتی ہے۔ معلومات کی صداقت کی ذمہ داری صاحب سوانح پر ہی عائد ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ خود نوشت کی ایک صورت ایسی بھی سامنے آئی ہے کہ حالات کسی اور کے ہیں لکھنے والا کوئی اور ہے اور اس نے "واحد متکلم" کے صیغہ میں اسی نوعیت سے تحریر کیا ہے گویا صاحب سوانح نے بیان کی ہے اس کو بیانیہ آپ بیتی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس نوع کی مشمولات کی صداقت شک وشبہ سے بالاتر نہیں ہیں کیونکہ اس نوع کی آپ بیتیاں صاحب سوانح کے انتقال کے بعد شائع ہوئی ہیں۔ اگر ان کی زندگی میں منظر عام پر آجاتیں تو مشکوک حصوں کے بارے میں ان سے وضاحت طلبی ممکن ہوتی بحالت موجودہ تحریر کرنے والے پر نہ تو تمام تر ذمہ داری ڈالی جاسکتی ہے اور نہ ان سے وضاحت طلب کی جاسکتی ہے اس کی نمایاں مثال "ہماری آزادی" (India Wins Freedom) کا اردو ترجمہ ہے اسے مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی آپ بیتی کہا جاتا ہے جسے ہمایوں کبیر نے مرتب کیا اور مولانا کے انتقال کے بعد شائع کیا۔ اس میں بیان کردہ واقعات پر بے شمار اعتراضات کئے گئے ہیں اور ان کی صداقت کے برخلاف شواہد شائع ہوئے ہیں چنانچہ من موہن گاندھی نے India Wins Errors (۱۰۵) میں تاریخی واقعات غلط لکھے جانے کی نشاندہی کی ہے یہی حال "آزاد کی کہانی' آزاد کی زبانی" مرتبہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (مطبوعہ ۱۹۵۸ء) کی ہے۔ ۲۲۔۱۹۲۱ء میں مولانا ملیح آبادی نے مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات زندگی جیل میں رہنے کے دوران معلوم کئے تھے اور ان کی یادداشتیں تیار کی تھیں انہیں ۳۶تا۳۵ برس بعد مرتب کیا اور مولانا آزاد کی وفات کے بعد شائع کیا۔ طویل عرصہ بعد تک یادوں کا ذہن میں تازہ رہنا بذات خود واقعات کی صداقت کو مشکوک بنادیتا ہے۔ چنانچہ اس کے مشمولات پر اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی دوسری تالیف "ذکر آزاد" بھی اسی نوعیت کی ہے۔ اس نوع کی آپ بیتیوں میں سب سے زیادہ متنازع کشمیر کے سیاسی رہنما شیخ عبداللہ کی بیانیہ آپ بیتی "آتش چنار" (مطبوعہ ۱۹۸۰ء) (۱۰۶) ہے اس کے بعض حصے تاریخی اور عقلی لحاظ سے ناقابل اعتبار ہیں۔ اس کے مرتبہ محمد یوسف ٹینگ نہ تو ان کی وضاحت کے موقف میں ہیں اور نہ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی حال "داستان حیات سید میر قاسم" مرتبہ عبدالرحمن کوندو (مطبوعہ ۱۹۸۰ء) (۱۰۷) کا ہے۔ ان تمام بیانیہ آپ بیتیوں کو اس صنف میں شامل کیا جاسکتا ہے لیکن ان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

ہر ملک کے مشاہیر (چاہے ان کا دائرہ عمل کچھ بھی ہو) ایسی مصروف زندگیاں گزارتے ہیں جن کو محشر عمل ہی کہا جاسکتا ہے۔ ان کے شب و روز متعلقہ شعبوں کی گتھیاں سلجھانے میں ہی صرف ہوجاتے ہیں ویسے بھی تحریر ایک فن ہے۔ ہر شعبۂ حیات کے ماہر کے لئے تحریر پر عبور



رکھنا' بھی ضروری نہیں۔ حد سے بڑھی ہوئی مصروفیا' لمحات فرصت کی کمی' ادبی کام سے عدم رغبت کی وجہ سے خود نوشت لکھنے کا رجحان سوانح عمری کی نسبت کم رہا۔ آزادی سے قبل گنتی کی چند خود نوشت منظر عام پر آئی تھیں۔ جبکہ آزادی کی بعد اس کا رجحان بہت بڑھا ہے۔ پھر بھی یہ شعبہ توجہ کا محتاج ہے۔

## خاکہ نگاری

سوانح نگاری اور آپ بیتی کا ایک لازمی عنصر شخصیت کی تعمیر نو ہے۔ ان میں صرف واقعات ہی بیان نہیں کئے جاتے بلکہ صاحب سوانح کے ظاہر و باطن' اوصاف حسنہ اور خامیاں اور شر کے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا جاتا ہے تاکہ سیرت و کردار کے نقش واضح ہوں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ لکھنے والا واقعات بیان کرتا ہے اور ان کے ذریعہ اوصاف کی تفہیم کی ذمہ داری پڑھنے والے پر ڈال دیتا ہے اور اظہار کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ علیحدہ باب قائم کرکے الگ الگ نکات کے طور پر ایک وصف بیان کیا جائے۔ مستحسن طریقہ پہلا ہے اس میں اگر وصف کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کردیا جائے تو معیوب نہیں۔ سوانح عمریاں اور آپ بیتیاں طویل جاتی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں زندگی کی بڑھتی ہوئی مصروفیات اور وقت کی تیز رفتاری نے ایسی فضا پیدا کردی ہے کہ طویل تحریروں کو پڑھنے سے گریز کیا جانے لگا ہے لوگ واقعات میں کم دلچسپی لینے لگے ہیں اور شخصیت کے اوصاف سے واقف ہونا ہی کافی سمجھتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سوانح نگاری کو فروغ نہیں ہورہا ہے اور اس کی جگہ ایک نئی صنف نے لے لی ہے جسے شخصی مرقعے یا خاکے کہا جاتا ہے جو فنی طور پر سوانح عمری اور آپ بیتی میں ایک جزو کی طور پر ہمیشہ سے رائج رہے۔ اس کی کیفیت وہی ہے کہ ایران کے قدیم شاعر نے قصیدہ کی طوالت سے گریز کرکے اس کے ایک حصہ کو جدا کرلیا اور غزل کا نام دے کر رواج دیا تھا۔ نثر نگاروں نے سوانح عمری کے حصہ شخصیت کے اوصاف و کردار کو جداگانہ صنف قرار دے کر خاکہ نگاری شروع کی ہے۔

سوانح عمری' آپ بیتی' ناول اور افسانہ کی نسبت خاکہ نگاری ایک جدید صنف ادب ہے انگریزی میں بھی طویل عرصہ تک سوانح عمری کا رواج رہا اور پھر ڈی کوئنسی (De Quincy) نے شاعروں سے اپنی ملاقاتوں کا حال بیان کرتے ہوئے اس صنف کا تعارف کروایا بیسویں صدی میں اڈمنڈ گاس (Edmond Goose) نے اسٹیون سن (Steven Son) کا کامیاب خاکہ لکھا۔ اس کا شمار ابتدائی دور کے شاہکاروں میں ہوتا ہے۔

میکس بیرہوم (Max Bear Home) اے جی گارڈنر (A.G Gardenar) ہیلیر بلاک

(Helair Bollac) اور جے بی پریسلے (J.B Prisrly) نے اس فن کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

اردو میں اس کے ابتدائی نقش "آب حیات" (مصنف محمد حسین آزاد) میں ملتے ہیں۔ جن شاعروں کے خاکے انہوں نے لکھے ان میں ان سے اکثر سے وہ شخصی طور پر واقف ہی نہیں تھے۔ جو باتیں بطور روایت مشہور تھیں انہیں کو بنیاد بنا دیا اور خاکہ کو دلچسپ بنانے کے لئے تخیل کی کرشمہ سازی اور لفظی موشگافی سے کام لیا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے خاکوں میں حقیقت کم ہے اور داستان طرازی کا عنصر غالب ہے۔ بہر طور ان کا یہ کارنامہ کیا کم اہم ہے کہ انہوں نے اپنے تذکرہ میں خاکہ نگاری کو متعارف کروایا۔ اور مستقبل کے لئے راہ ہموار کی اس خصوص میں دوسرا بڑا نام فرحت اللہ بیگ کا ہے جنہوں نے "نذیر احمد کی کہانی' کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی" تحریر کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کا یہ خاکہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ذاتی معلومات پر منحصر ہے اس لئے حقیقت پسندانہ بھی ہے اور جاندار بھی! انہوں نے نذیر احمد سے عقیدت رکھنے کے باوجود اور ان کی عظمت کا اعتراف کرنے کے باوصف ان کی کمزوریوں کی پردہ پوشی نہیں کی۔ در حقیقت انہوں نے ہی اس صنف کے حدود متعین کئے اور اور ان کا فن کارانہ مظاہرہ بھی کیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی غائر مشاہدہ اور مطالعہ کے وصف رکھتے ہیں اور ان کے تحریر میں انفرادی شان ہے اس لئے ان کی لکھے ہوئے خاکے بھی اپنی نظیر آپ ہیں۔ وہ تمام پہلوں کا جائزہ لیتے ہوئے ذاتی نظریات بھی داخل کرتے جاتے ہیں لیکن اس طرح کہ "انا" کی گونج سنائی نہیں دیتی اور بات پوری ہو جاتی ہے۔ ان ہی کے ساتھ مولوی عبدالحق کا نام بھی ناقابل فراموش ہے۔ ان کی مثالیت پسندی انسانوں میں عظمتوں کو تلاش کرلیتی ہے۔ اپنے خاکوں سے انہوں نے ثابت کردیا ہے کہ سر سید احمد خان' علامہ اقبال' محسن الملک' مولانا محمد علی' سر راس مسعود اگر عظمت کے نشان ہیں تو نام دیو مالی اور نور خان جیسی غیر' معروف شخصیات میں بھی عظمت کی کرنیں موجود ہیں۔

آزادی سے قبل چند ہی ادیبوں نے خاکہ نگاری کی جانب توجہ کی ان کی نسبت صحافی زیادہ پیش پیش رہے چراغ حسن حسرت' عبدالمجید سالک' رئیس احمد جعفری' شورش کاشمیری' شاہد احمد دہلوی سب ہی صحافت کے مرد میدان تھے ان کے خاکے ۱۹۴۷ء سے قبل ہی رسائل اور اخبارات میں چھپے لیکن اکثر کے خاکوں پر مشتمل مجموعے آزادی کے بعد شائع ہوئے اور ان صحافیوں نے آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔

مولانا سید سلمان ندوی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انہوں نے واقف کاروں کی رحلت پر



رسالہ معارف' اعظم گڑھ میں تعزیتی مضامین لکھے اور انہیں میں خاکہ نگاری کا حق ادا کیا اردو میں "وفیات" میں خاکہ نگاری کی روایت انہوں نے ہی قائم کی اور عبدالماجد دریا بادی نے اس روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

خاکہ نگاری کو آزادی کے بعد فروغ حاصل ہوا ترقی پسند ادیبوں کی کاوشوں سے یہ نوخیز پودا بار آور ہو کر تناور درخت بن گیا اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے کہ

"ترقی پسند تحریک نے خاکہ نگاری یا رپورتاژ ایجاد تو نہ کیا ان کو قابل قدر تجربوں سے وقیع ضرور کیا خصوصیت سے خاکہ نگاری کا تو انداز بدل کر رکھ دیا۔ پہلی مرتبہ شخصیت کی انسانی خوبیوں اور خامیوں کو فن کارانہ بصیرت سے اجاگر کیا گیا۔ ورنہ اب تک تو شخصیت نگاری قصیدہ درمدح قسم کی چیز تھی" (۱۰۸)

انسان تو سبھی ہیں۔ انسان اور انسان کے درمیان فرق بھی ہوتا ہے۔ جو ظاہری بھی ہے اور باطنی بھی! انسان کی ظاہری اور باطنی خصوصیات مل کر اس کی شخصیت کی صورت گری کرتی ہیں۔ انسان کو مکمل حالت میں دیکھ لینا اور اس کو حقیقت پسندی کے ساتھ دل پذیر اور دلکش انداز میں تحریر کردینا ہی خاکہ نگاری ہے۔ یہ فن افسانہ کی کردار نگاری سے قریب تر بھی ہے اور اس سے مختلف بھی! افسانہ اپنی مرضی اور کہانی کے تقاضوں کے مطابق کردار بناتا ہے۔ اس کا اپنا نقطۂ نظر کردار کی تکمیل کرتا ہے۔ زندہ انسانوں کا خاکہ تیار کرنا اس لئے مشکل ہے کہ افسانہ نگار کو کردار کے بارے میں جو سہولت حاصل ہوتی وہ خاکہ نگار کو حاصل نہیں ہوتی۔ وہ صاحب خاکہ کے اوصاف اور کردار کا پابند ہوتا ہے اس میں سرمو فرق نہیں پیدا کرسکتا۔ افسانہ میں تصویر فن کار کے تخیل اور اس کے برش کی رہین منت ہوتی ہے وہ اسے برتنے میں آزاد ہوتا ہے جبکہ خاکہ میں مصنف شخصیت کا پابند اور آلہ کار ہوتا ہے۔ اور رنگ لکھنے والے کا! کامیاب خاکہ اسی وقت لکھا جاسکتا ہے جب کہ شخصیت سے طویل عرصہ تک غیر معمولی قربت حاصل رہی ہو۔ اس سے مطالعہ اور مشاہدہ کی تکمیل بھی ہوتی ہے اور مختلف حالتوں میں اس کی نفسیاتی کیفیتوں کو سمجھنے کے مواقع بھی حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اردو میں ماسوا چند خاکوں کے تمام ایسے ہی مطالعہ اور مشاہدہ پر مبنی ہیں سعادت حسن منٹو نے قائد اعظم کا خاکہ تحریر کیا ہے وہ ان کے ذاتی تجربات کا حاصل نہ ہونے کے باوجود اس لئے کارآمد ہے کہ راوی یعنی قائد اعظم کے ڈرائیور آزاد نے اپنی قربتوں کے حوالے سے معلومات فراہم کی تھیں منٹو نے اپنے افسانہ نگاری کے فن کو کام میں لاتے ہوئے ان معلومات میں ایسی جان ڈال دی ہے گویا جو کچھ لکھا ان

کا آنکھوں دیکھا حال تھا۔ "میرا صاحب" کے اس خاکہ میں منٹو کا تخیل ان کا مددگار رہا انہوں نے قائد اعظم سے ملے بغیر آزاد کے بیان سننے کے بعد تصور کو حقیقت کا روپ دیا۔ (VisUlize) کیا ان حالات میں وہ قائد کے قریب ہوتے تو کیا محسوس کرتے۔ تجربے کو احساس کے سہارے پیش کرنا شاعر کا کام ہے ایک اچھا افسانہ نگار جب خاکہ نگاری کرتا ہے تو حسی تجربے سے کام لیتا ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ سنی سنائی باتوں کو بھی ذاتی تجربہ بنا لیا جائے۔ محمد طفیل نے کرشن چندر کا خاکہ تحریر کیا ہے جن سے ان کی ملاقات برائے نام رہی۔ انہوں نے کرشن چندر کی شخصیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی خاطر خواہ کوشش بھی نہیں کی۔ اس لئے ان کے خاکہ میں ان کی تصویر پوری طرح ابھر نہ سکی۔ گویا خاکہ نگاری کے لئے ذاتی تجربے ضروری ہوتے ہیں۔ سنی سنائی کے سہارے خاکے لکھنے کے لئے بھی معلومات کی فراوانی ہونی چاہئے اور خاکہ نگار میں معلومات کو سمجھنے کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ اسی ماحول اور کیفیت کو (VisuliZe) کرنے کی صفت کا ہونا بھی ضروری ہے جو اسے ذاتی تجربہ کی نوعیت سے قریب تر کرے۔

انسان کے ایک نہیں کئی روپ ہوتے ہیں خاکہ اس وقت زیادہ جاندار اور مؤثر ثابت ہوتا ہے جب لکھنے والے کی نظر میں سارے روپ ہوں۔ ہر روپ ایک نیا کیف اور ہر پہلو ایک نئی تصویر پیش کرتا ہے۔ تنوع کے ساتھ خاکہ لکھا جائے تو اس کی کیفیت کئی رخی (Demioision Multi) تصویر کی ہوتی ہے جو شخصیت کی ہمہ جہتی اور لکھنے والے کی فن کاری، دلکشی کا سبب بنتی ہیں اسی طرح شخصیت کی متضاد صفات بھی چونکا دینے والی اور متحیر کر دینے والی ہوتی ہیں۔ اس کی نمایاں مثالیں منٹو کے ان خاکوں میں ملتی ہیں جو انہوں نے باری علیگ اور پری چہرہ نسیم کے بارے میں لکھے ہیں۔ شخصیت کے متنوع پہلوؤں کو پیش کرنے کے اعتبار سے ممتاز مفتی کا لکھا ہوا خاکہ "پچی بھگت" (بانو قدسیہ) مثالی ہے۔

بعض شخصیات خاکے کے موضوع اس لئے بنتے ہیں کہ وہ خاکہ نگار کے محبوب رہے اور بعض اس لئے کہ خاکہ نگار ان کے لئے جذبات خیر نہیں رکھتا۔ پسند اور ناپسند کے معیار لکھنے والے کے اپنے ہوتے ہیں۔ ہر دو صورتوں میں خاکہ کا فنی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا اپنے جذبات کا اظہار کئے بغیر ان حالات، واقعات اوصاف کو بیان کرے جو پسند یا ناپسند کے موجب بنے۔ ضروری نہیں کہ خاکہ نگار اپنے جذبے کا اظہار بھی کرے۔ اس کا حقیقی کام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحریر کے ذریعے قاری کے دل میں بھی ویسے ہی تاثرات پیدا کرے جو اس کے اپنے



دل میں ہیں۔ منٹو کا خاکہ "میراجی" کے بارے میں اس کی بہترین مثال ہے لیکن اگر تحریر کو مدح یا قدح (مدلل یا غیر مدلل) بنا دیا جائے تو وہ خاکہ کی تعریف میں نہیں آتا۔ اس خصوص میں عبدالعنان کی تصنیف "مولانا سید سلمان ندوی کی شان جامعیت" کے علاوہ وہ تمام تحریریں شامل کی جاسکتی ہیں جو "وفیات" کے ضمن میں خاکہ کے طور پر شائع ہوئیں۔ ان میں "یاد رفتگان" (مصنفہ مولانا سید سلمان ندوی، ۱۹۵۵ء) "وفیات ماجدی" (مولانا عبدالماجد دریا بادی، ۱۹۷۸ء) "بزم رفتگان" (سید صباح الدین عبدالرحمن، ۱۹۸۱ء) "کیا قافلہ جاتا رہا" (نصراللہ خان ۱۹۸۳ء) یاد رفتگان (ماہر القادری، ۱۹۷۸ء) کے خاکے شامل ہیں۔ ان خاکوں پر مشرق پاسداری کی روایت غالب ہے۔ جس کے تحت سمجھا جاتا ہے کہ جب خدا سب کچھ جانتے ہوئے عیب پوشی کرتا ہے تو انسان کو بھی عیب جوئی سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اس لئے ایسے خاکے شاذو نادر ہی لکھے گئے ہیں جن میں خامیوں اور عیوب کا ذکر ہے۔ مرحومین کے بارے میں احترام کا رویۂ اختیار کرنا خصوصیت سے مشرق کے مزاج اور روایت کا حصہ ہے بچھڑ جانے والوں کو ہمیشہ اچھے الفاظ ہی میں یاد کیا جاتا ہے یہی کیفیت ان خاکوں کی ہے جو "وفیات" کے ضمن میں لکھے گئے۔

خاکے کا شخصی روابط اور تعلقات کی بنا پر لکھا جانا مناسب ہوتا ہے لیکن اس صورت حال میں بھی خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو خاکہ نگار کی کمزوری شمار کی جاسکتی ہے۔ ایسے خاکے بھی لکھے گئے ہیں جن میں صاحب خاکہ کی تصویر دھندلی ہوتی ہے۔ اور خاکہ نگار پیش منظر میں ہوتا ہے خاکہ میں "میں" کی حد سے بڑھی ہوئی گونج قاری کے ذہن پر منفی اثرات چھوڑتی ہے۔ اوپندر ناتھ اشک نے "منٹو، میرا دشمن" (۱۰۹) میں چاہے کتنی ہی صداقت پسندی سے کام لیا ہو پڑھنے والے پر یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ اشک نے خود کو ہیرو اور بلند قامت شخص بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے مقابلہ میں منٹو ایسے کمزور شخص نظر آتے ہیں جو چیلنج کرتے اور ناکامی کا خطرہ محسوس کرتے ہی "بابو کی گلی" سے فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ اشک نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ منٹو نے بھارت سے پاکستان سے ہجرت بھی اشک کے خوف سے کی تھی جبکہ محمد اسد اللہ نے "منٹو! میرا دوست" (۱۱۰) میں بیان کیا ہے کہ بمبئی کی فلمی دنیا میں عصبیت کے عفریت کے داخل ہو جانے کی وجہ سے انہیں ایسا کرنا پڑا۔

خاکہ میں کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی ضرور ہونا چاہئے لیکن اس طرح کہ انہیں فطرت انسانی کے لازمی جزو کے طور پر پیش کیا جائے اور اس طرح کہ پڑھنے والے کے دل میں جذبۂ

ہمدردی پیدا ہو جائے۔ مطعون کرنا‘ لعن طعن کرنا‘ تنقید اور تعرض کرنا خاکہ نگار کا منصب نہیں ایسے مواقع پر تفصیل میں گئے بغیر اشارہ سے کام لینا مستحسن ہوتا ہے۔ ابو سعید قریشی نے طویل کا خاکے "منٹو" میں ان کی یہ خامیاں بھی تحریر کی ہیں کہ وہ شراب کثرت سے پیتے تھے۔ بازاری عورتوں کے ہاں بھی جاتے تھے تو ان کا سبب حالات کو قرار دے کر ان افعال کو شخصی کمزوری بتایا ہے اور جذبہ ہمدردی کو ابھارا ہے۔ محمد اسد اللہ نے "منٹو! میرا دوست" میں اعتراف کیا ہے وہ بے حد ضدی تھے۔ ان کے چند افسانوں پر مقدمات قائم ہوئے تو انہوں نے ضدی بچے کی طرح ویسے ہی افسانے لکھنے شروع کر دئے۔

"میں" کی غیر ضروری تکرار اور "میں" کے حوالے سے بہت سے ایسی باتیں بیان کرنے کا شوق جن کا صاحب خاکہ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ماہر القادری کے خاکوں میں ملتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر اہم اور غیر اہم واقعہ کو بے محل بیان کر جاتے ہیں۔ کسی شاعر کے خاکہ کے ضمن میں بھوپال کا ذکر آجائے تو والئی بھوپال کی شان میں قصیدہ شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی جانب سے اپنی شاعری کی قدر دانی کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ یہ پیوند کاری معلومات میں تو شاید اضافہ کرے لیکن خاکے کو کمزور کر دیتی ہے۔

ایک دو ملاقاتوں میں نہ تو شخصیت کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ان کا خاکہ لکھنے کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی تحریر خود غمازی کرتی ہے کہ لکھنے والے نے سنجیدگی سے کام نہیں لیا۔ اردو کے صف اول کے ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین کا خاکہ سردار جعفری نے "ادب کے نئے معمار" کے سلسلہ میں لکھا تھا اس میں مخدوم کی شخصیت بھرپور انداز میں پیش کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اور چند ملاقاتوں کا حال بیان کرنے سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ دوسری خامی یہ نظر آتی ہے کہ نظریئے کے حوالہ سے سردار جعفری اپنے آپ کو معلم‘ مبلغ اور رہنما کے طور پر پیش کرتے ہیں تو مخدوم کو فکر و اظہار کے اعتبار سے عاجز شاعر کی حیثیت سے! اس لئے اردو میں لکھے گئے خاکوں میں یہ سب سے کمزور خاکہ ہے۔

خاکوں میں سوانحی حوالے بھی دیئے جا سکتے ہیں اور "سراپا نگاری" بھی کی جا سکتی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور ماہر القادری نے سراپا نگاری کے خاص جوہر دکھائے ہیں اور اپنی معلومات کے مطابق سوانحی حوالے بھی دئے ہیں۔

سراپا خاکہ کا جزو تو ہو سکتا ہے لیکن خاکہ نہیں! سراپا کے علاوہ ظاہری حالت‘ افعال کی کیفیت‘ طرز نشست و برخواست‘ رہن سن کا طریقہ کو بھی خاکے کے اجزائے ترکیبی کے طور پر



استعمال کیا جا سکتا ہے۔

خاکوں میں بات سے بات پیدا کرنا‘ پُر لطف جملہ بازی کرنا بھی روایت کا حصہ بن گئے ہیں پروفیسر رشید احمد صدیقی علم و فکر کے اعتبار سے انتہائی بلندی پر فائز تھے۔ وہ بات سے بات پیدا کرنے کے فن کے ماہر تھے ان کے فقرے شخصیت کے حوالے سے خاص زاویئے پیش کرتے اور حسن اظہار میں اضافہ کرتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی نے بھی یہی رویہ اختیار کیا لیکن رشید احمد صدیقی کی سطح کو نہیں پہنچ سکے۔ اب ہر خاکہ نگار نے فقرہ بازی کو شعار بنا لیا ہے لیکن علم و فکر کی کمی کی وجہ سے وہ اس طرز اظہار سے لطف سخن تو پیدا کر سکے معنویت میں اضافہ نہ کر سکے۔

## موجودہ صورتحال اور مستقبل کے امکانات

اردو میں سوانح نگاری کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ حالی کی "کریٹیکل بیا گرافی" کے نظریئے کے زیر اثر سوانح نگاری کا رجحان عام ہوا۔ اسے علامہ شبلی نے ایک تحریک کی صورت دی ان کی تصانیف نے ایسے نقش دوام چھوڑے جو دوسرے لکھنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ انہیں کی پیروی میں دبستان شبلی کے چراغ روشن ہوئے۔ اس کی لو کو مولانا سید سلیمان ندوی‘ مولوی عبد السلام ندوی‘ شاہ معین الدین ندوی‘ سید صباح الدین عبد الرحمٰن‘ محمد نعیم صدیقی ندوی نے بڑھایا اور اس صنف کے سرمایہ میں گرانقدر اضافہ کے باعث بنے۔ دبستان شبلی کی خوشہ چینی شیخ محمد اکرام‘ غلام رسول مہر‘ عبد الرزاق کانپوری اور دیگر سوانح نگاروں نے کی انہوں نے مسلمانوں کے درخشاں ماضی کے مٹے ہوئے نقش کو تازہ کرنے اور اسلاف کے کارناموں سے بصیرت فراہم کرنے کے نصب العین کے تحت سوانح عمریاں لکھیں۔ یہ آزادی سے قبل کی اہم ترین ضرورت تھے۔ اقوام ہند خصوصاً "مسلمان ۱۸۵۷ء کے بعد احساس شکست کی ذلت سے دوچار تھے۔ ان میں اس حد تک احساس کمتری جاں گزیں ہو چکا تھا کہ وہ اقوام یورپ کو علم و فن کے سمندروں کے شناور سمجھتے اور ان کے مقابلہ میں خود کو انتہائی ہیچ اور کم مایہ جانتے تھے۔ دبستان شبلی کے لکھنے والوں نے اس ذہنی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے سوانح عمریاں لکھیں اور یہ ثابت کیا کہ جن اسلاف کے وہ وارث ہیں ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو اب اہل مغرب میں نظر آتی ہیں بلکہ علوم و فنون کی موجودہ فلک بوس عمارت کی بنیادیں انہیں کے ہاتھوں رکھی گئی تھیں۔ ان کے کارناموں کو مثال بنا کر اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے اس صدی کے مسلمان اپنے آپ کو ان کا سچا وارث ثابت کر سکتے ہیں۔

جب سوانح نگاری کا رجحان عام ہوا اکثر شخصیات پر روایات کے پردے پڑے ہوئے تھے

مستند ماخذات دریافت نہیں ہوئے تھے۔ دبستان شبلی کے لکھنے والوں نے ان کی بازیافت کی سعی میں مشقت برداشت کی اور یہ راہ سجھائی کہ حقائق تک پہنچے بغیر سوانح و شخصیت نگاری کا فرض ادا نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ ادبی تحقیقات کا سلسلہ بھی شروع ہوا مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اردو ادب کے قدیم مخطوطات کا کھوج لگایا اور ادبی شہ پاروں کی اشاعت کے ساتھ مصنفین اور شاعروں کے حالات بیان کرنے کی کوشش بھی کی۔ قدیم دکنی کی لسانی اجنبیت اور حالات کی تحریری شہادتوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہ کام آسان نہ تھا۔ انہوں نے تحقیق کے مرحلے طے کر کے صداقت کی منزلوں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سلسلہ میں ان سے غلطیاں سرزد ہوئیں۔ سوانح عمری لکھنے کے لئے وہ تمام ماخذات تک نہیں پہنچ سکے اور وقت نظر کا ثبوت نہ دیتے ہوئے تصانیف کو ان سے منسوب کیا جو ان کے مصنف نہیں تھے اس کے باوجود ان کی محنت اور جانفشانی کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ انہوں نے نئی راہیں کھولیں اور طریق کار کی نشاندہی کی جو آنے والے دور میں رہنما ثابت ہوئیں۔

ان دونوں تحریکات کی کامیابی کا سبب صرف ان کی تصانیف کا وقیع ہونا ہی نہیں ہے بلکہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ آزادی سے قبل عام لوگوں میں بھی علم کی پیاس موجود تھی۔ وہ چشمہ شیریں سے سیراب ہونے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے سوانح نگاروں کی تصانیف کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کی قدر و منزلت میں کوئی کمی واقع نہ ہونے دی۔

آزادی کے بعد سوانح نگاری اسی تسلسل میں آگے بڑھی۔ اس کی کیفیت (معیار) میں فرق نہیں آیا لیکن کمیت میں کمی واقع ہوتی گئی۔ اس کی ذمہ داری سوانح نگاروں اور قارئین پر یکساں طور پر عائد ہوتی ہے۔ زمانہ کی تیز روی' مسائل کی زیادتی' تحقیق اور غور و فکر کے لمحات کے فقدان اشیائے صرف کی گرانی جس کی وجہ سے ایک قاری کی قوت خرید مفلوج ہو گئی تو دوسری طرف کتابوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ ان سب نے سوانح نگار اور قاری دونوں کو متاثر کیا۔ دبستان شبلی سے تعلق رکھنے والوں کی مصروفیت پڑھنے اور لکھنے تک محدود تھیں۔ وہ فکر معاش سے آزاد تھے اس لئے توجہ' انہماک اور یکسوئی سے تصنیفی کام انجام دیتے رہے۔ ان مصنفین کا علمی اور سماجی مرتبہ بلند تھا جو والیان ریاست یا صاحب ثروت مالی اعانت کرتے وہ ان پر احسان تصور نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے لئے ہی باعث توقیر سمجھتے تھے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ' انجمن ترقی اردو اور ادارۂ ادبیات اردو کو ہر منصوبے کے لئے امداد مل جاتی تھی۔



آزادی کے بعد صورت حال اس سے مختلف ہو گئی۔ علمی' ادبی فرائض انجام دینے سے معاشی مسائل حل ہونے کے امکانات ختم ہو گئے۔ تصانیف سے پیٹ بھرنا ممکن نہ رہا۔ دوسری طرف عوام کے مسائل میں اضافہ ہوتا گیا۔ جس سے پڑھنے کی جانب توجہ کم ہوتے ہوتے اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی شوق مطالعہ سے محروم اور کتاب کے لمس سے ناآشنا ہو گیا ہے۔

حالات اور ماحول کی تبدیلی سے سوانح نگاری کا فن متاثر ہوا۔ وہ اہل علم جو آزادی سے قبل بھی اس جانب متوجہ تھے اپنے ذوق تصنیف کو برقرار رکھا چند نئے لکھنے والوں نے ان کا ساتھ دیا لیکن جس وسیع پیمانے پر مستند کام ہونا چاہئے تھا معدودے چند مستثنیات کے سوا نہ ہو سکا۔

آزادی سے قبل کی سوانح نگاری ایک مخصوص ڈگر پر چلتی رہی اس میں تنوع اور تجربات کی کمی رہی۔ اس دور کی نسبت آزادی کے بعد ان کا ضرور خیال رکھا گیا۔ "آثار ابوالکلام آزاد" (مصنفہ قاضی عبدالغفار ۱۹۳۹ء)' پریم چند (مصنفہ ہنس راج رہبر ۱۹۵۰ء) یادگار حالی (صالحہ عابد حسین ۱۹۳۹ء) حکیم الامت' نقوش و تاثرات (عبدالماجد دریا بادی' ۱۹۵۲ء) اللہ کی تلوار' خالد بن ولید (میجر جنرل آغا محمد ابراہیم' ۱۹۷۵ء) حیات اقبال کے مخفی گوشے (حمزہ فاروقی ۱۹۸۸ء)' فیض احمد فیض (کے کے کھلر' ۱۹۹۰ء) مروجہ سانچے کے برخلاف اظہار کے تجربات اور بیان کے تنوع کے حامل ہیں۔ ہنس راج رہبر' عبدالماجد دریا بادی اور کے کے کھلر ادیب اور انشا پرداز ہیں جو اپنا اپنا منفرد اسلوب رکھنے کے ساتھ تخلیقی صلاحیتیں بھی رکھتے ہیں ان کی سوانحی تصانیف میں تخلیقی فن کی تمام خوبیاں سما گئی ہیں۔

ادبی شخصیات کی سوانح عمری کی تحریر کا جو سلسلہ مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور سے شروع ہوا تھا وہ بھی تسلسل کے ساتھ جاری رہا اور دوسرے شعبوں کی نسبت زیادہ تصانیف اس سے متعلق شائع ہوئیں۔ عام سوانح نگاروں کے علاوہ پاک و ہند کی جامعات کے شعبہ ہائے اردو نے اس سلسلہ میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ جامعاتی مقالوں کے لئے ایک خاص ہیئت ترکیبی (Patron) رواج پا گیا ہے۔ ان میں سیاسی' معاشی' معاشرتی' تہذیبی پس منظر جداگانہ' حالات زندگی جداگانہ اور خدمات جداگانہ ابواب میں اس طرح سمیٹے جاتے ہیں کہ باہم ربط قائم نہیں رہتا حیات انسان اس پس منظر کی آفریدہ ہوتی ہے جس میں وہ پروان چڑھی اس کا بیان حالات زندگی کے ساتھ ہونا چاہئے تاکہ اس کے اثرات کی نشاندہی ہو سکے کارنامے زندگی کا حصہ ہوتے ہیں انہیں بھی حالات زندگی سے پیوست ہونا چاہئے مروجہ طریقے کو جدت طرازی کا نام دیا

جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے جامعات کی خدمات کی تحسین لازمی ہے۔

آزادی کے بعد شخصیت پرستی کے ایک نئے رجحان نے رواج پایا ہے۔ یہ جشن سپاس اور یادگاری جشن ہیں۔ اکابر کی زندگی میں ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر جشن منانا، رسائل کے خصوصی شمارے شائع کرنا اور ان کے حالات زندگی اور کارناموں کے حوالے سے کتابیں شائع کرنا بھی مستحسن روایت ہے۔ اسی طرح مشاہیر کے یوم پیدائش یا یوم وفات پر یادگار تقریبات منعقد کرنا بھی سماجی روایت بن گئی ہیں۔ قائد اعظم، علامہ اقبال، مولانا آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، حالی پریم چند کے صد سال یوم پیدائش منائے گئے۔ ان بزرگوں میں کسی کی بھی سوانح عمری آزادی سے قبل نہیں لکھی گئی تھیں۔ زیادہ تر کام آزادی کے بعد ہوا بالخصوص صد سالہ یادگاری تقاریب کے سلسلہ میں وقیع تحقیقی کام ہوا اور سوانح عمریاں لکھی گئیں۔

جدید دور میں جن رجحانات نے فروغ پایا ہے ان میں ایک اختصار پسندی، دوسرے کارناموں کا اعتراف اور تیسرے سوانح سے زیادہ اوصاف پر توجہ ہیں۔ اختصار پسندی نے مستقل سوانح عمریوں کے بجائے سوانحی خاکوں کو رواج دیا۔ اکابرین اور مشاہیر کے بارے میں جو کتابیں شائع ہورہی ہیں ان کی ابتدا میں مختصر سوانحی حالات بیان کردیئے جاتے ہیں اور تصنیف کا بڑا حصہ کارناموں کو توضیح و تشریح اور ان پر تنقید و تبصرے پر منحصر ہوتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کارنامے تو اجاگر ہورہے ہیں لیکن شخصیات دھندلاتی جارہی ہیں۔

موجودہ زمانہ میں تصنیف و تالیف کو ہنر نہیں نام آوری کا ذریعہ سمجھا جانے لگا ہے۔ اب مسابقت اس طور نہیں ہوتی کہ کس کا معیار تصنیف بلند ہے بلکہ اس پیمانے پر ہوتی ہے کہ کسی کی کتابیں زیادہ تعداد میں شائع ہوئی ہیں۔ اس کا سہل طریقہ یہ ایجاد ہوا ہے کہ ایک شخصیت سے متعلق دس، بارہ مضامین یکجا کئے اور شائع کروایا، صاحب کتاب بن گئے۔ ان نوع کی کتابوں میں مضامین چاہے سوانحی حالات کے بارے میں ہوں، شخصیت کے بارے میں یا خدمات اور کارناموں کے بارے میں یکساں معلومات ملتی ہیں ہر مضمون دوسرے کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے نہ تو فن سوانح نگاری کی خدمت ہوتی ہے اور نہ موضوع کے ساتھ انصاف ممکن ہوتا ہے۔ اس سہل نگاری نے سوانح کے فن کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ

ایک حلقہ نے آزادی سے قبل کی سوانح نگاری کے تسلسل کو باقی اور جاری رکھا آزادی کے بعد اس فن کے فروغ کے لئے نئے تجربات کئے گئے مستقل سوانح عمریوں کی جگہ سوانحی



خاکوں کا بالوجوہ رواج ہوا۔ اکابرین اور مشاہیر کی یاد منانے سے فن۔ ‍انح نگاری کو سہارا ملا سہل نگاری نے اسے نقصان پہنچایا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سوانح عمریوں، آپ بیتیوں اور خاکہ نگاری کا سلسلہ جاری ہے لیکن ان کی نوعیتیں مختلف ہیں۔ جہاں تک سوانح نگاری کا تعلق ہے الطاف فاطمہ کا یہ کہنا درست ہے کہ

"۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک اس فن کی طرف برائے نام ہی توجہ دی گئی اور جو کچھ منظر عام پر آیا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں تک کہ غالب کی سو سالہ برسی کے موقع پر بھی غالب کی کوئی ایسی سوانح عمری منظر عام پر نہ آئی کہ جس کو حالی کی یادگار غالب یا مولانا رسول مہر کی، غالب پر بحیثیت مواد نہ سہی، بحیثیت اسلوب ہی کوئی اضافہ کہا جائے۔"

الطاف فاطمہ کے بیان میں اضافہ کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دور جدید کی علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی، سماجی شخصیات کی سوانح عمریاں بھی کم لکھی گئی ہیں اس صنف کی جانب ادیبوں کی بے توجہی کا یہ عالم ہے کہ مشاہیر شعراء اور ادباء کی داستان حیات بھی پردۂ اخفا میں ہے۔ ان کے بارے میں چیدہ چیدہ واقعات بطور حوالہ مضامین درج کردیئے جاتے ہیں۔ روداد حیات کو مکمل اور جامع طور پر پیش کرنے کی سعی نہیں کی جاتی۔ علامہ اقبال کے سوا اس صدی کے کسی شاعر کی جانب سوانح نگاری کے نقطۂ نظر سے توجہ نہیں کی گئی۔ اسی طرح جدوجہد آزادی کے بے شمار حریت پسند ایسے ہیں جن کے واقعات زندگی بھلائے جاچکے ہیں اور اب کوئی لکھنا بھی چاہے تو مواد کی فراہمی انتہائی مشکل مرحلہ ہوگا جو سوانح نگاروں کی حوصلہ شکنی کا سبب ہے۔

سوانح نگاری کی جانب عدم توجہی کی دو بنیادی وجوہات ہیں اور ان دونوں کا تعلق ذہنی رویہ سے ہے ایک وجہ یہ ذہنی رویہ ہے کہ کارناموں کے بارے میں مکمل یا غیر مکمل معلومات کو کافی سمجھا جانے لگا ہے۔ اس لئے جو کچھ لکھا جاتا ہے ان کی اہمیت علمی اور تاریخی نوعیت کی ہوتی ہے عام قاری میں کوائف زندگی معلوم کرنے کے رجحان میں کمی واقع ہونے کے سبب لکھنے والے بھی اس جانب توجہ نہیں کرتے اور اس زحمت سے بچ کر گزر جانا چاہتے ہیں جو صداقت اور حقائق کی تلاش میں لاحق ہوسکتی ہے۔

دوسرا سبب عام غیر سنجیدہ رویہ ہے۔ مسائل حیات کی بہتات اور صحیح ذہنی تربیت کے فقدان کی وجہ سے بحیثیت فرد کسی نصب العین کا تعین ہی نہیں کیا گیا۔ بے مقصد سانس لینے اور کسی منزل کو پیش نظر رکھے بغیر وقت گزارنے والی قومیں جو انحطاط اور انتشار کا شکار ہوتی ہیں

اسی کیفیت سے ہم دو چار ہیں۔ علوم کی وسعت کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے جذبے اور علوم کی گہرائیوں سے واقف ہو کر زندگی میں توانائی پیدا کرنے کے جذبے سے عاری ہونے کی وجہ سے ہم علم و ادب کے ہر شعبہ کے بارے میں سطحیت سے دو چار ہیں۔ ایسے میں سوانح عمری لکھنے یا پڑھنے سے کسے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس ذہنی خلفشار کے دور میں پاک و ہند کی جامعات اور "جشن" منانے کی رسم نے اس صنف کو سہارا دیا ہوا ہے جب تک علوم و فنون و ادبیات کی جانب عام رویہ غیر سنجیدہ رہے گا سوانح عمری کے فن کی ترویج و ترقی کے امکانات روشن نہیں ہوں گے۔

آپ بیتی بھی کثیر تعداد میں منظر عام پر نہیں آئی ہیں لیکن یہ امر باعث طمانیت ہے کہ آزادی سے قبل اس پر توجہ کم کی جاتی تھی اب (یعنی آزادی کے بعد) زیادہ کی جانے لگی ہے اور چند نہایت کامیاب 'معلومات' آفرین اور بصیرت افزا آپ بیتیاں منظر عام پر آئی ہیں۔ اس کی ترویج میں بھی دو عناصر حائل ہیں۔ ایک مشاہیر کی عدم فرصتی اور دوسرے مشرقی ذہنی رویہ کے تحت آپ بیتی کو خود ستائی کی ایک شکل قرار دے کر اسے معیوب سمجھنا ہے۔ سوانح عمری کی طرح اس کی ترقی کے امکانات بھی معدوم ہیں اب تو ایسے مشاہیر تلاش سے بھی نہیں ملتے جن کی زندگی کے تجربات بصیرت فراہم کر سکیں۔ البتہ چند ادیبوں کی کاوشوں سے اس صنف میں قابل قدر اضافے ہوئے ہیں ان میں جہان دانش (احسان دانش) گرد راہ (اختر حسین رائے پوری) مٹی کا دیا (مرزا ادیب) شہاب نامہ (قدرت اللہ شہاب) خصوصیت سے اہم ہیں۔

ان میں جس صنف کی ترقی کے امکانات روشن ہیں خاکے ہیں۔ یہ نسبتاً" مختصر ہوتے ہیں۔ ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنا پر تحریر کئے جاتے ہیں۔ اس کے لئے وہ جانکاہی نہیں کرنا پڑتی جو سوانح نگاری کے لئے دریافت احوال کے لئے تحقیق کی وجہ سے ہوتی ہے۔ وہ تمام اہل قلم جو افسانہ نگاری میں درک رکھتے ہیں بآسانی زندہ انسانوں کی کردار نگاری بھی کر سکتے ہیں ادیبوں اور صحافیوں کے ذریعہ اس کی نشوونما ہوئی ہے اور اس نے ترقی کی اہم منزلیں آزادی کے بعد ہی طے کی ہیں۔ سعادت حسن منٹو' شاہد احمد دہلوی' ممتاز مفتی' ضمیر جعفری اور محمد طفیل کے خاکے خاص ادبی شان کے حامل ہیں ان میں محمد طفیل کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے زیادہ خاکے تحریر کئے ہیں۔

مختصر ہونے کی وجہ سے خاکے لکھنا بھی سہولت کا باعث ہے اور پڑھنے والوں کے پاس وقت کی کمی کے باوجود ان کا مطالعہ کرنا ممکن ہے۔ رسائل اور اخبارات میں ان کی اشاعت آسانی



سے ہو جاتی ہے اس لئے خاکہ نگاری کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور توقع کی جا سکتی ہے کہ مستقبل میں ان کا رواج اسی طرح باقی رہے گا یہ صنف پھلے پھولے گی اور اس میں اظہار اور بیان کے نئے نئے امکانات پیدا ہوتے جائیں گے۔

## اردو ادب پر اثرات

سوانح عمری' آپ بیتی اور خاکے جو فنی لوازمات کے ساتھ لکھے جائیں جن میں پیش کردہ مواد معلومات افزا ہوں' حسن ترتیب اور حسن بیان سے جسے ادبی شان عطا کر دی ہو ادب کے ہی حصے قرار پاتے ہیں اور یہ ماننا پڑے گا کہ ان اصناف نے ادب کی توسیع کی ہے اس میں وسعت پیدا کی ہے اور زندگی کے خدوخال کو اصلی روپ میں پیش کرنے کے مرحلہ پر ناول اور افسانے کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ان اصناف کا ہی فیض ہے کہ افسانوی ادب (فکشن) میں زندگی کے اسی طور مشاہدہ اور مطالعہ پر زور دیا جانے لگا ہے جیسی کہ وہ ہے وہ حقیقت نگاری کے نمائندہ بھی ہیں اور اس کی ترویج و ترقی و توسیع کا سبب بھی۔

اردو کے شاعروں کے تذکرے لکھنے کا رواج زمانہ قدیم میں عام رہا ہے۔ ان میں سوانحی اشارے بہم ہوتے بالخصوص سنین کی اہمیت کو قطعی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ سوانح عمری کے رواج پانے سے تذکرہ نگاری کے رجحان میں بھی فرق پڑا۔ اب تذکرہ نے مختصر سوانح کی صورت اختیار کر لی ہے جس کی وجہ سے اس کی حیثیت اور اہمیت میں اضافہ ہوا ہے اور اگر تذکرے لکھے گئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہوا سوانحی فن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس کی زیر اثر سنین کے اندراج کو ضروری خیال جانے لگا ہے۔

ہمارے اسلاف کے علمی ادبی کارنامے زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق رہے ہیں لیکن عرصہ دراز تک ان کی اہمیت اور افادیت کی جانب توجہ نہیں کی گئی۔ موجودہ صدی میں خصوصیت سے تمام علوم و فنون کے مشاہیر کے کارناموں پر تحقیق کا کام وسیع پیمانے پر ہوا ہے۔ کارناموں کی باز یافت' ان کا تجزیاتی مطالعہ اور ان کے مرتبہ اور اہمیت کا تعین محققین کے مطمح نظر رہے ہیں۔ اس شعبہ میں بڑی ترقی ہوئی ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان تحقیقات میں ان عناصر کو بھی جگہ دی جاتی ہے جن کا تعلق مشاہیر کی زندگی' ان کے ماحول' اور تاریخی دور سے ہے اس طرح بالواسطہ طور پر سوانحی مطالعہ کے بغیر علمی' ادبی' تحقیق کا کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔

سوانح عمری کے زیر اثر ناول کی صنف میں جو ندرت پیدا کی گئی اسے "تاریخی ناول" بھی کہا

جا سکتا ہے یہ ناول اور سوانح عمری کی ملی جلی شکل ہوتی ہے۔ اردو میں اس کا رواج برائے نام ہی سی ہوا ضرور ہے۔ عبدالحلیم شرر نے جو بنیادی طور پر تاریخ دان تھے تاریخی ناول لکھنے کی ابتدا کی تھی۔ ان کے ناولوں میں شخصیت کے سوانحی کوائف پر تاریخ حاوی ہے۔ کردار نگاری پر مثالیت غالب ہے۔ آزادی کے بعد عشرت رحمانی نے غالب کی سوانحی عمری "مرزا نوشہ" کا آغاز ناول کے انداز میں کیا لیکن وہ چونکہ ناول نگار نہیں ہیں آخر تک اس انداز کو نبھا نہیں سکے۔ تاریخی یا سوانحی ناول لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ مصنف ان فنون کے رموز سے کما حقہٗ واقف ہو۔ ایسے ادیبوں اور مصنفوں کی کمی کی وجہ سے یہ شعبہ ترقی نہ کر سکا۔ البتہ اس میں سب سے کامیاب کوشش قرۃ العین حیدر کی "کارِ جہاں دراز ہے" (۱۱۲) قرۃ العین اردو کی صاحب طرز افسانہ نگار ہیں۔ ان کی ہر تحریر میں افسانہ کی خصوصیات نمایاں رہتی ہیں۔ اس لئے اپنے اسلاف اور اپنے بارے میں جب انہوں نے قلم اٹھایا تو اسے بھی ایک طویل ناول کے طور پر لکھا۔ "کارِ جہاں دراز ہے" میں کہانی کی ابتدا فرات وجیحوں کے تاریخی اور جغرافیائی حالات کے ساتھ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب ان کے خاندان کے بزرگ سید کمال الدین ترمذی بارھویں صدی عیسوی میں نواح جیحون سے مراجعت کر کے ہند آئے کیتھل متصل تھانیسر قیام پذیر ہوئے وہ اولین صوفیائے کرام میں سے تھے جو وارد ہند ہوئے اور اسلام کے نور کو پھیلایا۔ نسل بعد نسل ان کے افراد خاندان نے جو دینی اور دنیاوی خدمات انجام دیں ان کی تفصیل اس طرح ممکن ہے کہ تاریخ اور سوانح عمریاں باہم گتھی ہوئی ہیں۔ پہلا حصہ جو ساڑھے چار سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے آٹھ صدیوں کی داستان اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس میں قابل لحاظ حصہ سجاد حیدر یلدرم کے بارے میں ہے۔ دوسرا حصہ خود نوشت سوانح عمری ہے اس پر بھی وہی داستانی فضا چھائی ہوئی ہے۔ واقعات کا تعلق ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۱ء تک ہے اس کا ایک حصہ بزرگوں کی سوانح عمریوں اور دوسرا خود نوشت پر مشتمل ہے ہر دو سرا حصہ تاریخی ناول کے جا سکتے ہیں جو ہر اعتبار سے نمونہ ہیں اردو میں تاریخی ناول میں اس کو نمائندہ حیثیت حاصل ہے اس سے قطع نظر اس زبان کا دامن خالی دکھائی دیتا ہے جبکہ قرۃ العین حیدر کا کہنا ہے کہ

"مغرب میں کسی ادیب یا شاعر کا نام لیجئے۔ ہربرٹ ریڈ، ورجینا وولف، شان او کیسی، ولیم پلومر، سر اوز برٹ سٹ ول، ایلزبتھ لونگ، اسپنڈر، اشرووڈ، سارتر، سیموں دوبووا، جوزف ہون، سسکتھ ویرن، ہربرٹ گورین وغیرہ (پروفیشنل سوانح نگاروں سے قطع نظر) ان کے لکھے ہوئے سوانحی ادب کا انبار آپ کو مل جائے گا۔ اس نوع کی درجنوں تازہ ترین کتابیں ہر مہینے انگلستان



اور امریکہ میں چھپ رہی ہیں اجتماعی ناول، رائٹرز نوٹ بک اور فیملی ساگا آج کل انگلستان میں از حد مقبول ہیں کیونکہ وہاں "فیملی" ختم ہو چکی ہے (۱۱۳)

شاعری میں مرثیہ کا مطالعہ کیا جائے تو اس پر بھی سوانح عمری کا عنصری ملے گا یہ اور بات ہے کہ عقیدت اور روایت کے شامل ہو جانے سے اس میں حقیقت نگاری اتنی باقی نہیں جتنی تاریخ میں ملتی ہے آج کل جو شعری مجموعے شائع ہو رہے ہیں ان میں بھی شاعر کے جزوی یا مختصر سوانح یا خاکہ شامل کرنے کا رجحان عام ہے اسی طرح شخصیات پر جو تحقیقی مقالات لکھے جاتے ہیں اس میں موضوع کا سوانحی خاکہ یا کتاب کے پہلے باب کو عموماً مختصر یا جزوی حالات زندگی کے لئے وقف کرنا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد اردو کے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور محققین اور دیگر مشاہیر کی زندگی کے بارے میں جاننے کا تجسس بڑھتا جا رہا ہے اور تحقیقی عمل کے ذریعے ان کے کارناموں کے ساتھ ہی کوائف زندگی بھی مرتب کئے جا رہے ہیں جس سے مستقبل کا محقق یا نقاد ان کے بارے میں اپنے تنقیدی و تحقیقی عمل سہل بنا سکتا ہے۔ نصابی کتب میں بھی مصنف کا سوانحی خاکہ یا مختصر جزوی سوانح شامل کرنے کا رجحان عام ہو رہا ہے خصوصاً کالج اور جامعات کی سطح پر اردو زبان و ادب کی نصابی کتب میں یہ بات ضروری سمجھی جانے لگی ہے اور یہ سب آزادی کے بعد جدید دور کے حالات کی روشنی میں اردو سوانح نگاری کے باب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ جس کے سبب "اردو سوانح نگاری" اردو زبان و ادب کی ایک ممتاز، مقبول اور مستند صنف کی حیثیت میں سامنے آئی ہے۔ جس کے خوشگوار اثرات اردو ادب کی تمام اصناف پر نمایاں ہیں اور "آزادی کے بعد اردو سوانح نگاری" اردو زبان و ادب کی ایک نہایت معتبر صنف بن گئی ہے۔ جس کے اثرات سے خزینۂ علم و ادب میں خوشگوار اضافے ہو رہے ہیں لیکن اضافے کا عمل نہایت سست ہے۔ جس کی وجہ ادب کے قارئین کی مسلسل کمی، لکھنے والوں کی حوصلہ شکنی کا سبب بنتی ہے اور دوسری اصناف کی طرح سوانح نگاری کے زمرے میں بھی سہل نگاری نے جگہ بنائی ہے۔ جس کے سبب مستقل سوانح کی جگہ شخصی مرقعے یا خاکہ کے لکھنے کے رجحان کو تقویت ملی ہے۔

رسائل میں تخلیقات کی اشاعت کے ساتھ لکھنے والوں کے بارے میں معلومات کی فراہمی بھی ضروری سمجھی جانے لگی ہے۔ ان کی نوعیت تعارفی خاکے کی ہوتی ہے گویا سوانحی حوالوں کی اہمیت کسی نہ کسی طور بڑھ رہی ہے اور یہ رجحان بھی سوانح عمریوں کی افادیت کا ترجمان ہے۔ آزادی کے بعد اردو کے ادبی رسائل کے شخصیات نمبروں نے اس رجحان کو عام کرنے میں اہم

کردار ادا کیا ہے جو سوانح نگاری کے باب میں خوش آئند ہے۔

## جدید ذرائع ابلاغ کی روشنی میں ترقی کے امکانات

موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ کی بہتات اور اشاعتی ذرائع کی فراوانی ہے جو آزادی سے قبل میسر نہ تھے۔ ریڈیو فلم اور اخبارات آزادی سے قبل بھی تھے ریڈیو سرکاری تحویل میں ہونے کی وجہ سے انگریز حکمرانوں کی پالیسیوں کے پابند تھے اور انہیں کے مقاصد کے لئے کام کر رہے تھے۔ اس لئے قومی مقاصد کے پروگراموں کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ آزادی کے بعد ریڈیو کی اہمیت بڑھ گئی۔ ایسے مواقع حاصل ہوگئے کہ تاریخ کے ابواب اور مشاہیر کے کوائف مثال کے طور پر پیش کئے جاسکتے اس بارے میں کوشش بھی ہوئی لیکن محدود پیانے پر! صرف چند منتخب شخصیات کے بارے میں تفصیلی پروگرام پیش کئے گئے۔ تقاریر، فیچر اور دوسرے طریقوں سے ان کے کوائف زندگی اور کارناموں کو سامعین تک پہنچایا گیا۔ یہ کوشش خاص مواقع تک محدود رہی کبھی کسی کے یوم رحلت پر اسی نوعیت کے پروگرام نشر ہوئے۔ ریڈیو کے ارباب حل وعقد نے اس کے دائرے کو وسیع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جس طرح ۱۸۵۷ء کی یاد میں نشر ہونے والے پروگراموں میں تسلسل کے ساتھ سو سال قبل کے حریت پسندوں کو متعارف کروانے کا فرض ادا کیا گیا اسی طرح جدوجہد آزادی کے نامور اور گمنام جاں فروشوں کے لئے بھی ہفتہ یا پندرہ روز کے مسلسل پروگرام مرتب کرکے ان کے سوانحی حالات اور کارنامے پیش کئے جاسکتے تھے۔

ریڈیو نے ان اصناف کے حوالہ سے دو اہم کام انجام دیئے ہیں۔ ایک ایسے انٹرویو نشر کرنا جو شخصیت کے کوائف اور سیرت کو سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔ دوسرے خاص مواقع پر یاد تازہ کرنے کے لئے ایسے پروگرام پیش کرنا جو خاکے کے زمرے میں آتے ہیں۔ ریڈیو والوں کی اپنی مجبوریاں بھی ہیں انہیں اپنے ہر نوعیت کے سننے والوں کو مطمئن کرنا پڑتا ہے ویسے بھی خاکوں کے لئے بھی ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا لیکن ان سب سے بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ اب بھی ریڈیو سرکاری تحویل میں ہے۔ ارباب حل وعقد سنجیدگی سے وسیع پیانے پر تعمیری نوعیت کے پروگرام مرتب کرنے کے بجائے سرکار کی مرضی معلوم کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی سعی میں لگے ہوتے ہیں۔ اس ذریعہ ابلاغ کو مکمل طور پر آزاد کردیا جائے اور اس کا کاروبار دانشوروں کے ہاتھ میں آجائے تو اس بات کا امکان ہے کہ دور اندیشی اور نصب العین کے تعین کے ساتھ طویل المدتی پروگرام مرتب ہوسکیں اور اس وقت علم وادب، تاریخ وسیاسات، مذہب وتصوف کے حوالہ سے موجودہ اور گزشتہ مشاہیر کے حالات زندگی اور کارناموں پر بسیط اور وقیع



پروگرام مرتب کئے جائیں۔

ریڈیو نے ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ کلام شاعر بزبان شاعر کے بے شمار کیسٹ تیار کرکے محفوظ کرلئے ہیں۔ اس طرح ان کے ہاں انٹرویوز پر مبنی بھی لاتعداد کیسٹ ہیں۔ ان ہی کی طرح مشاہیر کی آپ بیتیوں کو بھی ریکارڈ کیا جاسکتا ہے چاہے واقعات از خود بیان کئے جائیں یا ان کا انکشاف مرتبہ سوالات کے جواب کے طور پر ہو۔ اب جو انٹرویو نشر ہوتے ہیں ان میں سوانحی حوالے برائے نام ہوتے ہیں۔

ریڈیو سوانح عمریوں، آپ بیتیوں اور خاکوں کے ذریعہ ان اصناف کی محدود پیانے پر خدمت کررہا ہے اس کی توسیع سے ایک اہم قومی فرض بھی ادا ہوگا۔ ان اصناف کی ترقی کے امکانات بھی بڑھیں گے اور رفتہ رفتہ سامعین میں ذوق وشوق بھی پیدا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ ریڈیو پروگرام سامعین کی دلچسپی کو ملحوظ رکھ کر بنائے جاتے ہیں لیکن اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ ریڈیو کا کام سامعین کی ذہنی تربیت بھی کرنا ہے۔

اخبارات اہم ذرائع ابلاغ میں شمار ہوتے ہیں انہیں ایک صدی سے نمایاں مقام حاصل ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی خبروں کی فراہمی کے علاوہ معاشرتی مسائل کی نمائندگی اور سیاسی معاملات کے تجزیے اور قارئین کی ذہنی تربیت ان کے فرائض میں شامل ہیں جسے وہ بخیر وخوبی انجام دیتے ہیں۔ ان میں ذہنی تربیت کا شعبہ انتہائی وسیع ہے اس کے تحت مشاہیر کا تعارف سامنے آتا ہے۔ تاریخ کی عظیم ہستیوں، علوم کے ماہرین، قوم کے پرانے اور نئے خدمت گزاروں کے تجربات زندگی کو بطور مثال موثر انداز میں پیش کرکے قوم کے نوجوانوں کی ذہنی تربیت کی جاسکتی ہے اس سلسلہ میں بھی اخبارات قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آئے دن مشاہیر کے حالات زندگی اور ان کی خدمات کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے لیکن اسے وسیع پیانے پر اور منظم طور پر کرنے کی ضرورت ہے۔

اخبارات ماضی کے ہوں یا حال کے ان کی اہمیت ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ دن گزر جائے تو اس دن کا اخبار ردی ہوجاتا ہے حقیقی صورت حال یہ نہیں ہے۔ تاریخ اور سوانح عمری لکھتے وقت اخبارات میں شائع ہونے والی خبریں ہی مصدقہ مواد کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ گویا اخبارات ان اصناف کی دو طرح سے خدمت انجام دیتے ہیں۔ ایک سوانح عمریوں اور کارناموں پر مشتمل مضامین شائع کرکے دوسرے مستقبل کے سوانح نگار اور مورخ کے لئے اہم معتبر مواد محفوظ کرکے! اس دوسری خدمت کا اعتراف تا حال پوری طرح

نہیں کیا گیا ہے۔ سوانح نگاری کے لئے ذرائع معلومات کو تو استعمال کیا جاتا ہے لیکن اخبارات کی جانب کم توجہ کی جاتی ہے۔ اس لئے ہم اخبارات کو غیر رسمی ذریعہ معلومات (Unconventional Source of information) کہہ سکتے ہیں۔ بیدار مغز تحقیق میں اس سے استفادہ کا رجحان بڑھ رہا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اخبارات کو کتب خانوں میں محفوظ رکھنے کا جو اہتمام ہونا چاہئے تھا کبھی نہیں کیا گیا۔ قدیم اخبارات کے فائل تو کیا چند شمارے دستیاب ہونا بھی مشکل ہے۔ آزادی کے بعد اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور ان کے محفوظ رکھنے کا اہتمام ہونے لگا ہے۔ آنے والے زمانہ میں سوانح نگاروں کو' بیش بہا معلومات کا ذخیرہ ان ہی میں ملے گا۔ اخبارات کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

جو صورت حال اخبارات کی ہے کم و بیش وہی رسائل کی ہے۔ اخبارات کی نسبت ادبی رسائل پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آزادی سے کچھ عرصہ قبل اور آزادی کے بعد مسلسل طور پر یہ رجحان پیدا ہوا ہے کہ سوانح و شخصیت کو بھی رسالہ کے دائرہ میں شامل رکھا جائے۔ اگرچہ زیادہ توجہ قدیم و جدید شاعروں اور ادیبوں کو دی جاتی ہے ان کے حالات زندگی کے حوالے سے ایک ایک چھپے ہوئے گوشہ کے بارے میں تحقیق کو رسائل کے ذریعہ منظر عام پر لایا جاتا ہے۔ پیش کردہ معلومات کی تائید اور مخالفت میں مضامین شائع ہوتے ہیں جن کے ذریعہ سچائی تک رسائی ممکن ہوتی ہے رسائل کے ذریعے مکمل جزوی مختصر سوانح عمری کی خدمت ناقابل فراموش ہیں۔ موجودہ صدی کی دوسری دہائی سے رسالہ زمانہ کانپور نے خود نوشت سوانح عمریوں کا سلسلہ شروع کیا تھا جو عرصہ تک جاری رہا۔ آزادی کے بعد بھی یہ روایت قائم رہی۔ اختر حسین رائے پوری کی خود نوشت "گرد راہ" رسالہ افکار میں چھپی تھی۔ قرۃ العین کی آپ بیتی کا آغاز رسالہ آج کل دہلی سے ہوا تھا۔ رسالہ نقوش نے آپ بیتی نمبر نکال کر ماضی اور حال کے اہل علم و ادب کی خود نوشت کو محفوظ کر لیا ہے۔

شخصیات کی یاد تازہ رکھنے کے حوالہ سے بھی رسائل کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ میر نمبر' غالب نمبر' اقبال نمبر' فیض نمبر' جگر نمبر' حفیظ جالندھری نمبر' سرسید نمبر' سلیمان ندوی نمبر' ابوالکلام آزاد نمبر' حسرت موہانی نمبر' اور ایسے ہی بہت سے خاص نمبر شائع ہوئے ہیں جن کی ہمہ پہلو افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان خصوصی شماروں کو مناسب منصوبہ بندی سے مرتب کیا جائے۔ سوانح عمری شخصیت اور اوصاف اور کارناموں کے



لئے الگ الگ حصے مختص کئے جائیں اور متعلقہ شعبہ کے ماہرین سے ان کے بارے میں مقالات تیار کروائے جائیں اس طرح کوئی شعبہ تشنہ نہیں رہے گا اور وہ عیب بھی باقی نہیں رہے گا جو مطالب کی تکرار کی وجہ سے فی زمانہ نظر آتا ہے۔

رسائل نے جہاں سوانح عمریوں اور آپ بیتیوں کے ضمن میں اہم خدمات انجام دی ہیں ان کے اعتراف کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ سب سے زیادہ خدمت خاکہ نگاری کی' کی ہے۔ دراصل اس صنف کو متعارف کروانے' نشو و نما دینے پروان چڑھانے میں اہم ترین فرض رسائل نے ادا کیا ہے آج بھی معتدد رسائل کا کوئی شمارہ ایسا نہیں ہوتا جس میں کسی نہ کسی کا خاکہ موجود نہ ہو۔

رسائل کا دائرہ کار بے حد وسیع ہے اور اپنے اپنے رجحان کے اعتبار سے ہر سال ان اصناف کی خدمت انجام دے رہا ہے مذہبی نوعیت کے رسائل میں مذہبی شخصیات' ادبی رسائل میں ادبی' علمی کے علاوہ دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات' سیاسی اور تاریخی نوعیت کے رسائل میں ان شعبوں سے متعلق شخصیات کے حالات زندگی کے بارے میں وسیع پیمانے پر معلومات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں یہ ذریعہ ایسا ہے جو فعال بھی ہے اور مؤثر بھی اگر کی ہے تو معلومات کو خاص منصوبہ بندی کے تحت پیش کرنے کی! توقع کا جا سکتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ تعمیری رجحان بڑھتا جائے گا اور ذہنی تحفظات کے بغیر یہ کام انجام پاتا رہے گا۔

ٹیلی وژن ذرائع ابلاغ میں سب سے بعد میں شامل ہوا۔ اس کے انداز کار نے اسے تفریحی اور کاروباری (کمرشل) ادارہ بنا دیا ہے۔ ڈراموں' موسیقی کے پروگراموں' سرکاری پالیسی کے مطابق خبروں اور ان پر تبصروں پر اس کے پروگرام مشتمل ہوتے ہیں۔ کبھی کسی کی یاد میں کوئی پروگرام ہوتا بھی ہے تو اس کا دورانیہ مختصر اور پیش کرنے والوں کا رویہ غیر سنجیدہ ہوتا ہے۔ انٹرویو شاذ و نادر ہی کئے جاتے ہیں جن میں سوالات' ذہنی تحفظات اور سرکاری پالیسی کے مطابق مرتب کئے جاتے ہیں اگرچہ ٹیلی وژن شہری علاقوں میں سب سے مؤثر ذرائع ابلاغ ہے اس سے وہ کام نہیں لیا جاتا جو قوم کو سدھارنے' نوجوانوں کی ذہنی تربیت کے لئے ضروری ہیں۔ قوم جس بے مقصدیت اور ذہنی خلفشار کی شکار ہے اس کی پوری طرح نمائندگی اس ادارے کے ذریعہ ہوتی ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ غور کیا جائے کہ قوم کو کیا دینا چاہئے اس پر عمل کیا جاتا ہے کہ سرکار کو کس طرح خوش کیا جائے اور عوام کا مطالبہ کیا ہے۔ پاپ اور ڈسکو کو رواج دینے کو اپنے مقاصد میں شامل کر کے اپنی ثقافت اور روایت سے بغاوت کا ڈول ڈالا جاتا ہے اردو کے

تمام پروگراموں کے نام انگریزی میں رکھ کر اپنی زبان کی توہین کی جاتی ہے تو اس ادارہ سے خیر کی کیا توقع کی جاسکتی ہے ٹیلی وژن اس لئے قائم نہیں ہوا کہ دنیا وہ دکھایا جائے جو مقبول عام ہے بلکہ اس لئے کہ دنیا کو اپنی تاریخ' ثقافت' علمی و ادبی روایات سے روشناس کروایا جائے جب سے پروگرام سٹلائٹ کے ذریعہ متعدد ممالک میں دکھائے جارہے ہیں مقاصد کا پہیہ الٹا گھوم رہا ہے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ہم انگریزی دانی میں دنیا میں کسی ملک سے پیچھے نہیں۔ ہماری تہذیب کی نمائندگی پاپ اور ڈسکو سے ہوتی ہے گویا ہماری اپنی کوئی تہذیب اور روایت نہیں۔ ٹیلی وژن کے پروگراموں کی باگ دوڑ جب تک ایسے "دانشوروں" کے ہاتھ میں رہے گی مغربی زندگی عام ہوتی جائے گی اور قومی شعائر سے روگردانی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ سوانح عمری' آپ بیتی' خاکہ کے بارے میں بعض پروگرام جو حالات حاضرہ پر مبنی تھے مثلاً "چہرے' روبرو' بلا تکلف اور گیسٹ آور جیسے پروگرام پیش تو کئے گئے جن میں شخصیات کے انٹرویوز کے ساتھ سوانحی حالات بھی پیش کئے گئے مگر یہ پروگرام بھی گروہی سیاست کا شکار ہو کر بالآخر بند کر دئے گئے۔ پاکستان کی اس صورت حال کا موازنہ ہمسایہ ملک سے کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے ایک ایک پروگرام کی تیاری میں اہل نظر اصحاب اور محققین کی فوج ظفر موج ہمہ تن مصروف نظر آتی ہے۔ گاندھی' غالب' ابوالکلام آزاد' ٹیپو سلطان' حسرت موہانی کتنے ہی مشاہیر ہیں ان کی زندگیوں اور کارناموں پر طویل پروگرام مرتب ہوئے۔ دوردرشن پر دکھائے گئے اور لاکھوں کی تعداد میں ان کے کیسٹ دنیا بھر میں پھیلائے گئے۔ ان میں پیش کردہ معلومات سے جزوی طور پر اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان کی کاوشوں کو سراہے بغیر نہیں رہا جاسکتا پاکستان ٹیلی وژن اور دوردرشن میں بنیادی فرق قومی مقاصد کے وقوف اور عدم وقوف' سنجیدہ اور غیر سنجیدہ رویہّ کا ہے۔ یہ ذریعۂ ابلاغ انتہائی طاقت ور ہے اس کے ذریعے پوری قوم کے ذہنی رویوں کو بدلا جاسکتا ہے لیکن جن ہاتھوں میں ہے وہ سطحی ذہن رکھتے ہیں اور غیر سنجیدہ انداز میں پروگرام مرتب کرتے ہیں اس طرح اشتہارات کی مد میں سالانہ اربوں روپے کمانے کے باوجود تعمیر بجائے تخریب کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اور مجموعی طور عالمی پر سطح پر جگ ہنسائی ہو رہی ہے۔ اگر ٹیلی وژن بھی سرکاری دباؤ سے آزاد ہو' صاحب بصیرت دانشور اس کے پروگرام ترتیب دیں جن کے پیش نظر قومی' مذہبی' علمی' ادبی اور تفریحی مقاصد ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ قوم کی حالت کو بدلنے میں اس سے مؤثر کام نہ لیا جاسکے۔ اسی صورت میں قائداعظم' شہید ملت اور قیام پاکستان کے لئے جدوجہد کرنے والے معروف اور غیر معروف شخصیات کے



سوانحی حالات' ان کی خدمت اور کارنامے بھرپور انداز میں عوام کے سامنے آسکتے ہیں۔ مشاہیر علم و ادب کو پیش کیا جاسکتا ہے ہر شعبۂ زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کو بلاامتیاز اپنی زندگی کے تجربات کو پیش کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ سوانح نگار ٹی وی کے لئے شخصیات کے سوانح لکھتے وقت نئی تیکنیک سے کام لے سکتے ہیں۔ اس طرح سوانح نگاری کے بارے میں نئی جہتیں سامنے آسکتی ہیں اور عدیم الفرصتی کے اس مشینی دور میں جب کتابیں پڑھنے کا رجحان کم سے کم ہوتا جارہا ہے اردو کے سوانحی ادب کو فروغ دینے میں ٹی وی ایک مؤثر اور بھرپور کردار ادا کرسکتا ہے۔ فی الحال پاکستان ٹیلی وژن کے پروگرام نہ صرف سوانح نگاری کے زمرے میں کوئی خدمت انجام دے رہے بلکہ زبان و ادب کی کوئی خدمت انجام نہیں دے رہے جو ایک بڑا قومی المیہ ہے اگر ٹی وی کے لئے سوانحی ڈرامے لکھ کر ٹی وی پر پیش کئے جائیں تو سوانح نگاری کا جدید انداز سامنے آئے گا اور قومی خدمت بھی ہوگی۔

فلم کا رویہّ ٹی وی سے بھی خراب ہے اسے بے معنی تفریح کا ذریعہ بنالیا گیا ہے اب رجحان یہ ہے کہ فلم کو تجارتی ذریعہ ثابت کیا جائے اور تجارت میں سوائے منافع اندازی کے کوئی امر توجہ طلب نہیں ہوتا۔ حالانکہ تجارتی نقطۂ نظر سے ہی اچھی بامقصد فلمیں بنائی جاسکتی ہیں مشاہیر اور زعماء کے حالات زندگی کو دلکش انداز میں ڈھالا جاسکتا ہے تاریخ کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے لیکن چونکہ اس شعبہ پر کاروباری لوگ چھائے ہوئے ہیں۔ انہیں کی مرضی کے مطابق کہانیاں تیار کی جاتی ہیں۔ پیسہ بٹورنے کے لئے ناچ' گانے اور تماشوں پر زور دیا جاتا ہے اس لئے جب تک باشعور' تعلیم یافتہ اشخاص اس طرف توجہ نہ کریں فلموں کے ذریعہ سوانح' آپ بیتی یا خاکہ نگاری کے فروغ کا تصور بھی محال ہے۔ اگر اردو کے سوانحی ادب کو فلم میں ڈھالنے کے منصوبے پر کام کیا جائے تو بہت سی باوقار شخصیات جنہوں نے پاک و ہند کی آزادی اور بقا کے لئے خدمات انجام دیں فلم کے موضوع بن سکتے ہیں۔ یہ صحیح معنوں میں قومی خدمت ہوگی جبکہ افسوس ہے ایسا نہیں اور ابلاغ کا یہ مؤثر ذریعہ اردو کے سوانحی ادب یا سوانح نگاری کی ترقی میں معاون و مددگار ثابت نہیں ہو رہا۔ گوکہ آزادی کے بعد شہید تیتو میر' غازی علم دین' حیدر علی' ٹیپو سلطان' محمد بن قاسم اور نواب سراج الدولہ جیسی فلمیں سامنے آئی ہیں جن میں مشاہیر کے سوانح اور کارناموں کو اجاگر کیا گیا ہے مگر کہانی نویسوں کی کم علمی کے باعث سوانحی حالات کے زمرے میں سوانح نگاری کا حق ادا نہ کیا جاسکا۔

آزادی کے بعد موجودہ دور میں وی سی آر اور ٹیپ ریکارڈ کی سہولت عام ہے اور بہت سے

ایسی شخصیات جو عمر کے آخری حصے میں ہیں اور اپنی سوانح ضابطہ تحریر میں لانے سے قاصر ہیں وی سی آر اور ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے اپنی آواز میں گفتگو کے انداز میں اپنے سوانح ریکارڈ کروا سکتی ہیں جو سوانح عمری کے زمرے میں ایک زندہ دستاویز کی حیثیت میں سامنے آسکتی ہیں جن سے مستقبل کا سوانح نگار حقائق کی بازیافت میں خاطر خواہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے اور جو سوانح نگاری کے باب میں بھی ایک جہت تازہ ثابت ہو سکتی ہے مگر افسوس اس سہولت سے بھی فائدہ حاصل نہیں کیا جا رہا لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جدید دور کے ذرائع ابلاغ کی روشنی میں سوانح نگاری اور سوانحی ادب کے سلسلے میں بھی کوئی پیش رفت سامنے نہیں آئی مگر امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں ان سہولتوں سے شاید استفادہ کی کوئی صورت ظاہر ہو اور اس کے ذریعے اردو کے سوانحی ادب اور اردو سوانح نگاری کے باب میں کوئی خوشگوار اضافہ ہو سکے۔



# باب ہفتم

## مصادر و ماخذات

۱۔ مقدمہ "حیات جاوید" : مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ : لاہور : ۱۹۵۷ء : صفحہ ۱۸
۲۔ ذکر اقبال : از عبدالمجید سالک : مطبوعہ لاہور : ۱۹۵۵ء
۳۔ روزگار فقیر : از فقیر سید وحید الدین : مطبوعہ کراچی : ۱۹۶۳ء
۴۔ اقبال درون خانہ : از خالد نظیر صوفی : لاہور : ۱۹۷۹ء
۵۔ اقبال درون خانہ : از خالد نظیر صوفی : لاہور : ۱۹۷۹ء
۶۔ اقبال کی صحبت میں : از ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی : مطبوعہ لاہور : ۱۹۷۷ء
۷۔ یادگار حالی : مصنف صالحہ عابد حسین : مطبوعہ دہلی : ۱۹۳۹ء
۸۔ آثار ابوالکلام آزاد : مصنفہ قاضی عبدالغفار : مطبوعہ دہلی : ۱۹۳۹ء
۹۔ حیات اجمل : مصنفہ قاضی عبدالغفار : مطبوعہ دہلی : ۱۹۵۰ء
۱۰۔ حکیم الامت : نقوش و تاثرات مصنفہ عبدالماجد دریا بادی : مطبوعہ اعظم گڑھ : ۱۹۵۲ء
۱۱۔ سوانح عمری خواجہ حسن نظامی : مصنفہ ملا واحدی : مطبوعہ دہلی : ۱۹۵۷ء
۱۲۔ حیات امجد : مصنفہ محمد جمال شریف : مطبوعہ حیدر آباد دکن : ۱۹۶۱ء
۱۳۔ تذکرۂ جگر : مصنفہ محمود احمد خان جامعی : کراچی : ۱۹۶۱ء
۱۴۔ حیات سلیمان : مصنفہ شاہ معین الدین ندوی : اعظم گڑھ : ۱۹۷۳ء
۱۵۔ علامہ سید سلیمان ندوی : مصنفہ محمد نعیم صدیقی ندوی : مطبوعہ لکھنؤ : ۱۹۷۵ء
۱۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد : مصنفہ شورش کاشمیری : لاہور : ۱۹۸۸ء
۱۷۔ یادگار حالی : صالحہ عابد حسین : مکتبۂ جامعہ ملیہ : دہلی : ۱۹۳۹ء : صفحہ ۷
۱۸۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی : از علامہ مناظر احسن گیلانی : ناشر نفیس اکیڈمی : کراچی : ۱۹۳۹ء
۱۹۔ امام رازی : از عبدالسلام ندوی : معارف پریس : اعظم گڑھ : ۱۹۵۰ء
۲۰۔ سید احمد شہید : از غلام رسول مہر : مطبوعہ لاہور : ۱۹۵۱ء

۲۱۔صدیق اکبر : از سعید احمد اکبر آبادی : مطبوعہ دہلی : ۱۹۵۷ء

۲۲۔شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ : از سید ابوالحسن علی ندوی : معارف پریس : اعظم گڑھ : ۱۹۵۷ء

۲۳۔سیرت سید احمد شہید : از سید ابوالحسن علی ندوی : چوتھا ایڈیشن : لاہور : ۱۹۵۸ء

۲۴۔سید امیر علی از شاھد حسین رزاقی : ادارہ ثقافت اسلامیہ : لاہور : ۱۹۷۰ء

۲۵۔حسرت موہانی' حیات اور کارنامے : از احمر لاری : مطبوعہ گورکھ پور : ۱۹۷۳ء

۲۶۔سید شاہ امین الدین اعلیٰ : از حسینی شاھد : انجمن ترقی اردو : آندھرا پردیش (بھارت) : ۱۹۷۳ء

۲۷۔اللہ کی تلوار (خالد بن ولید) : از میجر جنرل آغا محمد ابراہیم : نیشنل بک فاؤنڈیشن : کراچی : ۱۹۷۵ء

۲۸۔امیر خسرو دہلوی : از ممتاز حسین : مطبوعہ : کراچی : ۱۹۷۵ء

۲۹۔مولوی عبدالحق' حیات اور علمی کارنامے : از شہاب الدین ثاقب : انجمن ترقی اردو : کراچی : ۱۹۸۵ء

۳۰۔بہادر شاہ ظفر : از اسلم پرویز : انجمن ترقی اردو : دہلی : ۱۹۸۶ء

۳۱۔نیاز فتح پوری : از اختر یزدان محسن : دانش محل : لکھنؤ : ۱۹۸۸ء

۳۲۔عرب کا چاند : از سوامی لکشمی مہاراج : دارالکتاب سلیمانی : ریوڑی' پنجاب : س۔ن

۳۳۔امرائے ہنود : از سعید احمد مارہروی : نامی پریس : کانپور : ۱۹۱۰ء

۳۴۔کرشن جیون : از خواجہ حسن نظامی : خواجہ بک ڈپو : دہلی : ۱۹۱۹ء

۳۵۔گاندھی نامہ : از خواجہ حسن نظامی : مشائخ بک ڈپو : دہلی : س۔ن

۳۶۔حالات زندگی من موہن مالویہ : از ابوالاعلیٰ مودودی : دفتر تاج جبل پور : ۱۹۱۹ء

۳۷۔گوتم : از ڈاکٹر سید حفیظ : انجمن ترقی اردو ہند : ۱۹۲۳ء

۳۸۔سادھو جی سندھیا ترجمہ : از سید محمد عبدالسلام : مطبوعہ ۱۹۲۳ء

۳۹۔جواہر لال کی کہانی ترجمہ : از رحیم دہلوی : نیا کتاب گھر : دہلی : س۔ن

۴۰۔مقدمہ انکار محروم : از مالک رام : انجمن ترقی اردو ہند : دہلی : ۱۹۶۷ء : صفحہ ۶

۴۱۔حرف چند (مقدمہ پاکستان میں اردو تحقیق : از جمیل الدین عالی) : انجمن ترقی





اردو : کراچی : ۱۹۸۷ء : صفحہ ۳

۴۲۔المرتضیٰ : از سید ابوالحسن علی ندوی : مجلس نشریات اسلام : مطبوعہ ۱۹۸۸ء : صفحات ۱۷' ۱۸

۴۳۔صدیق اکبر : از سعید احمد اکبر آبادی : تصنیف ۱۹۷۵ء : طبع ثانی : کراچی : ۱۹۶۱ء : صفحات ۴۳' ۴۴

۴۴۔المرتضیٰ : از سید ابوالحسن علی ندوی : مجلس نشریات اسلام : مطبوعہ ۱۹۸۸ء

۴۵۔چودہ ستارے : از نجم الحسن کراروی : امامیہ کتب خانہ' مغل حویلی لاہور : (۸) ۱۳۹۳ھ

۴۶(الف)۔سید احمد شہید : از غلام رسول مہر : شیخ غلام علی اینڈ سنز : لاہور : ۱۹۱۵ء

۴۶(ب)۔سید احمد شہید : از ابوالحسن علی ندوی : لاہور : ۱۹۵۸ء

۴۷۔شاہ امین الدین اعلیٰ : از حسینی شاہد : انجمن ترقی اردو : آندھرا پردیش (بھارت) : ۱۹۷۳ء

۴۸۔اللہ کی تلوار' خالید بن ولید : از میجر جنرل آغا ابراہیم اکرم : نیشنل بک فاؤنڈیشن : کراچی : ۱۹۷۵ء

۴۹۔قائد اعظم کے ابتدائی تیس سال : از رضوان احمد : مرکز تحریک پاکستان : کراچی : ۱۹۷۷ء

۵۰۔اقبال کامل : از عبدالسلام ندوی : مطبع معارف : اعظم گڑھ : ۱۹۳۸ء

۵۱۔ذکر اقبال : از عبدالمجید سالک شاہد دین محمدی پریس : لاہور : ۱۹۵۵ء

۵۲۔روزگار فقیر : از فقیر سید وحید الدین : مطبوعہ کراچی : ۱۹۶۳ء

۵۳۔اقبال درون خانہ : از خالد نظیر صوفی : بزم اقبال : لاہور : ۱۹۶۹ء

۵۴۔اقبال کی صحبت میں : از عبداللہ چغتائی : مطبوعہ لاہور : ۱۹۷۷ء

۵۵۔حیات اقبال کے چند مخفی گوشے : محمد حمزہ فاروقی : ادارہ تحقیقات : پاکستان' لاہور : ۱۹۸۸ء

۵۶۔زندہ رود : از جاوید اقبال : شیخ غلام علی اینڈ سنز : لاہور : جلد اول ۱۹۷۹ء : جلد دوم ۱۹۸۱ء : جلد سوم ۱۹۸۴ء

۵۷۔غالب : از غلام رسول مہر : مطبوعہ لاہور : ۱۹۳۶ء

۵۸۔ مقدمہ کتاب "غالب" : از عبدالمجید سالک : مطبوعہ لاہور : ۱۹۳۶ء : صفحہ ۷
۵۹۔ آثار ابوالکلام آزاد : از قاضی عبدالغفار : مطبوعہ دہلی : ۱۹۳۹ء
۶۰۔ پریم چند : از ہنس راج : رہبر حالی پبلشنگ ہاؤس : دہلی : ۱۹۵۰ء
۶۱۔ سعادت یار خان رنگین : از صابر علی خان : انجمن ترقی اردو : کراچی : ۱۹۵۶ء
۶۲۔ امیر خسرو دہلوی : از ممتاز حسین : مطبوعہ کراچی : ۱۹۷۵ء
۶۳۔ میر تقی میر : از خواجہ احمد فاروقی : انجمن ترقی اردو : علی گڑھ : ۱۹۵۴ء
۶۴۔ سراج اورنگ آبادی : از شفقت رضوی : ادارہ تحقیق وتصنیف : کراچی : ۱۹۸۴ء
۶۵۔ ناسخ : از صدر الحق : انجمن ترقی اردو : کراچی : ۱۹۷۷ء
۶۶۔ کہانی میری زبانی میری : از حفیظ عباسی : علی پرنٹنگ پریس : دہلی : ۱۹۵۴ء
۶۷۔ غالب کی کہانی : از شفیع الدین منیر : جمال پرنٹنگ پریس : دہلی : ۱۹۶۸ء
۶۸۔ غالب کی آپ بیتی : از نثار احمد فاروقی : کوہ نور پریس : دہلی : ۱۹۶۹ء
۶۹۔ غالب اپنے آئینے میں : از اختر صدیقی : محبوب المطابع : برقی پریس : دہلی : ۱۹۷۰ء
۷۰۔ حکیم الامت، نقوش و تاثرات : از عبدالماجد دریا بادی : مطبع معارف : اعظم گڑھ : ۱۹۵۳ء
۷۱۔ ذکر آزاد : از عبدالرزاق ملیح آبادی : مطبوعہ دہلی : ۱۹۶۰ء
۷۲۔ تذکرہ جگر : از محمود علی خان جامعی : یونین پرنٹنگ پریس : دہلی : ۱۹۶۲ء
۷۳۔ حیات امجد : از محمد جمال شریف : حیدر آباد دکن : ۱۹۶۱ء
۷۴۔ مقدمہ حیات سعدی : خواجہ الطاف حسین حالی : نو لکشور : پریس لاہور : س۔ : ن صفحہ ۲
۷۵۔ سید الاحرار : اشتیاق اظہر : بہاولپور اردو اکیڈمی : س۔ن
۷۶۔ شبلی نامہ : شیخ محمد اکرام : بمبئی : صفحہ ۵
۷۷۔ شبلی کی حیات معاشقہ : ڈاکٹر وحید قریشی : لاہور : ۱۹۵۰ء
۷۸۔ شبلی کی رنگین زندگی : محمد امین زبیری : فاروق عمر پبلشرز : لاہور : ۱۹۵۲ء
۷۹۔ مقدمہ حیات جاوید : از ڈاکٹر سید عبداللہ : اکادمی پنجاب : لاہور : ۱۹۵۷ء



۸۰۔ مقدمہ شبلی نامہ : شیخ محمد اکرام : بمبئی : صفحات ۸،۹
۸۱۔ معراج روحانی : سراج احمد عثمانی : کراچی : ۱۹۶۳ء
۸۲۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی شان جامعیت : قاضی عبدالحنان : لاہور
۸۳۔ آپ بیتی (مضمون) : از غلام رسول مہر : رسالہ نقوش، آپ بیتی نمبر : جون ۱۹۶۴ء : صفحہ ۶
۸۴۔ تبصرہ : سرور صاحب کی خود نوشت : از ڈاکٹر گیان چند : مشمولہ رسالہ ماہی اقبال : لاہور : اپریل تا جون ۱۹۹۲ء : صفحہ ۲۴۳
۸۵۔ اعمال نامہ : (دیباچہ) سر رضا علی : دہلی : ۱۹۴۳ء
۸۶۔ خواب باقی ہیں : آل احمد سرور : دہلی : صفحات ۷،۸
۸۷۔ اعمال نامہ : سر رضا علی : دہلی : ۱۹۴۳ء : صفحات ص-ح
۸۸۔ نقش حیات : مولانا حسین احمد مدنی : الجمعیۃ پریس : دہلی : ۱۹۵۲ء
۸۹۔ آپ بیتی : ظفر حسن ایبک : لاہور : ۱۹۶۰ء
۹۰۔ انڈیا ونز فریڈم : مولانا ابوالکلام آزاد : اردو ترجمہ "ہماری آزادی" : از پروفیسر محمد مجیب : دہلی : ۱۹۶۱ء
۹۱۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی : محمد ایوب خان : کراچی : ۱۹۶۵ء
۹۲۔ شاہراہ پاکستان : چودھری خلیق الزماں : کراچی : ۱۹۶۷ء
۹۳۔ عابد علی : مزدور سے منسٹر : بمبئی : ۱۹۶۸ء
۹۴۔ نامہ اعمال : سر محمد یامین : کراچی : ۱۹۷۰ء
۹۵۔ رو میں رخش عمر : از عبدالسلام خورشید : لاہور : ۱۹۸۶ء
۹۶۔ آپ بیتی : از خواجہ حسن نظامی : دہلی : ۱۹۱۰ء : صفحہ ۴
۹۷۔ جہان دانش : احسان دانش : لاہور : ۱۹۷۳ء
۹۸۔ یاد عہد رفتہ : ڈاکٹر عبادت بریلوی : لاہور : ۱۹۸۸ء
۹۹۔ یاد عہد رفتہ : حوالہ مذکورہ : صفحہ ۷
۱۰۰۔ شہاب نامہ : قدرت اللہ شہاب : سنگ میل پبلی کیشنز : لاہور : ۱۹۸۷ء
۱۰۱۔ یادوں کی برات : جوش ملیح آبادی : مکتبہ شعر و ادب : لاہور : ۱۹۷۵ء
۱۰۲۔ تصوف اور تعمیر سیرت : تحریر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی : ترتیب عاصم

نعمانی : اسلامک پبلی کیشنز : لاہور : ۱۹۷۲ء
۱۰۳۔آپ بیتی رشید احمد صدیقی : مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : سنگ میل پبلی کیشنز : لاہور : ۱۹۷۳ء
۱۰۴۔سرسید کی کہانی : ضیاءالدین لاہوری : کراچی : ۱۹۸۳ء
۱۰۵۔انڈیا وزٹا یرز : دہلی : ۱۹۸۶ء
۱۰۶۔آتش چنار : محمد یوسف ٹینگ : لاہور : ۱۹۸۴ء
۱۰۷۔داستان حیات سید میر قاسم : مرتبہ عبدالرحمٰن کوندہ : دہلی : ۱۹۸۵ء
۱۰۸۔اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ : ڈاکٹر سلیم اختر : لاہور : ۱۹۸۳ء : صفحہ ۲۳۰
۱۰۹۔منٹو میرا دشمن : اوپندر ناتھ اشک : نیا دور : لاہور : ۱۹۷۹ء
۱۱۰۔منٹو میرا دوست : محمد اسد اللہ : منٹو میموریل سوسائٹی : کراچی : ۱۹۵۵ء
۱۱۱۔تاریخ ثقافت ادب پاک و ہند (حصہ دہم) : ادارہ ثقافت اسلامیہ : لاہور : صفحہ ۶۱۰
۱۱۲۔کار جہاں دراز ہے : قرۃ العین حیدر : مکتبہ اردو ادب : لاہور : س۔ن
۱۱۳۔حوالہ مذکورہ : صفحہ ۳۷

## کتابیات

۱۔اقبال کامل : عبدالسلام ندوی : مطبع معارف : اعظم گڑھ : ۱۹۳۸ء
۲۔مخدوم محی الدین : نئے ادب کے معمار : سردار جعفری : کتب پبلشرز لمیٹڈ کمپنی : ۱۹۳۸ء
۳۔دیدو شنید : رئیس احمد جعفری : کراچی : ۱۹۳۸ء
۴۔حیات شیخ الاسلام (حسین احمد مدنی) : مولانا سید محمد میاں : دہلی : ۱۹۳۹ء
۵۔سیرت سجاد : سید احمد حسین ترمذی : لاہور : ۱۹۳۹ء
۶۔امیر خسرو : محمد وحید مرزا : ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد : ۱۹۳۹ء
۷۔یادگار حالی : صالحہ عابد حسین : مکتبہ جامعہ ملیہ : دہلی : ۱۹۳۹ء
۸۔آثار ابوالکلام آزاد : قاضی عبدالغفار : کوہ نور پرنٹنگ پریس : دہلی : ۱۹۳۹ء



۹۔امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی : علامہ مناظر احسن گیلانی : انیس اکیڈمی : کراچی : ۱۹۳۹ء
۱۰۔یاد ایام : حافظ محمد احمد چھتاری : لاہور : ۱۹۳۹ء
۱۱۔امام رازی : عبدالسلام ندوی : مطبع معارف : اعظم گڑھ : ۱۹۵۰ء
۱۲۔پریم چند : ہنس راج رہبر : حالی پبلشنگ ہاؤس : دہلی : ۱۹۵۰ء
۱۳۔حیات اجمل : قاضی عبدالغفار : دہلی : ۱۹۵۰ء
۱۴۔حیات سرسید : نورالرحمان : انجمن ترقی اردو : علی گڑھ : ۱۹۵۰ء
۱۵۔ذکر غالب : مالک رام : مکتبہ جامعہ ملیہ : دہلی : ۱۹۵۰ء
۱۶۔مہاراجہ کشن پرشاد : مہدی نواز جنگ : حیدر آباد دکن : ۱۹۵۰ء
۱۷۔جوزفین : غلام رسول مہر : کتب منزل : لاہور : ۱۹۵۰ء
۱۸۔چند ہمعصر : مولوی عبدالحق : انجمن ترقی اردو پاکستان : کراچی : پہلا پاکستانی : ایڈیشن ۱۹۵۰ء
۱۹۔شبلی کی حیات معاشقہ : ڈاکٹر وحید قریشی : مکتبہ جدید : لاہور : ۱۹۵۰ء
۲۰۔سید احمد شہید : غلام رسول مہر : غلام علی سنز : لاہور : ۱۹۵۱ء
۲۱۔شبلی کی رنگین زندگی : محمد امین زبیری : فاروق عمر پبلشرز : لاہور : ۱۹۵۲ء
۲۲۔حکیم الامت نقوش و تاثرات : عبدالماجد دریا بادی : بھارت اعظم گڑھ : ۱۹۵۲ء
۲۳۔نقش حیات : حسین احمد مدنی : الجمعیتہ پریس : دہلی : ۱۹۵۳ء
۲۴۔حسرت کی یاد میں : مرتبہ عبداللہ ولی بخش قادری : ادارۂ تصنیف و تالیف مجیدیہ اسلامیہ کالج : الہ آباد : ۱۹۵۳ء
۲۵۔خاتم الانبیاء : ڈاکٹر شیخ محمد اقبال : الواعظ صفدر پریس : لکھنؤ : ۱۹۵۳ء
۲۶۔میر تقی میر حیات و شاعری : خواجہ احمد فاروقی : انجمن ترقی اردو : علی گڑھ : ۱۹۵۴ء
۲۷۔محمد علی' ذاتی ڈائری کے چند ورق : عبدالماجد دریا بادی : مطبع معارف : اعظم گڑھ : حصہ اول ۱۹۵۴ء : حصہ دوم ۱۹۵۶ء
۲۸۔سرگزشت : عبدالمجید سالک : لاہور : ۱۹۵۴ء
۲۹۔خواجہ دستگیر : محمد مسلم احمد نظامی : محبوب المطابع : دہلی : ۱۹۵۵ء

۳۰۔ذکر اقبال : عبدالمجید سالک : دین محمدی پریس : لاہور : ۱۹۵۵ء
۳۱۔امیر خسرو : تقی محمد خان خورجوی : ٹائمز پریس : کراچی : ۱۹۵۵ء
۳۲۔مشاہدات : ہوش بلگرامی : حیدر آباد دکن : ۱۹۵۵ء
۳۳۔مولانا مودودی' اپنی اور دوسروں کی نظر میں : مرتبہ محمد یوسف بھٹہ : لاہور : ۱۹۵۵ء
۳۴۔منٹو : ابو سعید قریشی : لاہور : ۱۹۵۵ء
۳۵۔منٹو' میرا دوست : محمد اسد اللہ : منٹو میموریل سوسائٹی : کراچی : ۱۹۵۵ء
۳۶۔یاد رفتگان : مولانا سید سلیمان ندوی : مکتبۃ الشرق : کراچی : ۱۹۵۵ء
۳۷۔صاحب : محمد طفیل : ادارۂ فروغ ادب : لاہور : ۱۹۵۵ء
۳۸۔یاران کہن : عبدالمجید سالک : مطبوعات چٹان : لاہور : ۱۹۵۵ء
۳۹۔ڈاکٹر زور : مرتبہ محمد عمر : ادارۂ ادبیات اردو : حیدر آباد دکن : ۱۹۵۵ء
۴۰۔سیرت قرآنیہ رسول عربی : محمد اجمل خان : دہلی : ۱۹۵۶ء
۴۱۔سیرت پاک (بچوں کے لئے) : بشیر محمد خان : دہلی : ۱۹۵۶ء
۴۲۔سیرت اشرف : منشی عبدالرحمٰن : ملتان : ۱۹۵۶ء
۴۳۔جلال لکھنوی : ڈاکٹر محمد حسن : انجمن ترقی اردو پاکستان : ۱۹۵۶ء
۴۴۔سعادت یار خاں رنگین : ڈاکٹر صابر علی خان : انجمن ترقی اردو پاکستان : ۱۹۵۶ء
۴۵۔حضرت امیر خسرو : تقی محمد خان خورجوی : ٹائمز پریس : کراچی ۱۹۵۶ء
۴۶۔اکابر تحریک پاکستان : محمد صادق قصوری : مکتبہ رضویہ : گجرات : ۱۹۵۶ء
۴۷۔شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ : سید ابوالحسن علی ندوی : معارف : اعظم گڑھ : ۱۹۵۷ء
۴۸۔صدیق اکبر : سعید احمد اکبر آبادی : طبع اول ۱۹۵۷ء : طبع دوم ۱۹۶۱ء : کراچی : ۱۹۵۷ء
۴۹۔سوانح عمری خواجہ حسن نظامی : ملا واحدی : دہلی پرنٹنگ پریس : دہلی : ۱۹۵۷ء
۵۰۔شبلی' ایک دبستان : ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی : ڈھاکہ : ۱۹۵۷ء
۵۱۔کلیات حسرت موہانی : مقدمہ جمال میاں فرنگی محلی : شیخ غلام علی : ۱۹۵۷ء
۵۲۔بلبل ہند' سروجنی نائیڈو : وزیر حسن : حیدر آباد دکن : ۱۹۵۷ء
۵۳۔شاد کی کہانی' شاد کی زبانی : شاد عظیم آبادی مرتبہ محمد مسلم عظیم



آبادی : پٹنہ : ۱۹۵۷ء
۵۴۔آزاد کی کہانی' آزاد کی زبانی (بیانیہ) عبدالرزاق کانپوری حالی : دہلی ہاؤس : ۱۹۵۷ء
۵۵۔سیرت سید احمد شہید : سید ابوالحسن علی ندوی : چوتھا ایڈیشن : لاہور : ۱۹۵۸ء
۵۶۔سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری : سید محمد الحسنی : ندوۃ العلماء : لکھنؤ : ۱۹۵۸ء
۵۷۔ابوالطیب متنبی : سید جمیل الرحمٰن اعظمی : کراچی : ۱۹۵۸ء
۵۸۔مجید لاہوری : شفیع عقیل : مکتبہ ماحول : کراچی : ۱۹۵۸ء
۵۹۔امام ابن تیمیہ : محمد یوسف کوکنی : مدراس : ۱۹۵۹ء
۶۰۔حسرت کی کہانی' نعیمہ کی زبانی : نعیمہ بیگم : کراچی : ۱۹۵۹ء
۶۱۔حسرت کی ذاتی زندگی : اشتیاق اظہر و نصرت موہانی : کراچی : س-ن
۶۲۔ظفر علی خان : شورش کاشمیری : چٹان پبلی کیشنز : لاہور : ۱۹۵۹ء
۶۳۔سیرت آئمہ اربعہ : رئیس احمد جعفری : لاہور : ۱۹۶۰ء
۶۴۔داغ : تمکین کاظمی : آئینہ ادب : لاہور : ۱۹۶۰ء
۶۵۔سر سید احمد خان' حالات و افکار : مولوی عبدالحق : انجمن ترقی اردو : پاکستان : ۱۹۶۰ء
۶۶۔ذکر آزاد : عبدالرزاق ملیح آبادی : دفتر آزاد ہند : کلکتہ : ۱۹۶۰ء
۶۷۔آپ بیتی : ظفر حسن ایبک : لاہور : ۱۹۶۰ء
۶۸۔مومن' مطالعہ مومن : ڈاکٹر عبادت بریلوی : اردو دنیا : کراچی : ۱۹۶۱ء
۶۹۔مومن' حیات زندگی اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر : کلب علی خان فائق : رامپور : ۱۹۶۱ء
۷۰۔میرانجی خدا نما : ڈاکٹر حفیظ قتیل : حیدر آباد اردو اکیڈمی : حیدر آباد : ۱۹۶۱ء
۷۱۔حیات امجد : محمد جمال شریف : حیدر آباد دکن : ۱۹۶۱ء
۷۲۔تذکرۂ جگر : محمود علی خان جامعی : اردو اکیڈمی سندھ' کراچی : ۱۹۶۱ء
۷۳۔مرزا احمد ہمدانی کلیم : ڈاکٹر شریف النساء : خواتین انسٹی ٹیوٹ : حیدر آباد دکن : ۱۹۶۱ء
۷۴۔سر سید احمد خان : انیس حسن الدین احمد : حیدر آباد دکن : ۱۹۶۱ء

۷۵۔ہماری آزادی (بیانیہ) روایت ابوالکلام آزاد : تحریر ہمایوں کبیر : ترجمہ محمد مجیب : اورینٹ لانگ مین : انڈیا : ۱۹۶۱ء

۷۶۔حیات قائداعظم : چوہدری سردار محمد خان عزیز : لاہور : ۱۹۶۲ء

۷۷۔گنجینۂ گوہر : شاہد احمد دہلوی : مکتبۂ اسلوب : کراچی : ۱۹۶۲ء

۷۸۔سیرت نبوی قرآنی : عبدالماجد دریا بادی : صدق جدید : لکھنؤ : ۱۹۶۳ء

۷۹۔سوانح اعلیٰ حضرت احمد رضا : بدرالدین قادری رضوی : لاہور : ۱۹۶۳ء

۸۰۔مخدوم جہانیاں گشت : محمد ایوب قادری : ایجوکیشنل پریس : کراچی : ۱۹۶۳ء

۸۱۔خواجہ غلام فرید : مسعود حسن شہاب : اردو اکیڈمی : بھاولپور : ۱۹۶۳ء

۸۲۔معراج روحانی : سراج احمد عثمانی : کراچی : ۱۹۶۳ء

۸۳۔شاہ عبداللطیف بھٹائی : اختر انصاری اکبر آبادی : محکمہ اطلاعات : حیدر آباد سندھ : ۱۹۶۳ء

۸۴۔روزگار فقیر : فقیر سید وحیدالدین : کراچی : جلد اول ۱۹۶۳ء : جلد دوم ۱۹۶۴ء

۸۵۔محسن انسانیت : نعیم صدیقی : دہلی : ۱۹۶۴ء

۸۶۔حضرت بابا فرید گنج شکر : وحید احمد مسعود : مشہور پریس کراچی : ۱۹۶۴ء

۸۷۔حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی : خلیق احمد نظامی لکھنؤ : ۱۹۶۴ء

۸۸۔حیات شیخ عبدالقادر رائے پوری : ابوالحسن علی ندوی : لکھنؤ : ۱۹۶۵ء

۸۹۔حضرت بندہ نواز : احمد ادریس قادری : کراچی : ۱۹۶۵ء

۹۰۔محمد حسین آزاد جلد اول ودوم : اسلم فرخی : انجمن ترقی اردو : پاکستان : ۱۹۶۵ء

۹۱۔محمد علی جناح ہیکٹر بولیتھو : ترجمہ زبیر صدیقی : مرکزی اردو بورڈ : لاہور : ۱۹۶۵ء

۹۲۔میری دنیا : ڈاکٹر اعجاز حسین الہ آبادی : ۱۹۶۵ء

۹۳۔جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی : محمد ایوب خان : آکسفورڈ یونیورسٹی پریس : پاکستان : ۱۹۶۵ء

۹۴۔چہرے : شورش کاشمیری : مکتبہ ماحول : کراچی : ۱۹۶۵ء

۹۵۔حیدر بخش حیدری کی مختصر کہانیاں : مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی : کراچی : ۱۹۶۶ء

۹۶۔دیوان حیدری : مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی : کراچی : ۱۹۶۶ء

۹۷۔سرگزشت : ذوالفقار علی بخاری : کراچی : ۱۹۶۶ء





۹۸۔ہم نفسان رفتہ : رشید احمد صدیقی : ہندوستانی ایڈیشن ۱۹۶۶ء/ پاکستانی ایڈیشن لاہور : ۱۹۷۱ء

۹۹(الف) عزیز بھٹی شہید : اصغر علی گھرال : گجرات : مئی ۱۹۶۷ء

۹۹۔شاہ عبداللطیف بھٹائی : اختر انصاری اکبر آبادی : حیدر آباد سندھ : ۱۹۶۷ء

۱۰۰۔حسین شہید سہروردی : شورش کاشمیری : ادارہ چٹان : لاہور : ۱۹۶۷ء

۱۰۱۔قائداعظم جناح : جی الانہ : لاہور : ۱۹۶۷ء

۱۰۲۔حضرت محمد یوسف کاندھلوی : محمد ثانی الحسنی : تنویر پریس لکھنؤ : ۱۹۶۷ء

۱۰۳۔یادوں کی دنیا : یوسف حسین خان : مطبع معارف : اعظم گڑھ : ۱۹۶۷ء

۱۰۴۔شاہراہ پاکستان : چوہدری خلیق الزماں : انجمن اسلامیہ : ۱۹۶۷ء

۱۰۵۔آپ : محمد طفیل : ادارہ فروغ ادب : لاہور : ۱۹۶۷ء

۱۰۶۔مولانا ابوالکلام آزاد' ایک شخصیت' ایک مطالعہ : مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری پروگریسو بکس : لاہور : ۱۹۶۷ء

۱۰۷۔شہریار دکن (آصف جاہ سابع میر عثمان علی خان) : محمد عبدالحئی بادی : رائٹرز بیورو : کراچی : ۱۹۶۸ء

۱۰۸۔ولی اللہ : ابوالعلماء محمد اسماعیل گودھروی : لاہور : ۱۹۶۸ء

۱۰۹۔حیات سید احمد شہید : مولانا محمد جعفر تھانیسری : کراچی : ۱۹۶۸ء

۱۱۰۔مزدور سے منسٹر : عابد علی : انقلاب پبلی کیشنز : بمبئی : ۱۹۶۸ء

۱۱۱۔حیات ذاکر حسین : خورشید مصطفیٰ رضوی : جمال پرنٹنگ پریس : دہلی : ۱۹۶۹ء

۱۱۲۔رشید احمد صدیقی : سلیمان اطہر جاوید : حیدر آباد دکن : ۱۹۶۹ء

۱۱۳۔ولی کامل (سوانح عمری مولانا محمد ذکریا) : مفتی عزیز الرحمٰن : بجنور : ۱۹۶۹ء

۱۱۴۔حکیم سید شمس اللہ قادری : میر احمد علی : لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ : حیدر آباد دکن : ۱۹۷۰ء

۱۱۵۔خسرو شیریں زبان : اقبال صلاح الدین : میری لائبریری : لاہور : ۱۹۷۰ء

۱۱۶۔سید امیر علی : شاہد حسین فراقی : ادارۂ ثقافت اسلامیہ : لاہور : ۱۹۷۰ء

۱۱۷۔حیات عبدالحئی : ابوالحسن علی ندوی : نامی پریس : لکھنؤ : ۱۹۷۰ء

۱۱۸۔نامۂ اعمال (دو جلدیں) : سر محمد امین خان : کراچی : ۱۹۷۰ء

۱۱۹۔سید انیس احمد جعفری : مرتبہ آفتاب رئیس جعفری : کراچی : ۱۹۷۱ء

۱۲۰۔خیابان مسعود : مرتبہ جلیل قدوائی : راس مسعود ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی پاکستان : کراچی : ۱۹۷۱ء

۱۲۱۔یادگار شبلی : شیخ محمد اکرام : ادارہ ثقافت اسلامیہ : لاہور : ۱۹۷۱ء

۱۲۲۔سید ابوالاعلیٰ مودودی : چوہدری عبدالرحمٰن ابد : لاہور : ۱۹۷۱ء

۱۲۳۔ڈاکٹر ذاکر حسین : احسن علی مرزا : حیدر آباد دکن : ۱۹۷۱ء

۱۲۴۔تحدیث نعمت : محمد ظفر اللہ خان : لاہور : ۱۹۷۱ء

۱۲۵۔بے تیغ سپاہی : صدیق علی خان : کراچی : ۱۹۷۱ء

۱۲۶۔حیات عثمانی : مولانا محمد انوار الحسن شیر کوٹی : طبع اول ۱۹۷۲ء : طبع دوم : کراچی : ۱۹۸۸ء

۱۲۷۔عبداللہ خویشگی : محمد اقبال مجددی : لاہور : ۱۹۷۲ء

۱۲۸۔حضرت مجدد الف ثانی : سید زوار حسین شاہ : ادارہ مجددیہ : کراچی : ۱۹۷۲ء

۱۲۹۔تین مسلمان فیلسوف : سید حسین نصر : ترجمہ پروفیسر محمد منور : ادارہ ثقافت اسلامیہ : لاہور : ۱۹۷۲ء

۱۳۰۔تصوف اور تعمیر سیرت (بیانیہ آپ بیتی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی : مرتبہ آصف نعمانی : اسلامک پبلی کیشنز : لاہور : ۱۹۷۲ء

۱۳۱۔دہلی کی یادگار ہستیاں : امداد صابری : دہلی : ۱۹۷۲ء

۱۳۲۔تذکرۂ معاصرین : مالک رام : دہلی : (جلد اول ۱۹۷۲ء) : جلد دو ۱۹۷۶ء

۱۳۳۔حیات سلیمان : شاہ معین الدین ندوی : مطبع معارف : اعظم گڑھ : ۱۹۷۳ء

۱۳۴۔حسرت موہانی حیات اور کارنامے : احمر لاری : دبستان گورکھ پور : ۱۹۷۳ء

۱۳۵۔مقدمہ دیوان آتش جلد اول : سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنؤ : مجلس ترقی ادب لاہور : ۱۹۷۳ء

۱۳۶۔علامہ سید سلیمان ندوی : شخصیت اور ادبی خدمات : محمد نعیم صدیقی ندوی : مکتبۂ فردوس : لکھنؤ : ۱۹۷۳ء

۱۳۷۔سیرت المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم : محمد ابراہیم سیالکوٹی : مکتبۂ اہل حدیث : سیالکوٹ : ۱۹۷۳ء



۱۳۸۔سید شاہ امین الدین اعلیٰ : ڈاکٹر حسینی شاہد : انجمن ترقی اردو : آندھرا پردیش : ۱۹۷۳ء

۱۳۹۔چودہ ستارے : مولوی سید نجم الحسن کراروی : لاہور : ۱۹۷۳ء

۱۴۰۔جہان دانش : احسان دانش : لاہور : ۱۹۷۳ء

۱۴۱۔ہماری زندگی : بیگم پاشا مدنی : ایوان اردو : کراچی : ۱۹۷۳ء

۱۴۲۔ابوالکلام آزاد : عرش ملسیانی : وزارت اطلاعات : دہلی : ۱۹۷۳ء

۱۴۳۔ذوالفقار علی بھٹو : توصیف چغتائی : کراچی : ۱۹۷۳ء

۱۴۴۔چشم دید : فیروز خان نون : لاہور : ۱۹۷۳ء

۱۴۵۔مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں : غلام السیدین : جمال پرنٹنگ پریس : ۱۹۷۳ء

۱۴۶۔کاروان حیات : مشتاق احمد خان : لاہور : ۱۹۷۳ء

۱۴۷۔رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی : سید معین الرحمان : سنگ میل : لاہور : ۱۹۷۳ء

۱۴۸۔میرا شہر میرے لوگ : طیب انصاری : وصلا اکیڈمی : حیدر آباد دکن : ۱۹۷۳ء

۱۴۹۔تاریخ تجزیہ و تقدیر : سید شبیہ الحسن نونہروی : اردو پبلشر : لکھنؤ : ۱۹۷۵ء

۱۵۰۔مصحفی ' حیات اور کلام : افسر امروہوی : مکتبہ نیا دور : کراچی : ۱۹۷۵ء

۱۵۱۔اللہ کی تلوار ' خالد بن ولید : میجر جنرل آغا محمد ابراہیم : نیشنل بک فاؤنڈیشن : کراچی : ۱۹۷۵ء

۱۵۲۔مولانا محمد علی جوہر حیات و تعلیمی نظریات : ثناء الحق صدیقی : پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس : کراچی : ۱۹۷۵ء

۱۵۳۔یادوں کی برات : جوش ملیح آبادی : مکتبۂ شعر و ادب : لاہور : ۱۹۷۵ء

۱۵۴۔اپنی تلاش میں : کلیم الدین احمد : پٹنہ : ۱۹۷۵ء

۱۵۵۔مولانا حیدر حسن خان : عبدالسلام ندوی : مطبع بھارت : اعظم گڑھ : ۱۹۷۵ء

۱۵۶۔رازدان حیات (سوانح حسرت موہانی) : اسلم ہندی : لکھنؤ : ۱۹۷۵ء

۱۵۷۔خسرو اور عہد خسرو : عبدالرؤف عروج : کراچی : ۱۹۷۵ء

۱۵۸۔امیر خسرو دہلوی : ممتاز حسین : کراچی : ۱۹۷۵ء

۱۵۹۔امیر خسرو ' احوال و آثار : مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن انصاری : دہلی : ۱۹۷۵ء

۱۶۰۔(الف) بلبل ہند سروجنی نائیڈو : وزیر حسن : ادارۂ ادبیات اردو : حیدر آباد

دکن : ۱۹۷۵ء

۱۶۱۔امیر خسرو : شیخ سلیم احمد : ادارہ ادبیات : دہلی : ۱۹۷۶ء

۱۶۲۔اختر شیرانی اور جدید اردو ادب : ڈاکٹر یونس حسنی : انجمن ترقیٔ اردو : پاکستان : ۱۹۷۶ء

۱۶۳۔مولوی نذیر احمد دہلوی' احوال و افکار : افتخار صدیقی : مجلس ترقیٔ اردو : لاہور : ۱۹۷۶ء

۱۶۳(الف)- دیدہ ور : (طبع سوم) کوثر نیازی : شیخ غلام علی اینڈ سنز : لاہور : مارچ ۱۹۷۷ء

۱۶۴۔یاد اقبال : صابر کلوری : لاہور : ۱۹۷۶ء

۱۶۵۔ہمارے قائد اعظم : اعجاز احمد : سنگ میل پبلی کیشنز : لاہور : ۱۹۷۶ء

۱۶۶۔بابائے قوم : حمید اللہ ہاشمی : محبوب بکڈپو : لائل پور : ۱۹۷۶ء

۱۶۷۔قائد اعظم کے ۲۷ سال : خواجہ رضی حیدر : پاکستان ہیرالڈ پریس : کراچی : ۱۹۷۶ء

۱۶۸۔زرگزشت : مشتاق احمد یوسفی : مکتبۂ دانیال : کراچی : ۱۹۷۶ء

۱۶۹۔کردار قائد اعظم : منشی عبد الرحمٰن : شیخ اکیڈمی : لاہور : ۱۹۷۶ء

۱۷۰۔کتابی چہرے : سید ضمیر جعفری : نیرنگ خیال پبلی کیشنز : راولپنڈی : ۱۹۷۶ء

۱۷۱۔ندیم نامہ : مرتبہ محمد طفیل و بشیر موجد : مجلس ارباب فن : لاہور : ۱۹۷۶ء

۱۷۲۔ناسخ : ڈاکٹر محمد صدر الحق : انجمن ترقی اردو : پاکستان : ۱۹۷۷ء

۱۷۳۔مفتی صدر الدین آزردہ : عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی : مکتبہ جامعہ : دہلی : ۱۹۷۷ء

۱۷۴۔اقبال کی صحبت میں : ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی : مجلس ترقی اردو ادب : لاہور : ۱۹۷۷ء

۱۷۵۔چند باتیں : خواجہ جمیل احمد : اردو اکیڈمی سندھ : کراچی : ۱۹۷۷ء

۱۷۶۔مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد' حیات اور ادبی خدمات : ڈاکٹر حبیب ضیاء : نگاہ پبلی کیشن : حیدر آباد دکن : ۱۹۷۸ء

۱۷۷۔سید الاحرار حسرت موہانی : اشتیاق اظہر : بہاولپور اکیڈمی : بہاولپور : ۱۹۷۸ء

۱۷۸۔قائد اعظم' ابتدائی ۳۲ سال : رضوان احمد : کراچی : ۱۹۷۸ء

۱۷۹۔سیرت سرور دو عالم (جلد اول' دوم' سوم) سید ابو الاعلیٰ مودودی) : مرتبہ نعیم صدیقی'



ادارہ ترجمان القرآن : لاہور : ۱۹۷۸ء

۱۸۰۔حضرت عثمان شہید (عربی سے ترجمہ) : تصنیف محمد بن یحییٰ بن ابی بکر مالکی : مرتبہ محمد یوسف زائد : اردو ترجمہ کوکب شادانی : ۱۹۷۸ء

۱۸۱۔ذکر احسن : محمد صدیق الہ آبادی : کراچی : ۱۹۷۸ء

۱۸۲۔آپ بیتی : عبد الماجد دریابادی : مکتبہ فردوس : لکھنؤ : ۱۹۷۸ء

۱۸۳۔وفیات ماجدی : عبد الماجد دریابادی : عبد الماجد اکادمی : لکھنؤ : ۱۹۷۸ء

۱۸۴۔معاصرین : عبد الماجد دریابادی : ادارہ انشائے ماجدی : کلکتہ : ۱۹۷۸ء

۱۸۵۔زندہ رود : جاوید اقبال : شیخ غلام علی اینڈ سنز : لاہور : جلد اول ۱۹۷۹ء : جلد دوم ۱۹۸۱ء : جلد سوم ۱۹۸۴ء

۱۸۶۔علامہ حیرت بدایونی' حیات و ادبی خدمات : رشید الدین : ادبی مرکز : حیدر آباد دکن : ۱۹۷۹ء

۱۸۷۔ذکر سالک : میر سراج الدین علی خان : حیدر آباد دکن : ۱۹۷۹ء

۱۸۸۔مرزا علی لطف' حیات و کارنامے : مرزا اکبر علی بیگ : مکتبۂ شعر و حکمت : حیدر آباد دکن : ۱۹۷۹ء

۱۸۹۔ڈاکٹر عبد القدیر خان اور اسلامی بم : زاہد ملک : مطبوعات حرمت : اسلام آباد : ۱۹۷۹ء

۱۹۰۔مولانا رومی : بشیر محمود اختر : ادارۂ ثقافت اسلامیہ : لاہور : ۱۹۷۹ء

۱۹۱۔سخنور : سلطانہ مہر : کراچی : ۱۹۷۹ء

۱۹۲۔غازی عبد الرحمان شہید بھٹاوری : ابو سلمان شاہجہاں پوری : کراچی : ۱۹۷۹ء

۱۹۳۔سرگزشت : بی اصغر : کراچی : ۱۹۷۹ء

۱۹۴۔منٹو' میرا دشمن : اوپندر ناتھ اشک : نیا ادارہ : لاہور : ۱۹۷۹ء

۱۹۵۔فکر تونسوی' شخصیت اور طنز نگاری : یوگس حیدر آبادی : زندہ دلان حیدر آباد : حیدر آباد دکن : ۱۹۸۰ء

۱۹۶۔میر شمس الدین فیض' حیات اور ادبی کارنامے : لئیق صلاح : شگوفہ پبلی کیشنز : حیدر آباد دکن : ۱۹۸۰ء

۱۹۷۔حیات بیدل : ڈاکٹر امانت : اردو رائٹرز گلڈ : الہ آباد : ۱۹۸۰ء

١٩٨۔ ارمغان مجنوں : مرتبہ صہبا لکھنوی، شبنم رومانی : کراچی : ۱۹۸۰ء

١٩٩۔ حیات محمد رضا خان بریلوی : ڈاکٹر محمد مسعود : اسلامی کتب خانہ : سیالکوٹ : ۱۹۸۰ء

۲۰۰۔ جگن ناتھ آزاد' ایک مطالعہ : محمد ایوب واقف : مونومنٹل پبلشرز : نئی دہلی : ۱۹۸۰ء

۲۰۱۔ عبدالرحمٰن چغتائی شخصیت اور فن : مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا : مجلس ترقیٔ ادب : لاہور : ۱۹۸۰ء

۲۰۲۔ صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی : شمس تبریز خان : مجلس نشریات اسلام : کراچی : ۱۹۸۱ء

۲۰۳۔ سید نجیب اشرف ندوی : ریاست علی تاج : مکتبۂ شعر و حکمت : حیدر آباد : ۱۹۸۱ء

۲۰۴۔ محمد حسین آزاد : آغا سلمان باقر : سنگ میل پبلی کیشنز : لاہور : ۱۹۸۱ء

۲۰۵۔ مرزا سلامت علی دبیر : مرزا محمد زمان آزردہ : مرزا پبلی کیشنز : رعناواری سری نگر : ۱۹۸۱ء

۲۰۶۔ ملت کا پاسبان : کرم حیدری : قائد اعظم اکیڈمی : کراچی : ۱۹۸۱ء

۲۰۷۔ بیگم حسرت موہانی : عتیق احمد صدیقی : مکتبہ جامعہ ملیہ : دہلی : ۱۹۸۱ء

۲۰۸۔ ہمارے پیارے مولانا : نظیر زیدی : منصورہ لاہور : ۱۹۸۱ء

۲۰۹۔ پطرس' ایک مطالعہ : کرنل غلام سرور : مطبوعات حرمت : راولپنڈی : ۱۹۸۱ء

۲۱۰۔ بزم رفتگاں : سید صباح الدین عبدالرحمان : مکتبہ جامعہ ملیہ : دہلی : ۱۹۸۱ء

۲۱۱۔ آسماں کیسے کیسے : صادق الخیری : کراچی : ۱۹۸۱ء

۲۱۲۔ ڈاکٹر عبدالمعید : مرتبہ نسیم فاطمہ و رئیس احمد صمدانی : کراچی : ۱۹۸۱ء

۲۱۳۔ شیخ محمد اکرم : ادارۂ ثقافت اسلامیہ : لاہور : ۱۹۸۲ء

۲۱۴۔ ظفر علی خان اور ان کا عہد : عنایت اللہ نسیم چوہدری : لاہور : ۱۹۸۲ء

۲۱۵۔ اتحاد جزیرۃ العرب' ابن سعود کی شخصیت اور کارنامے : محمد المانع : ترجمہ رشید ملک : لاہور : ۱۹۸۲ء

۲۱۶۔ سلطان با محمد : تصنیف مولانا عبدالماجد دریابادی : مرتبہ تحسین فراقی : لاہور : ۱۹۸۲ء



۲۱۷۔ عثمان ذوالنورین : مولانا سعید احمد اکبر آبادی : ندوۃ المصنفین : دہلی : ۱۹۸۲ء

۲۱۸۔ محفل : حسن الدین احمد : ولا اکیڈمی : حیدر آباد دکن : ۱۹۸۲ء

۲۱۹۔ حسرت موہانی : مرتبہ ثریا حسین : شعبۂ اردو : مسلم یونیورسٹی : علی گڑھ : ۱۹۸۲ء

۲۲۰۔ حسرت موہانی : مرتبہ بہار اردو اکیڈمی : پٹنہ : ۱۹۸۲ء

۲۲۱۔ ڈاکٹر عبدالسلام : تورا کینہ قاضی : شاہکار فاؤنڈیشن : کراچی : تصنیف انگریزی : ۱۹۸۲ء : ترجمہ اردو : ۱۹۸۳ء

۲۲۲۔ حیات وحشت : وفا راشدی : کراچی : ۱۹۸۳ء

۲۲۳۔ حضرت خواجہ میر درد دہلوی : ڈاکٹر عبادت بریلوی : ادارہ ادب و تنقید لاہور : ۱۹۸۳ء

۲۲۴۔ مہاراجہ چندو لعل شاداں : ڈاکٹر ثمینہ شوکت : نیشنل پریس : حیدر آباد دکن : ۱۹۸۳ء

۲۲۵۔ سلسلۂ روز و شب : منظور الٰہی : غالب پبلشرز : لاہور : ۱۹۸۳ء

۲۲۶۔ یادوں کا جشن : کنور مہندر سنگھ بیدی سحر : پاک اورینٹل پبلی کیشنز : کراچی : ۱۹۸۳ء

۲۲۷۔ کاروان زندگی : ابوالحسن علی ندوی : مجلس نشریات اسلام : کراچی : ۱۹۸۳ء

۲۲۸۔ سرسید کی کہانی' ان کی اپنی زبانی : مرتبہ ضیاء الدین لاہوری : ادارۂ تصنیف و تحقیق کراچی : ۱۹۸۳ء

۲۲۹۔ بابائے اردو کی کہانی' ان کے معتمد کی زبانی : بشیر احمد قریشی باپوڑوی کراچی : ۱۹۸۳ء

۲۳۰۔ محمد نقوش : ڈاکٹر سید معین الرحمان : کاروان ادب : ملتان : ۱۹۸۳ء

۲۳۱۔ سراج اورنگ آبادی : حیات، شخصیت اور فکر و فن : شفقت رضوی : ۱۹۸۴ء

۲۳۲۔ عبدالحق : مختار الدین احمد ساہتیہ اکادمی : نئی دہلی : ۱۹۸۴ء

۲۳۳۔ عرفان قادر (سیرت شیخ عبدالقادر جیلانی) : عبدالعزیز عرفی : کراچی : ۱۹۸۴ء

۲۳۴۔ جناب معصومہ قم : ڈاکٹر سید حیدر مہدی : حیدر آباد سندھ : ۱۹۸۴ء

۲۳۵۔ گرد راہ : اختر حسین رائے پوری : مکتبۂ افکار : کراچی : ۱۹۸۴ء

۲۳۶۔ سی کا ریا : مرزا ادیب : سنگ میل پبلی کیشنز : لاہور : ۱۹۸۴ء

۲۳۷۔یادِ رفتگان : جلد اول : ماہر القادری : مرتبہ طالب ہاشمی : کراچی : ۱۹۸۴ء

۲۳۸۔پرانے چراغ : ابوالحسن علی ندوی : کراچی : ۱۹۸۴ء

۲۳۹۔بزم خوش نفسان : شاہد احمد دہلوی : مکتبہ اسلوب : کراچی : ۱۹۸۴ء

۲۴۰۔علامہ سید سلیمان ندوی : ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی : مکتبۂ فردوس : لکھنؤ ۱۹۸۵ء

۲۴۱۔بابائے اردو مولوی عبدالحق، حیات اور علمی کارنامے : شہاب الدین ثاقب : انجمن ترقی اردو : پاکستان : ۱۹۸۵ء

۲۴۲۔تذکرۂ سلیمان : غلام محمد : مجلس علماء : کراچی : ۱۹۸۵ء

۲۴۳۔علامہ سید سلیمان ندوی کی سیاسی زندگی : سید فخرالحسن : مجلس علوم اسلامیہ کراچی : ۱۹۸۵ء

۲۴۴۔آتش چنار : (شیخ عبداللہ) (بیانیہ) : محمد یوسف : چوہدری اکیڈمی : لاہور : ۱۹۸۵ء

۲۴۵۔داستان حیات (میر محمد قاسم) بیانیہ : تحریر عبدالرحمٰن کندو : ادارہ ادبیات : دہلی : ۱۹۸۵ء

۲۴۶۔گنجینۂ گوہر کھلا : صادق الخیری : شہباز بک کلب : کراچی : ۱۹۸۵ء

۲۴۷۔ساغر نظامی : مرتبہ ضامن علی خان : ساغر نظامی میموریل اکیڈمی : نئی دہلی ۱۹۸۵ء

۲۴۸۔عبداللطیف اعظمی : مرتبین : انور صدیقی وغیرہ : مکتبہ جامعہ ملیہ : دہلی ۱۹۸۵ء

۲۴۹۔ڈاکٹر عندلیب شادانی : نظیر صدیقی : مکتبہ اسلوب : کراچی : ۱۹۸۶ء

۲۵۰۔آغا حشر کاشمیری، حیات و کارنامے : ڈاکٹر شمیم ملک : مجلس ترقی ادب : لاہور ۱۹۸۶ء

۲۵۱۔مخدوم محی الدین حیات و کارنامے : شاذ تمکنت : مکتبۂ شعر و حکمت : حیدر آباد دکن : ۱۹۸۶ء

۲۵۲۔اکبر الہ آبادی : تحقیقی و تنقیدی مطالعہ : خواجہ محمد ذکریا : سنگ میل پبلی کیشنز : لاہور : ۱۹۸۶ء



۲۵۳۔صہبائی : ایک مختصر تعارف : ڈاکٹر محمد انصاراللہ : علی گڑھ : ۱۹۸۶ء

۲۵۴۔شاعر خوش نوا (چھیل سرمست) : آفاق صدیقی : ثناء اکیڈمی : کراچی : ۱۹۸۶ء

۲۵۵۔بہادر شاہ ظفر : اسلم پرویز : انجمن ترقی اردو ہند : دہلی : ۱۹۸۶ء

۲۵۶۔مولانا ابوالکلام آزاد، سوانح شخصیت : ڈاکٹر شیر بہادر پنی : کراچی : ۱۹۸۶ء

۲۵۷۔امام الہند ابوالکلام آزاد : مولانا امداد صابری : ادارۂ تصنیف و تالیف : کراچی : ۱۹۸۶ء

۲۵۸۔راجہ صاحب محمود آباد : محمد امیر احمد خان : سید اصغر علی شادانی : کراچی : ۱۹۸۶ء

۲۵۹۔نساخ کی خود نوشت : ڈاکٹر عبدالسبحان : ایشیاٹک سوسائٹی : کلکتہ : ۱۹۸۶ء

۲۶۰۔رو میں ہے رخش عمر : عبدالسلام خورشید : آتش فشاں پبلی کیشنز : لاہور : ۱۹۸۶ء

۲۶۱۔میری زندگی فسانہ (طبع دوم) : صادق الخیری : کراچی : ۱۹۸۶ء

۲۶۲۔اردو کا ادیب اعظم (ابوالکلام آزاد) : مولانا عبدالماجد دریا بادی : مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری : ادارہ تحقیق و تصنیف : کراچی : ۱۹۸۶ء

۲۶۳۔شبلی، ایک مطالعہ : مفتون احمد : مکتبہ اسلوب : کراچی : ۱۹۸۶ء

۲۶۴۔اوکھے لوگ : ممتاز مفتی : یونیورسل بکس : لاہور : ۱۹۸۶ء

۲۶۵۔تذکرۂ سید مودودی : مرتبہ خلیل احمد حامدی، نعیم صدیقی وغیرہ : لاہور : ۱۹۸۶ء

۲۶۶۔نیاز فتح پوری : مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری : اردو اکیڈمی سندھ : کراچی : ۱۹۸۶ء

۲۶۷۔مطالعۂ سلیمانی : مرتبہ مسعود الرحمٰن ندوی و محمد حسان خان : بھوپال : ۱۹۸۶ء

۲۶۸۔ہمارے کنور صاحب : مرتبہ کے ایل نارنگ ساقی : دہلی : ۱۹۸۶ء

۲۶۹۔مولانا ابوالکلام آزاد، شخصیت اور کارنامے : مرتبہ خلیق انجم : انجمن ترقی اردو ہند : دہلی : ۱۹۸۶ء

۲۷۰۔سید سلیمان ندوی : مرتبہ خلیق انجم : انجمن ترقی اردو ہند : دہلی : ۱۹۸۶ء

۲۷۱۔مولانا ابوالکلام آزاد، ایک مطالعہ : مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری : مکتبۂ اسلوب : کراچی : ۱۹۸۶ء

۲۷۲۔یادگار ایوب قادری : مرتبہ شمس الدین احمد حنفی و ثناء الحق صدیقی : ادارہ دانش

حکمت : کراچی : ۱۹۸۶ء

۲۷۳۔محمد عزیز مرزا شخصیت' حیات اور کارنامے : مرزا اکبر علی بیگ : ادارۂ شعر وحکمت : حیدر آباد دکن : ۱۹۸۶ء

۲۷۴۔حسرت موہانی' مجاہد آزادی کامل : شفقت رضوی : ادارۂ تحقیقات تحریکات ملی : کراچی : ۱۹۸۶ء

۲۷۵۔شہاب نامہ : قدرت اللہ شہاب : سنگ میل پبلی کیشنز : لاہور : ۱۹۸۶ء

۲۷۶۔حیات مستعار : جلیل قدوائی : مکتبہ اسلوب : کراچی : ۱۹۸۶ء

۲۷۷۔عروج عروج : اسمار احمد صدیقی : مجلس ترقی اردو ادب : لاہور : ۱۹۸۷ء

۲۷۸۔یاران رفتہ : سید یوسف بخاری دہلوی : مکتبہ اسلوب : کراچی : ۱۹۸۷ء

۲۷۹۔مولانا غلام رسول مہر : ڈاکٹر شفیق احمد : مجلس ترقی ادب : لاہور : ۱۹۸۸ء

۲۸۰۔سر سید احمد خان : راجہ طارق محمود : بک کارنر : جہلم : پاکستان : ۱۹۸۸ء

۲۸۱۔ابن انشاء احوال و آثار : ریاض احمد : انجمن ترقی اردو : پاکستان : ۱۹۸۸ء

۲۸۲۔تاریخ پوری : اختر یزدان محسن : دانش محل : لکھنؤ : ۱۹۸۸ء

۲۸۳۔حیات اقبال کے چند مخفی گوشے : محمد حمزہ فاروقی : لاہور : ادارہ تحقیقات پاکستان : لاہور : ۱۹۸۸ء

۲۸۴۔ابوالکلام آزاد : شورش کاشمیری : مطبوعات چٹان : لاہور : ۱۹۸۸ء

۲۸۵۔ذوالفقار علی بھٹو : بچپن سے تختۂ دار تک : سلمان تاثیر : لاہور : ۱۹۸۸ء

۲۸۶۔پیکر حرمت' پیر صاحب پگارا : خان خداداد خان برکی : لاہور : ۱۹۸۸ء

۲۸۷۔حالات قائد اعظم : خالد اختر افغانی : آتش فشاں پبلی کیشنز : لاہور : ۱۹۸۸ء

۲۸۸۔یادوں کے چراغ : میاں عبدالعزیز : میکاز کا ٹرسٹ : کراچی : ۱۹۸۸ء

۲۸۹۔سیرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم : شاہ مصباح الدین شکیل : کراچی : ۱۹۸۸ء

۲۹۰۔حضرت سید صاحب بانسوی (سید عبدالرزاق بانسوی : مفتی محمد رضا انصاری : ادارۂ تحقیقات افکار تحریکات ملی : کراچی : ۱۹۸۸ء

۲۹۱۔صاحب سیف القلم : امام ابن تیمیہ کے سوانح اور کارنامے : سید حسین حسینی : گجرانوالہ : ۱۹۸۸ء

۲۹۲۔سیرت شیخ الاسلام (حسین احمد ندوی) : نجم الدین اسلام : دیوبند : ۱۹۸۸ء



۲۹۳۔نواسۂ رسول : ڈاکٹر سید حیدر مہدی نقوی : حیدر آباد سندھ : ۱۹۸۸ء

۲۹۴۔المرتضیٰ : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی : طبع اول ۱۹۸۸ء : طبع دوم ۱۹۸۹ء : طبع سوم ۱۹۹۰ء

۲۹۵۔یاد عمر رفتہ : ڈاکٹر عبادت بریلوی : لاہور : ۱۹۸۸ء

۲۹۶۔میری زندگی کے پچھتر سال : اعجاز الحق قدوسی : مکتبہ اسلوب : کراچی : ۱۹۸۸ء

۲۹۷۔یادوں کے چراغ : میاں عبدالعزیز : عباذ کا ٹرسٹ : کراچی : ۱۹۸۸ء

۲۹۸۔انجمن : فقیر سید وحید الدین : آتش فشاں پبلی کیشنز : لاہور : ۱۹۸۸ء

۲۹۹۔شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی : مرتبہ ڈاکٹر رشید الوحیدی : دہلی : ۱۹۸۸ء

۳۰۰۔مولانا احسن مارہروی آثار و افکار : صابر حسین خان : انجمن ترقی اردو : پاکستان : ۱۹۸۸ء

۳۰۱۔مسعود حسین رضوی : حیات اور کارنامے : مجلس ترقی ادب : لاہور : ۱۹۸۸ء

۳۰۲۔جنرل اختر عبدالرحمان' (شہید جہاد افغانستان) : عرفان صدیقی : جنگ پبلشرز : لاہور : ۱۹۸۸ء

۳۰۳۔جمال مصطفیٰ : جلد اول' دوم' سوم : عبدالعزیز عرفی : کراچی : ۱۹۸۸ء

۳۰۴۔سب سے بڑے انسان (بچوں کے لئے) : حکیم محمد سعید : ہمدرد فاؤنڈیشن : کراچی : ۱۹۸۸ء

۳۰۵۔شیخ الاسلام ابن تیمیہ' حیات وسیرت : ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری : ادارۂ تحقیق وتصنیف : کراچی : ۱۹۸۸ء

۳۰۶۔حسن علی آفندی : مرتبہ شاہد حسین خان : ادارۂ تحقیق وتصنیف : کراچی : ۱۹۸۹ء

۳۰۷۔ابوالکلام آزاد' ایک ہمہ گیر شخصیت : مرتبہ رشید الدین خان : ترقی اردو بیورو : دہلی : ۱۹۸۹ء

۳۰۸۔احتشام حسین' ایک مطالعہ : اخلاق اثر : بھوپال : ۱۹۸۹ء

۳۰۹۔علامہ سید سلیمان ندوی کی شان جامعیت : قاضی عبدالنان : الرحمان پبلشنگ ٹرسٹ : کراچی : ۱۹۸۹ء

۳۱۰۔ذکاءاللہ' حیات وعلمی کارنامے : ڈاکٹر رفعت جمال : بنارس : ۱۹۹۰ء
۳۱۱۔محمد اکبرالدین صدیقی : قطب الدین فاروقی : حیدر آباد دکن : ۱۹۹۰ء
۳۱۲۔فیض احمد فیض : کے کے کھلر : ادارہ فکرنو : دہلی : ۱۹۹۰ء
۳۱۳۔شہید ملت : ولی مظہر : مجلس کارکنان پاکستان : ملتان : ۱۹۹۰ء
۳۱۴۔تلاش آزاد : عبدالقوی دسنوی : مکتبہ جامعہ ملیہ : دہلی : ۱۹۹۰ء
۳۱۵۔حکیم طور سیاست : ولی مظہر : مجلس کارکنان تحریک پاکستان : ملتان : ۱۹۹۰ء
۳۱۶۔قائداعظم : جی الانہ : ترجمہ رئیس امروہوی : (س۔ن) : فیروزسنز : کراچی
۳۱۷۔حیات مولانا گیلانی (مولانا مناظر احسن گیلانی) : مولانا مفتی ظفرالدین مفتاحی : بنارس : ۱۹۹۰ء
۳۱۸۔سیرت حضرت عمرفاروقؓ (بچوں کیلئے) : چراغ حسن حسرت : س۔ن
۳۱۹۔میرے ساتھی' میرے غازی' میرے شہید : نصرت جہاں : ماڈرن بک ڈپو : لاہور : س۔ن
۳۲۰۔رسیدی ٹکٹ : امرتا پریتم : س ن
۳۲۱۔آزاد کی کہانی' میری زبانی (سردار عبدالرب نشتر' بیانیہ : مرتبہ آغا مسعود حسین : س۔ن
۳۲۲۔سیرت زینب : سد احمد حسین ترمذی : لاہور : ۱۹۹۰ء
۳۲۳۔محمد نبی ابی بکر : مرزا محمد عالم لکھنؤ : حق برادرز : لاہور : س۔ن

## حوالہ جاتی کتب

۳۲۴۔ادبی اور قومی تذکرے : ازکشن پرشاد کول : انجمن ترقی اردو ہند : علی گڑھ : ۱۹۵۱ء
۳۲۵۔اردو ادب کی تحریکیں : از ڈاکٹر انور سدید : انجمن ترقی اردو پاکستان : کراچی : ۱۹۸۳ء
۳۲۶۔اردو میں سوانح نگاری : از ڈاکٹر سید شاہ علی : رائٹرز گلڈ پاکستان : کراچی : ۱۹۶۱ء
۳۲۷۔اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا (۱۹۱۴ء تا ۱۹۷۵ء) : ڈاکٹر ممتاز فاخرہ : نئی



دہلی : ۱۹۸۴ء
۳۲۸۔اردو میں خودنوشت سوانح حیات : ڈاکٹر صبیحہ انور : لکھنؤ : ۱۹۸۲ء
۳۲۹۔افکار محروم (مقدمہ) : مالک رام : انجمن ترقی اردو ہند : دہلی : ۱۹۶۷ء
۳۳۰۔امرائے ہنود : سعید احمد مارہروی : نامی پریس : کانپور : ۱۹۱۰ء
۳۳۱۔بیرونی مشاہیر ادب حیدر آباد میں : ڈاکٹر سید داؤد اشرف : حیدر آباد دکن : ۱۹۸۳ء
۳۳۲۔پاکستان میں اردو تحقیق (مقدمہ) : جمیل الدین عالی : انجمن ترقی اردو : پاکستان : ۱۹۸۷ء
۳۳۳۔تاریخ ثقافت وادب پاک وہند (حصہ دوم) : ادارۂ ثقافت اسلامیہ پاکستان : لاہور :
۳۳۴۔تحریک پاکستان اور تاریخ پاکستان : حفیظ الرحمان صدیقی : مطبوعات تکبیر : کراچی : ۱۹۹۲ء
۳۳۵۔جدید اردو ادب : از ڈاکٹر محمد حسین : غضنفر اکیڈمی : کراچی : ۱۹۸۴ء
۳۳۶۔جواہر لال کی کہانی ترجمہ : رحیم دہلوی : نیا کتاب گھر : دہلی : س۔ن
۳۳۷۔حالات زندگی آنریبل مولانا موہن مالویہ آف الہ آباد : ازابوالاعلیٰ مودودی : دفتر تاج جبل پور : مطبوعہ اشتراکی پریس : دہلی : ۱۳۳۷ھ م ۱۹۱۹
۳۳۸۔خدا بخش لائبریری جرنل ۵۰: مرتبہ : عابد رضا بیدار : پٹنہ : ۱۹۸۹ء
۳۳۹۔حیات جاوید : الطاف حسین حالی : مرتبہ ومقدمہ : ڈاکٹر سید عبداللہ : اکادمی پنجاب : لاہور : ۱۹۵۷ء
۳۴۰۔حیات سعدی : الطاف حسین حالی : نولکشور پریس : لاہور : س۔ن
۳۴۱۔دستور پاکستان : مطبوعات محکمۂ اطلاعات : وفاقی حکومت پاکستان : ۱۹۷۳ء
۳۴۲۔عرب کا چاند : سوامی لکشمی مہاراج : دارالکتاب سلیمانی : ریوڑی : پنجاب : س۔ن
۳۴۳۔عظمتوں کے چراغ : ازولی مظہر : مجلس کارکنان پاکستان : ملتان : ۱۹۸۸ء
۳۴۴۔عظیم قائد' عظیم تحریک : جلد اول : جلد دوم : ولی مظہر : مجلس کارکنان پاکستان : ملتان : ۱۹۸۳ء
۳۴۵۔غزل پارے (شجاع خاور کے سو شعر) : مرتبہ نورجہاں سرور' سراج درپن : شمع

بک ڈپو : دہلی : ۱۹۹۲ء

۳۴۶۔غزلیں گوئل کی : از انجنی کمار گوئل : حیدر آباد دکن : ۱۹۹۲ء

۳۴۷۔کارجہاں دراز ہے : قرۃ العین حیدر : مکتبہ اردو ادب : لاہور : س۔ن

۳۴۸۔کرشن جیون : خواجہ حسن نظامی : خواجہ بک ڈپو : دہلی : ۱۹۱۹ء

۳۴۹۔کلچر کا مسئلہ : از ڈاکٹر سید عبداللہ : لاہور : ۱۹۷۷ء

۳۵۰۔کلیات حسرت موہانی : مقدمہ : جمال میاں فرنگی محلی : شیخ غلام علی اینڈ سنز : پاکستان : ۱۹۵۷ء

۳۵۱۔گاندھی نامہ : خواجہ حسن نظامی : مشائخ بک ڈپو : دہلی : س۔ن

۳۵۲۔گوتم : از ڈاکٹر سید حفیظ : انجمن ترقی اردو ہند : ۱۹۲۳ء

۳۵۳۔مادھوجی سندھیا : ترجمہ : سید محمد عبدالسلام : دہلی : ۱۹۲۳ء

۳۵۴۔مولانا شرر کی صحافت : از شفقت رضوی : مضمون مشمولہ سہ ماہی اردو : کراچی : شمارہ(۲) : ۱۹۸۱ء

## انگریزی کتب

☆ Historeis of Khilafat and non-co Operation Movements : Balm ford ۳۵۵

☆ 2nd edition-Delhi : 1972

☆ A Litorac, History of India : Freza R.W. : London : 1893. ۳۵۶۔

☆ India Wins Errors : Gandhi M.M. : Delhi : 1986. ۳۵۷۔

☆ Our Indian Muslim : Hunter W.W. : Londen : 18. ۳۵۸۔

☆ Si[illegible] of Congress : Satiya Pal : London : 1946. ۳۵۹۔

☆ Th[illegible] of Hindustanis : Tara Chand Dr. : Allahabad : 1944. ۳۶۰۔

○

## ڈاکٹر حسن وقار گل

**اصل نام۔** محمد وقار الحسن' **والد۔** محمد انوار الحسن انور دہلوی

**قلمی وادبی نام۔** حسن وقار گل' **تاریخ پیدائش۔** ۳۰ جون ۱۹۵۶ء پاکستان

**سابق پیشہ۔** صحافت' **موجودہ پیشہ۔** درس و تدریس

**تعلیم۔** ایم اے (اردو ادبیات)' ایم اے (جرنلزم)' ایل ایل بی' ڈی ایل ایس' پی ایچ ڈی

**ادبی مصروفیات۔** شاعری' ۱۹۷۰ء تا حال' تحقیق و تنقید' ۱۹۸۰ء تا حال

**مطبوعات۔** دو سو سے زائد مقالات / مضامین نظم و نثر تحریر کئے جن میں سو سے زائد علمی و ادبی شخصیات کے سوانحی خاکے اور انٹرویوز ہیں جو معیاری ملکی و غیر ملکی رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ تین کتابیں بھی مرتب کیں۔ تقریباً" ست سال سے ادبی و ثقافتی مجلہ "گل رنگ" کے ادارتی فرائض بھی انجام دے رہے ہیں ملکی و غیر ملکی دورے بھی کئے سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شریک ہو کر مقالات پڑھے جو جلد کتابی صورت میں شائع ہوں گے۔

**موجودہ فرائض منصبی۔** صدر شعبہ اردو وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج گلشن اقبال کراچی پاکستان